

# فکرِ امروز



*

غزل اور نظم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غزل کے موضوعات محدود ہیں اور نظم کے لامحدود۔ غزل میں حسن و عشق، ان کے متعلقات درجات و واردات کے علاوہ کسی اور موضوع کی گنجائش نہیں مگر نظم تمام واقعات و حالاتِ زمانہ کی ترجمانی پر حاوی ہے۔ اسالیبِ نظم کے تنوع اور ادا کی رنگا رنگی اور تنوع نے نظم کو غزل سے زیادہ مفید و دلکش بنا دیا ہے لیکن غور سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم نگاری کے لئے غزل نویسی سے یقیناً زیادہ علم اور زیادہ مشق کی ضرورت ہے۔ نظم نگاری کے لئے قادر الکلامی اور فکر صحیح کے ساتھ رفعت و ندرتِ تخیل ضروری ہے۔ یہی سبب ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اس سے وابستۂ فکر رہے ہیں اور ہمارے شعراء عام طور پر اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

تاہم رفتہ رفتہ اب نظم نگاری کا رجحان اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ غزل کی بقا اندیشناک ہو گئی ہے اور میرا ذاتی خیال ہے کہ آئندہ دس سال سے بیس سال تک اردو ادب میں نظم نگاری کو وہ فروغ حاصل ہوگا وہ غزل گوئی کے لئے مہلک ثابت ہو کر رہے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ نتیجتاً غزل اپنے موجودہ موضوعات کے ساتھ اردو ادب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے۔

[تاریخ ادب اردو کے ایک سلسلے تاجِ اردو کے ایک اقتباس سے ماخوذ
آگرہ۔ جنوری ۱۹۳۰ء جلد ۲]

**سیماب اکبرآبادی**


# شاعر

اشاعت کے ۵۸ ویں سال

ماہنامہ

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

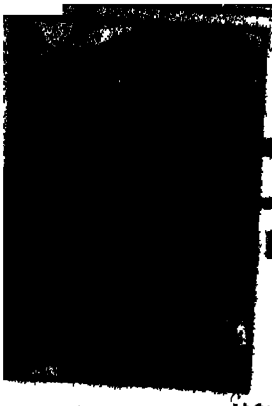
معاون
ناظر نعمان صدیقی

| قیمت | ۴ روپے |

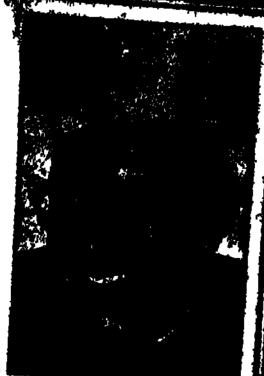
*

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

تا عمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالک غیر ۲۵۰ روپے سالانہ







# ہریانہ میں نئی بیداری

ہریانہ ملک کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست بننے کی جانب گامزن ہے ہماری چند اہم کامیابیاں اس طرح ہیں :-

- ہریانہ اپنے سبھی گاؤں میں بجلی پہنچانے اور انہیں پکی سڑکوں سے جوڑنے والا ملک کی پہلی ریاست ہے۔
- ہریانہ نے بڑے پیمانے پر لفٹ آبپاشی اسکیم شروع کی ہے جس سے ریتیلے علاقے بھی ہرے بھرے ہو گئے ہیں
- ہریانہ نے آبیانہ کا صدیوں پرانی روایت کو ختم کر دیا جس سے ۱۰ لاکھ کسان پریواروں کو راحت ملی ہے۔
- کسانوں کو آبی راستے پکے کرنے کے خرچ کی ادائیگی سے چھوٹ دے دی گئی ہے۔ ۱۱۲ کروڑ روپے کا تمام خرچ اب ریاست خود برداشت کرے گی۔
- آئندہ دو مہینوں کے دوران موجودہ آبپاشی نظام کو مزید بہتر بنانے کے لئے ۱ کروڑ روپے خرچ کئے جا رہے ہیں تاکہ ریاست کے کونے کونے تک پانی پہنچ سکے
- خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں آبیانہ، تکاوی اور کوآپریٹیو قرضہ جات کی وصولی منسوخ کر دی گئی ہے۔
- کیمیاوی کھاد (یوریا) کی قیمت کو ۱۱۰ روپے پچاس پیسے سے کم کر کے ۱۰۲ روپے ۵۰ پیسے فی بیگ کر دیا گیا ہے۔
- کل ۵۲۹۰ پانی کے مسائل والے گاؤں میں سے ۴۴۴۲ گاؤں کو پینے کے پانی کی سہولیات فراہم کرائی جا چکی ہیں۔ باقی گاؤں کو ۱۹۹۰ تک یہ سہولیات فراہم کرا دی جائیں گی۔



... کے درمیان تقسیم کی جا چکی ہے۔

- سماج کے کمزور طبقے کے لوگوں کو مکان بنانے کیلئے ۱۰۰-۱۰۰ مربع گز کے ۹۵ ہزار ۱۹۰ پلاٹ مفت دیئے گئے ہیں۔
- اس سال دیوالی کے اختتام تک ۱۰۴ ہزار افراد بڑھاپا پنشن حاصل کر رہے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ۰۰۰ لاکھ بیواؤں، بے سہارا عورتوں اور جسمانی معذوروں کو بھی یہ تمام سہولیات دی جائیں گی۔
- ہریانہ روڈویز کو ملک کی بہترین ٹرانسپورٹ سسٹم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ۳۲۰۰ بسوں میں روزانہ ۱۲ لاکھ ۹۰ ہزار مسافر سفر کرتے ہیں اور یہ ۹ لاکھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں
- سرکاری ملازمین کے لئے چوتھے پے کمیشن کی سفارشات لاگو کرنے کے ابتدائی کارروائی شروع کر دی
- سیر و سیاحت کے شعبے میں ہریانہ نے ... دیگر ریاستوں کے لئے قابل تقلید مثال ...

ہم اپنے عوام کی ... ہیں اور ایک ... مستقبل کی ... کے لئے پر عزم ہیں۔

# اساس، مزاج اور ردِ عمل

ہندوستان ایک مشترکہ تہذیب و تمدن کی اساس پر اپنے مزاج کا تعین آزادی کے حصول کے ساتھ کر چکا ہے۔ اسی بنیادی اساس نے ہندوستان کو تمام [illegible] رشتہ اور یکجہتی کا پیکر اور دستور بھی دیا ہے۔ ایک جمہوری ملک میں اس طرح کے دستور کی موجودگی اس ملک کے مزاج کی آئینہ دار تو ہے تاہم آزادی کے بعد [illegible] سکا ہے۔ تضادات و فسادات نے نہ صرف ہندوستان کے بنیادی مزاج کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ جمہوریت اور دستور دونوں ہی کے چہروں کو [illegible] ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو دو بڑی زبانوں کو یکساں سطح پر فروغ دینے کی ضرورت کو نظر انداز کئے جانے کے نتائج نے بہت سے [illegible] نقصانات وہ مسائل [illegible] ہندوستان کی قومی زبان ہندی کے ساتھ اردو کو مساوی درجہ دیے جانے کا جو مطلب ہو سکتا تھا اس سے انحراف کیا گیا حالانکہ ہندوستان کی آزادی میں اردو کا جو رول رہا ہے وہ اور زبان کا نہیں تھا۔ اردو، قومی یکجہتی کی علامت تو ہے لیکن تمام تر توقعات اور خواہشیں اسی ایک زبان سے وابستہ کر لی گئیں لیکن سلوک صورتِ حال کے برعکس رہا۔ اگر اسی سلسلے میں اس کے بنیادی مزاج کو برقرار رکھنے کے نعرے تو دیے گئے لیکن فضا ماحول اور طرزِ عمل کو ابھارا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی تمام زبانیں اس دھرتی کا حصہ و ورثہ ہیں لیکن ہندی اور اردو یہ دو زبانیں صحیح معنوں میں ہندوستان کی اساس اور بنیادی مزاج کا مظہر ہیں لیکن آج کا [illegible] ہی مختلف معنوں کا پتہ دیتی ہے۔ اردو زبان کا تعلق اس ملک کے تمام مذاہب اور فرقوں سے رہا ہے لیکن اسے مسلمانوں کے ساتھ بطور خاص منسوب کیا جا رہا ہے [illegible] زبان کیا جاتا ہے اور اس خیال کو فروغ دینے کے لیے جو منصوبہ بندی ہوتی رہتی ہے وہی ہر طرح کے خلفشار کا سبب بنتی ہے۔ [illegible] اس خلفشار کے [illegible] ہیں۔ متعصب ذہن بلکہ مفاد و مصلحت شعار افراد کو تخریبی کارروائیوں کے مواقع ملتے ہیں اور سلسلہ تیز تر ہے۔





مدحت الاختر



انور مینائی



شمیم فاروقی

[illegible]

[illegible]

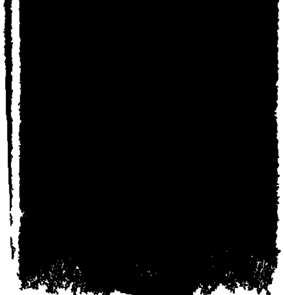
[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]

کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کرتا ہی رہا اور اس سلسلہ میں کچھ جرأت بھی
ہوتی رہی اور ترمیم میں تو نہ کسی کے ارادہ کو دخل ہے نہ مشورہ کی ضرورت
زمانہ کے خواص میں سے یہ بھی ایک خاصہ ہے جس کا جلوہ ہر چیز میں زمانہ کا
رنگ بدلنے کے پردہ میں حدوث کا ثبوت دے رہا ہے اور بجز ذاتِ باری
کے کوئی شے بعینہ ایک حال پر قائم نظر نہیں آتی بہت سی باتیں اگلوں نے اچھی
سمجھیں۔ اب ہمارے متروکات کی فہرست میں داخل ہیں۔ بہت سے سکے ہم رائج
سمجھتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ٹکسال باہر کر دیں گی۔ اچھا اور بُرا حقیقت میں
زمانہ نے کیا ہے مگر مفروضات کا اس محکمہ پر زیادہ اثر اور دباؤ ہے علم ملک،
زبان، حکومت، مذہب، ضرورت، مناسبت وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے سوسائٹی
جس کو پسند کرے وہ مقبول اور اس کے سوا سب مردود ہے۔

اقبال مند جو چاہیں سو کریں۔ نہ اُن تک دستِ ملامت دراز ہو
سکتا ہے نہ زبانِ اعتراض۔ کیونکہ نہ وہ کمال کے دعوے دار نہ پیشہ
کار۔ اُن کو شوق کے میدان میں قواعد کے گڑھے کرنے کیا ضرور ہے۔ کہ ہر
وقت دیکھ کر چلنا پڑے۔ دوسرے یہ کہ جن مضامین کو ہم بڑی تلاش سے
خیال میں لاتے ہیں بمراتب اُس سے زیادہ ہر وقت اُن کے پیشِ نظر
رہتے ہیں اور اسی لئے عشرت کے مضامین شاہوں کا حصہ اور فقر و
فاقہ کے مطالب غریبوں کا ترکہ اور ورثہ ہے اور صرف غزل کہنے والوں کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## بلاغت

بلاغت تین علموں کے مجموعہ کا نام ہے علم معانی، علم بیان، علم بدیع۔
بعض مؤلفین نے عروض و قافیہ بھی آخر کتاب میں بطور ضمیمہ شریک کر دیا ہے عربی
میں بلاغت کی دو کتابیں مشہور اور زیرِ درس ہیں۔ ایک مطوّل دوسری مختصر معانی
جن کو اصل میں ایک ہی سمجھنا چاہئے اور فارسی میں حدائق البلاغت اور دو ایک قدیم
کتب ہیں اردو میں حدائق البلاغت کا ترجمہ اور معیار البلاغت اور بعض کتب نے
ہوا ہیں۔ اور جس ترتیب سے میں نے ذکر کیا ہے اُسی ترتیب سے اُن کا رتبہ بھی سمجھنا چاہئے۔

## شاعری

اس زمانہ میں کیا بلکہ ہر زمانہ میں عشق، حسن، شباب، پیری، ہوشیاری،
دیوانگی، وصال، فراق، گلستان، بیابان، سفر، حضر، مصیبت، راحت،
کامیابی، ناکامی، اُمید، یاس اور انسانی جذبات اور دنیاوی حادثات
ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس لئے شعر و شاعری بھی انہیں
کے ساتھ رہی اور رہے گی۔ پہلا تو اعد منضبط نہ تھے اب منضبط ہو گئے۔
مذاق بدل گیا کچھ ترمیم و تنسیخ بھی ہوئی۔ غرض ہر طبقہ کیلئے میٹھا اس

محبوب الشعرا [کتاب العروض] کے دو صفحات کا عکس۔ کتاب کے مؤلف و مرتب سید نظر حسن سخا دہلوی جانشین داغ دہلوی۔ اشاعت اوّل ۱۸۹۹ء، بار دوم ۱۹۰۰ء مطبوعہ انصاری پریس دہلی۔

## عالمی اُردو کانفرنس کی
## ایک ادبی تصویر



نومبر ۱۹۵۵ء میں دہلی کے نامور ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا ایک اہم جلسہ عالمی اُردو کانفرنس کے سلسلے میں منعقد کیا
گیا تھا جسے عالمی اُردو کانفرنس کے کنوینر اور بانی [illegible] نے خطاب کیا تھا۔ اس تصویر میں دائیں [سے بائیں] گوپی [illegible] نے اس [illegible]
کریں [عالمی اُردو کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے] [illegible] آزاد [illegible] اور [illegible] حکیم [illegible]
[illegible] اور [illegible] دیکھے جا سکتے ہیں۔

پٹنہ ۲۳/۳ ۶۴ مشفق مکرم — کتاب لوروڑ ملا دلی شکریہ —

[illegible]

पोस्ट कार्ड
POSTCARD

جناب ابو محمد سحر
4, Char Bangla Rd
Bhopal
M.P.

قاضی عبدالودود بنام ابو محمد سحر [بشکریہ: ابو محمد سحر، بھوپال]

[illegible]

पोस्ट कार्ड
POST CARD

केवल पता
ADDRESS ONLY

Mr. Abu Mohammad Sahar M.A.
Lecturer Deptt. of Urdu
Govt. Hameedia College
Bhopal
M.P.

رشید احمد صدیقی مرحوم بنام ابو محمد سحر [بشکریہ ابو محمد سحر، بھوپال]

[redacted]

## بشیر بدر

تیرا ہاتھ مرے کاندھے پر دریا بہتا جاتا ہے
کتنی خاموشی سے دُکھ کا موسم گزرا جاتا ہے

نیم پہ اُنگھے چاند کی پلکیں شبنم سے بھر جاتی ہیں
سُونے گھر میں رات گئے جب کوئی آتا جاتا ہے

پہلے اینٹیں، پھر دروازے، اب کے چھت کی باری ہے
یادنگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

راکھ ہوئیں آنکھوں کی شمعیں آنسو بھی بے نور ہوئے
دھیرے دھیرے میرا دل پتھر سا ہوتا جاتا ہے

اپنا دل ہے ایک پرندہ جس کے بازو ٹوٹے ہیں
حسرت سے بادل کو دیکھے، بادل اُڑتا جاتا ہے

ساری رات برسنے والی بارش کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھے سکھایا جاتا ہے

ہم نے تو بازار میں دنیا بیچی اور خریدی ہے
ہم کو کیا معلوم کسی کو کیسے چاہا جاتا ہے

ڈی۔۱۲۰، شاستری نگر، میرٹھ (یوپی)

[redacted]

کبھی تو شام ڈھلے اپنے گھر گئے ہوتے
کسی کی آنکھ میں رہ کر سنور گئے ہوتے

سنگار دان میں رہتے ہو آئینے کی طرح
کسی کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے ہوتے

غزل نے بہتے ہوئے پھول چن لئے ورنہ
غموں میں ڈوب کے ہم لوگ مر گئے ہوتے

عجیب رات تھی کل تم بھی آکے لوٹ گئے
جب آگئے تھے تو پل بھر ٹھہر گئے ہوتے

بہت دنوں سے ہے دل اپنا خالی خالی سا
خوشی نہیں تو اُداسی سے بھر گئے ہوتے

[redacted]

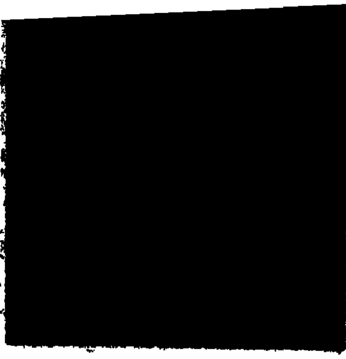
کسی کی یاد میں پلکیں ذرا بھگو لیتے
اُداس رات کی تنہائیوں میں رو لیتے

دُکھوں کا بوجھ اکیلے نہیں سنبھلتا ہے
کہیں وہ ملتا تو اس سے لپٹ کے رو لیتے

اگر سفر میں، ہمارا بھی ہم سفر ہوتا
بڑی خوشی سے انہیں پتھروں پہ سو لیتے

تمہاری راہ میں شاخوں پہ پھول سوکھ گئے
کبھی ہوا کی طرح اس طرف بھی ہو لیتے

یہ کیا کہ روز وہی چاندنی کا بستر ہو
کبھی تو دھوپ کی چادر بچھا کے سو لیتے




ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

شعبۂ اردو، گورڈن کالج، راولپنڈی (پاکستان)


# ادبیاتِ عالم میں ترجمے کی روایت

حاجی احمد فخری صاحب کے بقول: "یہ امر مسلّم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور...... اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے"[1] یوں ادبیاتِ عالم بڑی حد تک تراجم ہی کا مرہونِ منت ہے۔

مشرق اور مغرب، ہر دو اطراف میں ایک زبان سے دوسری زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ مشرق میں تراجم کی تاریخ کو کھنگالا جائے تو آج سے ٹھیک چودہ سو چونتیس برس پہلے ساسانی دور کے ایران میں سنسکرت کی کتاب "پنچ تنتر" کے ایک حصے کا ترجمہ بزرجمہر اور حکیم برزویہ کی کوششوں سے (۵۵۰ء) پہلوی زبان میں "کرتک و دمنگ" کے نام سے ہوا۔

اس سے پیچھے جائیں تو دنیا کے قدیم ترین ادب کی معلوم مثال ساڑھے (۵ ہزار سال قبل مسیح) سے ملتی ہے۔ اس زبان کی تہذیب سومیری یا سومیر کہلاتی ہے۔ سومیری ادب "رگ وید" سے کم از کم اڑھائی ہزار سال اور زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال قبل احاطۂ تحریر میں آنا شروع ہوا۔ یوں عبرانی اور یونانی ادب سے دو ہزار سال پہلے کا زمانہ بنتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ سومیری ادب کی ادبی تہذیب کے اوجِ کمال کے ساتھ اس وقت کی موجود دنیا پر اثر انداز ہوا ہوگا۔ کیا معلوم "رگ وید" پر سومیری ادب نے کس قدر اثر چھوڑا اور یونانی علم و ادب سومیری ادبیات کس قدر اثر پذیر ہوا؟ ان سوالات کا جواب خود سومیری زبان کے علاقے سومیر (جنوبی عراق) کے لوگوں کے پاس بھی نہیں[2]۔ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرے گا آریاؤں کی "رگ وید"، عبرانیوں کے "عہد نامۂ قدیم"، قدیم یونان کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" اور ہندوؤں کی "راماین" و "مہابھارت" پر سومیری ادب کے اثرات واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

روم کے زوال اور نشاۃ الثانیہ کی درمیانی صدیاں مؤرخین کے نزدیک "ازمنۂ تاریک" قرار پائیں لیکن دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں نے قدماء کے علمی و ادبی سرمائے کو برباد ہونے سے بچا لیا۔

مامون الرشید (عباسی) نے حران کے صابیوں، نسطوری عیسائیوں اور ہند کے علماء کی مدد سے سریانی، پہلوی، یونانی اور سنسکرت سے مختلف علوم و فنون کو عربی میں منتقل کر دیا۔ عباسی "بیت الحکمت" کم و بیش دو سو سال تک کام کرتا رہا۔ مترجمہ علوم میں ارسطو کی منطق، افلاطون کا اشراق، بقراط کی طب، فلاطینوس کا عرفان، بطلیموس اور آریا بھٹ کا علمِ ہیئت عربی ادب کو مالا مال کر گیا۔

۱۲ ویں اور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ابنِ رشد اور بو علی سینا کی تالیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر مغربی ممالک میں شائع ہوئیں جنہوں نے مغرب کی ہزار سالہ جہالت اور بے عملی کی زندگی کو حقیقی معنوں میں جینے کا جتن بنانے میں مدد دی۔ ابنِ رشد کے "حقیقت اور کردار" کے نظریے نے خاص طور پر مغربی اذہان کو متاثر کیا جبکہ یونانی فلسفے کی تہذیب کے سلسلے میں ابنِ ماجہ، ابنِ طفیل اور ابنِ رشد کے تراجم کو خصوصی اہمیت

---

[1] مقدمہ، رسالہ تراجم، مطبوعہ مجلہ "آئندہ" دکن ۱۹۳۹ء - ص ۵۹۴

[2] کمال ... از ... کاروانِ ادب ... ۱۹۸۳ء

ہے۔ دوسری [illegible] ارسطو کی کتاب "الروح" (شرح: اسکندر افرودیسی) کی مقبولیت سے "نوفلاطونی" یا "اشراقی" فلسفے نے رواج پایا۔ لیکن
نت پر شرح کا اثر غالب تھا اور ارسطو کے افکار کے ساتھ اس کا لفظی و ادبی سا تعلق پایا جاتا ہے۔
عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا بھر کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ بیروت کے عیسائی مؤرخ نوفل آفندی نے اپنی کتاب "صناجۃ
[illegible]" میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

امیر معاویہ کے زمانے میں حدیث، فقہ اور تفسیر کا علم اپنی انتہاؤں پر تھا۔ امیر معاویہ کے پوتے خالد نے عیسائی اور اہلِ ہنود سے علمِ طب
سیکھا۔ خالد نے غیر زبانوں سے تراجم پر خصوصی توجہ دی اور یونانی فلسفے کو مصری درس گاہوں سے منتقل کیا۔ واضح رہے کہ اس وقت مصری
تسلط تھی۔

خود امیر معاویہ کے عہد میں ابن آثال (ضلع حمص کا عیسائی ڈاکٹر) نے یونانی زبان سے طب کی بعض اہم کتب عربی میں منتقل کیں۔ اسے عربی میں
علمی جدید روایت کا سرآغاز کہنا چاہیے۔ اس عہد کا سب سے اہم مترجم اصطفن تھا، جس نے سریانی سے عربی میں اہم تراجم کیے۔ اس دور میں
ترجے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ مال گذاری اور خراج کے دفاتر غیر ملکی زبانوں کے سہارے چلتے تھے۔ مثال کے طور پر عراق کا دفتر
فارسی میں، شام کا لاطینی میں اور مصر کا قبطی میں۔ صالح ابن عبدالرحمٰن نے ۷۰۰ء مطابق ۸۰ھ میں عراق کا دفتر عربی میں منتقل کر دیا۔ ہشام
بن عبدالملک (سالِ خلافت: ۱۰۵ھ مطابق ۷۲۳ء) نے شام کے دفتر کو عربی میں منتقل کر دیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں
فارسی، لاطینی اور قبطی کے جاننے والے خود مسلمانوں میں (بڑی تعداد میں) موجود تھے۔ ہشام کے میر منشی سالم نے ارسطو کے رسالوں کا جو سکندر
اعظم کے نام تھے، عربی میں ترجمہ کیا جبکہ سالم کے بیٹے جبلہ نے فارسی ادب اور فلسفہ سے متعلق کتب ترجمہ کیں۔

دولتِ عباسیہ (۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء) کے خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب عجمیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی، انہوں نے فارسی سے طب اور
فلسفے کی کتابیں ترجمہ کیں۔ اس دور کا سب سے اہم مترجم عبداللہ ابن المقفع تھا جس نے سنسکرت "پنج تنتر" اور پہلوی "کرتک و دمنک"
کو عربی میں ترجمہ کر کے "کلیلہ و دمنہ" نام رکھا۔ اس کے فارسی سے کیے ہوئے دیگر تراجم میں ایرانی تاریخ کی نادر کتابیں خصوصاً "آئین نامہ"، "تزدک
نامہ"، "نوشیرواں نامہ" یادگار ہیں جبکہ اس نے مانی کی ذاتی تصانیف کو بھی عربی کا جامہ پہنایا۔ اسی طرح پارسی علم الاخلاق سے "الادب
الکبیر" اور "الادب الصغیر" اس کے یادگار تراجم ہیں۔

جارج ابن جبرئیل نے اس زمانے کی طب سے متعلق اہم کتابوں کو عربی میں منتقل کیا۔ منصور کے [illegible] بطریق (عیسائی) نے یونانی سے
بقراط اور جالینوس کے افکار کو ترجمہ کیا جبکہ ابن رشد نے ارسطو کے فلسفیانہ رسائل کو عربی کا جامہ پہنایا۔ اسی عہد میں مانی اور مجوسیوں
کے تراجم کے بعد عرب دنیا میں پہلی بار دوسری اقوام کے مذاہب پر ریسرچ کا رجحان پیدا ہوا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے "بیت الحکمۃ" کی بنیاد رکھی تو اس کے ساتھ دارالترجمہ بھی قائم کیا، یوں عربی میں ترجمے کی بکھری بکھری انفرادی
کوششوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔

ہارون الرشید کے عہد سے متعلق دو بڑے مترجمین: (۱) فضل ابن نوبخت مجوسی اور (۲) یوحنا ابن ماسویہ تھے۔ جنہوں نے
بالترتیب فارسی اور یونانی زبانوں سے ترجمے کیے۔

مامون الرشید کا زمانہ عربی میں تراجم کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ بقول شبلی نعمانی "ہر ہر بات میں وہ شاہانِ
عجم کی تقلید کرتا تھا اور اردشیر آئین سلطنت اس کا دستور العمل تھا۔"[3]
فلسفے سے اس کی رغبت کا احوال اس کا قیصرِ روم کے نام لکھا خط کھولتا ہے، جس میں اس نے لکھا تھا کہ ارسطو وغیرہ کی جس قدر

---

[1] بحوالہ "رسائلِ شبلی" از شبلی نعمانی مطبوعہ الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر س۔ن کتاب کا دیباچہ از شبلی نعمانی یکم فروری ۱۸۹۸ء کی تحریر ہے۔
[2] "الفہرست"، از علامہ ابن الندیم ص [illegible] "طبقات الاطباء" از یحییٰ نحوی۔ [3] رسائل شبلی، ص [illegible]

کتابیں بیت الحکمت پہنچائی جاتی تھیں۔ * وہ ایک قافلہ جب خلفائے عباسیہ کے [illegible] قیصر روم کے پاس [illegible] تھے۔

مامون الرشید سے پہلے عربی میں لفظی ترجمے کا رواج تھا اور کتب کے اصل متن کی مشکلات ترجمے میں بھی اسی طرح قائم رہتی تھیں۔ اس مشکل کو اس دور کے مشہور مترجم حنین بن اسحاق (عیسائی نسطوری تھا) اور مامون الرشید نے اس کی ہر تصنیف (ترجمہ) کے برابر سونا تول کر دیا۔ حنین نے اڑتالیس برس کی عمر تک مامون الرشید کے لیے جالینوس کی ۱۰۰ کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا جبکہ دوسرے عظیم مترجمین یعقوب کندی، سہل ابن ہارون اور قسطا بن لوقا نے بالترتیب حکمت و یونانی فلسفہ، کلیلہ و دمنہ کے طرز پر قصہ عفراء اور یونانی علوم و فنون کے تراجم کیے۔

یہ سب کچھ اس لیے بھی ممکن ہو سکا کہ مامون الرشید کے عہد میں مناظرے بازی (ابن الحکم کی یادگار) کے مقابلے میں علوم عقلیہ پر خصوصی توجہ صرف کی گئی، جبکہ اصطرلاب پر یونانی فلاسفر بطلیموس کے رسالے کا عربی ترجمہ ہارون الرشید کے عہد میں یحییٰ برمکی کے زیر اہتمام ہوا تھا۔

۲۲۷ھ مطابق ۸۴۱ء میں خلیفہ واثق باللہ نے حنین بن اسحاق کو دارالترجمہ کا مہتمم مقرر کیا جبکہ اسی زمانے میں موسیٰ بن خالد جیسے مترجم وہاں ترجمے کے کام پر موجود تھے۔ سیف الدولہ کے عہد میں عیسیٰ رقی جیسا اہم مترجم موجود تھا۔ امیر اندلس کے عبدالرحمٰن ناصر نے مترجمین سے وہ کام لیا جو "شاہنامۂ اسلام" (فردوسی) کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کر گیا۔ اسی زمانے میں عزالدین نے علم نجوم پر دلائل فیروزی جیسا ترجمہ مکمل کیا اور ثابت ابن قرہ نے ۲۸۸ھ میں متعدد ریاضی اور علم ہیئت سے متعلق کتب کو یونانی سے عربی میں منتقل کر دیا۔

داستانوی ادب کے تراجم میں "کلیلہ و دمنہ" کا دوسرا اہم ترجمہ عبداللہ بن ہلال اہوازی نے ۱۶۵ھ مطابق ۷۸۱ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ زمانہ یحییٰ کا تھا۔ اس دور میں عمر بن فرخان (جسے رئیس المترجمین کہا جاتا ہے) دارالترجمہ میں موجود تھے۔ اسی دور میں مہندس محمد بن ابراہیم فزاری نے زیج کی مشہور زمانہ تصنیف "سدھانت" از برہم گپت کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ مکمل کیا۔

مندرجہ بالا اہم مترجمین کے بعد موسیٰ بن شاکر کا خاندان ترجمے میں اہم مقام حاصل کر گیا۔ اسی خاندان کے ثابت بن قرہ کو اپنے زمانے کا "رئیس المترجمین" مانا گیا۔

* قدیم عرب کے مترجمین زبان فارسی:

عبداللہ بن المقفع، فضل بن نوبخت، ابو سہل اسمٰعیل بن علی بن نوبخت، حسن بن موسیٰ، حسن بن سہل، موسیٰ بن خالد، یوسف بن خالد، ابوالحسن علی، جبلہ بن سالم، احمد بن یحییٰ البلاذری، اسحاق بن یزید، محمد بن جہم البرمکی، موسیٰ بن عیسیٰ، ہشام بن القاسم، محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی، بہرام بن مردان شاہ، عمر بن فرخان الطبری، عبداللہ بن علی، سہل بن ہارون، اسحاق بن علی اور عبداللہ بن ہلال اہوازی۔ اور سعید بن ہارون۔

* قدیم عرب کے مترجمین زبان سنسکرت:

منکہ، ابن دھن، اسمٰعیل تنوخی، ابوریحان بیرونی اور فیضی۔

* قدیم عرب کے مترجمین زبان سریانی:

ماسرجیس (یہودی)، عیسیٰ بن ماسرجیس، ہشدی کرخی، ابن شہدی کرخی، ایوب الرہاوی، یوحنا، منصور بن باناس، ایوب بن قاسم اور متی بن یونان۔

* قدیم عرب کے مترجمین زبان یونانی و لاطینی نیز سریانی:

اصطفن، بطریق، یحییٰ بن بطریق، حبیب بن بہریز، حجاج بن مطر، عبدالمسیح ابن ناعمہ الحمصی، سلام ابرش، عیسیٰ بن نوح، ابراہیم

---

* [illegible] تہامی کشمیری [illegible] بحوالہ "الفہرست" الندیم۔

قویری، صلیبا، الیوب ہادی، باسیل، قسطا بن لوقا، حنین بن اسحاق، وغیرہ متعدد نام۔

عربی ادب میں جدید دَور کا آغاز تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نپولین کے مصر پر حملے سے ہوا اور اہلِ مصر جدید مغربی علوم سے روشناس ہوئے یعنی نپولین کی فوجیں فرانس واپس جاتے ہوئے اپنے علوم و ادب کے کچھ آثار چھوڑ گئیں اور یہی سبب ہے کہ مصر کے حکمران محمد علی پاشا نے اپنے ملک کے چیدہ ذہین طلباء پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھیجے اور جدید تر مغربی علوم کے تراجم عربی زبان میں کروائے۔ ان جدید تر علمی عناصر کی مصر میں نشوونما سے پہلے فرانسیسی ادبیات کو عربی میں منتقل کرنے کا کام مکمل کیا جا چکا تھا۔ ترجمے کے اس کام میں شام اور لبنان کے ان عیسائی ادباء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو مصر میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ تراجم کے زیرِ اثر شوقی نے پہلی مرتبہ فرانسیسی منظوم ڈراموں کی طرز پر کامیاب منظوم ڈرامے لکھے۔ یہی وہ تخصیصی اوصاف ہیں جن سے حافظ ابراہیم کی شاعری خالی ہے اور یہ صرف تراجم کے باعث پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین یونانی ادبیات کے ماہر تھے اور انہوں نے چاہا تھا کہ تراجم کا ایک اور دَور چلے۔ اس سے پیشتر جنگِ عظیم کی بدولت ادبیاتِ عالم میں جو نمایاں انقلاب برپا ہوا تھا اس کے ثبوت عربی ادب میں بھی ملتے ہیں۔ خلیل جبران خلیل لکھتا ہے:

"میں مشرق کا ماتم اس لیے کرتا ہوں کہ مردہ لاش کے آگے رقص کرنا محض پاگل پن ہے۔ میں اہلِ مشرق کے حالِ زار پر اس لیے روتا ہوں کہ بیماروں پر ہنسنا جہلِ مرکب ہے۔"

خلیل جبران کا نام ساری دنیا میں ترجمے کی تحریک کا نمایاں تر نام ہے۔ خلیل جبران کی بازگشت شام اور لبنان کے ادبی حلقوں میں بھی سُنی گئی۔ جنگِ عظیم کے بعد عقاد کا زمانہ آیا یہ زبردست نقاد اور انشائیہ نگار فرانسیسی ادب کی بہ نسبت انگریزی ادب سے زیادہ متاثر تھا اس نے انگریزی ادب کے جدید تر رجحانات کو عربی میں منتقل کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

عربی ادب کے "اپولو گروپ" کی قیادت مصری شاعر ڈاکٹر ابو شادی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہ گروپ ہے جس کی شاعری میں مغرب اور مشرق کی حدیں مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

عراق میں فکشن کی ابتداء "الف لیلہ" اور قدیم حکایات و قصص کے تراجم کے زیرِ اثر ہوئی جبکہ بعد میں اس کی جگہ مصر اور لبنان کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانے اور مغربی ادب کی ناکام نقالی نے لے لی۔ البتہ ترجمے کا کام مغربی زبانوں سے واقفیت نہ ہونے کے سبب نہ ہو سکا۔ پھر بھی محمود السید، انور شاؤل، عبدالمجید لطفی، ذوالنون اور ڈاکٹر خلوصی نے خلیل جبران اور امریکی ادب کے زیرِ اثر نئی تکنیک بھی برتی اور تراجم کی محدود تعداد میں ترجمے کا حق بھی ادا کیا۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ عراقی ناول نگاروں میں محمود احمد سید، ذوالنون ایوب اور جعفر خلیلی نے انگریزی ادب سے اثر قبول کیا۔

کارل مارکس کی "داس کیپٹل" کے ترجمے کے ساتھ ہی اشتراکی خیالات کی ابتدا ہو گئی تھی تاہم موجودہ دَور میں یہ اثرات کہیں زیادہ نمایاں ہیں۔ عربی کے جدید ناولوں میں حقیقت پسندانہ کردار نگاری کے فرائض انجام دینے میں مغربی اصولوں کو ہی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، جبکہ جدید ترین فکشن میں فرانس کے فلابیر اور زولا کے بعد سارتر کے زیرِ اثر نظریۂ وجودیت تک کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

**ایرانی ادب:-** ایران میں اکثر ترجمے عربی زبان سے ہوئے اور فرانسیسی اثر کو قبول کیا گیا۔ ساسانی دور کے ایران میں سنسکرت کی کتاب "ہتوپدیش" کے ایک حصے "پنج تنتر" کے ترجمے (۵۵۰ء) کے بعد متعدد یادگار ترجمے فارسی میں ہوئے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

تاریخِ طبری کا ترجمہ وزیر محمد عبداللہ بلعمی نے ۹۶۳ء میں کیا۔ ترجمہ "تفسیرِ طبری" بھی منصور بن نوح سامانی (۹۶۱ء - ۹۷۶ء) کے دَور میں ہوا۔ علمِ نجوم کی کتاب "برہان الکفایہ" نام کا ترجمہ احمد بن عبدالجلیل سجزی نے کیا جو ابو معشر بلخی کی عربی کتاب "احکام المولید" کا ترجمہ ہے۔ تاریخ فتوحی نام کی کتاب کا مترجم محمد المستوفی ہروی ہے جبکہ اصل کتاب کا نام "فتوح ابن اعثم" ہے اور اس کے عرب مصنف کا نام احمد ابن اعثم کوفی ہے۔ طوسی کی کتاب اخلاقِ ناصری، ابو علی مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق کا آزاد ترجمہ ہے۔

ادب و منطق پر ابن المقفع کی کئی اہم تصانیف [illegible] ہیں۔
عربی کتاب "تحفۃ المیلۃ" کا ترجمہ ابوالفضل الملک کاشانی نے کیا۔ عربی کتاب "الفرج بعد الشدۃ" کا ترجمہ الحسن علی المدائنی
کا ترجمہ حسین دہستانی نے ۱۲۳۹ء میں کیا۔ عربی کتاب "کنز الدقائق" کا فارسی ترجمہ نصر اللہ کرمانی نے کیا۔ جعفر تبریزی کی کتاب
"کشکول" کا ترجمہ جلیل قزوینی نے ۱۶۵۴ء میں کیا جبکہ "تحفۃ المومنین" محمد مومن معاصر شاہ سلیمان صفوی (۱۶۶۶ء تا ۱۶۹۴ء)
بھی عربی کتاب "تالیف الطبیب جملۃ" کا ترجمہ ہے۔

**چینی ادب:** چینی ادب نہایت قدیم ہے۔ ایک الگ تھلگ جزیرے کے مانند رہا ہے جبکہ سفرنامہ نگاروں نے اس کا رابطہ باقی ماندہ دنیا سے جوڑنے کی سعی کی ہے۔ ان مخطوطات سے ان باتوں کا علم ہے کہ چین کا علاقہ ہمارے لیے اور دیگر
چینیوں کے علاوہ چینیوں کے لیے ایک گمبھیر اسرار سے کم نہیں رہا۔

چین میں نثری رومانی قصوں کا آغاز عہد ٹانگ (۶۱۸ء تا ۹۰۶ء) میں یونانی قصوں کے زیر اثر ہوا۔ لیکن چین میں رومان پسندی کا عہدِ شباب ۱۳۶۸ء کا زمانہ ہے۔ سان کو چی SAN KUO CHI اور شوئی ہو چوان SHUI HU CHUAN کے دو قصوں بالترتیب "تین سلطنتوں کا زوال" اور "تمام انسان بھائی بھائی ہیں" نے خصوصی شہرت حاصل کی۔ آخر الذکر قصہ پرل ایس بک نے ۱۹۳۳ء میں ترجمہ کر کے نیو یارک سے طبع کروایا۔

چین کی مشہور رومانی داستان "مغرب کی سیاحتوں کے حالات" از ہی یو چی کے عالمگیر اثرات ادبیات عالم پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً "مغرب کی سیاحتوں کے حالات"، "ممد انڈیا" اور بھوانی جکشن تک ایک ہی سلسل اسرار سے متعلق اور کہانی درج ہے۔ ہی یو چی نے بدھ مت کی تبلیغ کے سلسلے میں مورتیوں اور کتابوں کی کھوج کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ بعد میں اس کتاب کو مسعود علی نے "بندر" کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ چینی سماجی آداب زندگی سے متعلق چن پنگ می[1] CHIN PING MEI کی داستان "سنہری گملے کا عبیر" کو کلیمنٹ ایجرٹن نے "سنہری کنول" کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ اسی طرح سنہرے کمرے کا خواب HUNG LOU MONG از سادہ سو چو (۱۷۱۹ء تا ۱۷۶۶ء) کو بعد میں چی چینگ وانگ نے قطع برید کے بعد "ڈریم آف دی ریڈ چیمبر" کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔

JAMES LEGGE نے چینی شاعری کے اولین مترجم کے طور پر شہرت پائی لیکن اس خصوص میں خاتون مترجم HELEN WADDELL کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ JAMES LEGGE کے ترجموں اور نوٹس کو بنیاد بنایا اور لفظی ترجمے کو تخلیقی ترجمے کے درجہ پر محسوس کروایا۔ اس ضمن میں LYRICS FROM THE CHINESE اور GREAT ANCIENT LYRICS کے سلسلے کی نظمیں ہمیشہ خصوصی توجہ کی طالب رہیں گی۔

THE TALE OF MENG CHIANG بچوں اور بچیوں میں یکساں مقبول رہی ہے۔ اسے GENEVIEVE WIMSATT نے THE LADY OF THE LONG WALL کے نام سے ترجمہ کیا اور کولمبیا یونیورسٹی پریس سے شائع کروایا۔

ARTHUR WALEY نے چینی شاعر CHU YUAN کے علاوہ بے شمار چینی شعراء کو تراجم کے ذریعہ پوری دنیا سے متعارف کروایا۔ CHU YUAN کی طویل نظم THE GREAT SUMMONS کے ترجمے کو آج بھی اہم گردانا جاتا ہے۔ شاعر کے ترجموں کے سلسلے میں WITTER BYNNER کو اہمیت حاصل ہے۔[2]

---

[1] مصنف کے نام کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ محققین کے مطابق یہ داستان وان وانگ شی چنگ کی لکھی ہوئی ہے۔
[2] چینی شاعری کے ان مترجمین کے کلام کے نمونے THE WISDOM OF CHINA مرتبہ LIN YU TANG مطبوعہ JAICO PUBLISHING HOUSE, 125, MAHATMA GANDHI ROAD, BOMBAY-400001, ۱۹۶۸ء میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

منشیوں نے کہ چینی ادیب نے چینی بیماری کا آغاز ۱۸۴۵ء کی افیون لڑائی سے کیا۔ موجودہ انقلاب کے دوران تک چین کے ادب نے تائپنگ کی آسمانی حکومت، ۱۸۹۴ء کی چین جاپان جنگ، ۱۸۹۸ء کی اصلاحی تحریک، ۱۹۱۱ء کی ڑی ہوچن تحریک، انقلاب بہرحال ۱۹۴۹ء، شمالی مہمات اور کسانوں کی جمہوریت، اگست ۱۹۴۹ء میں عوامی فوج کی فتح اور چیئرمین ماؤزے تنگ کا ادیبوں کے لیے لائحہ عمل سے لے کر ثقافتی انقلاب تک آسمان کے سبھی رنگ دیکھ لیے ہیں۔ البتہ چینی ادب اس اعتبار سے یقیناً ادبیاتِ عالم سے کٹا رہا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم ستان کی جنگ سے دوچار تھا۔ اس موضوعاتی فلک الافلاک کو چینی ادیبوں کے سرخیل ماؤزے تنگ اور لوہسون نے اس طرح سمیٹا ہے کہ چینی ادیبوں کو عمومی طور پر ادبیاتِ عالم میں کیے گئے تکنیکی تجربات کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

نئے چین میں تاحال افسانے کی تکنیک کم برتی جا رہی ہے۔ کہانیوں میں اکثر ماؤ کے کسی قول کو اساس بنا کر ہمت اور حوصلہ بڑھا کا درس دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوچن چاؤ کی کہانی "سمندروں میں طویل سفر"، چانگ ڑی کی کہانی "پہرہ دار سنتری" اور وانگ ین چی کی کہانی "معمولی مزدور" وغیرہ لیکن اس سارے منظرنامے کے پیچھے چینی کہانی (حکایت) کی مضبوط روایت بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ مثلاً قدیم چین کے مشہور فلسفی وی لی کی حکایاتِ لذیذ۔ وی لی کو چین کا سعدی شیرازی کہنا چاہئے۔

ہووان چن (افسانہ: پیاسی بلی)، نویان موہونگ لیانگ (افسانہ: چوہا) شیہ سونگ دین (افسانہ: دو گوریلے)، ہی چن چو چین (افسانہ: البم)، وانگ کوانگ دین (افسانہ: گھاس کا سفر)، کاؤ فنگ کو (افسانہ: تدبر کند بندہ)، ہو کانگ (افسانہ: زنگ آلود کیل) ماؤتن (افسانہ: خزاں کی کھیتی)، ہوشو (افسانہ: پرچھائیاں)، چینگ تین ای (افسانہ: گنبد) فینگ سنگ (افسانہ: چقل کی دیوار)[1] نے تکنیکی اعتبار سے روسی افسانے کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی سطح پر ناہمواری کے باوجود موضوعات اور نظریہ سازی کی مطابقت تھی۔

نئے لوگوں میں (مثلاً شن چن سن، رشی سین لینگ اور کاؤ یاؤ چیان) افسانے کے جدید رجحانات تلاش کرنا مشکل نہیں رہا۔ جس کا سبب امریکی، فرانسیسی، جاپانی اور ہندی کا چینی زبان میں ترجمہ ہونا ہے۔

**ترکی ادب:-** ۱۸ویں صدی کی ابتداء کے ساتھ ہی ترکی حکومت نے بہ امر مجبوری یورپی اقوام کو مذہبی اور قانونی تحفظات کے ساتھ ساتھ تجارت کے لیے منڈیاں فراہم کر دیں۔ معاشی اور سیاسی سطح پر اس خرابی میں خیر کی صورت بھی پیدا ہوئی اور یوں ۱۸ویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی ترکی ادب مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ خود ہمارے ہاں مغربی علوم اور افکار براستہ ترکی وارد ہوئے اور فکری سطح پر منظرنامے کی اس وسعت نے نت نئے مباحثوں کے ذریعے مشرقی عوام کو چوتھے گھونٹ کے سفر پر آمادہ کر لیا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ خود ترک دانشور اس نتیجے پر پہنچے کہ مشرقی روایات و افکار مغرب کے مقابلے میں چھنے کی سکت نہیں رکھتے، اس لیے مغربی چال چلن اختیار کرنے میں ہی بہتری ہے۔ سو ۱۷ء میں مغربی علوم خصوصاً طب، طبیعات اور جغرافیہ کے تراجم بڑی تعداد میں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی پر فرانس کا غلبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ترکی میں ترجمے کی ابتدائی کتب سعید محمد بن چلبی کے اولین چھاپہ خانے (قیام: ۱۷۲۷ء) سے چھپ کر سامنے آئیں۔[2]

ابراہیم شناسی آفندی (۱۸۲۴ء - ۱۸۷۱ء) پہلا ترک ادیب تھا جس نے ترکی فیبل اور فرانسیسی ادب کے تراجم شائع کروائے اور یوں عثمانیوں کے دورِ حکومت میں زبان و ادب کے ساتھ برتی جانے والی غفلت کا ازالہ کیا۔ یوں زولا، بالزاک، فلابیئر اور ستاں دال کے ترجمے ترکی زبان میں ہوئے اور ضیاء پاشا نے روسو کی "ایمیل" کا ترجمہ کیا۔

---

[1] یہ تمام افسانے "نیرنگ خیال" راولپنڈی چینی افسانہ نمبر۔ اپریل مئی ۱۹۶۸ء میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

[2] سعید محمد نے یہ چھاپہ خانہ ہنگری کے ایک نومسلم ابراہیم متفرقہ کے ساتھ مل کر قائم کیا تھا۔ یوں ترکی میں چھاپہ خانے ۱۵۰۷ء سے کام کر رہے تھے لیکن شیخ الاسلام کے فتوے کے مطابق صرف اہلِ یہود اور عیسائی مذہبیات سے متعلق ہی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔

[redacted]

**روسی ادب :-** [illegible] مقابلہ میں اجتماعی سے ایک خاص [illegible] ادب [illegible] کے تاریکی زبان و ادب تک نام کی کوئی شے تھی ہی نہیں ۔ مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر رہتے تھے اور ایک علاقے کے لوگ ادب کی صحت مند روایت سے بالکل بے تعلق تھے۔ نیز ایک دوسرے سے رابطہ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کئی علاقے ایسے تھے جو سارے کے سارے دیہی علاقے کے سبب ملک اپنے تکمیلی عمل سے ناآشنا تھیں ۔ قبیلے قبیلوں سے جدا اور علاقے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے اور بیشتر حاکم نیا ہی بیسیوں الجھنوں میں بٹ کر رہ گئی تھیں ۔ روسی انقلاب کے بعد ان کو ہم آہنگ بنانے کا سوال سب سے اہم مسئلہ بنا۔ روسی زبان و ادب کے اثر انداز ہونے کی تاریخ پر نگاہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تاملی شاعری فرغانی اور ترکمانی شاعری کو نکھار بخشا جبکہ تاجکی ادب نے ازبکستان اور ترکمانستان پر اپنے اثرات چھوڑے اور ایرانی تہذیب کی معرفت جارجیا اور آذربائیجان کے ادب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔

روسی ادب کا اثر یوکرینی ادب پر بہت گہرا رہا ہے اور اس کے بدلے میں یوکرین کے ثقافتی منظرنامے نے روسی ادب کو بھی بہت کچھ دیا، جس کا سب سے بڑا ثبوت گوگول کی تخلیقات ہیں۔

مجموعی طور پر روسی ادب، ادبیاتِ عالم سے کٹ کر رہنے کے باوجود اپنے طور پر ہی محدود نہیں رہ گیا کہ وہاں مختلف النوع علاقائی تہذیبوں کے باہمی میل ملاپ نے ادب کی کونپل کو ہرا رکھا۔ اس ضمن میں پشکن کی کوششوں خصوصاً روسی تعبیر کو نیا ادب دینے کی مہم اور اس سلسلے میں ماضی کی تاریخ اور لسانی روابطوں کی طرف توجہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی پشکن کا منظوم ناول ایوگنی اونیگن تھی جسے روسی عظیم ناقد ویساریان بیلنسکی نے روسی زندگی کا انسائیکلوپیڈیا کہا تھا۔

عوامی انقلاب کے بعد قومی سطح پر زبان و ادب کی ترویج کا کام بڑے پیمانے پر ہوا جس کی ۱۹۱۷ء سے قبل کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آتی۔ مثلاً جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں غیر روسی زبانوں میں صرف تین کتابیں شائع ہوئیں جبکہ ۱۹۳۹ء تک ان کی تعداد ۲۲۳ تک پہنچ گئی۔

ڈرامہ نگار حمزہ نے ۱۹۲۱ء میں شہرت پائی۔ وہ ایک تو ازبکی شاعر لیاکا فسکی کی شعری روایت کو پروان چڑھا رہا تھا اور دوسری طرف شیکسپیر اور مولیئر کی فنی روایتوں سے اثر قبول کر رہا تھا۔ اس عہد کے دیگر اہم مصنفین مثلاً آرمینی ادیب زاریاں، کازکی ادیب ثابت اور ترکمانی ادیب جارجی نے گورکی کے اثرات کے تحت لکھا۔ ثابت نے اپنی سوانح عمری گورکی کی MY CHILDHOOD سے متاثر ہو کر لکھی، جو "کازکی ادب" میں اولین "شیئیت پسندانہ" تحریر ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح غفوری نے اپنی مشہور کہانی THE GOLDFIELDS OF A POET گورکی کے تتبع میں لکھی۔ آرمینی مصنف زاریاں کے ناول KHATSABAN کا مرکزی کردار لیون، گورکی کی ناول "ماں" کے کردار پاول کے زیرِ اثر جنم لیتا ہے۔

یہ روسی زبان و ادب کا عالمی منظرنامے سے کٹ کر رہتے ہوئے خالصتاً قومی بنیادوں پر پیدا ہونے کا مختصر خاکہ ہے، لیکن کون جانتا تھا کہ صنف افسانہ گوگول کے "اوور کوٹ" سے برآمد ہوگی اور روس کی پشکن، گورکی اور ٹالسٹائی کے بعد چیخوف بھی عالمی ادب پر حکمرانی کریں گے؟

**یونانی ادب :-** یونان کو مشرق اور مغرب کا سنگم کہنا چاہیئے، اس لیے کہ یونان نے تراجم کے ذریعہ مشرق اور مغرب کے درمیان پل کا کام لیا۔

یونان کے قدیم ترین نثری قصے MILESIAN TALES ارسطو کے ایک گمنام شاگرد کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ یونان میں اول اول رومانی قصوں کی ابتدا تھی۔[1] ڈرامہ نگار ایس کائی لیس ACSCHYLUS کی پیدائش ۵۲۵ قبل مسیح کی ہے۔ اسی ڈرامہ نگار کے ڈرامے پرومیتھیوس کی طرز پر شیلے نے ۱۸۱۸ء میں "پرومیتھیوس زنجیر بستہ" انگریزی میں لکھا۔ اینٹونیس ڈایوجینس AMTONIUS DIOGENES کا ڈینیاس DINIAS اور ڈرسائلس DERCYLLIS کا چوبیس ابواب پر مشتمل قصہ اور دوسری صدی عیسوی میں دو داستان

---

[1] EVERY MAN'S انسائیکلوپیڈیا - جلد نہم - ناول کے باب میں۔

... لوسین LUCIAN اور لوسیس LUCIUS کے اثرات قصہ گوئی کے باب میں مغربی یورپ کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

یونان کے دو عیسائی مصنفین (۱) ہیلیو ڈورس HELIODORUS اور (۲) ایک گمنام مصنف نے قصہ گوئی کو مذہبی روایات کے ساتھ باہم ایک کرکے مسیحی رہبانیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنا دیا۔ یونانی قصے کی یہ نئی کروٹ عالمی سطح پر توجہ کا مرکز بنی۔ یہی وجہ ہے کہ گمنام مصنف کا قصہ "برلام اینڈ جوزافٹ" BERLAM AND JOSAFHAT قرونِ وسطیٰ کی عیسائی دنیا میں تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہوا۔ خود مغربی یورپ کی رومانی زبانوں میں قصہ گوئی کی ابتدا ہی اس یونانی قصے کے زیرِ اثر ہوئی۔ [1]

زبانوں کے اس باہمی لین دین کا سلسلہ قدیم وقتوں سے چلا آ رہا ہے۔ دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدے کا سب سے بڑا اور قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے بقول ابوالکلام آزاد:

"غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطونِ جدید NEOPLATONISM نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اشراقی عمارتیں استوار کیں۔" [2]

**لاطینی امریکہ اور اسپین کا ادب:-** جس طرح ۹ ویں صدی عیسوی سریانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت سے عربی زبان میں تراجم کی صدی شمار ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں صدی (۱۱۰۵ء تا ۱۲۸۰ء) کا زمانہ عربی سے لاطینی زبان میں ترجمے کا زمانہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اسپین میں عربی، لاطینی اور فرانسیسی زبانیں خوب پھول پھل رہی تھیں۔ اس دور میں اطالوی عالم اور مفکر جیرارڈ آف کریمونا (م ۱۱۱۴ء – ۱۱۸۷ء) نے اسّی ضخیم کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیں۔ جن میں خوارزمی کی کتاب "حساب الجبر والمقابلہ"، بطلیموس کی "المجسطی"، ابوبکر رازی کی "سر الاسرار"، بوعلی سینا کی "قانون الطب"، جابر ابن افلاح کی کتاب "کتاب الحیات"، ابوبکر رازی کی "الطب المنصوری (۱۰ جلدیں)"، خوارزمی اور البتانی کی "زیج" یادگار ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ابن ماجہ اور ابن بیطار عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ ابوبکر رازی کو لاطینی زبان میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ سمجھا گیا، یہاں تک کہ اطالوی مفکر جیرارڈ کے تراجم کے بعد بادشاہِ وقت چارلس آف آنجو کے حکمِ خاص سے ۱۳ ویں صدی میں بھی رازی کے افکار کو ترجمہ کیا گیا۔ ان دنوں کی پوری دنیا میں رازی RHAZE کے نام سے مشہور تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ جرمن مفکر ہمبولٹ نے کہا تھا کہ:

"عربوں کو طبیعیاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیے۔" [3]

۱۹ ویں صدی میں لاطینی امریکہ کی آزادی کے ساتھ وہاں ناول کی صنف نے ظہور پایا لیکن سوائے برازیل کے ناول نگار MACHADO ASSIS اور کولمبیا کے ناول نگار جارج ایزک کے وہاں کے دیگر ادباء نے کسی اور زبان کا اثر قبول نہیں کیا۔ جارج ایزک کا ایک ناول MARIA (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) فرانس کے ناول نگار برناڈ ڈی سینٹ پیرے کے ناول POUL ET VIRGINIE کے زیرِ اثر لکھا گیا۔

البتہ ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک لاطینی امریکہ کا ادب ہسپانوی، انگریزی اور فرانسیسی ادب کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کے ممالک میں یا تو ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے یا انگریزی۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ لاطینی امریکہ کی آبادی سراسر اسپین اور برطانیہ کے نوآبادکاروں پر مشتمل ہے۔

۱۹ ویں صدی کا زمانہ لاطینی امریکہ میں بین الاقوامیت کے وسیع تر دائرے سے نکل کر نسبتاً محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنی شناخت کے مراحل طے کیے۔ البتہ اس زمانے میں بھی روبیو لوگالیگاز، ماریا نوانڈ نیلا اور سائرو الیگریا نے انگریزی اور فرانسیسی ادب کے اثرات

---

[1] یہ زبانیں لاطینی کی شاخیں ہیں جن میں سے اطالوی، پرتگالی، ہسپانوی اور فرانسیسی نے بعد میں چل کر باقاعدہ زبانوں کا روپ دھارا۔

[2] بحوالہ "غبارِ خاطر" ص ۲۲۲ مکتبہ میری لائبریری لاہور۔ طبع چہارم ۱۹۶۶ء۔

[3] بحوالہ "نویدِ فکر" از سبطِ حسن، مکتبۂ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ ص ۹۱۔

[illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible] امریکہ کے جس [illegible] یعنی [illegible] کیبزی (نوبل انعام ۱۹۷۰ء) اور گبرائیل گارشیا مارکیز (نوبل انعام ۱۹۸۲ء) کا ادب سے ایک دنیا واقف ہے۔ بلکہ یہ وہ ادب ہے جس نے بیسویں صدی میں تراجم کی روایت کو نئے انداز کے ساتھ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ لاطینی امریکہ کا ادب گوئٹے اور ولیم شیکسپیر کے ادب سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن تراجم کے اثرات کے تحت اس سے الٹ صورت حال بھی دیکھنے کو ملی۔ ترانا لیما نے اپنے ناول PARADISO میں جو کچھ کیا جو جدیدیت کے علمبرداروں نے جاپان کے ساتھ کیا تھا یعنی جونز کیل اور پال موراند نے ایشیا، لاطینی امریکہ (خصوصاً ہسپانوی زبان) اور افریقہ کے ساتھ کیا۔ ترانا لیما نے قدیم ناول مارسل پروسٹ اور بائرن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، جونز کیل اور پال موراند کے انداز میں یورپ اور ایشیائی ثقافت کی تاریخ کو تہذیب اور ادبی سرمایہ کو اپنی تصنیف PARADISO میں مسخ کر کے رکھ دیا۔ دوسری طرف کارلوس فیونتس کے ناولوں نے یورپ کو متاثر کیا اور مارلو فیونتس، مارکیز اور کیبزی نے لاطینی امریکہ کے ادب کو عالمی تناظر کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہی سبب ہے کہ آج کا یورپی ناقد ایڈمنڈ ولسن کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ "آئیے لاطینی امریکہ کے ناول [illegible] ناپسندیدہ ہیں"۔

انگریزی ادب[1] یورپ میں صنف افسانہ پر نگاہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا اٹلی کے بوکاچیو کی تقلید میں ہوئی۔ جبکہ بوکاچیو نے ۱۳۵۳ء میں سو افسانوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جو بڑی حد تک الف لیلہ کے زیر اثر تھا۔ یہی سبب ہے کہ انگریزی ادب کے ہر دور میں مشرقی داستانوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ خصوصاً انگریزی میں عربی کے اثرات اس دور میں نمایاں ہونے شروع ہوئے جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں مشرق اور مغرب میں بحیرہ روم تک پہنچ گئیں۔ جزیرہ سسلی میں غالب خاندان کے زوال کے بعد بھی سسلی کی ادبی اور علمی زبان، یونانی اور لاطینی کے دوش بدوش عربی رہی۔ سسلی کے حکمران راجر کے میر منشی رابرٹ سسلی نے انگریز ادبا کے لیے دربار میں جگہ پیدا کی اور یوں عربی سے انگریزی میں ترجمہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ اسی دور میں یوجینی نے عربی زبان سے "کلیلہ ودمنہ" کو یونانی زبان میں منتقل کیا۔

چاسر نے اٹلی میں رہ کر بوکاچیو کے قصے "ڈی کامرن" کے انداز میں اپنی مشہور تصنیف CANTERBURY TALES مکمل کی جب کہ "ڈی کامرن" کے قصے "الف لیلہ" کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ اسی تسلسل میں شیکسپیر کا ڈرامہ ALL IS WELL THAT ENDS WELL آتا ہے جو ترجمہ در ترجمہ کی تیسری پشت ہے یعنی ڈی کامرن کا چربہ ہے۔

چاسر نے اسطرلاب پر بھی ایک رسالہ قلم بند کیا جس کا نام "بچوں کے لیے دودھ اور روٹی" تھا۔ یہ رسالہ یکسر عرب مصنف ماشاء اللہ کی کتاب "اسطرلاب" سے ماخوذ ہے اور چاسر کا قصہ THE PARDONER الف لیلہ کا ایک باب محسوس ہوتا ہے۔

راجر بیکن کی علمی تصانیف کی بنیادیں اسلامی فلسفہ اور سائنس پر استوار دکھائی دیتی ہیں۔ فرانس کے علاوہ "ٹروبادور" کے اشعار جو TROUBADOR شاعر کے نام سے مشہور ہیں یکسر اسی روایت کی ایک کڑی محسوس ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں اندلسی شعراء کے موضوعات اور عروض کے اوزان کے ساتھ عرب اسلامی اصطلاحیں بھی برتی گئیں۔

انگریزی زبان کے اولین رزم نامے BEOWULF (۷ ویں صدی عیسوی) کے اشعار کی تقسیم صدر اور عجز کا انداز لیے ہوئے ہے جو عربی ادب سے مستعار ہے۔ اسی نوع کا علمی ترکہ مارکو پولو نے اپنے مشاہدات کی شکل میں چھوڑا ہے۔ بعینہ اسی نوع کے اثرات کا مطالعہ انگریز سفر نامہ نگار مانڈویل کے ہاں کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی ادب کے دو مشہور زمانہ قصے SEVEN SAGES OF ROME اور FLORIS AND BLANCHER بالترتیب لاطینی متون اور "الف لیلہ" کا چربہ ہیں۔ ولیم شیکسپیر کا ڈرامہ THE TAMING OF SHREW الف لیلہ کے قصے "قمر الزمان" کا چربہ ہے

---

[1] دیکھیے "انگریزی افسانہ نویسی کی مختصر تاریخ پر ایک نظر" از محمد دین تاثیر مطبوعہ "مخزن" افسانہ نمبر اگست ستمبر ۱۹۲۹ء

ڈرامہ OTHELO کا سارا پلاٹ الف لیلہ سے ماخوذ ہے اور ڈرامہ "میکبتھ" میں عرب داستانوی کردار "زرقا" کی پرچھائیں توجہ چاہتی ہیں۔ کچھ یہی معاملہ شیکسپیئر کے ہمعصر ادیبوں کا بھی ہے مثلاً کرسٹوفر مارلو کے ڈرامے "تیمور لنگ" کا سارا منظر نامہ ایران اور ترکستان سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا مشہور ہزلیہ "کیمیادان" ALCHEMIST نہ صرف عرب علاقوں سے متعلق ہے بلکہ عربی تصانیف کا اثر صاف پہچانا جاتا ہے۔ ڈریسڈن کے ایک ڈرامے کا نام ہی "فتح غرناطہ" ہے۔ ڈرائیڈن کے ڈرامہ DANE SEBASTIAN کا سارا منظر نامہ مراکش سے متعلق ہے۔ ولیم کونگریو کے ڈرامے MOURNING BRIDE کا منظر نامہ اندلس سے متعلق ہے اور اس میں عرب داستانوی کردار اپنی نمایاں پہچان رکھتے ہیں۔

شیلے کے قصیدہ A TRANSLATION FROM THE ARABIC میں عنترہ العبسی کی سیرت کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ ٹینی سن کے قصیدے LOCKSLEY HALL میں عربی قصائد کی ایک طویل بحر اور مطلع / تشبیب کا انداز سراسر عربی ادب سے مستعار ہے۔ جبکہ دوسرے قصائد مثلاً RECOLLECTION OF ARABIAN NIGHTS اور AKBARS DREAM میں اندلس کی تاریخ اور اسپین کا منظر نامہ توجہ چاہتا ہے۔ اسی طرح سودے، اسکاٹ، ہینٹ، لینڈور اور براوننگ کی تصانیف میں عربی حکایات اور دیگر مشرقی قصوں کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

۲۰ویں صدی کے یورپی اور امریکی ادب میں ایک ایسا دور آیا جو ادبیات کے تراجم کے اثرات کے تحت اسلوبیاتی سطح پر یورپی اور امریکی ادب کو سینکڑوں کروٹوں سے ہمکنار کر گیا۔ اسے ۱۹ویں صدی کی "جدیدیت" کے فوراً بعد فرانس، روس، جرمنی اور برطانیہ میں نوال پذیر ادیبوں کے اثرات کا نتیجہ بھی کہنا چاہئے اور ۲۰ویں صدی کی آواں گارد تحریک کا اثر بھی۔

"آواں گارد اسکول" کے راہنما ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ۱۹۲۲ء میں جس والہانہ انداز میں آئرلینڈ کے جیمز جوائس کی کا خیر مقدم کیا اور دنیا بھر کے غیر وابستہ ادیبوں نے جس توجہ سے ایلیٹ کی آواز کو سنا وہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا اس میں ادب کے اثر پذیر اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو دخل ہے۔ جوائس کے ULYSSES کے بعد وہی طرز (جسے اپنانے پر ایلیٹ نے زور دیا) روسی ناول نگار BORIS ALNYAK کے ناول "برہنہ سال" THE NAKED YEAR میں دیکھنے کو ملا۔ پھر برطانیہ کے آلڈس ہکسلے نے اپنے ناول POINT COUNTER POINT میں اس تجربہ کو دہرایا۔ THE NAKED YEAR کا اثر جان داس کے ناول 42ND PARALLEL پر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ہاضمین کے ناول SER GOLDENE TOPE میں ایک کردار ڈاکٹر انکیٹن اسی راہ پر چل نکلا جس کا اولین سراغ ULYSSES میں ملتا ہے۔

لہٰذا مختلف زبانوں سے اثر پذیری اس حد تک بڑھی کہ ۲۰ویں صدی کی آواں گارد تحریک میں نئے ناموں کو یکسر رد کیا جانے لگا، اور یہی وہ زمانہ ہے جب ارنسٹ ہمینگوے کو دریافت کیا گیا۔ ہمینگوے کے علاوہ اس دھند سے دیگر کئی چہرے منظر عام پر آئے مثلاً امریکہ کے ولیم فاکنر، اسکاٹ، تھامس وولف۔ برطانیہ کے تھامس ہارڈی، اور جان کوپر۔ روس کے پرشون، نیورو اور آئی کاتا یود وغیرہ یہ تراجم ہی کا اثر ہے کہ آئرلینڈ کے دن زینے (لارڈ) کے ڈراموں کی خوابناکی اور رومانیت برطانیہ، روس، امریکہ اور فرانس سے ہوتی ہوئی خود ہمارے ہاں توجہ کا مرکز رہی۔

**فرانسیسی ادب:-** ۱۶ویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ٹنڈل اور کوورڈیل TYNDALE & COVERDALE نے انجیل مقدس کے تراجم کے ساتھ ترجمے کی تحریک شروع کی تھی۔ فرانس اور برطانیہ میں انہی تراجم کے زیر اثر مذہبی اور قومی موضوعات نے ادب میں جگہ بنائی اور ہر دو زبانوں میں عیسائی مذہب سے متعلق اہم دستاویزات کو بڑی تعداد میں ترجمہ کیا گیا۔ فرانسیسی شاعر دلیبارتاس DU BARTAS نے اسی زمانے میں طویل مذہبی نظم جیوڈتھ JUDITH مکمل کی جو ۱۵۷۴ء میں چھ جلدوں میں منظر عام پر آئی۔

۱۸ویں صدی عیسوی کا فرانس دنیا بھر کی ادبیات کے تراجم کے سبب مختلف اصناف ادب اور فلسفے کی نت نئی موشگافیوں کے باعث

یادگار ہے۔ اسی صدی میں روسو، دیدرو، والتئر، مونتسکو اور بوفون نے عالمی شہرت پائی۔ روسو نے بطور فلسفی اور والتئر نے بطور فلسفی، مؤرخ اور معاشرتی ناقد کے خود ہمارے ہاں کے ادیبوں کو متاثر کیا جبکہ ١٩ویں صدی کا فرانسیسی ادب اپنی منفرد حیثیت میں ساری دنیا کے ادب کو متاثر کر گیا۔ لامارتین، وکٹر ہیوگو، الفریڈ دی وینی، بودلیئر، ورلین، رامبو اور ملارمے کے اثرات سے کوئی بھی مشرقی یا مغربی زبان نہ بچ سکی۔

٢٠ویں صدی کے فرانسیسی علامت ساز شاعروں خصوصاً والیری، ورلین اور ملارمے کے تراجم نے دنیا بھر کے ادب کی کایا پلٹ دی خود ہمارے ہاں ن۔م۔ راشد اور میراجی ایک حد تک براہِ راست اور عمومی طور پر ایرانی ادب میں تراجم کی معرفت علامت نگاری کی اس عالمگیر تحریک سے متاثر ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب ٢٠ویں صدی کے نصف آخر تک خود فرانس میں اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا تھا ہمارے نثر نگار بڑی شدومد کے ساتھ علامت نگاری کی طرف آئے۔ انتظار حسین کا افسانہ "آخری آدمی" آئنسکو کے ڈرامے گینڈے کے زیر اثر تخلیق ہوا۔ جب خالدہ حسین نے افسانہ "ہزار پایہ" لکھا تو مغربی ادب میں اس قبیل کا کام پختگی کے عروج پر تھا۔

مختصراً یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا بھر کی زبانوں اور ادبیات کی حد بندیاں ٹوٹ گئیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کو اس وقت کے ادب کی دھڑکنوں میں سنا جا سکتا ہے۔ گو اس حوالے سے جاپانی، جرمن اور روسی ادب نے عالمگیر شہرت پائی لیکن اس خصوص میں فرانس کے لوئی آراگوں کو ٢٠ویں صدی کا عظیم تر شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

پرل ایس بک کی GOOD EARTH اور ولیم سرویاں کی THE HEUMAN COMMADY جیسی لازوال تخلیقات کے تراجم کی معرفت بننے والی زنجیر نے ادبیاتِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ✿



حمید الماس

## فیصلے سے پہلے

میری نظمیں مر رہی ہیں
منجمد ہے خون
لفظوں کا تنفس گھٹ رہا ہے
مضمحل ہے آگہی کی روح

میرے روبرو
طرزِ ناقدری کا شکوہ ہے لبوں پر
عالمِ بحران میں
خودکشی پر بھی ہوں میں مائل مگر
روکتا ہے ایک ملکوتی پرندہ
پھڑپھڑا کر اڑ گیا ہے جو مرے سینے سے
پھر وہ لوٹ کر آئے گا
مجھ سے خودکشی ممکن نہیں
صبحِ فردا پر ہے
میرے فیصلے کا انحصار

## تفاوت

اُس نے کب کہا مجھ سے
میرا ہر سخن گویا
حرفِ برگزیدہ ہے
جب وہ مجھ کو پڑھتا ہے
یہ فخر کہتا ہے
فکر یوں تو تازہ ہے
اور اس کو چمکاؤں
اُس کے لفظ مصنوعی
میرے حرف اصلی ہیں
پھر بھی نقشِ ثانی سے
مطمئن نہیں ہوتا
اُس کی گفتگو مٹی
میری خاموشی سونا

## آخری حد

زندگی
کتنے مدارج سے چلی
مسکرائے کیسے کیسے کارناموں کے گلاب
کس طرح ہارے
کبھی
رہ گئی پاؤں میں کانٹوں کی چبھن
زندگی
تاریخ کا پہلو سہی
کس طرح دہرائیں
اپنے کارناموں کو
محبت کی طرح

● ۹۲۲، اوپری منزل، ۲۰ ویں سڑک، نواب بلاک جے نگر، بنگلور۔



ست پرکاش سنگر

۲۸۰۔ ڈی، ۹۲۰۰۴ سیکٹر، چنڈی گڑھ

# سحر کہاں

"آپ نے استالین کی لڑکی کی کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں، پرچا، سوویت لانا کی۔" ڈاکٹر دیو نے وعدہ کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کہانی سننے کے لئے آرام سے بیٹھنا پڑے گا۔"

"آرام! عورت اور آرام دو متضاد باتیں ہیں۔"

"سب بیویاں یک زباں ہو کر ایسا ہی کہتی ہیں۔ چاہے دن بھر مکھیاں ہی مارتی رہیں۔"

"یہ بھی ایک کام ہے اور مرد کی اوقات کے باہر۔"

"تو کہانی سننے کا ارادہ نہیں؟"

"سنانے کا ارادہ ہے؟"

"اگر آرام سے بیٹھ کر سناؤں۔"

"بیٹھ جاتی ہوں، آرام کا وعدہ نہیں کرتی۔"

"تمہاری مرضی۔" ڈاکٹر دیو نے بیوی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

کسی کتاب میں پڑھی ہے کہانی؟ پرچا نے پوچھا۔

"نہیں۔ اخبار میں۔"

"اخبار کی کہانیاں بھی قابلِ یقین گردانی جاتی ہیں کیا؟"

"جو واقعات پر مبنی ہوں وہی کہانیاں۔ یہ ایک انٹرویو ہے جو نیویارک ٹائمز کے روس میں مقیم سابقہ نمائندے ریمانڈ اینڈرسن نے سوویت لانا سے کیا تھا اور کل کے ٹائمز آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ انٹرویو صحیح واقعات پر مبنی ہو؟"

"یہی تو ان لوگوں کی خوبی ہے۔" ڈاکٹر دیو نے فخریہ انداز سے کہا جیسے اینڈرسن اس کا خصوصی دوست اور اس کی اپنی برادری کا رکن ہو۔ "یہ لوگ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ واقعات بیان کرنے میں پوری ایمانداری برتتے ہیں۔ اسی پر ان کی اپنی اور ان کے اخبار کی عزت اور شہرت کا مدار ہوتا ہے۔"

"تو سنائیے کہانی، اینڈرسن کی زبانی۔"

"۱۹۶۷ء میں سوویت لانا نے فیصلہ کیا کہ وہ روس چھوڑ کر ہندوستان میں بسنا پسند کرے گی۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا بھی اُسے پسند نہ آئی اور وہ امریکہ چلی گئی اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی۔ پندرہ سال کے طویل عرصے میں، اُسے امریکہ میں مقیم، اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی طرف سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ اسے اکثر اُن کی یاد ستاتی۔ لیکن اپنی تڑپ کو وہ اندر ہی دبا لیتی۔ کر بھی کیا سکتی تھی؟ کوئی دوسرا چارہ بھی نہ تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ لڑکے لڑکیوں کی طرف سے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ اپنی ماں اور بہن اولگا سے ملنے کے لئے ان کا دل بے تاب ہو اٹھا۔ ان کے ساتھ ملاقات کا اشتیاق جاگ اٹھا۔ جذبات بھرے اُن خطوط کو پڑھ کر سوویت لانا کا دل قابو سے باہر ہو اٹھا۔ اس نے امریکی شہریت کو خیرباد کہہ کر ملک واپس جا کر، پھر سے وہاں بسنے کا عزم راسخ کر لیا۔ روسی سفارت خانے نے اس کی عرضداشت کو فوراً منظور کرتے ہوئے اُسے روس واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اولگا جو کہ انگلینڈ کے ایک اسکول میں پڑھتی تھی، اسکول اور تعلیم کو خیرباد کہہ کر، ماں کے ساتھ اپنے آبائی وطن واپس چلی گئی۔

پندرہ سال کی طویل مدت کے بعد بیٹے کے لڑکیوں کی ماں سے ملاقات ایک عظیم سانحہ ہے۔ ایسے نازک موقع پر سالہا سال سے دبے ہوئے جذبات کا شدت کے ساتھ ابھرنا، اور اُن کی رو میں بہہ جانا ایک فطری امر ہے۔ روسی سماج میں جذبات کا ایسا مظاہرہ ناشائستگی کے مترادف ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سوویت لانا نے روسی سفارت خانہ کو تجویز کیا تھا کہ بیٹے کے ساتھ ملاقات ہوٹل کے کمرے میں مناسب رہے گی۔ مقررہ دن اور وقت آنے پر وہ اپنے کمرے میں اُن کا انتظار کرنے لگی۔ ماں کے دل میں بیٹے اور بہو، لڑکیوں اور نواسوں سے ملنے کی تمنا موجزن تھی جس میں لمحہ بہ لمحہ شدت آتی جا رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی میں سے اس نے بیٹے اور بہو کو ہوٹل کا صدر دروازہ پار کرتے ہوئے دیکھا۔ ماں کا دل دھک دھک کرنے اور پوری شدت کے ساتھ چھاتی سے ٹکرانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں لان کی طرف بڑھتے

ہیں۔ ہوٹل کے اندر داخل ہونے کے بجائے وہ دونوں لان میں کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ ان کے اشارہ پر بیرا ان کے لئے وڈکا لایا اور دونوں اس طرح شراب پینے لگے جیسے کئی دنوں کے پیاسے ہوں۔ اسی طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگے جیسے مدت بعد بچھڑے ہوئے پریمی ملے ہوں۔ بیرے نے انہیں ہوٹل کے کرہ کے اندر انتظار کرتی ہوئی ماں کی یاد دلائی۔ انہوں نے بیرے کی بات اَن سنی کرتے ہوئے باہمی گفتگو جاری رکھی۔ ماں کا دل اور بھی تیزی سے اُچھلنے لگا اسے اپنی چھاتی کی دیوار چیر کر پار کر جانے کا خدشہ ہوا۔ لیکن حالات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان دونوں نے سوبت لانا کے کمرے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ووڈکا کی دو بوتلیں ختم کر کے وہ دونوں کرسیوں پر سے اٹھے اور صدر دروازہ پار کر کے ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ اسی وقت ہوٹل کے بیرے نے سوبت لانا کی طرف ایک تار بڑھا دیا۔ لڑکی نے اس میں لکھا تھا کہ "وہ اور چھوٹی بہن اُن سے ملنے کے لئے نہیں آئیں گی"۔ اس نے اپنے دل پر ہتھوڑے کی مسلسل ضرب پڑتی محسوس کی۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ لڑکے لڑکیوں اور نواسوں سے ملاقات کی امید ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ رُوس میں از سر نو رہائش کے ارادہ کو مستقل طور پر ترک کر کے سوبت لانا، اولگا کے ساتھ واپس امریکہ لوٹ گئی۔

پربھا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"اس لئے میں نہیں یہ کہانی سنانے سے گریز کر رہا تھا۔"

ڈاکٹر دیو سامنے دیوار پر نظریں لگاتے ہوئے بولے "تم اسے سننے کے لئے بضد ہو گئیں پربھا! وہ آہ کھینچ کر کہنے لگے۔ "یہ دنیا بھی خوب ہے" یہاں کس شخص پر کیا گذرتی ہے کسی کو بھی نہیں معلوم، ہر کوئی دوسرے کو خوش نصیب اور آسودہ حال تصور کرتا ہے اور اس کی زندگی پر رشک کرتا ہے۔ ہمارے بارے میں بھی لوگ طرح طرح کی باتیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہوں گے۔ اصلیت اور واقفیت کو جاننے والے کہاں ہوتے ہیں!"

اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔

انہیں اپنے لڑکے کی یاد آ گئی جو ایم۔ بی۔ بی ایس کی ڈگری لینے کے بعد انگلینڈ چلا گیا تھا۔ پانچ سال بعد جب وہ والدین سے ملنے آیا تو انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی کیساتھ اسکی شادی کر دی۔ شادی بھی خوب ٹھاٹھ باٹھ سے ہوئی تھی۔ لڑکی کے والدین نے بارات کی خاطر تواضع میں ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بھاری جہیز دیا۔ لڑکی کے نام بیس ہزار کا چیک بینک میں جمع کروا دیا۔ گہنے کپڑوں کا تو حساب ہی نہ تھا۔ لیکن انگلینڈ روانہ ہونے سے قبل لڑکی نے سارا روپیہ باپ کو لوٹا دیا۔ جہیز کا سامان، کپڑے، گہنے وغیرہ سبھی کچھ واپس کر دیا۔ اُن کے ہاں یہی رواج تھا۔ ڈھنڈورا پیٹ کر جہیز دیا جاتا اور خاموشی سے واپس لے لیا جاتا تاکہ دوسری لڑکی کی شادی پر کام آ سکے۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اینٹی جہیز قانون کے خوف سے لڑکے والے شور بھی نہیں مچا سکتے اور خاموش ہو جاتے۔

اوورسیز کی پوسٹ پر ساری زندگی رہنے کے باوجود اس کے سمدھی نے بینک بیلنس خوب بڑھایا تھا۔ تین مکان بھی بنوا لئے تھے۔ اسی سبب کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، لڑکوں اور بہوؤں کو بھی نہیں۔ جب دو بڑی بہوؤں نے ساس کے بے جا رعب کو ماننے اور غلامانہ زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا تو لڑکوں اور ان کی بیویوں کو گھر سے نکال دیا گیا۔ ڈاکٹر دیو کے لئے یہ ایک حیران کن واقعہ تھا۔ زندگی کی اقدار کے متعلق دونوں کے نظریوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رام دھن، رام میں نہیں، محض دھن میں یقین رکھتا تھا، من کی دولت کی اہمیت کو جاننے اور سمجھنے سے وہ عاری تھا۔ وہ تن کی دنیا کا پرستار، اور اس کے سود و زیاں کا اطاعت گذار تھا۔ دونوں کی شخصیت ایک دوسرے کے متوازی تھی۔ حساس ہونے کے سبب ڈاکٹر دیو سمدھی سے شاذونادر ہی ملاقات کرتا۔ اس کے گھر جانے سے کتراتا۔ سمدھی ان کے گھر منعقد کی جانے والی کسی بھی تقریب میں شمولیت سے انکار کرتا۔ جب بہو کی سب سے چھوٹی بہن کی شادی پر ان کے گھر سے دعوت نامہ آیا تھا تو ڈاکٹر دیو نے اُسے نظر انداز کر دیا تھا۔ سمدھی جی نے اسے ناقابلِ معافی ذاتی توہین سمجھ کر اور اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر ایک طویل خط کے ذریعہ اپنی لڑکی تک پہنچا دیا۔ خط کو پڑھ کر بہو رانی کا پارہ چڑھ گیا۔ خاوند کو بیوی سے اتفاق رائے کرتے ہی بنی۔

آخر کار وہ دن آ پہونچا جس کا ڈاکٹر دیو اور پربھا مہینوں سے انتظار کر رہے تھے۔ لڑکے اور بہو کا استقبال کرنے کے لئے وہ دونوں پالم ہوائی اڈے پر پہنچے لیکن لڑکا اور بہو اس دن نہیں آئے۔ لڑکی نے اپنے والدین کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ وہ ایک ماہ بعد آئیں گے۔ لیکن ڈاکٹر دیو کو اس کی کوئی اطلاع نہ تھی ڈیڑھ ماہ بعد اُسے اپنے لڑکے کا خط ملا کہ وہ پندرہ دن قبل انگلینڈ سے آئے تھے اور دو دن بعد واپس جا رہے ہیں۔ اور اگلے دن وہ بیوی کے ساتھ والدین سے ملنے کے لئے آیا۔ معمول کے خلاف اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ لڑکے اور بہو کو دیکھ کر والدین بے حد خوش ہوئے، لیکن یہ خوشی فوراً ہی کافور ہو گئی۔ سامان سے خالی دیکھ کر وہ تاڑ گئے کہ سسرال سے آ رہے ہیں۔

"کب آئے؟" افسردہ دل سے باپ نے پوچھا۔

"پچھلے ہفتہ"

"اطلاع تو دی نہیں۔"

کوئی جواب نہ ملا۔

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے]




انیس رفیع

اے۔ آر خان، آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ۔۱


# اوکھلی

مالک آرام کرسی پر گرا ہوا تھا۔ مالکن کہیں کسی اور صوفے پر۔ مالکن کس صوفے پر ہو سکتی ہے۔ رکمنی اس پر زیادہ زور نہ دے سکی۔ بس اس نتیجے پر پہنچی کہ مالک پل کے اس پار اور مالکن اُس پار۔

اس پار یا اُس پار۔ مالکن اور مالک کے پاس فیصلے ہیں۔ پل کے اِس پار یا اُس پار۔ مگر اس کے پاس۔ کس پار ہے وہ! پل کے اس پار یا اُس پار؟!

دونوں طرف مالکن ہیں۔ دونوں طرف مالک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک طرف یہ ننگے ہیں تو ایک طرف چیتھڑوں میں! وہ کچے فرش پر پاؤں کا انگوٹھا لگاتار رگڑ رہی تھی۔ اس پار آکر ایڑیوں کو ذرا آرام حاصل ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے وہ دونوں پار سے غائب ہو گئی۔ نہ دھنیا نہ مالک!

پیر کے انگوٹھے ان زخموں کی یاد دلا رہے تھے۔ جب مکھیا جی نے اسے اِس کی مٹی کی کھولی سے بے دخل کر دیا تھا۔ کس کڑاکے کی سردی تھی اس رات!

وہاں بھی ایک مالک تھا۔ ایک نوکر بھی تھا اُس مالک کے پاس۔ اور وہ ایک داسی! مگر مستقل تنخواہ دار نہیں تھی۔ جب جب مالک کو ضرورت ہوتی وہ حاضر کی جاتی۔ شادی کے چار سالوں میں تین لاغر بچوں نے دم توڑا۔ مگر وہ کسی طرح دم بچائے رہی۔

مٹی کی کھولی بھی بچی رہی۔ یہ ادنیٰ سا تحفظ اِسے اِس لیے میسر تھا کہ مالک اور اس کے درمیان ایک اور غلام وفاداری کی پونچھ ہلا ہلا کر فرش کی پتھریلی زمین کو صاف کرتا رہتا تھا۔ رکمنی چاہتی تھی کہ اِس وفاداری میں اگر اس کی بھی ساجھے داری ہو جائے تو اس کا اس بار کا بچہ لاغر نہیں ہوگا اور موت سے بھی بچ جائے گا۔

یہ سوچ کر اُس نے مالک کے گھر کچھ زیادہ ہی آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ مالک کے خاندان والے پہلے تو بہت خوش ہوئے۔ مالکن کے بچوں کے دودھ کی کٹوری دھونے والی ایک اور مل گئی تھی۔ وہ اُن کی کٹوریاں دھوتے دھوتے ہلکان ہو گئی۔ مگر وفاداری میں ساجھے داری کی اُمید کہیں سے نہیں جھلک رہی تھی۔ بلکہ کبھی اس کے زیادہ آنے جانے سے وہ مشکوک ہو جاتی۔ کئی طرح سے۔ جیسے مالک کچھ اور شک میں مبتلا ہوتا۔ مالکن کچھ اور۔ وفادار نوکر اسے تیسرے زاویے پر رکھتا۔ سبھی اپنے اپنے زاویے پر۔ کبھی کبھی وہ نڈھال ہو جاتی کام کرتے کرتے۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ کام کے بعد اُسے مالکن کچھ دے ہی دے۔ مستقل نوکر تو نہ تھی۔ کھانا ملا، ملا، نہ ملا۔ مگر پھر بھی وہ لگی رہی کہ ایک نہ ایک دن مالکن مہربان ہو گی۔ اگلا بچہ جاڑے میں آئے گا۔ شوہر اگلی بیساکھ میں۔ تب تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمی گزر گئی۔ برسات کا موسم بھی بدل گیا۔ مگر مالکن کے دل کا موسم نہ بدلا۔ پیٹ میں بچہ چلنے لگا تھا پر بدن پر کھال اور مسکی ہوئی ساڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔

سردی دھیرے دھیرے صندوق سے سُوتی چادر، اُونی چادر، سُوتی کمبل، اُونی کمبل۔ دلائی، رضائی نکلواتی جا رہی تھی۔ اور اُس کے پاس بچی کھچی اپنی گرمی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ پھر بھی اُسے اُمید تھی کہ بچہ دھان کی فصل کے ایک مہینہ بعد ہو گا۔ تب تک وہ مالک کے کھلیان میں دھان پیٹنے کی مزدوری کر کے کچھ نہ کچھ کر لے گی۔ کم از کم ایک وقت کا پیٹ بھر کھانا اور تاپنے کے لیے پوال۔

دھان کی فصل آتے ہی اِدھر اُدھر حسبِ معمول اناج کی چوری کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کھلیان دار اپنے اپنے اناج کے ڈھیروں پر نشان لگانے لگتا اور نشان گڑبڑ ہوا کہ چوری ہوئی۔ ایسے میں

بڑے گرہست کے بچے بڑے ناک ہو جاتے۔ ان کی آنکھیں کوٹنے پیٹنے والوں پر بڑی طرح نعباؔ رہتیں۔ مجال کیا کہ ایک دانہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ رکمنی بھی کوٹنے پیٹنے پر معمور تھی۔ مگر اوروں کے مقابلے میں یہ زیادہ اناج نہیں پاتی۔ کیوں کہ وہ تین چوتھائی طاقت اُنے والے بچے پر صرف کرتی۔ ایک چوتھائی سے کیا کمائے۔ کیا کھائے۔ بس کسی طرح اپنی اپنی زندگی کو کھینچ رہی تھی۔ دن بھر پٹائی میں مشغول رہتی تو جاڑے کا احساس نہیں ہوتا مگر شام ڈھلے جب کام نہ ہوتا تو اُس میں کپکپی سی ہونے لگتی۔ سردی اور بھی سخت ہونے لگی۔ کما کر جو پوال حاصل کرتی اُس کا جلاون ہو جاتا۔ تاپنے کے لیے آگ کہاں سے آئے۔ رات کیوں کر کٹے۔

ادھر چار دنوں سے رات نئے لوگوں کو رکمنی کے گھر سے موسل کوٹنے کی آواز سے ملی تھی —— دھم ادھم۔ دھم، دھم!

لوگوں کا شک بڑھتا جا رہا تھا۔ کہاں سے لاتی ہے۔ اتنا دھان۔ اور رات گئے تک کوٹتی ہے۔ وفادار نوکر کی دُم میں اِس بات پر گدگدی ہونے لگی۔ وہ دُم جھاڑ کر اِس بات کے پیچھے پڑ گیا۔ پیچھے پڑنے کی اس کی عادت پرانی تھی۔ مگر رکمنی کئی معاملوں میں بہت سخت گیر تھی۔ ساجھے داری کی کوشش اُس نے ضرور کی تھی پر مالک، مالکن کے سامنے گڑگڑائی نہیں تھی اور اُس غلام سے نہ اُس نے کسی رعایت کی بھیک مانگی تھی اور یہی بات اِس وفادار کو کھٹکتی رہی تھی۔

جب موسل کی آواز رات میں اٹھنے لگی تو وہ مالک کے بچوں کو جگا کر اس کے گھر کے پاس پہنچ جاتا۔ "سنا۔ یہ آواز اپنی تو صرف آپ کے کھلیان میں ہے۔ پھر اتنی ڈھیری اُسے کہاں سے مل جاتی ہے کہ رات بھر کوٹے۔"

ایک صبح کھلیان کے اناج کی ڈھیری کا نشان گڑبڑ ملا۔ سب کی نظریں رکمنی کی طرف اٹھنے لگیں۔ مگر اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اپنے کام میں لگی رہی۔

جب رات موسل کی آواز رکمنی کے گھر سے پھر اٹھنے لگی تو گاؤں کے مکھیا جی کی آواز سنائی پڑی —— "کیا ہو رہا ہے اندر؟" رکمنی گھر سے باہر آئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے ماتھے پر۔ ادھ ننگے بدن پر پسینے کی بوندیں چمچما رہی تھیں۔

"کیا ہو رہا تھا، کیا کوٹ رہی تھی؟"

"کچھ نہیں؟"

"معلوم ہے۔ مالک کے کھلیان سے اناج کمی ہو رہا ہے"۔

"ہاں معلوم ہے"

"ادھر کھلیان سے کمی ہو رہا ہے اور اُدھر تمہاری اوکھلی بھرتی جا رہی ہے۔ چل ہٹ سامنے سے تلاشی لیں گے۔"

مکھیا جی تلاشی لے کر باہر نکلے تو اُن کے ماتھے پر پسینے تھے۔ وفادار نے پوچھا —— "کتنا ملا، مکھیا جی؟" "ایک دانہ بھی نہیں۔ اوکھلی میں صرف موسل تھی، دانا ایک بھی نہ تھا۔"

"سچ سچ بتا کیا کوٹ رہی تھی؟"

"بتایا تو کچھ بھی نہیں"

"وہ تو ٹھیک ہے پر اوکھلی میں موسل برسنے کی آواز، دھم، دھم، دھم، دھم، وہ کیا ہے؟" "ہاں وہ ٹھیک آواز ہے۔ جب بہت زیادہ سردی لگنے لگتی ہے، مکھیا جی! تب دیہ گرمانے کے لیے خالی اوکھلی میں موسل مارنے لگتی ہوں، دھم، دھم، دھم، دھم، جاڑا بھاگ جاتا ہے مکھیا جی!" مکھیا جی کے ماتھے پر جیسے پسینے کی برسات ہو گئی اور ماتھے کے بھیتر موسل کی مار۔ دھم، دھم، دھم، دھم۔ پھر مکھیا جی نے آنکھیں لال کیں اور کہا —— "پر گاؤں کا فیصلہ ہو گیا ہے تو جو ہے۔ تو اپنے مرد کے پاس شہر چلی جا۔"

اور وہ شہر آ گئی۔ اور آج پل کے اس پار ہے۔ مالکن اب تک لاپتہ تھی۔ مالک آرام کرسی پر خراٹے لے رہا تھا۔ سب کے سب اس پار یا اُس پار جا کر بسیرا کر چکے تھے۔ مگر رکمنی اب بھی اس سوال کے سامنے کھڑی تھی کہ "کس پار" پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔ یا ایک فیصلہ خود اُس کے پاس کہیں سے آ گیا۔ مالکن کا دیا ہوا پیس گلے سے نوچ کر پھینکا اور مالک کی توند پر ایک لات ماری۔ پھر! نہ اِس پار۔ نہ اُس پار۔ بیچ پل پر ہی گھر بنایا جائے!!!

---

## زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جنوری ۱۹۸۷ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لیے مبلغ ۴۰ روپئے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدیدِ خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی۔ بھیجنے کی ہدایت کریں۔



نشتر خانقاہی

# قدم قدم آشوب

قلبِ مجروح میں جذبات کا محشر خاموش
دوپہر اور نشیمن میں کبوتر خاموش

مور یہ رات اور عالم سپر اندازی کا
اسلحے اپنے جھکائے ہوئے لشکر خاموش

اپنی تقدیر پہ روتے ہوئے ریگ جلے
زیرِ الفاظ سمندر کا سمندر خاموش

تابِ اظہار کی لذت کو ترستا غصہ
فرطِ جذبات میں بدلے ہوئے تیور خاموش

سنگ باری کی ہر اک زخم گواہی گویا
راستہ راستہ بکھرے ہوئے پتھر خاموش

گھر کی دہلیز پہ نیندوں کے فرشتے ساکت
ان گنت خواب ادھر آنکھ کے اندر خاموش

بند دروازے پہ ساکت متوقع دستک
فرشِ تنہائی پہ لیٹا ہوا بستر خاموش

منصدوں کے لئے گلزار خدا کی بستی
آسمانوں پہ بہت دور پیمبر خاموش

دستِ امروز سے فردا کی امیدیں غائب
دل سے نیچے کو لگائے ہوئے اور خاموش

تیز سنگیت سے مجروح کی چیخیں نادم
شور ابوہ میں بازار کا منظر خاموش

ذرے ذرے میں دمکتا ہوا سورج حیراں
بیچ آکاش کے مہتاب منور خاموش

واقعے ہاتھ کے باہر پہ تمسخر جیسے
دستِ لرزاں کی ہتھیلی میں مقدر خاموش

ڈور چاہت کی پہیلی کی طرح الجھی ہوئی
لب کے سامنے تصویر کا دل بر خاموش

عمر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کا رکنا معلوم
گھر کی انگنائی میں بیٹھی ہوئی دختر خاموش

رزق کے قحط سے کردار کا بحران سوا
ہم جو خاموش تو امکان کا دفتر خاموش

سب کی مٹھی میں ہیں الفاظ کے کھوٹے سکے
دیکھ یہ شہر منافق ہے سخنور خاموش

[redacted]

دیارِ رنگ ہوا ہے دھواں دھواں ایسا
کوئی فساد زدہ شہر بے اماں! ایسا

ہمارے پاس ہماری نشانیاں بھی نہیں
ہوا نہیں تھا کسی عہد میں زیاں ایسا

مری صدا کو رسائی کی آرزو ہے ابھی
میں اک دعا کی طرح ہوں، وہ آسماں ایسا

شگفتِ لب کہ ترنم کا پیش خیمہ سا
فروغِ حرف، حوالے میں کہکشاں ایسا

ملا تو ایسے کہ جیسے شرار تشنہ ہو،
گیا تو شعلۂ سیراب سے دھواں! ایسا

نشانِ قدم کے کہاں بیچ میں ہوئے غائب
خلا نہیں تھا تسلسل کے درمیاں ایسا

ہوا نہ اب کے جو ترکِ وفا پہ آمادہ
دیارِ عشق میں ہے کون صاحباں ایسا؟

محلہ جاناں، بجنور (یوپی)

# آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے لیل و نہار

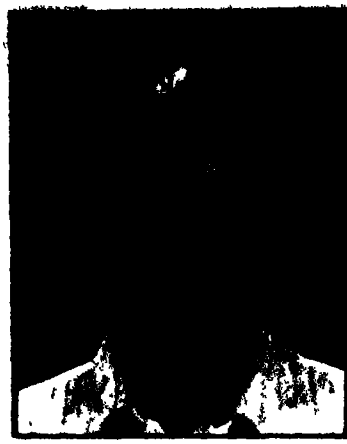
## سال ۸۶ — ۱۹۸۵ء

| | |
|---|---|
| تشکیل جدید | ۱۲ اگست ۱۹۸۵ء |
| مطبوعات پر انعامات | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریاست کی (۵۴) بہترین تصانیف نظم و نثر مطبوعہ ۸۲، ۸۳، ۸۴ء کو انعامات دیے گئے۔ |
| طلبہ و طالبات کو میرٹ اسکالرشپ | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریاست کے، ساتویں جماعت سے ایم اے تک کے سرکاری امتحان میں کامیاب (۱۵۹) طلبہ و طالبات کو اردو مضمون میں میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دیے گئے۔ |
| سمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کے انعقاد کے لیے اداروں کو امداد | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۸) اداروں کو سمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کے لیے امداد دی گئی۔ |
| شاعروں، ادیبوں صحافیوں وغیرہ کو علاج معالجہ کے لیے امداد | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں اردو کے (۵) ممتاز شاعروں، صحافیوں، فن کاروں، ادیبوں اور دانش وروں کو علاج و معالجہ کے سلسلے میں امداد دی گئی۔ |
| لائبریریوں کو امداد | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۶۴) عوامی کتب خانوں اور لائبریریوں کو بہ شکل کتب امداد دی گئی |
| رسائل اور جرائد کو امداد | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۷) علمی، ادبی رسائل اور جرائد کو امداد دی گئی۔ |
| اشاعتی پروگرام | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء تلگو اور اردو زبان و ادب کے مابین باہمی ارتباط کے اہم مقصد کے پیش نظر تلگو کے ایک مشہور ناول کے اردو ترجمہ "روشنی سائے" کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ |
| شعراء کی عزت افزائی اور مشاعرہ | سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں یکم نومبر، یوم تاسیس آندھرا پردیش کی سرکاری تقاریب کے ساتھ زیر اہتمام اردو اکیڈمی، حکومت کی طرف سے ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا، اس موقع پر ریاست کے (۱۶) شعراء کی عزت افزائی کی گئی۔ گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے شرکت کی۔ |
| مہمان شعراء اور دانشوروں کا خیر مقدم | ایک پُر اثر تقریب میں روس، پاکستان اور ملک کے مہمان شعراء اور دانشوروں کا اردو اکیڈمی کے دفتر میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک محفل شعر بھی منعقد کی گئی۔ |

*

محمد خلیل الرحمن
ڈائرکٹر و سکریٹری۔

۹۳۷-۴-۱۱ اے سی گارڈز
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ (اے پی)



بشر نواز

بتوسط: ایس این خان۔ بی۔ اے۔ ایم۔ جی۔ اے۔ او بمبئی

# ندا فاضلی — اپنے لہجے کی دریافت

سُسرو سے نوجوان مقرر نے کہا "میں ہُو بہُو آپ کے لہجے میں تقریر کر سکتا ہوں۔" "بہتر ہوتا تم اپنے لہجے میں بات کر سکتے" یہ سُسرو کا جواب تھا۔ اپنے لہجے کی دریافت دراصل اپنی شخصیت کی دریافت ہے۔ اور سُسرو یہی نکتہ اپنے نوجوان شاگرد کو سمجھانا چاہتا تھا تخلیقی عمل اپنی تلاش و جستجو کا فنی اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر تخلیق کار کو اپنا اندازِ اظہار خود دریافت کرنا پڑتا ہے۔ دریافت کا یہ عمل پیچیدہ بھی ہوتا ہے اور اکثر بھٹکانے والا بھی۔ پیچیدہ یوں کہ اس میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عوامل ماضی و حال کے نئے رشتے کی تعمیر اور اس رشتے کے جمالیاتی توازن کے مراحل ہیں اور بھٹکانے والا یوں کہ اکثر تخلیق کار اجتہاد کے شوق میں ہیئت پرستی اور لفظی کرتب بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ اپنے لب و لہجہ کی تلاش کا عمل شخصیت کے شعور کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جہاں یہ شعور اس تلاش میں شامل نہیں ہوتا، وہاں زبان فیشن زدہ چمک دمک سے ضرور آراستہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں زندگی کی حرارت نہیں پیدا ہوتی۔

ندا فاضلی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے ان کرتب بازیوں اور لفظی کلیشیز میں

[جنہیں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں 'مکتبی قسم کے نقادوں کا اعتبار حاصل تھا۔]

الجھے بغیر اپنا لہجہ پا لیا ہے۔ وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اور اپنے انداز و اسلوب سے جدید شاعروں کی بھیڑ میں الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر لہجے اور اسٹائل کی کچھ تحدیدات ہوتی ہیں۔ یعنی ہر موضوع ہر لہجہ میں پوری طرح اپنا اظہار نہیں پا سکتا۔ مثلاً کسی پیچیدہ فلسفیانہ موضوع کے لیے سیدھا سادھا انداز ناکافی ہوتا ہے اسی طرح کسی ہلکے پھلکے جذبے کے بیان کے لیے بھاری بھرکم الفاظ مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر کسی حد تک صحیح ہوتے ہوئے بھی مکمل صداقت نہیں ہے موضوع اور لہجہ کا یہ تفاوت فنکارانہ بصیرت کی کمی کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور صرف انہیں لوگوں کے لئے مسئلہ بنتا ہے جو اپنا اسٹائل اپنی شخصیت کے شعور سے اخذ کرنے کے بجائے کتابوں اور پیشرو فن کاروں کے فنی نمونوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری کے یہاں اب جو فیض کے اندازِ اظہار کی تقلید نمایاں ہے۔ وہ شخصیت کے اسی شعور کی ناپختگی کی غماز ہے۔ کسی شاعر کے الفاظ یا تراکیب کی نقل تو ممکن ہے لیکن الفاظ کے پیچھے جو روح کارفرما ہوتی، وہ بنا شخصیت کے رچاؤ کے آسانی سے گرفت میں نہیں آتی۔

شخصیت ہی اسلوب ہے۔ موضوع کا انتخاب شخصیت ہی کے تابع ہوتا ہے اس لیے موضوع اور اسلوب میں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فنی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ بھی سطحی معلوم ہوتا ہے کہ پیچیدہ موضوع صرف پیچیدہ ہیئت اور نامانوس زبان ہی میں اظہار پا سکتا ہے۔ دراصل ہیئت و زبان کا پیدا کردہ الجھاؤ موضوع کی تہہ داری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اکثر اوقات تہہ داری کا واہمہ پیدا کر کے گمراہ کر دیتا ہے۔ کئی جدید شاعر اس گمراہی کے اب تک شکار ہیں۔ وہ لفظوں کے لغوی الجھاؤ کو تہہ داری سمجھنے کی بھول کرتے ہیں۔ ندا فاضلی کے ہاں الفاظ کے غیر ضروری ہیر پھیر کے بجائے جذبہ و احساس کی تہہ داری ملتی ہے۔ ان کے سیدھے سادے الفاظ

کے پیچھے سوچتے ہوئے ذہن کی اور تہہ در تہہ احساسات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے اشعار معنوی اعتبار سے وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں لفظ ختم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کے ہاں الفاظ مکمل معنیٰ دینے کے بجائے احساساتی امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں اور احساس کی شدّت معنوی تہہ داری بن جاتی ہے۔

زندگی انتظار جیسی ہے ؎ دور تک رہ گذار جیسی ہے

یا

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی ؎ سیدھی نہیں ہے دور تک الجھی ہوئی ہے زندگی

یہاں انتظار اور رہ گذار کا تلازمہ ایک نئی معنوی جہت کو جنم دیتا ہے۔ اور جب زندگی انتظار بن جاتی ہے تو رہ گذار عام راستہ نہیں رہ جاتا بلکہ کسی غیر مرئی کیفیت کا احساس دلاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں "پہلے بھی جیتے تھے" اور "جب سے ملی ہے زندگی" کو شخصی معنیٰ دیے گئے ہیں۔ 'جیتے تھے' اور 'زندگی' کے معنوی تضاد سے جو وسعت اور                ابھرے ہیں، وہ بھی شدتِ احساس کا ہی جادو ہے۔

ندا فاضلی کے پاس احساسات کی تجسیم اور اشیاء کو غیر مرئی یا غیر مرئی جذبوں کو اشیاء کا روپ دینے کا رویّہ عام ہے۔ چنانچہ کبھی زندگی ایک آنکھ سے ہنستی اور ایک آنکھ سے روتی نظر آتی ہے۔

یہاں انہوں نے گریک دیوتا جینوس کو زندگی کی علامت بنایا ہے۔

کہیں موسم چہرے بن جاتے ہیں، کبھی خواب ستاروں کا روپ لے لیتے ہیں اور کبھی خدا کسی پھول، کسی پنچھی، کسی بچے کے تبسم میں مجسم ہو جاتا ہے۔ ندا کی زبان تصویری ہے۔ یہ لوک بھاشا کا وہ ارتقائی روپ ہے جس کے ابتدائی نقوش برج، اودھی اور کھڑی بولی کی بھگتی شاعری میں ملتے ہیں۔

ایک سے ہو گئے چہرے یوں کہ موسم کے سہارے ؎ مری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا
کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے ؎ ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا
بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو ؎ چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

جس طرح بجلی کے مثبت اور منفی کرنٹ کو ایک تار کے ذریعہ ملانے سے روشنی پیدا ہوتی ہے اسی طرح ندا کے ہاں دو متخالف احساسات و جذبات فن کاری کے ان دیکھے رشتے سے جڑ کر معنوی حیکا چوند پیدا کرتے ہیں۔ یہ کیفیت قدیم شعری صفت اجتماعِ ضدین سے یوں مختلف ہے کہ ان میں اشیاء یا احساسات کو ان کے ظاہری روپ میں نہیں بلکہ باطنی کیفیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ یہاں محض تضاد سے معنی جنم نہیں لیتے بلکہ بہ یک وقت پیدا ہونے والی نفسیاتی شعریت شعر کی بنیاد بنتی ہے۔

- اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اجالا دے گی۔
- ہر چمکتی قربت میں کوئی فاصلہ دیکھوں۔
- نیند میں بھی وہ جاگتا ہی ملا۔
- کوئی بادل چھپا تھا تشنگی میں۔
- جیون شور بھرا سناٹا۔
- ابکے جو گھٹائیں چھائیں برسات میں جل کر دیکھیں۔

موضوعاتی اعتبار سے یہی رویّہ زندگی کے تضادات کی طرف ندا کو متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظم "جنگ" جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اور جنگ کے بعد کے سکون میں جنگ کی ہولناکی اپنا احساس دلاتی ہے۔

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

جنگ
بے گھر
بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے
ذرہ ذرہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا کھنکتی چوڑیوں کا روپ لے کر
بستی بستی ڈولتی ہے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک جنگ گھر گھر بولتی ہے

زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد "والد کی موت پر ایک نظم" میں ایک نئی اور غیر متوقع جہت اختیار کرتا ہے اور زندگی کے تسلسل کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں موت ہر چیز کا اختتام نہیں بنتی بلکہ ایک سلسلہ در سلسلہ سفر بن جاتی ہے شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم و ضبط کے لحاظ سے اردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لیے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں

یہاں زندگی شکل اور جسم کے حدود توڑ کر وسیع تر تناظر میں نظر آتی ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ ایک خاص ترتیب پاکر نظم کا تانا بانا بنتے ہیں اور نظم مصرعوں میں نہیں بلکہ پوری اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے۔ زندگی اور موت کے فلسفہ پر عام طور پر بھاری بھرکم ڈکشن استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے ندا فاضلی کے ہاں ڈکشن مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں حرارت اور رجان کتابی صداقتوں کے بجائے نجی تجربے یا کبیر داس کے لفظوں میں "آنکھوں دیکھو

سو لگ بھگ سے آتی ہے۔ اس لیے اس میں لفظ کہیں بھی احساس یا خیال پر حاوی نہیں ہونے پاتا۔

دراصل ندا کا اسلوب بڑا دھوکہ دینے والا ہے۔ انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے :

"لائبریریوں میں محفوظ زبان نے عہد کی غیر محفوظیت کے لیے ناکافی ہے، اس زبان کو تخلیقی سطح پر فعال بنانے کے لیے، اسے کتب خانوں سے باہر نکال کر دوبارہ گلی کوچوں، کوٹھوں، چائے خانوں اور بھیڑ بھاڑ سے متعارف کرانا چاہیے"۔

ندا اپنی زبان وہاں سے اٹھاتے ہیں جہاں سے شائستہ ادیبوں کا گذر ہمیشہ ممنوع رہا ہے۔ کبیر داس اور نظیر کو اس جرم کی سزا برسوں بھگتنی پڑی۔ ندا فاضلی بھی انہیں ادبی کے گروہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ زبان کے تعلق سے یہ رویہ ندا کی طاقت بھی ہے کمزوری بھی۔ طاقت یوں کہ عام بول چال کے الفاظ قاری کو فوری متوجہ کر لیتے ہیں اور کمزوری یوں کہ انہیں الفاظ اور انداز اظہار کی وجہ سے اونچے آسن پر بیٹھنے والے شاعر کی تہہ در تہہ احساسات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ یہ مصنوعی تزئین اور موروثی آرائش کو ہی شعری زبان سمجھتے ہیں

مثال کے طور پر ندا کے ہاں ایک لفظ "گھر" بار بار استعمال ہوا ہے :

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں — دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

پہلے ہمیں بھی نیند نہ آتی تھی گھر سے دور — اب جس جگہ بھی رات پڑی تھک کے سو گئے

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے — ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

چار دیواروں پہ گھر باندھ کے جب وہ اترا
جسم تھا اس کا
پسینے سے شرابور مگر
اس کو آرام کی مہلت نہ ملی
شہر تو بعد میں ویران ہوا ہے مرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

(نئے گھر کی پہلی نظم)

یہاں گھر صرف چار دیواری اور چھت کا ہی نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ جس میں سکون، تحفظ کا احساس اور تنظیم ہے۔ ندا فاضلی کے ہاں "گھر" کی نوعیت دیگر شاعروں سے مختلف ہے۔

ندا نے اپنے گھر کو دو بار کھویا ہے۔ پہلی بار اس سے یہ گھر سیاست کی چیرہ دستیوں نے چھینا تھا : جس کا ذکر ندا نے اپنے پہلے مجموعہ "لفظوں کا پل" کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اور دوسری بار بہت دنوں کے بعد جب وہ کراچی گیا تو اُسے اپنے ہی گھر میں اپنا گھر نہیں ملا۔

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا اپنے گھر پہونچا
لیکن اب میرے گھر میں
میرا گھر کہیں نہیں تھا

(گھر ستارہ)

یہ بے گھری ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی ہے۔ بے گھری کے اس احساس کو جب ہم خدا کے تصور سے ملا کر دیکھتے ہیں تو بات زیادہ واضح اور واشگاف انداز میں سامنے آتی ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں — کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

یا
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
مسجدوں میں سجدوں کی شمعیں ہر شب روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں
(انتقام)

یہ خدا ہے جو ایک جیتے جاگتے معلوم سے معاشرے کی ہر ہر چیز میں جلوہ نمائی کرتا رہا ہے۔ اس خدا کو آسمانی و صندلکوں میں [illegible] کے بجائے، ندا نے زمین پر سانس لیتے رشتوں میں تلاش کیا اور جو وحدانیت کے تصور خدا سے زیادہ قریب [illegible] جانے اور اس کے ساتھ انسانی فطری معصومیت کی دردناک موت کے بعد انسان ضرورت سے زیادہ تنہا اور بے خوف [illegible] آیا۔

یہیں تھا وہ
یہیں بچوں کی آنکھوں میں
لہکتے سبز پیڑوں میں
وہ رہتا تھا
ہواؤں میں مہکتا تھا
ندی کے ساتھ بہتا تھا
(خدا کا گھر نہیں کوئی)

تو کیا اب خدا قصۂ پارینہ بن چکا ہے؟ نہیں! آج کا انسان ہی اپنی بصیرت کھو چکا ہے۔ اس کی نگاہیں اب روشن نہیں رہیں۔ اس تیز رفتار اور تجارتی معاشرہ نے اس سے کائنات کے اندرونی روابط اور رشتوں کو دیکھ سکنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔

ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں
جو بہاڑی پر چمکتی بولتی آواز کو دیکھیں
ہمارے واسطے اب پھول کھلتے ہیں
نہ کوئیل گنگناتی ہے
نہ خاموشی اندھیروں میں سنہرے گیت گاتی ہے۔
ہمارا عہد ماں کے پیٹ سے اندھا ہے بہرا ہے
ہمارے آگے پیچھے موت کا تاریک پہرہ ہے۔
(خدا کا گھر نہیں کوئی)

گھر، خدا اور شہر، ندا فاضلی کی شعری رامائن کے تین کردار ہیں۔ اس تکون کا ڈرامائی منظرنامہ ہی اس کی شاعری [illegible] ایک طرف اپنے دور کی کوتاہیوں، محرومیوں کا احساس اور دوسری طرف اپنے خوابوں کی جیتی جاگتی دنیا کی آرزو ندا پر نہ صرف خواب اور حقیقت کے درمیان فاصلوں کو واضح کرتی ہے بلکہ اسے موجودہ زندگی کے اندرونی تضادات کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ یہ تضاد صرف ایک فنکار کی خیالی اور حقیقی دنیاؤں ہی میں نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ بھرے پُرے شہروں میں تنہائی کے احساس، دوستوں اور محبتوں کے کھوکھلے پن، روحانی اقدار کے زوال، اور تہذیبی استحصال کے ماحول میں زندگی کرنا آج کے شعور کا مقدر ہے۔

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ — دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے
تیرا سچ ہے ترے عذابوں میں — جھوٹ لکھا ہے سب کتابوں میں

لیکن ندا کی شاعری جدید شاعری کے عام چہرہ کی طرح ہر دم رونے بسورنے کی قائل نہیں ہے وہ زندگی کے درد و کرب کو زندگی کا مقدر نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے لہجے کا تیکھا پن اور طنزیا جھلاہٹ زندگی سے ریاکارانہ سمجھوتہ نہیں بلکہ اسے اپنے طور پر نہ بدل پانے کا غم بن کر ابھرتی ہے۔ اس غم میں خود فریبی کی جگہ خود آگہی کی چمک ہے۔ اس غم کا رشتہ ذات کے حدود سے باہر آکر دوسروں کے غموں سے جڑ جاتا ہے ؎

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو ــــ تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اس اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے مرنا ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ سمجھو زمیں پر محبت ہے زندہ
(شکایت)

ہمیں بھی شوق ہے اپنی طرح سے جینے کا ــــ ہمارا نام بھی کیجیے عتاب میں شامل

دنیا کو اپنے طور سے جینے کی یہ کوشش مزید زخموں اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں دے پاتی۔ زمانے سے کچھ دن کی دوستی تو ممکن ہے لیکن شعوری بلوغت کے ساتھ یہ زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے پاتی ؎

ہم ہیں کچھ اپنے لیے کچھ ہیں زمانے کے لیے ــــ گھر سے باہر کی فضا ہنسنے ہنسانے کے لیے

یہ جھوٹی اور دکھاوے کی ہنسی خود فریبی کی ایک اور کوشش ہے جس کا مقدر ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں چنانچہ ندا کے ہاں بھی ایک بار زندگی کو از سر نو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے ؎

اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اجالا دے گی ــــ رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی
گزرو جو باغ سے تو دعا مانگتے چلو ــــ جس پہ کھلتے ہیں پھول وہ ڈالی ہری رہے

شاعری جب اظہار کا وسیلہ بنتی ہے تو ہیئت، لفظیات اور فارمولوں کے حصار سے باہر نکل آتی ہے۔ اس لیے ہم کسی شاعر کے کلام کو لفظ بند میں دیکھنے کے بجائے اس کے تخلیقی عمل اور تخلیقات کو کل کی شکل میں دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہر سچے اظہار کے پیچھے ایک شخصیت کار فرما ہوتی ہے جو مسلسل تعمیر و تخریب کے رد و بدل سے گزرتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار فن میں ہوتا رہتا ہے۔ ندا کے ہاں اس کا احساس "لفظوں کا پل" کی زمینی قربتوں "مور ناچ" کے فرد اور سماج کے ٹکراؤ اور نئی نظموں اور غزلوں میں زندگی کو اپنے طور سے سمجھنے اور سمجھانے کے عمل میں ملتا ہے۔ اکثر صورتوں میں معنوی تبدیلیاں شاعر کی پسندیدہ ہیئتوں اور ڈکشن میں اندر ہی اندر سرایت کرتی رہتی ہیں۔ شاعر کا اسلوب اور انداز تو کم و بیش وہی رہتا ہے لیکن اس میں ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئی تہوں اور جہتوں کا اضافہ ہو جاتا ہے جسے عام زبان میں تہہ داری کہتے ہیں۔ ندا کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت اور سادگی ملتی ہے۔ بڑے شہر میں آنے کے بعد اس سادگی کا تصادم یہاں کے تجارتی تعلقات اور اس سے پیدا ہونے والی ریاکاری سے ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ندا کے ہاں جھنجھلاہٹ اور بہت تیزی سے لڑکھڑانے کا انداز جنم لیتا ہے۔ لیکن "ٹھوکر" سے اجالا کشید کرنے کے شعور میں پھر ایک نئی دنیا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس میں بھی ایک درد کے مارے ہیں تضادات، دکھ، درد یہاں بھی ہیں لیکن یہ کسی ایک فرد کا المیہ نہیں اسے ندا نے اپنی فنی سوجھ بوجھ سے اپنے المیہ کو پورے معاشرہ کا المیہ بنا دیا ہے۔

جو ملا خود کو ڈھونڈتا ہی ملا
ہر جگہ کوئی دوسرا ہی ملا

رشتوں کے ریگزار میں ہر سر پہ دھوپ ہے
ہر پاؤں میں سفر ہے مگر راستہ بھی ہو

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اٹھایا جائے
میرے حالات بھی اپنے ہی مکاں سے نکلے

غم نہیں سوتا آدمی کی طرح
نیند میں بھی یہ جاگتا ہی ملا

ندا کی نئی نظموں غزلوں اور گیتوں میں فکری کینوس بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں اطراف کے نقوش زیادہ واضح اور دلکش نظر آتے ہیں اور اس کے اشعار شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی انداز لیے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کی شاعری میں اب تیسرے ابعاد کا ایک خوش گوار اضافہ ہو رہا ہے۔

جو پائے وہ کھوئے اسے، جو کھوئے وہ روئے اُسے
یوں تو سبھی کے ساتھ ہے کس کی ہوئی ہے زندگی

ہر راستہ انجان سا ہر فلسفہ نادان سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

ہر اک تلاش یہاں فاصلوں سے روشن ہے
حقیقتیں کہاں ہوتی ہیں خواب میں شامل

ممکن ہے سفر ہو آساں اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں
کچھ تم بھی بدل کر دیکھو، کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں

نظر کی وسعت اسے زندگی اور زندگی کرنے کے ایک نئے انداز سے آشنا کرتی ہے۔ اور دنیا اسے قابل نفرت نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق نظر آتی ہے۔

یہ ہی زمین سفر ہے
یہ ہی زمیں منزل
نہ تم تلاش کرو مجھ میں جو نہیں ہوں میں
نہ میں تلاش کروں تم میں
جو نہیں ہو تم (جو نہیں ہو تم)

اس انداز میں ہاتھ ملاتے رہنے والی ریاکاری کی جگہ شعوری ہوشمندی محسوس ہوتی ہے۔ ندا کا شعری سفر ایک وسیع تر شاہراہ پر جاری ہے۔ ابتدائی شاعری کی جھلاہٹیں جیسے

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

اس قسم کے اشعار میں ممکن ہے فوری اپیل ہو۔ ممکن ہے یہ کسی واقعے کے فوری ردعمل کے طور پر بھلے لگیں، لیکن رک کر اور واقعات کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے والوں کے لیے ان میں ایک معصوم سی ناراضگی کے علاوہ کچھ نہیں، اگر ندا کا ذہنی سفر یہیں رک جاتا تو یہ بڑی ٹریجڈی ہوتی لیکن وہ اس موڑ سے صحیح سلامت گذر گیا۔ اب بھی قدم قدم پر حادثوں کا سامنا تو ہے لیکن اُن کے تعلق سے شاعر کا ردعمل فوری نہیں بلکہ سوچا سمجھا یا ورڈس ورتھ کے لفظوں میں سکون سے عبارت ہے۔

اس لحاظ سے اس کی شعری نظر ظاہر موجودات کے پیچھے کارفرما محرکات تک اترتی نظر آتی ہے۔ اب زندگی اسے صرف سیاہ اور سفید خانوں میں تقسیم نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس کے ہر دم بدلتے رنگوں کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے لہجے میں ایک مخصوص ٹھہراؤ ابھرتا ملتا ہے اس کے موضوعات آٹا گوندھتی یا کچن میں پیالی توڑتی لڑکی تک محدود نہیں رہے۔ ندا انسانی تعلقات کی پیچ در پیچ نوعیتوں کے ساتھ دوسروں کی الجھنوں اور مجبوریوں کے شعور کے ساتھ مختلف اصناف میں ایک ساتھ طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اب انہیں ایک آنکھ سے ہنستی اور ایک آنکھ سے روتی نظر آنے لگی ہے۔ یہ آنسو اور مسکراہٹ کا سنگم ہی ان کی شاعری کی پہچان ہے جس میں سارے عناصر ایک ہی زندگی کے مظہر بن جاتے ہیں۔

[باقی صفحہ ۴۹ پر دیکھیے]

ندا فاضلی

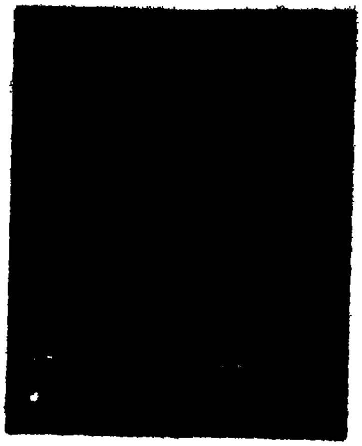
## کون بتائے

آؤ کہیں سے
تھوڑی سی مٹی بھر لائیں
مٹی کو بادل میں گوندھیں
چاک چلائیں
نئے نئے آکار بنائیں
کسی کے سر پر چٹیا رکھ دیں
ماتھے اوپر تلک سجائیں
کسی کے چھوٹے سے چہرے پہ
موٹی سی داڑھی پھیلائیں
کچھ دن ان سے جی بہلائیں
اور یہ جب میلے ہو جائیں
داڑھی، چوٹی، تلک، سبھی کو
توڑیں، پھوڑیں
گڈمڈ کر دیں
ملی جلی یہ مٹی پھر سے
الگ الگ سانچوں میں بھر دیں
داڑھی میں چوٹی لہرائے
چوٹی میں داڑھی چھپ جائے
کس میں کتنا کون چھپا ہے
کون بتائے

## میوزیم

[illegible]
ان گنت چھوٹے [illegible]
ہر اک [illegible] چہرہ
ہر اک چہرہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
کبھی [illegible]
کبھی [illegible]
کبھی [illegible]
ننھے چھپتے [illegible]
[illegible]
[illegible] میوزیم میں
[illegible] ہوتا ہے



[redacted]

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی
سیدھی نہیں ہے دور تک الجھی ہوئی ہے زندگی

اچھی بھلی تھی دور سے جب پاس آئی کھو گئی
جس میں نہ آئے کچھ نظر وہ روشنی ہے زندگی

جو پا سکے وہ کھوئے اسے جو کھوئے وہ روئے اسے
یوں تو سبھی کے ساتھ ہے کس کی ہوئی ہے زندگی

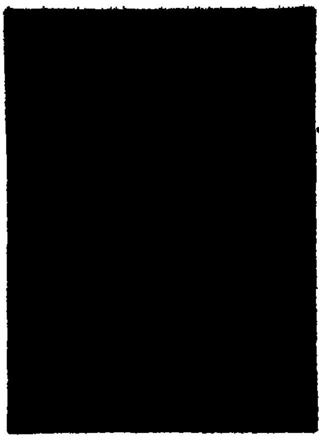
ہر راستہ انجان سا، ہر فلسفہ نادان سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ اک آنکھ سے روتی ہے یہ
جیسی دکھائی دے جسے اس کی وہی ہے زندگی

مٹی ہوا لے کر اڑی گھومی پھری واپس مڑی
قبروں پہ کتبوں کی طرح لکھی ہوئی ہے زندگی

# ایک تصویر کئی رنگ

[illegible]ی دھوپ
[illegible] شام کا روپ
[illegible]وں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب
[illegible] کا سچ
[illegible]وں کی کتاب
[illegible]ست میں پھیلے ہوئے معصوم گلاب
[illegible] کی مہک
[illegible] پانی کی کھنک
[illegible] آنکھوں کی چمک
[illegible] کو دیکھا تو یہیں ہے
لیکن،
میری تنہائی میں یہ رنگ برنگے منظر
جو بھی تصویر بناتے ہیں
وہ تم جیسی ہے



منظر الزماں خان

مکان نمبر ۲۵۶ ... بی، کاچی گوڑا حیدرآباد ...

# ایک اُداس دُوپہر کی کہانی

بڑی اُداس دوپہر تھی اور اس شدید رطوبت پیدا کرنے والی دوپہر میں وہ ایک اہم گفتگو کرنے کے لئے اپنے ایک دوست کے گھر چل نکلا تھا کہ اُس کے اندر کی تمام باتیں اُچھل اُچھل کر باہر نکلنے کے لیے مضطرب تھیں اور وہ اپنے اندر بھیسی ہوئی اُن تازہ اور باسی باتوں کو اپنے دوست کے آگے اُگل دینا چاہتا تھا جو لمحہ بہ لمحہ اُس کے ذہن پر بوجھ بنتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے ذہن کے اس بھاری بوجھ کو ہلکا کر دینے کے لیے اس شدید اور رطوبت پیدا کرنے والی تپتی ہوئی دوپہر میں اکیلا نکل گیا تھا اور قدم باز چلتا ہوا اپنے ایک دوست کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ گفتگو کو دیر تک دبائے رکھنا اب اُس کے بس کے باہر تھا کہ بظاہر وہ اوپر سے مجرد ہوا لیکن اندر سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس قدر ٹوٹا ہوا تھا کہ ذرا سی سنسناتی ہوئی نم ہوا بھی اُس کے وجود کو ایک خشک پتے کی طرح بکھیر دیتی تھی اُس کے اندر گرم آوازوں کا ایک ہجوم چھپا ہوا تھا جسے برداشت کرنے کی اب اُس میں طاقت نہیں تھی وہ تو بس ایک بُلبُلے کی طرح دریا کے بہاؤ کی زد میں تھا۔

چنانچہ جوں جوں وہ اپنے دوست کے گھر کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ الفاظ کا زخمی قافلہ بھی اُس کی زبان کے کنارے کنارے چل رہا تھا اور جب وہ اپنے دوست کے دروازے پر پہنچ گیا اور انگلی کال بل پر رکھ دی تو الفاظ زبان سے پھسل کر نئی سماعت میں گر جانے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن دیر تک بل بجانے کے باوجود اندر سے کسی قسم کی کوئی آہٹ ہوئی اور نہ کوئی جواب ہی آیا تو وہ مضطرب ہو گیا۔ تاہم بل برابر بجاتا رہا۔ اس اُمید پر کہ شاید اس تپتی ہوئی دوپہر میں تمام مکیں سو گئے ہیں اور کال بل کی آواز اُن کی نیندوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے کہ اگر وہ اُن کی نیندوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتی تو وہ یقیناً چلے آتے۔ اور یہی وہ اُمید تھی جو اُسے بل بجاتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن کتنی ہی دیر تک بل بجانے کے باوجود جب اُن کی نیندیں ٹوٹی نہیں تو وہ مایوس ہو کر اپنے ایک اور دوست کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا کیوں کہ اُسے بے حد اور انتہائی اہم باتیں کرنی تھیں۔ ایسی باتیں جو اُس شدید اور رطوبت پیدا کر دینے والی کڑی دوپہر سے زیادہ گرم تھیں اور وہ اُن تمام باتوں کو اپنے کسی بھی دوست پر اُگل کر ہلکا ہو جانا چاہتا تھا کہ گفتگو کا بوجھ اُس کے سر پر پہاڑ بن چکا تھا۔ اور پھر پہلے دوست سے دوسرے دوست کا گھر قدرے دور تھا اور دھوپ نے اُس کے سارے جسم میں اپنے دانت اُتار دئے تھے۔ پھر بھی وہ برابر آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا کیونکہ اُسے اس بات کا خوف تھا کہ اگر وہ ان تمام باتوں کو اپنے اندر ہی رکھے گا تو سوچتے سوچتے اُس کا دماغ پھٹ جائے گا اور جو اہم باتیں وہ سُنانا چاہتا تھا وہ اُسی کے ساتھ ختم ہو جائیں گی اور وہ —— ان باتوں کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بہت اہم۔ بے حد اہم اور انتہائی اہم تھیں۔ چنانچہ وہ چلتا رہا چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اپنے دوسرے دوست کے گھر پر پہنچ گیا اور پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر زنجیر کھڑکھڑانے لگا۔ لیکن دیر تک اور مسلسل زنجیر کھڑکھڑانے کے باوجود کسی نے دروازہ کھولا اور نہ کوئی آہٹ ہی ہوئی تو وہ مایوس ہو کر آوازیں دینے لگا —— "سُنو کہ میری آنکھوں میں نمک کھاتے ہوئے زخم، تو وہ مناظر ایک اک کر کے اترتے جا رہے ہیں اور سر میں بیٹھے ہوئے مضطرب الفاظ میری خشک زبان سے پھسل کر گر جانے کے لیے بے چین ہیں اور میں جو لڑی جانے والی جنگ کا ایک جل جانے والا میدان ہوں۔ تم سے بڑے اہم اور سلگتے ہوئے موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے اس تپتی ہوئی نکلی دوپہر میں پیدل چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس کے باوجود اگر تم میری باتیں

سننا گوارا نہیں کرتے تو کم از کم اپنے گھر کے پالتو جانوروں کو ہی بیچ دو تاکہ میں اپنے اندر کے الفاظ اُن جانوروں کے آگے ڈال کر ہلکا ہو جاؤں اب مجھ میں اُن باتوں کو محفوظ رکھنے کی تاب نہیں ہے میری کہانی اختتام کے قریب پہنچ چکی ہے، تاہم کوئی جواب آیا اور نہ دروازہ ہی کھلا یوں لگتا تھا کہ اندر کوئی ہے ہی نہیں۔ حالانکہ وہ ان گھروں کے روزنوں میں آنکھ رکھ کر دیکھ چکا تھا۔ گھروں میں مکین موجود تھے۔ لیکن خاموش تھے۔ لہٰذا جب وہ اپنے تمام احباب کے گھروں پر دستکیں دے کر، زنجیریں بجا کر اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا تو راستہ چلنے والوں کو آوازیں دینے لگا۔ رُکو۔ ٹھہرو اور سُنو کہ میں تم سے چند بے حد اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ ان باتوں کا بوجھ مجھ پر اب اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اگر میں انہیں کسی کو سنا نہ دوں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا کہ دباؤ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ لیکن کسی بھی راہ گیر نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی اُس نے خود ہی آگے بڑھ کر ایک راہ گیر کے کندھے کو پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ سُنو بھائی۔ میں اپنے تمام دوستوں کے گھروں پر جا کر دستکیں دے چکا ہوں۔ زنجیریں بجا چکا ہوں تاکہ ان سے نئے موسم پر گفتگو کروں اور اپنے اندر کی تمام باتیں نکال دوں جو میرے ذہن میں پہاڑ بن چکی ہیں۔ لیکن میرے کسی دوست نے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولا حالانکہ وہ سب کے سب اپنے اپنے گھروں کے اندر موجود تھے۔ تاہم خاموش تھے۔ لہٰذا تم میری باتیں سن لو کہ ان دنوں بڑی گرم ہوائیں چل رہی ہیں لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور چاروں طرف سے گولیوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں اور عجب وضع قطع کے لوگ اپنی تمام انگلیوں میں بے بسی بارود بھر بھر کر لکیریں کھینچنے کے جنون میں اپنی ہی جننے والی کے پیٹ کو چیر رہے ہیں، اور لکیریں مٹ ہوتی جا رہی ہیں اور سرحدیں آدھا ادھر ہے اور آدھا ادھر ہے اور۔ کہتے کہتے اچانک وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا اور راہ گیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ سن رہے ہو میری باتیں کہ میں اور بھی بڑی اہم باتیں تمہیں سُنانے والا ہوں۔ لیکن راہ گیر نے عجیب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس میں حیرت کے آثار عیاں تھے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر اپنے بہرے پن کا اظہار کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا!!!

## بقیہ صفحہ ۴۲ سحر کہاں

"ہم تم لوگوں کو لینے کے لئے پالم بھی گئے تھے۔"

کوئی جواب نہ ملا۔

پہلے چائے تو بناؤ۔ ڈاکٹر دیو نے ہمت توڑتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"چائے پی کر آئے ہیں۔"

"کھانا تیار ہے۔" مسز دیو نے کہا۔

"وہاں بھی تیار ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"وہاں! سسرال میں؟" پربھا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"ڈارلنگ! جلدی کیجئے۔ وہ لوگ کھانے کے لئے انتظار کر رہے ہوں گے۔ بھابھی کی بہن اپنے خاوند کے ساتھ آنے والی تھی۔"

"ہاں۔ یار آگیلہ چلتے ہیں۔"

سرسری باتوں کے بعد اجنبیوں کی طرح دونوں اٹھے اور کچھ کہے بغیر دروازے سے باہر نکل گئے۔ ایک ٹیکسی ان کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔

مسز اور ڈاکٹر دیو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہ گئے۔ تبھی ایک دھماکے کے ساتھ مسز دیو فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

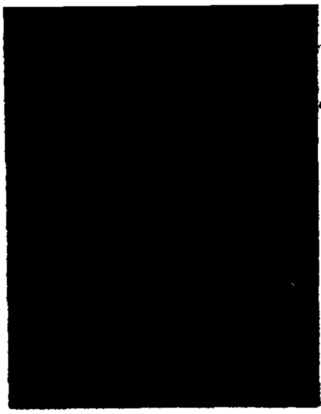
## بقیہ صفحہ ۲۰ ندا فاضلی اپنے لہجے کی دریافت

چاند سے پھول سے یا میری زباں سے سنیئے
ہر جگہ ایک ہی قصہ ہے جہاں سے سنیئے

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اٹھایا جائے
میرے حالات بھی اپنے ہی مکاں سے سنیئے

نکلے تھے جب سفر پہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دکھائے ہیں۔

زندگی کی معنویت کی یہی تلاش ندا کی شاعری کے سفر کی داستان ہے۔ اور یہ سفر اب ایک نئی سمت اختیار کر رہا ہے اور یہ سمت وہ ہے جو بڑی شاعری کی بشارت ہے۔



سید الابرار

معرفت۔ مسلم گرلس اسکول بلڈنگ نمبر دس، ۱۸/۹ بی۔ ٹی روڈ، شب پور، ہاوڑہ۔ ۲

# پسِ تعمیر

سارے شہر پر تعطّل سوار تھا جیسے کسی مشین کو بریک ڈاؤن کی بیماری لگ گئی ہو جو چلتے چلتے اپنے آپ رک جاتی ہو۔

حامد کا ٹرک ایک گڈھے کے نیچے آکر اچھلتا ہوا کچھ آگے بڑھ کر رک گیا۔ سامنے سمندر روڈ پر گاڑیاں ساکت اور صف بصف کھڑی تھیں۔ سڑک کے بیچ میں ایک پتلا سا راستہ بچا ہوا تھا جس پر لائن لگا کر لوگ اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔

اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ٹرک کے شیشے سے دُور سڑک کو دیکھتے ہوئے حامد سوچنے لگا۔

آج کل تمام چیزیں نہ جانے کیوں اُداس دکھائی دے رہی ہیں۔ جیسے دل ہی دل میں کوئی رو رہا ہو۔ کچھ پتا بھی نہیں چلتا اور چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ دفتر بند ہوتے جا رہے ہیں۔ بستی اور محلّے اجڑتے جا رہے ہیں۔ آبادی سمٹتی جا رہی ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ جہاں لوگ نظر آتے ہیں وہاں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں اور جہاں ویرانی نظر آتی ہے وہاں شعال کی طرح آنکھیں دکھاتے ہوئے جن، پری اور بھوت نظر آتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی وہ نیا شہر لگتا ہے۔ اِس بوڑھے شہر کا سارا رنگ اڑا لے جائے گا۔"

سورج ڈھلتا جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں کنارے دور دور تک بہت مشغول، آباد اور رنگین دکھائی دے رہے تھے۔ دور سے نزدیک تک کا یہ منظر دیکھ کر حامد نے اپنے آپ سے کہا "یہ ٹرک رات سے پہلے جاگنے والی نہیں ہے۔ ساہو جی کے ڈھابے پر چل کر دم لیتے ہیں۔"

ٹرک سے نیچے اتر کر چلتے چلتے گودام نمبر ۲ اور ۳ کے بیچ والے گلیارے میں حامد نے جھانک کر دیکھا۔ بہت سے لوگ ٹخنوں تک اترے کچھوں۔ ملک کی رنگین لنگیوں چین کی پتلونوں اور لٹھے کے پائجاموں میں آتے جاتے دکھائی پڑے جن کی چمڑے کی جوتیوں سے چُر چُر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

وہ جب گلی میں گھسا تو اس نے دیکھا ساہو جی اپنے ڈھابے کی قنات سے باہر سڑک کے رُخ پر کھڑے تھے۔

اپنے سامنے اچانک حامد کو دیکھ کر انہوں نے چھوٹتے ہوئے کہا "کہو حامد میاں، کیسے ہو؟ بہت دنوں بعد پھرے، جیسے جیسے پڑول کا دام بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے تم لوگوں کی پسند بھی اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی دوسرا اڈّہ پسند آگیا ہے"۔؟

حامد نے کہا۔ "ساہو جی! پسند اور ناپسند کی بات نہیں۔ آج کل بہت نئی اور نرالی قسم کی مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اپنے حصّے کی جائداد پر بڑے بھائی نے ایک سائرس پھنسا دی۔ گاؤں کے دس دن عدالت، دستاویز، صاحب، اردلی اور دلال کے بیچ کٹ گئے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ کون سا موسم اور کون سا گرہن لگا ہوا ہے"!

یہ کہہ کر حامد خاموش ہو گیا اور تھوڑی دیر تک ساہو جی کا منہ تکتا رہا۔ اس نے پھر گلوگیر آواز میں کہا۔ کچھ ہے تو ان سب کے سامنے ہے ساہو جی!

یہ بات سن کر ساہو جی کا چہرہ سُرخ ہو گیا انہوں نے حامد سے کہا "چل اندر چل کر بیٹھ، یہ شہر سب کی تھکن لے گی"۔ اور سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہی اوپر والا دکھ اپنی باہوں میں لے کر بھی کرے گا۔ یہ ناہنجار بوڑھا ہے!"

حامد جب ساہو جی کے ڈھابے کے اندر گھسا تو دیکھا بنچوں پر ادھر اُدھر کچھ گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ بس ایک کونے میں مثلث کی شکل میں ایک فاصلے سے رکھی ہوئی تینوں تپائیاں خالی پڑی تھیں۔ وہ تیسری تپائی پر جا کر بیٹھ گیا تو آمنے سامنے کی تینوں تپائیوں سے

کچھ زیادہ فاصلہ پر دکھائی دینے لگتی تھی۔
اسی بیچ اندر سے گھومتے ہوئے گندمی رنگ کے دو ادھیڑ عمر ڈرائیور ساہوجی کے ڈھابہ میں داخل ہوئے اور حامد کے سامنے کی دونوں چارپائیوں پر آکر بیٹھ گئے۔

ان میں سے ایک نے دوسرے کو مخاطب کر کے کہا — "دوارکا! اب تو یہ کاروبار صرف بھگوان بھروسے چل رہا ہے۔ ڈرائیوری میں اب کسی پل چین نہیں۔ ہر گام چور، اچکوں، داداؤں، بھیا، سیانوں اور باہر والوں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ راستے کتنے بدل گئے ہیں"

دوارکا نے کہا — "اور منوڑ، اس پر سے دنگا، فساد اور کرفیو کا چکر لگا ہوا ہے۔ نہ ہانڈی سلامت اور نہ ڈھانڈی سلامت ہے"

منوڑ نے کہا۔ "دیکھو آگے کیا ہوتا ہے!"

دوارکا نے کہا — "بھیا جب ڈیرے میں آندھی گھس آئی تو ہونی اور انہونی کیا!"

تھوڑی دور ندی کے کنارے واقع گرجاگھر میں جب شام کا گجر بجنے لگا تو کچھ اور لوگوں کے ساتھ یہ دونوں ڈرائیور بھی ڈھابے سے نکل کر باہر چلے گئے اور اس میں سوندھی بو کے ساتھ چیل کے بڑے بڑے گلاسوں میں چائے۔ دودھ اور لسی پھینٹنے کی قلقل کرتی ہوئی آواز پھیل گئی جو دماغ کی نسوں کو سُن کرتی جا رہی تھی کہ ساہوجی کے ڈھابے میں چھریرے بدن کے دو نوجوان اور داخل ہوئے اور دیوار سے لگی ہوئی ایک بنچ پر حامد سے کچھ دوری پر بیٹھ گئے۔ ڈھابے کی قلقل کرتی ہوئی آواز کے ساتھ اب ان کی آواز بھی حامد کو صاف سنائی دینے لگی۔

ساہوجی نے ان کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھ کر آواز لگائی — "...لے چودھری کے لیے دو گلاس نیبو پانی گلاب ڈال کر لاؤ!"

...ری کے دوسرے کنارے پر بندرگاہ میں لنگر انداز جہاز کا بھونپو بجنے لگا تو شام کا اندھیرا اور گھنیرا ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ساہوجی کے ڈھابے میں ایک اور آواز سنائی دینے لگی۔ "پھول، بیل، پھول کا ...ر لو!"

...ن آوازوں کی گونج ابھی باقی ہی تھی کہ تیز سینٹ کے ایک بھبکے کے ساتھ کچھ ملی جلی نسوانی آوازیں کان کی لوؤں کو سن سے چھیڑتی ہوئی ...رگئیں۔ چھریرے بدن کے وہ دونوں نوجوان چونک گئے اور ...ف جنبش کے ساتھ سیدھا ہو کر پھر بیٹھ گئے۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساہوجی کے ڈھابے میں کچھ سناٹا چھا گیا اور بہت کم ہی لوگ باقی رہ گئے تھے۔ حامد کے پاس چائے سے بھرا ہوا ایک گلاس ڈھابے کے کمسن خادم نے لا کر رکھ دیا۔ جس کی سطح پر جمی ہوئی بالائی کی موٹی تہہ کو دیکھتے دیکھتے وہ ان دونوں نوجوانوں کو دیکھنے لگا جن کی آوازیں اس سناٹے میں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

ان میں سے ایک کی مینڈکی شکل پر بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور وہ خیر سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایک کا سر بڑا اور بڑا چہرہ گمبھیر دکھائی دے رہا تھا۔

مینڈکی شکل والے نوجوان نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے سر والے نوجوان سے کہا — "یہ جو بندہ ہے نا ہاتھ کا سچا اور لنگوٹ کا پکا آدمی ہے، اس لیے ڈرتا صرف رب سے ہے۔ دلوو چاہے جتنی پی لے، چال اس کی بالکل نہیں بدلتی"

بڑے سر والے نوجوان نے کہا۔ "اس ایک جان کے پیچھے نہ جانے کتنے دشمن لگے ہوئے ہیں لیکن ان سے کسی کروٹ چھٹکارا نہیں، جن کی پکی ہوئی بولیاں اگر دارو نہ پیوں تو خواب میں بھی سنائی دیتی ہیں"

مینڈکی شکل والے نوجوان نے ڈولتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا — "ہاں سنائی دیتی ہیں۔ ماں کی گود میں جو اوقات ملی تھی وہ جہاں تھی وہیں رہ گئی اور عمر آگے بڑھ گئی!"

رات کا پہلا پہر شروع ہوتے ہی چاروں طرف دبیز سناٹا پھیل گیا۔ ساہوجی کے ڈھابے میں حامد کے ساتھ دو تین لوگ جو اور بچ گئے تھے وہ بھی ان نوجوانوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ باہر نکل گئے اور اب ساہوجی کے ڈھابے میں صرف حامد باقی بچ گیا تھا جو بیٹھے بیٹھے نیند کی جھپکیاں لینے لگا تھا۔

جب رات کچھ اور بوجھل ہوگئی تو حامد بھی اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے چلتے اس نے ساہوجی سے کہا۔ "چلیں اپنی گاڑی پر۔ یہ سڑک اب جاگنے والی ہے"

ساہوجی نے کہا۔ "ہاں جاگنے والی ہے، کالی، کلوٹی، ہاتھ کی لولی، آنکھ کی پھوٹی۔ نئی اولاد کو اپنی بانہوں میں لے کر بھی اب کیا کرے گی!"

کلاکار ٹرانسپورٹ کے دفتر کی بوسیدہ سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے، حامد ٹھٹھک کر بڑبڑانے لگا۔ "دانیال بھائی، دفتر میں گھستے ہی اسے کہیں طلب نہ کر لے۔ نگاہ سے کمزور تو ضرور ہے،"

لیکن طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی اس کی لمبی ناک بہت تیز ہے!"
کلا کار ٹرانسپورٹ کا سارا دفتر پلائی وڈ کی خوبصورت کھولیوں میں ایک پرانی حویلی کے مربع نما ہال کے اندر جمع تھا۔ ہال کی دیواروں پر چاروں طرف دیوالائی تصویریں بنی ہوئی تھیں، جن کے مٹتے ہوئے نقوش میں پری، جن، فرشتہ اور شیطان، کسی کا چہرہ صاف سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

حامد جیسے ہی کلا کار ٹرانسپورٹ کے ڈرائیور روم میں داخل ہوا، دانیال بھائی کی پاٹ دار آواز سنائی پڑی۔ وہ ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ دانیال بھائی کو اس کی موجودگی کا پتا چل گیا اور "حامد میاں" کی صدائے بازگشت پورے ہال میں گونج گئی۔ یہ آواز سنتے ہی اس نے جنبش لی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بغل کی سیٹ پر سوئے ہوئے ڈرائیور کو دیکھنے لگا جس کی نیند اچٹ گئی اور آنکھوں کے دونوں کنارے بھیگ گئے تھے۔ چلتے چلتے حامد نے اس کی طرف قہقہہ لگا کر کہا۔ "جاگ مچھندر گورکھ آیا۔ اب تو دعا سلام کی بھی مہلت نہیں۔"

وہ جب دانیال بھائی کی کوٹھری میں داخل ہوا تو اس نے گرج کر پوچھا۔
"کل کیوں صرف ایک بڑا اور تین چھوٹا ارسال ہوا اور پٹرول بھی زیادہ خرچ ہوا۔ جام میں پھنسے ہوئے مال کی پہرہ داری کا خرچہ کون دے گا تیری جورو کا یار! اور پٹرول کا خسارہ کون بھرے گا تیرے باپ کی رکھیل!"
حامد نے اپنے آپ کو بے حد سنبھالتے ہوئے دانیال بھائی پر ایک نظر ڈال کر کہا "بڑے صاحب، آپ کو پتا ہے، راستے کا حال کتنا خراب ہے۔ ہر جگہ شور، ڈکیتی، جھگڑے، اور لاٹھی چارج ہے اور ان سب کی مار، راستہ، گاڑی، اور ڈرائیور پر پڑتی ہے۔"
دانیال بھائی کی گردن کی تمام رگیں یک بیک تن گئیں اور انہوں نے تنک کر کہا۔ "بھیّا یہ کہانی دہانی کسی اور کے لیے اُٹھا رکھ۔ بول کل کتنی کمائی ہوئی۔ تو مجھکو اپنی باتوں میں نہیں الجھا سکتا۔ ڈیڑھ مہینے میں گھر کا دھبا چکر کیسے لگا۔ مجھے تو تم لوگوں کے مردے کا بھی پتہ ہے۔ بول تیری کھاٹ کھڑی کرکے وہ بھی دکھلا دوں!"
یہ کہکر دانیال بھائی نے اپنی پاٹ دار آواز میں پکارا "منشی جی!"
آواز سنتے ہی پچاس پچپن سال کا ایک مریل صورت آدمی اپنی کھچڑی داڑھی کو کھجلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔
حامد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانیال بھائی نے منشی جی سے کہا۔ "اس ڈرائیور کی آوٹ ڈور ڈیوٹی بند۔ آج برخاست اور کل سے گاڑی کا ناشتہ کرانے کی ڈیوٹی بحال۔"
یہ سن کر حامد کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جیسے ایک جھٹکے میں دانیال بھائی نے حامد کے جسم کا سارا خون نکال لیا ہو وہ واپس ڈرائیور روم میں آکر اس ڈرائیور کے بغل میں جاکر لیٹ گیا جو پہلے سے سویا ہوا تھا۔

ایک دن حامد نے کلا کار ٹرانسپورٹ میں زبردست کارنامہ انجام دیا جب چار مسلح ڈاکوؤں کو پچھاڑ کر کلا کار ٹرانسپورٹ کے تمام ورکروں کی تنخواہ بچانے میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ ان ڈاکوؤں نے اس جیپ پر حملہ کر دیا تھا جس میں بینک سے تنخواہ کا کیش آ رہا تھا اور جس کے پچھلے دروازے پر اتفاق سے حامد کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ چوری، ڈکیتی، ٹھگی، مہنگائی اور چور بازاری اپنے عروج پر تھی اور چاروں طرف ہاہا کار مچا ہوا تھا۔
اس واقعہ کی بہت دھوم مچی۔ حامد کی بہت تعریفیں ہوئیں اور دانیال بھائی نے خوش ہو کر حامد کو پھر آوٹ ڈور ڈیوٹی پر بحال کر دیا۔

حامد کو بہت دنوں بعد اپنے ٹرک کے شیشے سے سڑکیں نظر آئیں۔ وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ کبھی بارش، کبھی دھوپ۔ سڑکوں کے کناروں پر دور دور تک بھیگی دیواروں سے اترے ہوئے پوسٹر کیچڑ میں لت پت پڑے تھے اور زمین سے بھاپ نکل رہی تھی۔ حامد ٹرک پر نئے شہر کے افتتاحی جشن میں کام آنے والی بلم بلد بلیاں لدی ہوئی تھیں۔
نیا شہر جانے کے لیے حامد کا ٹرک جب سمندر روڈ میں داخل ہوا تو ٹرک کا رفتار پیما اپنی رفتار گھٹانے لگا اور گلی نمبر ۱۵ اور ۱۶ کے بیچ سڑک پر آکر وہ آہستہ آہستہ ایک کنارے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ساہو جی بہت دنوں سے اس کا اور حامد کا انتظار کر رہے ہوں۔
حامد کبھی سامنے گلی کو، کبھی اسٹیرنگ پر خاموش بیٹھے ہوئے ہاتھوں کو اور کبھی اوپر آسمان کو دیکھتا ہوا ٹرک سے نیچے اتر پڑا۔ وہ جب ساہو جی کے ڈھابے کے پاس پہنچا تو اگست کے کالے بادل اچانک چھٹ گئے اور بڑی جان لیوا قسم کی دھوپ پھیل گئی۔ حامد کو لگا جیسے اس کے سارے بدن میں کرچیاں سی چبھ گئی ہوں۔ وہ دوڑ کر ساہو جی کے ڈھابے میں گھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ ساہو جی کے ڈھابے میں جہاں چار بھٹیاں جلتی تھیں وہاں صرف ایک [illegible] تھا

س پر چڑھی ہوئی چائے کی کیتلی میں سے بھاپ کی خفیف لکیریں اوپر اٹھنے کے ساتھ ہی لڑکھڑا کر ختم ہو جاتی تھیں۔

ساہو جی نے حامد کو دیکھ کر کہا۔ آ، آ، تو بڑا وفادار ہے، حامد!

حامد نے کہا۔ ساہو جی، یہ کیا ہو گیا ہے؟ نیچے دیکھو تو آگ اور اوپر دیکھو تو بکھرے ہوئے کالے بادل نظر آ رہے ہیں۔

ساہو جی نے کہا۔ حامد میاں، اس آخری عمر میں پاؤں کے نیچے دل دل آ گئی۔ کون نکالے گا اس دل دل سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سارا کاروبار آہستہ آہستہ نئے شہر کو منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ اکا دکا گودام اور دفتر باقی رہ گئے ہیں اور اب وہ بھی منتقل ہو جائیں گے۔

حامد نے کہا "ساہو جی! بیٹے نے باپ کو دغا دے دیا۔ ہم جیسے کچھ وفادار باقی رہ گئے ہیں ایک دن وہ بھی چلے جائیں گے یا بے دخل کر دیے جائیں گے۔ پھر یہ بوڑھا شہر کیسے کیسے تڑپ کر مرے گا اس کو کوئی پانی پلانے والا بھی نہیں ملے گا۔"

ساہو جی نے چونک کر کہا "نہیں نہیں، ایسا نہیں۔ بس دھوکہ ہو گیا۔ جس کو اس نے خوب بھرا وہ اس کو پہلے دغا دے کر چلے گئے۔"

یہ سن کر حامد کا چہرہ کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور اس نے گمبھیر ہو کر کہا۔ "کیا کمی تھی اس شہر میں، صاحب، بی بی، غلام، اردلی، گماشتہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سب تو موجود تھے۔"

ساہو جی نے کہا "ہاں، ہاں کہتے چلو ہیر رانجھا، سوہنی اور مہیوال بھی تھے۔"

حامد نے بیچ میں لقمہ دیا "ہاں، چاچا امریالی بھی تھی!"

ساہو جی نے کہا۔ ہاں، بیٹے سب کا اپنا اپنا نام تھا اور کوئی۔۔۔!

ساہو جی کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ایک مجذوب عورت ڈھابے میں داخل ہوئی۔ سر پر جمی ہوئی میل کی موٹی تہہ۔ آپس میں چپکے ہوئے رستے جیسے بال۔ بدن پر ایک پھٹا پرانا بوسیدہ تہبند اور بھی پرانی پورے آستین کی بے ڈول قمیض، پاؤں میں ٹماٹے کے موٹے تار کا کڑا، چھدی ہوئی ناک میں گھسا ہوا ایک میلا کچیلا پیلے رنگ کا قدرتی پھول۔ ایک کندھے پر لٹکتی ہوئی ایک گدڑی۔ دوسرے کندھے کے نیچے دبی ہوئی ٹاٹ کی ایک پوٹلی اور داہنے ہاتھ میں تام چینی کا ایک بدرنگ گلاس تھا۔

ساہو جی نے اس کو دیکھ کر کہا۔ کہوں ری بڑھیا تو کہاں سے ٹپک پڑی!

یہ سن کر اس مجذوب عورت نے تڑاخ سے اپنی ہری سرخ ناک دکھا دی اور ساہو جی نے یہ دیکھ کر چولہے سے چائے کی کیتلی اٹھا کر اس کے گلاس میں چائے انڈیل دی۔

ساہو جی نے پھر حامد سے مخاطب ہو کر کہا "مت پوچھو اس دنیا کے کتنے روپ ہیں، میرے یار!"

حامد نے کہا "سچ ہے اس دنیا کے نہ جانے کتنے روپ ہیں!"

سورج آہستہ آہستہ جب نیچے اترنے لگا تو حامد اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب وہ چلنے لگا تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے ساہو جی نے کہا۔ حامد تو نیا شہر جا رہا ہے تو ضرور لوٹ کر آنا اور بتا جانا کہ اس کی صورت کیسی ہے۔ اس کو دیکھنے کے چکر میں پھنس کر آدمی لوگ، بابو، بھیا اور دلال کھا گئے۔ لیکن نئے شہر کا اندراج نہیں مل سکا اور جو باقی بچے اس کو اپنی اولاد اور ڈھابے کے نوکر کے غدار ہو گئے۔ اب میرے پاس ہوا میں کھٹکتے ہوئے ان برتنوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ ایک پرانے دوست بولے بھائی کے گھر جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی تدبیر نکالے نہیں تو پھر گاؤں واپس جاؤں مگر گاڑی کے اس ناکارہ گھوڑے کو اب وہاں کون پوچھے گا۔ اور اگر وہ بھی ٹھٹھکا کھڑا ہو تو! اس آخری عمر میں پاؤں کے نیچے بڑی بھیانک دل دل آ گئی ہے۔ کون نکالے گا اس دل دل سے، اس دل دل سے، اس دل دل سے۔

یہ کہتے ہوئے ساہو جی آبدیدہ ہو گئے اور جذبات کی شدت سے کانپنے لگے۔ حامد کے کندھے پر سے ان کا ہاتھ آہستہ آہستہ ہٹتا گیا اور حامد کا ٹرک ایک شور اٹھاتا ہوا نئے شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ✿

## بقیہ ۵۵ صفحہ۔ قومی بچت اسکیم

وہ سوچنے لگے کہ دیر کرنے سے دوسرا زیادہ فائدے میں رہے گا۔ جو مل جائے غنیمت سمجھ کر لے لینا ہی دانشمندی ہے۔ پانچ سیر نمک مل جائے تو کافی ہے۔ بعض نے تو یہاں تک سوچا کہ آدھا سیر نمک کو مل جائے تو بھی غنیمت ہے۔ ✿

## مدحت الاختر

موسم نیا نیا ہے فضائیں نئی نئی
کرتا ہوں تیرے حق میں دعائیں نئی نئی

تو کیا گیا کہ سب کی نگاہیں بدل گئیں
سنتا ہوں اپنے بارے میں رائیں نئی نئی

اپنا یہ جُرم تھا کہ کسی کے قریب تھے
اس جُرم کی ملی ہیں سزائیں نئی نئی

کھولے نہیں کسی نے دریچے تو کیا کریں
چلتی ہیں اس نگر میں ہوائیں نئی نئی

یہ غم ہمارے واسطے کافی ہے صاجو!
خوشیاں کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں نئی نئی

لبوں پہ آہ نہ آنکھوں میں اشکِ غم رکھنا
نیا ہے شہر ذرا سوچ کر قدم رکھنا

نیا شریکِ سفر بدگماں نہ ہو جائے
خیال گذری ہوئی منزلوں کا کم رکھنا

فقط یہیں تو محبت کے پھول کھلتے ہیں
زمینِ دل کو سدا آنسوؤں سے نم رکھنا

گلہ تو خیر ضروری ہے بے نیازی کا
مگر لبوں پہ شکایت نہ دمبدم رکھنا

کسی کی یاد میں دو شعر کہہ لیے مدحت
ہمارا شوق نہیں کان پر قلم رکھنا

● شعبۂ اُردو فارسی، انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسز ناگپور (مہاراشٹر)

## شمیم فاروقی

اک رات ہی میں دفعتاً کیا ہو گیا مجھے
اپنا ہی جسم غیر سا لگنے لگا مجھے

یارب ترا حقیر سا بندہ ہوں خیر ہو
اک شخص دے رہا ہے مسلسل دعا مجھے

ایسا بھی کیا ہمیشہ سراپا خلوص ہے
کینہ بھری نظر سے کبھی دیکھتا مجھے

جب تک جنوں کے زیرِ اثر تھا مزے میں تھا
لیکن خرد سے پڑ ہی گیا واسطہ مجھے

سب لوگ دیکھ کر اسے حیران رہ گئے
کیسا عجیب شخص تھا کیا دے گیا مجھے

ویسے تو اس سفر میں وہی دُھند ہے شمیم
کچھ کچھ نظر بھی آنے لگا راستہ مجھے

● آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ (یوپی)



سلیم شہزاد
۹۹ ۱۱ ایم ایچ بی کالونی / مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

# قصہ جدید افسانے کا

جدید شاعری کی طرح جدید افسانہ بھی ۱۹۶۰ء کے آس پاس افقِ ادب پر طلوع ہوا اور اپنے موضوعات کے انتخاب، فنی طریقِ کار، زبان و اسلوب کے تنوع اور اپنی ظاہری شکل و ہیئت کے متوقع کئی عوامل کے سبب قارئین اور ناقدین دونوں ہی کے مخالف اور مزاحمتی رویوں کا ہدف بن گیا۔ اس کے تعلق سے

"افسانہ پہلے بھی کوئی بہت اہم صنف نہیں رہا"

یا

"افسانے کی بحث کا آغاز افسانے کی موت سے کرنا چاہیے"

جیسے انتہا پسندانہ خیالات سے قطع نظر

(۱) جدید افسانہ کہانی سے انحراف کرتا ہے۔

(۲) پلاٹ، کردار، آغاز، انجام اور وحدتِ تاثر وغیرہ روایتی اصول کا التزام یا احترام نہیں کرتا،

(۳) زبان کی شکست و ریخت اور شخصی علامات کے استعمال نے اُسے ناقابلِ فہم بنا دیا ہے،

(۴) ہندسی اور ریاضیاتی وغیرہ علمی اصطلاحات کے تصرف سے لغویت کی تشکیل کرتا ہے،

(۵) نثری لوازم کی بجائے شعری لوازم کی طرف مراجعت کرتا ہے۔

(۶) اس نے نظم کی ہیئت اختیار کر لی ہے،

وغیرہ وغیرہ ایسے اعتراضات ہیں جنھیں اعتراضات سے زیادہ جدید افسانے کی ظاہری خصوصیات تصور کرنا چاہیے اگرچہ صرف یہی خصوصیات اس کی پہچان نہیں، مجموعی حیثیت سے چاہے انھیں جدید افسانے پر منطبق کیا جا سکتا ہو مگر سچ یہ ہے کہ ان کے عدم کے باوجود جدید افسانہ جدید افسانہ ہوتا ہے بلکہ ان کے برخلاف منطقی مسلسل بیانیہ واقعہ اور کردار وغیرہ کے التزام سے بھی جدید افسانے کی تخلیق ممکن ہے۔ گویا جدید افسانے کی ان خصوصیات کے علاوہ بھی کچھ ایسے عوامل موجود ہیں جنھیں اس کی شناخت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ عوامل دراصل اس کے فنی اور فکری رجحانات ہیں جو اس کے باطن یعنی وجدان و فکر، مواد و موضوع اور طریقِ اظہار سے نمو پاکر اس کی خارجی سطح یعنی زبان اور اسلوب، تخلیقی طریقِ کار اور ظاہری ہیئت تک پہنچ کر اسے عصری ادب کی ایک نمائندہ صنف کا مقام دیتے ہیں۔ افسانے کو وجود میں لاتے ہوئے فنکار دو سطحوں پر اپنا اظہار کرتا ہے: اولاً افسانے کا تخلیقی طریقِ کار یعنی فنی تکنیک، اور ثانیاً افسانے کی ظاہری ہیئت کے توسط سے فنکار کے باطن کا مقصودِ بیان۔ پہلی سطح کو عملِ ترسیل اور دوسری کو عملِ تفہیم کہا جا سکتا ہے۔ جدید افسانے کی مذکورۂ بالا خصوصیات یا رجحانات کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:

(۱) داستانی (۲) اعترافی (۳) علامتی (۴) ابہامی

تکنیک اور اظہار کی ہر دو سطحوں پر ان رجحانات کے متعدد پہلو جدید افسانے میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

افسانے کے تعلق سے ابتدائی سطور میں مندرج انتہا پسندانہ خیالات میں سے پہلا خیال اس صنف کے پہلے ادوار (بروزِ کیا) نیز ہم

ہونے کا واضح اعلان کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خصوصاً آج کے دور کو نثر ہی کا دور کہا جاسکتا ہے ۔ یہ خیال بھی انتہا پسندانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ایک قسم کی انتہا پسندی کا جواب صرف اور صرف دوسری قسم کی انتہا پسندی ہوتی ہے ، اس کے پیشِ نظر افسانے کے ہر دور میں غیر اہم صنفِ ادب ہونے کے متشدد خیال کو کسی قدر اعتدال پر لایا جاسکتا ہے یعنی ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے افسانہ کسی دور میں چاہے کسی قدر غیر اہم ہو گیا ہو (تاریخِ ادب میں یوں تو ایسا کوئی دور نظر نہیں آتا) لیکن موجودہ دور میں تیز رفتار مشینی زندگی ، نظریات و افکار کی ایک دوسرے پر تاثر پذیری اور براہِ راست اور روشن اظہار کی افادیت و ضرورت کے تناظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نثری اسالیب اس لحاظ سے خاصے زود اثر اور متحرک ثابت ہو سکتے ہیں ۔ پس نثری ادب میں سے افسانہ آج ضرور اہمیت کا حامل ہے ۔ ویسے کوئی بھی صنفِ ادب دیگر اصناف کے مقابلے میں بالذات اہم یا غیر اہم کبھی نہیں ہوتی ۔ اگر تکنیکی وسیلۂ اظہار کا فرق نمایاں طور پر موجود ہو تو شاعری جو زبان کی ایک مخصوص ہیئت نظم کے توسط سے اپنا اظہار پاتی ہے ، افسانے یا ناول سے ارفع صنف ہو سکتی ہے نہ اس کے برخلاف افسانہ یا ناول جن کا وسیلہ زبان کی دوسری مخصوص ہیئت نثر ہے ، شاعری سے مقابلتاً اعلیٰ درجہ کے حامل قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ بظاہر اظہار کے دونوں طریقِ کار میں وسیلۂ زبان مشترک ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود زبان کے دو مختلف اسالیب یعنی نظم و نثر کے فرق کے سبب شاعری اور افسانہ اپنے اپنے دائرے میں قائم بالذات اصناف کا مقام پالیتے ہیں اس لیے ارفع یا ادنیٰ ہونے کے تعلق سے ان کا تقابل ہی مہمل ٹھہرتا ہے البتہ اصنافِ سخن اور اصنافِ قصہ کا جداگانہ تقابل ممکن بھی ہے اور درست بھی ۔ اس لحاظ سے مندرجہ بالا قول اپنے آپ میں غلط اور لغو ثابت ہو جاتا ہے ۔

اسی طرح دوسرا قول کہ افسانے کی بحث کا آغاز افسانے کی موت سے کرنا چاہیے ، افسانے کی تاریخ بیان کرنے یا صرف پرانے افسانے پر بحث کرنے تک محدود نظر آتا ہے کیونکہ اگر افسانہ وفات پا چکا ہے تو ظاہر ہے آج مرنے والے کے اوصاف حمیدہ یا قبیحہ بیان کرنے کے سوا نقاد کے لیے دوسرا کوئی شغل موجود نہیں ۔ دوسرے لفظوں میں اس قولِ محال کا یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ افسانہ کل تک تو موجود تھا مثلاً پریم چند اور کرشن چندر کا افسانہ لیکن آج اس کا وجود ادب میں نہیں پایا جاتا ۔ پھر انتظار حسین ، انور سجاد ، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا وغیرہ سے لے کر قمر احسن ، انور خان ، شوکت حیات اور حمید سہروردی وغیرہ تک سیکڑوں فنکار افسانے کے نام پر جو صفحات سیاہ کیے جا رہے ہیں وہ کس فعلِ عبث میں مبتلا ہیں ؟ ہر چند افسانہ نگار کہتا ہے کہ "ہے" نقاد صدا لگاتا ہے "نہیں ہے" ایسی "ہے نہیں ہے" کے پھیرنے دراصل افسانے کے متعدد نقاد پیدا کر دیے ہیں ورنہ ہماری تنقید اب تک صرف شاعری کے لیے مخصوص تھی اور شاعری کی جزوی تنقید کو کل مملکت ادب کی تنقید فرض کر لیا جاتا تھا ۔ جب واویلا مچا کہ نقاد صرف شاعری کے ہو کر رہ گئے ہیں تو افسانے کی اہمیت سے انکار کر کے یا افسانے کی موت کا اعلان کر کے شاعری کے نقاد افسانے کی تنقید پر بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور درجن بھر مضامین پر مشتمل تنقید کی کتاب میں ایک آدھ مضمون افسانے یا ناول یا فکشن کی تنقید پر بھی نظر آنے لگا ۔ یہ جملۂ معترضہ اس لیے ضروری تھا کہ اس قسم کی جلد باز تنقید نے افسانے کے قضیے میں فیصلے صادر کرنے میں بھی جلد بازی اور تشدد سے کام لیا اور فن اور فنکار دونوں کو غلط راہیں سجھائیں ، دونوں سے غلط مطالبات کیے (نقاد کا مطالبہ کرنا بجائے خود غلط ہے) اور خوب خلفشار پیدا کیا ' ابتدا میں جن اقوال کا ذکر کیا گیا وہ اسی خلفشار کی دین ہے ۔

---

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ جدید افسانہ نہ صرف سماجی حقیقت نگاری کے ترقی پسند افسانے کا ردِ عمل ہے بلکہ یہ پریم چند کے مقصدی افسانے کی روایت سے بھی انقطاع کرتا ہے ۔ "کفن" کسی حد تک اگر اس کی روایت کا سرچشمہ ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں پریم چند نے کسی فلاحی مقصد کو چھوا نہیں (کسی قدر معروضی رہ کر بس ایک واقعہ بیان کر دیا ہے ۔ بے روح حقیقت اور لا حاصل مقصد سے مبرا ہونے کے لیے جدید افسانہ نگار نے سب سے پہلے افسانے کی ہیئت کا بت توڑا ۔ پلاٹ اور کردار حتیٰ کہ خود کہانی سے تو افسانے کا جوہر ہوتی ہے ، لاتعلق ظاہر کی ، حقیقی سے ماورائے حقیقی ہو گیا یا اس نے اپنے باطن کا رخ کیا ۔ ذہنی پراگندگی ، خواب نویسی اور مجذوب کی بڑ کا اسلوب اظہار کے لیے اختیار کیا گیا جس کے سبب غیر حقیقی ، متضاد اور متناقص ذہنی اور لسانی پیکر افسانے میں راہ پا گئے ، بیان کے منطقی تسلسل سے لحوظ برتا جانے لگا اور اس طرح شکستہ و ریختہ زبان کے نمونے سامنے آئے ۔ علامت اگرچہ ایک حقیقی پیکر ہے لیکن اس کی معنویت

چونکہ تجربے سے مملو ہوتی ہے اس لیے افسانے میں ہزاروں علامات در آئیں جن کا اخذ و اکتساب ظاہر ہے کہ زندگی کے صرف چشمے سے نہ کیا گیا ہوگا، علامت کے لیے فنکار نے علوم کے دفتر چھان مارے ۔ دور از کار بعید از فہم، مغلق، معمّہ، مہمل غرض بجی سے بجی معنویت کی حامل علامات اتنی کثیر تعداد میں برتی گئیں کہ ہر جدید افسانے کو علامتی افسانہ سمجھا جانے لگا ۔ ہندسی اور ریاضیاتی شکلوں کے ذریعہ افسانوی ترسیل کے رجحان کو بھی اسی ضمن میں سمجھنا چاہیے ۔ غیر روایتی زبان میں شعور کی رَو کا اظہار، منتشر خیالی کے لفظی پیکر اور علامتی ابہام نے نثری اسلوب کو شعری اسلوب کی حد سے بھی ملایا اور آزاد یا نثری نظم کی طرح چھوٹی بڑی سطروں میں افسانہ لکھا جانے لگا بلکہ متعدد افسانوں سے تو یہ تاثر عیاں ہے کہ افسانہ نگار نے شعوری طور پر افسانے کو نظم بنانے کی کوشش کی ہے ۔ پھر چند لکھنے والوں کے خالص شعری تشبیہی اسلوب برتنے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ افسانہ واقعی شاعری بنتا جارہا ہے (افسانے کو شاعری کے مقابل کمتر صنف خیال کرنے کا اسے بھی ایک سبب قرار دیا جاسکتا ہے) یہ باتیں اعتراضات کی طرح جدید افسانے پر اس لیے وارد ہوئیں کہ افسانے کے قاری اور ناقد پہلے ان کے عادی نہ تھے ۔ حقیقت بیانی یا مقصدیت کے دو اور دو چار والے ضابطے سے ہٹ کر انھوں نے افسانے کو دیکھا ہی نہ تھا ۔ وہ پسینہ بہاتے، لگان دیتے اور بھوکے رہتے کسان سے یا ذخیرہ اندوزی، کالا بازاری اور مزدور کا استحصال کرتے سرمایہ دار سے واقف تھے ۔ خلا میں گم ہوتی سیڑھیوں پر چڑھنے والے یا تنی ہوئی رسّی پر چلنے پر مجبور فرد سے ان کی آشنائی نہ تھی ۔ گاؤں کی پگڈنڈی یا شہر کی سڑک انھوں نے افسانے میں ضرور دیکھی تھی لیکن دھند اور دھوئیں میں چھپا ہوا بے سمت راستہ ان کے لیے خطرناک تھا ۔ وہ کالو بھنگی، بابو گوپی ناتھ، لاجونتی اور شمن وغیرہ کو تو خوب پہچانتے تھے کہ یہ سارے نام اور کردار ان کے اپنے ماحول سے اٹھائے گئے تھے لیکن الف ب ج، سُرخ چہرے والے، پہاڑ سے اترنے والے اور لنوار وغیرہ سے وہ کبھی کہیں ملے نہ تھے انھیں باتوں کے نتیجے میں انھوں نے جدید افسانے کو بے ماجرا، بے ماحول، بے کردار اور بے روایت قرار دے دیا۔

لیکن جدید افسانے میں افراط و تفریط کا یہ ماحول زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ (شاعری میں البتہ آج بھی کسی نہ کسی حد تک اس کے نشانات پائے جاتے ہیں) فن کے تعلق سے مخلص فنکاروں نے جلد ہی ہاتھ سے نکلتا کہانی کا سرا دوبارہ پکڑ لیا اگرچہ کہانی کے روایتی تصوّر سے انھوں نے اپنا انحراف باقی رکھا ۔ کہانی کا روایتی تصوّر آغاز، وسط اور انجام کے ضابطے سے زندگی سے ماخوذ کسی وقوعے یا واقعے کا ایک یا چند کرداروں کے توسط سے، جن پر ماخوذ واقعہ واقع ہوا ہو، مسلسل نثری بیان ہوا کرتا تھا ۔ اس بیانِ واقعہ میں ماحول اور منظر اضافی اور متاثرکن لوازم کی حیثیت رکھتے تھے ۔ افسانے کی زبان ایسی ہوتی تھی کہ قاری اور ناقد بیک قرات ترسیل و تفہیم کے مراحل سے بسرعت گذر جاتے ۔ مختصر یہ کہ پرانا افسانہ حقیقی زندگی کی تصویر تھا ۔ نئے لکھنے والوں نے یہ دیکھ کر کہ حقیقی زندگی کا تجربہ ادب کے توسط سے حاصل کیا جانے لگا ہے، اسے حقیقی زندگی ہی تک محدود کر کے افسانے یا زندگی سے ماخوذ کسی واقعے کے فنی بیان کو فن سے متصل اور مزید متاثرکن بنانے کے لیے کہانی ہی کو خیرباد کہہ دیا ۔ بے کہانی کا افسانہ افسانہ نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہانی کے روایتی نظریے کو فن کے تحت لا کر اس میں لچک پیدا کرلی گئی اور اب واقعے کے من و عن بیان کی بجائے اس کے واقع ہونے کی نظری رَد کا بیان افسانے میں ملنے لگا ہے ۔ تخیل اور تصوّر سے کام لے کر غیر مسلسل اور ماورائے حقیقی میں ایک تسلسل اور معنویت کی دریافت ہو چکی ہے ۔ مجسّم اور موسوم کرداروں کی بجائے مجرّد اور بے نام کرداروں کے ذریعہ واقعے میں تحرک پیدا کیا گیا ہے اور محض تخصیص یا محض تعمیم کی بجائے دونوں سے بیک وقت کام لے کر ایک پہ دوسرے کی تاثر پذیری کا عمل افسانے میں اجاگر ہونے لگا ہے ۔ جدید افسانے میں کہانی، کردار اور ماحول کا غیر روایتی تصوّر یہی ہے۔ افسانے کے اس تصوّر کو مزید فنی اور فکری وسعتوں سے روشناس کرانے کے لیے بعض فنکار قصہ، حکایت، تمثیل اور داستان کی سمت بھی رجوع ہوئے ہیں ۔ یہ سب کہانی کہنے کے مختلف پیرائے یا کہانی کی اصناف ہیں ۔ ان سب کا بنیادی عنصر (کہانی) پلاٹ، کردار، ماحول اور وحدتِ تاثر وغیرہ کو بروئے کار لا کر ترسیل کے عمل سے گذرتا ہے ۔ جدید افسانے میں انھیں نئی تکنیکوں کے طور پر قبول کیا گیا اور افسانے کو افسانہ رکھتے ہوئے، چاہے اس میں حکایت کا پیرایہ برتا گیا ہو یا داستان کی واقعہ در واقعہ صورت حال اخذ کی گئی ہو، جدید زندگی کی کوئی متاثرکن صورت ترسیل کی جانے لگی یا اس کی پیچیدگیوں کو داستانی استعارے کا بیان بنا دیا جانے لگا ہے ۔ جدید افسانے کا یہ معروف

داستانی رجحان ہے جس کے رنگ یوں تو تمام ہی نئے لکھنے والوں کے یہاں جستہ جستہ مشاہدے میں آتے ہیں لیکن داستانی فضا انتظار حسین کے افسانوں میں غالب رجحان کے طور پر ابھرا ہے۔ دراصل اسے انتظار حسین کا ذاتی نوسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ ماضی کی یادیں، بچھڑے بسرے خواب، اپنی مٹی (گھربار، زمین) اور احباب سے جدائی وغیرہ ایسے نفسی عوامل ہیں جن سے نوسٹلجیائی کیفیت ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے اور جب یہ عوامل خود فنکار کی ذات کا حصہ ہوں تو اس کے اظہار پر ضرور حاوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ وجدان سے نمو پا کر جب یہ فکر و خیال کی سطح پر آتے اور لسانی پیرایہ اختیار کر کے تخلیق اور ترسیل کے عمل سے گذرتے ہیں تو قدیم روایات، فرسودہ تصورات، ذہنوں میں پیوستہ توہمات اور فراموش کردہ حکایت سب کے حوالے ایک فنی پیرایۂ اظہار بن جاتے ہیں۔ یہ اگر کسی فنکار کے یہاں بار بار اجاگر ہوں تو خود اس کے فن اور اسلوب کی شناخت بھی انھیں کے ذریعہ ہونے لگتی ہے، جیسا کہ انتظار حسین کا معاملہ ہے۔

روایات، تصورات، توہمات اور حکایات افسانے کے داستانی رجحان کے علائم تو ہیں ہی مگر خاص پہلو اس رجحان کا یہ ہے کہ فنکار اسے برتتے ہوئے زبان بھی وہی استعمال کرتا ہے اور داستانوں ہی کی استعمال کرتا ہے جس سے افسانے میں داستانی فضا خلق ہوتی ہے، قدیم اور جدید دور پر محمول ہوتے ہیں اور خیال کی اترن میں سرعت اور ابہام پیدا ہوتا ہے۔ اس رجحان کو برتنے کے اہم مقاصد یہی ہیں۔ ایک مثال:

> "اور یہ آیت پڑھ کر آپ ملول ہوئے۔ میں نے سوال کیا یا شیخ یہ آیت آپ نے کیوں پڑھی اور پڑھ کر ملول کس باعث ہوئے؟ اس پر آپ نے ابو مسلم بغدادی اور احمد تمری کا قصہ سنایا کہ زبانی وصی نقل کرتا ہوں"
>
> [ زرد کتا، انتظار حسین ]

"وہ شخص تو ہنسا کیوں اور پھر رو دیا کیوں؟" جیسا استفسار ہر معروف داستان میں موجود ہے تو ذرا سی تبدیلی سے یہاں وارد ہوا ہے۔ استفسار کے جواب میں اقوم سرسبز اور کہ کے جد درد مراقبہ بیان کرنا بھی اس داستانی تکنیک ہے جس سے بالکل مشابہ رُخ پر مذکورہ افسانہ خلق کیا گیا ہے۔ داستانی زبان و اسلوب کے پہلو بہ پہلو یہی داستانی رنگ اجاگر کرنے میں مدد گار ملتے ہیں

> دیوانہ درویش ہے دو دن تک غور سے دیکھا، پھر بولا "کہو کیا غم ہے کہ ایسے ہو؟"
>
> "ہے گیانی تو بڑے ہیں کون ہوا اور مدان مندر ہیں کرتا ہے؟" اور پھر دھاوا کہ اری ساری رام کہانی کہہ سنائی
>
> [ نرنارائن، انتظار حسین ]

رشی موہن سے مسئلے کا حل دریافت کرنا یا رجوع کرنا یا کسی مرد فقیر سے رجوع کرنا داستانی تکنیک کا اہم طرز ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں جدید افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جدید افسانے کا دوسرا اہم رجحان دروں بینی، انکشافِ ذات یا شخصی اظہار کا رجحان ہے جسے اعترافی رجحان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اعتراف اپنی ذات کے متعلق سے فرد کے سچ کا اظہار ہوتا ہے۔ فنکار جو عموماً دروں ذات کے بیان میں صداقت سے کام لیا کرتا ہے اعتراف کے عمل میں خود اپنے باطن کا بیان رقم کرتا ہے یعنی اپنے سلسلے میں صداقت سے کام لیتا ہے اسی لیے اعترافی رجحان کے افسانے سے عام طور پر خود نوشت سوانح کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس قسم کا افسانہ داخلی خود کلامی کی مثال ہے جس میں فن کار اپنے باطن کا بے لاگ اظہار کرتا ہے چاہے اس کا احوال سننے والا کوئی موجود ہو یا نہ ہو۔ وہ صاحبِ راز راوی کی حیثیت سے کسی بر خود گذشتہ وقوعے کا بیانیہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ 'حال' اور 'قال' کی کیفیات ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک نئی تجربہ بن جاتی ہیں جس کی سامعین یا قرأت سے گذر کر راوی کے علاوہ دوسرا فرد بھی اسے اپنا ہی تجربہ خیال کرنے لگتا ہے اگرچہ ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں کہ اعتراف کا عمل معترف ہی کی ذات کی صداقت کا بیان ہوتا ہے مگر یہ بیان کی صداقت ہی ہے جس کی وجہ سے معترف کا وہ عمل جسے کسی وقوعے کی حیثیت سے بیان کیا جا رہا ہے، قاری کو اپنی ذات پر واقع ہونے والا محسوس ہونے لگتا ہے۔ واضح رہے کہ اعترافی افسانہ اس افسانے سے نوعیت میں مختلف ہوتا ہے جس میں ذاتِ دیگر کا تجربہ یا جگ بیتی صفر روداد ہی کے ذریعے بیان کی جاتی ہے۔ اعترافی افسانے کا راوی بذاتِ خود فن کار ہوتا ہے اور ذاتِ دیگر کا تجربہ بیان کرنے والا خود

ن کار تو ہو سکتا ہے لیکن عموماً نہیں ہوتا بلکہ یہ راوی ناظر کی حیثیت سے ایک واقعہ بیان کر رہا ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے حاضر راوی والے افسانے وگندر پال نے خوب لکھے ہیں، ویسے اعترافی خصوصیت کے حامل افسانوں کی تعداد ان میں زیادہ ہی ہے۔ عموماً جن میں کسی مفروضہ سامع یا مخاطب کے سامنے راوی اپنی روداد بیان کرتا ہے اور کبھی سامع اور راوی دونوں ایک ہی شخصیت ہوتے ہیں:

"نہیں چھوٹے بابا، مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔ نہیں، تمہارا یہ چھوٹا سا کوٹ مجھے کیسے پورا آئے گا؟ نہیں چھوٹے بابا!

میں لوہے کا بنا ہوا نہیں ہوں، لوہے اور لکڑی کے تو تمہارے کھلونے ہیں۔"

[کھلونے: جوگندر پال]

س خود کلامی میں "چھوٹے بابا" کے مفروضہ سوال پر کہ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟ متکلم کا جواب بیان کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے "چھوٹا بابا" متکلم کا مخاطب ہے اور متکلم کا "لوہے کا نہ بنا ہوا ہونا" (یا شیشے، رسّی کا بنا ہوا ہونا) متکلم کا اعتراف ہے:

"آؤ، رکو گے نہیں تو پہنچ جاؤ گے۔

لیکن پہنچنا تو رُکنے پر ہوتا ہے۔

لیکن تم ابھی پہنچے ہی نہیں تو رُکے رُکے کیسے پہنچو گے؟

کیوں، جیسے یہ درخت جس کی منزلیں آپ ہی آپ موسموں کی مسافتیں طے کر کے اس کے بدن پر آگ آتی ہیں۔"

[نادیدہ: جوگندر پال]

اس مثال میں راوی اور سامع دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ افسانے میں متکلم کا بیانیہ (اعتراف) خود سامع کا بیانیہ (اعتراف) بن گیا ہے — افسانے کو اعتراف نامہ بنا دینا بذاتہٖ ایک استعاراتی عمل ہے۔ ہر اعترافی افسانہ ضروری نہیں کہ افسانوی خود نوشت ہو۔ دراصل عصری مسائل کے متعدد پہلو اس طرح افراد پر حاوی ہیں کہ جدا جدا ہر فرد کے مسائل بعض پہلوؤں میں مشابہت رکھنے والے نظر آتے ہیں اس لیے آپ بیتی جگ بیتی اور جگ بیتی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ جوگندر پال کے بیشتر افسانوں میں یہی کیفیت نمایاں ہے وجودی فکر میں جس کا سررشتہ بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اظہار کی ایک تکنیک ہونے کے سبب ادبی اظہار میں بھی علامت کو کسی رویّے سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ داستانی فضا والے افسانے میں کسی اسطوری حوالے کے طور پر علامت موجود ہوتی ہے اور اعترافی افسانے میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے مگر بعض فنکاروں کے یہاں خالص علامتی فکر کے تحت تخلیقی اظہار ہوا ہے، وہ کسی قدر وسیع تناظر والا داستانی رجحان رکھتے ہیں نہ خود نوشت سوانح کے پردے میں محرومی اظہار کو چھپاتے ہیں بلکہ حقیقت نگاری کے علامتی اسلوب کے اختصار و تجرید کی راہ اپناتے ہیں۔ علامت اپنی خارجی لفظی سطح پر حقیقی لسانی پیکر اور داخلی معنوی سطح پر ایک تجریدی خیال ہوتی ہے جس کے توسط سے وسیع تر ذہنی تصوّر ایک یا چند لفظوں میں بیان کیا جانا ممکن ہوتا ہے، گویا فنی اظہار کے ایجاز و اختصار کے مؤثر ذریعے کے طور پر علامت افسانے میں ورود کرتی اور اپنے مختلف النوع پیرایوں کے بکثرت استعمال سے افسانے کے فنی اور فکری رجحان کی حیثیت سے اہمیت حاصل کرتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر جدید افسانے کو علامتی افسانہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک لفظ جو افسانے میں علامت بنتا ہے، دو سطحوں پر عمل کرتا ہے:

"کیا اس طرح پڑے پڑے تمہارا دم نہیں گھٹ رہا ہے؟"

"نہیں" اس کا ساتھی بولا "دم تو اٹھ کھڑے ہونے میں گھٹتا ہے۔"

اس نے پھر سوال کیا "کیا تمہارے پھیپھڑوں میں دھواں نہیں گھس رہا ہے؟"

"میرے پھیپھڑے پہلے کے مقابلے میں اب دھوئیں کے کچھ عادی ہو گئے ہیں۔"

[دھواں: اقبال مجید]

اس مثال میں "دھواں" عمومی معنوں میں (علامت کی خارجی سطح) دھواں بھی ہے اور "جبر کے تسلّط" (علامت کی داخلی سطح) کی علامت بھی۔

فعلی لسانی برتاؤ کے سبب اس علامت کو خاص افسانے کی علامت کہا جاسکتا ہے۔

علامتیت اقبال مجید کے افسانوں کا مخصوص رنگ ہے۔ ان کی علامات سریع الفہم اور وسیع المعنیٰ ہوتی ہیں اور شریتا ناظر میں برتی جانے سے افسانویت کے دائرے سے باہر نہیں نکلتیں۔

علامتی رجحان کے افسانہ نگاروں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یہ لکھنے والے اسطوری، سماجی، علمی اور نفسی وغیرہ علامات کے اخذ و اکتساب سے افسانے میں معنویت کی متعدد ابعاد سمو دیتے ہیں۔ بعض ایک طرح کی اور بعض دوسرے مخصوص حلقۂ فکر سے وابستہ علامات کی طرف متوجہ ہیں اور کچھ کی تحریروں میں ہمہ اقسام کی علامات کا تفاعل نظر آتا ہے۔ انور سجاد، سریندر پرکاش اور قمر احسن وغیرہ کا علامتی اظہار بھی معنویت کا حامل ہے۔ ان کی بیشتر علامات دور از کار، مبہم اور بے ابلاغ ہو گئی ہیں مگر پھر بھی ان کے یہاں "کونپل"، "بجوکا" اور "طلسمات" جیسی تخلیقات بھی مل جاتی ہیں جن کی علامتیت میں وسیع تجریدی معنویت، افسانوی صداقت اور عصریت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علامتی اظہار کی فراوانی کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ علامت پسندی جدید افسانے میں فوقیت رکھنے والا رجحان ہے۔

علامت ابہام پیدا کرتی ہے لیکن وہ جدید افسانہ جسے ابہام کا حامل یا ابہامی افسانہ کہہ سکتے ہیں علامتی ہونے کے علاوہ بھی (علامتی افسانہ مبہم نہیں ہوتا) چند اور خصوصیات رکھتا ہے۔ مثلاً تکنیکی لحاظ سے اس میں علامت تمثیل یا استعارہ بھی برتا جاتا ہے، افسانہ بعید از فہم اسطوری حوالوں کا نظام ہوتا ہے اور شکستہ لسانی اظہارات کے ذریعے منتشر خیالی کا اسلوب اس میں برتا ہوا ملتا ہے جس میں ہذیانی کیفیات یا برے خوابوں کی چونکانے اور ڈرانے والی فضا کے تاثرات عام ہوتے ہیں۔ ابہامی افسانہ کہانی کے روایتی تصور کے علاوہ کہانی کے غیر روایتی تصور کی بھی، جس کا گذشتہ سطور میں ذکر ہوا، نفی کرتا ہے۔ داستانی یا علامتی طرز کے کسی حد تک متسلسل بیانیہ والے جدید افسانے کے خلاف اس میں بیانیہ غیر مربوط، غیر منطقی اور مجذوب کی بڑ معلوم ہوتا اور انتشار میں ارتکاز کی مبہم کیفیت خلق کی جاتی ہے یعنی ابہام کا افسانہ اظہار کی حوالجاتی یا لسانی اور تاثراتی یا معنوی دونوں سطحوں پر دیر اثر ہوتا ہے۔ غیر فنی ابہام کو جدید افسانے کی نامقبولیت کا بڑا سبب قرار دیا جاسکتا ہے جس کی ابہامی افسانے میں بہتات ہے۔ بعض لکھنے والوں نے مشاہیر کی صف یا تذکرۂ قصہ گویاں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے کی دھن میں خوب گنجلک اور ژولیدہ افسانے لکھے نتیجے میں لغویت اور غیر فنی ابہام کو ہوا ملی اور جدید افسانہ خاصا بدنام ہوا۔ اس کے باوجود سریندر پرکاش، کلام حیدری، انور سجاد، احمد ہمیش، میرزا قمر احسن، ظفر اوگانوی، اکرام باگ، حسین الحق، احمد یوسف اور مظہر الزماں خاں وغیرہ کے افسانوں میں فن کے دائرے میں نمود کرنے والے ابہام کی تخلیق سے اس رجحان نے خاصی تقویت حاصل کی اور داستانی طرز بیان کی طرح ہر جدید افسانے پر اس کی چھاپ نظر آنے لگی۔ خصوصاً قمر احسن کی ذہنی ترجیح اسی رجحان کی طرف ہے۔ اس کے سبھی افسانوں میں خوف زدگی، تحیر، زمان و مکاں کی اجنبیت اور اعصابی صدمے کا دباؤ وغیرہ عوامل اپنے نفسی اور طبعی تفاعل میں مصروف ہوتے ہیں:

> بس اسے اتنا معلوم ہوا کہ اس کا ذہن اس کے سامنے اداس پیاسا کھڑا ہے اور اس کے جامد دانت کمانڈر کے یا کسی اور کے جسم میں پیوست ہوتے جارہے ہیں۔
>
> [صدیاں : قمر احسن]
>
> وہ شہر پرچھائیوں کا تھا۔ سارا دن پرچھائیاں موجود رہتیں لیکن رات ہوتے ہی ان سب کی آنکھوں، کانوں اور ناک سے گاڑھا سیاہ دھواں خارج ہونے لگتا۔
>
> [بریدہ جسموں کو چپکانے والا بوڑھا : قمر احسن]
>
> الف کو محسوس ہوا کہ نیچے بہت زوروں سے ابخرات اپنا سر پٹک رہے ہیں اور حباب پھوٹ پھوٹ کر پھیلتے جارہے ہیں، اس میں شامل ہوئے جارہے ہیں کوئی شے اسے تیزی سے حرکت دیتی ہوئی زبردستی اوپر اچھال رہی ہے۔
>
> [سلیماں سر بزانو اور صبا ویراں]
>
> رات ہوتے ہی میں اچانک گھر سے نکل پڑتا اور چپ چاپ کئی سیڑھیاں اتر کر ایک تہہ خانے میں داخل ہو جاتا۔

تہ خانے میں داخلے سے پہلے میرے ہاتھ میں کہیں سے ایک جلتی ہوئی شمع آجاتی۔

[ قطبیہ اور ہوا : قمر احسن ]

شت (جسم میں پوست دانت)، قبیح خوبی (آنکھ، کان، ناک سے دھواں نکلنا) نا شناختگی (کردار کو موسوم بالف) اور بے سمت سفر (سیڑھیوں والا تہ خانہ) ان مثالوں کی جزوی ابہامی خصوصیات ہیں جو قمر احسن کے مجموعی فن پر بھی منطبق ہو سکتی ہیں۔ محسوس پیکروں یا علامتی شکال کے ذریعہ افسانوی اظہاریت ابہامی افسانے کا ایک طرز ہے جس کی مثالیں خال خال فنکاروں کے یہاں موجود ہیں۔ ابہام کے اسی رز کی حیثیت تجربے سے زیادہ نہیں اور نہ اس طرز پر کوئی نمائندہ تخلیق ہی اب تک سامنے آئی ہے۔

جیسا کہ واضح کیا گیا، ان رجحانات کی جدا جدا خصوصیات ان کی شناخت بنتی ہیں اور چند فنکاروں کے یہاں انھیں ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممیز کیا جا سکتا ہے لیکن ایک رنگ کو دوسرے رنگ میں شامل ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ داستانی افسانے میں علامت ورابہام بھی ملتے ہیں، ابہام کا افسانہ علامات سے مبہم بنتا ہے، اعترافی افسانہ نگار کے کسی ڈراؤنے خواب کا بیان بن جاتا ہے اور خواب کی علامات اسطوری حوالوں میں گھل مل جاتی ہیں۔ جدید افسانے میں یہ امتزاجی وصف کہانی کے غیر روایتی تصور کو اپنانے سے پیدا ہوا ہے۔ اب ہانی کا بیانیہ غیر مسلسل، کردار نا شناخت، واقعہ غیر متوقع، زبان وقوع لازماں، مکانی وقوع "پرچھائیوں کا شہر" اور ماحول دھول اور دھند میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

اس جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ جدید افسانہ اپنے فنی اور فکری رجحانات کے زیر اثر ہر رجحان کو علاحدہ طور پر یا سب کے ملے جلے کو اپنا کر، اپنی روایات آپ وضع کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ چند زاویوں سے اس نے بعض پیش رو لکھنے والوں کی اتباع کی مگر اظہار اور تکنیک کے ن رویوں کو اس نے قصہ، تمثیل، حکایت، داستان اور لوک کہانی سے اخذ کیا اور انھیں عصری تقاضوں کے بموجب برتا ہے اس کے سبب ضی قریب کے افسانے کی نسبت اس کو ارفع تر فنی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے جسے ماورائے حقیقی معنویت، بے زمانی عصریت، غیر شخصی (تعمیمی) شخصیت اور غیر متوقع واقعیت کے افسانوی عناصر میں بآسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔

بقیہ صفحہ ۵۸ سنہرے لمحات

خیریا" کے شکار ہوتے ہیں اور ذہن کی ہر گفتگو کا آغاز "ہمارے زمانے میں۔۔۔۔" یا "جب ہم جوان تھے۔۔۔" یہ بھی ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہے نہ میرے بوڑھے ہو جانے سے زمانہ تو نہیں بوڑھا ہو گیا۔ سورج ہر دن تازہ ترین صبح اور اس کے تازہ ترین پیغامات اور امکانات لاتا ہے

ہر گھڑی ہر گام پہ فتنے جگاتی ہے نئے — نو بہ نو تازہ بہ تازہ داستاں ہے زندگی

گذرے ہوئے دنوں کی راکھ میں جب میں اپنی یادوں کو گرمانے کے لیے خوشیوں کی چنگاریاں ڈھونڈتا ہوں تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ مجھے سب سے زیادہ کہاں ملتی ہیں؟ ان بیتے ہوئے سنہرے لمحات میں جو میں نے بے فکری سے اپنے حلقۂ احباب میں بسر کیے تھے۔ جب "میں کہوں اور سنا کرے کوئی" کا عالم تھا۔ جب مجھے اپنی بات کے ہر لفظ کے آگے "نہیں" لگانا پڑتے تھے اور ان کے معنی بتانے کی کوئی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی۔ میرے گرد فضا میں خلوص تھا، محبت تھی، دردمندی تھی۔ جب مجھے کسی پر رعب جمانے کی ضرورت نہیں تھی، جب میں وہی تھا جو ہوں اور مجھے اپنے چہرے پہ کوئی چہرہ لگانے کی حاجت نہیں پڑتی تھی۔ جب میں کسی کو اپنی منطق اور دلائل سے پسپا اور قائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب میں صرف خوش ہونا اور حاضرین کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اور جب حاضرین کا اپنی گفتگو میں بھی یہی مطمح نظر ہوتا۔

زندگی سب کچھ چھین سکتی ہے لیکن نہ یہ سنہرے لمحات چھین سکتی ہے اور نہ ان لمحات سے مجھ کو۔ یہ میرے ہیں اور صرف میرے۔

میں نے بہت بڑی قیمت دے کر انہیں حاصل کیا ہے ؎

آ زندگی کے نام پہ نغمے لٹائیں دوست — اور اس سے بے نیاز کہ نام و نشاں رہے

## [redacted]

شروع سے تھا جہاں اب بھی وہیں ہے
یہاں سب کچھ بھی آخر کچھ نہیں ہے

کوئی یہ زندگی اغوا نہ کر لے
بہت ہی خوب صورت نازنیں ہے

میں دن ڈھلنے پہ سورج سے ملوں گا
ابھی مغرور، کم سن اور حسیں ہے

سمندر سے گھٹا ہے پر توں تک
کہیں ہیں پاؤں اس کے سر کہیں ہے

چھپا بیٹھا ہے کوئی آئینے میں
جسے تم ڈھونڈتے ہو وہ یہیں ہے

عجب اس دور کی ہے بے لباسی
گریباں ہے نہ کوئی آستیں ہے

جہاں تو آنکھ میچے سو سکے گا
ترے حصے کی بس اتنی زمیں ہے

## دیپک قمر

ٹوٗ کے ہاتھوں دل شکستہ کھیتیاں ہیں
پھول، پتوں کے کھلونے اور چڑیاں
ان پہاڑوں کو نئے کپڑے نہ دو
ہوں ننگے کے پاؤں تو پہنچیں وہاں
راس کرتی ہے ہوا جگنو کے ساتھ
جنگلوں کے پھول اب چوٗمے گا کون
پاؤں آنگن میں ٹکے ہیں بیل کے
کھولتے ہی تازہ منظر جاگتے ہیں

کس سمندر نے چھپائیں بدلیاں ہیں
جال مت ڈالو یہ میری بیٹیاں ہیں
اس جگہ معصوم بھولی بستیاں ہیں
اس کی چھت کو ہر طرف سے سیڑھیاں ہیں
بانس کے جنگل میں بجتی مرلیاں ہیں
شہر کے جادو سے بہکی تتلیاں ہیں
گھر کے ماتھے پر لٹکتی ڈالیاں ہیں
یہ کتابِ زندگی کی کھڑکیاں ہیں

نیند آجاتی ہے ان کی گود میں
اپنی غزلیں ماں کی میٹھی لوریاں ہیں

موہن بیکری لمیٹڈ، ۱۹۵-اوین، میرٹھ ۲۵۰۰۰۱

## انور مینائی

خود سمٹ کر خیالات کے جب، خوشنما زاویے رہ گئے ہیں
تا بہ منظر نگاہوں میں میری آتشیں دائرے رہ گئے ہیں

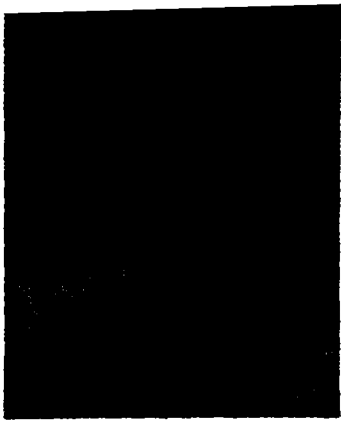
جلتے سورج کی کرنوں کو پی کر، مجھ کو بننا نہ تھا، کوئی برگد
میری نظروں میں بس چاندنی کے دلنشیں واقعے رہ گئے ہیں

یہ کھنڈر جیسے جسموں کا منظر، اور لمحوں کا یہ جلتا صحرا
دور تک زندگی کے سفر میں درد کے سلسلے رہ گئے ہیں

اے ہوا بھاگتے ساعتوں کی، کچھ بھی باقی نہیں میرے اندر
طاقِ دل میں سسکتے ہوئے کچھ خواہشوں کے دیے رہ گئے ہیں

اپنی پہچان کی دھند میں گم، اس طرح ہو گیا ہوں کہ انورؔ
اپنے ہی سے اُجالوں سے بھی اب دور کے رابطے رہ گئے ہیں

[illegible]



[گجراتی ـ پنالال پٹیل]


ایس ـ ایم ـ حیات

تامل ناڈو پبلک سروس کمیشن، راناسلائی مدراس


# قومی بچت اسکیم

گاؤں کا چوپال ـــــ چوپال کے سامنے ایک موڑ کھڑی ہے۔ چوپال کے پچھلے حصے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سویرے ہی رسوئی تیار ہونے لگی ہے۔ ہوا میں پھیلی ہوئی خوشبو اس بات کی غماز ہے کہ کوئی مٹھائی ٹپک رہی ہے۔ کوئی سبزی کاٹ رہا ہے تو کوئی بیسن صاف کر رہا ہے۔ کوئی سل بٹہ دھو رہا ہے۔ کوئی دیہاتی کرائے پر آئے ہوئے دیگوں کے ٹکڑے اٹھائے آ رہا ہے۔ وہ تین افسر تماشا ہی سے اس شور و غل میں اور بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

چوپال کے سامنے والے حصے میں ایک دم سکون طاری ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ پچھلے حصے کی بہ نسبت اگلے میں لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے۔ چوپال میں گدّے بچھے ہیں۔ ایک نوجوان افسر بیٹھا اخبار کے مطالعہ میں منہمک ہے۔ اس کے پاس ہی تین کلرک بیٹھے ہیں۔

سامنے گدّے کے پاس ایک پلنگ پوش بچھا ہے۔ درمیان میں کافی جگہ چھوڑ کر پلنگ پوش کے ایک سرے پر دو چار کسان فکرمند بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے دھوتی پگڑی والے تقریباً چالیس پچاس بیس قبیلے کے کسان ایک سی پوشاک پہنے بیٹھے ہیں۔ نیچے دھوتی اور لنگر ہیں۔ اوپر سے سر پر کنوار کی دھوپ پڑ رہی ہے۔ ان میں سے نہ تو کوئی پلنگ پوش پر بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ کوئی چوپال کی کھلی جگہ میں بیٹھنے کا خواہش مند ہے۔ اگر کوئی خواہش مند ہے بھی تو اس میں اتنی ہمت نہیں۔

صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمھیں کیوں ہوں مکھیا! سارے گاؤں کی خبر لینا ہمارے لئے ناممکن ہے" پاس ہی بیٹھے ہوئے کلرک سے ناموں کی فہرست لے کر مندرجات کے آخری حصے پر نظر ڈالتے ہوئے بولے "پہلی بات تو یہ ہے مکھیا کہ آدھے نام تم نے اس فہرست میں نہیں لکھوائے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر گھروں کے عوض تم نے صرف پانچ ہی لکھوائے ہیں!"

"ٹھیک ہے باپ جی! حکومت کے ہی کھاتے میں جو نکلے وہی ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں تو تین بیس زمینیں، مکان ہی ہیں۔ یقین نہ ہو تو گن لیجئے باپ جی!"

"اچھا اچھا! بولو تم کتنے لکھوانا چاہتے ہو؟"

"کیا لکھواؤں ان داتا؟"

"پھر وہی بات! ایک بار میں نے تم سے کہہ دیا کہ ہمیں پس و پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا" کلرک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لکھو! مکھیا کے پچاس!"

مکھیا نے اپنی پگڑی اتار کر کہا۔

"ان داتا! غضب ہو جائے گا۔ پچاس تو جھونپڑی پر کھپریل بھی نہیں ہیں ماں باپ!"

مکھیا کی طرفداری کرتے ہوئے سبھوں نے کہا۔

"نہیں صاحب، ہم مر جائیں گے!"

صاحب کی ہنسی پھوٹ پڑی۔

"ارے پگلے! مکھیا ہو کر ایسی باتیں کرتا ہے" صاحب نے یقین دلایا "یہ پیسے بارہ سال میں تجھے بیاض کی رقم ملا کر واپس کر دئے جائیں گے۔ دس کے پندرہ اور بیس کے تیس ملیں گے۔"

انہوں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ ارتھ شاستر سے کچھ دھول اور مسائل بھی سمجھائے لیکن بیٹھے ہوئے لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ خریدنے والی قوت اور پریشانی دور کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ تو صرف اتنا سمجھ رہے تھے کہ راجا کو روپیہ دینے کے لئے یا تو انہیں مویشیوں کو بیچنا پڑے گا یا کسی کے یہاں جھنے وارن کر رہنے کی نوبت آئے گی۔

صاحب نے نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ کا دوسرا فائدہ بتاتے ہوئے کہا "اس طرح تم لوگ تھوڑا دکھ برداشت کر کے خوب روپیہ اکٹھا کر سکو گے۔ گھر کا ایک فرد ہر مہینہ دو آنے ہی بچائے اور اگر گھر میں آٹھ افراد ہوں تو فی ماہ ایک روپیہ کی بچت ہو گی۔ سال کے بارہ روپئے ہوں گے۔ اور اس طرح اگر دس سال تک بچت رہے تو چھ بیس اور ایک سو بیس روپئے ملیں گے۔ یہ اچھی خاصی بڑی رقم ہوئی نا؟"

مکھیا کو ہنسی آ گئی "ارے ان داتا! اگر پیسے ہی بچتا تو لوگ قرض دار ہی کیوں ہوتے؟" لوگوں کو نہ تو صاحب کی تقریر سمجھ میں آ سکی اور نہ ہی ان کے روپئے

روپیہ مل جانے کا یقین دلانے پر اعتبار ــــ وہ جانتے تھے کہ پیسہ واپس ملے یا نہ ملے اس وقت پیسہ دئے بغیر کام نہیں چلے گا۔

مکھیا نے بات آگے بڑھائی

"اَن داتا! ہماری حیثیت دیکھ کر ہی لکھئے گا۔ میرے نام پر لکھئے دو روپئے"

"کیا پاگل ہو گیا ہے مکھیا؟" کلرک نے کہا اور ایک کاغذ کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو! دوسرے گاؤں کے مکھیا نے کتنے لکھوائے ہیں؟ ہیں نہ پچاس روپئے؟!!"

"ہوں گے باپ جی! ہم ٹھہرے ان پڑھ گنوار۔ آپ جھوٹ تھوڑے ہی بولیں گے؟"

"تب بول!" کہتے ہوئے کلرک نے قلم اٹھالیا

صاحب نے کہا: "لکھو بیس روپئے!"

لیکن جب مکھیا کو پھر سے پگڑی اتارتے ہوئے دیکھا تو پندرہ کر دیئے اور کہا: "اب کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے مکھیا! ہاں ب کس کا نمبر ہے؟"

کلرک نام بتانے لگا۔ جیسے جیسے وہ نام گنواتا رقم کبھی صاحب لکھواتے کبھی کلرک اپنے دل سے لکھ لیتا۔ کسی کے پانچ، کسی کے دس۔ پانچ روپے سے کم کی گنجائش سرٹیفیکیٹ میں نہیں تھی۔

صاحب جانتے تھے کہ ان لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہے اور یہ سب پریشان ہیں۔ لیکن کریں کیا۔ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ اسکیم کو عام کرنا ان کے ذمے تھا۔ جہاں ساری رعایا ہی غریب ہو وہاں کس کس کو رعایت دی جائے کس کس کو بخشا جائے۔

صاحب نے ایک غریب کسان کی درخواست پر غور کرتے ہوئے اسے چھوڑ دینے کا خیال کیا ہی تھا کہ کلرک نے اس کے شانے پر پڑا ہوا رومال اتار لیا۔ اس کے سیاہ ہاتھ پر چاندی کی چوڑی چمکنے لگی۔

"دیکھا! کہتا ہے کہ غریب ہوں!"

صاحب کو کلرک کی بات جچ گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جب لنگوٹی پہننے والی رعایا تین تین کپڑے پہن سکتی ہے مویشی رکھ سکتی ہے تب یقیناً یہ لوگ غریب تو نہیں ہو سکتے۔ ان کے پاس پیسے تو ہوں گے ہی نا۔

اس کسان کی مدد کے لئے دوسرا کسان دوڑا۔

"صاحب! یہ تو اس کی بہن کی ہے!"

صاحب چڑھ گئے۔ "ٹھیک ہے تو لکھو اس کے پانچ اور اس ہشیاری ظاہر کرنے والے کے دس روپے!"

"ارے باپ رے! غضب ہو جائے گا ماں باپ!"

اس کسان کو مانو سچ مچ بخار چڑھ آیا ہو۔

کلرک کو ایک ہندسے پر بندی رکھنے کتنی دیر لگتی۔ اس نے کہا ــــ "رام جی! لگا انگوٹھا!"

بیچارہ رام جی ابھی تک اسے مذاق ہی سمجھ رہا تھا۔ مصیبت میں پھنس کر جیسے لوگ بھگوان کی طرف پُر امید اور ملتجی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں ویسے ہی رام جی نے مکھیا کی طرف دیکھا۔ مکھیا اس کسان کی سفارش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کہا "ہاں! اَن داتا! یہ بالکل غریب ہے۔ عورت مر گئی ہے اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

صاحب سمجھ گئے کہ نرمی سے کام نہیں چلے گا۔ کڑکتے ہوئے بولے "بچوں کی پرورش کے لئے اس کے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ راجا کے نام پر اس سے دس روپئے نہیں دیے جاتے۔ لگواؤ اس کا انگوٹھا جلدی کرو!"

اب کیا تھا۔ کلرک سبھوں کے نام پانچ پانچ روپے لکھتا چلا گیا۔ گڑگڑا کر منت سماجت کرنے والے کے لئے دس کا ہندسہ تیار ہی رہتا۔

کام پورا ہونے پر صاحب نے کہا۔

جب کوئی عملدار پیسے وصول کرنے آئے اور اس کے عوض نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ دے تو اس کاغذ کو سنبھال کر رکھنا!

مکھیا ہی نہیں سارے گاؤں والوں نے محسوس کیا کہ صاحب گپ مار رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب غریبوں کو دھوکہ دینے کی ایک چال ہے۔

ایک ہی مہینے میں عملدار پیسے وصول کرنے آ پہنچا۔ کسی نے رحمن کی دکان سے ایک روپیہ پر ایک آنہ فی ماہ بیاض کی شرح پر روپیہ قرض لیا تو کسی نے دھان بیچ کر روپیہ اکٹھا کیا۔ بعض نے پہلے سے ہی گھر اور مویشی بیچ کر روپئے جمع کر رکھے تھے۔ مگر رام جی کی مشکلات کا ٹھکانہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ رحمن کی دکان والے نے بھی روپیہ بیاض پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کل اثاثہ صرف ایک بکری اور تین چھوٹے چھوٹے بن ماں کے بچے تھے۔ جس نے عملدار کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"صاحب آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کیا دوں۔ کیسے دوں؟"

اس بات کو سن کر عملدار کاٹ کھانے کو دوڑا۔ گالیاں بھی دیں۔ اور ایک لات بھی جما دی۔ "اٹھ سالے سور! پیسے نہیں ہیں تو بیچ دے عورت!"

"لیکن صاحب! میری عورت تو کبھی کی مر گئی۔ کیا بیچوں؟"

"کیا بیچوں بتاؤں؟" کہتے ہوئے عملدار کا نوکر تنگ آ گیا۔ آخر پھر مکھیا کو مداخلت کرنی پڑی۔ اس نے رام جی کو گھر بھیجتے ہوئے کہا: "ایک بکری ہے وہ بھی بیچ دے۔ جا!"

اس وقت غرض راؤجی کی تھی۔ اس لئے پندرہ کے دس روپے دینے والے بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ آخرکار دوکاندار ہی کو مہربانی کرنی پڑی۔ اس نے آٹھ روپے بکری کے اور ہر ماہ فی روپیہ دو آنے بیاض کی شرح سے جتنی رقم دو روپے ملا کر کل دس روپے راؤجی کے ہاتھ میں تھما دیے۔

راؤجی کے ہاتھ میں دس روپے کا نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ آ گیا۔ لیکن سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آتے ہی ایک سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کاغذ کو وہ کہاں رکھے۔ پلاسٹک کے چھوٹے سے گھر میں نہ تو کوئی صندوق تھا اور نہ کوئی مٹی کا چھوٹا سا برتن۔ ماہانہ بھرنے کی کوشش بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور پھر ایک آدھ مہینے سنبھال کر رکھنے کی بات ہوتی تو کوئی ترکیب سوچی جاتی۔ یہاں تو سوال پورے بارہ سال تک سنبھال کر رکھنے کا تھا۔

راؤجی کو ہنسی آ گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ کاغذ درحقیقت سنبھال کر رکھنے لائق ہے بھی یا نہیں۔ اس بارے میں مکمل تحقیق کرنے دو چار لوگوں کے ساتھ وہ بھی دوکاندار کے یہاں گیا۔

دوکاندار ان پڑھ تھا۔ معمولی گجراتی پڑھ لیتا تھا۔ انگریزی کی بات تو دور رہی۔ لیکن جب اس نے سرٹیفکیٹ پر روپے جیسی عبارت دیکھی اور برٹش راج کا سکہ دیکھا تو اس کے دل میں ہمت سی بندھی۔ اس نے پوچھا۔

"اگر یہ کاغذ مجھے آٹھ آٹھ آنے میں دے سکو تو میں لے لوں گا!"

"ارے جا سیٹھ! پانچ روپے کا کاغذ آٹھ آنے میں۔ خوب ٹھگنے جا نکلے ہو۔ چلو بھائی یہاں سے" کہتے ہوئے سب چلے گئے۔ مگر راؤجی نہیں اٹھا۔ اس نے آج اس دوکاندار کو ٹھگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ بولا۔ "ان سب کے کاغذ پانچ پانچ روپے کے ہیں اور میرا کاغذ ہے دس روپے کا۔"

"تب ایک روپیہ لے۔ بول راضی ہے؟"

"نہیں۔"

"چل ڈیڑھ روپیہ لے۔ دینا ہو تو دے نہیں تو سنبھال اسے۔ گھر جا کر ساگ میں ڈال دینا۔ کھٹاس آ جائے گی!"

راؤجی نے دوکاندار کی نیت تاڑ لی اور دوکاندار نے اسے روکا نہیں لیکن راؤجی پھر اس کاغذ کو سنبھالے رکھنے کی فکر میں الجھ گیا۔ اس جھنجھٹ سے بچنے کے لئے اس نے کہا۔ "سیٹھ! قرض کے دو روپے بیاض اور اصل رقم ملا کر کل رقم چکا کر لینا ہے۔ بولو ہے مرضی؟"

دوکاندار نے دو روپے دکھائے اور بیاض کے آٹھ آنے فوراً مانگے۔

"دو روپے کا بیاض آٹھ آنہ لا۔ رکھ ہاتھ میں!"

راؤجی کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

"ارے روپیہ لینے میں ایک بکری پھونک مارنے کی دیر بھی نہیں ہوئی اور اتنے میں بیاض آٹھ آنے ہو گیا!"

دوکاندار ہنسا۔ "یہی تو بات ہے۔ کرو حساب۔ دو روپے کی دو آنے چار آنے۔ اور چار آنے ایک مہینے کا بیاض یہاں تو بیس تاریخ میں ٹھیک ایک مہینہ ہو گیا۔"

راؤجی سمجھ گیا جب دوکاندار پورا حساب چکا دے گا تو وہ کاغذ دے دے گا ورنہ نہیں۔

"ارے بھئی! چکا دوں گا۔ کاغذ دے!" کہتے ہوئے دوکاندار نے کاغذ لیا اور تین بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخرکار اس نے سوچا۔ پڑا رہے گا۔ بارہ سال کے بعد پیسہ حکومت سے واپس مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ سمجھوں گا کہ بکری دس روپے میں ہی خریدی تھی۔

سرٹیفکیٹ پر راؤجی کا انگوٹھا لگوایا اور بہی کھاتہ کھول کر اس کا کل حساب بیباق کر دیا۔ "بس! اب تو خوش ہے نا؟"

دوکان سے باہر نکلتے وقت راؤجی بے حد خوش ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر جانے سے پہلے مکھیا کو خوش خبری سنانے کے لئے ادھر مڑ گیا۔ باہر سے وہ اپنی چالاکی کے گن گاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں نے تو اس کاغذ کے ڈھائی روپے پیدا کر لئے ہیں مکھیا!"

مکھیا کو ہی نہیں، بلکہ بیٹھے ہوئے دیگر چند جن لوگوں کو بھی راؤجی پر غصہ آیا۔ مکھیا نے کہا۔ "ارے بندر! دس روپے کی رسید تو مر! نہیں، ڈھائی روپے ہی مارے مر رہا تھا کیا۔"

لمحہ بھر راؤجی نے محسوس کیا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی اور وہ ٹھٹھک سا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنی مشکلات یاد آ گئیں۔ اس نے کہا۔ "میں تو نہیں مروں گا مکھیا، لیکن بکری کے دودھ کے بغیر کام چل جائے گا۔ پھر سے بھی میں کچھ نہیں مانا لیکن ——" آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف نظر گھماتے ہوئے کہا۔ "بارہ سال تک تم سب لوگ اس کاغذ کو سنبھال کر رکھ سکو گے؟"

اب سب کی آنکھیں کھلیں اور کاغذ سنبھالنے کا مسئلہ پریشان کرنے لگا۔ نہ صندوق نہ پیٹی نہ پیالی۔ یہاں تک کہ ڈھکن یا جیسی دیوار میں طاق جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ سبھوں نے محسوس کیا کہ راؤجی کا کام بن گیا۔ اس نے کاغذ کے جھگڑے سے جان چھڑا لی۔ اس احساس کے ساتھ ہی پندرہ بیس کی ٹولی میں سے ایک کے بعد ایک کھسکنے لگا۔ سبھی بھاگ دوڑ کرنے لگے۔

[باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے]

## معصوم انصاری

اب دستِ ستم پیشہ میں خنجر نہ رہے گا
یا پھر مرے شانوں پہ مرا سر نہ رہے گا

موسم کا تغیر ہے بہر حال یقینی
سب دن تو سلگتا ہوا منظر نہ رہے گا

ہر اونچی عمارت پہ عقابوں کا ہے ڈیرہ
محفوظ کسی چھت پہ کبوتر نہ رہے گا

میں یوسفِ کنعاں کا طرفدار ہوں یارو
کیا میرا برادر بھی برادر نہ رہے گا

معصوم اسی فکر میں کٹ جاتی ہیں راتیں
میں سو کے اٹھوں گا تو مرا گھر نہ رہے گا

مکان نمبر ۴۹۔ بدھوار چوتھا نظام پور پوسٹ آفس
بھیونڈی ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

## عاصم شہنواز شبلی

کوئی مسکن کوئی دیوار نہ در رکھتے ہیں
ہم مسافر ہیں فقط راہ گزر رکھتے ہیں

جس کی شاخوں پہ کبھی کھلتے نہیں تازہ گلاب
اپنے آنگن میں ہم اک ایسا شجر رکھتے ہیں

پھول ہو تتلی ہو سپنا ہو یا موسم کوئی
سب کی افسردہ نگاہی کی خبر رکھتے ہیں

میری لہرائی میں اترو تو سمجھ جاؤ گے
ہم وہ پتھر ہیں کہ پھولوں کا جگر رکھتے ہیں

توڑنے والے چلے آؤ کہ ہم دل کی جگہ
اپنے سینے میں کسی تتلی کا پر رکھتے ہیں

شعلۂ فکر سے اک پل بھی نہیں ہم کو نجات
رات دن آگ کے دریا کا سفر رکھتے ہیں

یک بیک تیز سی ہو جاتی ہے دھڑکن دل کی
میرے اشعار بھی کچھ ایسا اثر رکھتے ہیں

۵/۹ زرین اسٹریٹ، پہلا منزلہ، کلکتہ ۱۶

## خورشید طلب

کسی گھر میں نہیں اب بے شکن بستر تعلق کا
سرِ منظر برہنہ ہے ہر اک منظر تعلق کا

کریں ہم اپنی من مانی ہی لیکن متحد ہو کر
یہی رستہ ہے اپنے بیچ اک بہتر تعلق کا

نہ چھو پائے پرندے پاک رشتوں کی بلندی کو
بس اک ساعت میں زخمی ہو گیا شہپر تعلق کا

سمٹتے جا رہے ہیں ہم حصارِ اجنبیت میں!
بدلتا جا رہا ہے ہر نفس تیور تعلق کا

وہ اک سایہ جو بٹ کر فاصلوں میں اجنبی سا تھا
قریب آیا تو پھر کھلتا گیا دفتر تعلق کا

یہ ہر لمحہ بکھر جانے کا اندیشہ لگا رہتا
بنا کر ریت پر کرتے بھی کیا ہم گھر تعلق کا

معرفت ایم آئی خان، ای ای آفس کارگل (دربھو) گریڈیہہ (بہار)



وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل، سندیلہ (ہردوئی)

# سنہرے لمحات

میں زندگی کے سترہویں سال یعنی تین بیس اور دس [ دس اور سات، جوانی کی راتیں مرادوں کے دن، والا سترہ نہیں ] کے اونچے سنگ میل پر کھڑے ہو کر پیچھے نظر دوڑاتا ہوں تو دو متضاد احساسات ابھرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہائے! زمانہ کتنی جلد گذر اور بدل جاتا ہے۔ کتنے ارمان ابھی دل میں کلبلا ہی رہے ہیں کہ کھٹکا پیدا ہو گیا کہ اب گھنٹی بجا ہی چاہتی ہے کہ تماشا ختم، نکلو سنیما ہال سے باہر اور دوسرا یہ کہ زمانے کو اور تیزی سے گذرنا اور بدلنا چاہیئے کہ صرف گھڑیوں اور کلنڈروں کے ذریعہ بر انعام نہیں بلکہ واقعی ایسا بدل جانا چاہیئے کہ آج کل سے بالکل ہی مختلف ہو جائے (کیونکہ میں اس کی موجودہ روش سے غیر مطمئن ہی نہیں بلکہ بیزار بھی ہوں) غالباً پہلا احساس میرا ہے اور دوسرا میرے اندر چھپے ہوئے انسان کا جو میرے جیسا خود غرض نہیں۔ میں تو صرف اپنی ذات کے چھوٹے ترازو سے زمانے کو تولتا ہوں اور وہ عام بنی نوع انسان کے بڑے پیمانے سے اسے ناپتا ہے۔ میں مر جاؤں گا، ختم ہو جاؤں گا لیکن وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے گا ؎

میں ہوں نا انجام داں انساں ہے کب یہاں دو دن کا وہ مہمان ہے

ستر سال واقعی ہم انسانوں کے معیار سے ایک بڑی مدت ہے۔ کچھ ابتدائی اور کچھ آخری سال چھوڑ کر قریب پوری ایک صدی! اور پھر وہ بیسویں جیسی ہنگامہ خیز صدی! جس میں چند دنوں میں وہ ہو جاتا ہے جو پہلے برسوں میں نہیں ہوتا تھا۔ ان ستر سالوں میں لمبائی کے ساتھ گہرائی بھی ہے۔ افسوس کہ ستر سال یا اس سے بھی آگے بڑھ کر مرنے والوں کے لیے کوئی بھی یہ کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمر کی افزائش کے ساتھ خواہشوں اور ارمانوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوتی البتہ ان کی نوعیتیں ضرور بدل جاتی ہیں۔ بقول حضرت غالب ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

چھونے، پینے، چھلکانے اور لہرانے کی طاقت نہیں رہی تو کیا ہوا! ان باتوں کی آرزو نہیں کر سکتے تو یہ آرزو کب ختم ہوگی کہ ساغر و مینا کو دیکھیں اور ان کے متعلق پرکیف تخیلات میں گم ہو جائیں۔ طلب کا موضوع بدل گیا لیکن اس کی کیفیت اور کمیت اور شدت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

عمر کی اس بلندی سے جب میں نیچے اور پیچھے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اس مقتل میں جس میں میری زندگی کے قریب ساڑھے پچیس ہزار دن کام آچکے ہیں عجیب مناظر دکھائی پڑتے ہیں لیکن زیادہ تعجب خیز وہ ہیں جو باوجود تلاش نہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ مجھے کہیں شہرت اور عزت کے جھنڈے اور پھریرے نظر نہیں آتے۔ جگمگاتے ہوئے جلسے اور موٹروں سے چھپاتی ہوئی کانفرنس بھی نہیں دکھائی دیتیں۔ راشٹرپتی، پردھان منتری، مکھ منتری کی اونچی کرسیوں کا ذکر کیا کریں کہ لوک سبھا، ودھان سبھا کی ممبری یا کسی ملکی یا صوبائی ادارے یا انجمن کی مقابلتاً نیچی کرسی بھی دکھائی نہیں پڑتی البتہ اپنی نگر پالیکا کی صدارت کا ٹوٹا ہوا اسٹول ضلع پریشد کی چیرمینی

کتابیں اور چند ضرورت سے زیادہ معاشی اداروں کی صدارت اور نظامت کی اور کارروئنہ پڑھیائی اور چند تعصباتی مشاعروں اور ادبی
نشستوں کی مسند نشینی کی جھوٹی دریاں اِدھر اُدھر مٹی کے ڈھیروں کے نیچے دبی ہوئی ضرور جنت نگاہ بنیں۔ اور پھر جب خیال آیا کہ ان پست
اور گھٹیا چیزوں کے حصول کے لیے بھی مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے تھے تو مجھے خود اپنے آپ سے تھوڑی سی ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس خود ترحمی
سے بچنے کے لیے میں نے اپنے اوپر طبل و علم سے بے نیازی اور ملک و مال سے بے ثباتی کی فضا طاری کر لی۔ میں کچھ ہو جاتا تو کیا ہو جاتا؟ میرا
جاہ و حشم کب تک رہتا؟ اور نہیں ہوا تو اس سے میری اس خالص تن کی زندگی میں کون سی کمی رہ گئی؟ اور پھر جب آخر میں سب کا حشر ایک ہی
ہونا ہے تو ؏ چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک۔ ؎

ہیں گودِ غریباں میں سبھی خاک کے تودے
دارا نہ سکندر نہ وہاں کوئی بھی جم ہے

میں نے اپنی ادبی تخلیقات کے چراغوں کی طرف کچھ پُرامید نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں میرا خونِ دل جلا تھا، ان کی روشنی کا
ضرور کوئی حلقہ ہوگا۔ لیکن یہ کیا؟ کچھ چراغوں کا ایک سرے سے پتہ ہی نہیں تھا غالباً وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں لاپتہ ہو چکے تھے۔
کچھ بجھے ہوئے اِدھر اُدھر کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے البتہ کچھ نیم جان مدھم سی روشنی دے رہے تھے لیکن ان کے قریب
ہی دوسروں کے ہزاروں واٹ کے بجلی کے بلب روشن تھے اور بے شمار پروانے ان ہی کے گرد رقص کر رہے تھے اپنی ناقدری اور اپنے
ساتھ ناانصافی پر دل بھر آیا لیکن پھر اس خیال سے تقویت ہوئی کہ ہر چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی۔ بزمِ ادب میں بھی شہرت اور
عزت کا بہت کچھ دارومدار پیدا ہو گیا، 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' والی گٹ بندی، نقادوں کی ناواقفیت اور عصبیت، مدیران
سے دوستی، انعامی کمیٹی کے ممبروں کی چاپلوسی، جاہ و منصب کی دھونس، نیتاؤں کی سرپرستی اور پس پردہ کاٹ چھانٹ وغیرہ پر رہ گیا
ہے۔ لہٰذا یہاں صرف شہرت اور عزت سے مرعوب اور متاثر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے سے جو بن پڑے وہ خلوصِ نیت
کے ساتھ کرتے اور ستائش و تحسین کی طلب سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اپنی تخلیق ہی اپنا سب سے بڑا انعام ہوتی ہے ؎

تلاشِ حسن کرتا ہے جو اپنی ذات سے آگے
تو ہر غنچے میں پنہاں پنجۂ صیاد ہوتا ہے

خیر یہ سب تو ایک طرح سے بیرونِ خانہ کی باتیں تھیں، میں جب اندرونِ خانہ نظر کرتا ہوں اور اپنے آپ کو اپنے اعزا و اقربا، یار
دوست اور احباب کے جھرمٹ میں گھرا ہوا پاتا ہوں تو میرا دل طمانیت اور خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ گھر سے باہر تو ہجوم، فرد کو کھا
لیتا ہے اور کسی نمی پر سد کر بہا جیت، والا مضمون ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنے گھر اور اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں، میری ایک اپنی
شخصیت اور اہمیت ہوتی ہے اور میں اپنے آپ کو ایک جیتا، جاگتا انسان محسوس کرتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو یہی میری دنیا اور یہی میری
سلطنت ہے۔ اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں اپنے سماج سے بھاگنا اور منہ چرانا چاہتا ہوں اور میری تمنا یہی ہے کہ
اس کے معاشرے موڑنے والوں میں میرا بھی نام ہو۔ آخر میرے گھر والے اور دوست و احباب سماج ہی کا ایک جزءِ لاینفک ہیں
کہ نہیں؟ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنے اعزا و اقربا اور دوست و احباب کے درمیان اپنے آپ کو زیادہ فطری، مؤثر اور تابناک محسوس
کرتا ہوں۔

اعزاء اور اقربا میں میرے بیشتر بزرگوں کو تو میری عمر ختم کر چکی۔ آخر وہ بیچارے کتنا جیتے جو اب میرے بزرگ بنے رہتے۔
تماشا زیادہ طول کھینچتا ہے تو اکثر تماشائی سو ہی جاتے ہیں۔ میرے لڑکے لڑکیاں اور اُن کے بچے بچیاں حفظ مراتب کا پورا لحاظ رکھنے
کے باوجود میرے دوست ہیں۔ اُن سے بے تکلف بات چیت ہوتی ہے، اکثر بحث بھی ہو جاتی ہے، اختلاف بھی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے
کے خیالات کا احترام بھی کرتے ہیں، ایک دوسرے کے مشاغل میں دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور آپس میں دل کی بات کہتے نہیں جھجکتے۔ ان
سب کو میرے حلقۂ احباب ہی میں شامل سمجھنا چاہیے۔ میرا بڑا لڑکا ایڈوکیٹ ہے اس سے کسی مقدمے کے قانونی نکتے پر تبادلۂ خیال
ہوتا ہے۔ میرا چھوٹا لڑکا انجینئر ہے اس سے فلکیات کی کسی نئی دریافت پر معلومات کا لین دین ہو جاتا ہے۔ پوتے سے میں کرکٹ کے
متعلق کوئی نئی بات معلوم کرتا ہوں۔ نواسا مجھے کسی فلم کے بارے میں کوئی باریک نکتہ سمجھاتا ہے۔ میں ان بزرگوں میں نہیں ہوں جو یادش

# مکتوب

**[illegible] جعفری** — ۱۱۔ بیچ چھاسترا، گرد نگر، جلی سڑ، اوجیری، بیتی
تنقیدی گوشہ حامدی کاشمیری اچھا ہے، تصاویر کے سبب گوشے کی جامعیت بڑھ گئی ہے۔
آپ نے صد رسم الخط، زبان کے مسائل اور اس کی ترقی کے سلسلے میں حکومتی اقدام کے بارے میں جو اداریہ لکھا ہے اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ کچھ کر نہیں پاتے، جو ارباب اقتدار و اختیار ہیں ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ اگر مختلف صوبائی اکیڈمیاں ہر ماہ "شاعر" اور دوسرے ادبی رسائل کی تھوڑی تھوڑی کاپیاں ہی خرید لیا کریں تو مسئلہ حل نہ بھی ہو تو کچھ تو فرق ہو جائے لیکن انہیں کون سمجھائے۔

**منظر اعجاز** — ۳۱۔۳۔۱۲، فرحت نگر، حسین آباد — ۲۲
"شاعر" کے شمارہ نمبر ۷ میں، جیسا کہ تنزیل خاں صاحب نے شمارہ ۹۔۱۰ میں شائع شدہ اپنے مراسلے میں نشان دہی کی ہے، زبیر رضوی جیسے کہنہ مشق شاعر نے زبان کو موزون سخن والا باندھا ہے، مومن خاں شوق (جنھوں نے غرض کو تحقیق اور شکر کو شکر باندھا ہے) تو خیر تازہ وارد ہیں لہٰذا ہوائے دل ہیں لیکن فنی طور پر ایسی سقیم تخلیقات کی اشاعت سے "شاعر" کا معیار متاثر ہو جاتا ہے جس کا نام سیماب اور اعجاز صدیقی جیسے مشاہیر ادب سے وابستہ ہے۔ زبیر رضوی کی نظم میں ایک اور فاش غلطی ہے آخری بند میں لفظ "تمنا" ردیف ہے اور قافیہ غائب ہے نظم آزاد یا نثری نظم بھی نہیں بلکہ از اول تا آخر پابند ہے۔ یہ بات شاعر کے عجز بیان / سہل انگاری کی غمازی کرتی ہے۔ بند آسانی پابند کیا جا سکتا تھا جیسے —

امن شاخ نہال تمنا
امن ارماں کا خال تمنا
امن جذب جمال تمنا
امن ظل خیال تمنا

اسی نظم کے دوسرے بند میں یہ مصرع —
"دولہا دولہن براتوں کے باجے" کو "ہیں شادی بیاہوں کے باجے" کر دیا جائے (نیز بند کا ہر مصرع لفظ امن سے شروع ہو گا جس کا التزام ساری نظم میں رکھا گیا ہے بجز مذکورہ مصرعے کے۔ دوسرے لفظ دولہن کی قرأت کا، جو بروزن چمن استعمال ہوتا ہے (اور بمعنیٔ گلشن استعمال کیا گیا ہے) سقم بھی دور ہو جائے گا۔

جلیس نجیب آبادی نے اپنے مراسلے میں اپنی غزل کے ایک مصرعے میں لفظ "ہی" کے اضافے کو کاتب کی کارستانی قرار دیا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے کامن سینس کی ضرورت پر اصرار کیا ہے عجیب کہتے تو یہ ہے کہ اس کے لیے کامن سینس کے بجائے علم عیب درکار ہے میری غزل میں ایسا کوئی بس کامن سینس سے سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں کسی لفظ کی کمی بیشی نہیں۔
"شاعر" (شمارہ ۹۔۱۰) کے تازہ شمارے میں آپ نے حامدی کاشمیری کا ترجمہ بہ طور خصوصی شمارہ شائع فرمایا ہے۔ میری

غزل کا شعر ہے —

قریب آنے سے کر لو حذر لوگو!
مرے سینے میں اک آتش فشاں ہے

پہلے مصرع میں حذر جو بروزن گذر ہے بروزن سفر باندھا گیا ہے یہاں کتابت کی غلطی کا امکان نہیں کہ تحریر خود شاعر کی ہے اس مصرع کو "حذر کرنا قریب آنے سے لوگو! — کر دیا جائے تو یہ سقم دور ہو سکتا ہے۔

مظفر حنفی، نصا اس نیمی، اختر سعید خاں، ملتمس ٹڈوی اور رؤف خیر کی غزلیں "سہل، پختہ و پیچیدہ و تہ دار" کی تعریف میں آتی ہیں۔ رؤف خیر نے مطلع کے مصرع اوّل میں "عاد کسی طرح کی بھی تجدید مت کرو" کہا ہے اور دوسرے مصرع میں "دشمن پہ بھی تنقید مت کرو" کہہ کر خود ہی تحدید عائد کر دی ہے، ویسے غزل من حیث الکل بہت عمدہ ہے۔

عبداللہ کمال کی غزل "میرا احساس ....." الخ "معلوم نہیں کس بحر میں ہے۔ مجھے تو یہ اچھی خاصی ایجاد بندہ معلوم ہوتی ہے کوئی بحر ہے بھی تو کم سے کم اردو میں غیر متداول ہے سوائے مطلع کے سارے مصرع ہائے اوّل نصف رکن کی حد تک ٹوٹ گئے ہیں ویسے اگر "جائے" کو (جو بروزن فاع ہے) بروزن فعلن باندھا بھی جائے (جو معیوب حد تک غیر فصیح ہے) تو بھی بات بنتی نظر نہیں آتی۔

"شاعر" کے حسن صوری و معنوی میں دن بہ دن اضافے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے اس پر مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا —

ڈرتا ہوں بڑھتے بڑھتے خدا میرا ان جائے
کچھ اس ادا سے حسن ہے اک شخص کا مرا

**شہنشاہ مرزا** ——— ۸۲۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ
حامدی کے گوشے میں سب سے اچھا مضمون ان کا لیا محترمہ کا ہاشمی محمود ہاشمی کے ساتھ ان کی گفتگو خوب رہی۔ باقی اور مضامین مجھے زیادہ اچھے نہیں معلوم ہوئے چاہے پال صاحب ہوں یا عابد ق صاحب یا پھر مظہر امام کے مضامین، معلوم ہوتا ہے محض مضمون لکھنے کا فرض ادا کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ البتہ برراج کومل نے اپنی عادت کے مطابق مضمون محنت سے لکھا ہے۔ ہر حال آپ نے تو بھی گوشہ کو نہایت سلیقہ سے پیش کیا ہے، لہٰذا آپ کی تعریف تو کرنا ہی پڑے گی۔

**اسلم حنیف** ——— گنورہ، بدایوں (یوپی)
زندگی بہت سی مصروفیات سے فارغ ہوا تو "شاعر" کے کئی شمارے بیک وقت پڑھ ڈالے۔ انشائیہ نمبر کا بطور خاص مطالعہ کیا۔ جہاں تک انشائیہ صنف کی تحقیق و تنقید کی بات ہے انور سدید کا مضمون "ادب، معاصری آگہی اور انشائیہ" اور ڈاکٹر سلیم اختر کا "انشائیہ کی بنیاد" کافی دلچسپ ہیں۔ آپ نے انشائیہ ایک موضوع میں انشائیے کے حدود و امکانات کو سمیٹنے کے لیے کافی وقیع مواد فراہم کیا ہے۔ میں تو یہ کہہ سکتا تھا کہ شاید انشائیہ جیسی صنف ابھی آپ کی توجہ کے لیے دیر تک منتظر رہے گی لیکن اس شمارے کو دیکھ کر یہ

انتہا مسرت ہوئی لیکن مضامین حقہ معیاری ہیں تخلیق تو گے دیکھ کر مجھے انتہائی افسوس بھی ہوا۔ تخلیقی میدان میں انشائیہ میری پسندیدہ صنف ہے اس لیے زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت اس کے تخلیقی کرب کا عرفان مجھے حاصل ضرور ہے اسی لیے شمارے میں موجود تمام انشائیوں کو میں نے دلچسپی سے پڑھا مگر مجھے ان میں انشائیہ پن کی ہر جگہ کمی کھلی۔ بعض انشائیے تو خالص مزاح کے ذیل میں آتے ہیں اور بعض اس صنف کے تقاضوں کو برائے نام ہی پورا کر پاتے ہیں۔ ان تمام انشائیوں کو پڑھ کر انشائیہ کیا ہے یہ سوال تو فراہم ہوتا ہے مگر انشائیہ کیا ہے کا ثبوت نا پید نظر آتا ہے۔ کاش ہمارے معاصر فنکار اس صنف پر سنجیدگی اور متانت سے غور فرما کر اس کے تخلیقی میدان کو سر کرنے کی مہارت کا ثبوت دیتے۔

"شاعر" کا شمارہ ۹۔۱۰ بھی اپنے منفرد مزاج کی خوبصورت توضیح ہے۔ حامدی کاشمیری کی شخصیت واقعی اس قابل تھی کہ "شاعر" جیسا بلند معیار جریدہ ان کے فن و حیات پر مبسوط مقالات شائع کرتا۔ گوشۂ حامدی کاشمیری کے تمام مضامین اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے حامدی کی حیات اور ان کے تنقیدی اور شعری منہاج کو خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کے خلوص اور انتھک کوششوں کو واضح کرتا ہے۔

حامدی کاشمیری کی چار غزلیں آپ نے اس شمارے میں شامل کی ہیں۔ تعجب ہے کہ حامدی جیسا تا مزاج موزوں شعر تخلیق کرتا ہے۔ ذیل کا شعر توجہ کا مستحق ہے —

قریب آنے سے کر لو حذر لوگو
مرے سینے میں اک آتش فشاں ہے

اس شعر میں حذر بروزن عام استعمال ہوا ہے جس کی بنا پر شعر ناموزوں ہو جاتا ہے حذر بہ سکون ذال کے معنی ضد کے ہیں لیکن یہاں پرہیز کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
غالب کا شعر ہے —

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

یہاں حذر بروزن فعل استعمال ہوا ہے جو درست ہے لیکن حامدی صاحب اسے سقیم صورت میں نہیں برت سکے ہیں۔ وہ بھی اتنی ہیں جنھیں یہاں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ انور خان، شفق اور ابن کنول عصری مسائل کے نقد آشنام کہانی کے خوبصورت علامتی افسانوں کو پڑھ کر کافی فرحت محسوس ہوئی۔ اقبال انصر لین کا سعد کے افسانے قلندر اور عزیزہ بیچوا اہم نگار شات ہیں ان کے وسیلے سے میں یہ کہوں کہ ان قلم کا روں کے بیان جو ابتدا میں ابہام کی ہلکی پھلکی جھنگ وہ اب بالکل ختم ہو چکی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ابن کنول [illegible] کے معصوم مزن میں [illegible] کا مطالعہ ان کے لئے [illegible] اور اہم تاثر نتیجہ ہوتا ہے۔
"شاعر" نے کتنی [illegible] [illegible]

ب دیکھئے ... ہوا جدید نسل جوان ہیں شعر
نا ہے کے یہ اچھا اقدام ہے۔ ان معائب کو دیکھ
کر اب شاعری کی تفہیم و تنقید کے لیے فن کو بھی اہمیت
ہے۔ لفظیات کی غیر منہضم شدہ تھا اور جدیدیت کی بے
یں سے دلچسپی کا انداز تھا اس بے ساختہ گشدہ کی
ش اور تحقیق کی طرف نیا ذہن مبذول ہو رہا ہے۔ اس
وار آپ ہی کہہ دیں گے کہ آپ کی کاوش ایک طرف
احب کی ذہنی سعایت کی توسیع اور فنی ضرورت کے
ہو رہی ہے تو دوسری جانب [illegible] سب کا
ملا مل رہی ہے۔
تشاعر کو پسند ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا احترام بھی کرتا ہوں
آپ کی سرپرستی اسے دیر تک حاصل رہے اور اردو
ظہار و دلکشی کے اس دور میں بھی نہیں مستقل معیار تک ہی
ن معیاروں کو پھیلاتا رہے۔
پریمی ___ مکین ودھامہ، بینادامک، سرینگر (کشمیر)
شاعر کا شمارہ ۹/۱۰، جلد ۷۰ (گوشۂ حامدی کاشمیری)
وا۔ حامدی کاشمیری پر گوشہ شائع کر کے صرف حامدی [illegible]
لمی اور خلوص کا اعتراف ہے بلکہ جموں و کشمیر جیسے دور افتادہ
اُردو میں لکھنے کے لیے فال نیک ہے۔ ریاست جموں و کشمیر
دیں لکھنے والوں کی ایک پوری کھیپ موجود ہے۔ مثلاً شمیم
ی (شاگرد سیماب) شوریدہ کاشمیری۔ حکیم منظور۔ بشیر
پریتپال سنگھ بیتاب۔ حامد مناوری۔ تار ساوری۔ راہکار
برج کار، سعود ساموں۔ رفیق راز۔ رحمان حنیف۔
سیم۔ رفیق ہمدم۔ جاوید آذر۔ منیب الرحمان۔ فاروق
شکیل الرحمن۔ شمیم۔ مشتاق مہدی۔ خالد بشیر وغیرہم کے
ا دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ مضامین سارے اچھے لگے
س بلراج کومل کا حامدی کاشمیری کی شاعری اور شمس الرحمن
فاروقی کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں مظہر امام صاحب سے اچھے
ون میں مدیر نے لاحرف سے اقتباس لیا ہے۔ مگر شروع
انہوں نے لاحرف کے بجائے تمثیلات کا حوالہ دیا ہے۔ تمثیلات
ری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس پر کوئی دیباچہ وغیرہ نہیں ہے۔
گوشے کے بعد کا حصہ بھی اچھا ہے علی جواد زیدی کی نظم اجنبی
کوشش ہے۔ عبداللہ کمال صاحب نے اپنی تینوں غزلوں میں کیا
ملا ہے۔ اسعد بدایونی کی غزل نمبر ۲ کے شعر میں بحر بدل گئی
گئی ہے۔

مفتعلن ___ مفتعلن
سے خواب کت ___ نے عجب سے تھے
مفتعلن ___ مفتعلن
منتساب کت ___ نے عجب تھے
مفتعلن ___ مفتعلن
میں الجھ گیا ___ کسی پھول سے
مفتعلن ___ مفتعلن
ہے کٹ گیا ___ کسی ہات سے

الفراواں کا یہ شعر بہت پسند آیا ۔

کون سی اب نسل کو تھی گم یہاں
جس نے بویا عمر بھر کچھ بھی نہیں

پرکاش تیواری نے مایوس کیا۔ ایک بار ان کی غزل غیر معیاری رہی مثلاً ۔

مفاعلن ۔ مفاعیلن مفاعیل

(۱) تمہارے ہجر میں زندہ کہاں ہوں
میں تو دن زندگی کے گن رہا ہوں

دوسرے مصرع میں تیں تو مگر رہا سا لگ رہا ہے۔ اور پوری طرح ضم نہیں ہو پایا ہے

(ب) کشش کیا ہے زمانے رنگ میں
بنا پر کے میں زنداں میں اڑا ہوں

اگر یوں ہوتا ۔

سوا نے پر ہوا میں اُڑ گیا ہوں
یا
بنا پر میں قفس میں اُڑ رہا ہوں

تو ٹھیک رہتا کیوں کہ بنا پر کے صلاحیت قادرہ ہے اور شعر یا جان باقی نہیں رہ جاتی۔ سعید صدیقی کی غزل شبخون (۱۹۹۱ء) میں پہلے پڑھنے کو ملی تھی۔ اب دوبارہ چھپوانے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔ غزل کے سارے اشعار منتخب تھے ۔

ہمارے ہاتھ میں پتھر کا آنا
درختوں پر ثمر اچھے لگے تھے
ہوا کا زور بھی اپنی جگہ تھا
سراسیمہ ثمر اچھے لگے تھے

جو یہ ہوس بدلا ہے کا ادراک ہے۔ اظہر عنایتی کی غزل کا یہ شعر کئی کہانیاں لیے ہوئے ہے ۔

جہاں صدیوں کیا کرتا تھا چپ میرا
کہاں سے لاؤں کھلونوں کی اس دکانوں کو

حاصل غزل شعر ہے ۔

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

**شاداب رضی** ۔ لیکچرر، شعبۂ اردو، [illegible]

مشرکر شمارہ ۹ - ۱۰ ملا۔ گشت اب دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ مشمولات تو مزید دل خوش کن ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی ہمہ جہت خدمات پر آپ نے عمدہ گوشہ نکالا ہے۔ مبارکباد۔

یقین کیجئے میں حامدی صاحب کو صرف ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانتا تھا۔ زیر نظر گوشے سے معلوم ہوا کہ نہ صرف ادبی بلکہ اُن کی علمی و معاشرتی شخصیت بھی MULTI-DIMENSIONAL ہے۔

آپ نے بے شک ایسے مضامین منتخب کیے ہیں جو ان کی فن کارانہ شخصیت و ذہنیت کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ معصوم ہے کہ حامدی مگر میں تکرار کر رہی ہوں مگر بھی پوری کر سکی گزارش کروں گا کہ انتخاب مضامین میں آپ نے خصوصی جہت کا انتخاب کیا ہے۔ وہ یہ کہ تمام مقالات تخلیقی فن کاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک اچھا تخلیقی فن کار ہونا ضروری نہیں ہے پھر بھی ہم ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ایک تخلیقی فن کار ہی بہتر طور پر فن کا ماخذ ہی کی گتھیوں سے نسبتاً زیادہ صلاحیت رکھنے کے ساتھ سلجھا سکتا ہے۔ ایلیٹ، کلیم الدین احمد، مغربی کو [illegible] اور خلیل الرحمان اعظمی ناقد بنگی مثالیں موجود ہیں۔ پھر بھی انتخاب مضامین کے وقت آپ نے اس نزاکت کو ملحوظ رکھا ہو۔ بہر حال، مظہر امام، جگن ناتھ پال، بلراج کومل اور شمس الرحمن فاروقی نے اچھے مضامین لکھے ہیں۔ لیکن اتنا کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ حامدی صاحب SELF-IMPOSITION کے شوق میں تنقید کے بنیادی منصب سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ موصوف کی بالغ نظر بصیرت کا ایک زمانہ قائل ہے لیکن وہ جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں میں یہ واضح نہ کر سکے کہ وہ کنزا ہوگو کو یونا کا مطالعہ کر کے کس طرح کا تجزیہ حاصل ہوا تھا۔ اس طرح کی مرکزیت کا نتیجہ قریب ایسا تو ہو سکتا ہے لیکن تنقید پارے میں اسے عیب اور ضیاع کا نام دیا جائے گا کیونکہ تشریح و تفہیم، فن تنقید کے بنیادی اوصاف میں شامل ہے۔

غزلیات کا حصہ ایک منتخب مجموعے کی شان رکھتا ہے۔ کس غزل کی تعریف کی جائے؟ این ہمہ خانہ آفتاب است۔ کیا بزرگ اور کیا نوجوان شعراء، جو صنف دیکھوں، کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ نئی نسل کے لوگوں میں انتخاب صدیقی، عبداللہ کمال، سعید صدیقی، اسعد بدایونی، اظہر عنایتی، مغنی تبسم وغیرہم خصوصی طور پر متاثر کرتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے زیر نظر شمارہ مستقل کالموں کے ساتھ تازہ بہ تازہ تخلیقی و تنقیدی جواہر پاروں کا گنج گراں مایہ ہے۔ حسن آوری اور جامعیت طرازی کا سلیقہ تو کوئی آپ سے سیکھے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم اور اعجاز صدیقی مرحوم کی ساحرانہ خلاقی تسلیم لیکن جہاں تک مدیرانہ جدت طرازی کا سوال ہے آپ یکتا صاحب نظر ہیں۔ شعر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

**احمد عثمانی** ___ [illegible]

گوشۂ حامدی کاشمیری خوب ہے۔ بڑی تفصیل سے گوشہ پیش ہوا ہے۔ حامدی نمبر ہی ایک اچھا مضمون ہے جس سے حامدی صاحب کی پوری شخصیت گھر اور باہر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ [illegible] متاثر نہیں کرتا۔

آمنہ ابوالحسن کی تراشیں اور انور خان کا [illegible] ہر چند تاثر پیش شدہ ہیں۔ شاعری میں علی جواد زیدی اور عبداللہ کمال پسند آئے۔

**پروفیسر عبد القوی دسنوی** ۔ شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال

گوشۂ حامدی کاشمیری بہت اچھا گوشہ ہے، معلومات افزا اور دلچسپ اور ہر طرح سے اہمیت سے بھرپور ہے۔ شاعر کا یہ سلسلہ ضرور جاری رہے، اہم اور بہت خوب ہے۔

*

# نقد و نظر

## کتھا نگر
### جوگندر پال

جوگندر پال اردو افسانے کا ایک معتبر انداز اور منفرد نام ہے جنھوں نے جہاں افسانے میں کہانی پن کو قربان نہیں کیا وہاں کسی ترشے ہوئے PATTERN یا طے شدہ فارمولوں کو سامنے رکھ کر بھی افسانے نہیں لکھے۔ ان کا فنی مواد اور ہیئت کے توازن اور موثر امتزاج کی عمدہ مثال ہے کتھا نگر ان کے افسانچوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ افسانچے کے بارے میں وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ افسانچے کے قاری کو لکھنے والے کی دہری میں کسی متعین مقام پر نہیں پہنچنا ہوتا۔ اس صنف کی اہمیت اس میں ہے کہ پڑھنے والے کی تخلیقی شرکت کے سبب چھوٹی اور معانی کی نشاندہی میں انہیں حسب واردات مقام یا کیچ کے آزادتر مواقع میسر آتے ہیں۔ وہ وضاحتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن "[illegible] اور اختصار" کو افسانچے کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں دراصل چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بکھری ہوتی ہیں اور کہانی کے اجزاء اگر متناسب ہوں تو وہ انھیں طویل یا مختصر افسانوں کی گرفت میں لا سکتی ہے۔ خود کتھا نگر کے افسانچے دو سطری بھی ہیں اور تین یا چار صفحات پر محیط بھی لیکن یہ سب قاری کو تخلیقی شرکت کا انبساط فراہم کرتے ہیں۔ جوگندر پال کے بیشتر افسانچے ختم ہو جانے پر بھی ختم نہیں ہوتے کیوں کہ ہمارے احساس میں ان کے تاثرات کی جھنکار تادیر گونجتی رہتی ہے اور اس گونج میں ہم خود اپنے اندر کی وسعتوں اور ہنگاموں کا آہنگ بھی سنتے ہیں مثلاً یہ دو افسانچے دیکھیے:

**[illegible]**

بابا تم بڑے میٹھے ہوتے
یہی تو میری مشکل ہے میاں۔ ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا
تو جھاڑ سے جڑا ہوتا۔

**محمد غوری**

اس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور ہر بار ایسی سر توڑ ناکامی کے باوجود ہمت نہ ہاری اور بالآخر اپنے تازہ حملے میں دلی سر کر لی۔
اور یہاں سکریٹریٹ میں کلرک کی بھی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جوگندر پال کے افسانچوں کے موضوعات خود زندگی کی طرح متنوع اور ہمہ گیر ہیں۔ آج کے معاشرے میں انسان اور مشینوں کی مطابقت میں تیزی سے کم ہوتے ہوئے تفاوت، بچوں کی مسکراہٹ کی راحتیں، صنعتی دور میں زندگی کے بدلتے ہوئے تجربے، دو نیم شخصیتوں کے تجزیے، خود انسان کے اندر بے پناہ وسعتوں میں اس کی ذات کی گم شدگی اور اس کی بازیافت کی سعی، خود شناسی اور خود آگہی کے گوناگوں پہلو اور ان سے وابستہ اذیتوں اور مسرتوں کے کھٹے میٹھے ذائقے ان افسانوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ جوگندر پال کو اس بات کا احساس ہے کہ آج انسان اس قدر تنہا ہے کہ خود اپنے ساتھ بھی رابطہ استوار نہیں کر پاتا اور وہ معاشرے کی مسلّم قدروں کو رد کر کے جنگل کی اس تہذیب کی طرف مراجعت کر رہا ہے جہاں محض وحشی جبلتیں ہی اس کا استقبال کریں گی۔ سیویلائزیشن کے تحت لکھے افسانچوں میں خلائی سیاحت اور تسخیر کے ساتھ ساتھ مستقبل کے انسان کی بے حسی اور زندگی اور زمین کو جہنم بنا دینے کے امکان کا فنی اظہار ملتا ہے۔ کتھا نگر کے افسانچوں میں زندگی کی برنائیاں اور رعنائیاں، اس کی الجھنیں اور پیچیدگیاں ایک ایسا تخلیقی تجربہ بن جاتی ہیں جن سے ان افسانچوں میں ایک اچھے شعر جیسا حسن اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ جوگندر پال کے فن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کا انداز اساطیری ہو، استعاری یا علامتی، قاری سے ان کا رابطہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔

صفحات — ۱۹۸ ○ قیمت — ۳۶ روپے ○ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء ○ تقسیم کار — رابطہ گروپ، ۲۰۴ سندا کالی انکلیو، کالکاجی۔ نئی دہلی ۱۹۔

[آزاد گلاٹی]

## ذکر رسولؐ مُردوں کی مسیحائی
### عبدالماجد دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، اور صدق جدید کے سیرتی مقالات کا ایک گراں قدر مجموعہ "مُردوں کی مسیحائی" کے نام سے جنوری ۱۹۶۳ء میں ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوا اور نہایت درجہ مقبول ہوا تھا۔ یہ مجموعہ مولوی ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کا مرتب کردہ تھا۔ خود مولانا نے اسے مرتب نہیں کیا تھا۔ اس میں صدق جدید کے نقش اول "سچ" میں شائع ہونے والے پُرکیف سیرتی مضامین جنھیں نثری نعت کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے، شامل تھے، پہلے مضمون کا عنوان "مُردوں کی مسیحائی" تھا۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب تھی اب اس کا جدید ایڈیشن طباعت و کتابت کی نفاست کے انتہائی اہتمام کے ساتھ "ادارۂ انشائے ماجدی" نے شائع کیا ہے۔ یہ ادارہ اس سے قبل مولانا ماجد کی بعض اور تصانیف معاصرین، سفر حجاز، [illegible]، سیاحت ماجدی خصوصی اہتمام سے شائع کر کے اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

"مُردوں کی مسیحائی" کا موجودہ ایڈیشن جس کا دوسرا نام "ذکر رسولؐ" ہے ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کا سرورق بہت ہی دیدہ زیب اور کمال صناعی کا مظہر ہے۔ نثری مضامین سے قبل دو صفحوں میں مولانا ماجد کی ایک پُرکیف نعت جس کا مطلع ہے ؎

پڑھتا ہوا اللہ میں جب صلِّ علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابر کرم چھایا

یہ مجموعہ ۱۹ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے ایڈیشن میں شامل چار مضامین جو براہ راست سیرت طیبہ سے تعلق نہیں رکھتے حذف کر کے ان کی جگہ چار سیرتی مضامین جو لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہونے کے بعد مولانا کے اخبار "صدق جدید" میں شائع ہوئے تھے اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کے ایک مضمون "ورفعنا لک ذکرک" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں عرب کے ریگستان اور چٹیل میدان اور افریقہ کے صحرا و بیاباں سے لے کر لندن اور پیرس اور برلن کے تمدن زاروں تک ہر روز اور ہر روز بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار، اللہ کے نام کے ساتھ بلند ہوتی رہتی ہے؟ اپنی ذاتی عقیدت مندی کو الگ رکھیے، محض ایک خالی الذہن اور غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے بعض واقعات پر نظر کر کے، فرمائیے کہ یہ مرتبہ، یہ اکرام دنیا کی تاریخ معلوم سے لے کر آج تک کبھی بادی، کسی رہبر، کسی ملکوتی کو حاصل ہوا تھا؟ جس بے کسی اور بے بسی کے عین اس وقت جب کہ اسے زور اور قوت والے سرداران قریش اپنے خیال میں کچل کر اور پیس کر رکھ چکے تھے اور اس کا نام و نشان تک مٹا چکے تھے۔ یہ وعدہ ہوا تھا کہ،

ورفعنا لک ذکرک۔ ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے۔ اگر آوازہ اس کا بلند نہ ہو گا اور کس کا ہو گا؟ نام اس کا سرفراز اور سربلند نہ ہو گا، تو اور کس کا ہو گا! بلندی ذکر کی یہ وہ تصویر ہے جو اوراق لیل و نہار پر ساڑھے تیرہ سو برس سے ثبت چلی آ رہی ہے، چشم روزگار اسے صدیوں سے پڑھتی چلی آ رہی ہے اور خدا معلوم کب تک اسی طرح پڑھتی رہے گی۔" (صفحہ ۶۳)

ان سیرتی مضامین کا اسلوب بے حد دل کش ہے، تحریروں میں تحقیق، تاریخی، علمی اور ادبی پہلو کی سمائی نے کتاب کو وقیع بنا دیا ہے کہ خلوص عقیدت و جذبات سے یہ مضامین مملو بھی ہیں۔ یہ ایک اہم دستاویز ہے جو نبی کریمؐ کی سیرت پر لکھی جانے والی کتابوں میں مطالعہ رسول کے لیے ناگزیر سمجھی جائے گی۔ امید کہ اس کتاب کی قدر افزائی ہو گی تاکہ ناشر کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور مولانا کی دیگر تصانیف ان کے مقالات اور شذرات اسی بلند معیار کے ساتھ شائع ہو سکیں۔

صفحات ۲۰۶ ○ قیمت ۲۰ روپے ○ سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء ○ ناشر: ادارۂ انشائے ماجدی، ۱۲۰۔ مابند اسرانی کلکتہ ۷۳۔

## سادہ کاغذ
### ایوب جوہر

جدید اردو افسانہ افراط و تفریط کے عبوری دور سے گزر کر اب اس منزل تک گزر چکا ہے۔ ژولیدگی، ابہام اور گورکھ دھندوں سے نکل کر کہانی پن کے تخلیقی منطقے میں لوٹ آیا ہے۔ اس نے فکر و خیال کی گہری معنویت کے ان گنت دریچے وا کر دیے ہیں۔ اب یہ صنف ابلاغ آمیز علامت نگاری کی قائل ہو گئی ہے اور اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ ادب کی کوئی بھی صنف ابلاغ کے بغیر زندگی کا واقعی اور بامعنی جواز نہیں حاصل کر سکتی۔ اب نئی کہانی کی بنیاد کسی نہ کسی

تجربہ، خیالی تسلسل اور شعور کا بہاؤ محسوس ہوتا ہے۔ جدیدیت اور علامتیت کا نشہ ہوا کرے اس صنف کو جو نام دیا گیا وہ معروف تھا، ان میں کو حباب کی طرح ابھر کر بیٹھ جیسے کے لیے گم ہو گئے اور پھر گم ہو کر رہ گئے۔ اب نئی کہانی نے اپنے منفرد اسلوب اور نئی اظہاریت کے ساتھ سماجی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے۔ اب یہ صنف ادب تجریدیت کی یکسانیت، طرز اور اسلوب سے اپنا پنڈ چھڑا چکی ہے۔ اب نیا افسانہ خارجی عناصر سے ہم آہنگ ہو کر معصوم انسانیت کی خوب صورتی کو نشانہ بنانے والی قوتوں سے دست و گریباں ہے۔ نیا افسانہ باطنیت کی ڈور میں خارجیت کے موتی بھی پرو رہا ہے اور خارجیت کے خاکے میں باطنیت کی رنگ آمیزی بھی اپنے توازن کے ساتھ کر رہا ہے۔

رام لعل، انتظار حسین، کلام حیدری، انور سجاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش، مسعود اشعر، رشید امجد، احمد داؤد، منشا یاد، احمد یوسف، زاہدہ حنا، خالدہ اصغر، منظر الاسلام، خالدہ حسین، اور اقبال مجید نئے افسانے کے پیچیدہ تر تجربوں سے نکل کر بھی معنویت کے آفاق کو سجا رہے ہیں۔ اب یہ لوگ جدید افسانہ نگاری کی شاہ راہ پر چراغوں کی طرح نہ صرف روشن ہیں بلکہ اپنے ساتھ دیگر سفر کرنے والوں کو بھی اجال رہے ہیں۔ ان روشنی میں جانے ہوئے لوگوں کی مدد سے نئے افسانے نے اپنی سمت کا تعین کر لیا ہے۔

نئی کہانی کے اس فنی سفر میں رواں قافلے میں ایوب جوہر بھی شامل ہیں۔ انہوں نے وضاحت سے علامت تک اور قدامت سے جدت تک کا سفر بڑے صبر و تحمل اور محتاط طریقے سے طے کیا ہے۔ ان کے یہاں تخلیقی تجربہ اور تحریری تنظیم کا ایک بامعنی تسلسل ہے۔ انہوں نے فکر و فن کے مقصد اعلیٰ کے حصول کے لیے کبھی جست نہیں لگائی بلکہ وہ ایک بُردبار کوہ پیما کی طرح بڑی جرأت مندی، صبر و استقامت اور انہماک کے ساتھ پیش قدمی اور بلند نگاہی کی ڈور تھامے ہوئے فکر و فن کے ارتقائی سفر پر رواں ہیں۔

ایوب جوہر کی افسانہ نگاری کا فن صنوبر کی طرح ہے جو آزاد ہو کر کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ اپنی شاخیں پھیلائے ہوئے ہے۔ آزادی اگر کچھ پابندیوں کے ساتھ موجود نہ ہو تو یہ تباہ کن بھی ہو سکتی ہے۔ ایوب جوہر غالباً اس کا مکمل احساس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افسانے کے شجر بار دار کو پربہار رکھنے کے لیے مناسب جتن کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کو زمین سے الگ کر کے فضا میں معلق نہیں کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں فضا کی وسعت بھی ہے اور زمین کی سوندھی مہک اور زرخیزی بھی۔ ان کے یہاں تجربے میں توانائی کا ایک متوازن انداز پایا جاتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں کلاسکیت کا رنگ بھی ہے اور صحت مند روایات سے متمتع ہونے کی سعی جمیل بھی۔ انہوں نے سماجی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور سماجی چوٹ والی بھی تحریر کی ہیں اور بغیر جھنجھلاہٹ کہانی کا تجربہ بھی کیا ہے۔

ایوب جوہر کی کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسیع تجربہ کی بنا پر ان کو بالغ پن حاصل ہوتا ہے اور انسان کے اس معاشرے کی شناخت یہاں سے ملتی ہے جہاں وہ جلتی شمع کی طرح اپنے جسم کی سیم اور ہوش کو دکھن لیے بغیر کسی صلہ کے ساتھ جلتے رہتے ہیں۔

انھوں نے خود اپنے سماج اور کائنات کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانے بصیرت و بصارت کی ترسیل بھی کرتے ہیں اور اقدار کا اثبات بھی۔ ان کہانیوں میں موجود سماجی عوامل اور خارجی و ظروفی جھلک آپ کو ساتھ لے جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے یہاں انفرادیت کی واضح شان ہے جس میں سادگی تو ہے ہی مگر اس سادگی کے ساتھ ہنر کاری اور سرتیت بھی ہے۔

ایوب جوہر کے افسانوں میں جہاں ثقافتی جڑوں کی تلاش، ماضی کے ہر پہلو میں شاعری اور امیجز کی ریزہ کاری کا تخلیقی انہماک ملتا ہے۔ وہیں ان میں ذات کی وحشت، زندگی کے اندرونی اتھل پتھل اور اس میں پوشیدہ خوش نما تمناؤں کی ہو بہو ہی کا بھی ایک منظر ہے جو ڈوبتے ہوئے سورج کا سماں پیش کرتا ہے۔

ایوب جوہر کے افسانوی رویے میں سب سے بنیادی اور مرکزی حیثیت انسان اور انسانی رشتے کو حاصل ہے۔ وہ ایک طرف انسان اور انسانی رشتے کے تقدس کے قصیدہ خواں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف انسان کے باہمی رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور اس کے تذلیل ہونے کا بھی مرثیہ رقم کرتے ہیں۔

ہجرت کے کرب کا اظہار شعراء نے نظموں اور اشعار میں کیا ہے۔ ادیبوں نے ناولوں اور افسانوں میں اسے موضوع بنایا ہے۔ تقریباً سبھوں نے ہجرت کا ماجرا ایک دکھن کے طور پر بیان کیا ہے۔ خود ایوب جوہر کے یہاں بھی ہجرت ایک عذاب کی طرح اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایوب جوہر نے ہجرت کو ایک اور پس منظر میں بھی دیکھا ہے۔ ان کا یہ رویہ خالص انسانی رشتے اور انسانی رابطے کے حوالے سے ایک وسیع عالمی تناظر میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی ہجرت ایک اخراجی رویے کی نشان دہی کرتی ہوئی مقامی سے قومی اور قومی سے بین الاقوامی تناظر میں اس طرح پھیلتی چلی گئی ہے کہ ہجرت ایک لفظ بے معنی بن جاتی ہے۔

ایوب جوہر نے اپنی کتاب "سادہ کاغذ" کو سادہ کاغذ رہنے نہیں دیا ہے بلکہ اسے زندہ اور تابندہ حرفوں سے اس طرح سجایا ہے کہ اس میں زندگی تمام تضادات کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اپنے معنوی امکانات کے سبب لوگوں میں پسندیدگی کا جواز جلد پیدا کرے گی۔

صفحات ۱۲۸ ۔ قیمت ۶۰ ٹاکا

ناشر اور ملنے کا پتہ۔ محاذ پبلیکیشنز، ۲۶۱ - لال چند مقیم لین (رانی کھولا) ڈھاکا۔ بنگلہ دیش

[شفیق احمد شفیق]

## کتب و رسائل

○ **بہادر شاہ ظفر** ۔ ہندستان کے مغل سلاطین کا آخری بادشاہ۔ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اسیر بے بسی کے ہندستان کی سیاسی و ثقافتی اور ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ وہ اپنی شاعری کے سبب اردو کے ایک اہم شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے ظفر کی سیاسی و ادبی شخصیت کا جائزہ ایک نئے انداز میں لیا ہے۔ ایک سنجیدہ محقق، تاریخ اور تنقید تینوں ہی زاویوں سے بہادر شاہ ظفر کی سیاسی و ادبی شخصیت کا تعین کرتی ہے۔ دیدہ زیب و خوش کتابت و طباعت۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت ۷۰ روپے۔

— پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

○ **نالۂ نیم شبی** ۔ حمد، نعت و نظموں پر مشتمل ... کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں جناب ... نعمانی کا مقدمہ، جناب شمس تبریز کا تبصرہ اور محترمہ ... کا تبصرہ شامل ہے۔ اور عرض حال کے تحت مصنفہ کا اظہار خیال بھی کتاب میں شامل ہے۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲۰ روپے۔

— پتہ: ... لکھنؤ

○ **سویرا تو سب کے لیے ہے** ۔ داستانِ روس کی چھوٹی سی تمہید۔ مشہور معروف ترکی شاعر ناظم حکمت کے روسی ناول کے انگریزی ترجمے کو جناب احسان آوارہ نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ترکی انقلاب تکنیک میں لکھے گئے اس دلچسپ ناول کا اردو ترجمہ اپنے آپ میں اصل ہی کی طرح ہے۔ اس ناول پر احسان آوارہ کو ... ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ صفحات ۱۴۰۔ قیمت ۲۵ روپے۔

— پتہ: احسان آوارہ، پھلواری، باندہ ۲۱۰۰۰۱ (یوپی)

○ **حقائق و بصائر** ۔ معروف ادیب و شاعر شمس جالینی کے تحقیقی و تنقیدی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ۔ اس سے قبل ذوقِ مسافت، شعری تجربہ، ... جیسی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ قیمت چالیس روپے۔

— پتہ: روشن پبلی کیشنز، روشن محل، ...

○ **ابابیل** ۔ مشہور ترقی پسند شاعر ... کا تازہ شعری مجموعہ (لہروں کی آواز) شائع ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی مسائل اور واقعات کے پس منظر میں تخلیق کی جانے والی شاعری اس حیثیت سے ممتاز ہے۔ ایک اہم شعری مجموعہ۔ صفحات ۱۵۶۔ قیمت چالیس روپے۔

○ **بازیافت** ۔ نئی افسانہ نگار خاتون فرحت جہاں کے ۱۸ معیاری افسانوں کا اولین مجموعہ۔ ہر افسانہ عصر حاضر کی ترجمانی کا تخلیقی اظہار۔ بیانیہ کے خوب صورت اسلوب۔ موضوعات کا تنوع۔ عمدہ کتابت و طباعت۔ صفحات ۱۲۲۔ قیمت پچاس روپے۔

## خدابخش لائبریری کو مگدھ یونیورسٹی نے مرکز تحقیق تسلیم کرلیا

پٹنہ۔ یہ خبر علمی حلقوں میں باعث مسرت ہوگی کہ خدابخش لائبریری کو مگدھ یونیورسٹی نے بھی یونیورسٹی کا مرکز تحقیق تسلیم کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل کشمیر یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کئی یونیورسٹیوں نے اسے مرکز تحقیق کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدابخش لائبریری ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور لائبریری میں محفوظ اہم مخطوطات اور نادر مطبوعات پر ریسرچ کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے [illegible] سینیر فیلوشپ اور ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے انداز پر وزیٹنگ اور جنرل فیلوشپ کے انتخاب کا اختیار رکھتی ہے۔ خدابخش فیلوشپ کے تحت ڈگری کے لیے ریسرچ کے علاوہ آزاد ریسرچ بھی ہو رہی ہے۔

## انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے نئے عہدیدار

نئی دہلی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی کانفرنس کے آخری کاروباری اجلاس میں نئے عہدیداروں کا انتخاب اتفاق رائے سے ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرپرست: خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، [illegible]، ڈاکٹر [illegible] اور [illegible] گجرال۔

مجلس صدارت: علی سردار جعفری (صدر)، غلام ربانی تاباں، کیفی، [illegible]، [illegible]، ڈاکٹر محمد حسن، [illegible]، ڈاکٹر محمد عقیل رضوی، اصغر علی انجینئر، اختر سعید خاں، اقبال مجید، عابد سہیل، شمس الرحمن [illegible] اور [illegible]۔ جنرل سکریٹری ڈاکٹر قمر رئیس۔

سکریٹریز: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر فضیل، عبدالقیوم ابدالی، رتن سنگھ، ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر عتیق اللہ۔

اسسٹنٹ سکریٹریز: حسن کمال، علی احمد فاطمی، قدوس جاوید، محمود الحسن، فاروق بخشی اور پرویز جعفری۔

خزانچی: ہرپال سنگھ سدھو۔

## روزنامہ "آفتاب عالم" کی رسم اجرا

لکھنؤ۔ لکھنؤ سے ایک اردو روزنامہ "آفتاب عالم" شروع ہوگیا ہے جس کے ایڈیٹر اردو کے افسانہ نگار رام لعل ہیں۔ اس نئے روزنامے کی رسم اجرا یہاں ایک جلسے میں ہوئی جس کی صدارت مسٹر [illegible] نے کی۔ پرچے کا اجرا مولانا کلب صادق کے ہاتھوں ہوا۔

اس موقع پر ریاستی وزیر زراعت مسٹر [illegible] سنگھ، مولانا فضل الرحمن، عابد سہیل، نسیم نکہت؟، حکیم عبدالقوی دریابادی، احمد ابراہیم علوی اور اخبار کے مالک [illegible] موجود تھے۔

## گجرال کمیٹی کی رپورٹ شائع کی جائے

بنگلور۔ مہاراشٹر کی [illegible] ریاست میں اردو زبان و تعلیم کی ترقی کے لیے گجرال کمیٹی کی رپورٹ جاری کرنے اور اردو [illegible] کرنے، اردو ذریعہ تعلیم کے [illegible] والی مدارس شروع کرنے کے لیے حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا ہے۔ کرناٹک کی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اردو کے [illegible] ترقی کے لیے کرناٹک اسٹیٹ پرائمری اسکول ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ تین روزہ ریاستی کانفرنس میں جنرل ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری مسٹر [illegible] نے کانفرنس میں موجود تقریباً [illegible] ہزار اردو اساتذہ میں جاری اکثریت [illegible] اساتذہ کے حق [illegible] مطالبات پر مشتمل ایک یادداشت ریاستی وزیر داخلہ مسٹر [illegible] اور وزیر تعلیم مسٹر [illegible] کو پیش کی جس میں اساتذہ کے دیگر مطالبات کے ساتھ خاص طور پر اردو تعلیم کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اردو [illegible] گجرال کمیٹی کی رپورٹ، [illegible] اور اردو مدارس کے لیے [illegible] نصاب کا مطالبہ کیا۔

## صدر جمہوریہ ہند نے "مالک رام ایک مطالعہ" کتاب کی رسم اجرا کی

نئی دہلی۔ صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے راشٹرپتی بھون میں ماہر غالبیات اور صدر انجمن ترقی اردو (ہند) جناب مالک رام صاحب کی کتاب "مالک رام — ایک مطالعہ" کی رسم اجرا فرمائی۔ صدر جمہوریہ ہند نے موصوف کی ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کی۔ جناب گورچرن سنگھ [illegible] اور [illegible] ریڈی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ فراق اردو کے مشہور شاعر ادیب، محقق اور صحافی تھے [illegible] مالک رام صاحب [illegible] چندوں نے اہتمام دیے۔

## ساہتیہ اکادمی کے ۱۹۸۶ء کے انعامات

نئی دہلی۔ اردو کے ناقد و ادیب جناب شمس الرحمن فاروقی، انگریزی ناول نگار نیز [illegible] اور [illegible] گوپی [illegible] ۲۲ اہل شخصیتوں میں شامل ہیں جنہیں اس سال ساہتیہ اکادمی نے انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کی مجلس عاملہ کے چیرمین [illegible] کی صدارت میں [illegible] سفارشات [illegible] سے متعلق ساہتیہ اکادمی کے [illegible] پیش کی گئیں اور انعامات یکم جنوری ۱۹۸۲ء سے ۳۱ دسمبر تک ان کی تصنیفات پر دیے گئے ہیں۔

## بہار میں اردو اساتذہ کے لیے تین ہزار اسامیاں مخصوص

پٹنہ [illegible] وزیر [illegible] بہار جناب [illegible] نے [illegible] میں ایک اجتماع [illegible] اسکولوں میں ۱۹ [illegible] پوسٹوں میں سے [illegible] پوسٹیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس اجلاس میں [illegible]۔

## غالب تقاریب

نئی دہلی [illegible] مرزا غالب کے [illegible] یوم ولادت کی [illegible] ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ء کو شام پانچ بجے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک جلسہ [illegible] منعقد کی گئی جس میں [illegible] شاعروں [illegible] دو کتابوں [illegible] ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب نے صدارت فرمائی [illegible]۔

جناب [illegible] غالب اکیڈمی کے حاضرین کا [illegible] سے آئے ہوئے اسکالرز [illegible] کا استقبال کیا [illegible] میں [illegible] غالب [illegible] ٹرسٹ [illegible] سجاد شاہد [illegible] اور آئی غالب اکیڈمی کے لیے صدر جلسہ جناب مالک رام صاحب کو پیش کی۔

[illegible] انجمن ترقی اردو [illegible] اعتماد غالب پر ایک [illegible] پیش کیا۔

سبھی علماء و ادیب اور [illegible] جناب کا ایک [illegible] رہتا ہے۔ ایک مقالہ [illegible] غالب [illegible] کو باری باری ترتیب سے پیش کیا۔ تقاریب کے آغاز میں مزار غالب پر گل پوشی و چادر پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ [illegible] کی ابتدا [illegible] فتوی [illegible] سکریٹری غالب اکیڈمی کی تعارفی تقریر سے ہوئی۔ آپ نے صدر جلسہ جناب مالک رام صاحب کو ان کی ۸۰ ویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کی اور ان کا گلدستہ محبت سے استقبال کیا۔

پروفیسر [illegible] صدیقی نے [illegible] تقریر کرتے ہوئے کہا کہ غالب اکیڈمی ہر سال ۲۷ دسمبر کو مرزا غالب کے یوم ولادت پر اور ۲۲ فروری کو اپنے یوم تاسیس پر مرزا غالب کی یاد میں مذاکروں اور محفلوں کا انعقاد کرتی ہے۔ یہ مذاکرے اور محفلیں ادبی معیار کے ساتھ [illegible] کو تقویت دینے کے لیے برابر [illegible] کامیاب رہی ہیں۔

[illegible] غالب [illegible] اور [illegible] مرزا غالب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور [illegible] بہار آرٹسٹ [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] غالب اور آئی غالب اکیڈمی کے لیے صدر جلسہ جناب مالک رام صاحب کو پیش کی۔

[illegible] اسکالر [illegible] ڈاکٹر [illegible] نے مرزا غالب کو خراج تحسین پیش کیا۔

[illegible] محفل کلام غالب ترتیب دی گئی [illegible] اور آواز کی ہم آہنگی کے ساتھ سامعین کو مسحور کر دیا۔ آخر میں غالب اکیڈمی کی [illegible] کمیٹی کی جانب سے [illegible] نے صدر جلسہ اور مذاکرے اور محفل کے شرکا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

## اردو عوام لسانی مسائل کا سیاسی استحصال برداشت نہیں کریں گے

نئی دہلی [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی کل ہند [illegible] کانفرنس کی گولڈن جوبلی تقریبات جو یہاں ۲۶ تا ۲۸ دسمبر منعقد کی گئیں کے آخری اجلاس میں [illegible] سے [illegible] کے لیے وقف تھا اردو کے ممتاز افسانہ نگار و فیڈریشن آف پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن کی مجلس صدارت کے رکن اور اردو [illegible] کمیٹی کے چیرمین مسٹر رام لعل کی اردو سے متعلق ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی [illegible] میں [illegible] ۱۹۸۰ء کے پارلیمانی انتخابات کے منشور میں کیے گئے وعدے کو پورا کرنے میں ناکام رہنے کے [illegible] ریاست بہار کی طرح پر اتر پردیش، دہلی اور [illegible] میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین کو یقین ہے کہ [illegible] اردو کے جائز حقوق [illegible] اور [illegible] پر لسانی مسائل کا سیاسی استحصال برداشت نہیں کریں گے۔

انجمن نے ایک مطالبہ میں کہا کہ بہار اور اتر پردیش کے [illegible] سیاستوں میں جہاں اردو [illegible] طور پر مسلم [illegible] کے لسانی زبان کا درجہ [illegible] اور اس کے ساتھ ساتھ [illegible] ریاستوں میں [illegible] اردو بولنے والے [illegible] تعداد میں رہتے ہیں اردو کو اس کے جائز حقوق جلد از جلد دیے جائیں۔

## حیدرآباد دوردرشن سے اردو میں خبریں نشر کرنے کا تیقن

حیدرآباد [illegible] مرکزی وزیر [illegible] اطلاعات [illegible] نے کہا ہے کہ دوردرشن [illegible] وزارت اطلاعات و نشریات حیدرآباد دوردرشن [illegible] اردو میں خبریں نشر کرنے کے [illegible] پر جلد غور کرے گی۔ اس ضمن میں [illegible] جناب [illegible] کانگریس [illegible] کی قیادت میں ایک وفد [illegible] سے ملاقات کر کے انہیں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ حیدرآباد کے [illegible] اردو [illegible] ہے حیدرآباد [illegible] اردو کا گڑھ ہے لیکن یہ کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ حیدرآباد دوردرشن سے [illegible] میں [illegible] دوردرشن سے [illegible] اردو پروگرام بہت کم ہیں [illegible] یہاں کے اردو پروگراموں [illegible] دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ اردو پروگراموں کے اوقات میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ [illegible] نے وفد سے کہا کہ ۱۹۸۷ء [illegible] میں ضروری اقدام کیے جائیں گے۔ وفد میں جنرل سکریٹری مسٹر محمد [illegible] کے علاوہ مسٹر ابراہیم جنیدی بھی شامل تھے۔

... of Publication ... 1997 Teleph...
(Publishing Date 27-28)
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/97



# سوکھی زمین
# سوکھے ہونٹ

دونوں کو چاہیئے پانی اور خوراک جو ہم ہی مہیا کر سکتے ہیں سرکار اور عوام کے تعاون سے ۔ آیئے ان لوگوں کی مدد کریں۔ ان کے لئے پانی اور کام اور زندگی فراہم کریں۔

مہاراشٹر سخت ترین خشک سالی سے دوچار ہے۔ ریاست کے ۱۲۳۱۳ دیہات اور ۹۴ شہری مراکز حالیہ خشک سالی کا شکار ہیں۔ ۱ء۵۶ کروڑ افراد اور ۲۳ء۸۰ لاکھ مویشی خشک سالی سے متاثر ہوتے ہیں۔

ریاستی سرکار صورتحال پر قابو پانے کیلئے جنگی پیمانے پر برسرپیکار ہے۔ مگر اس سلسلے میں عوام کا تعاون بڑے پیمانے پر درکار ہے۔ آیئے مل جل کر خشک سالی سے متاثرہ دیہاتوں کے اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے آگے بڑھیں۔

# وزیر اعلیٰ کے راحت فنڈ میں
# دل کھول کر چندہ دیں

ڈائریکٹوریٹ برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ، حکومت مہاراشٹر

# شاعر




■ غالب پر تین اہم مضامین

■ میر انیس کی ایک غیر مطبوعہ رباعی

■ بہ یادِ اعجاز صدیقی



# ثاقب لکھنوی

۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء — ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء

کہوں میں لکھنوی تم کو کہ اکبرآبادی
سخن کی راہ ادب میں ہے تیری استادی
تری غزل میں ہے تاثیر [illegible]
[illegible] ہے تیرے تغزل [illegible]

[illegible] آپ کا نام میرزا ذاکر حسین [illegible] — [illegible] صفوی [illegible]
[illegible] میرزا ذاکر حسین کے نام [illegible]
[illegible] ثاقب لکھنوی [illegible]
[illegible]

# شاعر

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

اشاعت کے ۵۸واں سال

جلد — ۵۸
شمارہ ۔۔۔ ۲-۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۳۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے ہندوستانی

## فکرِ امروز



*

تاثیر صرف اسی شعر میں پیدا ہوسکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اس کی حقیقی کیفیات کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل اور دماغ پر محسوس نہ کرے اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے، مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ طرز پر اثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے، نہ زبان الجھے، نیز تقلیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہیے۔

[ دسمبر ۱۹۳۵ء کے ایک خطبے سے اقتباس ]

سیماب اکبرآبادی

# روزگار گارنٹی یوجنا کا

# مفید سفر

## پندرہ سالوں میں سولہ کروڑ روپے سے زیادہ کے پیداواری کام

یکم مئی ۱۹۷۲ سے مہاراشٹر میں روزگار گارنٹی یوجنا چل رہی ہے۔ دیہی علاقوں میں روزگار کے متلاشیوں کو روزگار مہیا کرنے والی ایک خاص یوجنا کی شروعات کرنے والا مہاراشٹر پورے ملک کی واحد ریاست ہے۔ حکومت کے پیش نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس یوجنا کے تحت کارآمد و پیداواری کام ہوں۔

گذشتہ ۱۵ سالوں میں روزگار گارنٹی یوجنا کے تحت مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں سینچائی کی چھوٹی، درمیانی اور بڑی اسکیموں، تالاب، سخت زمین کو نرم، اصلاحات، اراضی کے لیے نالہ بندی، شجر کاری، راستے اور اسی طرح کے دوسرے ۱۱۸۱۹۷ مفید کام (مارچ ۱۹۸۶ء) تک پورے کیے جاچکے ہیں۔ مارچ ۱۹۸۷ء کے آخر تک اس یوجنا پر ۱۶۰۰٫۳۸ کروڑ روپے خرچ ہوئے اور ۱۹۳٫۵۹ کروڑ روپے کام کے دن استعمال کیے گئے۔

غرض یہ کہ روزگار گارنٹی یوجنا نے گذشتہ ۱۵ سالوں میں مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں لاکھوں غریب ضرورت مندوں کو روزگار دیا اور اس دور میں ۱۶۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ مالیت کے مفید اور کارآمد اثاثے وجود میں آئے۔

## دیہی عوام کے مفاد کی یوجنا،

## مہاراشٹر کی روزگار گارنٹی یوجنا۔

---

**محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامّہ، حکومت مہاراشٹر**

جرعات

# آپ کی زبان اُردو نہیں ہے، اگر۔

آپ اردو میں دستخط نہیں کرتے
آپ اپنی درخواستیں اردو میں نہیں دیتے
آپ کے بچے اردو نہیں پڑھتے
آپ اردو میں اپنے پتے نہیں لکھتے
آپ اپنے سائن بورڈ اردو میں نہیں لکھتے
آپ اپنے نام کی تختی اردو میں نہیں لگاتے
آپ کے یہاں اردو اخبارات و رسائل نہیں آتے
آپ غیر اردو داں لوگوں میں اردو کو فروغ نہیں دیتے
آپ اردو تہذیب کی نمائندگی نہیں کرتے
آپ اردو ذریعۂ تعلیم کو نہیں اپناتے

آپ اردو زبان و دانش کے مسائل پر غور نہیں کرتے
آپ اردو کو اپنی تہذیبی پہچان اور اپنے وجود کے لیے ناگزیر نہیں سمجھتے
آپ کو اپنی زبان پر ناز نہیں ہے
آپ اردو میں گفتگو کرنے میں احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں
آپ اپنی زبان کے لیے فرائض کو بھول کر حقوق کی بات کرتے ہیں
آپ اپنی زبان کے مستقبل سے مایوس ہیں، افواہوں پر یقین رکھتے ہیں اور اداسی پھیلاتے ہیں
آپ اردو کو صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں
آپ اپنی زبان کے تحفظ کے لیے احتجاج نہیں کرتے

ترتیب

## بہ یادِ اعجاز صدیقی



## مقالات



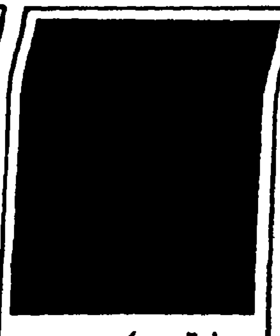
## غزلیں



## کہانیاں




دور آفریدی


فوق کریمی


حباب ہاشمی

آپ اپنی زبان کے لیے مصلحتوں کا شکار ہیں
آپ عالمی سطح پر ہونے والے سیمیناروں میں اردو میں تقریر [illegible]
[illegible] اردو میں مقالے نہیں پڑھتے
آپ صرف ادب تخلیق کرتے [illegible]
آپ صرف انعام واکرام، مالی امداد اور اپنی [illegible]
[illegible] خود کو محدود کیے ہوئے ہیں
آپ اردو کے نام پر چلنے والی [illegible]
آپ صرف شاعروں اور سیمیناروں تک [illegible]
آپ اردو دشمن اردو والوں کو نہیں جانتے
آپ نے ساری توقعات حکومت وقت سے [illegible] رکھی ہیں
آپ اپنی زبان کے خلاف ہونے والی سازشوں کو جانتے ہیں
پھر بھی خاموش ہیں
آپ یہ نہیں جانتے کہ صاحب اقتدار سیاسی [illegible]

اردو [illegible]
آپ [illegible] قدم قدم پر اردو [illegible]
آپ [illegible] حکومت [illegible]
والے [illegible]
[illegible]
اگر [illegible] شامل ہیں
[illegible]
[illegible] اپنے ضمیر کو [illegible]
[illegible]
دیکھنا ہے [illegible]
وقت سنجیدہ [illegible]

اعجاز صدیقی

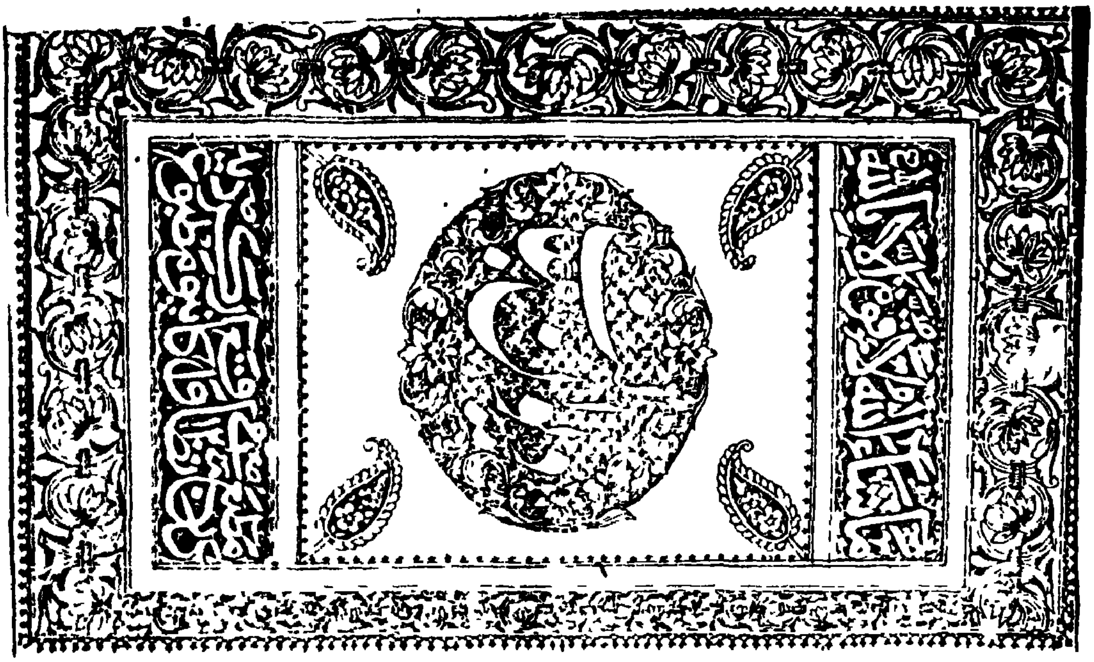
## ترتیب

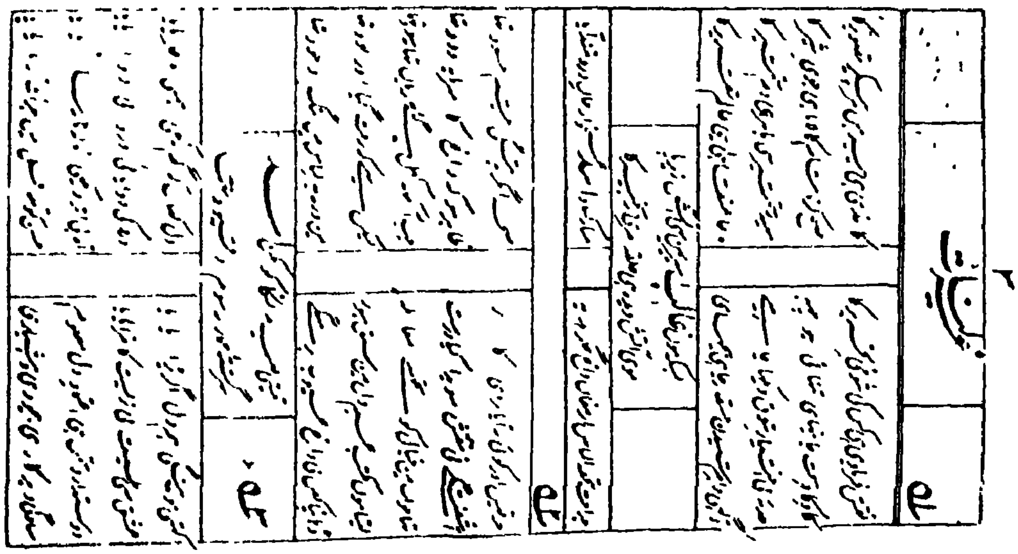

صابر فخرالدین


سخی حسن جاوید صدیقی


سردار ایاغ

# بازیافت





دیوانِ غالب [چوتھا ایڈیشن] مطبع نظامی کانپور جون، جولائی ۱۸۶۲ء کے دو صفحات کا عکس

[بہ شکریہ کالی داس گپتا رضا]



کل ہند مشاعرہ منعقدہ ۲۰ جون ۱۹۶۲ء کھنڈوا [ایم پی] بسلسلہ عرس حضرت خواجہ اجمیری کی ایک یادگار تصویر مہتم مشاعرہ سیٹھ مظہر الدین برادر مظفر حنفی تھے۔

## تصویر میں

صفِ اوّل [دائیں سے بائیں] شوق ماہری، شعری بھوپالی، مولانا ماہر القادری، سیٹھ مظہر الدین، ساغر نظامی، چھوٹے بابو، ڈاکٹر ستار احمد خوشتر، ادیب سہارنپوری۔

صفِ دوم [دائیں سے بائیں] ظریف جبلپوری، عزیز قیصری، دانش اندوری، نظر اکبرآبادی، اختر ماہری، بے دھڑک اندوری، سکریٹری علیم الدین فکری، شیخ نواب قمر بھساولی۔

صفِ سوم [دائیں سے بائیں] نثار حکیم، شیش اندوری، ادیب مالیگانوی، سیف بھساولی۔

[بشکریہ اطہر الدین اطہر کھنڈوا]

# رباعی انیس بخط انیس

اکبر حیدری کاشمیری

لوگ کہتے ہیں کہ جب مرزا غالب ۱۲۴۲ھ ہجری میں سلسلۂ پنشن کلکتہ گئے تھے تو اس سے پہلے قیام لکھنؤ کے زمانے میں میر انیس سے ملاقات کی تھی مجھے اس روایت میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی ہے کیونکہ اس زمانے میں میر انیس فیض آباد میں قیام فرماتے تھے اور ان کی مرثیہ گوئی کی زیادہ شہرت نہیں تھی۔ وہ مستقل طور پر لکھنؤ میں امجد علی شاہ بادشاہ (۱۸۴۲ - ۱۲۵۹ھ) کے اوائل زمانے میں رہنے لگے تھے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ غالب اور میر انیس کے مابین کوئی خط و کتابت بھی تھی۔ بہرحال جب ۱۲۸۵ھ ہجری میں غالب کا انتقال ہوا تو میر انیس نے ان کی وفات پر ایک رباعی کہی تھی۔ یہ رباعی انہی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی جناب راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں انیس کے ذخیرۂ مراثی کے ساتھ ایک کاغذ پر اب تک موجود ہے۔ راقم نے رباعی کا عکس آج سے ۳۰ سال قبل لیا تھا۔ رباعی یہ ہے

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداح علیؑ کا مرتبہ اعلا ہے
غالب اسد اللہ کی خدمت میں گئے

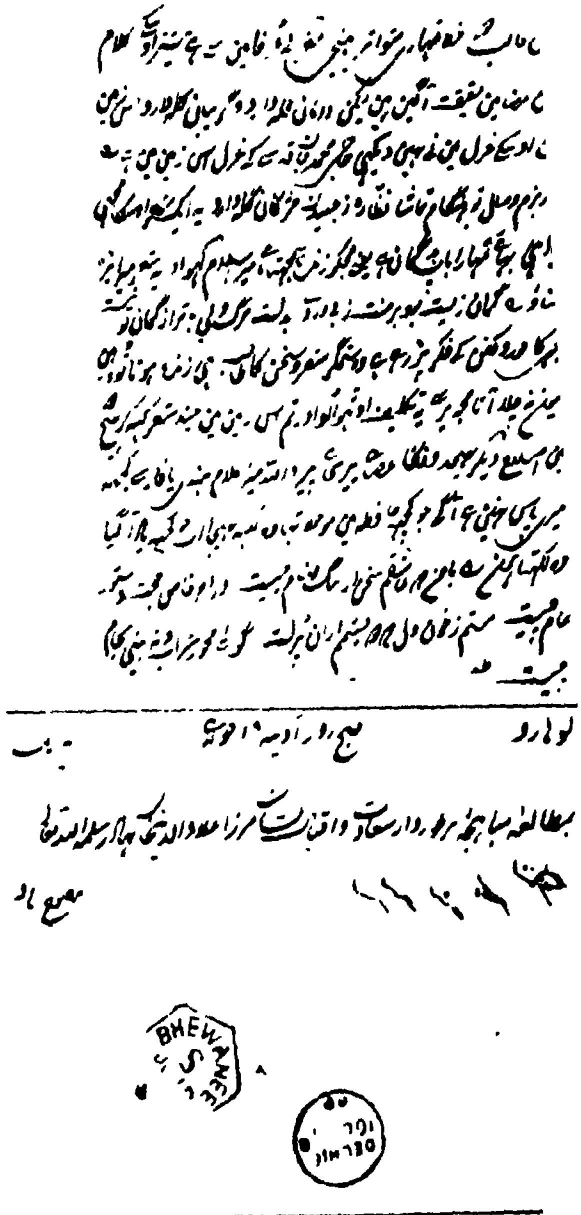


## ثاقب لکھنوی

گلشن میں کہیں بوئے دمسازہ نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ اُلفت سے
اک میری طبیعت ہے، جو باز نہیں آتی

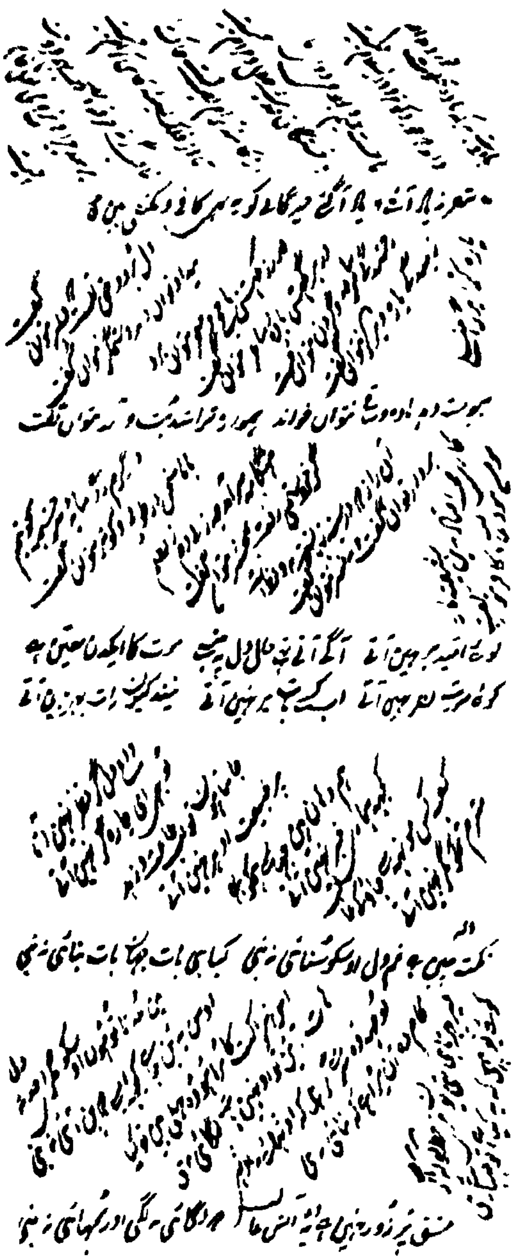
میرزا ثاقب لکھنوی
پانزدہم ماہ نومبر ۱۹۴۳ء

مرزا ثاقب لکھنوی کا عکس تحریر

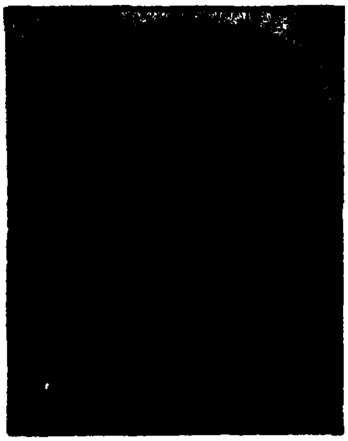


اصل لفافے کی عکسی تصویر جس میں یہ خط ملفوف کر کے بھیجا گیا۔

۵ غالب بنام مرزا علاء الدین خاں علائی



۵ غالب کا کلام بہ خط غالب



بلراج کومل

# ہائیکو

یہ برستا ہے نہ کھلتا
شہرِ دل کا
اجنبی سنگین موسم

---

کھڑکی بند کروں تو میرا دم گھٹتا ہے
کھول کے بیٹھا ہوں
تو جلتی گرم ہوا اور وحشی سائے

---

تصویروں میں جانے کیوں
سب کے سب اچھے لگتے
بندر، آدم خور، گھنا جنگل، اژدر

---

"میرے ساتھ" مجھ سے سرگوشی میں وہ گویا ہوئی
"کچھ بھی کر سکتے تھے تم"
وقتِ رخصت، سرخ جوڑا، اور پھر ماہِ عسل !!

---

موسمِ گل میں، بہ فیضِ لمسِ نو
روشن ہوئے، تو سنگ دل بھی ہو گئے
جسم، رنگ پیرہن، آواز، اندازِ سخن

---

وہ ہنستا تھا، اور ہنستا تھا
پھر اس نے بڑھائی میری جانب
جلتے شہر کی آگ

---

اس کے گاؤں میں سنتے ہیں
پانی چھم چھم برسا تھا
ڈوب گیا ہے میرا گاؤں

---

پاؤں سے سر تک
جسم کو آخر کھا ہی گئی
عمر کی بیل۔ !!

---

کل کی باتیں سب یکساں
آج کی باتیں، سب کی اپنی اپنی ہیں
آنے والے کل کی باتیں۔ پتھر کی دیوار !!

---

سونے والے سو چکے
جاگنے والوں کے لب پر
تیرا نام ! تیرا نام !

● ای-۹۴۱، کالکاجی، نئی دہلی-۱۹




## خواجہ احمد فاروقی

۲۔ یونیورسٹی روڈ، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی۔۷


# اعجاز مرحوم

قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم [۱۹۱۱ء - ۱۹۷۸ء] کی شخصیت اور کارناموں کو محیط ایک ضخیم خاص نمبر کی ترتیب کا خیال دھاکہ مدتوں سے ادھورا پڑا ہے حتیٰ کہ بے شمار عقیدت مندانِ اعجاز صدیقی اور ہمارے کرم فرماؤں کا مسلسل اصرار بھی رہا ہے کہ اعجاز صدیقی نمبر شائع ہونا چاہیے لیکن چونکہ ایک معاصر ادبی رسالے نے اعجاز صدیقی نمبر شائع کرنے کا اعلان ۱۹۸۰ء میں کر دیا تھا اور کثیر تعداد میں مضامین وغیرہ جمع ہو گئے تھے لہٰذا ہم اس نمبر کی اشاعت کے منتظر رہے لیکن ایک مدت گذر جانے کے باوجود بھی یہ خاص نمبر منظرِ عام پر آنے والا تھا نہ آسکا تو ہمیں احساس ہوا غیر معمولی تاخیر ہو چکی ہے۔ اب کام کا آغاز ہونا چاہیے۔ ان کی شاعری، ہر عنوانات کے تحت منتخب لازوال تحریریں، مضامین و مباحث، اسم با مسمّیٰ شخصی خاکے، تحقیقی و تنقیدی مضامین، تبصرے وغیرہ کی یکجائی۔ ان کی تحقیق و تدوین ہو رہی ہے۔ بہر حال خواجہ احمد فاروقی صاحب کے ایک تاثراتی مضمون سے اپنے کام کی ابتدا کر رہے ہیں اور اب آئندہ شماروں کے صفحات پر قبلہ مرحوم کے کارناموں کو مضامین وغیرہ کے ذریعہ پیش کیا جائے گا۔ خواجہ صاحب نے مشہور زمانہ کالم خرافات کے اداریوں کی اہمیت و افادیت کو اپنے طور پر اجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور قبلہ مرحوم نے اردو زبان کے لئے جو قربانیاں دی تھیں اور جو خدمات انجام دی تھیں اس کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی خدمات کا یہ سلسلہ ایک صدی کو محیط ہے اور اب یہ ہماری روایت بن گیا ہے۔ [ادارہ]

ایک مرتبہ شیطان سخت بیمار ہو کے بستر پر پڑ گئے۔ شیاطین میں صف ماتم بچھ گئی۔ مصلحت اجل اور ڈاکٹر بلائے گئے۔ کسی نے کہا ہے کسی بڑے قاتل کا خون دینا چاہیے۔ خون پہنچایا گیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ ہذیان کی کیفیت بڑھ گئی۔ پھر طبیبوں کا مشورہ ہوا اور یہ تجویز ہوئی کہ اسے کسی بڑے کذاب کی بوٹیوں کا شوربا دینا چاہیے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا بلکہ مرض بڑھ گیا اور شیاطین پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ آخر میں ایک بوڑھے طبیب نے جس کے بال بہت ہی سفید تھے۔ اور پلکیں اور بھنویں تک سفید برف تھیں، تجویز کیا کہ کسی بڑے بے حس اور بے درد کی کلیجی کو جلا کر سفوف کر لیا جائے اور اس سفوف کی پڑیاں دو دو گھنٹے بعد دی جائیں۔ خدا کی قدرت کہ اس نے ایک ہی خوراک کھائی تھی کہ آنکھیں کھول دیں۔

بے حسی سب سے بڑا زہر ہے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور اس نے احساسِ زیاں کو بالکل مٹا دیا ہے۔ اردو کا قتل عصرِ حاضر کی تاریخ کا سب سے دردناک واقعہ ہے۔ ایسا کہ رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگے لیکن اہلِ اردو نے اس کا جنازہ بھی دھوم سے نہیں اٹھایا۔

اردو کے قافلے میں ایک شخص تھا: اعجاز صدیقی جس نے اس بے حسی اور بے دردی اور بے ضمیری کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے زبان و ادب کے عاشقوں سے منتیں کیں، آہ و زاری کی کہ وہ اردو کے لئے سینہ سپر ہو جائیں، قدم ملا کے چلیں، اپنے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اپنے تخلیقی کارناموں سے اردو کو سربلند کریں۔

اعجاز جانتے تھے کہ زبانیں، سونے کے انجکشنوں سے زندہ رہتی ہیں اور نہ حکومت کی بیساکھیوں پر چلتی ہیں۔ ان کی زندگی کی ضمانت تو صرف ادیبوں اور شاعروں کا خونِ جگر ہے ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

واضح رہے کہ ٹیگور (۱۸۶۱-۱۹۴۱ء) سے پہلے بنگالی اتنی وسیع نہیں تھی۔

گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲ء) سے پہلے جرمن زبان کو ادبی محفلوں میں جگہ نہیں مل سکی تھی۔ جرمنی کا سب سے بڑا بادشاہ تو صرف اپنے گھوڑوں سے جرمن زبان

میں باتیں کرتا تھا۔ دانتے کا طربیہ خداوندی ۲۱-۱۳۱۴ء سے پہلے اطالوی زبان کو یہ مرتبہ اور وقار حاصل نہیں ہوا تھا اُردو میں میر و غالب و اقبال اسی درجہ کے شاعر ہیں کہ اس کو بلاشبہ بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملنا چاہیئے۔ اس میں جو طنز و مزاح کا سرمایہ ہے جو مکتوباتی ادب ہے، جو غزل کا خزانہ اور سماجی تاریخ کی دولت ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے آنکھوں پر جگہ دی جائے۔

دنیا میں اُردو کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو پچاس ملین کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اور یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ آسٹریلیا اور کناڈا کی بھی آبادی نہیں۔ اعجاز صدیقی نے اُردو کی اتنی بڑی آبادی کی بے حسی اور بے عملی پر ماتم کیا ہے اور اپنی بے مثال محنت سے ان کو خواب گراں سے اٹھایا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے اعجاز صدیقی جب آگرہ سے دہلی مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے بمبئی جانے اور وہاں سے شاعر نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے عرض کیا تھا:

"بمبئی سوداگروں کا شہر ہے۔ وہاں نہ شاعر کی گنجائش ہے اور نہ شاعری کی۔ جوش اور ساغر نے وہاں رہنے کی کوشش کی لیکن ان کو ایک دن بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا اور ان کی شاعری میں سطحیت آگئی۔ پرچہ آپ نے نکالا بھی اور وہ آخری سانس کی طرح نکلا تو اس سے کیا حاصل ہے۔ ارض تاج کو نہ چھوڑیئے اور یہیں دل و نگاہ و نفس سب اُردو کی خدمت میں لگا دیجئے اور اگر بمبئی کے راستے پاکستان جانے کا ارادہ ہے تو میں صرف آپ کی عقل کا ماتم کر سکتا ہوں۔ انسان اینٹ پتھر نہیں ہے کہ اسے یہاں سے اٹھایا اور اُدھر رکھ دیا۔"

اعجاز صدیقی نے کہا:

آپ میرے بزرگ ہیں۔ سیماب صاحب کے قدردانوں میں سے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شاعر، آخری سانس کی طرح نہیں نکلے گا۔ میں مر جاؤں گا لیکن شاعر کو نہیں مرنے دوں گا۔ اس کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان نہیں جاؤں گا اور اُردو کی خدمت میں دل و نگاہ و نفس سب لگا دوں گا۔"

اس میں شک نہیں کہ اعجاز صدیقی نے اُردو کی خدمت میں دل و نگاہ و نفس لگا دیا تھا۔ اُن کا جاگنا اور سونا، اٹھنا اور بیٹھنا سب اُردو کے لئے تھا۔ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ بڑی بڑی کڑیاں جھیلیں۔ اپنوں کی بے حسی اور بے دردی کو برداشت کیا لیکن وہ الف لیلہ کی کہانی کی طرح سیدھے راستے پر چلتے رہے۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ اِدھر اُدھر دیکھا اور وہ پتھر کے ہو جائیں گے۔

اُردو زبان پر جب بھی بُرا وقت آیا ہے تو انہوں نے صرف غزل ہی نہیں کہی بلکہ ایسی ولولہ انگیز نظموں اور بے پُرمغز اداریوں کے ذریعہ اُردو والوں کو جھنجھوڑا اور ان کی غیرت کی آنکھ کھولی۔

اعجاز صدیقی کے لئے بڑا آسان تھا کہ وہ حکومت کی قوالی کرتے، جا و بے جا طور پر اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے یا کسی وزیر یا اُدارے سے رشتہ جوڑ لیتے اور اس شاگردی اور مدح گستری کے صلہ میں اپنی دکان چمکاتے لیکن انھوں نے یہ ضمیر فروشی کبھی نہیں کی اور اپنے اصولوں پر سختی سے جمے رہے۔ انھوں نے اُردو کے بہی خواہوں اور حکومت دونوں کو اپنی تہذیبی، آئینی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے باخبر کیا اور اُردو کے لئے عمل صالح کی فضا پیدا کر دی۔

اعجاز کی ان بکھری ہوئی تحریروں اور شاعر کے اداریوں کے بغیر عصر حاضر میں اُردو کی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ایک ایک نقش، فریادی ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ قطرۂ خوں ہے جو خلوص کی شدّت میں ڈبو کر لکھا گیا ہے۔ پتھروں کی عمارتیں ڈھ جائیں گی لیکن یہ تحریریں نہیں مٹ سکتیں۔ کہنے کو تو یہ اداریے چند لفظوں اور جملوں کا مجموعہ ہیں لیکن ان کے پیچھے اعجاز کی زندگی کا سارا درد اور کرب ہے۔ رفتار و گفتار و کردار کی ہم آہنگی ہے۔ ان کا بے پناہ خلوص اور اس کی گرمی ہے۔ وہ خلوص جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا اور تعمیر و عمل کی ایک نئی فضا پیدا کر دی۔

اعجاز صدیقی کے طرز نگارش پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایک قصہ یاد آجاتا ہے۔ نظام المشائخ دہلی کے "تمہید نمبر" میں مولانا ابو الکلام آزاد کا ایک مضمون "سرمد شہید" پر شایع ہوا تھا۔ اس کو پڑھ کر علامہ شبلی نے فرمایا تھا کہ سرمد کے حالات اتنے ہی ملتے ہیں جتنے ابو الکلام نے لکھے ہیں۔ لیکن حالات کو پھیلایا بہت ہے۔ اکٹھے بیس صفحے لکھ ڈالے۔ مواد صرف دو صفحے کا ہے۔ باقی ابو الکلام کی ادبیت ہے۔" اعجاز صدیقی کے یہاں اختصار و ایجاز ہے اور طوالت بیان نہیں ہے اسی لئے ان کی تحریریں بڑی اثر انگیز ہیں۔

اعجاز صدیقی نے مایوس دلوں کے گھپ اندھیرے میں امید کی جوت جگائی اور رجائیت کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کر دیا۔ انھوں نے علم و یقین کی جو شمع روشن کی ہے وہ خود دلیل سحر ہے لیکن مجھے یقین ہے شاعر کے پڑھنے والے اور لکھنے والے ——— اعجاز کی اس میراث کو سنبھال کر رکھیں گے اور اُسے اپنے ذہن و ضمیر کا حصہ بنا لیں گے۔ ؎ عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

# جہات:- کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں -!

غریب اور مظلوم اُردو زبان کے لئے اُردو والوں نے وہ سارے جتن کرنے جو وہ کر سکتے تھے۔ سالہا سال سے ایک یاس انگیز عالم ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب بے چارہ اُردو کو اس کے علاقوں میں اس کے حقوق دے دے گا کبھی ہر اُمید ایک خواب دوسرا معلوم ہوتی ہے۔ اُمیدیں یاس میں بدل جاتی ہیں آرزوؤں پر پانی پھر جاتا ہے اور تمنائیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ دُنیا کی کسی دور اور کسی تاریخ میں ایسا دیکھا اور نہ سُنا۔ ہر ملک نے اپنے اعلانات کو پورا کیا ہے۔ ہر حکومت اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ بہار کی حکومت اور تو تمام ملکی معاملات میں اپنے احکامات اور اعلان کے نفاذ کی زبردست کوششیں کرتی ہے لیکن اُردو زبان کے سلسلے میں اب تک کے سارے اعلانات قطعی بے نتیجہ ثابت ہوئے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی میں اُردو کو اس کے علاقوں میں بحال کرنے کے لئے بارہا وعدے فرمائے تھے، وہ اُردو زبان کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی حکومت کی مشینری نے انہیں آگے بڑھنے نہ دیا۔ ہمارے نہایت محترم وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری نے بھی وعدے فرمائے۔ پارلیمنٹ میں اور اسمبلی کے کئی سوالات میں نیز مرکز اور صوبۂ یوپی میں شدت کے ساتھ اُردو کا سوال اُٹھایا۔ حکام سے وفود ملے اور اسی سال نہیں گزشتہ پندرہ سولہ سال میں نہ جانے کتنے وفود وزراء اور دیگر حکام سے ملتے رہے ہیں۔ مگر اُردو کا مقدر جہاں کا تہاں ہے!!---- ایک عالم سکرات ہے جو کسی صورت ختم نہیں ہو رہا ہے---- اُردو زبان بڑی ڈھیٹ ہوتی ہے اور دیکھتے ہیں کہ جا رہا ہے کہ گھبرا کر نہیں ابھی مارتے ہیں - کوئی حد -؟ کوئی انتہا - ؟

اُردو والے کسی قسم کی ناجائز رعایت نہیں چاہتے۔ یہ صرف اپنے جائز حقوق کے لئے درخواستیں کرتے رہے ہیں۔ ادب کے ساتھ سنجیدگی اور تہذیب کے دائروں میں رہ کر انہوں نے اپنے مطالبات پیش کئے ہیں۔ ان کے نمائندہ وہ لوگ رہے ہیں جو حکومت سے قربت رکھتے ہیں۔ حکومت نے ان کو ہمیشہ اعتماد کی نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن اُردو کی نمائندگی کے سلسلے میں اُن کی بھی پروا نہیں کی گئی۔

واقعات کے تضادات حد درجہ حیرت ناک اور موجب افسوس ہیں۔ دُنیا کی بڑی زبانوں کی جب فہرست بنتی ہے تو اُردو زبان کو الگ سے ایک امتیازی حیثیت ملنے کے علاوہ، وہ ہندی زبان کے ساتھ مل کر ہندوستان کا سر بلند کرتی ہے اور دُنیا کی بڑی زبانوں میں ہندوستان کی یہ زبانیں مشترکہ طور پر دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتی ہیں۔ خود ہندوستان میں زبانوں کی رپورٹ بتاتی ہے کہ ہندی زبان کے بعد اُردو کا چلن سب سے زیادہ ہے۔ اِس سال چودہ زبانوں میں اُردو کے نئے روزنامے سب سے زیادہ نکلے۔ اُردو رسائل و اخبارات کی مجموعی تعداد دُوسری زبانوں سے آگے رہی۔ بعض ریڈیو اسٹیشنوں پر اُردو کے نئے پروگرام شروع کئے گئے۔ اُردو کتابوں پر پہلے بھی انعامات ملتے تھے۔ اِس سال اور زیادہ ملے۔ مرکزی حکومت نے ازراہِ کرم نوازش اِس سال اُردو کے لئے سالہائے گزشتہ سے زیادہ خطیر رقم منظور کی جو آٹھ لاکھ روپے ہے۔ حالیہ جنگ میں بھی اُردو زبان کے آگے آگے رہنے کا اعتراف کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن اُردو کی تعلیم ———— ؟

بس اسی بنیادی حقیقت کو نظر انداز اور فراموش پہلے بھی کیا گیا اور اب بھی کیا جا رہا ہے۔ کتنے ہی صوبوں میں نئی نسلوں کو اُردو زبان سے محروم کر دیا گیا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری کاموں میں اس کے اثر کو محدود۔ سیکڑوں بار عرض کیا گیا کہ ہندی زبان قابلِ احترام ہے اس کی تعلیم اُردو والوں کے لئے لازم و ملزوم، مگر اس کے ساتھ اُردو تعلیم کا بھی مستقل انتظام کیجئے۔ مگر اب تک یہی نہیں ہو پایا۔ اُردو والوں کو صرف یقین دہانیاں کرائی گئیں لیکن ہوتا ہے تو یہ کہ تازہ اطلاع کے مطابق صوبۂ بہار میں اُردو کے طلبہ کے لئے نہایت سخت ہندی زبان میں امتحان کے پرچے چھپے اور جبراً انہیں حل کرنے پڑے اور نتیجہ نہایت افسوسناک نکلا۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے۔

اُردو والوں کو انعامات نہیں چاہئیں۔ اُردو زبان کو سرکاری امداد و اعانت نہ دیجئے۔ صرف اُس کی تعلیم کا تمام انتظام ابتدا سے ثانوی مدارس تک کر دیجئے۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں بقدرِ ضرورت اس کو بھی جگہ دیجئے۔ اُردو والوں کو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہئے۔ جمہوریت کی رواداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُردو جیسی بڑی اور مقبول زبان کی تعلیم اُن کو بھی دی جائے جن کی مادری زبان ہندی ہے۔ پھر دیکھئے ہندوستان کس طرح اعلیٰ مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ قومی یکجہتی کے باغ پر کیسی بہار آتی ہے اور زبان کا جھگڑا کس طرح ختم ہو جاتا ہے -!

[signature]

۱۸ دسمبر ۱۹۶۵ء

## غزل

(میر انیس کی زمین میں بی نکر)

اعجاز

بیامِ لطف ہے خمرِ کلفِ حسینوں کو — نظر لگے نہ کہیں میرے ماہ جبینوں کو!

قدم قدم پہ سجائے گئے ہیں مقتلِ شوق — پکارتا رہا ہے جو آستینوں کو

اگر بکھر گئی یہ محفلِ قدح خواراں — کہاں سے ڈھونڈ کے لائیگے ہمنشینوں کو؟

کتابوں کی نہیں اور حرم گئیں ان پر — ~~[illegible]~~ کف میں جو رکھی وقت کے نگینوں کو!

یہ اشک و آہ سے ہوگی نہ سرد، اک آگ ہے — پلاؤ خون سلگتی ہوئی زمینوں کو

ہوئے تباہ وہ ٹکرا کے سنگِ ساحل سے — بچا کے لائے تھے طوفاں سے ہم سفینوں کو

یہ بزرگوار ~~[illegible]~~ عزت کے مرحلوں کے لئے — گلے لگاؤ محبت کے خوشہ چینوں کو

حریفوں کی کرشمہ گری کچھ اور ~~[illegible]~~ تنگ دلی — کشادہ ظرف بنانے ~~چلے تھے سینوں کو!~~

ہم آ گئے خودی میں کہ ہم اعتبار — ملاؤ آنکھ یہ ہم لوریہ نشینوں کو

کرد کوئی سجدہ ہوگ رہا روزی — جھکا تیغ یہ رحم آشنا جبینوں کو

ہوا کے صحرائی اگر کچھ اور چلی — ڈھونڈتے رہ جائینگے مکینوں کو!

شکستہ دل، بہت ہم ان کو خیال اعجاز

لگی تو عشق نے آئینوں کو

اعجاز صدیقی

شمار دور وقت کیسی مگر — کہیں دلوں کو گماں ہے کہیں مہینوں کو



اعجاز صدیقی

## غزل

کے ساتھ ہی

زنجیر یا ~~[illegible]~~ گنہگار ہی چلے — جب سر چلیں تو فاصلہ بیدار ہی چلے

پھر حسب کچھ کا گلوں پر پناہوں کی ہے تلاش — دل کو ملی کیا ہے تا کہ آثار ہی چلے

چلے کا تذکرہ ہے تو ان تھوڑی دور تک — ہم راستوں ہی ہیں غمزدار ہی چلے

اب کون رقص و رنگ کی محفل سجائے گا؟ — اے پیرِ میکدہ ترے میخوار ہی چلے

کچھ دیر تو گرتیں ہم دلوں کی جھلکیاں! — کچھ دیر قہقہہ لب و رخسار ہی چلے

گمراہیاں انہیں کے مقدر میں آئی ہیں — جن قافلوں میں قافلہ سالار ہی چلے

ہم دشتِ بیکسی کے ہیں راہی ہمارے ساتھ — موج ہوا کے جھونکے دلدار ہی چلے

عرضِ متاعِ شوق پہ سب خود ہی بک گئے! — بازارِ غم میں جتنے خریدار ہی چلے

جب ہم ٹھہر گئے تو ٹھٹک گئے ہنگامۂ شہر — جب ہم چلے تو کوچہ و بازار ہی چلے

غربت میں غم گسار کسی کا کوئی تو ہو! — سایہ کے ساتھ ساتھ یہ دیوار ہی چلے

یہ پیدا آنچ جو یہ سینے تڑپے تڑکے — دھوپ اگر ہوں تیز تو بیزار ہی چلے

اعجاز جتنی تیز چلیں غم کی آندھیاں — اتنا ہی تند نشتر بیدار ہی چلے

(دیوانِ حق ...)

(۲۳ رجون ۱۹۷۸ء)

[illegible]



کالی داس گپتا رضا

۲۰۲ اے۔ جل درشن، ۴۴۲ اے، پوتھا منزل انیکسی روڈ بمبئی ۶

# بیدل اور غالب

مرزا عبدالقادر بیدل نے ولادت ۱۰۵۴ھ مطابق ۱۶۴۴ء اکبر نگر (راج محل) ۳ صفر ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۲۰ء کو دلی میں وفات پائی۔ غالب ۷۰ سال بعد ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ دور مشرقی تہذیب کا انحطاطی دور رہا۔ چنانچہ شاعری کو ایک طلسم اور معنی آفرینی کا مرقع بنا دینا اور اس پر ناز کرنا، اس دور کی بعض خصوصیات میں سے ہیں مگر بیدل نے اس طرز سخن میں جو نام اور شہرت پیدا کی ہے وہ انہیں کی اپنی اور اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے بعد کے شاعروں نے کسی نہ کسی رنگ میں ان کی تقلید کرنی چاہی ہے، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ اور غالب تو اپنی ابتدائی عمر کے تقریباً پچیس سال بطور خاص بیدل کے پیرو رہے اور یہی آپ پر ان کا ناز عمر فارسی گوئی میں بھی قائم رہا۔ چنانچہ جہاں بیدل لکھتے ہیں:

بیدل از فطرت ما قصر معانی ست بلند | پایہ دارد سخن از کرسی اندیشۂ ما

غالب نے بھی بصد فخر کہا ہے:

ہر ارمعنی سر و ستش خدمی تعلق من است | از ابی ذوق دل وگوشہ از عکس بر داشت

غالب اگرچہ مستقلاً فارسی گو رہے مگر ان کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز تقریباً ۱۸۲۲ء یعنی پچیس سال کی عمر سے ہوا ہے۔ اس وقت تک وہ بیدل کی پیروی ترک کر چکے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں بیدل اور اسیر و شوکت کا رنگ بہت کم پایا جاتا ہے۔ مگر ابتدا میں جو اردو شاعری انہوں نے کی وہ یکسر بیدل کے زیر اثر کی۔ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب، مکتوبہ ۱۸۱۶ء میں جب کہ ان کی عمر ابھی ۱۸، ۱۹ سال کی تھی، ان کے تین مقطعے اسد کے تخلص کے ساتھ یہ ہیں:

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے | مجھے رنگ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب | ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب | عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

آخری دو مقطعوں میں پہلے اسد تخلص تھا، ۱۸۲۱ء تک موجودہ شکل میں اور غالب تخلص ڈال دیا گیا تاہم دل و دماغ بر رنگ بیدل مسلط رہا جیسا کہ یہ ظاہر ہے

---

۱؎ سال ولادت دو مادوں "فیض قدس" اور "انتخاب" سے برآمد ہوتا ہے مادے مولانا قاسم درویش نے نکالے اور بیدل نے نظم کئے۔

۲؎ توقیت بیدل مختصراً یہ ہے: ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء ولادت راج محل۔ تقریباً ۱۶۴۵ء میں والد کی وفات، تربیت چچا مرزا قلندر کے ذمے۔ تقریباً ۱۶۵۵ء میں قرآن کی تعلیم سے فارغ۔ بعد ازاں علوم متداولہ سیکھے۔ شہزادہ محمد معظم کی ملازمت اور پھر ہمیشہ کے لئے ترک ملازمت ۴۰ سال (۱۶۸۳ء) کی عمر میں محمود سلم دختر شاہ عاقل خاں ہوا۔ کہا گیا درج ہے کہ وہ جن شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے ان کے القاب یا نام یہ ہیں: شیخ کمال، شاہ ملوک، شاہ یکہ، شاہ فاضل، شاہ ابوالفیض، شاہ کابلی۔ آخر الذکر سے آخری ملاقات ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ بیدل کے شاگردوں میں شکر اللہ خاں، صوبیدار، نواب دولت خاں از نجات سرکار اورنگ زیب، نظام الملک آصف جاہ اول، امانت رام امانت، شیو رام حیا، بندرابن داس خوشگو، محمد علی، اللہ خاں عطا، مغل خاں قابل، آفتاب خاں، اسد رام مخلص اور سری گوپال تمیز شامل ہیں۔ وفات ۱۷۲۰ء بمقام دہلی۔ اپنے ہی گھر میں دفن ہوئے۔ سرو آزاد میں لکھا ہے کہ ایک لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ چہار عنصر کے علاوہ نکات، محیط اعظم، عرفان، طلسم حیرت، طور معرفت، اور غزلیات، رباعیات، قصائد، قطعات کا دیوان ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہوگا جس کی نشاندہی فی الحال نہیں کی جاسکتی۔

تخلص کے ساتھ کہیں اسد تخلص ترک نہیں ہوا چنانچہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) کے متن میں مزید مقطعے ملتے ہیں اور ۱۸۱۶ء اور اس سے پہلے کے کچھ مقطعے جن میں بیدل سے عقیدت پائی جاتی ہے ابھی برقرار رہے ہیں:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل ۔۔۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

در کارگہِ فکرِ اسدِ بے نوائے دل ۔۔۔ یاں سنگ آستانۂ بیدل ہے آئنہ

وحشی دل ہے، مجھ سے حسنِ فطرتِ بیدل نہ پوچھ ۔۔۔ قطرے میخانۂ دریا سے بے ساحل پوچھ

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار ۔۔۔ اسد آئینۂ پردازِ معانی مانگے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بکف، اسد ۔۔۔ یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسد ۔۔۔ شوخیِ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

طرزِ بیدل کی مداحی میں ایک مقطع بھی ہے جس میں غالب نے تخلص کی جگہ اپنا پورا نام درج کیا ہے۔ اس شعر کا تعین غالب اپنے مکتوب بنام مولوی عبدالرزاق شاکر میں لکھتے ہیں: "ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا ۔۔۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

خط پر تاریخ درج نہیں مگر یہ یقیناً مرزا کی زندگی کے آخری چند سالوں میں لکھا گیا تھا۔" ابتدائے فکرِ سخن" کے معنی یہی ہیں کہ شعر ۱۸۱۲ء (تذکرہ عمدۂ منتخبہ کی اولین روایت ترجمۂ غالب) کے آگے پیچھے کہا گیا ہوگا مگر یہ سب شعر ۱۸۲۱ء تک کے ہی ہیں۔ اس عہد کے بعد اردو میں ایک شعر بھی بیدل کی مداحی میں نہیں کہا اور گل رعنا (انتخاب کلام از غالب ۱۸۲۸ء) سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک غالب طرزِ بیدل کی تقلید قریب قریب ترک کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ بیدل کے اثر سے کلیتاً کبھی آزاد نہیں ہوئے۔ تخیل در تخیل کے گل بوٹے اور خیالی مضامین کے ہوائی قلعے، کلام کو انتخاب کرنے کے باوجود کہیں کہیں جھلک دکھا ہی جاتے ہیں۔ غالب نے بعد کے زمانے میں بھی اپنے خطوں میں کئی مقامات پر بیدل کے شعر سے فائدہ اٹھایا ہے مثلاً ۲۹ جون ۱۸۵۶ء کو اپنے خط بنام انوار الدولہ میں لکھتے ہیں:

"اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں وہ زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے ..... فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل

جہد با در خورِ توانائیست ۔۔۔ صنعت یکسر فراغ می خواہد

"۱۹ نومبر ۱۸۶۲ء کو سرور کو لکھتے ہیں: ..... عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان ہے۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

مرزا تفتہ کو ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

"میاں میرے بچانے کو وہ حق ہے اور تمہارے سمجھنے کو عقل ہے، ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے، اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ میرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام ۔۔۔ زیں ہوس با گذر یا مگذر، می گذرد"

خط بنام حکیم غلام نجف خاں میں [اپریل ۱۸۵۸ء (؟)] کو لکھتے ہیں

"خدا جانے میں جاری ہوگا یا نہ ہوگا۔ احتمالِ تعیش و تنعم بشرطِ تجدیدِ صورتِ اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ مرحوم بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

نہ شام ما را سحر نویدی، نہ صبح ما را دمِ سپیدی ۔۔۔ چو حاصل ماست نا امیدی غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ"

انوار الدولہ شفق کے نام کے خط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۵ء میں ہے

"اور 'کی' اور 'ے' کی حرکت و سکون کے باب میں قول فیصل یہی ہے جو حضرت نے لکھا ہے ..... مرزا عبدالقادر بیدل

چو ری سطور بہت ازل گو و گریز ۔۔۔ کہ نیز در ایں تماشا بجواب لن ترانی"

مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی دفتر اسد اللہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء کو لکھا ہے:

" یہ جو قبول اہلِ سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمہ کے بارے آیا ہے ؎

میرآں کسے را کہ ہرگز نمیر

مجاز ہے ، امر بھی اور تشبیہ بھی ، متاخرین میں سے بھی عبدالقادر بیدل کہتا ہے ؎

بمیر اے سرکشِ ناپاک تا یک دم بیاسائی "

یہ مولوی ضیاء الدین دہی ہیں جنھوں نے مولوی امین الدین پر غالب کے ہتکِ عزت کے مقدمے میں غالب کے خلاف گواہی دی تھی۔

مرزا ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور وہاں ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ قیام کر کے ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دہلی آئے۔ کلکتے کے ادبی معرکے میں جب ان کی بہت زیادہ بڑھی تو انہوں نے آشتی نامہ (جو بعد میں بادِ مخالف کے نام سے مشہور ہوئی) کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ اور اس میں اپنے شعر پر ایک اعتراض کے جواب میں اس کا شعر بھی[1] شامل کیا اور کہا کہ اگرچہ بیدل اہلِ ایران سے نہیں مگر وہ قتیل کی طرح نادان نہیں۔ بعد ازاں بیدل کی تعریف میں یہ شعر ہے ؎

ہم عیاں این محیطِ بے ساحل      قلزمِ فیض[2] ، میرزا بیدل

مگر چند ہی اشعار کے بعد وہ اس مثنوی میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ " طرزِ بیدل بجز تفنن نیست " اس مصرع کو ترکِ اتباعِ بیدل کا پیش خیمہ کہنا چاہیے۔ یہ بات ۲۹-۱۸۲۸ء کی ہے۔ اس کے بعد کے غالب کے اشعار سے کہیں عقیدتِ بیدل کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ طرزِ بیدل کو خیرباد کہہ کر ظہوری ، عرفی ، نظیری کو رہنما بناتے آتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ غالب اپنے کلام میں بے راہ روی پر غالب آ گئے۔ غالب نے یا تو نسخۂ بھوپال ( قدیم ۱۸۲۱ء ) کی پیشانی پر اپنے قلم سے بسملہ ، یا علی المرتضیٰ ، یا حسن ، یا حسین کے بعد لولعانی میرزا عبدالقادر بیدل رحمی اللہ عنہ " لکھا تھا اور ترتیب میں " ..... فقیر بیدل اسد اللہ خان ، ..... " درج کیا تھا ، یا بہ عقد و مطرح کے ماتحت نے جو قدرت نے غالب کو ودیعت کیا تھا ، یہ دن دکھایا کہ وہ مضامین اور نزاکتِ تخیل کو صرف اسی حد تک روا رکھنے لگے جہاں تک وہ قابلِ قبول ہو سکتے تھے اور بیدل کو جیسے بھول ہی گئے حتیٰ کہ پنج آہنگ ! میں ، جس کی داغ بیل تقریباً اسی زمانے میں پڑی تھی ( اگرچہ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۴۹ء میں چھپی ) ، بیدل کا کہیں ذکر نہیں۔

اب غالب ۹۰ سال کی عمر کو نجادر کرتے ہیں۔ اب وہ فارسی اساتذہ کے مقلدِ محض نہیں تھے بلکہ اساتذہ میں سے ایک تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک تعصب سا بھی پیدا ہو گیا تھا وہ یہ کہ وہ ہندوستان کے فارسی سخنوروں میں ، سوائے امیر خسرو دہلوی کے کسی کو نہیں مانتے تھے اگرچہ حسبِ ضرورت پڑتی تھی ، تو ہندی فارسی گویوں کے اشعار اپنی حمایت میں استعمال بھی کر لیتے تھے تسلیم کرتا ہوں کہ اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان میں محاورے اور روزمرے کا کچھ فرق ہونا قدرتی بات ہے مگر اس بات میں غلو کرنا نری حماقت ہے کیونکہ اعلیٰ درجے کے رساندانوں میں یہ فرق بہت کم رہ جاتا ہے اور ہر اہلِ زبان کو مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ غالب نے اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیدل کی فارسی کو مستند فارسی نہیں مانا۔ مارچ - اپریل ۱۸۵۹ء ( ؟ ) کے ایک خط بنام سرور میں لکھتے ہیں :

" ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ کے سوا کوئی مسلم الثبوت استاد نہیں ہوا ..... وہ مجسم نظامی گنجوی و بطرح سعدی شیرازی ہے .... فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے ..... آرزو ، نصیر اور شیدا اور بہار وغیرہم ، انہیں میں ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ، ان کی فارسی کیا ! ہر ایک کا کلام منظرِ انصاف دیکھئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ؟ "

منشی ہرگوپال تفتہ کو اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا ؟ سمجھو پہلا مصرع لغو ، دوسرے مصرع میں 'برد' کا فاعل معدوم ، 'حلقۂ زر' کی زے پر نقطہ نہ تھا میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ 'حلقۂ زر' درست نہ 'حلقۂ زر' درست۔ مگر یہ فارسی بیدل کی ہے۔ خیر رہنے دو ..... "

---

[1] شعر اشکے بہ فشارم نہ جگر دارم ـــــ لختہ برسے سرد ساماں طوفاں زدہ    غالب کے اس شعر پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ شعر کی ردیف زدہ کا استعمال غلط ہوتا ہے۔ غالب نے مثنوی بادِ مخالف میں بیدل کا یہ شعر اپنی حمایت میں بطورِ سند پیش کیا ہے ؎ عاشقی بیدلے ، جنوں زدہ ـــــ قدحِ آرزو بخون زدہ

[2] ۲۹-۱۸۲۸ء وہ زمانہ ہے جب غالب ، بیدل اور طرزِ بیدل قریب قریب دونوں کو چھوڑ چکے تھے۔ یہاں بیدل کو 'قلزمِ فیض' محض اس لیے کہا گیا کہ غالب بیدل سے اپنی حمایت میں کام لے رہے ہیں ورنہ محیطِ بے ساحل اور قلزمِ فیض شاعرانہ مبالغے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی ترکیبیں ان کے قصائد میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ جیمز ٹامسن لفٹنٹ گورنر اکبر آباد کے لئے دیکھئے ؎ آسماں پایہ جیمس ٹامسن آں قلزمِ فیض۔

پھر جولائی ۱۸۶۳ء (؟) میں سرور کو لکھتے ہیں:

"..... ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس امیز (؟) ان میں تو ہیں ——————

[اس امیز (؟) نے ذریعے فارسی کے مشاہیر شعرا کے نام گنانے کے بعد غالب نے فارسی شاعری کی تین طرزیں بتائی تھیں، ایک طرز حافظ، اس کے اقران و نظیری، اس کے امثال اور درج صائب، اس کے نظائر، ان تین طرزوں کے علاوہ ہندی فارسی گو شعرا کی طرز کیلئے کہتے ہیں]

"یہ طرز جو تھی ہے۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی کاہے ہندی ہے۔ دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔"

چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے یہ دونوں خط عودِ ہندی میں شامل ہیں جو ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے تقریباً چار مہینے پہلے چھپی تھی[1]۔ تمام تذکرہ نگار اور مشاہیر، بیدل کی عظمت کے قائل تھے اور نظریۂ وحدت الوجود کے ماننے والے، بلا امتیاز مذہب و ملت، بیدل کو ولی کا مقام دیتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی عودِ ہندی کی اشاعت ہوئی اور لوگوں پر غالب کی اس تعریض کا حال کھلا، تو انہوں نے اس کا بُرا مانا مگر جلد ہی غالب کا انتقال ہو گیا اور معاملہ دب سا گیا۔ تاہم آگ لگی اور شعلے اٹھے جن کی خاکستر آج بھی کسی نہ کسی ٹھکانے موجود ہے۔ ایسے ہی چند مقامات کی نشاندہی یہاں کی جاتی ہے۔

اسرارِ احسن۔ محمد احسن بن محمد احمد صدیقی ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے تھے۔ مینی پور ضلع اناؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ احسان اللہ ممتاز اور کل محمد باطن (؟) مکرانی کے شاگرد رہے۔ حیدرآباد دکن کی سرکار سے بھی وابستہ رہے بعد میں نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادوں کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ اگرچہ غالب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر خط و کتابت کے اور شاگردانِ غالب کے ذریعے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہتا تھا۔ احسن نے فارسی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں ارژنگِ فرہنگ، کارنامہ فرہنگ، صحیفۂ شاہجہانی اور اسرارِ احسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[2]۔ اسرارِ احسن نامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ شاید احسن اس وقت تک زندہ تھے۔ وہ صفحہ ۵ پر مرزا بیدل کی مدافعت میں رقم طراز ہیں:

"ہمچناں غالب دہلوی در عودِ ہندی ہجوِ مرزا بیدل علیہ الرحمہ رقم کردہ است و ہجوِ حضرت بیدل روشن تر از آفتاب است، در وجود حقیقت آں ہجا گو از انشائے صحیفۂ شاہجہانی دریافتہ کہ بارہ از حکمِ ضرورتِ نواب گردانیدہ ارجاع حضرت بیدل امر نقاش رقم کردہ ام ——————"

'صحیفۂ شاہجہانی' دستیاب نہیں ہوئی ورنہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی جاتی۔

نمونۂ مغلوبیتِ غالب[3]۔ دس صفحوں کو محیط اس مختصر رسالے کا سرورق صرف یہ بتاتا ہے کہ اس کا نام 'نمونۂ مغلوبیتِ غالب' ہے اور یہ کہ وہ مطبع صدیقی واقع شہر بھوپال باہتمام مولوی بدیع الزماں صاحب طبع ہوا تھا۔ تاریخِ طبع درج نہیں مگر قرائن سے ثابت ہے کہ یہ والا جاہ[4] نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں تصنیف ہوا۔ اس طرح اسے ۱۸۷۷ء یا اس سے کچھ عرصے بعد کی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ ترقیمے سے ظاہر ہے کہ رسالے کے کاتب "حامد علی المواہانی" ہے اور مصنف "شنکر پرشاد تخلص جوش ساکن بھوپال"۔ صفحہ ۲ پر پیشانی کی سرخی یوں ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمونۂ مغلوبیتِ غالب بکرامت ولیِ کامل جناب مرزا عبدالقادر بیدل قدس سرہ، بخواہشِ تصدیق از انصاف پروران و طالبِ جواب از منکرانِ ایں کرامت و غایتِ دیگر، فقط مخلوق از اغلاط"

رسالہ اردو زبان میں ہے جس میں کثرت سے فارسی اور عربی جملوں اور شعروں کے اقتباس دیے گئے ہیں۔ مصنف شنکر پرشاد جوش اردو، فارسی اور عربی کا بہت اچھا درک رکھتا ہے۔ فنِ شعر، زبان کے قواعد اور لغت سے بھی اسے خاطر خواہ واقفیت ہے۔ رسالے کی پہلی چند سطور معنی خیز ہیں۔ غیر ضروری القاب اور الفاظ حذف

---

۱ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام کا خط اردوئے معلیٰ میں شامل ہے جو ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو یعنی مرزا کی وفات سے ۱۹ دن بعد چھپی۔

۲ احسن بلگرامی سے متعلق تمام معلومات 'غالب اور عصرِ غالب' مؤلفہ محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۹۲ سے لی گئی ہیں۔

۳ اس رسالے کا فوٹو اسٹیٹ مجھے عبدالقوی دسنوی صاحب کی وساطت سے ملا۔

۴ نواب صدیق حسن خاں کو 'والاجاہ' کا خطاب انگریزی سرکار کی طرف سے دربارِ قیصری منعقدہ ۱۸۷۷ء میں ملا تھا۔

کیے جاتے ہیں :

"قبل ازیں مرزا قتیل نافہم نے حضرت مولانا روم ..... و حضرت امیر خسرو ...... کے کلام پر ازراہ تعصب بیجا اعتراض لکھے ہیں اور اپنی تصنیفات مثل شجرۃ الامانی وغیرہ میں درج کیے۔ سو بزرگوارانِ موصوف مرزا غالب وغیرہ کے ہاتھ سے کلام اس کا جیسا مردود ہوا مثل حال مردود بیت ابلیس کے شہرۂ آفاق ہے۔ بعد ازاں ویسی ہی حرکت مرزا غالب نے کی یعنی مرزا بیدل کے کلام کو ازراہ الحسد تعصب کے بے دلیل اور بے وجہ ناقص ٹھہرایا۔ چنانچہ خود ہندی میں لکھا ہے کہ کلام مرزا بیدل کا دائرۂ طرز اساتذہ سے خارج ہے۔ بس بکرامت مرزا بیدل اب دیکھنا ہے کہ غالب کی مقبولیت کس حد کو پہنچی اور کیا پردہ دری ہوئی نیز اس پردہ دری سے مقصود نفع خلق اللہ ہے کہ اغلاط سے محفوظ رہیں —————— "

پھر پنج آہنگ پر تنقید کی گئی ہے اور غالب کے بعض فرمودات کو مصطلحات وارستہ سیالکوٹی، بہار عجم (ٹیک چند بہار) اور فن در مصادر سامانہ اشعار حافظ و سیف الدین بخاری کی مدد سے غلط ثابت کیا ہے۔

آگے چل کر لکھا ہے :

"بعض معتقدین غالب یہ کہتے ہیں کہ رسالہ غالب لاجواب ہے اور کسی نے نہیں لکھی۔ سو حقیقت حال یہ ہے کہ کتاب آئین اکبری اور دفتر سوم ابوالفضل اور نگار دانش ابوالفضل اہل انصاف بغور دیکھ لیویں کہ مرزا غالب نے انہیں کتابوں کی کچھ خوشہ چینی کر لی ہے۔ اور اس وقت جو کوئی کچھ خوشہ چینی ان کتابوں کی کرے گا، بے تکلف اس زبان پر قادر ہو جاوے گا ..... خود غالب کی تحریر میں الفاظ ایک طرف اکثر فقرات انہیں کتابوں کے موجود ہیں جیسا کہ یہ فقرہ انشائے غالب کا "پدرش سایہ از سر برگرفت"، نگار دانش ابوالفضل میں موجود ہے اور یہ فقرہ کہ "کمی اندیشہ فرو رفت" گلستاں کے باب پنجم کا ہے اور "بال روان بکشاید" فقرہ مرزا بیدل کا ہے۔ اور تیسرے رقعہ میں جو لکھا ہے "شوخ دیدہ را دل بدرد آوردن" یہ سالم فقرہ مصرع حضرت نظامی .... کا ہے جو اس شعر سکندر نامہ میں موجود ہے ؎

جو اسنے کی در گرتی گرد آورد　　نخوشندہ را دل بدرد آورد

غرض کہ اس طرح فقرات عمدہ اس کے (غالب) کے کتب متداولہ میں موجود ہیں ....."

اسی طرح اور کئی مثالیں دے کر لکھا ہے کہ یہ نوشتہ نمونہ از خروارے ہے۔ غالب کی "سرقت، اہلیت نظم، ایجاد ترکیب" کا بقیہ حال ابھی لکھا جائے گا۔ ارباب فہم و ذکا اس نمونے کو پیش نظر رکھ کر تھوڑے ہی غور سے غالب کے کلام سے بہت سی اغلاط نکال سکتے ہیں۔ اور اگر مکمل کر مشتہر کر دیں تو موجب حفظ خلائق ہوگا

"باعث حصول ثواب بجناب ذری الحق واہل یعنی مرزا بیدل علیہ الرحمۃ کی ہے۔ پس اب اہل انصاف سے امید تصدیق بذریعہ مکاتبات ہے اور حامیان اور معتقدان غالب سے طلب جواب ہے اور جواب اس کا خدمت میں جناب مستطاب سید علی حسن خان صاحب بہادر علی تخلص کیس فرزند جناب معلی القاب نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خان صاحب بہادر فرمان روائے ریاست بھوپال دام اقبالہ کے روانہ فرما دیں۔"

اس اقتباس پر رسالہ ختم نہیں ہو جاتا۔ مصنف نے بیدل کی مدافعت میں کئی اور دلیلیں پیش کی ہیں اور آخر میں کہا ہے:

"کلام مرزا بیدل کا اس وقت کے تمام اساتذہ کاملین ایران اور ہندوستان نے بچشم خود دیکھا اور سوائے مدح کے کوئی حرف کسی زبان سے نہ نکلا یہاں تک کہ تمام کاملین ایران نے پہلوان السخن کا خطاب دیا اور یہ شعر بھی عاقل خان رازی مدح میں مرزا بیدل کی دیکھنا چاہیے:

زیب رنگ بہارستان ملک مرزا بیدل　　سواد کشور ہندوستان رشک صفاہان شد

بخلاف مرزا غالب کے کہ تمام عمر اس پر اہل ہند اور اہل ایران اعتراض اور ناپسندی ظاہر کیا کیے۔ —————— "

پھر فارسی کلام پر کلکتہ کے ادبی معرکے، قاطع برہان کے ہنگامے، ناطق مکرانی اور ہادی علی اشک لکھنوی کے اعتراض کا ذکر کیا ہے پھر لکھا ہے

" کلام اردو اس کا سوائے دو چار شعر کے کہ حال اس کی مرد قیت کا بھی جداگانہ لکھا جاوے گا، آج تک شعرائے اردو پسند نہیں کرتے چنانچہ اسی وجہ سے کوئی شاگرد رشید غالب، کا اردو میں اس کا معتقد نہیں ہے اور دلیل ناپسندی ظاہر ہے کہ اردو میں اس قدر فارسی الفاظ کو داخل کرنا خلاف قاعدہ ہے۔ "

آخر میں ایک حکایت لکھی ہے:

" مرزا ناطق مکرانی کے کلام پر ایک شخص نے محفل میں اعتراض کیا کہ ہم نے یہ محاورہ نہیں دیکھا۔ مرزا نے نہایت غضبناک ہو کر چند بار کہا کہ "تو چہ دیدۂ کہ نہ دیدۂ" پس اب یاد رکھنا چاہیے کہ ...... جس نے مرزا بیدل صاحب کے کلام پر اعتراض کیا ہے ...... اس کا یہ، جواب ہے: 'تو چہ دیدۂ کہ ندیدۂ' "

**کرامتِ بیدل** ۔ یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ دریافت کرنے پر کسی کتب خانے میں بھی اس کا سراغ نہیں ملا۔ اس کا ذکر شنکر پرشاد جوش نے 'نمونۂ منظومیت غالب' میں کیا ہے۔ اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بھی غالب کے خلاف اور بیدل کی مدافعت ہی میں ہوگا۔ لکھا ہے:

" صاحبِ رسالۂ کرامتِ بیدل نے لکھا ہے کہ غالب الفاظ پرست، بے معنی نگار، اصلی فنِ تحریر کو جس کو معاملہ نگاری کہتے ہیں، بمقدار مصنف دستور البیان کے بھی نہیں جانتا کیونکہ دستور البیان میں کہیں نہیں ہے کہ دعوے کچھ اور، دلیل کچھ اور، مبتدا کچھ اور۔ جب یہ رسالے لکھے گئے یا شائع ہوئے، غالب اپنے دفاع کے لئے زندہ نہ تھے۔

لیکن یہ سب کہہ چکنے کے بعد خیال آتا ہے کہ طلسماتی زبان اور دقیق معنی آفرینی کے سوا، کیا بیدل کی شاعری میں اور کچھ نہیں ہے جس سے غالب کچھ استفادہ کر سکتے؟ مختصراً عرض ہے کہ بیدل اپنے عہد کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ انسان تھے۔ ان شعرا میں بیدل برگزیدہ ہیں جنہوں نے حق کو مذہب سے بلند تر رکھا ؎

مے کشی کردیم و آسودیم از تشویشِ وہم گر دو چندیں مذہب از یک جرعہ مے برشکست

جامِ حق ایک ہی گھونٹ سے مذاہب کے توہمات کی گرد بیٹھ گئی۔ ہم نے یہ مے کشی کی اور آرام پایا۔ یہی نہیں بیدل نے رسوم و ظواہر پر بھی بڑی لے دے کی ہے اور اس میدان میں وہ کڑی سے کڑی نکتہ چینی سے بھی باز نہیں آئے ؎

ایں قدر ریش چہ معنی دارد غیر تشویش چہ معنی دارد
آدمی خرس چہ ظلم است آخر مرد حق میش چہ معنی دارد
حذر از زاہدِ مسواک بہ سر عقرب و نیش چہ معنی دارد
بیدل ایں ہمہ ریش است فش است ملت و کیش چہ معنی دارد

یہ لمبی داڑھی سوائے تشویش کے اور کیا دے سکتی ہے۔ کیا ستم ہے کہ انسان ریچھ کی حیثیت اختیار کر لے اور پارسا بھیڑ بن جائے۔ مسواک در از زاہد کے سامنے عقرب و نیش کچھ نہیں۔ اے بیدل! اب بات داڑھی اور طرے کی ہے، ملت اور کیش کو کون پوچھتا ہے۔ یا پھر ؎

بے نیازی از تمیزِ کفر و دیں آزاد بود از کجا جوشید یا رب اختراعِ ننگ ما
یار در آغوش و سیرِ کعبہ و دیر است کند تا کجا رفت است از خود دستوفِ بے پروا ما

بے خودی میں کفر و دیں کی تمیز کہاں رہتی ہے۔ پھر یہ کوتاہ بینی کیسی؟ محبوب سے تو ہم مدام ہم آغوش ہیں پھر یہ دیر و حرم کے پھیرے کیسے؟ ہمارہ شوق آوارہ ہمیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔

بیدل کی اس بے باکی سے غالب متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی کئی جگہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

سر از حجابِ تعین اگر بروں آید چہ جلوہ ہا کہ بہ ہر کیشِ می تواں کردن
رہا را از اں قوم مباش کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بہ درودے
کفر و دیں چیست جز آرائش پندارِ وجود پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود
خوشا رندی و جوش زندہ رودے در مشربِ عشق بر لب خشکی چہ میرد در سر ابستانِ مذہب ہا

تن پروری خلق فزوں شد زریاضت    بزرگی بی افطار ندارد رمضان ہیچ

یہاں بیدل اور غالب کا تقابل مقصود نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب نے جب پیروی بیدل ترک کی تو انہوں نے صرف ان روشوں کو چھوڑا جو انہیں لفظوں کی خارزار تک پہونچاتی تھیں مگر ان روشوں پر برابر چل قدمی کرتے رہے جو مثبت فکر و معانی کے چمن زاروں کی سیر کراتی تھیں۔ ہر عظیم شاعر کی طرح بیدل نے بھی شعر کو زندگی سے الگ نہیں ہونے دیا اگرچہ انہوں نے بیشتر زندگی کے روحانی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ایسا کرنے میں یہ ہوا کہ شعر دل کی دیوار سے سیدھا جا ٹکرایا بلکہ اس کو دماغ کے رستے سے دل تک پہونچنا پڑا۔ غالب نے سنگلاخ طرز بیدل کو تو چھوڑ دیا مگر وہ ان کی فکری روش کو نہ چھوڑ سکے اور آج جب ہم یہ کہا کرتے ہیں کہ غالب نے اردو ادب کو فکری شاعری سے روشناس کر دیا تو لامحالہ اس کا کچھ نہ کچھ کریڈٹ ہمیں مرزا عبد القادر بیدل کو بھی دینا پڑتا ہے جو طرز بیان و فکر میں غالب کے اولین رہنما تھے اور جن سے انہوں نے تقریباً ربع صدی تک نوشہ کر محنت کی تھی۔ سلہ ✿

---

سلہ بیدل نے اپنے سال ولادت کا قطعہ یوں کہا تھا

سالے کہ بیدل بملک ظہور    زبیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبر داد از مولدش    کہ ہم فیض قدس است و ہم انتخاب
۱۰۵۴ھ    ۱۰۵۴ھ

غالب نے بھی اپنے سال ولادت کو رباعی میں نظم کیا اور بعینہٖ یہی پیرایہ اختیار کیا ہے

غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب    ہم بیم عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس    ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب
۱۲۱۲ھ    ۱۲۱۲ھ

عمیق حنفی

## پس دیوارِ شب

نیم شب میں عیشِ بستر چھوڑ کر
کون میرے پیچھے پیچھے آئے گا
اور دیکھے گا کہ میں
اک غیر آباد مسجد میں
چند انجانے بزرگوں کی جماعت میں
تہجد پڑھ رہا ہوں

کون دیکھے گا رجال الغیب مجھ سے
بات کرنے میں مگن ہیں

چاند کو ابرِ فلک پر چھوڑ کر
وقت کی اندھی گپھا میں
دور تک اندر پہنچ
آگ کے اور روشنی کے آبشاروں میں نہاتا ہوں
اور اسی رستے سے باہر آن کر
چاند کی گردن میں اپنا ہاتھ ڈالے
انجمن تا انجمن آوارگی کا شغل لیتا ہوں
نیم شب کو عیشِ بستر چھوڑ کر ■

## سدھی

حدِ ادب کا پاس کرے
دونوں بھنویں
اک انگل دور رہتی ہیں
بند نینوں کے دیے دو ہی ہیں
لو مگر ہے ایک
ٹھیا نہ بیچوں بیچ ماتھے کا تلک بن کر
چمکتی ہے سشمنا
ایک انگوٹھے برابر کی شِکھا
جس سے روشن
میرے اندر کی گپھا

لب سیے بیٹھا ہوا ہوں
میں اگر کچھ بول دوں گا
بس! وہی ہو جائے گا
سچ ہو ہی جائے گا ■



# تہہ آب

نت پانی اور چپ سادھے ہوئے ہر لہر
دم خاموش سطحِ آب
رٹ اور پتلون بنیان اور انڈرویئر
ساڑی بلاؤز پیٹی کوٹ برا اور چڈی
سب کنارے ریت پر بکھرے ہوئے
اور وہ دونوں سمندر کی گپھاؤں میں کہیں گم
جن کے دروازوں پہ آبی چلمنیں
گم شدہ جوڑا کہاں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
ریت اور پانی کے شرمائے ہوئے چہرے
ایک پراسرار کیفیت کے ادھ اجلے ورق
یڈیو کی چار سو پھیلی ترنگیں
ٹی وی کیمرے کی آنکھ
اور اخباروں کی سطروں سے کوئی کب تک بچے گا
ان کے کپڑوں میں بسی ہے ان کی گندھ
جیسے تن میں روح
سونگھ کر کتے پہنچ ہی جائیں گے
زندہ یا مردہ پکڑ کر سطح پر لے آئیں گے
یا زبانیں اور قلم
داستانوں کے کفن بنتے رہیں گے ■

# وہ لمحہ وہ ساعت وہ سعادت

شانت پانی پر گرے اک بوند اور آواز پیدا ہو
جیسے چاندی کی بہت چھوٹی سی گھنٹی بج اٹھی ہو
اور یہ آواز بڑھتی جائے بڑھتی جائے
سیڑھیاں سرگم کی چڑھتی جائے چڑھتی جائے
گونج بن کر آسماں پر چھائے
زہرہ و ناہید کے تاروں کو بڑھ کر چھیڑ دے

اور میرا نام میری جان اور پہچان گم ہو جائے
صرف اس کا لحن اس کا نغمہ ہو اور کچھ نہ ہو

کاش وہ لمحہ وہ ساعت وہ سعادت لوٹ آئے
اور اپنے آپ کو دہرائے

پھر مجھے مل جائے کاش
وہ لمحہ وہ ساعت وہ سعادت ■

● اے - ۲۲۲، ہینڈلا روڈ، نئی دہلی - ۳



جمیل زبیری

ب - ۱۲۲ بلاک ۱۰ ، گلشن اقبال ، کراچی (پاکستان)

# زخم اندر زخم

کمال اور اس کی بیگم حسینہ نے بڑی پرتکلف دعوت کا انتظام کیا تھا۔ آٹھ دس لوگ مدعو تھے سوائے میرے سب ہی بڑے لوگ تھے۔ کچھ ڈائریکٹرز، بیجر، کرنل اور بزنس میگنٹ۔ کمال جو خود بائیس گریڈ کا آفیسر تھا بڑا خلوص برتا کرتا تھا۔ اور مجھے انکل کہتا تھا۔ شاید اسی خلوص کی وجہ دور کے کچھ وہ رشتے تھے جن کا علم ہم لوگوں کو دو چار ملاقاتوں میں ہوا تھا۔

کھانے سے پہلے وی سی آر پر انڈین فلم دیکھنے کا پروگرام تھا جہاں ہم لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا وہاں ایک جانب فرش تھا اور دوسری جانب کرسیاں رکھی تھیں۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ٹی وی اور وی سی آر رکھے ہوئے تھے۔ لوگ آتے گئے اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں مرد حضرات فرش پر اور خواتین کرسیوں پر بیٹھتے گئے۔ فرش پر بیٹھنے میں کچھ دقت ہوتی ہے اس سے میں بھی کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری برابر والی کرسی خالی تھی اس کے بعد والی کرسیوں پر فرزانہ، رخشی، ریحانہ اور نعیمہ بیٹھ گئیں۔ میجر قادر، ڈائریکٹر اسد، کرنل توفیق اور ایک بڑی فرم کے منیجنگ ڈائریکٹر سرفراز فرش پر پاؤں پھیلا کر آرام سے بیٹھ گئے۔ میں ان سب لوگوں سے ایک دو مرتبہ پہلے مل چکا تھا۔ اس لئے تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی۔ مجھ میں اور ان لوگوں میں بہت فرق تھا۔ وہ سب پیسے والے بنگلوں والے زمینوں والے تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور میں.....

کمال اور حسینہ خاطر مدارت میں بچھے جا رہے تھے ہر ایک کا خیال، ہر ایک سے نہایت خلوص اور رواداری کا برتاؤ....

"بھابی آپ وہاں بیٹھ جائیے گدے والی کرسی پر شاید آپ کو کرسی پر تکلیف ہو رہی ہے، انکل آپ کے لئے دوسری کرسی لا دوں، وہ زیادہ آرام دہ ہے۔ بھابی آپ ادھر آجائیں یہاں سے فلم زیادہ اچھی دکھائی دے گی"

رخشی بہت بے تکلف سی تھی اس نے بیٹھتے ہی رفیق کے باپ کا قصہ چھیڑ دیا وہ بڈھا ایسے گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ ایک روز تو اس نے حد ہی کر دی اپنے کمرے سے ایک کرسی اٹھا کر لایا اور ہمارے بنگلے کی دیوار کی دوسری جانب سے ہمارے گھر میں جھانک رہا تھا کہ چوکیدار کو شبہ ہوا اس نے آواز لگائی اور پکڑنے کے لئے دوڑا مگر وہ بوڑھا اپنی کرسی اٹھا کر روانہ ہو گیا۔ چوکیدار دوڑ کر دوسری جانب سے اس کے بنگلے پر پہنچا تو دیکھا کہ ریٹائرڈ کرنل صاحب کرسی اٹھائے تیز تیز بنگلے کے بیرونی دالان کی سمت چلے جا رہے تھے۔ چوکیدار نے ان سے کچھ نہیں کہا اور آ کر سارا قصہ مجھے سنا دیا۔ مجھے اس ریٹائرڈ بڈھے پر بڑا غصہ آیا۔ مگر میں چپ ہو رہی۔"

رخشی نے بیان جاری رکھا۔ بعض لوگ خواہ وہ کسی عمر کو پہنچ جائیں یہ حرکتیں نہیں چھوڑتے اور تو اور ان کا بیٹا بھی ایسا ہی نکلا ہے۔ ظاہر ہے بچے ماں باپ کا اثر تو قبول کرتے ہی ہیں۔ ابھی تھوڑے دن پہلے اس کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ مگر وہ تو اور بھی چکروں میں رہتا ہے آخر بیوی تنگ آ کر اسے چھوڑ گئی۔ فرزانہ نے پوچھا ان کا بیٹا بھی تو بتاؤ۔ اس کا نام رفیق ہے۔ سنا ہے اس بڈھے ریٹائرڈ کی سفارشوں سے وہ بھی اب بڑے عہدے پر پہنچ گیا ہے۔ آج کل لاہور میں ہے۔ یہ کہتے ہوئے رخشی نے ٹی وی کھول دیا۔ اذان کی آواز آ رہی تھی حی علی الفلاح اللہ اکبر اللہ اکبر پھر سے ٹی وی کی آواز بند کر دی اسکرین پر مختلف مساجد کے گول گول گنبد اور لمبے لمبے خوبصورت مینارے اور منقش دروازے مختلف رنگوں میں نظر آتے رہے۔

ریحانہ جو اس وقت موجود خواتین میں سب سے زیادہ تندرست و توانا تھی بابا کسی کا ذکر کر کے ہنس رہی تھی۔ جس وقت میں نے اپنی توجہ اس کی باتوں پر مرکوز کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنی ساس کے بارے میں کہہ رہی تھی میری ساس مجھے بہت ذرا سی ہے۔ کیا مجال جو میرے سامنے اُف کر سکے۔ اگر میں کہوں کہ رات ہے تو وہ کہتی ہے رات ہے بیٹا۔ اور اگر کہوں کہ دن ہے تو کہتی ہے دن ہی ہو گا بیٹا ... کرنل صاحب کی کیا مجال جو مجھے ایک لفظ بھی کہہ سکیں۔ یہ ہی فقرہ سنا ہی تھا کہ کمال نے اٹھ کر وی سی آر پر ہندوستانی فلم کے کیسٹ [illegible]

[illegible]

گانے میں ایک عورت ناچ رہی تھی اور گا رہی تھی کہ ادھر دیکھئے سے لگا کوئی رئیس زادہ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ناچنے والی کا لباس بالکل عریاں تھا اس کی کمر لچک رہی تھی کولہے مٹک رہے تھے۔ وہ بڑی ادا سے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کی دو انگلیوں کے درمیان سے جھانکتی تھی اور نیند لبھانے والی ادا دل سے اس رئیس زادے کو دیکھتی تھی تو وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر قریب بلاتا تھا رقاصہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاتی تھی پھر وہ اپنی کمر میں شرل ڈال کر اٹھتی تھی اور اپنے سینے کے ابھار کو جھلاتی ہوئی تیزی سے تھرکنے لگتی تھی اور گانا جاری تھا۔ اب کمرے میں خاموشی ہو گئی تھی۔ اور سب لوگ ناچ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے خواتین کی باتوں کا لامتناہی سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔

جب وہ ڈانس ختم ہوا اور دوسرا شروع ہوا تو ڈائریکٹر سرفراز نے کہا سر! دیکھیں ہندوستان میں کس قدر آزادی ہے وہ نئی فلمیں کس آزادی سے بناتے ہیں.... پھر کہنے لگا انہیں بنانے کی آزادی ہے تو ہمیں دیکھنے کی آزادی ہے بس یہی نا کہ گھروں میں بند ہو کر دیکھ سکتے ہیں۔ اب کمال کا ملازم کوک کی ٹرے لے آیا۔ بوتلوں کے کھلنے سے خاموشی ٹوٹ گئی۔ لوگوں کی توجہ بٹ گئی۔ ریحانہ کے بیٹے نے کوک کی بوتل اپنے کپڑوں پر گرا لی اور دوسری بوتل لینے کے لیے رونے لگا میجر قادر کا ڈیڑھ سال کا بچہ دودھ کے لیے رونے لگا۔ کچھ عجیب سا شور برپا ہو گیا گانا ڈانس۔ عورتوں کی باتیں مردوں کے قہقہے بچوں کا رونا دھونا۔ میں بیزار ہونے لگا.. اور اس بھرے کمرے میں جہاں دیگر لوگوں کی دلچسپی کا سامان تھا میں اپنے آپ کو بالکل تنہا اور دور محسوس کر رہا تھا میرا جی چاہ رہا تھا کہ پاس رکھی ہوئی پتھر کی ایش ٹرے سے ٹی۔ وی اسکرین چکنا چور کر دوں۔ کسی کا سر پھوڑ دوں یا اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر ... مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا میں بالکل مجبور تھا۔ اف ہم اخلاق کے سارے مقید لوگ۔ شاید کمال کو میری اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ کوک کی بوتل لے کر ایک کرسی میرے قریب کر کے میرے سامنے بیٹھ گیا اور مجھے اسمگل کیا ہوا نہایت عمدہ سگریٹ پیش کیا۔ پھر اپنی جیب سے خوبصورت سنہرے رنگ کا لائٹر نکال کر سگریٹ سلگایا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر والے کمرے میں کھانے کے انتظامات دیکھنے چلا گیا۔ حسینہ نے اٹھ کر وی۔ سی۔ آر بند کر دیا اور وہ بھی باہر کے کمرے میں کھانے کے انتظامات دیکھنے چلی گئی۔ ریحانہ کا بیٹا جس کی عمر تقریباً آٹھ نو سال ہو گی برابر شرارتیں کیے جا رہا تھا اب وہ باہر کے کمرے سے ٹرانسسٹر اٹھا لایا اور میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ کر پورے VOLUME والیوم سے کھول دیا۔ آواز آ رہی تھی۔ "یہ ریڈیو پاکستان ہے"۔ دین کی اساس ایک مذاکرہ پیش کیا جاتا ہے۔ شرکائے گفتگو ہیں مولانا....

ریحانہ نے اسے ڈانٹا "بند کر دو ریڈیو اور باہر رکھ آؤ" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "سر! یہ ابھی سے چینل خراب کر دے گا"۔ یہاں بیٹھ کر اب میں بھی سرکھپانے کا مستحق ہو گیا تھا۔

خواتین کی باتیں پھر زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں رخشی کوئی چینی ڈش تیار کرنے کی ترکیب بتا رہی تھی کرنل توفیق نے سرفراز کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر پوچھا "سر! آج کل کرنل بختیار کی بیوی کہاں ہے۔؟"

ڈاکٹر اسد نے میجر قادر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری کرنل توفیق نے اپنی بات جاری رکھی "سنا ہے سر! اب ڈولی نے کرنل کو فائنلی چھوڑ دیا ہے ویسے کچھ عرصے سے دونوں میں ٹرا کھیا ڈھیلا رہا تھا بچوں کی مجبوری تھی ورنہ اس سے بہت پہلے ہی چھوڑ دیتی"۔ میجر قادر کہنے لگا "سر! میں نے کچھ دن پہلے ایک روز اسلام آباد میں اسے گریسی کی نئی ٹیوٹا کار ولا میں بیٹھے دیکھا تھا۔

سپر مارکیٹ کے قریب دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کوک پی رہی تھی شاید اس کا ساتھی مارکیٹ سے کچھ خریدنے گیا ہوا تھا اس کے سنہرے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے دھوپ کا چشمہ سر پر لگا ہوا تھا شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھی"۔ سرفراز ہنسا اور بولا "مجھے معلوم ہے وہ آج کل کہاں ہے۔؟"

اس ذکر پر میری کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، اسی وقت نعیمہ نے کہا۔ "ذرا ٹی۔ وی تو کھول کر دیکھو کیا آ رہا ہے" جیسے ہی ٹی۔ وی کھلا اسکرین کے ایک کونے میں حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی ایک تصویر جس میں وہ اپنے ہاتھ کی مٹھی بنائے ایک گال پر ٹکائے آنکھیں بند کیے تخیلات میں گم ہیں۔ نظر آئی۔ نیچے اشعار لکھے ہوئے تھے کوئی آواز خبریں پڑھنے کے انداز میں پڑھ رہا تھا۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

رخشی نے کہا بھئی بند کر دو ٹی۔ وی نہ معلوم یہ ریڈیو اور ٹی۔ وی والے ہر وقت اقبال کو کیوں پیٹتے رہتے ہیں۔ کمال صاحب! وہ فلم لگائیے نا جو آپ ابھی ہی باہر سے لائے ہیں دبئی سے وہاں آج کل بہت سی نئی نئی بیرونی فلمیں آئی ہوئی ہیں اور صرف پچیس روپے میں کرائے پر مل جاتی ہیں"۔ کمال مسکراتے ہوئے اٹھے "لیجئے بھابی لگائے دیتا ہوں مگر بعد میں شکایت نہ کریں کہ ایسی بیہودہ فلم لگا دی"۔ یہ کہہ کر کمال ذرا مسکرایا اور اس نے انڈین فلم "جھٹکے پہ جھٹکا" لگا دی فلم کی ابتداء ڈانس سے ہوئی تھی۔

میری نگاہیں۔ ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ میں بظاہر ڈرامہ دیکھ رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا ڈائریکٹر نے ڈولی کا روپ دھار لیا تھا بالکل وہی انداز گورا چٹا ہوا رنگ سنہری بال چہرے پر بکھرے ہوئے سُرخ رنگ کی بشرٹ اور جینز دھوپ کا چشمہ سر پر ٹکا ہوا۔

لاہور میں اس طرح کی ایک دعوت جس میں کرنل بختیار اور ڈولی شریک تھے۔ ہم سب لوگ لان پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اس روز ہمیں ایک بڑے بزنس مین اسلم نے اپنی کوٹھی پر مدعو کیا تھا مجھے اور دیگر افسران کو بھی اسلم نے یونہی شرکت کے لئے مدعو کر لیا تھا۔ دراصل تو اسلم نے وہ دعوت کرنل بختیار کے اعزاز میں دی تھی۔ کیوں کہ اسے کرنل سے ایک بہت بڑا ٹھیکا ملنے کی امید تھی۔ میں اسلم کو کئی سال سے جانتا تھا وہ پی آر بنانے کا ماہر تھا۔ اس کی دوستی کا ہاتھ بہت دور تک پہنچا تھا۔ میں کرنل بختیار سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا سب لوگ آچکے تھے۔ کرنل اور ڈولی کا انتظار تھا اسلم سب سے اونچی آواز میں بول رہا تھا اس نے امتیاز سے پوچھا تھا "سر! وہ آپ کی نئی کرولا کا کیا ہوا ابھی کہ نہیں"

"ہاں بھئی ایک لاکھ پچپن ہزار میں نکل گئی۔ سارا جھگڑا اس میں لگے ہوئے کیسٹ پلیرز کا تھا میں وہ دینے کو تیار نہ تھا۔ وہ بہت قیمتی ہے۔ میں باہر سے لایا تھا اور گاڑی میں اس خیال سے لگوایا تھا کہ میں وہ خود استعمال کروں گا، مگر مجھے مرسیڈیز مل گئی اس لئے اسے نکال دیا پھر گاڑیوں کے نئے نئے ماڈل، نئے ٹی وی، وی سی آر لیٹسٹ امریکن اور ماڈرن سوئیز کا ذکر ہوا۔ اسلم نے کرنل صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا

"سر! کیا آپ کی گلبرگ والی کوٹھی کرائے پر چڑھ گئی۔ اگر ابھی کسی کو نہ دی ہو تو میرے پاس ایک اچھا کرایہ دار ہے" کرنل نے جواب دیا "اب کہاں وہ تو میں نے دے بھی دی اصل میں قصہ یہ تھا کہ میں وہ ایک جاپانی فرم کے ڈائریکٹر کو دینا چاہتا تھا مگر میرا ایجنٹ ایک جرمن کو دینے پر مصر تھا جرمن کا آٹھ دس کا تھا جب کہ جاپانی کا آٹھ کا مگر مجھے ذرا لالچ تھا کہ جاپان والے کوٹھیوں میں باغ بڑے خوبصورت لگاتے ہیں تم جانتے ہو دو ہزار کا فرق بہت ہوتا ہے۔ میں نے پھر جرمن ہی کو دے دی۔ باغ کا کیا ہے جب چاہیں گے لگوا لیں گے"۔

اس کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ کرنل بختیار کی لمبی سی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی ہم سب لوگ ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پہلے ان کی بیگم اتریں۔ ڈولی نہایت خوبصورت، گورا چٹا ہوا رنگ، سنہری بال، چہرے پر بکھرے ہوئے، تیز سُرخ رنگ کی بشرٹ اور جینز پہنے دھوپ کا چشمہ سر پر ٹکا ہوا گو کہ اب دھوپ دیواروں سے نیچے اتر چکی تھی۔ وہ لان تک آئی سب لوگوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور اسی شان بے نیازی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر گھر میں چلی گئی جہاں دیگر خواتین بیٹھی تھیں۔

کرنل صاحب سے میرا تعارف ہوا کرنل نے بیٹھتے ہی کہا: "میں جلد ہی آجاتا مگر ڈولی نے تیار ہونے میں بڑی دیر لگا دی۔ کپڑوں کے سلسلے میں میرا اس سے جھگڑا ہو گیا۔ بہرحال آ تو گئی ہے مگر موڈ بہت خراب ہے"۔

مجھے محسوس ہوا کہ تمام لوگ ڈولی کی عادتوں سے واقف تھے اور کرنل اس کی ہر بات سرِعام بتاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کر رہا تھا یہاں تک کہ ان لوگوں کی موجودگی میں بھی میں نے کھانے کے دوران بھی کچھ خواتین اور مردوں کو کھسر پھسر کرتے دیکھا تھا۔ اور مجھے یقین ہو گیا تھا ان کی گفتگو کا موضوع ڈولی ہی تھی۔ مجھے اسی دن اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ عورت کسی روز دھماکہ ضرور کرے گی اور آج میری اس سوچ کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ڈولی نے کرنل کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور کسی اور کے ساتھ چلی گئی تھی میں لاہور والے اس دن کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا پھر فلم ختم ہو گئی۔ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں "لاحول ولا کس قدر بور فلم تھی اور فحش کتنی تھی" کمال صاحب اکیا اس سے اچھی کوئی اور فلم نہ ملی" ریحانہ نے کہا اس کے بعد سب لوگ اٹھ کر باہر کے کمرے میں کھانے کے لئے چلے گئے میز پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے دوسری جانب ایک چھوٹی میز پر کئی طرح کے پھل رکھے تھے لوگوں نے اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال لیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر میز کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ نعیمہ نے حسینہ سے پوچھا "بھئی آج کی دعوت کا سلسلہ کیا ہے یہ بھی تو معلوم ہو"۔

اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا کرنل توفیق نے اونچی آواز میں کہا "اچھا تو ابھی تک آپ لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ دراصل کمال پر جو مقدمہ چل رہا تھا جس میں کوٹھے تک لگ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑی اور اب یہ باعزت طور پر بری ہو گئے ہیں"۔

کمال نے کہا: "مقدمہ تو ختم ہو گیا مگر...."

"مگر کیا؟" ریحانہ نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا

"مگر یہ کہ تبادلہ ہو گیا ہے"۔ کمال نے جواب دیا

"ارے واقعی یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ کہاں کا ہوا" اس نے نعیمہ سے پوچھا

"لاہور کا" کمال نے بتایا۔

سرفراز نے ہنس کر کہا۔ "بھابھی ہوشیار رہیے گا انہوں نے لاہور کا تبادلہ خود ہی کرایا ہوگا"۔

"کیوں کیوں سر" میجر قادر نے پوچھا "اس لئے کہ آج کل ڈولی بھی تو وہیں ہے" سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کس کے پاس" اسد نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے سرفراز کی طرف دیکھا۔

وہ آج کل لاہور میں میجر اسلام الدین کے ساتھ ایک نئی کرولا میں گھوم

باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے




رحمٰن حمیدی

"دبستان" محلہ چار گودام، پوسٹ آفس گوموہ، ضلع دھنباد (بہار)


# گرتی دیواریں

تھی تو وہ ننھی منی، گوری چٹی، بھولی بھالی، جاپانی گڑیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ہر شخص پیار و محبت سے اسے گود میں اٹھا لیتا۔ اس کے گلابی گالوں کو تھپتھپاتا، اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتا اور اسے پیار کر کے فرش پر رکھ دیتا تو وہ اتنا خوبصورت رقص پیش کرتی کہ جنتا اور الورا کی رقص آلود مورتیاں نگاہوں کے سامنے آجاتیں گھر کا ہر فرد اسے وارفتگی اور چاہت و محبت سے دیکھتا رہتا۔ وہ کبھی صوفے پر بیٹھی رہتی۔ کبھی شفاف میز پر اچھل کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے جنم دن کے موقع پر عزیز و اقارب نے پیار بھرا نغمہ گایا تھا۔

گڑیا جاپان کی ـــ!

دل میرا لے گئی ـــ!

بے تکلف ہمسایہ کے اکلوتے بیٹے نے جاپانی گڑیا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ چیں چیں کرنے لگی۔ مختلف انداز سے چیخ و پکار کرنے لگی لیکن وہ زبردستی اسے سبزہ زار پر لے کر چلا گیا۔ رنگ برنگ کے پھول توڑ کر اس کے سامنے بکھیر دیئے تو روتی ہوئی گڑیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بہت خوبصورت گھروندا بنایا اور اسے گھروندے میں رکھا تو وہ عروس نو کی طرح جگمگانے لگی۔ عزیز و اقارب نے انہیں کھیلتے دیکھ کر کہا

"دونوں کتنے خوبصورت پھول ہیں ـــ!"

عزیز و اقارب نے دونوں کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ بے تکلف ہمسایہ اور سارے لوگ شام کے وقت رخصت ہو گئے۔ گڑیا حسب معمول اندرون خانہ اچھلنے، کھیلنے کودنے لگی۔

کانونٹ سے جونیئر کیمبرج کا رزلٹ آیا تو بے تکلف ہمسایہ کے یہاں بھی مٹھائی بھیجی گئی۔

لیکن ـــ!

گھر والوں میں ایک تشویش بھی ابھرتی جا رہی تھی کہ گڑیا جو بھرے ہوتے غبارے کی طرح پھیل رہی ہے اس کے گال اور کمر پر گوشت بھر گیا ہے اس کی آنکھیں جھیل کی طرح گہری ہوتی جا رہی ہیں اس لئے باغوں اور میدانوں میں تنہا گھومنا پھرنا مناسب نہیں، اسی بنیاد پر آہستہ آہستہ پابندیاں عائد کی گئیں لیکن ان پابندیوں کے خلاف اس کے پورے وجود نے احتجاج کیا۔ سارا گھر آسمان پر اٹھا لیا۔ کھانا پینا ترک کر دیا۔ اس قدر واویلا اور شور مچایا کہ سبھی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سبھی نے بالاتفاق رائے فیصلہ کیا کہ:؟

"کچھ اور بڑی ہو گی تو سمجھداری آجائے گی ـــ!"

اب اس کی سہیلیاں ملنے کے لئے گھر پر بھی آنے لگیں اور سارا دن اس کے کمرے میں رہنے لگیں۔ وہ بھی اپنی سہیلیوں کے یہاں ویک اینڈ پر جانے لگی۔ کبھی کبھی وہ سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر بھی چلی جاتی۔ وہ دوستوں اور سہیلیوں سے بے تکلفی سے باتیں کرتی۔ اب وہ آزاد پنچھی کی طرح ہر جگہ جاتی۔ اگر کسی سہیلی کے یہاں شب بسری کا ارادہ ہوتا تو وہ فون پر گھر والوں کو اطلاع دے دیتی۔

گھر والوں میں اکثر و بیشتر اس کے لاابالی پن اور بے ہنگم آزادی پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں انہیں برابر اطلاع مل رہی تھی کہ گڑیا بہت سے کھیلوں میں حصے لے رہی ہے۔ ہائی جمپ اور لانگ جمپ میں فرسٹ پرائز لا رہی ہے۔ اس کا منہ کلی سے تجاوز کر کے دائرہ نما سرخ گلاب کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کی بھری بھری پنڈلیاں مچھلی کی طرح چمک رہی ہیں، چھوٹے سے لیموں کے پودے کی جگہ نارنگی اور سیب کے درختوں نے لے لی ہے۔ اس کی آنکھوں سے بوند بوند شراب ٹپک رہی ہے۔

گڑیا اپنی سہیلیوں کے ساتھ قہقہے بکھیرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی تو سارے لوگ ادھر ادھر کھسک جاتے۔ محلے کے آوارہ مزاج لونڈے گڑیا کی سہیلیوں کو دیکھ کر برساتی مینڈک کی طرح ٹرّاتے، کبھی

بھونرے کی طرح منڈلاتے، کبھی قلمی گانے زور زور سے گاتے۔ گڑیا کی خونخوار نگاہیں دیکھ کر کبھی کھسک جاتے اور کبھی دُم ہلاتے ہوئے صدر دروازے تک آ جاتے۔ ایک دن ان کتوں نے اس کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور بھونک بھونک کر سارا آسمان سر پر اٹھا لیا تو گھر والے سر جوڑ کر بیٹھے اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ:

"گڑیا جوان ہو گئی ہے اب اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں ۔" !

یہ فیصلہ گھر کے ایک ایک فرد کے ساتھ میز کرسی اور تپائی تک کو بتا دیا گیا اسی روز صوفے پر چند اور گڑیاں بھی نظر آئیں۔ سبھی آپس میں چلنے کی سپ پر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ گھر والے مطمئن انداز میں سوچ رہے تھے کہ ہاتھ پیلے کئے جانے کے فیصلے پر قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور ہونے والے جیون ساتھی پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں ۔

لیکن ـــ

اگلے ہی دن صبح کی چائے لئے ملازمہ نے دروازے پر دستک دی تو گڑیا اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی ۔ بستر، الماری، میز، ڈسک، باغیچہ ایک ایک کونہ تلاش لیا گیا ۔ سبھی ٹیلیفون کی بجتی ہوئی گھنٹی کی طرف بھاگے ۔ فون پر بھی انہیں کی گڑیا کی پوچھ گچھ ہو رہی تھی کیونکہ فون کرنے والی کی اپنی گڑیا بھی لاپتہ تھی سبھی نے ایک دوسرے سے فون پر رابطہ قائم کیا وہ ایک جگہ اکٹھا ہو کر شرمندگی و خجالت سے سوچ رہے تھے ـــ ننھی منی گڑیا میں اتنی قوت کہاں سے آئی کہ اس نے ایسی چھلانگ لگائی کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی

مگر ـــ!

اس سماج کا کیا ہوگا جس میں ایسی گڑیا جنم لے رہی ہے ؟؟ ۔

## زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری فروری ۔ مارچ ۱۹۸۰ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے ۔ از راہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۲۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے ۔ امید ہے کہ آپ تجدیدِ خریداری سے ضرور نوازیں گے ۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی ۔ پی ۔ بھیجنے کی ہدایت کریں ۔

بقیہ صفحہ ۷۰ سے آگے

بن چکا تھا ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آوازیں بھی قید کر لی گئی ہوں ۔

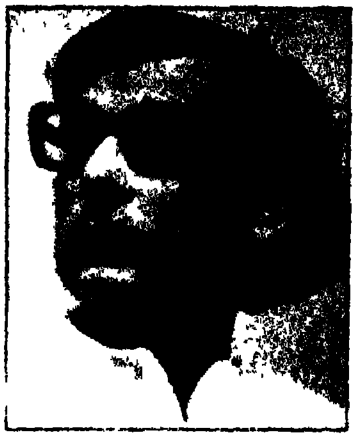
ایک دن صبح آوازیں آنے لگیں تو محسوس ہوا کہ آہنی زنجیروں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں ہیں ۔ لوگ باگ باہر نکل آئے ہیں سڑکوں پر سہمے سہمے ڈرے ڈرے اپنی ضرورت کی چیزوں کی تلاش میں جلدی جلدی قدم اٹھاتے نظر آتے لوگ بڑے بھائی ابا کی تلاش میں باہر جانا چاہتے تھے لیکن ماں انہیں روک رہی تھی ۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہم لوگوں میں کوئی باہر گیا تو پھر واپس بھی آئے گا یا نہیں ۔ ہم لوگوں میں سے ہر کوئی باہر جانا چاہتا تھا ۔ ماں چاہتی تھی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے ۔ منجھلے بھائی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ "ماں بھی ساتھ چلے لیکن دوبارہ بھگدڑ مچ گئی تو ـــ؟ کیونکہ اخوت و بھائی چارگی کی جگہ نفرت نے لے لی ہے ۔ جن سے نفرت ہے ان کا خون بہانا اولین مقصد بن گیا ہے ۔ ایسے ماحول میں ماں کا ساتھ چلنا مناسب نہیں ۔" ماں نے ہم تینوں کو گلے لگایا اس کی سوکھی آنکھوں میں پتہ نہیں کہاں سے آنسو آنے لگے تھے ۔

ہم لوگوں نے تین چار دنوں کی کوشش میں شہر کا کونا کونا چھان مارا لیکن نتیجہ یہی نکلا کہ ابا ہم لوگوں کو روتا بسورتا چھوڑ کر ان کی پاک جنت میں کہیں گم ہو گئے ہیں ۔ ان کے آفس سے اتنا معلوم ہو سکا کہ ہنگاموں سے چند منٹ پہلے ہی وہ آفس چھوڑ چکے تھے ۔ اب ہم لوگوں نے بھی ان کی واپسی کی آس چھوڑ دی تھی ۔

ایک دن ہم تینوں بھائی تھکے ماندے گھر واپس ہوئے تو ماں کو مال و اسباب باندھتے ہوئے دیکھا ۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ۔ بڑے بھائی نے ماں سے پوچھا "کہاں کی تیاری ہے ؟" ماں ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی "چلو بیٹے اپنی مٹی کی طرف چلتے ہیں ، جو مٹی اپنے لئے کھاد مہیا کرنے والوں کے خون سے سینچی جاتی ہو وہ ہرگز پاک نہیں ہو سکتی ۔"

اتنا کہہ کر ماں پھر سے اسباب باندھنے لگی ۔

ہم تینوں بھائی لامتناہی خلا میں دیکھنے لگے ۔ ۔ ۔



## فضیل جعفری

قدم قدم پہ ہیں بکھری حقیقتیں کیا کیا
بزرگ چھوڑ گئے ہیں شہادتیں کیا کیا

میں تازہ دم بھی ہوں بے چین بھی ہوا کی طرح
مرے قدم سے ہیں لپٹی روایتیں کیا کیا

مزاج الگ سہی، ہم دونوں کیوں الگ ہوں کہ ہیں
سراب و آب میں پوشیدہ قربتیں کیا کیا

کرم، عناد، خوشی، غم، امید، مایوسی
دلوں کو دیتی ہے دنیا بھی دعوتیں کیا کیا

میں باز آیا نہ لڑنے سے ہار کر بھی فضیل
مرے خدا کی ہیں مجھ پر عنایتیں کیا کیا

بی۔ ۲/۳ چوتھا منزلہ، گرد نگر، جے پی روڈ اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸

## قیصر قلندر

زندہ رہنے کا کوئی ساماں تو ہو
خواب ہو، امید ہو، پیماں تو ہو

بیتے لمحوں کی نہ سنتا دستکیں
شب کے سناٹے میں کچھ بیچوں تو ہو

اک صحرا ہے تغافل کا جہاں
ابر نیساں کا کوئی امکاں تو ہو

درد کی یک رنگ دنیا تیاگ دیں
خواہشوں کا خار حیراں تو ہو

حسرتوں کا سادھواں ہے ہر طرف
روشنی کچھ خواہش جاناں تو ہو

بے صدا لفظوں کی تادیلیں کریں
جلیع روشنی کا کوئی پرساں تو ہو

پھول رت آئے دیار شوق میں
ہر نظارہ راحت خنداں تو ہو

کس کو قیصر کہہ سکو گے اپنی بات
حق پرستوں کی کوئی پہچان تو ہو

عمر ۔۔۔ چوہ ہکر ۔۔۔

## شاہین بدر

بجر توں کے پھول ہیں شبنم زدہ
خوشبوئے امید ہے موسم زدہ

دستکیں دے کر ہوئی رخصت بہار
دل کا دروازہ رہا سہم سہم زدہ

بھول بیٹھے داستاں کرب کی !
ہو گئے ہم لوگ اب پرچم زدہ

جسم میں حدت کہاں سے آئے گی
دھوپ بھی اب ہو گئی شبنم زدہ

سچ کے آئینے میں آئے گی کہاں
جھوٹ کی تصویر ہے البم زدہ

زندگی اخبار ہے شاہین بدر
روز و شب کے مسئلے کالم زدہ



شمس الرحمٰن فاروقی
ڈی ۱۱/۸۵، سکا ٹاورز، نئی دہلی۔

# سوانح غالب کا ایک پہلو اور مالک رام

... مالک رام کے بارے میں اظہار خیال کر رہا ہوں تو ... اسی لیے کہ ... ہوں۔ جب کسی شخص کی ذات اور کارنامہ اس طرح متحد ہوں کہ دونوں میں فرق نہ ہو سکے اور جب اس شخص سے آپ کے مراسم بھی ہوں اور وہ آپ کا بزرگ بھی ہو تو ... درج فہرست امتحان ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے مالک رام صاحب سے ... اور غالب سے متعلق ان کی ... لہٰذا میں مالک رام سے اختلاف ضرور رکھتا ہوں اور اس اختلاف کے برملا اظہار سے ڈرتا بھی نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ... مالک رام صاحب کا حق نہیں ادا ہوا کیونکہ اختلاف یا اتفاق کی کوئی بھی لے، چاہے وہ کتنی ہی مدلل کیوں نہ ہو، اس پوری تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی جس کا نام مالک رام ہے۔ میں خود کو ... اور مرتب کتاب نے بھی اس مضمون کا تقاضا شاید اسی لیے کیا ہے کہ وہ بھی مجھے ... سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میرا کام تحریر کے حسن و قبح کو دیکھنا ... تخصیص نگاری یہ کام نہیں۔ لیکن مالک رام ... کے بارے میں لکھا اور ان کی تحریر کے بارے میں لکھا، وہ دونوں مجھے ایک ساتھ آتے ہیں۔ اس مختصر سے غیر رسمی دیباچے کے بعد میں اپنے مطلب پر آتا ہوں۔

... پہلو یہ ہے کہ مالک رام صاحب کی دو تحریریں ... اظہار خیال کر کے میں ان کی غالب شناسی کے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لیکن ان کی غالب شناسی ... کی محققانہ شان کی نوعیت ضرور ظاہر کر سکتا ہوں۔ محقق کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب آسان ہے ... آسان نہیں۔ ظاہر ہے کہ تحقیق کے تمام معمولی لوازم ... معلومات، محنت، تدقیق، احتیاط، سواد کو پرکھنے اور ان کو الگ کرنے کی صلاحیت، یہ چیزیں تو کم و بیش مشق اور مشقت سے حاصل ہو سکتی ہیں ... اعلیٰ درجے کا ... جیسا کہ شیرانی ... کو نصیب تھا، وہ سب کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک شے ہے، جسے میں موضوع کی روح میں ہمدردانہ بصیرت کے ساتھ اتر جانے کی صلاحیت کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر محقق اور اس کا موضوع من تو شدم تو من شدی کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے ... احساس میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے محقق کے لیے اپنے موضوع کا کوئی راز سربستہ نہیں رہ جاتا۔ وہ فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ یہ شخص کہاں جھوٹ بول رہا ہے، وہ کہاں سچ ... کس موقع پر اس شخص کا عمل یا ردعمل کیسا ہوتا، اس کا ... یا فطری احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایسا محقق اپنے موضوع کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے کہ آپ محقق کی تحریر پڑھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود اس شخص سے مل لیے ہوں۔ اس کی تحقیق کا موضوع ... ظاہر ہے کہ ایسا محقق اشخاص ہی کو موضوع بناتا ہے۔ ادوار یا تحریکات سے اس کو اس قدر شغف نہیں ہوتا۔ مغربی ادب میں اس طرح کے محقق کی بہترین مثال جان لونگسٹن لوز JOHN LIVINGSTONE LOWES ہے جس نے آج سے پچاس برس پہلے کولرج کی دو اہم نظموں کے تقریباً ہر پیکر، ہر تشبیہ اور ہر استعارے کی اصل اور اس کے ماخذ کا سراغ لگایا۔ ہمارے زمانے میں ... اور ... رچرڈ ایلمین RICHARD ELEMAN اور ... پر والیس فاؤلی WALLACE FOWLIE اس کی مثالیں ہیں۔ اردو کی طرف دیکھیے تو مسعود حسن رضوی ادیب اور انیس اور واجد علی شاہ، امتیاز علی عرشی اور غالب۔ اور مالک رام اور غالب ایسے محقق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ایسا محقق غلطی نہیں کرتا۔ لیکن یہ غلطی اس طرح کی نہیں ہوتی کہ کسی کتاب کا نام یا کسی واقعے کی تاریخ غلط درج ہو جائے۔ اعلیٰ درجے کا محقق

جسے وجدانی تحقیق کہا جا سکتا ہے۔ غلطیاں بھی وجدانی قسم کی کرتا ہے یعنی اس سے تعبیر و تشریح کی غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ غلطی اس طرح کی ہوتی ہے کہ جیسے آپ کسی شخص سے بخوبی واقف ہوں لیکن اس کی کسی بات، یا اس کے کسی کام کا غلط مطلب نکال لیں۔ تعبیر و تشریح کی اس غلطی اگر بنیادی اور مرکزی حیثیت نہ رکھتی ہو تو صرف آپ کی فہم اور اس شخص کے بارے میں آپ کے علم کی صداقت پر چنداں حرف نہیں آتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ گویا پریم چند کے ناولوں میں مشرقی یوپی کے بارے میں بعض تفصیلات غلط ہیں، لیکن ان کے باوجود مشرقی یوپی کی روح کے بارے میں ہم جتنا ان ناولوں کے ذریعہ جان سکتے ہیں، اتنا تاریخوں سے نہیں جان سکتے۔ اور نہ مجنوں گورکھپوری کے ناولوں سے ہی جان سکتے ہیں، جن میں تفصیلات تو صحیح ہیں، لیکن مشرقی یوپی کی روح نہیں ہے۔

اس کی مثال مالک رام کے ایک پرانے مضمون "مرزا غالب حالات، عادات، خصائل" میں دیکھی جا سکتی ہے (یہ مضمون "فسانۂ غالب" میں شامل نہیں ہے۔ اگر یہ مشمول ہوتا تو میں اسے فسانۂ غالب میں سرفہرست رکھتا)۔ یہ مضمون ایک فرضی شخصیت کی طرف سے واحد متکلم کے صیغے میں ہے۔ متکلم نے غالب کے "چشم دید" حالات لکھے ہیں۔ متکلم کی شخصیت فرضی ہونے کے باوجود غالب کی شخصیت اور مزاج کی جو تصویر اس مضمون سے نکلتی ہے وہ ہزاروں تحقیقوں اور کئی سوانحوں پر بھاری ہے۔ اس مضمون کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ غالب اس شخص کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ یہ ان کی اور متکلم کی پہلی ملاقات ہے (۱۲۵۸ھ)

> میں نے باقاعدہ طور پر کسب کمال اور پڑھنا لکھنا دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خان صاحب (یعنی نواب غلام حسین خان مکی دائیں مرزا صاحب کے ماماں) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی سخت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا لیکن بیکار، معلوم نہیں میرے سر پر آوارگی کا بھوت کیوں اس شدت سے سوار تھا کہ مجھ پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ طالب علمی کی طرف رخ نہیں کیا۔ (پھر مسکرا کر) لیکن سوچتا ہوں تو اس سے مجھے ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ اصل روح علم حاصل کر کے بڑھ سے زیادہ بھی ہوتا، کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ جتنا علم مجھے ہے اس سے کیا حاصل ہوا، کم از کم چالیس برس کی تک ہے۔

لکھ کر فائدہ دعویٰ ہنر میں حاکِ نیست

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے کچھ پوچھتے رہے۔ آپ سے جب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا۔ بھائی کو سلام شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے، اور یہ شعر سنایا:-

بالذت دیدار ز پیغام گزینم    مشتاق تو را دیدار شنیدن بتاسد

اور دیکھو، اب کے جو دلی آنا ہو تو میرے ہی پاس ٹھہرنا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

(احوال غالب، مرتبہ مختار الدین آرزو، صفحہ ۹۲)

اس ساری عبارت میں صرف ایک واقعی بات ہے، اور وہ بھی غیر قطعی یعنی یہ کہ غالب نے بہت کم عمری ہی میں تعلیم ترک کر دی تھی۔ کم عمری کا تعین "دس بارہ برس کی عمر" سے کیا گیا ہے، جو غیر قطعی ہے۔ اور یہی ممکن ہے کہ پوری طرح درست بھی نہ ہو، کیونکہ خود مالک رام کی ہی ترتیب "عیار غالب" (مسودۂ عیار غالب ۱۹۶۵ء اور فسانۂ غالب ۱۹۷۷ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی تعلیم اٹھارہ برس کی عمر تک جاری رہی۔ لیکن اس کے باوجود غالب کا شخص اس عبارت کے ذریعہ جس طرح ابھرتا ہے، وہ اس سوال کے جواب سے ممکن نہیں کہ غالب نے جب تعلیم ترک کی تو ان کی عمر کے سال کے کیا تھے۔ عبارت کے الفاظ، لب و لہجہ، غالب کے نانا اور ماموں کا ذکر، تعلیم اور عرض ہنر کی بے فائدگی کی بات، خاص کر یہ بات کہ پڑھنے لکھنے سے تو عالم یا مولوی ہی کہلاتے، غالب کے اردو مصرعے اور ایک فارسی شعر کا برمحل حوالہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری تقریر میں الفاظ کی نشست اور لہجہ، یہ چیزیں غالب کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں، اور ان کے ذریعہ غالب کے بارے میں ہماری معلومات علم کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مالک رام کے اس پورے مضمون میں وہی شان ہے جو آندرے موروا کی ان سوانح عمریوں میں ہے جن میں اس نے بعض انگریز اور فرانسیسی ادیبوں کے حالات ناول کے طرز پر لکھے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں، پھر یہ تحقیق کیا ہوئی، یہ تو ایک طرح کی افسانہ نگاری ہوئی۔ (شاید مالک رام صاحب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے یہ مضمون اپنے مجموعے "فسانۂ غالب" میں شامل نہیں کیا۔) بات صحیح ہے۔ اگر آپ تحقیق کے معنی یہی لیتے ہیں کہ فلاں شعر کی فلاں قرأت فلاں مخطوطے میں ہے، اور فلاں مخطوطہ مصنف کا دیکھا ہوا ہے، اور مصنف جب رشتاٹا ہوشیار پور پہنچا تو اس وقت شام کے ساڑھے سات نہیں بلکہ سوا آٹھ بجے تھے، تو مالک رام کا یہ مضمون یقیناً محققانہ

نہیں ہے۔ لیکن اگر محقق کا یہ بھی منصب ہے اور یقیناً ہے کہ وہ جس شخص یا زمانے پر لکھ رہا ہے اس کو ہمارے سامنے زندہ کر دے تو یہ مضمون اعلیٰ درجے کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ جھگڑا فقط یوں نہیں مانا کہ ترک تعلیم کے دفعتہً غالب کا صحیح عمر کیا تھی۔ لہٰذا اس پر وقت اور غور نہ کرنا اور ضائع کرنے سے یہ بہتر ہے کہ غالب کی شخصیت کا تعین کرنے میں سعی کی جائے۔

لیکن فسانۂ غالب تحقیقی کتاب ہے اور غالب کی تعلیم کا ذکر بھی کیا ہے۔ لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو بھی نہ کہ غالب اور عبدالصمد کے قضیے پر مالک رام کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے۔

اس مضمون میں انہوں نے قاضی عبدالودود جیسے شخص کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے۔ مالک رام نے یہ مضمون قاضی عبدالودود کے جواب میں لکھا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مضمون کے جواب میں اپنے اصل مضمون میں جس حد تک اور اضافہ کیا ہے۔ مالک رام صاحب کا مضمون جس شکل میں فسانۂ غالب میں شامل ہے وہ قاضی صاحب مرحوم کے حواشی اور استدراکات کو مدنظر رکھنے کے بعد تیار ہوئی ہے لہٰذا زیر بحث مضمون کو اس مسئلے پر مالک رام کی مکمل اور آخری نظر سمجھی رائے کہہ سکتے ہیں۔

قاضی صاحب مرحوم اور مالک رام کے دلائل کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مالک رام صاحب نے جانبداری کا تھوڑا بہت ثبوت دیا ہے لیکن قاضی عبدالودود کم و بیش یہ فیصلہ دے بیٹھے ہیں کہ غالب نے جو بہت سے معاملات میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس لئے عبدالصمد کے بارے میں بھی غالب کے بیانات مشکوک ہی سمجھے جانے چاہئیں۔ قاضی صاحب مرحوم کا یہ اصول ہندوستانی قانون شہادت INDIAN EVIDENCE ACT پر مبنی ہے لیکن انہوں نے غالب کے معاملے پر اس کا اطلاق جس شدت سے کیا ہے اتنی شدت شاید خود قانون شہادت کا مقتضا نہ تھی۔ بہرحال، قاضی صاحب نے ایک بات ایسی لکھی ہے جو اس سارے معاملے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ بات ثابت ہو جائے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ ("احوال غالب"، صفحہ ۹۷) میں مقالہ ہذا کی فصل ۵ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ بحث کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا" قاضی صاحب کا یہ ارشاد مبہم ہے لیکن اس کے معنی (جو دوسرے مضمون کو پڑھنے اور قاضی صاحب کی خاص اہمیت کو سامنے رکھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں) یہ ہیں کہ عبدالصمد کے وجود کا فرضی یا اصلی ہونا اس لئے غیر اہم ہے کہ اس کے بارے میں کسی طرح کی باتیں غالب نے بیان کی ہیں اور غالب کی تحریروں کو پڑھ کر عبدالصمد کی لیاقت علمی و لسانی کے بارے میں کیا اندازہ ہو سکتا ہے، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالصمد کے مراسلات اور غالب کے بیانات میں ایسا تناقض ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی شخصیت بڑھانے کے لئے عبدالصمد کی تخلیق کی تھی۔ ایران قدیم کے بارے میں غالب کی معلومات بہت کم ہیں۔ اگر غالب نے واقعی کسی ایسے شخص سے تعلیم حاصل کی ہوتی جو علوم فارسیہ کا ماہر تھا، تو یہ بات نہ ہوتی۔ قاضی عبدالودود کہتے ہیں۔

> سب سے بڑی دشواری یہ ہی تھی کہ ایران قدیم سے متعلق غالب کی معلومات بہت قلیل تھیں، اور جو کچھ تھیں وہ بھی بہت غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جن کے معلومات اس سے زیادہ اور صحیح تر ہوں۔ ان کے لئے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زردشتی عالم مذہب سے کسی حد تک بھی باخبر ہیں، ایک ایسے زردشتی عالم کے وجود کا قائل ہونا جو خوشنویسی کی جگہ بشتی کو صحیح سمجھتا اور جیود کو مستحدث مانتا ہو، ممکن نہیں۔

قاضی صاحب کا یہ فرمانا کہ عبدالصمد کے وجود کی بحث اس کی اہمیت سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ بظاہر بہت اہم ہے لیکن اس میں ایک منطقی سقم بھی ہے، کوئی بھی شخص ایسی ہستی نہیں ایجاد کر سکتا جو اس سے زیادہ با علم ہو۔ مثلاً اگر میں لاطینی نہیں جانتا تو میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا کردار خلق کروں جو لاطینی میں گفتگو کرتا ہو۔ لیکن عبدالصمد کوئی کردار نہ تھا، وہ ایک نقل کل تو تھا نہیں۔ لہٰذا اگر غالب اس سے ایسی باتیں منسوب بھی کرتے جو اصل میں صحیح ہوتیں تو بھی یہ کہنا ممکن تھا کہ عبدالصمد کا علم مکمل نہ تھا کیونکہ عبدالصمد ہو یا کوئی اور، اس کو فارسی زبان اور ایران قدیم کی تمام باتوں کا علم تو ہو نہیں سکتا تھا۔ چونکہ عبدالصمد کی معلومات کا ذریعہ صرف غالب کے بیانات ہیں، اس لئے عبدالصمد اگر اصلی بھی ہوتا تو بھی ہمیں اس کے بارے میں وہی کچھ معلوم ہوتا جو غالب نے لکھا ہے۔ لہٰذا قاضی صاحب کی یہ تنقیح ہمیں بہت دور نہیں لے جاتی بلکہ دائروی CIRCULAR معلوم ہوتی ہے۔

تعجب ہے مالک رام نے اتنے دور رس اعتراض کا باقاعدہ جواب نہیں دیا ہے۔ وہ یہ ضرور لکھتے ہیں۔

> ...... ہم غالب کے سہو اور غلطی کے لئے استاد کو کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور اگر غالب نے ٹھیک روایت کی تھی

افسانوں یا سرسری بیانات کو غیر ضروری اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حالی اور غالب کے مراسم کے بارے میں غلام رضا خاں نے عبدالغفور شہباز کو لکھا کہ حالی تو غالب کے یہاں گاہ گاہ ہی آتے تھے۔ ان کی نشست وہاں زیادہ نہ تھی۔ اس غیر ذمہ دارانہ بیان کو قاضی صاحب قبول کرتے ہیں اور مالک رام نے اس پر اچھی گرفت کی ہے۔

مالک رام صاحب نے عبدالصمد کا وجود ثابت کرنے کے لئے مشاق وکیل کی طرح دلائل اور براہین فراہم کیے ہیں۔ قاضی صاحب کے سرد اور عاری از جذبات انداز کے بالمقابل وہ پرجوش نظر آتے ہیں لیکن کیا عبدالصمد کا وجود واقعی مسلم الثبوت ہے؟ ہمارے پاس حالی کے بیانات ہیں جو عبدالصمد کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں۔ عبدالصمد کا خط بھی، جو غالب کے نام آیا، اس کے وجود کی دلیل بھی شیفتہ کے حوالے سے حالی ہی ہیں۔ دوسری طرف حالی ہی کا بیان ہے کہ کبھی کبھی خود غالب کی زبان سے سنا گیا ہے کہ عبدالصمد محض ایک فرضی شخص ہے۔ چونکہ لوگ مجھے بے استادہ کہتے تھے اس لئے میں نے ایک استاد گڑھ لیا۔ مالک رام نے قاضی صاحب کے اس اعتراض کا جواب نہیں دیا ہے کہ حالی نے ان بیانات کے تضاد کو محسوس کیا اور ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کوشش میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ لیکن مالک رام صاحب نے یہ نکتہ نظر انداز کر دیا ہے کہ کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالی لکھتے ہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے دو برس فارسی زبان سیکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ حالی ایماندار آدمی تھے۔ اگر انہیں کسی قسم کا شبہہ ہوتا کہ عبدالصمد کا وجود محض غالب کی اختراع ہے، تو وہ یہ جملہ اتنے حتمی انداز میں نہ لکھتے۔ وہ غالب کی مدلل مداحی ضرور کر رہے تھے (جیسا کہ قاضی صاحب کا ارشاد ہے) لیکن عبدالصمد کی شاگردی غالب کے لئے کوئی مایۂ افتخار نہ تھی کہ جس کو ثابت کرنا حالی کے لئے ضروری ہوتا۔ اگر ان سب باتوں کے باوجود حالی صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ عبدالصمد واقعی ایک شخص تھا، اور غالب نے اس سے فارسی پڑھی تھی، تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ کم سے کم حالی کی نظر میں عبدالصمد ایک واقعی شخص تھا اور غالب کے تخیل کی اپج نہیں بلکہ غالب کی ادبی شخصیت کے سرچشموں میں سے ایک تھا۔

ایک نکتہ جس پر مالک رام کی نظر نہیں گئی ہے، خود اس بات سے متعلق ہے کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی سنا گیا کہ عبدالصمد کوئی وجود نہیں۔ حالی یہ نہیں کہتے کہ میں نے غالب کو یہ کہتے سنا کہ عبدالصمد فرضی شخص ہے۔ حالی صرف یہ کہتے ہیں کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی سنا گیا۔ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا۔ حالی یہ بھی نہیں بتاتے کہ یہ بات ان سے کس نے کہی۔ ممکن ہے انہیں غلام رضا خاں نے کہی ہو جنہوں نے شہباز کو لکھا کہ "عبدالصمد کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا۔" کوئی ضروری نہیں کہ غالب نے واقعی ایسا کہا ہو۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس روایت کے مطابق غالب نے عبدالصمد کی شخصیت اس لئے گڑھی کہ لوگ انہیں بے استادہ کہتے تھے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو غالب نے یہ بھی کیوں نہ کہا کہ عبدالصمد نے ان کے فارسی کلام پر اصلاح دی تھی؟ ظاہر ہے کہ "بے استادا" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ غالب کا کوئی معلم نہ تھا۔ (اور اگر یہی معنی ہیں بھی تو بے استادا ہونے کا الزام سراسر بے بنیاد ہے اور اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں نظر آتی کیونکہ غالب نے بہرحال کچھ تعلیم حاصل کی تھی، اور ظاہر ہے کہ وہ تعلیم انہیں کسی استاد ہی سے ملی ہوگی۔ بے استادا کے معنی ہیں وہ شخص جس کا کوئی استاد فن شعر میں نہیں۔) یہ بات بھی ظاہر ہے کہ زبان فارسی کے دقائق و غوامض کو عبدالصمد سے حاصل کرنے کا دعویٰ اس اعتراض کو رفع نہیں کرتا کہ غالب بے استادے ہیں۔ لہٰذا عبدالصمد کی شخصیت کو ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا مجھے اس بات میں سخت شک ہے کہ غالب کی زبان سے واقعی کبھی یہ سنا گیا ہو کہ عبدالصمد محض ایک افسانہ ہے، لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے اسے ایجاد کر لیا تھا۔ جب تک معتبر شہادت اس بات کی نہ ملے کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا، میں اس روایت کو انتہائی ضعیف قرار دوں گا اور عبدالصمد کے جھگڑے میں اس پر کوئی تکیہ نہ کروں گا۔ اور اگر غالب نے کبھی عبدالصمد کے وجود کو فرضی قرار بھی دیا ہو، تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ سچ بول رہے تھے، محض مذاق نہیں کر رہے تھے؟

ممکن ہے کہ قاضی صاحب مرحوم کو اس بات کا احساس رہا ہو کہ "بے استادا" کا الزام اگر وہ صحیح بھی ہو، عبدالصمد کی ایجاد کے لئے کوئی تحریک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عبدالصمد کو ایجاد کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ غالب کو خوف تھا کہ قتیل کے طرفدار ان پر اعتراضات کریں گے اور ان کے مبلغ علم پر شک کریں گے۔ لہٰذا انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر عبدالصمد کا ذکر قاطع برہان میں کیا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔

> غالب دنیا کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ میں نے "فارسی کی تحقیق کو اس پائے پر پہنچا لیا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔"......
> غالب کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا تنہا فارسی داں سمجھے جانے کو دل سے نکال دیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ غالب نے ایک ایسا فرضی استاد گڑھ لیا جو علوم عربیہ و فارسیہ پر یکساں تبحر رکھتا تھا، اور اس تبحر کو دعویٰ فارسی دانان ہند پر اپنے تفوق کی وجہ بتایا۔

[باقی صفحہ ... پر دیکھئے]

## دُرِّ آفریدی

جاں لٹکنے کی، مہکنے کی ادا لے جائیے!!
گلستاں سے بوئے گل، رنگِ حنا لے جائیے

سادگی تو زندگی کا حسن ہے، اس کے سوا
کچھ برائے عاشقاں ناز و ادا لے جائیے!

اور کیا انعام ہوگا؟ بزمِ فیضِ حسن سے
کچھ بہ شکلِ خونِ دل رنگِ حنا لے جائیے

تنہا تنہا زندگی کا یہ سفر آساں نہیں!
کچھ بہ قدرِ جان و دل اک ہم نوا لے جائیے

زندگی کرنے کو لمحہ لمحہ یادیں ہیں بہت!
مہرباں، نامہرباں سی ہر ادا لے جائیے

عشق کی راہیں کٹھن، ہارے پڑے ہوں جب تھکے
یہ جھنک دل کش ہوا کا گھنگھرو لے جائیے

● [illegible]

## حجاب ہاشمی

بشر کو علم و ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
شعورِ فکر و نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مری بساط ہے کیا، میری کائنات ہے کیا
متاعِ دردِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ زندگی جسے کہتے ہو زندگی یارو
قیودِ شام و سحر کے سوا کچھ اور نہیں

بہت حسین ہے دنیائے رنگ و بوئے دوست
مگر فریبِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر ایک سمت فضاؤں میں اُٹھ رہا ہے دھواں
چمن میں برق و شرر کے سوا کچھ اور نہیں

مجاہدانہ [illegible]
بس ایک کاوشِ سر کے سوا کچھ اور نہیں

● [illegible]

## فوق کریمی

لب پہ ہے فغاں، طرزِ فغاں کوئی نہیں ہے
منسوب ہے نالوں کی زباں کوئی نہیں ہے

احساس کے مطلع پہ دھواں کوئی نہیں ہے
اب دل پہ مرے بارِ گراں کوئی نہیں ہے

احساس کی گہرائی ہو یا فکر کی پرواز
اب میں ہوں وہاں دوست جہاں کوئی نہیں ہے

خنجر ہے یہ کیا بات لہو تھمتا نہیں کیوں
جب تیر کلیجہ میں نہاں کوئی نہیں ہے

قاتل بھی ہے مقتل بھی ہے مقتول بھی، لیکن
حیرت ہے کہ قاتل کا نشاں کوئی نہیں ہے

ہر در پہ پکارا کہ یہاں کوئی تو ہوگا!
ہر در سے صدا آئی یہاں کوئی نہیں ہے

یوں جیتے ہیں کچھ لوگ بھی اس دور میں اے فوق
جیسے کہ انہیں کارِ جہاں کوئی نہیں ہے

● کریم بلڈنگ، ایم۔ یو۔ علیگڑھ (یوپی)



احمد عثمانی
منشی شعبان نگر مالیگاؤں، ضلع ناسک (مہاراشٹر)

# اپنی مٹی

رات اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی خاموش ہوتی تھی۔ دن بھی بنجر زمین کی طرح سنسان ہوتا تھا کہیں کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ دھائیں کی آواز ہوتی تھی۔ جو اندھیرے میں تھرتھراہٹ پیدا کرتی تھی اور پھر اس دھائیں کی آواز کا پیچھا کرتی چیخ جو بہت بھیانک ہوتی تھی۔ پھر جیسے وہ چیخ آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے معدوم ہوتی جاتی تھی۔ کہیں کہیں آگ کی لپٹیں آسمان تک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اندھیرے کو دھوئیں نے پھیل کر مزید دبیز کر دیا تھا۔ اندھیرا جیسے دیوار کی طرح جم گیا تھا۔

ماں اپنی تیز نظروں سے اندھیرے کی دیوار چیرتی پھاڑتی دور تک دیکھ لیتی تھی۔ کوئی ہیولا سا نظر آتا تھا لیکن غور سے دیکھنے کے بعد یہ اندھیرے کا فریب معلوم ہوتا تھا۔ ماں کے ذہن میں ابا کا جو ہیولا تھا وہی آتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ماں کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ فکر و پریشانی میں کھو جاتی اور وہ ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے لگتی۔

جب غم و آلام دہلیز سے باہر ہوتے ہیں صبح شام دوپہر سب ہی حسین ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ گھرانا خوشحال تھا۔ ابا صبح کی نماز پڑھ کر آتے۔ ہم سب جاگ جاتے۔ پھر کسی کو کالج جانے کی سوجھتی تو کوئی گیند اور بلا لے کر گھر کے قریب والے گارڈن کا رخ کرتا۔ روز کی طرح آج کی صبح بھی وہ تمام خوشیاں لے کر آئی جو روز لے کر آتی تھی۔ ابا حسب معمول آئے سب اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں۔ ابا اپنے آفس چلے گئے۔ ماں گھر کے کاموں میں الجھ گئی۔ صبح دوپہر کی طرف رواں ہوئی۔ شہر میں بارات کی سی رونق ہو گئی۔ اچانک سارا منظر یک لخت بدل گیا سارے شہر کو دھوئیں نے ڈھک لیا فضا میں بارود اور خون کی بو، خنجروں اور تلواروں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔

اندھیرے میں اپنے آپ کو بچاتے راہ ٹٹولتے ہم سب بھائی گھر تک پہنچ گئے۔ لیکن ابا نہیں پہنچ سکے۔ فون بند، بجلی بند، سڑکیں بند، ہر گھر کے دروازے بند تھے۔ اگر دشمنوں کے بس میں ہوتا تو ہماری طرف آنے والی ہوا بھی بند کر دیتے لیکن یہ ان کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے ہماری سانسیں جاری تھیں۔ ان آتی جاتی سانسوں کے بیچ بس ابا کا انتظار تھا۔

جب کبھی ابا موڈ میں ہوتے تھے تو پرانے قصے سنانے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ کر کہتے "جب میں تمہاری عمر کا تھا بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ اس وقت مجھے آزادی کا مفہوم بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن میں نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بس ہم وہ کرتے تھے جو اوپر کے لوگ بتلاتے تھے۔ جلوس نکالنا "لے کے رہیں گے آزادی"! "دے کے رہیں گے" جاتے۔ انقلاب زندہ باد کی صدائیں لگاتے، سڑکوں، گلیوں میں چلتے۔ کبھی کبھی پولیس ہم پر ڈنڈے برساتی تو ہم پھولوں کی طرح انہیں جھیلتے۔ کیونکہ سر پر آزادی کا سودا سما گیا تھا۔

جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آتی جاتی تھی۔ ہم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں کچھ بڑے بوڑھوں نے ایک قوم، ایک ملک، ایک زبان، ایک مذہب کا نعرہ لگایا۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ اس لئے میں اس نعرے کے ساتھ ہو گیا ...

بیچ بیچ میں ماں کہہ اٹھتی تھی: "انہیں نعروں کے چکر میں تم نے سب کچھ کھو دیا۔ گاؤں، زمین داری اور بڑے باڑے کے ساتھ حویلی بھی۔ کیا اچھی ہوا تھی ہمارے گاؤں کی اور وہ پچھواڑے کی بیری کے بیر کتنے میٹھے ہوتے تھے۔ یہاں اجاڑ ایک ہرا پتہ بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ ناطے سدھن سب چھوٹ گئے رشتے سب ٹوٹ گئے"

ابا خشمگیں نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھتے اور کہتے "لیاقت کی ماں تم نہیں جانتیں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہم نے پاک مٹی پا لی۔ اس کے بدلے جو کچھ کھویا وہ کم تھا۔" ابا پھر شروع ہو جاتے۔

"پھر کیا ہوا، اس وقت گھر والوں نے مجھے سدھارنے کے مقصد سے شادی طے کر دی۔ لیکن میں نے تمہاری اماں کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ میں سوچتا تھا بس ہم کو پاک مٹی میں گزرنا ہے۔ ہمارے

اپنے وطن میں۔ تب میں یہاں آگیا۔ یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ میرے
سارے خاندان کو ادھر دشمنوں نے ختم کر دیا۔ ہم نے بھی اپنے خاندان کا
بدلہ ادھر لیا بہت سارے دشمنوں کو ختم کر دیا۔ اگر میں بھی سیانوں کے
بہکاوے میں آجاتا تو میری ہڈیاں کسی ناپاک جگہ پڑی ہوتیں اور گوشت
گدھ نوچ چکے ہوتے۔ ... اور پھر لیاقت کی ماں تم سوچو، یہاں سب
کچھ اپنا ہی ہے۔"

ہم لوگ ابا کو بڑا اضطراب نگاہوں سے دیکھتے۔ کیونکہ ہم محسوس کرتے
تھے کہ کچھ لوگ ہم پر ہر وقت نفرت کی نگاہیں گاڑتے ہیں اور ہر جگہ نبرد آزما
ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس علم و عقل ان کے مقابلے میں
زیادہ ہے۔ اس لئے ہم ان سے آگے نکل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے
دلوں میں نفرت نے جگہ پائی ہے۔ لیکن ابا ایسے خوش ہیں کہ جیسے انھیں دنیا
ہی میں جنت مل گئی ہے۔

ماں کبھی کبھی اپنے رشتہ داروں کو یاد کرکے رو پڑتی تھی۔ کیونکہ اسے کسی
ملک یا قوم سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ تو ابا کے ساتھ گائے کی طرح بندھی تھی
ہماری طرح ماں کے اندر بھی اضطراب تھا۔ وہ بھی مقامی عورتوں کی آنکھوں
نفرت جھیلتی تھی۔ آج یہی نفرت ابل پڑی تھی۔ بندوق کی گولیوں کی صورت
میں، خنجر کی کاٹ کے روپ میں، تلوار کی دھار کی مانند۔

ماں اندھیرے کو کاٹتی دور تک نظریں گاڑتی لیکن بے سود۔ پھر اس کا ذہن
اڑتا ہوا اس کے گاؤں پہنچ جاتا۔ جہاں وہ تھی۔ ہمجولیاں تھیں، خوشیاں
تھیں۔ باغوں میں تتلیاں تھیں، بہاریں تھیں، خوشگوار ہوائیں تھیں۔
کھلیانوں میں بالیاں تھیں۔ بے فکری تھی۔ ندیوں میں پانی چم چم چمکتا تھا
کھیتوں میں فصلیں لہلہاتی تھیں۔ آسمان سے خوشیاں برستی تھیں۔ پھر یوں
بے چینی کی لہر اٹھی جیسے ہوا میں پردہ ہل رہا ہو۔ اس بے چینی نے نفرت کی
جگہ لے لی۔ اپنی مٹی سے نفرت اپنے لوگوں سے نفرت۔ پھر جیسے ہر دیوار
ہر گلی، ہر گھر افواہوں کا مرکز بن گئے۔ عجیب باتیں، انوکھے قصے، مار
دھاڑ، کاٹ کی اور لوٹ مار کی باتیں دہشت کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ایک دن
گاؤں کی مسجد میں مولانا انوار الحق نے اعلان کیا کہ وہ کل سرزمین پاک کی
طرف جا رہے ہیں جو چلنا چاہے ہمارے ساتھ چلے اور دوسرے دن نماز فجر
کے بعد ایک بڑا قافلہ آہ و بکا کے ساتھ معلوم منزل کی جانب نامعلوم
راستوں سے چلا گیا۔ اس وقت سارا گاؤں مولانا سے گلے مل کر رو رہا تھا۔
پتہ نہیں وہ کون سی نفرت تھی جس کا ذکر لوگ کیا کرتے تھے یہاں تو کیا ہندو
کیا مسلمان سب ہی رو رہے تھے اس لئے کہ ان کے گاؤں کے چند لوگ جدا
ہو رہے تھے۔ ہر آنکھ سے محبت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

دوسرے دن اس کی شادی طے بھی ہو گئی اور شام ہونے تک ہو بھی گئی۔
تیسرے دن وہ مہندی گوٹے کناری کے لباس میں لدی پھندی لیاقت کے
ابا کے ساتھ آہ و بکا کے طوفان میں اس منزل کی طرف بڑھ گئی جس کا
خاتمہ یہاں ہوا تھا۔

وہ ماضی سے پھر حال میں آگئی۔

آج کیا ہوا؟ وہ کیوں نہیں آئے؟ اس نے پھر اندھیرے کی دبیز چادر کو
اپنی نگاہوں سے چیرنے کی ناکام کوشش کی۔ زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا۔
اس لئے ماں کے ساتھ ساتھ ہم سب بے چین تھے۔ ماں اندھیرے کی دبیز
چادر کو کاٹتے کاٹتے تھک جاتی تو باری باری ہم سب کو چھو کر محسوس کرتی
کبھی کبھی وہ یا اللہ کہہ کر اپنی فریاد اللہ تک پہنچانے کی کوشش کرتی۔

رات نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سفر تمام کیا۔ صبح پیلی پیلی دھوپ نکلی
تو ماں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دور نگاہ تک سڑکوں کو دیکھنا
چاہتی ہوگی۔ اسی وقت بڑے بھائی خیر علی اور منجھلے بھائی ذوالفقار علی نے
ماں کو وہاں سے کھینچ کر کمرے کے وسط میں کر دیا۔ اسی لمحہ پتہ نہیں کس سمت سے
ایک گولی کھڑکیوں پر لگی اور کھڑکی کے شیشے احتجاج کرتے ہوئے نیچے گر کر یوں
چکنا چور ہو گئے جیسے ہمارا یقین بکھر رہا تھا کہ یہ زمین پاک ہماری اپنی نہیں ہے۔

شہر کے در و دیوار غم کے کوہ بنے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی بھاری
بوٹوں کی یا دندناتی جیپوں کی آوازیں آتیں یا پھر چیخیں سنائی دیتیں۔ سارا
دن یوں ہی ابا کی راہ تکتے گذر گیا۔ پھر وہی کربناک اندھیرے کی دبیز اور کہیں
کہیں اس چادر میں سوراخ ڈالتا اجالا جو جلتے گھروں سے پیدا ہو رہا تھا۔
فضا دھواں آلود ہو چکی تھی۔ پورا ماحول غمگین ہو چکا تھا۔

ہم سب جیسے غنودگی کے عالم میں تھے۔ زندہ نہ مردہ بیچ کی کوئی کیفیت
تھی۔ ماں سوچتے سوچتے تھوڑی دیر کے لئے یوں غافل ہو جاتی جیسے اپنے
سہاگ کو چھیننے کے لئے اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئی ہو جب وہ آنکھیں
کھولتی تو ہم تینوں بھائیوں کو چھو کر اطمینان کر لیتی کہ ہم ابھی تک اس کے
پاس ہی ہیں پھر بڑی یاس اور حسرت بھری نگاہوں سے یوں دیکھتی جیسے
اسے یقین نہ ہو کہ ہم یوں ہی اس کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔

پتہ نہیں یوں ہی کتنے دن بیتے مگر ہمارے لئے وہ صدیوں سے کم نہ تھے
ماں کی نقاہت اور بڑھاپے میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا اس نے ہم لوگوں
سے زیادہ کرب جھیلا تھا۔ اب ماں کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور بس دروازے
پر جم گئی تھیں۔ صبح شام دن رات کا فرق مٹ گیا تھا۔ ہر گھر ایک قید خانہ

باقی صفحہ ۲۰۸ پر دیکھئے



یوسف عارف
۲۹/سی فورتھ میں، اے اسٹریٹ اکر ... ادا سرلی سکٹر ...

# ایک ادھوری کہانی

یہ کہانی ـــــ
سُلگتے الاؤ کے گرد بیٹھ کر نہیں سُنائی جا سکی کہ الاؤ نہ صرف بُجھ چکے ہیں، بلکہ اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

یہ کہانی ـــــ گھنے درختوں کے فرحت بخش سایوں میں بیٹھ کر نہیں سُنائی جا سکی کہ گھنے درخت نہ صرف کٹ چکے ہیں، بلکہ آج ان کا تصور بھی محال ہے۔

یہ کہانی ـــــ دادی ماں یا نانی ماں کے پوپلے مُنہ سے بھی نہیں سنائی جا سکی کہ آج کی مائیں، دادی ماں کا نصیب پانے سے قبل ہی دوسری دنیا کو سدھار جاتی ہیں۔

یہ کہانی ـــــ جس میں نہ کوئی خاص کردار ہے، جس کا نہ کوئی پلاٹ، نہ کوئی حادثہ، نہ واقعہ، نہ کوئی منظر نہ ہی کوئی منظر نامہ

یہ بے روح کہانی ـــــ کیا کہانی کہلائی جا سکے گی ـــــ؟

وہ لمبی سڑک ـــــ جو میں دیکھ رہا ہوں، مگر ایسی سڑکیں تو یہاں ان گنت ہیں .... اور میں ـــــ ا ـــــ بھلا کون ہوں ـــــ؟ چلئے یوں سہی ـــــ وہ سڑک جو آپ دیکھ رہے ہیں ـــــ لیکن آپ کون ہیں؟ ـ مگر میری ضد تو یہ ہے کہ ـــــ شہروں میں، گاؤں میں اور جنگلوں میں یہ جو سڑکیں گذرتی ہیں ـــــ ان پر صرف ایک ہی آدمی چلتا ہوگا ـ اور وہ آدمی یا تو آپ ہوں گے یا میں!

میں اور آپ!

ـــــ ہاں کچھ دکھائی دے رہا ہے، کچھ سُجھائی دے رہا ہے ـــــ کس اس سے کسی کو انکار ہے کہ وہ آپس میں اس طرح محوِ گفتگو ہیں۔

"میری نظروں میں وہ سارے منظر آج بھی گھومتے ہیں جنہیں تم ... دیکھ نہیں پائے ہو"

لمبی سنسان سڑک پر لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا بوڑھا، چوڑے کندھے والے صحت مند نوجوان سے مخاطب ہوا۔ اور چوڑے کندھے والے صحت مند نوجوان نے تیزی سے یوں جواب دیا۔

"میں اس بات کی کوشش کر رہا ہوں کہ نابود شدہ منظر کا رہا سہا نقش بھی کھرچ کر پھینک دوں ... پھر ایک ایسے منظر کی تخلیق کر دوں جو نہ صرف انوکھا ہو بلکہ ایسا ہو کہ ... جسے نہ کسی نے دیکھا تھا اور نہ دیکھا ہے۔

نوجوان کا جواب سن کر بوڑھے نے پل بھر کے لئے رکا اور لاٹھی کے سہارے اپنی جھکی ہوئی کمر قدرے سیدھی کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ نوجوان کے کندھے پر ڈالا اور پھیکی سی بے کیف ہنسی ہنستا ہوا یوں گویا ہوا۔

"اے عزیز! رب العزت تیری کوشش بار آور کرے خوش نصیب ہے تو جو تجھے میری ہمسری حاصل ہے۔ مگر یہ بات بھی ذرا دھیان میں رکھ لے کہ کبھی وہ بھی دن تھے کہ میں نہ ہاتھ میں لاٹھی رکھتا تھا اور جسم میں ناطاقتی ... سوچ کی رفتار بجلی کے کوندے سے زیادہ تیز تھی۔ لیکن جس منظر کے بارے میں میں نے تجھ سے کہا ہے ... وہ منظر بے حد حقیقی اور عظیم الشان تھے ... اس لئے میں نے تجھ سے کہا تھا ـــــ وہ سارے منظر آج بھی میری نظروں میں گھومتے ہیں جنہیں تو نے دیکھا ہی نہیں" چوڑے کندھے والے صحت مند نوجوان نے بوڑھے کی بات سن کر چپ سادھ لی۔

"اے معصوم! جانتے ہو، وہ منظر کیا تھے؟" نوجوان نے واقعی بڑی معصومیت سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

"اے عزیز! تو بھی سن لے، میں نے دیکھا ہے، مقدس عید کی ساعتوں میں لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ایک وسیع و عریض کچہری میں جمع ہو کر والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے اور گاؤں کا مکھیا نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ انہیں بیڑے تقسیم کرتا تھا کہ ـــــ

پر مسرت اور مقدس ساعتوں کی خوشبو سا رے گاؤں میں پھیلتی چلی جاتی، یہ نکہت اور یکجہتی کی ہوائیں چلتی رہیں۔ — مگر آج وہ جگہ ویران ہے، وہاں الّو بولتے ہیں، تو کیا یہ سچ ہے کہ — آج روز مرّہ تعمیر ہوئی بلند و بالا خوبصورت عمارتوں کے ساتھ ساتھ ایسی کسی کٹیا کی تعمیر نہیں ہو گی ؟"

بوڑھے نے دھیرے سے نوجوان کے کندھے پر رکھا اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا کچھ سوچنے لگا۔ — پھر اس نے اپنی گردن اٹھائی اور دھندلائی آنکھوں سے دور — بہت دور دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں نے دیکھا ہے — وہاں" — اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لاٹھی اٹھائی "ہاں ادھر ہی — کبھی خوبصورت محل کھڑا ہوا کرتا تھا .... پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس محل کے پلستر جھڑنا شروع ہوئے، صندوقیں آہنی دروازے زنگ آلود ہونے لگے — پھر منقش محرابوں کا حسن موسم کے لگاتار حملوں کے بعد ایسا اجڑا کہ حسن کا نام و نشان بھی نہیں رہا — اب — سب کچھ بھورے مائل مٹی کی شکل میں مسمار پڑا ہے، دن نکلتا ہے اور آرام سے ڈھلتے ڈھلتے ستھرے لباسوں اور چہروں پر دھول ہی دھول اڑنے لگتی ہے — کیا واقعی دن دھول ہوا؟" اچانک ہی بوڑھے نے کھانسنا شروع کر دیا۔ کھانستے وقت اس کی حالت دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہونے لگی تھی۔ نوجوان نے اسے سہارا دینے کی بڑی کوشش کی — لیکن بوڑھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر اپنے آپ ہی سنبھل کر کہنے لگا۔

"اے نوجوان! مجھے بے حد افسوس ہے اور شاید تمہیں بھی ہو کہ میرے شہر میں وہ آوارہ ہوائیں اب کبھی نہیں چلتیں کہ جن کی تازگی سے پھل پکتے تھے، گھوڑے ہنہنا کر سرپٹ دوڑتے تھے اور مہلک بیماریوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا — تو شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو گے کہ منظر ریزہ ریزہ کر دو گے اور ایک نئے منظر کی داغ بیل ڈالو گے — اور یہی فتح مندی تمہارا بازوئی تعویذ ہو گی۔"

نوجوان نے محسوس کیا، اس کے بازو یا تو کٹ چکے ہیں یا مضبوط شکنجوں میں جکڑے جا چکے ہیں — اس کے جی میں آیا وہ بوڑھے سے اس بات کا وعدہ کرے کہ اب کوئی منظر جھٹلایا نہیں جائے گا، کوئی سلسلہ کاٹا نہیں جائے گا اور نہ ہی کوئی کتاب رد کی جائے گی کہ یہ سب کچھ ہمارے منافی ہے اور تا قیامت — نوجوان نے یکایک محسوس کیا بوڑھے کے ہونٹوں پر کرب آمیز مسکراہٹ ابھرنے لگی ہے۔ وہ بڑا حیران و ششدر ہوا۔ یعنی وعدے بھی آج بے اعتبار اور بے مروت ہو گئے ہیں۔ بوڑھا اچانک بول پڑا۔

"اے عزیز! میں تیرے وعدوں پر وارے جاؤں، مگر افسوس، میں نے دیکھا ہے وعدوں کے نام پر ہم صرف اپنی پر فریب آواز ایک دوسرے کو سناتے ہیں اور اطمینان کا سانس یوں لیتے ہیں جیسے ہر شام وہسکی کی کھلی بوتل سانس لیتی ہے۔" پھر بوڑھے نے اپنے ٹوٹتے ہوئے دردمندانہ لہجہ میں کہا۔

"اپنے بزرگوں سے میں نے سن رکھا تھا — کبھی یہ دھرتی، چٹیل میدان، گھنے جنگل، دور دور تک پھیلی بیکراں خاموشی میں نظریں پھینکیں تو لگتا تھا سب کچھ ہمارا ہے اور اس سب کچھ کے لئے ہم ہیں۔ لیکن آج — یہ تیرا ہے، وہ میرا ہے، یہ اس کا ہے اور وہ اس کا ہے، آج ہم سب کسی نہ کسی ڈور میں الجھے وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں جو ہمیں راس بھی نہیں آتا۔

نوجوان نے محسوس کیا — آس پاس کا منظر زمین اور آسمان یہاں تک کہ لاٹھی کے سہارے خزاں زدہ سی مدت تھرتھراتا بوڑھا یہ سبھی کچھ اس کی نظروں میں ڈانواڈول ہوتے دکھائی دے رہے ہیں ... اور وہ خود جیسے بے سہارا ہو گیا ہے اور بے سہارگی کسی بھی پل اسے زمین پر ڈھیر کر سکتی ہے مگر یہ کس قدر بزدلی اور نا طاقتی کی بات ہے کہ وہ ایک ناتواں عمر رسیدہ بزرگ کے سامنے خود کو اس قدر کمزور اور بے سہارا محسوس کر رہا ہے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لئے ایک گہری لمبی سانس لی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ذہن کا سناٹا دور نہیں ہو پایا جو اکثر صبح کے اخبار کی سنسنی خیز خبریں پڑھنے کے بعد ہوتا تھا۔ وہ خبریں تھیں :-

"حملہ آوروں نے چار ماہ کے بچے کو ہوا میں اچھال دیا"

"گیارہ سالہ لڑکی کی ٹانگیں چیر کر اس کے دو حصے کر دیئے گئے"

"آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں زندہ آدمیوں کو جھونک دیا گیا"

لیکن کون — ؟ تم — !!

اس نے اپنی مٹھی بھینچ لی اور ایک مضبوط گھونسہ اپنے ہی جبڑے پر لگا بیٹھا۔ پھر درد سے کراہتا ہوا لڑکھڑا کر چلنے لگا۔

یہ دنیا — یہ دنیا۔ اس نے برسوں قبل پڑھا تھا، ہم صبح کے شہر کے آدمی ہیں۔ چمکتی دھوپ ہمارا مقدر ہے لیکن اب اس کہاوت کو رد کرنا ہو گا۔

[باقی صفحہ ۶۵ پر دیکھئے]



[illegible]ے زہر خند ہو جاتا
[illegible]کے دروازے بند ہو جاتا
[illegible]پہ اک چوبِ خشک سا انکار
[illegible] درختوں کا بھی تا دہند ہو جاتا
[illegible] ہوڑے ہوتے ہی اوجھل اس کے لئے
[illegible]ستوں کا فکر مند ہو جاتا
[illegible] ترکِ مراسم کے بعد چاہت میں
[illegible] اپنا فیصلہ تک ناپسند ہو جاتا
[illegible] سی جو کرتی رہے دلوں کو دو نیم
[illegible] ایک دم کئی چیخیں بلند ہو جاتا
[illegible]یں میں چھنا میرا رہائی کی خاطر
[illegible]ڑھتا ہاتھ پھسلتی کمند ہو جاتا
[illegible] صدا پہ پلٹنے کا کرتا تھا یارا
[illegible] صدا کا ہوائے گزند ہو جاتا

[illegible]جنبی دیار میں ہے [illegible]
میں ہوں اور اب [illegible]
منتظر کوئی نہ تھا دونوں [illegible]
اور مجھے لاحق تھا اگلے مرحلے کا انتظار
منجمد پانی میں ہم تم یوں کھڑے ہیں جس طرح
ایک قیدی دائرے کو دائرے کا انتظار
فرش سے تا عرش تھی اک آنکھ سی ہوتی ہوئی
کس قدر تکلیف دہ تھا شب گئے کا انتظار
گھر کے آئینوں میں جب دھند لاگئی تیری [illegible]
ختم تھا پھر روز سورج ڈوبنے کا انتظار
بھیڑ میں ہر شخص ہے اپنی جگہ سہما ہوا
سب کو نا معلوم سے اک حادثے کا انتظار
تھے ستارہ در ستارہ رت جگوں کے راستے
کر دیا کس نے معطل رابطے کا انتظار

ماں کے پاؤں سے یوں کب بیڑیاں نکلتی ہیں
سخت مرحلوں کے بعد بیٹیاں نکلتی ہیں

زرد رُت کو اوڑھے یہ کون بین کرتا ہے
رات بھر ہواؤں کی سسکیاں نکلتی ہیں

لاش کے تناسب سے چادرِ کفن کم ہے
سر ڈھکو تو پاؤں کی انگلیاں نکلتی ہیں

خواہشِ نمو کا دم بند گھر میں گھٹتا ہے
ورنہ ہیں نکل پاتے کھڑکیاں نکلتی ہیں

ایک شخص زد میں ہے سورجوں کے نیزوں کی
جسمِ تنہا پر لاکھوں برچھیاں نکلتی ہیں

قافلے پرندوں کے پل کے اڑتے ہوں جیسے
ایک ساتھ ہجرت کو بستیاں نکلتی ہیں

جب سے اک گہر میں نے ریت میں گنوایا ہے
میری کاوشیں خالی سیپیاں نکلتی ہیں

زینہ زینہ سوچوں کے سلسلے نہیں تھمتے
آسمانوں کی حد تک سیڑھیاں نکلتی ہیں

لہلہاتے کھیتوں کو عشق یوں نہیں ملتا
خاک دفنوں کے مقتل سے بالیاں نکلتی ہیں




عنوان چشتی

صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵


# غالب اور مسائلِ تصوف

## ایک شعر کے حوالے سے

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

اس غزل میں "جس کا شعر زیرِ بحث ہے" غالب کے تخلیقی عمل کی تین سطحیں نظر آتی ہیں۔ پہلی سطح پر غالب کا ذہن اس کے پورے تخلیقی عمل پر حاوی ہے، اور جذباتی عنصر کم نظر آتا ہے۔ اس سطح پر غالب خیال اور فکر کو گہرا یا پیچیدہ کرنے کے لئے تخئیل سے غیر مشروط استفادہ کرتا ہے۔ اور اپنے خیال کی نقش گری کے لئے مغلق لفظوں، فارسی محاوروں کے ترجموں، نئی اور اجنبی ترکیبوں کا سہارا لیتا ہے۔ اور طرزِ بیدل کی پیروی پر ناز کرتا ہے مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس سطح پر جذبہ پر خیال کا اور خیال پر بیان حاوی ہے مثلاً

| | |
|---|---|
| عکسِ خطّ تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز | آئینہ بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے |
| سنبلستانِ جنوں ہوں ستم نسبتِ زلف | موکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے |
| گرد ما در آئینۂ محشرِ خاکِ مجنوں | یک بیاباں دلِ بیتاب اٹھایا ہے مجھے |
| حیرت کا غذ آتش زدہ ہے جلوۂ عمر | تہ خاکسترِ صد آئینہ پایا ہے مجھے |

ان اشعار کی ساخت اور ہیئت پر فنکاری سے زیادہ صناعی کا اثر ہے جو ترکیب تراشی، انفرادیت پسندی، اور استادر الکلامی کی صورت میں نمایاں ہے۔ دوسری سطح پر غالب کا تخلیقی عمل تارِ حریرِ دو رنگ کا منظر پیش کرتا ہے۔ عام طور پر مصرعِ اولیٰ صناعی اور تخئیل کی مینا کاری کا شاہکار ہوتا ہے۔ اور اس میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو پہلی سطح کے اشعار میں نظر آتی ہیں لیکن دوسرے مصرعے میں جذباتی اور جمالیاتی فضا غالب رہتی ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصرعِ ثانی جذبے کی لہر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نسبت سے مصرعِ اولیٰ کا لسانی اظہار مصرعِ ثانی کے لسانی اظہار سے مختلف ہوتا ہے۔ پہلے میں صناعی اور دوسرے میں فنکاری ہوتی ہے۔ اس سطح پر غالب کہیں کہیں دعوے اور دلیل کا انداز بھی اختیار کرتا ہے مثلاً

| | |
|---|---|
| لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار | ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے |
| درد اظہارِ تپش کسوتیِ گل معلوم | ہوں میں وہ چاک کہ کانٹوں میں سلایا ہے مجھے |
| بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد | ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے |

ان اشعار کے مصارعِ اولیٰ سے ذہنی کاوش اور صناعی نمایاں ہے اور مصارعِ ثانی جذباتی تموّج اور فنکاری کے مظہر ہیں۔ دونوں کے اظہار میں نمایاں فرق ہے۔ اور لسانی مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہے — تخلیقی عمل کی تیسری سطح پر غالب کا ذہن خیال بندی، پیچیدگی اور صناعی سے آزاد ہوتا ہے۔ اور جذباتی کیفیت کا عکاس ہوتا ہے۔ اس سطح پر غالب کے اشعار اس کے شعری اور تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت کے امین اور عکاس ہوتے ہیں جس میں خیال جذبے کا اور جذبہ فکر کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اور جذبہ و فکر ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک دلکش لسانی پیکر اختیار کر لیتے ہیں زیرِ بحث شعر اسی نوعیت کا ہے۔ یعنی

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

اس شعر میں جذبہ و فکر کی دوئی نظر نہیں آتی۔ اظہار کی سطح پر بھی غیر ضروری صناعی اور شترگربگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شعر کی خارجی ہیئت اس کی داخلی

ہیئت سے ہم آہنگ ہے۔ اور شعر کا لسانی پیکر شعری اور جمالیاتی تجربے کی بنیادی خصوصیت کا بھرپور اظہار ہے۔ اس سطح پر غالب کا فن معراجِ کمال پر نظر آتا ہے۔ اور بہترین فنکارانہ اور جمالیاتی خصوصیات کا حامل ہے۔

اس شعر پر غور کرتے ہوئے پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اس کا مفہوم اور موضوع کیا ہے؟ یہ سوال بظاہر آسان ہے۔ مگر ہے بنیادی۔ دوسرے تمام سوالات اس سوال سے وابستہ ہیں۔ اس مصرع کی نثر اس طرح کی جاسکتی ہے۔

مجھ سے ہر ذرہ کا جام سرشار تمنا ہے (میں) کس کا دل ہوں، کہ مجھے دو عالم سے لگایا ہے

مفتی محمد انوار الحق مرتب نسخۂ حمیدیہ، مولانا عبدالباری آسی اور پروفیسر محمد مجیب نے دوسرے مصرع کو اس طرح لکھا ہے یعنی "کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے"، لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے اس مصرع میں "سے" کی جگہ "میں"، لکھا ہے یعنی

کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

مولانا عرشی کے متن کے مطابق اس شعر کی نثر یہ ہوگی

مجھ سے ہر ذرہ کا جام سرشار تمنا ہے۔ (میں) کس کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم میں لگا یا رکھا گیا ہے لیکن مولانا عرشی نے بھی صحت نامے اور بعد کے ایڈیشنوں میں "سے" ہی لکھا ہے۔ پہلے مصرع میں مجھ سے کا "سے" بھی غور طلب ہے۔ عہد میر تک "سے" "مانند اور طرح" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا مثلاً

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

یعنی سب داغ آنکھوں کی مانند کھل رہے ہیں (اس لئے) میرا ہاتھ نرگس کے پھولوں کا دستہ بنا ہوا ہے۔ اگر غالب کے شعر میں "مجھ سے" کو میری مانند تصور کرلیا جائے تو اس کی نثر یہ ہوگی۔

ہر ذرّے کا جام میری طرح سرشار تمنا ہے۔ (میں) کس کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم میں لگا یا گیا ہے۔

مصرع ثانی میں "سے" اور "میں" کے اختلاف سے، اور مصرع اولیٰ میں "سے" کے معنی کے اختلاف سے اس کا مفہوم زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ مثلاً

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

پہلا مفہوم یہ ہے کہ میری بدولت یا میری وجہ سے ہر ذرّہ کا جام تمنا (کی شراب) سے سرشار ہے۔ یعنی میں ہر ذرّہ کے جام میں شراب کی طرح موجزن ہوں۔ جس سے ہر ذرّہ کا جام سرشار تمنا ہے۔ میں ایک ایسا باطنی سرچشمہ ہوں، جو کائنات کے ذرہ ذرہ کو زندگی عطا کر رہا ہے۔ اور پھر غالب استفہامیہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ میں کس کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم سے لگایا گیا ہے۔ یہاں کس کا کہہ کر یہ نکتہ پیدا کیا گیا کہ اے خدا میں تیرا دل ہوں۔ یعنی میں ہی کائنات کی زندگی کا باطنی سرچشمہ ہوں۔ اور کائنات پر محبت بن کر چھایا ہوا ہوں۔ اس مفہوم میں "مجھ سے" اور "مجھے" غور طلب ہیں۔ جو "میں" کے قائم مقام ہیں۔ "میں" ذات اور وجود کا استعارہ ہے۔ نیز انسان کا استعارہ بھی ہے۔ پہلے مصرع میں "میں" زندگی کی داخلی قوتوں کا اور دوسرے میں خارجی فتوحات کا ضامن ہے۔ فکر کی یہ عمودی اور افقی لہریں ہیں، ذات اور موجود کا اثبات کرتی ہیں۔ اور ماسوا کی نفی کرتی ہیں۔ انسان کی عظمت اور تقدیس پر صاد کرتی ہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میری بدولت ہر ذرّہ کا جام سرشارِ تمنا ہے۔ یعنی میں ہر ذرّہ کے جام میں شراب کی طرح موجزن ہوں۔ پھر شاعر استفہامیہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ میں کس کا دل ہوں (یعنی اے خدا تیرا دل ہوں) جسے دو عالم میں لگا یا گیا ہے۔ جس کی بدولت کائنات کا ذرّہ ذرّہ تمنا کی شراب سے سرشار ہے۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمنا کس کی ہے خود کی ہے یا خدا کی۔ مولانا عبدالباری آسی نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے

"ہر ذرّہ کے جام میں میری تمنا بھری ہوئی ہے۔ اور میری تمنا سوزی سے سرشار ہے۔ اے خدا آخر میں کس کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم سے وابستہ کیا ہے یعنی آخر کس شیفتہ و فریفتہ کا میں دل ہوں کہ ہر ایک سے میرا تعلق رکھا گیا ہے۔"

[مکمل شرح دیوانِ غالب [ترمیم شدہ] صدیق بک ڈپو، امین آباد لکھنؤ ص ۳۰۶]

آسی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ ہر ذرّے کے جام میں میری تمنا بھری ہوئی ہے۔ اور "میری تمنا سوزی" سے اس مفہوم کی وضاحت کی ہے لیکن اس تعبیر کو قبول کرنے میں یہ قباحت ہے کہ شعر میں اپنی تمنا کرنے یعنی خود طلبی کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ غالب کے یہاں تمنا ایک وسیع ترین تصور کا مظہر ہے جو آرزو

وجستجو درد و داغ اور جذبِ و مستی و کشش کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ مثلاً

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب | ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
درماندگی شوق تراشے ہے پناہیں | دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری | تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

ان اشعار میں دشت امکاں کو تمنّا کا پہلا قدم قرار دینا، دیر و حرم کو آئینۂ تکرارِ تمنّا قرار دینا اور محوِ آئینہ داری کو کس تمنّا سے دیکھنا مختلف الجہات اور وسیع تصورات ہیں۔ غالب کے زیرِ بحث شعر میں بھی تمنّا کا بہت وسیع مفہوم ہے پھر اس نے غالب کے استفہامیہ انداز کو تخاطب بہ خدا کر کے محدود کر دیا ہے۔ "کس کا دل ہوں" سرگوشی اور خود کلامی کا انداز بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں لفظ "سے" ہو یا "میں" "دو عالم سے لگایا ہے یا دو عالم میں لگایا ہے" مجموعی طور پر ایک ہی مفہوم ہے اور دونوں صورتوں میں مجھے جو میں قائم مقام ہے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مصرعے میں دل بذات اور وجود کا بھرپور استعارہ ہے۔ اور انسان کی بے کنار عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اب تک جو وضاحت کی گئی ہے، وہ دوسرے مصرعے میں "سے" یا "میں" کے پیشِ نظر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مصرعِ اولیٰ میں "مجھ سے" کی معنویت کے پیشِ نظر کی گئی ہے "مجھ سے" کے کئی معنی میری طرح بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس لئے اس شعر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ میری طرح کائنات کے ہر ذرّے کا جام شرابِ تمنّا سے سرشار ہے۔ میں کس کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم میں شرابِ تمنّا کی ترسیل اور اس کے نتیجہ میں سرشاری پیدا کرنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جو میری خواہش ہے وہی ہر ذرّے کی ہے۔ گویا کہ میری تمنّا کی شراب سے ان کا جام لبریز ہے۔ میں کس عاشق کا دل ہوں کہ مجھے دو عالم سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ یہ بھی "ہمہ من است" قسم کا مضمون ہے۔ ساری دنیا کے دل میں تمنائیں میری ہی دی ہوئی ہیں میری ہی تقلید میں ہیں۔"

تفسیرِ غالب، ۱۹۷۱ء، سری نگر، ص ۴۵۷

پروفیسر گیان چند جین کی تشریح میں "سے" بمعنی مانند یا طرح کا ملکا سا اشارہ ملتا ہے۔ مگر انھوں نے یہ لکھ کر کہ "گویا میری تمنّا کی شراب سے ان (ذرّوں) کا جام لبریز ہے" ایک الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ میری تمنّا سے کیا مراد ہے یہ بات واضح نہیں ہو سکی۔ انھوں نے اس شعر کی اصل روح کی طرف "ہمہ من است" قسم کا مضمون کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ مگر اس جملے کی تشریح میں یہ لکھ کر کہ ساری دنیا کے دل میں تمنائیں میری ہی دی ہوئی ہیں۔ ایک اور غلط بحث کر دیا ہے۔ غرض مولانا آسی کی طرح پروفیسر جین نے بھی اس شعر کے بنیادی موضوع اور اصل مفہوم کو پوری طرح واضح نہیں کیا ہے۔ البتہ پروفیسر جین نے اپنی تشریح میں یہ خیال انگیز مگر مبہم سا نکتہ ضرور بیان کر دیا ہے کہ اس شعر میں ہمہ من است قسم کا مضمون ہے۔ اس تجزیے سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کے زیرِ بحث شعر میں ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ جس میں دل، تمنّا، مجھے یا مجھ سے کلیدی الفاظ ہیں۔ اس شعر میں "مجھ سے" یا "مجھے" "میں" ذات یا وجود کی علامت ہے۔ جس کو کائنات کا مصدر اور مظہر قرار دیا گیا ہے۔ دل کو ذات، وجود اور "میں" کا استعارہ بنا کر اس کو زندگی کا حاصل، جوہر اور محرک نیز تمام پنہاں اور پیدا طاقتوں کا سرچشمہ بنایا گیا ہے۔ اور "میں" کو انسان کا استعارہ بنا کر اس کو انسانی تقدس اور عظمت کا اشاریہ بنا دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں وجود کو موجود یا موجود کو وجود ظاہر کیا جاتا ہے۔ یا ذات کے سوا ماسوا کی نفی کی جاتی ہے یا ہر رنگ میں بہار کا اثبات کیا جاتا ہے، وہاں عام طور پر وحدت الوجودی انداز فکر کارفرما ہوتا ہے۔ مولانا میکش اکبرآبادی نے لکھا ہے کہ "محبت اور خودی کا حسین ترین موصوف اگر عقل و دانش میں نہ آئے تو خدا اور دل و نظر میں سما جائے تو انسان ہے۔" غالب کے زیرِ بحث شعر سے جو انسان کا تصور ابھرتا ہے، وہ دل و نظر میں بھی سماتا ہے اور وہ محبت اور خودی کا ایسا حسین ترین موصوف بھی ہے جو عقل و دانش میں بھی نہیں آتا۔ اس لئے غالب کے زیرِ بحث شعر کا بنیادی خیال وجودی انداز فکر سے ماخوذ ہے اور اس میں انسان کی عظمت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ اس انداز فکر کا لازمی نتیجہ ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مصرعِ اولیٰ میں "سے" کے دو معنی ہونے کے باوجود اور مصرعِ دوم میں "سے" اور "میں" کے اختلاف کے باوصف مجموعی طور پر مفہوم میں بڑی حد تک یکسانیت رہتی ہے۔ اس میں عظمتِ انسان کا تصور اور وحدت الوجودی انداز کارفرما ہے۔ اور یہ شعر ہمہ اوست کی جمالیاتی مگر منفرد تعبیر ہے۔ ابن عربی کی وجودی فکر نے ثنویت اور غیریت کے تصور پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اور وجود و موجود کی دوئی سے صرفِ نظر کر کے عینیت کے تصور کو فروغ دیا ہے۔ اس انداز فکر نے الیاتی اد

اور کونیاتی مسائل کو فلسفیانہ اساس فراہم کی ہے اور دونوں کے تضادات کو تعلق، ترتیب اور تسلسل کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ نیز کثرت کو وحدت بنا دیا ہے۔ ابن عربیؒ کے وحدت الوجود کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں۔ ذات باری تعالیٰ مرتبۂ قدیم یعنی باطن میں مجرّد اور وحدت ہے۔ نیز مرتبۂ ثانی یعنی خارج میں مرئی اور کثرت ہے۔ باطن سے خارج تک کا ظہور درجہ بدرجہ ہے۔ جس کو فلسفہ کی زبان میں تنزلات کہا جاتا ہے۔ ہر درجہ یا مرتبہ ایک حقیقت ہے۔ یہ مرتبے سات ہیں جنہیں تعینات کا نام دیا جاتا ہے۔ پہلے تین مراتب (واحدیت، وحدت اور احدیت) کا تعلق الہیاتی مسائل سے ہے اور دوسرے تین مراتب کونیاتی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخری یعنی ساتواں مرتبہ حضرت انسان کا ہے۔ جو ان تمام مراتب کا جامع اور ان مراتب کی تمام صفات اور خصوصیات کا حامل ہے۔ غالبؔ نے ذات، وجود، میں یا انسان کو جو حیات و کائنات کا محرک، سرچشمہ اور جوہر قرار دیا ہے وہ اسی انداز فکر کا دلکش پیرایۂ اظہار ہے۔ انھوں نے رخ بدل کر وجود کو موجود اور موجود کو وجود کہا ہے۔ لیکن ایک خاص جمالیاتی انفرادیت کے ساتھ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب فلسفۂ وحدت الوجود سے واقف تھے؟ اگر وہ واقف تھے تو ان کی واقفیت کس درجہ کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ غالبؔ نے اپنی شاعری میں وجودی فکر کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ "ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر" یا "اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" وغیرہ جمالیاتی کلیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالبؔ نے وجودی اندازِ فکر کو اپنایا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اشعار اپنی فنی، فکری اور جمالیاتی خصوصیت کی بنا پر بے حد اہم ہیں۔ مثلاً

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب نے وجودی اندازِ فکر کو تخلیقی توانائی کے ساتھ بار بار پیش کیا ہے اس کے علاوہ غالب کی حضرت کالے شاہ صاحبؒ سے عقیدت مولوی فضلِ حق جیسے وحدت الوجودی عالم سے دوستی اور حضرت جی غمگینؒ سے مراسلت بھی اس کی تصوف دوستی کی مظہر ہے۔ غالبؔ نے حضرت جی غمگینؒ کو ایک خط میں لکھا ہے۔

"موجود ایک ہے اور خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، اور اس کے سوا جو کچھ بھی خدا کے سوا ہے اور جسے موجود سمجھ رہے ہیں۔ یہ سب معدوم ہے۔ جو کبھی موجود نہیں ہوا"

[مسائل تصوف از میکش اکبرآبادی ۱۹۷۴ء علی گڑھ، ص ۱۶]

اس اقتباس میں غالبؔ نے موجود کو وجود یا وجود کو موجود کہا ہے۔ موجود کو حق کہہ کر اس کا اثبات کیا ہے۔ اور ماسوا کے وجود سے قطعاً انکار کیا ہے۔ یہی وحدت الوجود ہے۔ یہ وحدت الوجود کا عطر یا خلاصہ ہے۔ چونکہ وحدت الوجود ایک فلسفہ ہے اس لئے یہ بھی پرکھنا ہوگا کہ غالب اس فلسفے کی جزئیات اور مدارج سے کس قدر آگاہ تھے۔ حضرت جی غمگینؒ کو یہ لکھتے ہیں۔

"پیدا ہونے سے موت تک سب اس شخص کی اعیانِ ثابتہ تھی، جو وجودِ مطلق میں قائم اور ثابت ہے۔ نہ وہ ظاہر ہوئی نہ معدوم نہ کبھی ظاہر ہوگی نہ پوشیدہ ......... یہ آسمان نہیں ہے۔ آسمان کی عینِ ثابتہ ہے۔ آفتاب نہیں ہے آفتاب کی عینِ ثابتہ ہے۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ تغیر اور انتقال سے پاک ہے اس لئے اعیانِ ثابتہ بھی نمودِ وہمی کے ساتھ موجود نہیں ہوتی۔ اور اس طرح زوال کو قبول نہیں کرتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعیانِ ثابتہ کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں تغیر نہیں ہوتا۔ اور وہ خدا کی ذات سے علیحدہ نہیں ہوتیں اور خود اپنے اوپر تجلی کرتی ہیں۔"

[مسائل تصوف از میکش اکبرآبادی۔ ص ۱۶]

غالب نے اپنے اس بیان میں مسئلۂ تجددِ امثال پر روشنی ڈالی ہے۔ اور "اعیان" اور اعیان کے مسئلے کی وضاحت کی ہے جس کے تجزیے سے چند نکات واضح ہوتے ہیں۔

(۱) اعیانِ ثابتہ وجودِ مطلق میں قائم اور ثابت ہیں۔ ظاہری اشیاء اور مظاہر سے اعیانِ ثابتہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲) اعیانِ ثابتہ میں تغیر نہیں ہوتا اور وہ خارج میں ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔

(۳) اعیانِ ثابتہ ذاتِ باری تعالیٰ سے علیحدہ نہیں ہوتیں۔ اور ذاتِ مطلق میں ہی اپنے اوپر تجلی کرتی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ خارج میں جو کچھ موجود ہے وہ بجائے خود اپنی اصل کی عینِ ثابتہ ہے۔ عینِ خارجہ نہیں ہے یعنی کائنات کا نامیاتی ارتقا

ذہن باری تعالیٰ میں جاری ہے۔ جو کچھ ہے باطن میں ہے۔ خارج میں کچھ نہیں ہے۔

غالب نے اپنے بیان میں نظریۂ تجدد امثال کو پیش کیا ہے۔ جو ابن عربی کے نظریۂ تجدد امثال سے ماخوذ ہے۔ لیکن صحیح نہیں ہے۔ ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود میں مسئلہ تجدد امثال بیحد اہم ہے۔ جو تخلیقِ کائنات کا بیحد نازک اور لطیف مرحلہ ہے۔ فلسفۂ وجود کے پہلے تین مراتب [مرتبۂ احدیت، مرتبۂ وحدت اور مرتبۂ واحدیت] علم الٰہی کے خارجی مراتب ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مرتبۂ احدیت مرتبۂ ذات ہے۔ جو اپنی ذات سے ہر قید اور ہر نسبت سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ مطلق کی قید سے بھی پاک ہے۔ مرتبۂ وحدت بھی مرتبۂ ذات ہے۔ لیکن یہ علم اجمالی کی منزل ہے۔ یعنی یہ وہ مرتبہ ہے جہاں حضرت حق کو اجمالی طور پر اپنی ذات اور صفات کا علم ہے۔ مرتبۂ واحدیت بھی مرتبۂ ذات ہے۔ لیکن یہ علم تفصیلی کی منزل ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جہاں اسم اللہ کا ظہور ہوا۔ اس منزل میں ذات باری تعالیٰ کو اپنی ذات اور صفات کا علم پوری جزئیات، اور امکانات کے ساتھ ہے۔ اس علم تفصیلی کا نام اعیان علمیہ ہے۔ اس کو اعیان ثابتہ بھی کہتے ہیں۔ انہیں اعیانِ ثابتہ کے خارجی ظہور کا نام اعیانِ خارجہ ہے یعنی کائنات اور اس کے جملہ آثار، احوال، مظاہر اور اشیا جیسا کہ خارج میں۔ اعیانِ خارجہ علم الٰہی کے خارجی مراتب ہیں۔ عالم ارواح غیر مرئی ہے۔ عالم امثال عالم خواب یا عالم رؤیا ہے۔ عالم اجساد عالم رنگ و بو ہے۔ غالب اعیانِ خارجہ کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور اس طرح یہ اندازہ کہ عالم ارواح عالم امثال اور عالم اجسام کے منکر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ غالب فلسفۂ وحدت الوجود کے چھ مراتب میں سے صرف پہلے تین مراتب کے قائل ہیں اور آخری تین یعنی خارجی مراتب کے قائل نہیں۔ جس کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ وہ خارجی پہلو کی نفی کرتے ہیں اس کو موجود نہیں معدوم تصور کرتے ہیں۔ اور اس طرح غیر شعوری طور پر وحدت الوجود کو ویدانیت کا مترادف بنا دیتے ہیں۔ جس میں کائنات کو معدوم تصور کیا جاتا ہے۔ غالب نے اس غلط فہمی کی بنا پر اپنے اشعار میں بار بار کائنات کو معدوم کہا ہے۔ مثلاً

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

ان اشعار میں کائنات کو معدوم اس غلط فہمی کی بنا پر قرار دیا ہے جو غالب کو وحدت الوجود کے پوری طرح نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زیر بحث شعر یعنی

جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

میں "کس کا دل ہوں" کا ٹکڑا اُن کے وجودی فکر کی وحدت کو متاثر کیا ہے۔ اور اس سے ثنویت کی بو آتی ہے۔ اس شعر میں "کس کا" کلمۂ استفہامیہ ہے یہ ٹکڑا فنکارانہ نقطۂ نظر سے شعر کے حسن میں ضرور اضافہ کرتا ہے۔ ذہن کو مہمیز بھی کرتا ہے اور غور و فکر پر مائل کرتا ہے لیکن فلسفیانہ نقطۂ نظر سے وجودی فلسفہ میں رخنہ پیدا کرتا ہے یہ "کس کا" ٹکڑا عینیت کو غیریت کی طرف مائل کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شعر خالص وجودی انداز فکر کا حامل ہے اور اسی فکر کا جمالیاتی اظہار ہے۔

ابن عربی کے فلسفہ کی روشنی میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں جو کچھ ہے حق ہے اور حق کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہم باطل بھی حق ہے۔ خدا اور کائنات کے درمیان رشتۂ غیریت نہیں بلکہ رشتۂ عینیت ہے۔ اعیانِ ثابتہ کا خارجی ظہور ہی اعیانِ خارجہ ہیں۔ وحدت ہی کثرت میں ظاہر ہوئی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ مرتبۂ باطن میں وحدت اور مرتبۂ ظاہر میں کثرت ہے۔ اس کے باوجود خدا خالق ہے اور کائنات مخلوق۔ خدا عالم ہے اور کائنات معلوم۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کا عین ہیں غیر نہیں۔ انسان تمام مدارجِ ظاہری و باطنی کا جامع ہے۔ یہ اشرف المخلوقات اور خلیفۂ رحمان ہے۔ اسی لئے نظریۂ وحدت الوجود کائنات اور انسان کی تقدیس پر اصرار کرتا ہے۔ اور انسان کی عظمت کا رجز پڑھتا ہے۔ اگرچہ وجودی فکر ایک روحانی، اخلاقی اور وجدانی انسان کے وجود پر اصرار کرتی ہے مگر اس کے مادی، نفسیاتی اور شعوری وجود کا انکار بھی نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس ثنویت پر کاری ضرب لگاتی ہے اور انسان کو عینِ ذات بنا کر اس کو ایک ارفع مقام عطا کرتی ہے۔ جس پر انسانیت ناز کر سکتی ہے۔ غالب کے زیر بحث شعر میں جو تصور ملتا ہے، وہ اس تفصیل کا اجمالی، مجموعی، اور منفرد تاثر ہے۔

عروضی نقطۂ نظر سے یہ شعر کم از کم دو بحروں میں تقطیع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) بحر رمل سالم مخبون مخبون محذوف/مسکن جس کا وزن ہے: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

(۲) بحر رجز مرفوع مطوی مطوی مسکن/مطوی جس کا وزن ہے۔ فاعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن/مفعولن

ان دونوں بحروں میں پہلی بحر یعنی بحر رمل کو اس بنیاد پر ترجیح حاصل ہے کہ اس میں دوسری بحر یعنی بحر رجز کے مقابلے میں مزاحف ارکان کی تعداد کم ہے۔ بحر رمل میں مزاحف ارکان تین ہیں جبکہ بحر رمل میں مزاحف ارکان کی تعداد چار ہے۔

پنگل شاستر میں چھندوں کو ان کے مزاج اور اثر انگیزی کی نوعیت کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) ایسے چھند جو المیہ جذبات کی عکاسی کے لئے موزوں ہیں (۲) ایسے چھند جو طربیہ اور شوخ نیز جنچل جذبات کی صورت گری کے لئے زیادہ مناسب ہیں (۳) ایسے چھند جو سنجیدہ افکار اور فلسفیانہ خیالات نیز زندگی کے حقائق کے اظہار کے لئے موزوں ہیں۔ اگر اس اصول کا اطلاق اردو عروض پر کیا جائے تو اوزان و بحور کے صوتی اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ غالب کے زیر بحث شعر میں جو دو اوزان دیے گئے ہیں۔ ان کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر رمل کی حد تک اس میں ایک رکن سالم اور تین ارکان مزاحف ہیں۔ جن کی ترتیب الف ب ب ج ہے۔ اور بحر رجز کی حد تک چاروں ارکان مزاحف ہیں۔ جن کی ترتیب الف ب ب یا ج ہے۔ ان اوزان کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلے رکن کا آہنگ۔ آخری رکن کے آہنگ تک دریا کی طرح بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ داخلی طور پر پہلے رکن کا آہنگ دوسرے رکن کے آہنگ سے دوسرے کا تیسرے سے اور تیسرے کا چوتھے رکن کے آہنگ سے اس طرح پیوست ہے۔ کہ یہ ایک نئے آہنگ کی زنجیر سی بنا دیتا ہے۔ اس لئے ان میں بلا کی ہم آہنگی وحدت اور یکسانیت ہے۔ اس لئے ان اوزان میں شکست ناروا کا عیب وارد نہیں ہو سکتا۔ ان اوزان میں حرکت و سکون کی ترتیب اور تسلسل سے جو صوتی لہریں پیدا ہوتی ہیں، وہ بہت تیز ہیں نہ بہت مدھم ہیں۔ بلکہ سنجیدہ رفتار کی خصوصیات کی حامل ہیں۔ ان میں والہانہ پن اور بانکپن کے ساتھ سنجیدگی بھی ہے۔ ایک سادگی و پرکاری کا عالم ہے۔ ان بحور کا اجزائی آہنگ چست سڈول اور ترشا ہوا ہے۔ جو ایک دوسرے سے مل کر دو آتشہ ہو گیا ہے۔ اس لئے ان اوزان میں نشاطیہ اور جنچل جذبات سے زیادہ زندگی کے حقائق اور سنجیدہ افکار کے اظہار کی صلاحیت ہے۔ غالب نے اس زمین میں اور اس وزن میں جتنے شعر کہے ہیں، وہ سب گہرے تفکر اور زندگی کی گہری بصیرت کے مظہر ہیں۔ زیر بحث شعر بھی وجودی فکر کے وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ جس کو اوزان و بحور کا آہنگ ایک ایسی اساس فراہم کرتا ہے، جو ایک جمالیاتی کیفیت اور دوسری طرف زندگی کی گہری بصیرت عطا کرنے میں پوری طرح معاون ہے۔

اس شعر میں الفاظ کا انتخاب اور استعمال مشق اور قادر الکلامی کی بنیاد پر نہیں بلکہ تخلیقی تجربے کی نامیاتی قوت سے وابستہ ہے۔ اس میں طرز بیدل کی پیروی، ژولیدہ بیانی ترکیب تراشی اور پیچیدہ انداز بیان سے انحراف کیا گیا ہے۔ ایک لفظ دوسرے لفظ سے وابستہ ہو کر مصرع کی تشکیل کرتا ہے۔ اور دونوں مصرع مل کر ایک شعر یعنی دلنواز جمالیاتی اکائی کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس شعر میں مناسبت لفظی کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ التزام صنعت گری یا صناعی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ جمالیاتی تجربے سے وابستہ ہے۔ اس شعر میں جام، سرشار، تمنا، دل وغیرہ الفاظ ایک خاص نوعیت کے ہیں۔ جن میں ظاہری ربط کے ساتھ گہرا باطنی ربط ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شاعر نے بیک وقت اظہار کے بہت سے وسیلوں سے کام لیا ہے۔ ایک طرف مفرد اور سلیس الفاظ نیز سادہ و پرکار انداز بیان اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف جام ہر ذرہ اور سرشار تمنا جیسی ترکیبوں سے شعر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں "میں"، جو پس پردہ ہے، اور جس کے قائم مقام کے طور پر "مجھ سے"۔ اور جیسے دو الفاظ برتے گئے ہیں طلسمی فضا کا امین ہے۔ بنیادی طور پر "میں"، خود ذات اور وجود کی علامت ہے جس کا ایک سرا انسان اور دوسرا حقیقت اعلیٰ سے جڑا ہوا ہے۔ اور جس سے شعر میں غیر معمولی معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح "دل" جو سرچشمۂ زندگی ہے۔ اور تصوف کی اصطلاح میں جس کا باطن روح اور ظاہر نفس ہے، ایک طلسمی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ استعارہ در استعارہ اور علامت در علامت کا عالم شعر کو جو حسن اور معنویت عطا کرتا ہے۔ اس کو احاطۂ تحریر میں لانے کا کام نوک خار سے نبض رنگ و بو چھونے کے عمل سے کم نہیں۔ زیر بحث شعر کا پورا دروبست ذہن پر اپنے معنی اور محرکات کا انکشاف مشک نافے کی طرح کرتا ہے۔ اور مسرت کے ساتھ بصیرت عطا کرتا ہے۔ ابتدا میں غالب کے تخلیقی عمل کے بارے میں بعض اشارے کیے تھے یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ شاعر نے تخلیقی عمل کے دوران ذہن کی دونوں قوتوں سے بیک وقت کام لیا ہے۔ ایک طرف اس نے جذبہ کو فکر بنانے (یعنی
کی کوشش کی ہے۔ اور دوسری طرف فکر کو جذبے میں تحلیل کرنے (یعنی
کی بھرپور کوشش ہے۔ شعر میں یہ دونوں قوتیں برسرپیکار نظر آتی ہیں۔ جذبہ فکر میں تحلیل ہو گیا ہے۔ اور فکر جذبہ میں ڈھل گئی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے

ضبط کرنا مشکل ہے۔ اور ادراک، جذباتی نیز تخیلی عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ ساختیاتی غالب کا کمال فن ہے۔ اس جمالیاتی کیفیت کے کرنے سے بیتے ہیں جس سے وجدان متوجہ ہوتا ہے۔ اور جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ نیز شعور کی سطح پر معانی کے انکشاف سے زندگی اور زمانے، حیات اور کائنات، وجود اور وجود کے تعلق سے گہری اور بے کنار بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اس تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) غالب کی اس غزل میں جس کا شعر زیر بحث ہے تخلیقی عمل کی کئی سطحیں ملتی ہیں جن کو صناعی، نیم صناعی، نیم فنکاری اور فنکاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زیر بحث شعر غالب کی فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔

(۲) غالب کے شارحین مولانا آسی اور پروفیسر گیان چند جین نے اس شعر کو پوری طرح واضح نہیں کیا۔ بلکہ غلط بحث کر دیا ہے۔

(۳) اس شعر کا مفہوم بحر کے مختلف معانی ہونے یا دوسرے مصرع میں 'یا' میں کے اختلاف کے باوجود قریب قریب ایک سی رہتا ہے۔ اس شعر کا بنیادی خیال وحدت الوجود سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا موضوع عظمتِ انسان ہے۔

(۴) غالب وحدت الوجود کا بہترین فنکارانہ اور جمالیاتی اظہار شاعری میں تو کرتے ہیں لیکن ان کی نثری تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ وحدت الوجود فلسفے سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ وہ اس فلسفے کے چھ مراتب یا تنزلات میں سے صرف تین کے قائل تھے۔ اس لئے عالم کو معدوم خیال کر کے وحدانیت اور وحدت الوجود کے امتیاز کو نہیں سمجھتے تھے۔

(۵) یہ شعر دو بحروں (بحرِ رمل اور بحرِ رجز) میں تقطیع ہوتا ہے جس کا آہنگ اس خیال، فکر یا فلسفے کے اظہار کے لئے موزوں ہے، جو غالب نے اس شعر میں پیش کیا ہے۔ یعنی اس شعر کا آہنگ بھی الفاظ کے ساتھ تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت سے وابستہ ہے۔ اور الفاظ کی طرح خیال سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

(۶) شعر کی لسانی ساخت سادگی و پرکاری کا آمیزہ ہے جس میں زبان کا تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ غالب نے مفرد، مرکب الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ علامتوں اور استعاروں کے شعری وسیلوں سے بھی کام لیا ہے۔

(۷) غالب کا یہ شعر فنی، عروضی، لسانی اور فکری نیز جمالیاتی اعتبار سے ایک لازوال شعر ہے۔ ❁

بقیہ صفحہ ۶۱ قاتل بارے میں

جلد دیکھتا۔ "قاتلو! واپس جاؤ۔۔۔" اور آج پورے دس برس بعد وہ لوٹ رہا ہے وہاں جہاں سے آیا تھا۔۔۔

اسٹیشن پر ان کے سامان پڑے ہیں۔

گاڑی کا انتظار ہے۔

جہاں وہ کھڑے ہیں، آس پاس کوئی نہیں۔۔۔ وہ سب اکیلے کھڑے ہیں۔۔۔ آج کوئی بھی نزدیک نہیں آ رہا ہے۔۔۔

سب خوف زدہ سے کھڑے ہیں۔

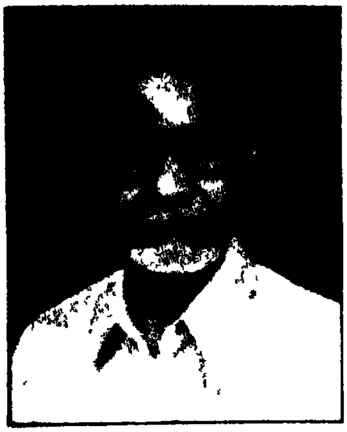
گاڑی آ گئی۔

جوان جلدی جلدی سامان چڑھا رہے ہیں۔۔۔ ان میں سے ایک وہ بھی ہے، لیکن اس کے ہاتھ اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔۔۔ اور جب گاڑی دھیرے دھیرے سرکنے لگی تو ایک لڑکے نے جھکانے نے اسے دیکھ کر تیج سے تھوک دیا۔۔۔ اس نے دیکھا اس کے چہرے پر بھی نفرت کے ویسے ہی تاثرات ہیں جیسے کبھی پتا کے چہرے پر ناراض ہونے پر ہوا کرتے تھے۔

نفرت ملک کی آئی!

دس بارہ سال کے ایک لڑکے نے اس کے ڈبے پر پتھر مارا اور زبان چڑھاتا ہوا بھاگ گیا "قاتل بابا۔۔۔ [illegible]۔۔۔"

اس نے کھڑکی بند کر لی۔ اور سوچنے لگا، آج سے چند سال پہلے جب وہ دشمنوں سے لڑنے سرحد پر جا رہا تھا تو اپنا کے بند کے جھنڈے اور منانے آئے تھے۔ لڑکیاں، جوان پانی کو پوچھتی تھیں۔ اور اسی اسٹیشن پر ایک بوڑھی عورت نے اس کے ہاتھوں پر ایک موڑ رکھ دیا تھا۔ "بیٹے رکھ لو۔۔۔ [illegible]۔۔۔" اس کے بری طرح کانپتے ہاتھ تو اس کو دیکھا تھا۔۔۔ پھر ایک چھوٹا سا بچہ نے اسے راکھی [illegible]۔۔۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور درد نہیں، نفرت آپ سے آپ دھیمی ہو گئی۔۔۔ کانوں میں تیزاب کی طرح زبان چڑھاتے بچے کی آواز گرنے لگی "قاتل جا رہے ہیں۔۔۔ خونی جا رہے ہیں۔" ❁



## فرحت قادری

○

گزر جاؤ کبھی تو دیدۂ الہام سے پہلے
تمہارا نام بھی آئے ہمارے نام سے پہلے

شکستہ سر مطمئن ہیں رخنۂ دیوارِ زنداں سے
خیال افروز کیا ہوں گے کسی الزام سے پہلے

خطائیں کیسے بخشی جا رہی ہیں بے سروپا ہیں
معمّا حل نہیں ہوگا غمِ ایام سے پہلے

اجازت دلزدگی کی تیشہ برداروں کو ملتی ہے
شرارے پوچھ لو جا کر نگاہِ عام سے پہلے

تنک تابی بھی ظلماتِ سحر میں کم نہیں ہوتی
اگر خائف نہ ہو دل لذتِ انجام سے پہلے

○

خطائیں بخش دی جائیں گی ہر انکار سے پہلے
مگر یہ غم نہ جائے گا، ہوگا لطفِ دار سے پہلے

چھپائے مجھ کو اپنے گوشۂ دل میں تو بہتر ہے
مرا اظہار ہوتا ہے ترے اظہار سے پہلے

وہ لذت دو گھڑی گم ہو گئی کم، وحشتِ امکاں
جو ملتی تھی ہمیں ہر لذتِ آزار سے پہلے

گلوں کی آبرو کہتے ہمیں جانِ چمن کہتے
یہ گل بوٹے کہاں تھے گلستاں میں خار سے پہلے

بھٹکتے پھر رہے ہیں وادیٔ لوح و قلم میں وہ
سبق لیتے تھے جو فرحت در و دیوار سے پہلے

○

تمنّا زندہ رہتی ہے [illegible] سے پہلے
[illegible] شامل ہے شعورِ ذات سے پہلے

خشونت کیا عقوبت کیا امکانی لامکانی کیا
بڑھا پائے تمنا سارے امکانات سے پہلے

خلوصِ حسن کا ظرفِ کرم تم ناپ سکتے تھے
ذرا تھمتے ذرا رکتے اگر جذبات سے پہلے

اسے ہر کرب لذت، ہر اذیت شادمانی تھی
زمانہ خون کیوں روتا مرے حالات سے پہلے

اجالوں کو کسی نے کب سمیٹا اپنی آنکھوں میں
سحر تو آئی تھی فرحت اندھیری رات سے پہلے

● ... سبو بھر گیا دہار




## تسکین زیدی

بزم خضر راہ، ۷۴۰/۱۲/۵، گوالٹولی، کانپور-۱ (یو۔پی)


# ایک ہی گلاس

رحیم الدین سہما ہوا، سکڑا ہوا چلتی ہوئی ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے کی برتھ پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے اس کی برقعہ پوش بیوی کو گھور رہے ہیں۔ ان کی اس حرکت پر وہ دل ہی دل میں چراغ پا ہو رہا ہے لیکن خاموش ہے۔

سامنے بیٹھے ہوئے کالج کے لڑکے آپس میں خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھی اس کی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ لڑکوں کی بائیں جانب سیٹ پر کوئی پنڈت جی بیٹھے ہیں جن کا رخ بالکل رحیم الدین کے سامنے ہے۔ ان کے ماتھے پر تلک کا پیلا نشان ہے جب کہ رحیم الدین کے ماتھے پر سجدے کا نشان ہے۔

رحیم الدین اپنی بیوی، بچی اور لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا تو ان دونوں سیٹوں پر ملٹری کے جوان لیٹے ہوئے تھے اور اسے کوئی بھی جگہ دینے کو تیار نہیں تھا۔

"جاؤ بابا! اگلا ڈبہ دیکھو" کی آوازیں ایک ساتھ ابھری تھیں۔ "تھوڑی سی جگہ دے دیں مہربانی ہوگی۔ میں اگلے اسٹیشن پر ڈبہ بدل لوں گا" اس نے انتہائی لجاجت سے کہا تھا۔

اسی وقت یہ تینوں لڑکے آگئے تھے۔ انہوں نے پتہ نہیں کیا بات ان سے کی کہ وہ فوجی جوان ایک طرف کونے میں سمٹ گئے۔ اور اس طرح اسے جگہ مل گئی۔ پھر یہ جوان اوپر کی برتھ پر جا کر بیٹھ گئے جہاں کہ پہلے سے ہی دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ آپس میں کہنے لگے "بیٹھ جانے دو یار۔ رات ہوتے ہی یہ لوگ اتر جائیں گے اور ہم پھر نیچے لیٹ جائیں گے۔"

اگلے اسٹیشن پر پنڈت جی اور سردار جی بھی آگئے۔ ان لڑکوں نے دونوں کو بٹھا لیا۔

اس وقت اس چھوٹے سے گوشے میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اور سب اپنے اپنے گروپ میں باتیں کرنے میں مگن تھے۔

سردار جی اور پنڈت جی کسی مسئلے پر بحث کرنے میں الجھے تھے۔ کبھی کبھار دونوں رحیم الدین کی بیوی کی جانب دیکھ کر مسکرا دیتے اور بڑبڑانے لگتے جیسے کہہ رہے ہوں کیا عجوبہ ہے؟

لڑکوں کی بات چیت سے رحیم الدین کو ان کے نام معلوم ہوئے اور اس نے ان کو غور سے دیکھا۔ لمبے قد اور الجھے بال والے کا نام راجیندر سنہا، گھنی مونچھوں اور فرنچ کٹ داڑھی والا ارلم کمار سونکر، چوڑے سینے اور چھوٹے قد والا اشوک کمار یادو ہے۔ تینوں ہم جماعت اور ہوسٹل فیلو لگتے ہیں جبھی بے تکلفی سے یار یار کہہ کر ایک دوسرے کو مخاطب کر رہے ہیں۔ پنڈت جی اور سردار جی کہنے لگے "ہم لوگ کہاں پھنس گئے۔ ان لڑکوں کی باتیں بے سر پیر کی ہیں۔ ان کے سوچنے اور اظہار کا طریقہ بھی ہم سے جدا ہے۔ نئی نسل ہے نا۔ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ کبھی فلموں پر کبھی کرکٹ پر اور کبھی سیاست پر باتیں کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اکیسویں صدی کی فکر ہے۔ ہر پارٹی ان کے ذریعہ جنتا کا شوشن کر رہی ہے۔ ہر دل اپنے ساتھ لوگوں کو لیے آندولن کر رہا ہے دھرنا دے رہا ہے۔"

"سردار جی! کبھی آپ سوچ سکتے تھے کہ آپ کے پاس سونکر اور یادو بیٹھے بے شرمی سے باتیں کریں گے اور ہماری برابری کریں گے۔ ہمارے گاؤں میں تو اب بھی ان کی بستی الگ ہے۔" پنڈت جی نے طنز کیا۔

سردار جی بھی بول اٹھے "پنڈت جی۔ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں انہونی باتیں ہوں گی بادشاہو۔ اب تو پیسہ دیکھا جاوے ہے جات نہیں۔"

رحیم الدین سوچنے لگا "یہ لوگ کہتے تو ٹھیک ہیں۔ آج جیسے

پاس پیسہ ہے وہ بڑی ذات کا بن بیٹھا ہے اور بڑی ذات والے اب ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی چوکیداری کر رہے ہیں۔

دوسری طرف سونکر، یادو سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو یار اشوک! اس پنڈت کے ماتھے کے تلک کو۔ کیا ڈھونگ رچاتے ہیں یہ لوگ۔ یہ سب دکھاوا ہے من اُن کا ہمیشہ میلا رہتا ہے اور پیٹ خالی۔ ہمیشہ اونچ نیچ کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں نے گاؤں میں میرے بابا کا جھونپڑا جلا دیا تھا۔ اک ذرا سی بھول تھی کہ وہ مندر میں جل چڑھانے بنا پنڈت جی کی آگیا کے چلے گئے تھے اور بستی کے کنویں سے جل بھرنا چاہا تھا اور یہاں یہ کیسا سیدھا اور سادہ لوح بنا بیٹھا ہے، میرا بس چلے تو ان جیسوں کو گولی سے اڑا دوں۔

"یار تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی ان کے بارے میں ایسا ہی وچار ہے۔" رحیم الدین لڑکوں کی باتیں سن کر مسکرا دیا۔ اس کا دھیان تو شادی کے ہنگاموں کی طرف تھا۔ وہ کارخانے سے چھٹی لے کر اپنے سالے کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں جا رہا تھا۔ وہاں ایسے موقعوں پر بڑا ہنگامہ رہتا ہے پرانے دوست احباب اور عزیزوں سے مل کر دل خوش ہو جاتا ہے سسرال والے اس کی کتنی خاطر کرتے ہیں۔ رات میں کوئی سونے ہی نہیں دیتا۔ عورتوں کے گانوں کی آواز اور ڈھولک کی تھاپ بھلا کسے چین لینے دیتی ہے۔

"اری ہٹ منی! کب تک تو مجھے چوستی رہے گی۔" اس کی بیوی کی ہلکی سی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ بچّی کو گود میں لیے دودھ پلا رہی تھی برقعہ سے اپنے جسم کو چھپائے ہوئے اور سامنے بیٹھے لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے۔ پاس ہی اس کا نوعمر لڑکا بیٹھا ان لڑکوں کی باتوں کو بڑی دل چسپی سے سن رہا تھا۔ رحیم الدین سوچنے لگا کہ وہ یہاں بیٹھا ہی کیوں؟ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک بدمعاش موجود ہے۔ اس پنڈت کی نظریں اس کی بیوی پر ہی کیوں ہیں جب اس نے بچے کو دودھ پلانے کے لیے سینہ کھولا تو پنڈت جی کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ یہ ناپ کے لڑکے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ پنڈت اوپر سے جتنے سیدھے لگتے ہیں اندر سے ان کا من اتنا ہی گندہ ہوتا ہے۔ یہ فوجی جوان بھی بڑے رنگیلے لگتے ہیں ان کے پاس سے تمرا ب کی بو آ رہی ہے اگر انہوں نے اس کی بیوی سے کوئی چھیڑ خانی کی تو کیا ہوگا؟ خواہ مخواہ جھگڑا ہو جائے گا۔ نہیں۔ نہیں وہ اگلے اسٹیشن پر دوسرے ڈبّے میں بیٹھ جائے گا۔ ان لفنگوں کے ساتھ نہیں رہے گا یہ لوگ دوسرے کو بھی اپنی صحبت اور نازیبا حرکتوں سے خراب کر دیں گے۔ اور یہ سردار بھی کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے، کنکھیوں سے اس کی بیوی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لڑکے پھر کسی بحث میں الجھ گئے۔ اب کسی فلم پر چرچا ہو رہی ہے۔

پہلے ایشا بھ اور ریکھا کی محبت سے لے کر جھگڑے تک کا ذکر ہوا اور اب یہ چھوکرے سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن کے مسئلے پر الجھ رہے ہیں۔ سنہا کہہ رہا ہے کہ قابلیت ہی سلیکشن کا معیار ہونا چاہیے کم لیاقت والوں کو پچھڑی ذات کا ہونے پر فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ جب کہ یادو اور سونکر ریزرویشن کی پُر زور حمایت کر رہے ہیں۔

رحیم الدین نے منہ بنایا اور بڑبڑایا۔ انہیں اس مہنگائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ والدین کا روپیہ ہوسٹلوں میں عیش و مستی میں برباد کر رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے کاندھوں پر ہندوستان کا مستقبل ہے، یہی اکیسویں صدی کے نگہبان اور معمار ہیں۔ میرا انور کتنا سیدھا ہے میں نے اچھا ہی کیا کہ اس کو انگریزی تعلیم کے لیے کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخل نہیں کرایا۔ ابا جان ہم سے کہا کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم ہمارے مذہب اور تہذیب کا ستیاناس کر دے گی۔ اب یہی ہو رہا ہے۔

پنڈت جی اور سردار جی پھر گھسر پھسر کرنے لگے۔ رحیم الدین نے کان لگا کر سنا۔ پنڈت جی اس کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہے تھے۔ "یہ لوگ اپنے آپ کو اقلیت اقلیت کہہ کر خوب شور مچاتے ہیں فساد میں خود گھروں کو جلاتے ہیں اور الزام ہم پر آتا ہے۔ فیملی پلاننگ میں بھی اکثریت ہماری ہے اور یہ لوگ برائے نام ہی اس طرف آتے ہیں یہ تو بچے پیدا کر کر کے اپنی آبادی بڑھائے جا رہے ہیں۔ دس سالوں میں ان کی آبادی ہم سے بھی زیادہ ہو جائے گی تب ہم اقلیت میں اور یہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ مگر بھائی ان کی عورتیں ہوتی بہت خوبصورت ہیں۔ سامنے والی عورت کی عمر خاصی ہے لیکن پھر بھی خوبصورتی برقرار ہے۔ ان کا سے

برقعوں میں تو ان کا حسن اور بھی نکھر جاتا ہے، اپنے یہاں تو پردے کا رواج نہیں۔ یہ حسن تو پردے کے پیچھے ہی اچھا لگتا ہے، اپنی ایک جھلک سے دوسروں کو گرمانا اور تجسس پیدا کرنا۔

سردار جی نے "ٹھیک کہو ہو بادشاہو" کہہ کر قہقہہ لگایا اور ٹرین کے باہر دیکھنے لگے۔ لڑکوں نے بھی کسی بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔ جو فضا میں گونج کر رہ گیا۔ پنڈت جی یہ کہتے ہوئے باتھ روم کی طرف چل دیے "میں ابھی آیا۔ دیکھو میری سیٹ پر کوئی نہ بیٹھے"

سردار جی۔ رحیم الدین کو دیکھ کر مسکرا دیے اور بولے۔ اُن کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ یہ لوگ ڈھونگی ہیں۔ ہم تم تو بھائی بھائی ہیں ہماری زبان ایک، کھانا پینا ایک ہے۔ گرو جی اور بابا فرید کی بانی ایک ہے۔ حالیہ فساد میں ہم کتنے اجاڑے گئے کتنے برباد ہوئے۔ سارے کاروبار چوپٹ ہو گئے۔ میں ابھی دلی سے آرہا ہوں بھائی صاحب کیا بتاؤں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا۔"

رحیم الدین دونوں کی باتوں پر غور کرنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پنڈت جی ٹھیک کہہ رہے تھے یا سردار جی۔ پنڈت جی اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔ ٹرین ایک جگہ رُکی۔ تبھی سردار جی نے چونک کر پوچھا اور اپنا صافہ درست کیا۔ "کیا لدھیانہ آگیا جی"؟ پنڈت جی نے باہر جھانک کر دیکھا اور بولے "ابھی نہیں سردار جی"۔

اوپر کی برتھوں پر چاروں طرف فوجی جوان رَم کی بوتلوں سے شغل کر رہے تھے نیچے بیٹھے لڑکے انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کہنا چاہتے ہوں کچھ ادھر بھی۔

ایک فوجی نے ان سے پوچھا۔ کیا آپ لوگ شوق کرتے ہیں"؟

سنہا اور یادو نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ کبھی کبھی پی لیتے ہیں مگر آپ لوگ تو صرف اپنے لیے ہی لائے ہوں گے؟"

فوجی نے مسکراتے ہوئے کہا "ارے ہم لوگ تو چھٹیاں گذارنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ ہمیں تو گھر جانے کے لیے کافی بوتلیں ملی ہیں گھر جا کر بوتلیں ہی تو خالی کرنی ہیں اور وہاں کیا کام ہے"

اور انہوں نے اوپر سے ایک بوتل سنہا کے ہاتھ میں تھما دی اُن کے دل خوشی سے جھوم اُٹھے۔ سردار جی اور پنڈت جی بھی اپنی باری کا انتظار کرنے لگے مگر اُن لڑکوں سے مانگنے کی ہمت نہ کر سکے

اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی، ایسے ہی موسم میں تو پینے پلانے کا مزا ہوتا ہے۔

سنہا نے اس فوجی سے کہا۔ ہم اتنے عادی نہیں ہیں جتنے آپ لوگ ہم تو ہوسٹلوں کے کمروں میں بند ہو کر تھوڑا تھوڑا پانی یا سوڈا ملا کر ہی پیتے ہیں۔

کیا آپ کے پاس گلاس ہوگا؟

"نہیں" "ارے یار۔ آج ایسے ہی پی جاؤ۔ دیکھو اس ولایتی شراب کا مزا، آتما خوش ہو جائے گی"

یادو اور سونکر نے سنہا کی طرف دیکھا اور کہا "کیا ایسے ہی چلے گی؟"

"نہیں بھائی! ۔کہیں سے پانی لیا جائے ۔گلاس ڈھونڈا جائے"

سنہا نے کہا۔ اور پھر سارے ڈبے میں گلاس تلاش کیا گیا لیکن گلاس کہیں نہیں ملا۔ اب ان کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ سونکر کے ہاتھ میں کہیں سے ایک ٹوٹا ہوا آب خوردہ آگیا اور وہ اسے بوتل کے قریب لایا مگر اس میں کچھ ٹوٹی ہوئی بیڑیاں اور بجی ہوئی چائے پڑی تھی۔ اس کی طبیعت متلا گئی اور اس نے اسے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ پھر تھوڑی سی رَم ہتھیلی میں انڈیل کر زبان سے لگائی۔ اسے اپنی زبان جلتی ہوئی معلوم ہونے لگی، اس نے اپنا ہاتھ زمین پر جھٹک دیا اور بوتل کا کارگ بند کر دیا۔ سامنے بیٹھے ہوئے رحیم الدین کی باسکٹ میں سے المونیم کا ٹونٹی دار لوٹا اور اس پہ ڈھکا گلاس جھانک رہا تھا۔

سونکر نے سنہا کو اس طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ سنہا بہت بے باک لڑکا تھا مگر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ رحیم الدین سے اس کا گلاس اس کام کے لیے مانگے۔

اس کی بیوی کی آنکھیں سیاہ برقعہ کی سفید جالی سے انھیں گھور رہی تھیں جیسے کہنا چاہتی ہوں۔ لڑکو! ہم لوگوں کے سامنے پیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی، مگر لڑکے اس تمام ماحول سے بے پرواہ تھے، اُن کی تشنگی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی اور بغیر پانی کے وہ پی نہیں سکتے تھے۔

یکایک سنہا کی نظریں رحیم الدین کے لڑکے سے ٹکرا گئیں جو اسے دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

اب سنہا نے ہمت کر کے رحیم الدین سے کہا۔ "بڑے صاحب

کیا آپ کا گلاس مل سکے گا؟ تھوڑی دیر کے لیے دے دیں۔ ہم اسے اچھی طرح صاف کر کے آپ کو لوٹا دیں گے۔

رحیم الدین ان لڑکوں کی جسارت پر متحیر رہ گیا اور خالی خالی آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگا۔ اور سوچنے لگا: ان کے گلاس میں یہ شراب پئیں گے پھر اسی میں وہ پانی پئے گا اس کا ایمان تو جل ہی جائے گا۔ وہ قدرے غصیلے لہجے میں بولا،

"کیا بکتے ہو۔ مانگنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تم نہیں جانتے ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے"۔

"چھین لو گلاس۔ پوچھنے کی کیا ضرورت۔ ہے" موہن کرے حقے سے کہا۔ اس کا دل چاہا بڑھ کر موہن کر اور سہنا کا منہ توڑ دے، وہ ان سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ٹرین کے چلنے کی چھک چھک میں اس کے لفظ ڈوب گئے۔ تنہائی کے احساس نے اس کی ہمت توڑ دی، وہ سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے، وہ تنہا ہے اور یہ اتنے سارے۔ پھر گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں سوالیہ انداز میں دیکھا۔ کچھ اشارہ پا کر اور کسی خوف کے احساس سے اس نے بے دلی سے اپنا گلاس ان کی طرف بڑھا دیا اور بولا کیا پانی بھی چاہیے؟ پانی پینا ہو تو لوٹا لے لو۔

ہاں۔ ہاں۔ تھوڑا سا پانی بھی دے دیں۔ ہم آپ کے آبھاری رہیں گے۔ سہنا نے انکساری سے کہا۔

اور رحیم الدین نے اپنا لوٹا بھی اُدھر بڑھا دیا۔

پھر تینوں اسی گلاس سے پانی ملا ملا کر پینے لگے اور رحیم الدین کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگے جو دل ہی دل میں لاحول پڑھ رہا تھا۔

پنڈت جی جو بظاہر اس جگہ پینے کے خلاف تھے اس گلاس سے پینے پر اور بھی برہم نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ لڑکے اس گلاس سے پی کر اپنا دھرم بھرشٹ کر رہے ہیں۔ مگر رم سے ان کو بھی پیار تھا۔ کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں چل جاتی ہے گھر والوں سے چھپا کر۔ مگر اصلی رم ملتی ہی کہاں ہے؟ اس کا مزا چکھنے کے لیے وہ بھی بے تاب تھے۔ مگر اس گلاس سے ان کو گھن آ رہی تھی۔

سردار جی کو سہنا نے تھوڑی سی گلاس میں دے دی اور وہ بھی پی کر جھوم اٹھے۔ کوئی شعر گنگنانے لگے "کیا بڑھیا رم ہے مزا آ گیا۔ جیتے رہو پتر"۔ سہنا پھر پنڈت جی کی طرف دیکھ کر مسکرا کے "ارے پنڈت جی نیک کام میں دیر کیا"۔ اور لڑکوں نے بولے "تو بھی آپ بھی تھوڑی سی"۔

پنڈت جی نے دل ہی دل میں رام۔ رام کرتے ہوئے رم کی کشش سے مجبور ہو کر جھوٹے گلاس کو بے تابی سے منہ سے لگا لیا۔

آج رحیم کو اپنا یہ گلاس بڑا خوبصورت لگ رہا تھا جس نے اونچ نیچ۔ نفرت اور کدورت کی ساری دیواریں گرا دی تھیں اور سب ایک ہی ساغر سے پی رہے تھے اور ریل گاڑی بھی چھک چھک کرتی جھومتی گاتی کسی مست شرابی کی طرح اپنی منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔

بقیہ صفحہ ۲۷ زخم اندر زخم باہر

رہی ہے۔

اسد کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر اس کی قمیض کے دامن پر دھبا لگاتا ہوا قالین پر گر گیا وہ پلیٹ رکھ کر ٹشو پیپر سے دھبہ صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا اس کی انگلیاں مرغی کے شوربے میں سنی ہوئی تھیں۔ ریحانہ کا بیٹا برابر شرارتیں کئے جا رہا تھا۔ اس نے کھانا کھاتے کھاتے ایک دم ٹرانسسٹر پھر پورے والیوم سے کھول دیا۔ خبریں آ رہی تھیں۔

آج افغانستان نے پاکستانی سرحد کی ۲۳۹ ویں مرتبہ خلاف ورزی کی انہوں نے پاکستان کے سرحدی علاقے میں کئی میل اندر آ کر گن شپ سے راکٹ برسائے جن میں دو افراد شہید ہو گئے اور کئی لوگ جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں۔ زخمی ہو گئے۔ گولیاں برسا کر ان کا ہیلی کاپٹر اپنی سرحد کی طرف بھاگ گیا"۔ منیر قادر نے جھنجلا کر زور سے کہا۔ "دیکھا! بھاگ گیا نا"۔ اور رستے ہوئے مرغی کے سالن میں سنی ہوئی انگلیاں مرے لے کر چاٹنے لگا۔

بقیہ صفحہ ۵۴ روبرو

وہ دم بخود رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ وہ خود تھا۔

لیکن آج، وہ ہزاروں کی بھیڑ میں، بھرے پُرے بازار میں، جیتی جاگتی شاہراہوں پر کھلے آسمان کے نیچے بارونق بستیوں کے بیچ جس کو جب چاہتا ہے قتل کر دیتا ہے اور کوئی اسے نہیں دیکھتا وہ روشن دان کھول کر کھڑکیوں سے ہٹ ہٹا کر پردے سرکا کر تلاش کرتا ہے کہ کوئی تو ایسا مل جائے جس نے اس کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہو۔ مگر کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اسے لگتا ہے کہ ہر طرف سناٹا ہے اور اس کے اطراف کے تمام لوگ مر چکے ہیں۔

جب اپنے اطراف کے سارے کے سارے لوگ مر جائیں تو انسان کس قدر اکیلا ہو جاتا ہے۔




فرحت جہاں

کوٹھی - ای - ۶۴۰ - عیدگاہ ہلز - بھوپال


# روبرو

اپنے پہلے قتل کے بعد ایک ایک بات اسے یاد تھی۔ کیسے اس نے گردن کاٹی اور پھر کس طرح وہ کانپ اُٹھا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سامنے والے کی گردن ڈھلک گئی ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھر گئی ہیں۔ سانس کی ڈوری اور تمام حیات کے تار تو اس طرح ٹوٹ گئے ہیں۔ جیسے کوئی شیشہ گرے اور چور چور ہو جائے اور پھر اپنی شکل میں کبھی نہ آئے۔ ایک آن میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ادھ کھلے منہ میں سے اس کے پارٹنر کی زبان نکلی پڑ رہی تھی۔ اگر مرتے مرتے اس کے اندر تھوڑی سی بھی بولنے کی طاقت ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر مجھے گندی گالیاں ضرور دیتا اور گالی کا ڈنک کچھ اس طرح میرے اندر پیوست ہوتا کہ کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ لیکن شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہی ختم ہو گیا۔ کتنی دوڑ دھوپ کے بعد اتنا تیز زہر ملا تھا۔ مرتے مرتے بھی وہ اس کی نظروں میں دوست ہی بنا رہا یہ سوچتے ہوئے اسے بہت سکون ملا۔ پھر اس نے خیال کی جست لگائی اور وہ زندگی کی رنگین تصویریں دیکھنے میں گم ہو گیا۔ تصویر کا ہر رُخ اسے لذتوں سے ہمکنار کر رہا تھا۔ بزنس کا سارا پرافٹ اب اس کے پاس آئے گا۔ پارٹنرشپ ختم ہو گئی۔ پارٹنر موت کی نیند سو گیا۔ لیکن۔ لیکن۔ روپیہ دھیرے دھیرے میرے پاس بھی بہت ہو جاتا۔ آدھا پرافٹ بھی تو کم نہ تھا۔ خاموشی کی تہوں میں اس کا مجرمانہ احساس ایک دم سے اس کی طرف جھپٹا۔ اس سے بچتے ہوئے وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ انتظار۔ انتظار کے معنی ہیں وقت۔ اور وقت ہے کہاں؟ کس پل بھی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ سوتے میں یا جاگتے میں۔ چلتے میں یا بیٹھا رہنے میں، دھماکے، میزائل، نیپام بم، ایٹمی تجربے، دنگے فساد، جلتے ہوئے مکانات جلتے ہوئے گلی کوچے۔ کٹی پھٹی لاشیں اور پھر مسموم ہوتی فضا بھی لا اعتبار ہو گئی ہے اب۔ نرم مٹی پہ کھلتے کھلتے گلاب ایک دم سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہیں ایسا تو نہیں۔ چاروں سمت ہی ایسا ہو رہا ہے۔ انسان ایک دوسرے کو تہ تیغ کرنے میں مصروف ہے۔ بھری پُری سڑکوں پر، خوبصورت چوراہوں پر، گھروں کی دہلیز پر، سیاست کی کرسیوں پر، برس کی منڈیوں میں، ہر طرف یہ کھیل ہو رہا ہے۔ اور جو لوگ قتل نہیں کر پاتے وہ اپنے خیالوں ہی میں سہی دن تمام کتنوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ بغیر چیخے اور بغیر کسی آواز کے پھر میں الجھ کیسے ہوا۔؟ یہ سوچتے ہی اطمینان کی لہر اس کے اندر دوڑنے لگی۔ اس نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کی۔ جب اس کے پارٹنر میں اب اتنی سکت بھی نہیں ہے کہ وہ سوٹ کا بٹن جو کاج میں اٹک گیا ہے وہ اسے کھول لے یا بند کرے۔ شاید وہ اسے کھولنا چاہتا ہو یا پھر بند کرنا چاہتا ہو لیکن اب وہ اپنی مرضی کا مالک نہیں رہا۔ وہ دوسروں کے کندھوں کا محتاج ہے اپنی آخری آرام گاہ تک جانے کیلئے۔

وہ زیرِ لب مسکرایا اور پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بدبدانے لگا "کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور سب کام بخیر و خوبی ہو گئے۔ نہ گواہ نہ شہادت" اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ سکون اور طمانیت کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لینے لگا۔ خوشی کے دائرے میں چکر لگاتے ہوئے اچانک اس کا دل زور سے دھڑکا اس دھڑکن نے اس کی خوشی پہ اس زور کا جھپٹا مارا کہ یک بارگی اس کا سارا وجود جھنجھنا اٹھا اس نے سوچا کہیں کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑ گئی ہو۔ خوف کا حصار چاروں طرف سے اس کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بڑھا۔

ہوسکتا ہے راستے میں کسی نے اُسے دیکھ لیا ہو۔ کسی بھی نگاہ نے۔ آج جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا تو سیڑھیاں چڑھتے دروازہ کھولتے ہوئے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو۔ جیسے ہی یہ خیال آیا حلق میں کانٹے پڑنے لگے وہ اٹھا اور کمرے کا طواف کرنے لگا۔ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی، اور منہ سے لگا کر غٹا غٹ پانی پی گیا۔ لیکن حلق کے کانٹوں میں کمی نہیں آئی۔ اپنے اندر سے اٹھنے والے متضاد جذبات سے بے چین ہو کر اس نے پھر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ بلب ایک ایک کونے پر نگاہ گڑنے لگی، آنکھیں ابلنے لگیں لیکن کمرے میں سوا اس کے کوئی اور نہیں تھا یا پھر اس کے پارٹنر کی سرد لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی ایک بار پھر طمانیت کی لہر سی اس کے اندر دوڑ گئی۔ نہیں کسی دریچے میں سے کسی نے دیکھا ہو... ایسا ہو... سوچ۔ چند لمحوں بعد پھر اسے بے چین کر دیا۔ خوف زدہ آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں اوپر نیچے گردش کرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا وہ کھڑکی تک گیا ایک ذرا کھول کر باہر جھانکا۔ خاموش رات دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سڑکیں اونگھ رہی تھیں۔ نہ موٹر گاڑیاں، نہ لوگوں کا ہجوم لوگ جیسے کہیں نہیں تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سڑکیں صدیوں سے یونہی ویران پڑی ہیں جیسے ان سڑکوں پر کوئی چلا ہی نہ ہو۔ کوئی شخص کسی عمارت میں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر بڑے شہروں میں لوگ اس طرح رہتے ہیں۔ ایک ایک سے نا آشنا۔ نہیں ملتے۔ خواہشات کا جگر اور اس کے گرد چکر پھیریاں۔ کہیں گلی سے کتوں کے لڑنے کی آوازیں آئیں اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن وہ آپس میں لڑ رہے تھے بالکل انسانوں کی طرح۔ ملٹی اسٹوری بلڈنگیں سکوت کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں کہیں کہیں کھڑکیوں کے پٹ آدھ کھلے تھے اور زیرو پاور کے بلب اس میں جلتے ہوئے نظر آ رہے تھے لوگ اپنے آپ سے راہ فرار اختیار کر کے نیندوں نیند جانے کن انجانے سفر میں بھٹک رہے ہوں گے اس نے سوچا۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو رات گئے دروازہ پر آنکھیں گڑائے۔ لیکن رات کہیں خوابوں کے پیکر میں ڈھلتی ہے تو کہیں خواب نہ دیکھنے کی ضد میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹتی ہے۔ اگر کوئی سویا ہی نہ ہو تو۔ جاگ رہا ہو۔ یا سو کر بھی بیدار ہو۔ کچھ لوگ سو سکتے ہیں نہ جاگ سکتے ہیں خوشی اور غم سے بے تعلق ہو کر اندھیرے اجالے میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا شخص۔

کسی کے دیکھے جانے کے خوف سے وہ پھر کانپ اٹھا۔ کپکپی سی آگئی اسے۔ اندیشے ایک بار چاروں طرف سے پھنکارنے لگے احساس کا الاؤ جو دہکا تو ہتھکڑی، جیل اور پھانسی کا پھندا گلے میں کسنے لگا۔ وہ خود اپنے خیالوں سے ٹکرانے لگا۔ اس ساعت وہ اپنے آپ میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا ماضی کی کوئی حسین یاد۔ پُر مسرت لمحہ۔ عورت کا قرب، لبوں کی پنکھڑیاں، کمر کا لوچ، بازوؤں کی چکناہٹ، کہیں نرم نرم جذبات حقیقت کی بھٹی میں بھاپ بن کر اڑنے لگے۔ موجودہ لمحے نے اس کو اپنے میں گھسیٹ لیا۔ اپنے خوبصورت آرام دہ ڈرائنگ روم میں ہوتے ہوئے بھی اسے یوں لگا جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں آبلہ پا کھڑا ہو۔ اور نس نس سے لہو بہہ رہا ہو۔ ہر لمحہ اس کے احساس کو زدوکوب کرنے لگا۔ وہ جیسے اٹھا۔ اور دروازہ میں لگے تالے کو گھما کر دیکھا۔ کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر ایک بار پھر برابر کئے کہیں کوئی روزن نہ رہ گیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے کھڑکی کے پاس گیا۔ پٹ کھول کر باہر کی جانب دیکھا تھوڑا سا جھکا۔ سرد ہوا کے جھونکے سے اس کا جسم کپکپا اٹھا۔ لیکن کھال کے اندر کی تپش بڑھنے لگی۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر اوپر نظر ڈالی۔ آسمان پہ ستارے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی اور کچھ چہل پہل نظر آئی۔ دودھ سے بھرے ڈبوں کی موٹر سڑک سے گذری، روشنی دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہاں، ہاں، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ کسی نے نہیں دیکھا مجھے۔ اس نے چہرہ سے پسینہ پونچھا۔ ہر کام بخیر وخوبی ہو گیا۔ لیکن کھڑکی کی دریچہ سے باہر دیکھتے دیکھتے جیسے ہی اس کی نگاہ پلٹی تو کمرے میں کوئی اسے کھڑا نظر آیا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کون ہے؟۔ بڑی مشکل سے اس کے نرخرے سے آواز نکلی۔ لیکن کوئی آواز جواب میں نہیں ابھری۔ کمرے کے سرے پر اس نے گھبرا کے دیکھا۔ وہاں بھی اسے کوئی کھڑا نظر آیا۔ خشک گلے سے بمشکل اس نے آواز نکالی کون ہے؟۔ لیکن پھر بھی کوئی آواز جواب میں نہیں ابھری خوف کی لہر اس کے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں پھر اُن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو غور سے دیکھا اور پتھر کے مجسمہ کی طرح

[باقی صفحہ ۷۵ پر دیکھئے]



# مرتضیٰ علی شاد

ہر نئی تخلیق کا پہلے تو پس منظر ملے
پھر نظر کو جسم، احساسات کو پیکر ملے

اب نہ گلیوں میں تماشہ تھا، نہ جادوگر ملے
ہاں مگر اُجڑے مکاں، ویران بام و در ملے

خواہشوں کی دُھول آنکھوں میں لئے پھرتے رہو
کیا عجب اِن راستوں میں کوئی خوش منظر ملے

وہ تو اک حرفِ دعا کے ماسوا کچھ بھی نہ تھا
پھر اُسے کس جُرم کی پاداش میں پتھر ملے

زرد موسم کی ہوا تیزاب سے کچھ کم نہ تھی
تُو ملا تو سُوکھتے پیڑوں کو برگِ تر ملے

وہ تو مٹی کے پرندے ہی بناتا رہ گیا
کھیلتے بچوں کو راہوں میں پڑے شہپر ملے

گُل قبا، خوشبو بدن لوگو، یہ کیا گزری کہو
ہم کو پھولوں کے نگر میں ہر طرف خنجر ملے

اُسے غرور بدلتی رفاقتوں کا تھا
ہمیں بھی پاس کچھ اپنی روایتوں کا تھا

نہ جانے کیا ہوا بستی کے لوگ برف ہوئے
ابھی سروں پہ تو موسم تمازتوں کا تھا

صبا کے ہاتھوں پہ لکھے پھر حروفِ دعا
بلا سے قحط زمیں پر سماعتوں کا تھا

صلیبِ ذات پہ لٹکا ہوا ہر اک چہرہ
جو پڑھ سکو تو برہنہ صداقتوں کا تھا

وہ حرفِ گویا کی مانند بولتا کیسے
مگر نگاہ کا لہجہ عبارتوں کا تھا

یہ کربِ خانہ بدوشی، یہ ہجرتیں اپنی
یہ بارِ دوش گذشتہ امانتوں کا تھا

کوئی سمجھ نہ سکا اور سخن تمام ہوا
یہ معجزہ بھی غزل کی علامتوں کا تھا

پھر اچانک نطق و لب کا رابطہ گم ہو گیا
تو ملا تو اعتبارِ مُدعا گم ہو گیا

جب انا جاگی تو ہر دستِ عطا گم ہو گیا
ہونٹ کھولے بھی نہ تھے، حرفِ دعا گم ہو گیا

اُس کو بھی شاید کسی اندھی گلی نے ڈس لیا
بھیڑ میں اک شخص تھا سہما ہوا، گم ہو گیا

کس طرف جائیں، کسے آواز دیں، کس سے ملیں
مصلحت کے شہر میں ہر آشنا گم ہو گیا

اب شکم سے سوچئے، پیروں سے دیکھا کیجئے
دوش پر جو بار تھا وہ حق نوا گم ہو گیا

مکان نمبر ۲ ، سیفیہ کالج روڈ، بھوپال





## عشرت بیتاب

جہانگیری محلہ ، رب کدہ ، آسنسول


# ریت پر اُگا ہُوا گلاب

للّن کا اداس اداس چہرہ میری آنکھوں میں سما گیا تھا جیسے وہ جوانی ہی میں بڑھاپے کی منزل کو پہنچ گیا ہو۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ جیسے پیاس کو ترس ترس رہے ہوں۔ للّن کی قربت کا نامعلوم احساس میرے جسم و جان سے ایک جھٹکے کے ساتھ ... دنیا میں اس کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا — مغائرت ، بے توجہی جیسے اپنی ہی کوئی پہچان اس کے پاس نہ ہو۔ ہر وقت اداسی ہی چھائی رہتی مجھے اس کی آنکھوں میں بے چینیوں کی لہریں موجزن نظر آتیں جیسے اسے کسی شئے کی تلاش ہو ، کوئی چیز کہیں بھول گیا ہو ، کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ جیسے ابھی کوئی ساتھ تھا ، پھر الگ ہو گیا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے تلاش اس کا مقدر بن گئی ہو۔ کسی اجنبی شئے کی تلاش جو شاید گم ہو گئی ہو لیکن مل جانے کی امید بھی نہ ہو۔

وہ میرا ہم عمر اور ہم پیشہ تھا یوں تو اس کا نام لال چند تھا لیکن لوگ اسے للّن ہی پکارتے۔ وہ انگریزی ادب میں ایم اے تھا لیکن ملازمت ایک سرکاری پرائمری اسکول میں کر رہا تھا۔ اکثر وہ اپنی قسمت کو کوستا ، بھگوان کے انصاف کو جھنجھوڑتا — لیکن کیا ملتا — سوائے ورثہ میں ملی ہوئی نیچ ذات کی ملامت کے جس میں وہ پلا — بڑھا — اور جوان ہوا —

اس کے پتا جی ریلوے کے ایک معمولی ملازم تھے آٹھ گھنٹوں کی جان لیوا محنت و مشقت کے عوض سوائے دو وقت کی روٹی کے کچھ نہ پا سکا — ماں نے تو دس سال کی عمر ہی میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک بہن تھی وہ بھی بڑی مشکلوں سے بیاہی گئی تھی۔

اکثر للّن سے میری ملاقات ٹیچر ویلفیئر سوسائٹی کی میٹنگوں میں ہوا کرتی تھی اور میٹنگ کے بعد ہم دونوں گھنٹوں کسی ریستوران میں بیٹھے اپنی بیتی باتوں کو دہراتے — میں بھی اپنی بپتا سناتا —

میں اس سے کہتا کہ للّن تمہاری اور میری کہانی تقریباً ایک سی ہے میری ماں بھی بچپن میں مجھے اکیلا چھوڑ کر دور ستاروں میں جا بسی۔ پاپا نے دوسری شادی رچا لی۔ نئی اماں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی ، ایسی بات نہ تھی میں تو اس وقت ایک دو سال ہی کا تھا۔ ماں کی پہچان تو ممتا سے ہوتی ہے جس نے چاہا ، چاہت دی جس کے کاندھے پر سر رکھ کر سو لیا۔ ماں کو میں کیوں نہیں بھاتا — یہ میں اکثر سوچتا کہ کہیں اس کا بانجھ پن تو نہیں جو ممتا کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ میں کچھ بھی محسوس نہ کر سکا کہ وقت کس طرح گزرتا گیا — اور ایک دن پاپا بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے — مجھے تنہا زندگی سے جنگ کرنے کے لئے۔

پھر تنہائی مقدر بن گئی اور اس تنہائی میں ، میں اکثر اپنے بچپن کو ڈھونڈتا۔ جب میں ننھا سا تھا۔ مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ، روٹھ گیا تو مجھ کو منایا — مجھے تعلیم دلائی اور جب بھی میرے قدم ڈگمگاتے ، میرے حوصلے پست ہوتے تو اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھاما۔ مجھے سہارا دیا ، میرا حوصلہ بلند کیا اور پھر شجر سایہ دار کی طرح کچھ عرصہ تک مجھ پہ چھایا رہا — لیکن نرم و نازک یادوں کا کیا۔ یادیں تو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر جاتی ہیں اور میں بھی یادوں کی طرح بکھر بکھر کر رہ گیا۔

للّن میری باتیں سن کر اداس اداس سا ہو جاتا۔ ماں کا وہ بیکراں پیار جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا ، اچانک خون میں گردش کرنے لگتا۔ وہ کہہ اٹھتا — "جب میں بچہ تھا۔ خوب مستی تھی۔ خوب مست ہو کر کھیلتا ، کودتا اور ادھم مچاتا۔ اور وہ پیاری پیاری صورت والی ، موہنی مورت والی — اپنی چھاتی سے چمٹاتی ، دودھ پلاتی اور تھپک تھپک کر ، میٹھی میٹھی لوریاں سنا کر ، سلا دیتی۔

دوست ! میری بپتا اور تیری کہانی ایک جیسی ہے ، ایسا لگتا ہے ہم لوگ ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو زندگی کی رہ گزر پر نشیب

...رازسے یکساں طور پر متاثر ہوتے رہے ہیں — ایک کی پرورش جو آکی نرم و نازک گود میں ہوئی تو دوسرے کو اوم کی مضبوط و سخت بانہوں نے پروان چڑھایا۔ ہمارے بدن کا کوئی فرق نہیں۔ خون کے رنگ میں بھی کوئی فرق نہیں، احساسات و جذبات کا بھی کوئی فرق نہیں۔ فرق —— فرق صرف اتنا ہے کہ تو مسلمان ہے اور میں ہندو — اور وہ بھی پچھڑی ذات کا — مجھے پست ذات کا ایک فرد کہا جاتا ہے۔

میں اسے تسلی دیتا۔ دوست ہمارے یہاں ذاتوں کا بھید بھاؤ نہیں۔ یوں تو ہم لوگ بھی کئی ذاتوں کے الگ الگ خانوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں پھر بھی کسی طرح کا بھید بھاؤ نہیں — ہماری سبھی ذات اور برادری کے لوگ ایک ہی دستر خوان پر کھاتے ہیں اور ایک ہی صف میں نماز پڑھتے ہیں اور پھر موت کے بعد ایک ہی قسم کی رسم کے مطابق سپردِ خاک کئے جاتے ہیں۔

یہ باتیں للن کو اچھی لگتیں — پھر میں اور للن بھی تو اس وقت رائل ہوٹل کی ایک ہی میز پر بیٹھے مرغ توڑ رہے تھے۔

للن اکثر کہتا — تم لوگوں کی بعض باتیں بہت عمدہ ہیں جو ہمارے یہاں نہیں ہیں اور پھر اپنے عقیدے پر لعنت بھیجنے لگتا اور الٹی سیدھی باتیں بکنے لگتا۔ جس پر میں اسے سمجھاتا — ارے یار — ذات پات، مذہب کے بھید بھاؤ — تو ہم انسانوں نے گڑھ لئے ہیں اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں تم نے کبھی اپنے بھگوان اور ہمارے خدا کو لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے؟ —

مجھے اچھی طرح یاد ہے میری شادی کے موقع پر وہ بہت خوش تھا — مجھ سے بھی زیادہ — میری شریک حیات کی تعریفیں کرتے وہ تھکتا نہیں تھا — وہ اکثر کہتا — یار تم بڑے خوش نصیب ہو تمہیں بیوی اچھی ملی۔ تمہاری بیوی کتنی سُندر ہے، کتنی سوشیل ہے، سیتل چھایا ہے سیتل۔

اس وقت میں اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا، جہاں مجھے ان صفتوں کی شدت سے کمی محسوس ہوتی۔ یوں تو اس نے کبھی بھی دانستہ و کسی موقع کسی مصلحت سے بھی، ضروری یا غیر ضروری صورت میں بھی — کبھی غیر دانستہ اپنی سدھا کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا لیکن اسکی اداسی کھلی کتاب کی طرح تھی جس کے ایک ایک ورق سے اور ورق کے ایک ایک لفظ سے اور لفظ کے ایک ایک حرف سے عیاں تھی اس وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زندگی کی اس کتاب کے ہر ورق کو، ہر لفظ کو، ہر حرف کو

زہرآب کی طرح پی گیا ہو۔

زہر! زہر ہوتا ہے جس کی سرایت سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا یوں تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ تھا ہی لیکن اب اس سیاہی کی چمک ماند پڑ رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے چہرے سے اس کا اصلی رنگ غائب ہو گیا ہو۔ چہرے پہ بے بسی، اداسی کے رنگوں کے ساتھ نقاہت اور کمزوری کی پرتیں جم گئی تھیں۔

اس کے بعد اچانک میرا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو گیا اور پھر مدتوں ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ لیکن ایک دن ضلع انسپکٹر آفس میں اچانک اس سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہی چہرہ، وہی اداسی، وہی نراشا — بالوں میں سفیدی کچھ زیادہ پھیل گئی تھی اور جبڑے کے اوپر کے گوشت بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

پھر ہم لوگ گھنٹوں دفتر کے قریب پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے بیتے ہوئے دنوں کے قصے دہرانے لگے۔ بھولی بسری باتیں کا غذ کے پرزے بن کر اڑنے لگیں۔ گذرے ہوئے وقفوں کی باتیں زخمی پرندوں کی طرح پر پھڑ پھڑانے لگیں، ہونی انہونی بہت ساری باتیں ہوئیں — تب اس نے بتایا کہ جسے میں جنت بروئے زمین است کہا کرتا تھا اسے وہ کیوں جہنم کی تپتی ریت کہا کرتا ہے۔

کہنے لگا — ریت تو ریت ہے اس پر پھول کیسے اُگے گا —؟ پھول کی آبیاری کے لئے نرم و نازک وگداز زمین چاہیئے۔ ریت میں نمی ہے نہ نزاکت اور نہ ہی جذب کرنے کی قوت۔

"میرے دوست!" میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم نے کوئی اور نرم و نازک بانہوں والی گداز زمین کا کیوں نہ سودا کر لیا"

وہ کہنے لگا "میں ٹھہرا ہندو —— میرے یہاں جنم جنم کا بندھن ہوتا ہے یہ بندھن مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا"

"میرے یار بھابی کو راضی کیا ہوتا — سمجھایا ہوتا"

تب للن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ——

وہ کہنے لگا "پتھریلی زمین پر دانہ ڈالنے سے کیا فائدہ میرے بھائی! پتھر تو پتھر ہوتا ہے بھائی میرے!"

میں لاکھ تسلی دیتا، ڈھارس بندھاتا، اللہ اور بھگوان کی مرضی بتاتا پر وہ کب اپنے بھگوان کو مانتا، کب اللہ کی پرستش کے لئے سرگرم کرتا۔

اس نے بتایا کہ شہر کے سبھی نباضوں سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن نبض کسی کی گرفت میں نہ آسکی۔ گرفت ڈھیلی پڑ جاتی یا نبض ہی سست پڑ جاتی،

کچھ کہنا مشکل تھا۔ ایک دن تو حد ہوگئی، ویدوں کے مہاراج پدھارے — اس کی شان و شوکت آؤ بھگت کی گئی۔ نیم کا پیڑ اکھاڑ کر لایا گیا۔ سرسبز پتوں کا رس پلایا گیا۔ اس پر بھی جب نبض پکڑ میں نہ آسکی تو کڑوی کسیلی بدبودار بوتل کا سارا پانی اس کے منہ میں انڈیل دیا گیا۔ سوکھی لکڑیوں کا الاؤ لگایا گیا دھوئے سے سارا گھر بھر گیا۔ اور تپش سے سارا ماحول تیکھی تیکھی مہک کا مسکن بن گیا لیکن نبض کی تفتیش نہ ہو سکی۔

پھر سوکھی لکڑیوں کے دھوئیں کا مرغولہ آہستہ آہستہ آسمان کی جانب اٹھنے لگا اور پھر چاروں اور گھنگھور گھٹا چھا گئی — بجلی بھی چمکی۔ بجلی کی چمک سے بارش کی امید تو کی جا سکتی ہے لیکن سورج کے طلوع ہونے کی نہیں۔

میں نے سمجھایا — یہ تو نظروں کا دھوکہ ہے سورج روز طلوع ہوتا ہے اور غروب بھی لیکن وہ ان باتوں کو کب دھیان میں لاتا۔ وہ تو بس۔ سورج میں اندھیرا اپنی تلاش کرتا رہا — اور — سوکھی لکڑیوں کا دھواں۔ نبض کی گرفت — نیم کے پتوں کے کڑوے پن میں الجھا رہا —

ایک دن اچانک اس کی موت کی خبر مجھ پر پہاڑ بن کر گری۔

ایسا لگا جیسے مجھے موت آگئی ہو۔ لوگ میرے مردہ جسم کو غسل دے رہے ہوں۔ مردہ جسم پر کیوڑے، عطر چھڑکے جا رہے ہوں اور اب قبر کی عمیق گہرائیوں میں، تاریکیوں کی بستی میں بس اتارا جانے والا ہوں — اچانک میرے حواس مجتمع ہو گئے۔ میں چیخ اٹھتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ اسے تو جلانا ہے لیکن آگ کون دے گا۔ کوئی پوت، کوئی سپوت —

سب لوگ رک گئے — ساری گردنیں نیچے لٹک گئیں۔ ایک خلفشار برپا ہوگیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جس میں تجسس تھا، گہری فکر تھی — کہ درمیان سے پندرہ سولہ سال کا ایک نوجوان آگے بڑھا۔ ہاتھ میں آگ کا ٹکڑا لیے۔ آنکھوں میں آنسو، لبوں پر خاموشی —

بکھرے پھیلے ہوئے لوگ ایک جگہ سمٹ گئے۔ کسی نے کہا —

"دور رہو!"

پھر سبھوں نے ایک زبان ہو کر کہا —

ایک نیچ ذات کو برہمن پوت آگ دے — ممکن نہیں، ناممکن —

میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔

لیکن دفتر کے سامنے پیپل کے نیچے بیٹھے اس کی وہ باتیں یاد آنے لگیں —

"دوست! میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں — لیکن کبھی کبھی جب میں اپنے وجود کو ڈھونڈتا ہوں تو دور بہت دور پچھڑی ذاتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں خود کو گم پاتا ہوں۔ اپنے وجود کا اقرار کس طرح کروں — آج میں قائم ہوں میری بڑی پہچان ہے کل جب میں فنا ہو جاؤں گا، میری پہچان بھی گم ہو جائے گی۔ تم بھی مجھے پہچان نہیں پاؤ گے — تو لوگوں کا کیا —!

اسی لئے میرے دوست اپنے وجود کو گم ہونے کے ڈر سے، میں نے اپنا سارا خون ایک اونچی ذات کی ننھی سی جان میں انڈیل دیا ہے وہ ایک بچہ ہی تھا جب میں نے اسے سینے سے لگایا تھا اور اپنے جسم کا سارا خون شیشوں میں انڈیل کر اس ننھی سی جان کے جسم کی توانائی کے لئے ارپن کر دیا تھا۔

ایک مشہور نبض شناس نے کہا تھا کہ اس ننھے برہمن کی ریڑھ کی ہڈیوں کا سارا خون خراب ہو چکا ہے اتفاق سے میرا خون اس کی زندگی کی قوت بن گیا۔"

وہ نوجوان چیخ رہا تھا —

ہاں، ہاں — میں برہمن ہوں لیکن یہ موچی، نیچ اور پچھڑی ذات والا، فرشتہ صورت و نیک سیرت انسان تھا۔

وہ مر گیا۔ لیکن اس کے جسم کا خون اب بھی سرخ ہے۔ ذات کی پہچان کرنے والو۔ اپنی آنکھوں سے پردے ہٹاؤ اور خون کی پہچان کرو!

خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے سفید نہیں۔ میرے جسم کا خون بھی سرخ ہے — سفید نہیں، پانی نہیں۔ خون ہے خون جو مجھے زندگی دے رہا ہے مجھے قوت بخش رہا ہے۔ مجھے ہونے نہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ مر کر بھی مجھ میں زندہ ہے میری رگ و پے میں پیوست ہے میری سانسوں میں رواں ہے۔ میری آنکھوں میں موجزن ہے۔

پھر سبھوں نے دیکھا اس کے ہاتھ کی مشعل مردہ جسم کی طرف بڑھی اور ہونٹوں کے قریب آکر لپکتے ہوئے شعلوں میں بکھر گئی۔

گردنیں اور بھی خم ہو گئیں، سبھوں کے چہرے لٹک گئے۔

ایک میں تھا جو مسکرا رہا تھا، رو رہا تھا — جو ایک گمشدہ البم تھا — لمحہ جو اپنی شناخت کھو چکا تھا — دھوپ میں بارش کا منظر — میری آنکھوں کے آگے ایک منظر گھوم گیا۔

منظر نا تمام تھا — لمحہ مردہ!

ترجمہ: اختر واصف

ہندی: راجنے شاہ پشپ
سبری باغ، پٹنہ - ۴ (بہار)



# قاتل جارہے ہیں

آج لوٹ جانا ہے۔ پورے دس دنوں کے بعد آج لوٹ جانا ہے۔ ..... شہر میں اب سکون ہے۔ دکانیں کھل گئی ہیں۔ وہ لوگ اپنی اپنی رائفلوں کے ساتھ شہر میں امن قائم کرنے کے لیے بلوائے گئے تھے ..... اب حالات نارمل ہو گئے ہیں، اور انہیں لوٹ جانا ہے ..... پورے دس دنوں بعد آج انہیں پھر وہیں لوٹ جانا ہے، جہاں سے وہ آئے تھے ..... یہاں آنے سے پہلے افسر نے کہا تھا "فوراً کوچ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اپنی اپنی رائفلیں، اسٹین گن وغیرہ سنبھال لو۔ ہمیں امن قائم کرنے کے لیے جانا ہے ....!"

اور اسے یاد آیا تھا اپنا بچپن ..... وہ ہائی اسکول میں تھا ان دنوں۔ پتاجی سینکے ہوئے بھٹے سے دانے نکال کر کھا رہے تھے۔ وہ گائے کے لیے گنڈاسے سے کٹی کاٹ رہا تھا۔ تبھی آدمی دوڑتا ہوا آیا تھا۔ زمین کے معاملے کو لے کر دو جماعتوں میں کہیں جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے لاٹھیاں نکل ہوئی تھیں۔ سنتے ہی پتاجی اٹھ گئے تھے۔ وہ گاؤں کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی کافی عزت اور دھاک تھی۔ وہ چلنے لگے تو وہ بھی اٹھ گیا تھا گنڈاسا لے کر ... ابھی آنگن کے باہر ہی آیا تھا، کہ پتاجی نے کہا "گنڈاسے کو اندر رکھ دو ....."

"کہیں ضرورت پڑ گئی تو ....." اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"ہم امن قائم کرنے جا رہے ہیں۔ جنہیں لڑنا ہے، وہ ایسے ہتھیار لے کر جا چکے ہیں ......"

وہ چپ چاپ اندر چلا گیا تھا۔ گنڈاسا رکھنے۔ اور اس دن وہ خالی ہاتھ گیا تھا۔ پتاجی کے ساتھ امن قائم کرنے ان لوگوں کے بیچ، جن کے پاس خطرناک ہتھیار تھے۔

اس نے رائفل کو کانپتے ہاتھوں سے چھوا۔ اس کی بٹالین کو ان خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ ان لوگوں کے بیچ امن قائم کرنے کے لیے جانے کا حکم ملا تھا، جن کے ہاتھ خالی تھے۔ بوٹ پہنتے وقت، بلٹ کے اندر رائفل کی گولیاں سمیٹتے ہوئے، اسے بار بار پتاجی کی یاد آ رہی تھی اس دن ..... اور آج پورے دس دنوں بعد اس کی بٹالین کو وہیں لوٹ جانا ہے، جہاں سے وہ آئی تھی۔

اس کے کئی دوست سادے لباس میں پیدل گھومنے نکل گئے تھے، وردی میں نہتے نکلنا ٹھیک نہیں۔ یہ سوچ کر وہ نہیں گیا صرف سوچتا رہا ..... اگر اس وردی میں اکیلا نکل جائے تو ... کیا طلبا اسے چیر ڈالیں گے؟ جن لوگوں کے بچے مرے ہیں، کیا وہ اسے زندہ جلا دیں گے؟؟ اس وردی سے، اور اس وردی کے اندر جو آدمی رہے گا، کیا اس سے نفرت کرنا لوگ بند نہیں کریں گے؟ کتنے ہی سوال ابھرے اور بکھر گئے۔ ایسے ہی سوال اس وقت بھی اٹھتے تھے جب وہ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد پہلی بار گاؤں لوٹ رہا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ کنکھیوں سے دیکھنے لگے تھے۔ کہ ماس صاحب کے گھر سپاہی ..... ہر طرف ایک خاموشی چھا گئی تھی۔

آج، اس میں یا اس کے ساتھیوں میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وردی پہن کر خالی ہاتھ کوئی باہر گھومنے نکل جائے۔ مگر کچھ دن پہلے تک، جب وردی میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جیپ پر نکلتا تھا۔ رائفل تانے، تو سڑک پر چلنے والے اکّا دکّا لوگ بھی گلیوں میں بھاگ جاتے تھے۔ جھروکوں سے جھانکتی عورتیں پیچھے ہٹ جاتی تھیں ..... ابھی اسی دن تو ..... ایک مکان کے نیچے جیپ رک گئی تھی۔ اس میں کچھ خرابی آ گئی تھی شاید۔ کوٹھے کی کھڑکی سے ایک بچہ جھانک رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ ٹھیک بیٹو کی طرح تھا۔ جب وہ چھٹیاں ختم کر کے لوٹ رہا تھا تو بیٹو بھی تقریباً اتنا ہی بڑا تھا۔ وہ لوٹا بار بار کھڑکی کی چھڑوں پر چڑھ اتر رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا، یہ پتو ہے۔ اگر پتو کے پیر ٹھیک ہو جائیں تو وہ بھی چھتوں پر چڑھا اتر سکے گا۔۔۔ بالکل اسی طرح۔

خط پا کر وہ گاؤں گیا تھا۔

پتو کا ایک پیر پولیو کی وجہ سے بے کار ہو گیا تھا۔ پوری چھٹیاں وہ اُسے لے کر، اس ڈاکٹر سے اس ڈاکٹر کو دکھاتا رہا۔ ایک دن اسے وردی میں دیکھ کر پتو نے کہا تھا "میں بھی سپاہی بنوں گا۔ ایسے کپڑے پہنوں گا۔ بنوں گا نا۔۔۔؟" وہ چونک گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پتو کبھی ایسی وردی نہیں پہن سکے گا۔۔۔ اپاہج لوگ فوج میں نہیں جا سکتے۔۔۔ بچہ ابھی چھتوں پر چڑھا اتر رہا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس لڑکے کے پیر ٹھیک ہیں، یہ فوج میں بھرتی ہو سکتا ہے، کہ اس کی ماں نے اسے چانٹے مارے اور پٹ بھڑ دیے۔۔۔ اس نے اپنی وردی کو دیکھا تھا۔۔۔ اپنی رائفل کو۔۔۔ اور ذہن میں ایک سوال اُٹھا تھا۔ کیا وہ قاتل ہے؟

"خونی کہیں کا۔۔۔" پتاجی نے کہا تھا۔

چنتا رو رہی تھی۔ اپنی گڑیا کو لے کر۔ چنتا اس کی چھوٹی بہن۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ لیکن کسی بات پر اس سے لڑائی ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی گڑیا کو زور سے پٹخ دیا تھا۔۔۔ اور وہ پتاجی کے سامنے کھڑی رو رہی تھی۔ اور اپنی گڑیا کو سہلاتی جا رہی تھی۔

پتاجی کا خونی کہنا اسے بے طرح لگا تھا۔ اور وہ اندر سے غصے میں بھر گیا تھا "میں خونی نہیں، اس گڑیا میں جان نہیں ہے۔"

پتاجی سمجھ گئے تھے کہ وہ ناراض ہو گیا ہے۔ پاس بلا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگے تھے "بیٹے تیری بہن اس گڑیا کو بے حد پیار کرتی ہے۔ اسے پھینک کر تو نے اس کی روح کو دکھ پہنچایا ہے۔۔۔ روح کو دکھ پہنچانا ایک طرح کا قتل ہی ہے بیٹے۔۔۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا جس گھر میں بے جان گڑیا کو پھینکنا بھی ایک قسم کا قتل تھا۔ اسی گھر کا وہ۔ رائفل لے کر سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اور آگے والی جیپ کا لاؤڈ اسپیکر چیخ رہا تھا۔۔۔ "جو بھی سڑک پر نظر آئے گا۔۔۔ اسے گولی مار دی جائے گی۔۔۔"

پتو کی ماں کا خط آیا تھا۔۔۔ یہاں آنے سے شاید دو تین دن پہلے، کہ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ جتنی تنخواہ بھیجتے ہو، اس میں دو وقت پیٹ نہیں، اور اوپر سے نکمی ماں کو کھلانے جا رہی ہے۔

بہت مصیبت کے دن ہیں۔۔۔ اور تب بھی مصیبت کے دن تھے، جب پتاجی اچانک چل بسے۔ ہائی اسکول کے امتحان کی فیس بھرنا تھی۔ روپے نہیں تھے۔ لیکن ماں نے کہا تھا "بیٹے کسی طرح اسکول کی پڑھائی کرلے تو دکھ کے دن اپ سے آپ ختم ہو جائیں گے۔۔۔۔ تو صرف پڑھ بیٹے۔۔۔" اور واقعی جس دن ماں نے فیس کے روپے اس کے ہاتھ پر رکھے، وہ ایک دم خوش ہو گیا تھا۔ مگر سر اٹھا کر دیکھا تو ماں کی آنکھیں گیلی تھیں۔ وہ بت کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ ماں نے کہا تھا "بیٹے تو جا۔۔۔ آج آخری دن ہے۔ فیس نہیں بھرے گا تو امتحان کیسے دے گا؟۔۔۔ بس یہ پڑھائی ختم کرلے تو کوئی نہ کوئی نوکری لگ جائے گی۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ تو جا بیٹا۔۔۔"

فیس بھر کر نئے جوش کے ساتھ وہ لوٹا تھا۔ مگر آنگن میں پیر رکھتے ہی دھک سے رہ گیا تھا۔ جہاں گائے بندھتی تھی، وہ جگہ خالی تھی اور سانی کی ناد کو تھامے ماں سسک رہی تھی۔ صبح شام اپنے ہاتھوں بھوسے اور کھلی کی سانی دیتی تھی۔۔۔ رات بے رات ذرا سا کھٹکا ہو جائے تو لالٹین لے کر باہر آ جاتی تھی۔ وہی ماں۔۔۔ خالی ناد کے پاس رو رہی تھی۔ اس نے کسی روح کو دکھ پہنچایا ہے۔۔۔ روح کو تکلیف دینا ایک طرح کا قتل ہے۔۔۔ وہ قاتل ہے۔۔۔ خونی ہے۔۔۔ وہ الٹے پیر باہر لوٹ گیا تھا اور مندر کے پاس والے پیپل کے نیچے بیٹھ کر رو رہا تھا۔

قریب لیٹے ایک نوجوان نے ٹرانزسٹر زور سے بجا دیا۔ وہ پھر اپنے آپ میں لوٹ آیا۔۔۔ آج پورے دس دنوں کے بعد اسے وہیں لوٹ جانا ہے، جہاں سے آیا ہے۔۔۔ الگ الگ بٹالینوں کو، الگ الگ ٹھہرا دیا گیا تھا۔ اس نے سر گھما کر پیچھے بلیک بورڈ دیکھا۔ سبھی کالج اور اسکول بند کر دیے گئے ہیں۔ اس کی بٹالین جہاں ٹھہری ہے وہ کوئی کالج ہے۔ ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد وہ دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا کوئی معجزہ ہو۔۔۔ اتنے روپے اچانک کہیں سے آ جائیں، کہ گھر کا مسئلہ حل ہو جائے۔۔۔ اور وہ بھی کالج میں کتابیں لے کر داخل ہو۔۔۔ اس کی خواہش پوری ہوئی تھی۔ لیکن اس کالج کے کمرے میں، وہ طالب علم بن کر نہیں، بلکہ خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ آیا تھا۔

چھاتا اندر لان کو شانت کرنے کے لیے، اور جیسے ہی وہ کمرے میں
داخل ہو رہا تھا، اس کی نگاہ بلیک بورڈ پر گئی تھی۔ کسی طالب علم
نے لکھ دیا تھا "قاتلو! واپس جاؤ ...." اور چوکھٹ پار کرتے
کرتے، ایک پل کو اس کے پیر ٹھٹھک گئے تھے۔

لیکن کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ امتحان کے نتیجے کے کئی برسوں
بعد تک وہ بیکاری سے جوجھتا رہا، نوکری کھوجتا رہا۔ ایسی نوکری
جس کے سہارے دو ماں بہن کو روٹی دے سکے، اور آخر میں
مایوس ہو کر وہ ایک دن ایسے دفتر کے سامنے آگیا، جہاں لکھا
تھا۔ فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی خدمت کیجیے۔ آج بھی اسے
اچھی طرح یاد ہے، اس دن اس کے ساتھ اور بھی کئی لڑکے صرف
اس لیے دفتر کے اندر آگئے تھے، کہ وہ اپنے گھر کے لیے روٹیاں
پیدا کر سکیں۔ اب وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہل اور رائفل دونوں
سے روٹیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ودھان سبھا کے چاروں طرف لوہے اور لکڑیوں سے بہت
دور تک گھیرا بنا لیا گیا تھا۔ وزراء کی حفاظت کا معاملہ فوج کے سپرد
کر دیا گیا تھا۔ سبھی جوان اپنی اپنی رائفل کے ساتھ تیار کھڑے تھے
.... لیکن وہ .... دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا ....
اسے بنانے کا ٹھیکہ جسے دیا گیا ہوگا، اس نے کتنے روپے بنائے
ہوں گے ....؟ اس پر کل کتنا خرچ آیا ہوگا؟ .... ان روپوں
سے کتنا اناج لایا جا سکتا تھا، اور وہ رک گیا تھا۔ پتہ نہیں ابھی گھر میں
کچھ پکا بھی ہوگا کہ نہیں .... ہو سکتا ہے کچھ کھایا بھی ہو کہ ....
پچھلی بار ماں نے لکھا تھا، مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ جتنی پگار بھیجتے ہو
اس میں پورا نہیں پڑتا .... بہت مصیبت کے دن ہیں۔ تبھی نعرے
لگاتے ہوئے طلبا اکٹھے ہونے لگے .... مہنگائی کم کرو ....
بھرشٹاچار بند کرو .... ابھی دو، آج دو، کھانے کو اناج دو
.... ہماری مانگیں پوری کرو .... انقلاب زندہ باد ....
رائفل تھامے وہ سوچنے لگا تھا، یہ لوگ صرف نہتے ہی نہیں، بھوکے
بھی ہیں اور اسے یاد آیا، تب ساتویں میں تھا شاید۔ ٹفن کے وقت
رمیش کے ساتھ برگد کے نیچے کھڑے ہوئے گنا چوس رہا تھا۔ وہیں ایک
ایک بہتر کار آکر کھڑی ہو کر دیکھنے لگا تھا۔ اس نے کہا تھا ——
"بھاگ" وہ نہیں گیا تھا۔ کچھ دیر بعد رمیش نے کہا تھا "یہ منہ سے
نہیں لیکن آنکھ سے تو کھا رہا ہے۔ مار ڈالو اسے۔ اور اس نے گنا

سے ہی پیٹ رہا تھا۔ پتاجی ہیڈ ماسٹر تھے۔ کسی لڑکے نے شکایت کی
آفس میں پیشی ہوئی۔ پتاجی نے خوب ڈانٹا تھا "چور .... تیرے
ہاتھ میں تو گنا تھا، اس کا ہاتھ تو خالی تھا۔" اس نے یہ پوچھنا چاہا،
نہیں سوچا، کہ وہ صرف نہتا ہی نہیں بھوکا بھی ہے ...." وہ
دو چپ ہو گئے تھے۔ کمرے میں خاموشی بھر گئی تھی۔ کچھ دیر کی
خاموشی کے بعد اس نے کہا تھا۔ "رمیش نے مارنے کے لیے کہا
تھا ...." "اور تو نے مار دیا۔ وہ مرنے سے مرت کہا اور تو نے
کیا .... تیرا اپنا ایمان .... جیسے دوسرے کیا کہتے ہیں، اس
پر مت جا۔ کچھ کام کرنے سے پہلے اپنی روح سے پوچھ، کہ وہ کیا کہتی
ہے؟ اس کی بات سن۔" تبھی افسر کی آواز گونجی تھی۔ "سمجھا تو! سبھی اور یہ
سے کام صاحب، کہ اگر یہ طلباء حد سے گذرتے ملیں تو گولیاں چلیں گی۔
"ناؤ بی الرٹ" اور اپنے آپ اس کے ہاتھوں نے رائفل کو سینے
سے چپکا لیا تھا .... رائفل سے روٹی پیدا کرنے کے لیے یہ
بہت ضروری تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامہ .... طلباء نے پتھراؤ شروع
کر دیا تھا .... اغل بغل کے مکان جلنے لگے تھے .... ان
لوگوں نے فائرنگ پوزیشن لے لی .... اسی وقت اسمبلی کے اندر
کھلبلی مچ گئی۔ پتہ چلا کہ کچھ کرمچاریوں کے مکان جل رہے ہیں باہر
.... انہوں نے فوج کی مدد مانگی تو ٹکا سا جواب ملا ....
اس بات سے وہ ناراض ہو گئے ہیں، کہ وزراء نے صرف اپنی حفاظت
کا بندوبست کیا ہے اور ان کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اندر
وزراء میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی تھی اور وہ کشمکش میں گرفتار
ہو گیا تھا .... کس طرف گولی چلائے، باہر یا اسمبلی کی طرف ....
ہر طرف .... ہر آدمی کے اندر ایک آگ ہے ....
تبھی آرڈر ملا۔ "فائر" اور گولیاں چلنے لگیں، لوگ گرنے لگے
تھے۔ بھاگنے لگے تھے۔ بھیڑ میں پیچھے کوئی ایک پر چیخنے لگا تھا ....
قاتل گولی چلا رہے ہیں .... خون کا بدلہ خون سے لیں گے" اور
اس کا ہاتھ ایک دم سے رک گیا تھا۔ کچھ ایسے پریچت چہروں سے لت
پت کئی لوگ گرے ہوئے تھے .... پتاجی اگر ہوتے تو اسے کیا
کہتے .... صرف خواب یاد ہیں ....

پھر کرفیو!

گشت لگاتا جیپ میں وہ جدھر سے نکلتا، دیواروں پر ایک ہی

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھیے]

# رباعیات







راہی [illegible]

دیواریں چمکتی ہیں تو در روشن ہیں
شعلوں سے جو ٹوٹے، وہ شرر روشن ہیں
اس آخری ایثار کی کچھ داد ملے
گھر میرا جلا، اوروں کے گھر روشن ہیں

اک دشت کی تقدیر ہوا جاتا ہوں
خاموشی کی تقریر ہوا جاتا ہوں
اب گھر میں بس اتنی ہے ضرورت میری
دیوار کی تصویر ہوا جاتا ہوں

انسان پہ یہ جور ہے جورِ آخر
آلام کا یہ طور ہے طورِ آخر
مستقبلِ اخلاف نہیں کچھ ـــــــ یعنی
تہذیب کا یہ دور ہے دورِ آخر

کیا صبر ہے، کس طرح کے صابر ہم ہیں
بستی کے مکیں ہیں، نہ مہاجر ہم ہیں
مدت سے جو مسدود ہوا، بند ہوا
وہ راستہ ہے، اور مسافر ہم ہیں

● شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ ۶ (کرناٹک)

انس مسرور

سوچا ہے کہ جو کچھ بھی ہو تنہا جھیلوں
پانی ڈھونڈوں، عذابِ دریا جھیلوں
بستر پہ لیٹوں آنکھیں بند کروں
تا حدِ نظر دھوپ کا صحرا جھیلوں

بستی کو اگر چھوڑوں تو جنگل پاؤں
تلوار سی ہر شاخ کو صیقل پاؤں
ہر شخص ہے اپنے ہی لہو میں غلطاں
ہر شہر کو ہم صورتِ مقتل پاؤں

مٹھی بھر خواب سجالیں آنکھوں میں
اک تاج محل بنالیں آنکھوں میں
جیون سنگھرش کٹھن، ہم تنہا
کچھ دیر سہی، مسکرالیں آنکھوں میں

یہ کون و مکاں، مٹی، پانی، آگ، ہوا
انسان انساں، مٹی، پانی، آگ ہوا
اللہ اللہ حکمت، قدرت، وسعت
سارا یہ جہاں، مٹی، پانی، آگ ہوا

● سکراول، ٹانڈہ، فیض آباد، یوپی

محمد مشتاق شارق

ہر سمت تباہی کے نشاں ہیں یا رب!
دنیا پہ جہنم کے گماں ہیں یا رب!
مردانِ حق آگاہ کی ہے مجھ کو تلاش
مردانِ حق آگاہ کہاں ہیں یا رب!؟

مضطر ہے جو لالہ نسترن ہے بیتاب
بے چین ہے گل تو یاسمن ہے بیتاب
کیا جانیے کیسا انقلاب آیا ہے
پھولوں کی تمام انجمن ہے بیتاب

آئینِ محبت کا تقاضا کیا ہے؟
دستورِ شرافت کا تقاضا کیا ہے؟
انسان پہ شمشیر اٹھانے والو!
انسان کی عظمت کا تقاضا کیا ہے؟

قومیں یہاں بے عصا ہوئی ہیں کتنی
یاں محفلیں بے صدا ہوئی ہیں کتنی
نفرت کے پجاری تو نے سوچا ہے کبھی
تہذیبیں یہاں فنا ہوئی ہیں کتنی

● ۵۰ - کوٹلہ، میرٹھ (یوپی)




عاصی سعید

شہزادپور پوسٹ آفس، ٹمرن کلاں ضلع مرادآباد، یوپی


# دُنیا کا انت

عالم بالا کے بلاک ارواحِ انسانی میں فرشتوں کے ذریعہ، روحوں کو یہ سنسنی خیز خبر ملی کہ عالم اسفل یعنی اس سیارے کا جسے دنیا کہتے تھے جہاں کبھی خود وہ روحیں بھی قالبوں کے قفس میں اسیر رہا کرتی تھیں، نبانت ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کو اچانک انت ہوگیا۔ فرشتوں نے مزید بتلایا کہ نصف دنیا میں اس وقت رات تھی۔ نصف میں دن، وہ سب معہ اسرافیل اور عزرائیل بارگاہ ربّ ذوالجلال والاکرام میں سربسجود تھے، جو ان کا شب و روز کا شعار ہے، کسی اور ہی کام کے کرنے کا حکم دیدیا جائے تو اور بات ہے نہ صور پھونکنے کی ضرورت پیش آئی نہ عزرائیل کو سفر کی زحمت ہوئی، پورا کرۂ ارض رحلت فرما گیا۔ کسی ذی حیات کے بیماری میں ایک بھی نفس باقی نہیں رہا، تقدیر کا لکھا ایسے ہی تھا، مشیت ایزدی میں کسی کو چارہ نہیں۔

روحیں:۔ (فرشتوں سے مخاطب ہوکر) اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

کھٹک تو ہمیں بھی گئی تھی، کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ عالم اسفل سے عالم ارواح میں روحوں کے آنے کی رفتار کم و بیش پانچ ہزار فی سکنڈ رہا کرتی تھی۔ جس تاریخ اور وقت کا آپ صاحبان ذکر فرما رہے ہیں، تو چیل میں آئی کی طرح روحیں بیک وقت پھڑ پھڑاتی ہوئی، اربوں بلکہ کھربوں کی تعداد میں آکر اس بلاک (BLOCK) میں جہاں جگہ ملی، اقامت پذیر ہوگئیں، جیسے پرانے زمانے کے کسی طول طویل اینڈ بنڈ (ABOND OND) اصطبل میں چمگادڑوں کے پرے کے پرے آندھی جیسے سناٹے کے ساتھ آئیں اور جہاں جگہ ملے وہاں لٹک جائیں۔ لیکن اس کے بعد سے تو روحوں نے ایسی کھٹی کھائی کہ آج تک ایک روح بھی پھر یہاں وارد نہیں ہوئی۔ قیامت تک جاری رہنے والا یہ سلسلہ یک لخت کیسے رک گیا یہ ان ہونی کیسے ہوئی، کام ان دو بزرگوں کے کرنے کا، کر دیا کسی اور نے یہ کیسے ممکن ہے، کیا ہمارے سے فرشتے کر گئے؟

فرشتے:۔ (روحوں سے) جب بانس ہی نہیں رہا تو بنسری کاہے کی بجے کوئی روح ہوتی تو آتی۔ وہاں تو جھاڑو پھر گئی وہاں تو کوئی جسم ہے نہ روح، پھر قسم کھانے یا کھٹی کھانے کا کیا سوال۔ بچوں، جوانوں، بوڑھوں تندرستوں، مریضوں، اپاہجوں، سب ہی نے اجل کو لپک لپک کر لبیک کہا، گویا موت کوئی بھاری اور دل پسند مقناطیس تھی، جس سے ہر ذی حیات بلا استثنا نہ صرف آچپٹا، بلکہ اس میں ضم ہوگیا۔ روئے تک کیلئے تو کوئی بچا نہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے۔ انسانوں کے ساتھ چرندوں پرندوں، حشرات الارض۔ غرض ہر ذی حیات کی بلکہ نباتات اور کل کرۂ ارض تک کی وفات کامل ہوگئی۔ قیامت سے پہلے قیامت۔ روس اور امریکہ کے کچھ انسانوں کے کرتوت، جو بزعم خود غلط ہو گئے تھے۔ خدا کو چھوڑ کر سائنس پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ گمراہ ہو چکے تھے، اپنے آپے میں نہیں رہے تھے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ۱۹۹۵ء تک کرۂ ارض پر دو ہی سربراہ رہ گئے تھے، روس اور یو ایس اے اپنی اپنی زیر اقتدار مملکتوں میں بڑی بمباریوں اور خوں ریزیوں کے بعد انہیں یہ دن نصیب ہوا تھا۔ تمام ایشیا اور تمام افریقہ کی مملکتیں روس کے آگے دُم ہلانے لگی تھیں۔ ملک رہے کے علاوہ باقی ماندہ تمام یورپ، آسٹریلیا، کینیڈا، میکسیکو اور جنوبی امریکہ یو ایس اے کے آگے یہاں تک تو دونوں بھیّا بھیّا بنے رہے اور سب کچھ باہمی تال میل سے آپس ہی میں تقسیم کر لیا۔ اب چین سے بیٹھ جائیں گے لیکن چین ان کی تقدیر میں نہیں تھا، غرض جو پیچھے لگا ہوا تھا ۱۹۹۵ء کے بعد ان دونوں میں سے ایک نے تمام دنیا کو بلا شرکت غیرے اپنانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ آئے دن سرد جنگیں ہونے لگیں ان کی گرم جنگ سے تمام دنیا کو اندیشہ لگا رہتا تھا لیکن ان دونوں کو کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ البتہ اس کا ربد سے پہلے دونوں نے یہ ضرور چاہا تھا کہ اپنے اور اپنے ملک والوں کیلئے، خواہ اربوں ڈالرس کی لاگت آجائے، سائنس داں سے یہ انتظام

(SCIENCE SPECIALIST) سے کوئی نوح کی جیسی کشتی تیار کرالیں، یا کوئی ایسا تیل ایجاد کروالیں کہ تباہی کا بٹن دبانے سے چند منٹ پہلے اس تیل کی مالش کرکے اس جنرل (GENERAL) موت کے کھینچے جانے والے محیط میں رہ کر بھی مستثنیات ہونے کا شرف حاصل کرسکیں، لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ" ایسی کشتی اور ایسے تیل کا علم تو "الّا بما شاءَ" سے باہر تھا۔ خیال ہی رہا، محال اور جنون۔ ہم تو ڈوبیں گے صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔ کے مصداق، خود بھی ڈوبے، ساتھ میں سب ہی کو لے ڈوبے۔ گناہ گاروں کو بھی بے گناہوں کو بھی۔

روحیں:۔ مگر یہ تو فرمائیے، آیا آپ کو پہلے سے بھی کچھ معلوم تھا۔ اور یہ کہ چگونہ بودہ است آں انت؟

فرشتے:۔ سمجھ تو ہم پہلے ہی گئے تھے، ایک دن ایسا ہونا ضرور ہے۔ انسان کو اس انکشاف کے باوجود کہ دنیا گول ہے رات و دن اور تمام سال بڑی تیزی سے اپنی جگہ اور سورج کے گرد، دوسرے سیاروں کے ساتھ ایک خاص نظم و آہنگ کے ساتھ چکر لگا رہی ہے، ہم نہیں چونکے۔ اس برخود غلط انسان کے خدا کے تصوّر کو طاقِ نسیاں میں رکھ کر خالص مادہ پرست ہوجانے پر ہم اتنے نہیں چونکے۔ پھر اس کے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نیوٹرون بم بنانے پر ہمارے کان اتنے کھڑے نہیں ہوئے۔ ہاں اس روز جس روز پہلی بار اس کا پہلا انسان مسٹر آرم اسٹرانگ چاند میں چرخا کاتنے والی بوڑھیا کو دیکھنے کے بہانے چاند میں جا پہونچا تب ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ جلد ہی انسان اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والا ہے، اس عالم ہست کو نیست کرکے رہے گا، ماننے کو سیدھے سادے ڈھنگ کو ایسا ٹیڑھا ترچھا اور اپنے نزدیک ایسا ترقی یافتہ بنائے گا کہ کسی ذی حیات کو نہ بخشے گا۔ اسی روز اس بدمست شراب سائنس کو ہوش میں لانے کے لئے مبادا ناخدائی سے خدائی میں ٹانگ اڑانے لگے، ہم نے بحکم رب چاند میں آرم اسٹرانگ کو اذان کی آواز بھی سنادی تھی، کہ اچھا ہے، اب بھی کچھ نہیں بگڑا اب بھی یہ برخود غلط انسان منبعِ حیات (LIFE SOURCE) کو سمجھ جاتے توانائی کی اس بحرِ بیکراں کی وسعت اور گہرائی کا ادراک کرلے جس کی موج موج خون اس کے خون میں موجزن ہے، اس عظیمِ مطلق کی قوت ہیبت اور جلال سے آشنا ہوجائے، چاند کو پاکر مغرور نہ ہوجائے، اپنا پندار نہ کھو بیٹھے، بلکہ چاند کو پالینے کے بعد نافرمان اور بے نیازی کی جگہ مطیع و نیازمند بن جائے۔ مگر یہ تو سیانا تھا ہوکر بھی اندھا ہو رہا تھا اسے تو چرطھ ہی بہت رہی تھی۔ قدرت حیات و ممات میں سے بس

آخرالذکر کی، وہ بھی شمہ بھر۔ اس کے پلّے پڑ گئی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ سب کو ملیا میٹ کرکے رہے گا، جیسے چوہے کے ہاتھ کتر لگ جائے اور وہ بزاز (کپڑا فروش) کا کام کرنے لگے۔

انت کے وقت بحکم رب سجدے سے اٹھ کر ہم عرش کے غرفوں سے نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ انت یوں ہوا اوّل اوّل تو دنیا کی طرف سے ہمیں شائیں شائیں کی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کسی دعات کے ہزاروں نل بارود کے زور سے سنسنے کے ساتھ ہزاروں میل فی سکنڈ کی رفتار سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ اتنے ہی میں تڑ تڑ تڑ اتڑا، کھڑ کھڑ کھڑ اکھڑ، دھڑ دھڑ دھڑادھڑ ہونے لگی، جیسے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نیپام بم پھٹ رہے ہوں، جن سے نکلے ہوئے آسمان کی طرف اٹھنے والے دھوئیں میں ہم کچھ نہیں دیکھ پائے کہ کون غارت ہوا، اور کون غارت ہونے سے رہ گیا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ ایٹمی جنگ برابر سرابر میں انجام پانے کو تھی، نہ کسی کو جیت ہوتی، نہ کسی کو ہار، کہ ان دونوں طاقتوں سے کوئی بڑی طاقت اپنے شدید غصے میں خود اپنی سلامتی کو بھول گئی اور بدحواسی میں کچھ ایسے بموں کے بٹن دبا بیٹھی جن کی آواز سوں سوں سے زیادہ نہیں تھی، جیسے اسپرے مشین فضا میں اسپرے کر رہی ہوں اور اس آکسیجن کو چاٹ رہی ہوں جو کرۂ ارض پر محیط ہے ان بموں نے اس حفاظتی تہ کا خاتمہ کردیا جو ہر ذی حیات کو زندہ رکھتی ہے جب اس طاقت نے ہر ایک کو مرتا دیکھا اور اس کا اپنا دم بھی گھٹنے لگا تو یہ سوچ کر کہ مبادا لاشوں میں کوئی دبا دبایا زندہ رہ گیا ہو اور بعد میں متنازعہ چیزوں پر قبضہ جمالے، مرتے مرتے بھی کرۂ ارض کی ماتی کے بموں کے بٹن دبا بیٹھی۔ پھر تو چٹاخ چٹاخ، تڑاق تڑاق اور پڑاخ پڑاخ کی آوازیں آنے لگیں، پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے مانند ہوگئے، زمین شق ہوکر مع اپنی عمارتوں اور جمادات کے ٹکڑے ٹکڑے بلکہ ریزہ ریزہ ہوگئی، اور آن واحد میں عدم کے کھڈ میں گر کر اوجھل ہوگئی۔ یہی وہ وقت تھا جب آسمان کھلم کھلا دھواں لایا، جو ہر طرف چھا گیا۔۔

روحیں:۔ یہ تو بتلائیے کہ ان دونوں بدمعاشوں میں متنازعہ فیہ کیا چیز تھی؟

فرشتے:۔ وہی زن، زر، زمین جن کی ملکیت کا جذبہ تنازعوں کو ہوا دیتا ہے۔

روحیں:۔ یوں تو یہ چیزیں ہر زمانے میں متنازعہ فیہ رہی ہیں، ہمارے زمانے میں بھی تھیں۔

فرشتے:۔ زن کے معاملے میں یہ زن پہ اتنا جھگڑا تھا اور زن کو اتنا اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ جتنا ان کی عصمت کی نتھیں توڑنے پر زور دیتے تھے پھر ایک

نتھ توڑنے کا تو ہر ایک کو پیدائشی حق تھا۔ اگر نتھ ٹوٹی اس کی بقید جوانی مرجائے تو دوسری نتھ توڑنے کا بھی۔ مگر یہ ایک دو تین نتھوں کے توڑنے پر قانع کب تھے؟ مرد نتھ شکنی کے لئے کروڑوں پر کروڑیں بدلتے تھے۔ یہ تو آسمان سطوت و جبروت کے درخشندہ ترین۔ مگر کج رو انجم تھے۔ انہیں نہ زوال آدم خاکی کی پرواہ تھی، نہ عورت کے زیاں عفت و عصمت کی۔ گھور بوڑھاپے میں بھی نتھ توڑنے کی طاقت اصل مقام سے ریاحی درد کی طرح ہٹ کر ان کی آنکھوں میں آجاتی تھی، مر کر بھی موت کے قائل نہیں ہوتے تھے۔ ان کی موت ہو یا ان کے قوی کی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے اور جانا ہر ایک کو ضرور ہے، ان دونوں ملکوں کے بدمعاشوں کی ہوس زر اور زمین لو زر اور زمین سے ضرب دو، جو حاصل ضرب آئے اس کو پھر زر اور زمین سے ضرب دو، پھر اسی طرح کئے جاؤ۔ یہاں تک کہ سورج کو چھوڑ کر (سورج سے تو پھونک سرکتی تھی، ہم فرشتے تو اس میں بھاگے پھرتے ہیں) تمام دنیا، چاند، خلا، معلوم شدہ سیاروں، نامعلوم شدہ سیاروں، سب کا زر اور زمین آجاتے۔ اس انت سے پہلے سوال اس سب زر اور اس سب زمین کو بلا شرکت غیرے اپنانے کا تھا۔ دنیا کے انت سے پہلے اس ہوس میں یہ خود پھول پھول کر ہاتھی ہوگئے تھے۔ سابق زمانوں میں لوگ پھول پھول کر گدھے، خچر، گھوڑوں اور اونٹوں کی جسامت تک محدود رہتے تھے۔ یوں تو ملک ملک، شہر شہر، گاؤں گاؤں ان کے اثر سے ان کے زیر سایہ، ان کے مرید، ان کے شاگرد بے شمار خودساختہ ہاتھی پڑے ہوئے تھے، مگر ان دونوں ہاتھیوں میں سرخاب کے پر بھی لگے ہوتے تھے، سائنس کے جدید ترین ایٹمی آلات و ہتھیار دنیا کو تباہ کرنے کے لئے اور ویٹو (VETO) کا ہتھیار دنیا کا منہ بند کرنے کے لئے گویا ماریں اور رونے بھی نہ دیں۔ انہیں سائنس پر بھروسہ تھا۔ سائنس کو خود پر بھروسہ نہیں تھا۔ یہ نہیں پہچان سکے سائنس جہاں استاد تھی وہاں اسناد کی محتاج بھی تھی۔ وہ جہاں دوسروں کو فنون شاخوں اور تمیوں کا علم فراہم کرتی تھی وہاں جہل کے علم سے خود محروم تھی۔ وہ خود قوت حیات (LIFE FORCE) کی ماہیت اور کارکردگی کے معاملے میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتی تھی۔ وہ دوسرے سانس سے تادمِ مرگ ہر سانس کی توجیہ و توضیع کرنے کا دم بھرتی تھی۔ پہلے سانس کے معاملے میں مفروضے سے چلنے پر مجبور تھی۔ جبکہ مفروضوں کے خلاف تھی۔ گویا اور کو نصیحت آپ کو فضیحت۔ ان کی سائنس ہی انہیں لے بیٹھی۔ حکم ایزدی سے جب

ہم نے اس بڑے بدمعاش کی لاش کو تلاش کر کے اس کا پوسٹ مارٹم (POSTMARTEM) کیا تو ہم نے اس کی ہوس کی بڈی ایبنارملی اینلارجڈ (ABNORMALLY ENLARGED) پائی کہ آج تک کی بڑھی ہوئی بڈیوں کا ریکارڈ بیٹ (BEAT) ہو گیا۔

روحیں :- توبہ توبہ، لعنت ہو روس اور امریکہ کے ان خود ساختہ (MADE ہاتھیوں پر۔ یہ کروٹ کروٹ دوزخ میں جلیں۔ یہ تو فرمائیے کہ کیا باری تعالیٰ پھر سے دنیا بنا کر اسے آباد فرمائے گا؟

فرشتے :- یہ سوال ہمارے کورس سے باہر ہے۔ ہمیں پڑھایا ہی نہیں گیا احباب عبادت کا وقت ہے، تم بھی عبادت کرو، ہم بھی۔ خدا حافظ!"

بقیہ صفحہ ۲۹ ایک ادھوری کہانی

آج ہم ڈاکوؤں کے شہر میں پناہ گزیں ہیں اور ظلم ہمارا مقدر ہے۔

لیکن مقدر اور ہم کون ہیں ؟

آپ اور میں کون ہیں      اس نے پہلے خود سے استفسار کیا۔

پھر بوڑھے کی جانب جھک کر انتہائی بلند آواز میں سوال کیا۔

لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ      سامنے گذرتی ہوئی لمبی سڑک پر      وہ بوڑھا      جس کا توازن کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے اتنی دور جا چکا تھا کہ      اس کی بلند آواز      دائیں بائیں، آگے پیچھے گونجنے کا ڈھونگ تو رچا سکتی تھی      لیکن لمبی سڑک پر چلتے بوڑھے تک پہنچنے سے قاصر تھی۔

وہ ایک بار پھر کوشش کر کے حلق پھاڑ کر چیخ پڑا۔

"اے بابا      اے بابا"

لیکن چوڑے کندھے والے صحت مند نوجوان کی آواز آج بھی تیز رفتار ٹریفک کے ہجوم میں ڈوبی ہوئی ہے      اور وہ بوڑھا بدستور آج بھی دور      بہت دور لمبی سڑک پر پھاگن کے بید کی طرح کانپتا، تھراتا اور لرزتا چلا جا رہا ہے۔

## صابر فخر الدین

کوئی دن ہونا پڑے گا اور بھی رسوا مجھے
دربدر لے کر پھرے ہے میرا ہی چہرا مجھے

اس کی جب تک چاہ تھی دنیا نے ٹھکرایا مجھے
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

میں تو خود گم کردۂ منزل تھا لیکن رہبرو!
اور بھی بھٹکا گیا ہے میرا ہی رستا مجھے

تم بھی چاہو تو سمندر میں اٹھا کر پھینک دو
پھر کنارے پر لگا دے گا ہر اک لہرا مجھے

مجھ سے "میرا میں" ہی اے صابر خفا ہو جائے گا
اس کا تو ہرگز نہیں تھا کوئی اندیشہ مجھے

● بالمقابل پولس کوارٹرس مین روڈ، یادگیر ۵۸۵۲۰۱ (کرناٹک)

## سخن حسن جاوید

زنگ آلود گئی ذہن کے خم تک نہ رہے
حرف بے معنی بنے خواب ارم تک نہ رہے
سوچتا ہوں کہ میں کم مایہ تمنا تج دوں
میری لغزش، کسی انداز کرم تک نہ رہے
ایسا اٹھے کوئی طوفان سر راہ جنوں
مری پہچان جہاں خیمۂ غم تک نہ رہے
وجۂ پامالیٔ عزت جو رہی اتنی رہی
خود چلیفان حرم، بانگ خرم تک نہ رہے
گردش وقت نے بدلا ہے یہ پہلو کیسا
بات کوئی بھی کہو، بات میں دم تک نہ رہے
وسعت قلب و نظر، اتنی بڑھا لی لیکن
راستے میرے کسی نقش قدم تک نہ رہے
شب وحشت کا وہ بکھرا ہوا منظر جاوید
میری آنکھوں کو جہاں اپنا بھرم تک نہ رہے

● ۹۲۹، بستی حضرت نظام الدین اولیاء بیرون ترکمان گیٹ دہلی ۲

## سردار ایاغ

ذہن کے خود ساختہ خاکوں میں خون بھرنا تو ہے
زندہ رہنے کے لئے ہم کو بھی کچھ کرنا تو ہے

حادثوں کی آگ سے دامن بچائیں کس لئے
موت فی الواقع ہو یا قسطوں میں ہو مرنا تو ہے

آسماں خاموش، دھرتی چپ، فضائیں گنگ ہیں
ایسے عالم میں حسینوں کی زباں "پر نا" تو ہے

حج کی نیت ہو کہ گنگا میں نہانے کی لگن
فاصلہ دیر و حرم کا چل کے طے کرنا تو ہے

شہر میں تنہا بھٹکنے کی سزا سردار ایاغ
اپنی پرچھائیں سے مجرم کی طرح ڈرنا تو ہے

● ۲۷، مین ٹیمپل روڈ، بنگلور ۵۶۰۰۵۱ (کرناٹک)

# آہ! عروج زیدی



نام ○ سید فیاض علی
تخلص ○ عروج زیدی
تاریخِ پیدائش ○ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۳ء
مولد ○ میرٹھ [یوپی]
آبائی وطن ○ بدایوں [یوپی]
شعری و ادبی سفر کا آغاز ○ ۱۹۲۹-۳۰ء
تصانیف ○ عروج کے سو شعر ۱۹۴۲ء
جھلکیاں ۱۹۵۳ء
دلِ لخت لخت ۱۹۶۷ء [غزلیں]
شمعِ فروزاں ۱۹۷۶ء
سفینۂ غزل ۱۹۷۸ء [غزلیں]
زندہ کتبے ۱۹۸۳ء [نثری خاکے]
متاعِ فکر ۱۹۸۵ء [غزلیں]
زیرِ ترتیب ○ لہجے کا چراغ [غزلیں]
ختم المرسلین [نعتیہ کلام]
زندہ کتبے [نثری خاکے، جلد دوم]
وفات ○ ۴ فروری ۱۹۸۷ء [شب میں دس بج کر ۲۵ منٹ] رامپور

## غزل

"عطا شناسِ تجیف" موجِ جی آپ کی | ستم ہے ستمِ رہ دستی آپ کی
مری بزم ہے واقعی آپ کی | کمی ہے تو شاید کمی آپ کی
نہیں اس میں موجوں کی [illegible] نہیں | طرب کار پردہ دری آپ کی
وہاں کس شکایت پہ کیوں [illegible] | جہاں [illegible] ہے وہ بے بسی آپ کی
خراجِ محبت اسے چاہیے | ہماری خوشی پر خوشی آپ کی
اسد آپ نے رات کو دن کیا | مسلّم سخن پروری آپ کی
مری بے عوروی سوز دنیا بن گئی | تماشا نگر ہے گلی آپ کی
جہاں سنگ باری ہے ہر گام پر | وہاں بھی ہے شیشہ گری آپ کی
مسلّم جہاں رہنما آپ ہیں | نظر میں ہے دیدہ وری آپ کی
خدا نے سوا کون بدلے مزاج | خدا ساز ہے رُخی آپ کی

نہ کیوں معتبر ہو کلامِ عروج
قلم کا سفر رہبری آپ کی

لہ الشعراء حضرت علامہ سیف الرحمٰن۔

خود مرا احساس تنہا تھا سراپا زخم تھا
جب کہنے کے لیے میں بھی شریکِ بزم تھا

اب میں اپنے قول کی تردید کر سکتا نہیں
اس کی بابت کچھ نہ کہیے وہ مرا ہم جرم تھا

سنگ باری کی فضا میں کون کرتا احتجاج
میں بعنوانِ وفا پابندِ راہ و رسم تھا

ہر قدم پہ تھے راہ میں کانٹے، اندھیرا، پیچ و خم
وہ تو کہیے میرا رہبر صرف میرا عزم تھا

میں زبانِ جنبشِ چلمن سے نا واقف نہیں
سرد سا لہجہ سہی، جذبہ مرا سرگرم تھا

خود ہی دنیا میرے قدموں میں سمٹ کر آ گئی
جب مذاقِ دنیا داری میں فریب ختم تھا

رُخِ پیشانی شکن آلود تھی لیکن عروج!
اس کے دل کا ایک گوشہ پھول جیسا نرم تھا

# مکتوبات

**تاراچرن رستوگی** ـــــ پر و ماڈی، گوبائی ۱۱۰۰۱۸ ،

شاعر شمارہ ۱۰/ ۸۵ نے قارئین کو اردو کی نئی بستیوں سے متعارف کرایا ہے، جو فی الواقع مستحسن بھی ہے اور اہم بھی ہے۔ بازیافت، چہرہ چہرہ یادیں پر آثار لمحات شاعر کے خصوصی نمبر ہیں۔ غالباً شاعری کے اعتبار سے موجودہ دور دو رہ انحطاط سے مشہور شعری مولوس یوں ہی سا ہے۔ بہرحال المجموع، شمارہ اوراق صحت معیار کا صحتوں کا آئینہ دار ہے

شمارہ ۱۲/ ۸۵ میں غالباً شاعری کی تدریس کا سوال لکھنے والوں کے پیش نظر تھا۔ شاعری کی تدریس ہو یا کسی اور مضمون کی تدریس ایک ترقی تنظیم ہے لہٰذا اس مضمون میں کچھ کہنے کی جسارت کرنا اور متعلقہ تنظیم سے روگردانی کرنا صرف سعی رائیگاں ہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ پہلا مضمون شاعری کیا ہے بری طرح ژولیدگی کا شکار نظر آیا۔ اگر اس موضوع سے مخاطب ہونا ہی پڑتا ہے تو پہلے POETIC MIND ایسی کتابوں کو سامنے رکھ کر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے تو اچھا مضمون کہا جا سکتا ہے مگر اس میں بھی ترقی تعلیم سے روگردانی کی گئی ہے لہٰذا بات گو مگو ہو کر ہی رہ گئی۔

تنقیدی معیار پر نئی شاعری میں قاری کی تخلیقی شرکت بہت حد تک پورا اترتا ہے اور بہت کامیاب مضمون ہے مگر شرکت کے ساتھ تخلیق کا اضافہ غیر ضروری ہے کیونکہ صفت بسا اوقات اسم کی دشمن ثابت ہوتی ہے A G GARDINER نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ADJECTIVE IS THE ENEMY OF NOUN

اردو میں نہ جانے کیوں مثبت اور منفی جیسی بے سود اصطلاحیں در آئی ہیں۔ تنقید تنقید ہوتی ہے، منفی یا مثبت نہیں ہوتی۔ اگر حقیقت بیانی سے کام لیا جائے تو صورت حال یہ ہے کہ فی زمانہ اردو تنقید معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ جریان القلم یا سیلان الالفاظ دونوں تنقید کے لیے کینسر ہیں۔ اس موضوع پر پورا مضمون ہی لکھ کر پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ جو غالباً تکمیل سے محروم رہے۔ ریزہ ریزہ دل و دماغ اور شکست و ریخت کی زد میں آئی ہوئی صحت دونوں کچھ نہیں کرنے دیتے۔

دونوں شماروں میں افسانے خاصے اچھے ہیں۔ اور دونوں ہی شاعر کی مخصوص روایات و روایت کے آئینہ دار ہیں۔ روایت کو روایت سے ہم کنار رکھنا مشکل کام ہے مگر شاعر یہ کام کر رہا ہے۔

**مجتبیٰ حسین** ۱۷۔ این آئی ای کیمپس صدری اور وجد و مارگ۔ نئی دہلی

شاعر باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اردو کی نئی بستیاں والا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ مجھے اردو کی ان نئی بستیوں میں جانے کا موقع ملا ہے۔ اردو کے ان پرستاروں نے اجنبی دھرتیوں میں جس طرح اپنی

وطن اور کلچر کی حفاظت کی ہے وہ حیرت ناک ہے۔ کئی اہم شاعر و ادیب اجنبی ماحول میں تخلیق کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں کناڈا کے ایک شاعر خالد شمیل کا شعری مجموعہ میرے پاس آیا ہے، بہت اچھا ہے۔ آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ شاعر میں اردو کی نئی بستیوں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو جگہ دے کر آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔

**سلطان سبحانی** ۔۱۹۳، ایم ایچ پی، کالونی مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

شاعر کے دو شمارے ایک ساتھ دستیاب ہوئے سرورق پر اردو کی نئی بستیاں دیکھ کر چونک اٹھا۔ اداریہ پڑھ کر احساس ہوا کہ شاعر ایک بے حد اہم سفر پر نکل پڑا ہے۔ میری دانست میں اردو صحافت کا یہ پہلا سفر ہے جس میں ہند و پاک اور بنگلہ دیش سے باہر بسی ہوئی اردو نے تمام دنیاؤں کو دریافت کرنے اور انھیں ایک ہی رشتے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس وقت جب کہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اردو کی مارکیٹ ہیل اور کسی بہار کے پڑھ اور پھیل رہی ہے ہمارا فرض ہے کہ اس کی مستور سارے عناصر۔ وہ ہمارے ہی جسم کا ایک حصہ ہے۔ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ہم الگ الگ صورتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

دنیا کے بہت سارے ممالک سے اردو کے رسائل، اخبارات ڈائجسٹ اور سووینئر وغیرہ شائع ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اردو وہاں بھی۔ وہ بے ہنگام کسی کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں شاعر کے اس شمارے نے دیار اجنبی میں بسے ہوئے اردو کے بہت سارے شعرا، افسانہ نگاروں کو ایک ساتھ پیش کیا ہے اور قابل قدر تخلیقات دی ہیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ شاعر اردو کا ایک معتبر رسالہ ہونے کے ساتھ اردو کا ترجمان بھی ہے۔

محترم رام لعل اردو کے ایک نہایت اہم افسانہ نگار ہیں اور ان کے بارے میں اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بذات خود اردو افسانہ کا ایک مستحسن حصہ بن چکے ہیں۔ ان کی محنت اور صلاحیات یقیناً قابل احترام ہیں۔

**عزیز اکبر آبادی** ۔ ۔۔۔ علی نعیم خان نئی بستی آگرہ ۲

دو ماہ کے شاعر وصول ہوئے۔ ملنے کے بعد ظاہر ہے معلوم ہوا کہ شاعر کا ۱۹۸۵ء کا سفر تمام ہوا اور اب عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ ۱۹۸۶ء میں قدم رکھا ہے۔ آپ جیسے اولوالعزم ۔۔۔ دو ہی ایسے ہیں ۔۔۔ شاعر کے تواب ضرور ۔۔۔ شمارہ معیاری ۔۔۔ دلی مبارک باد قبول ۔۔۔ شمارہ نمبر ۱۱ میں کچھ باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول ۔۔۔ یاد میں کہتا ہوں ۔۔۔ پر ملک زادہ جاوید صاحب ۔۔۔ ان کے مقطع کا مصرعۂ ثانی خارج از بحر ہے ۔۔۔ شعر کا مصرعۂ ثانی ہمارے پاس

صحیح ہے وہ بہت ہی نفیس ہے۔ آفاق صاحب ناصری کے مطلع میں تعیین کی کمی بہت زیادہ کھٹک گئی ہے۔ عامر باطلی کی غزل کا مطلع دولخت ہے۔ یہی حال اور دوسرے کا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۳ پر یوسف بیگ صاحب جلال کی غزل کتابت کی غلطی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں شاید ساجان ہوگا صاحب کا یہ شعر

خدا کرے کہ ملے تو کھلے رمز لامکاں
ہر سمت اک سلسلۂ لامکاں ملا

عمر اور تاثیر رکھتا ہے۔

سب سے زیادہ متاثر حضرت علامہ ربانی تاباں کی ... کیا۔ حاصل شاعر غزل ہے "حضرت وامق جونپوری کی"۔ مطلع شاید یہ تاثر دیتا ہے کہ دوسری قوموں کے پیمبروں نے شاعر کے جسم کو بے سر کر دیا ہے اور اب وہ فرشتوں کے سے سرنگوں ہیں۔ کیا یہ پیمبروں کے مرتبہ کی بے حرمتی نہیں ہے اگر وہ اپنی قوموں کے عمل اور دنیا کی بنا پر سرنگوں ہیں تب بھی پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے روز تمام انسان جسم سالم اور ایک بار دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے؟ زیادہ کیا لکھوں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است"۔

میں مدعا کا مقصد شاعر کے ناطق حسن میں ہی ہے۔

**وامق جونپوری** ۔ لال کوٹھی، پوسٹ ڈاکخانہ ... گاؤں ضلع جونپور

شاعر کے شمارے نمبر ۱۱ - ۱۲ - ایک ساتھ ملے۔ اس کے میں تمہارا شکریہ کیا ادا کروں تم اپنا فرض ادا کر رہے ہو اور تم کو دعاؤں میں یاد کرتا رہتا ہوں۔

اردو کی نئی بستیاں اچھا سلسلہ ہے۔ شاعر کو تم نے جو اور طاہری رنگ روپ دے رکھا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کم ہے

تم اب بھی کسی حد تک ترقی پسند تحریک میں عملی طور پر شامل ہو جاؤ۔ اب اس تحریک کے اور تمہارے موقف کوئی فرق نہیں رہا۔ سب ہی ٹوٹ ٹوٹ کر اس میں شامل ہو رہے ہیں پھر تم کو کیا تردد ہو سکتا ہے۔

**رام لعل** ۔ شانتی نکیتن ۔ ڈی ۔ ۲۲۹ اندرا نگر لکھنؤ

شاعر کے دو شمارے ایک ساتھ ملے۔ اردو کی نئی بستیاں سلسلہ کامیاب رہے گا۔ پہلے ہی سلسلے کے بارے میں مجھے بے شمار کتاب کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ہر حرف جاوداں کی کہانی اچھی ہے۔ ان سب کتابوں سے ان لوگوں کے ذہنوں کو سمجھنے اور ان کا پتہ چلتا ہے۔

**اقبال متین** ۔ جبال ۔۔ عثمان کالونی، پانچم پلڑ ۲۲۹ ...

رام لعل سے اردو کی نئی بستیاں کے عنوان سے بہت کچھ پڑھا ہے۔ آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے اس کی اشاعت

کو میرا پیار پہنچا دیجئے۔ ہماری نسل کا یہ بڑا المیہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے اتنی دنیا بھگولی ہو اور ہمیں دولت سے نوازتے ہیں۔ ہم گھر جا کر تو سارے واقعات نہیں ہیں۔ اگر یہ کہانیاں آپ کو رام لعل کی ملی ہیں تو اس سے یار طرح دار سے لیجئے کہ یہ کہانی بہ مسطری را نے بھی دیا کر سے۔ اس سے ہمیں لکھنے والوں کی بھی ہوتی اور آپ کا یہ موصولی سلسلہ اور زیادہ ہوئے گا۔

**عبدالقوی دسنوی** ۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال

ہر کا ہر شمارہ اپنی ایک خاص حولی اور پہچان رکھتا ہے۔ بستیاں نمبر خوب لگا، مجھ کو خوب آیا۔ اس کا آغاز سارک جو ضرورت تھی اس طرح ہمیں اردو زبان کی طاقت مقبولیت کا احساس ہوتا رہے گا اور ہم اس وسیع دنیا کر ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے اور ایک کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ اس سلسلے کے بار مبارکباد قبول کیجئے۔

**مدر پال** ۔ ۲/۲ صدا کی ایکلیو، نئی دہلی ۱۹۔

اردو کی نئی بستیوں کی آباد کاری کی دستاویزی میں یا شمارہ قول واقعی بڑی اہم خدمت انجام دے رہے ہو۔ مستقبل کے ان کو اس سے کھا اور ساس اقدام کیا بہت ضروری ہے۔ کی ہمت اور لگن سامنے رکھے۔

**مشفق** ۔ ی۔ ۵۰۰، وہاں کھیتی، کوانڈوں نیو، کلکتہ

شاعر کے دو تازہ شمارے دیکھے، حسب معمول پسند آئے۔ میں کچھ جیرنیں بھی معمول ہیں۔ اردو کی نئی بستیاں کا سلسلہ ہے۔ اردو کی ان نئی بستیوں کی روایت بھی ایک کارنامے ہیں۔ اردو زبان وادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ شاعر اس کا خوش گوار اثر پڑے۔

**انصاری** ۔ ۱۶/۱ پریڈ ۔ کانپور۔ (یوپی)۔

اردو کی نئی بستیاں میں آپ نے باہر کے افسانہ نگاروں کے افسانے شائع کئے ہیں ان سے کچھ تازگی کا احساس تو ہوتا ہے مگر کچھ ایسا بھی ہونا چاہئے جس سے معلوم ہو کہ غیر ممالک میں ان کی زندگی کے کیا مسائل ہیں، کیا محسوسات ہیں اور اس کے اظہار سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ہر چند یہ جاؤ کرکے یہ افسانے پڑھے ہیں، وہ رفتہ رفتہ افسانے کے فن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جارہے ہیں۔

**افضال مرزا** ۔ ۲۰/۲ کالج اسٹریٹ، بیگم بیش روڈ، کلکتہ

انسانی جسم میں دل کی جو حیثیت رکھتا ہے، اگر دل صحیح کام نہ کرے تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چہرے کی چمک دمک اور آب و تاب سیاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کسی رسالے کا اداریہ ہوتا ہے جسے میں رسالے کا دل کہتا ہوں۔ ایسے ہی دیگر رسائل اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے اداریئے حروں سے کہیں زیادہ اہم مانے جاتے ہیں۔ بڑے لوگ اور ورا دہ ان اداریوں کو ہی اہم جانتے ہیں۔ میرے خیال میں شاعر

کے اداریے اس کے مندرجات سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اردو زبان وادب کے رفتار بتاتے ہیں۔ ہمارے ماحول کی نبض ہیں۔ دیگر رسائل کے اداریے دبی گھسے پٹے اور فرسودہ ہوتے ہیں جبکہ شاعر کے اداریے کتابی شکل میں مرتب کیے جانے کے لائق ہیں۔

اس کے علاوہ سادہ کس اپنی روایت کا حامل تخلیقی سلسلہ ہے اس سے ماضی کے قدآور اردوں کا ذکر تازہ ہوتا ہے۔ اس دور میں اس کی اتنی ضرورت ہے کہ شاید کسی بھی دور میں نہ رہی ہوگی۔ آپ نے بہ طور ایک خاص وقیع مواد مہیا کیا ہے۔ مبارکباد۔

مکتوبات، نقد و نظر، رفتار ادب اور دوسرے مسائل جیسے اہم ترین کالموں کی کتابت اس قدر باریک ہو رہی ہے کہ پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر صفحات کم ہیں تو دوسری تخلیقات کو کم کیجئے اور ان اہم صفحات کی کتابت قدرے روشن کروائیے۔

**ظفر ہاشمی** ۲/۱ ۴ نصرت کدہ، وڈرکس طیب کالونی، جمشید پور

۳۰۰واں شمارہ ہر زاویہ سے انوکھا اور سنگ میل بہ حیثیت میں آپ کے حسن انتخاب اور حسن ترتیب و تہذیب کی آب و تاب قابل داد ہے۔

نظم نگاروں میں بالخصوص مظہر امام کے صدائش کار رشید امجد، یر مسعود اور اسعد ہاشمی کی تخلیقات دلچسپ دل مقام رکھتی ہیں۔

ظہیر یہ اور ماحیات میں پرویز یداللہ کا مضمون نئی سمت و رفتار کا تعین کرتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس کا انتخاب عالمی ادب میں بھی کیا جا سکتا ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

محترم یہ مسعود اپنے ہر مضمون اور مقالے میں کسی مباحث کا اختتام بھی کرتے ہیں اور اہتمام بھی مثلاً

شاعری زبان سے انہوں نے ایک جگہ لسانیات کو مباحثہ ہے اور دوسری جگہ اس کے تمام لا محدود تناظر کو لیا ہے۔

اس طرح انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بھی ملا ملا کر یکجا ان کا یہ اقتباس بھی قابل ذکر ہے۔

> کلاسیکی شاعری کی لطافت کے مقام تک ہم
> لاسیکی شاعری کے وسیلے سے پہنچ سکتے ہیں۔ ص ۱۵

**شاذ رحمانی** ۔ ملا مارکیٹ، کشن باغ ۔ ۵۰۱۴۰۵ (بہار)

شاعر کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً نصف ماہ ہو چکا تو میں نے اس قدر تاخیر کا سبب خط لکھ کر معلوم کرنا چاہا کل ہی میرا خط لکھا ہے اور آج شاعر کے دو شمارے اکتوبر و نومبر کے ملے اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر آفسیٹ پر شائع ہونے کے بعد کافی دیدہ زیب اور دلکش ہو گیا ہے لیکن اس کی طباعت میں تھوڑی سی خامی نظر آتی ہے۔ کہیں آئینے کی طرح صاف و شفاف اور کہیں اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ بس اس طرف تھوڑی توجہ دینے کی ضرورت ہے اس کے بعد شاعر کا ہر ورق مکمل ماہتاب کی ماہتابی نظر آئے گا۔

شاعر میں جو ان دنوں حسین و خوش گوار تبدیلیاں آئی ہیں وہ سب آپ کے اعلیٰ ذوق و ادب شناسی کی علامت ہیں۔ سرورق کی

چھپائی پشت پر زیادہ توجہ دینا ضرورت سمجھتا ہوں آپ کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔ اس کے علاوہ چہرہ چہرہ ایرانی اور رنگ مدر لفظ لفظ ہے تمام چیزیں یقیناً شاعر کے حسن معیار میں اضافہ کرتی ہیں اور آج کے تمام دوسرے ادبی جرائد و رسائل سے بالکل منفرد نظر آتی ہیں۔

رام لعل کی اردو کی نئی بستیاں ہر لحاظ سے معلوماتی ہے۔ اگرچہ موصوف افسانہ نگار ہے اس سے قبل بھی اس نوعیت کی چیز خواب خواب سفر شائع کی ہے لیکن سفرنامہ لکھنا بھی ایک طرح کا آرٹ ہے جو سب کے بس کی بات نہیں۔

اردو کی نئی بستیاں کے عنوان سے جتنے افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوئے ہیں سب اچھے ہیں اور جو موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے متاثر کرتے ہیں۔ نظمیں اچھی ہیں لیکن غزل کا حصہ اتنا عمدہ نہیں۔ غلام ربانی تاباں کا مطلع بہت پسند آیا ہے

> کس نے کہی کہ جانب صحرا چلے گئے
> دیوانے کب کے عزم تو پہلے چکا گئے

شمارہ سو کی تمام غزلیں اچھی ہیں لیکن شمیم انور کی غزل کا ساز انداز کا مطلع میں صحت زبان کی بجائے صحت آذر ہو جاتا ہے اسے سراسر کتابت کی غلطی کہی جا سکتی ہے۔ علی احمد جلیلی کا یہ شعر

> سے یاد آئی تیرے شہر کی وہ گلیاں اب تک

قابل توجہ ہے۔ اس میں ذرہ برابر معلوم پڑتا ہے۔ انیس نگار، میر مسعود اور ساحر ہاشمی جیسے ماہرین کے مقالات پڑھ کر خصوصاً انیس نگار کا مقالہ نہایت معلوماتی، جامع اور پر مغز ہے۔ انہوں نے کرار ح کے قول کے مطابق یعنی الفاظ و ترتیب جو شاعری کی جان ہے اچھے اور دلچسپ انداز میں ان پر بحث ہوئی ہے۔ پڑھ کے بعد ذہن خشک کی بجائے تر ہو گیا۔ یقیناً وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

**فرحت جہاں** ۔ کو پی ۱۲/۲ مسید محلہ، بلند شہر یو پی

شاعر کا ہر شمارہ نئی لذتوں سے آشنا کرتا ہے حالانکہ آج کل تو رنگ محل ہے اور جو انواع و اقسام کے رسالے نکل رہے ہیں اور جن کو لوگ بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں کبھی سیدھا آتے ہیں کبھی شیش محل میں سحر کی وحشت دور کرنے کے لیے اور کبھی چھٹے سائے کی تلاش میں، گویا لمحہ بھر کی مسرت کے لیے۔

لیکن شاعر میں تو وہ ورق ورق زندگی کی حقیقتیں اس کی تلخیاں اس کی افسردگیاں پڑھنے کو ملتی ہیں اور وہ زیر لب مسکراہٹیں بھی جو کبھی نظر آتی ہیں مضامین اور افسانوں میں متنوع رنگ محسوس ہوتی ہے۔ گویا ہر شمارہ ایک نیا انداز لیے نکلتا ہے کہ کتنے انداز سے آپ نے شاعر کو وقار بخشا ہے۔ مشاہیر اہل قلم کی تخلیقات اور ان کے ساتھ نئے قلم کاروں کو ترتیب دیا۔ میرے خیال میں شاعر کو یہاں تک لا کر آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے جوکھم والی بات ہے۔

آپ کا اداریہ سوچ پر ایسی ضرب کاری لگاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا جوش بیدار ہوتا ہے گویا آنکھیں کھول لیجئے کو دل چاہتا ہے۔ بھوپال میں محترمہ تنصیفہ رحمت صاحبہ کی کوششوں سے جگہ جگہ ابتدائی اردو پڑھانے کے اسکول کھولے جارہے ہیں۔ عالی شان بلڈنگیں نہیں، عمارتیں ایسی کوئی کام جام نہیں۔ بس ایک چھوٹا سا کمرہ، اس میں فرش ہو دیکھی ہوئی اور اس پر بیٹھے

ہوسنے تھے ــــ

کالا ینٹا کے لیے میں بہت کوشش کی۔ میں نے بغیر کسی معاوضہ کے اردو پڑھانے کے لیے کہا۔ لیکن لسانی عصبیت رنگ لائی اور وہاں کی پرنسپل نے کسی طرح اسکول میں اردو پڑھانے کی اجازت نہیں دی۔ بہر حال سکڑی کے نقش قدم پہ چلنا ہوگا کرتے رہو، لیکن جالا بنانا نہ چھوڑو۔

ہاں شاعر کے لیے ایک مشورہ ضرور دینا چاہتی ہوں کہ اس میں ایک افسانہ دوسری زبان کا ضرور شامل کیا جائے۔ اردو ادب میں ترجمہ کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ اکثر ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ہر شمارہ میں ہو تو بہتر ہے۔

**وسیم احمد قریشی** ـــــ قاضی زادگان، چاند پور ضلع بجنور (یوپی)

سال ۸۶ء کا آخری شمارہ دیکھا، بہت خوب ہے۔ خاص طور پر مضمون "شاعری کیا ہے" پسند آیا۔ "کلاسیکی شاعری کیا ہے"۔ اور "شاعری کی تخلیق شرکت" یہ دونوں مضامین کچھ خاص نہیں رہے، تشنگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسانے اور منظومات شاعر کا اپنا معیار ہیں۔

شاعر اور ایسے ہی ادبی رسائل کی اپنی حیثیت مسلم لیکن کبھی کبھی بہت افسوس ہوتا ہے اس وقت جب ایک عام اردو داں قاری ان رسائل کو خریدنے ہی سے نہیں بلکہ پڑھنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ ہمارے اردو ادب اور اردو کے قارئین کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ خلیج بے فکری، شعوری۔ اردو کے ادبا، شعراء اپنے تخلیقی سفر میں آگے بڑھ رہے ہیں اور اپنی نثر و نظم تخلیقات سے اردو زبان و ادب کو مالا مال کر رہے ہیں جب کہ اردو کا قاری وہی پرانی دس، پندرہ سال پیچھے ہی کے ادب کو کچھ ہونے ہے [؟] اس میں خواص شامل نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے بہترین رسائل عام طور پر مشکلات کا سامنا کرتے ہیں جب کہ اردو کے نیم ادبی، اور فلمی رسائل کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ عوام اچھے ادب کو پسند کیوں نہیں کرتی؟ میری ناقص رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھا ادب ایک عام قاری کی فہم سے بالاتر ہوتا جا رہا ہے۔ عوام میں سے خواص نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ قارئین کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟ آپ رائے دیں۔

**نظام بالف** ـــــــــ معرفت امیر حسین

جی۔ ۱/۶۲۵، ، مروالی، مراد آباد ـــــ (یوپی)

جلد ۵۷ شمارہ ۱۲ میں آپ نے خاکسار کی ایک نظم "اقرات" شائع کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ زیادتی یہ ہوگئی ہے کہ جہاں میرا پتہ لکھا تھا وہاں یوسف جمال صاحب کا پتہ لکھ دیا ہے اور جہاں یوسف جمال کا پتہ ہونا چاہیے تھا وہاں میرا پتہ لکھ دیا گیا ہے۔ اب میں اس المیہ کو کیا کہوں!

اس شمارہ میں آپ نے تین مقالے شامل کیے ہیں [انجم] کمار، نیر مسعود، اور اشتہر ہاشمی کے] تینوں ہی مقالے خوبصورت اور معیاری ہیں۔ اشتہر ہاشمی کا "نئی شاعری میں قاری کی تخلیق شرکت" خاص طور سے اس لیے بھی توجہ چاہتا ہے کہ اس میں تخلیقیت کو ایک نئے زاویہ سے دیکھا گیا ہے اور اس سے قاری کا انسلاک ایک ضابطے کے ذیل میں روا رکھا گیا ہے۔ منظومیں بہتر اچھی ہیں۔ مظہر امام، وقار واثق، شاہد تسنیم، محسن ملگانوی، قمر سرشار وغیرہ سب نے الگ الگ اپیل کیا۔ نظموں کے متعلق تو یہ عرض ہے کہ اس بار آپ نے صرف دو ہی نظمیں شریک اشاعت کی ہیں ایک میری اور دوسری یوسف جمال کی۔ اور ان دونوں میں یوسف جمال کی نظم کہ سے بہر حال زیادہ اچھی ہے۔ پیروڈی کا طنز و مزاح ان کا ستا تحسین کا رڈ ہے۔

لعل ایسی کے تحت آپ کا اداریہ پوری توجہ چاہتا ہے آپ بہت بے لاگ لکھتے ہیں جس میں اکثر تلخی اور ترشی بھی آ جاتی ہے جس کی تشریح لوگوں کے اندر تک دھنس جاتی ہے مگر یہ کیا جائے ہمارے اردو ادب کی بہت سی کمیاں ہیں جن میں مصلحت کوشیاں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ ایک ریڈیو مذاکرہ میں میں نے آپ کے اس اداریے کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ کیونکہ وہ موضوع ہی ایسا تھا، اردو میں ادبی رسائل کی کمی کیوں۔

## بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴۔ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت بمبئی — وقفۂ اشاعت ماہنامہ

پرنٹر و پبلشر ناظر نعمان صدیقی — قومیت ہندستانی

پتا دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی۔۴ — ملکیت ناظر نعمان صدیقی

ایڈیٹر افتخار امام صدیقی — قومیت ہندستانی

پتا دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی۔۴

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط: ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء

[بقیہ صفحہ ۴۴ سوانح غالب کا ایک پہلو ...]

اگر یہ صحیح ہے تو یہ "استاد" ہونے والی بات غیر ضروری ہو جاتی ہے، اور عبدالصمد کے فرضی ہونے کے بارے میں ایک بظاہر مضبوط دلیل بے کار ہو جاتی ہے۔ غالب کے جن بیانات کی بنا پر قاضی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب نے عبدالصمد سے اصلاح شعر بھی حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے، ان کے بارے میں مالک رام صاحب کا محاکمہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان بیانات سے اصلاح شعر کے معنی مستنبط نہیں ہوتے۔ یوں بھی، عبدالصمد جو بھی رہا ہے، شاعر نہ تھا۔ لہٰذا اس سے اصلاح شعر حاصل کرنے میں کسی قسم کا اعزاز نہیں، بلکہ ایک طرح کی توہین ہی ہے، کہ استاد بنایا بھی تو ایک غیر شاعر کو۔

لہٰذا عبدالصمد کے وجود پر مالک رام صاحب کے دلائل، غالب کے مزاج و افتاد طبع سے ان کی وجدانی مناسبت کے آئینہ دار ہیں اور مدلل فکر کا بھی حکم رکھتے ہیں۔ ان کے دلائل پر اضافہ کیا جا سکتا ہے، ان کے بعض استدلال بہت مستحکم نہیں ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا فیصلہ اس وقت تک کی معلومات اور فکر کی روشنی میں صحیح ہے۔

# کتب و رسائل

○ **یادگارِ غالب۔** مولانا الطاف حسین حالی نے لیے نادر مرزا غالب کی سوانح لکھی تھی جو ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ اسی معتبر اڈیشن کا عکس غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ضخامت ۴۳۰ صفحات۔ قیمت ساٹھ روپے۔
— پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔

○ **صائب** [سہ ماہی] ٹونک سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے کا صائب نمبر شائع ہو گیا۔ استاد صائب ٹونکی کے فکروں کی تفہیم و تعین کے لیے ایک معیاری کوشش جس میں ۲۲ مقتدر اہلِ قلم حضرات کے تنقیدی و تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ اس خصوصی نمبر کو صائب مرحوم کے شاگرد اکبر شہبال ٹونکی نے ترتیب دیا ہے۔
— صفحات ۲ قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ سرایا دواخانہ، حافظ اسٹریٹ، ٹونک (راجستھان)

○ **اسباق** [ماہنامہ] کا ایک شمارہ قاضی مشتاق احمد کے نام معروف افسانہ نگار و ادیب قاضی مشتاق احمد کے فن اور شخصیت پر ایک معیاری خصوصی اشاعت چند طویل مختصر مضامین تصاویر اور خطوط کے ساتھ قاضی مشتاق احمد کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ۸ افسانوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ ضخامت ۱۴۴ قیمت ۱۲ روپے۔
— پتہ: ماہنامہ اسباق ۲۰۲۔ بیلا پارک، ایرو ڈروم، پونہ ۳۲ (مہاراشٹر)

○ **اسبابِ بغاوتِ ہند۔** سر سید احمد خاں کی مشہور کتاب جس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی تھی۔ اسے جناب فوق کریمی نے پہلی بار ۱۹۵۸ء میں اپنے مختصر سے مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا تھا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۷۱ء میں نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔ یہ تیسرا اڈیشن ہے اس میں فوق کریمی صاحب نے ایک اور مبسوط مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح یہ اہم ترین کتاب اور زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت بیس روپے۔
— پتہ: یونیورسٹی پبلشرز، کریمی بلڈنگ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

○ **نئی ہندی شاعری۔** ڈاکٹر صادق نے ہندی کے ۱۱ ہم عصر شعراء کا ایک خوب صورت انتخاب پیش کیا ہے جو نئی ہندی شاعری کا تعارف ہے۔ ہر شاعر کا مختصر سا تعارف اس کی فن کارانہ خصوصیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنے موضوع پر پہلی اہم کتاب۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۲۵ روپے۔
— پتہ: اے جی ۱ ایم سی اے، اس پوری، بوڈیا۔ نئی دہلی۔

○ **پتھروں کے گیت۔** محمد اقبال اسیری [?] کے تیس افسانوں کا انتخاب شائع ہو گیا ہے۔ صوبہ اڑیسہ کی تہذیب و ثقافت، تمدنی رجحانات، تاریخی روایات اور جغرافیائی اقدار کے پس منظر میں لکھے گئے یہ افسانے کہانی کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۴۵ روپے۔
— پتہ: ایڈیشنل پبلشرز، ناگپاڑہ اسٹریٹ (ملحقہ) ڈونگری۔ بمبئی ۹۔

○ **سرائے میں شام:** صاحبِ اسلوب شاعر و نثر نگار عالم نقوی [?] کا تیسرا شعری مجموعہ جسے ہم عصر اردو منظر کے بعد شاعری کی ایک اہم کتاب شائع ہو گئی ہے۔ طلب کریں:
نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)

○ **فرار:** اردو کے نامور صحافی، افسانہ نگار اور ناول نگار ظفر پیامی کا نیا ناول جس میں بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان کو تقسیم در تقسیم ہونے کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے مصنف کی آپ بیتی بھی ہے ایک دل چسپ گرو ہم ناول۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت: چالیس روپے۔ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی۔

○ **پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش**
احمد مریم [?] کا تحقیقی مقالہ جس میں پریم چند کے عہد کا جائزہ، طبقاتی کشمکش کی تعریف اور اس کی تاریخ، پریم چند کے ناولوں کا تجزیہ، طبقاتی کشمکش کی نوعیت اور اس کے اسباب و نتائج پر بحث کی گئی ہے۔ پریم چند پر ہونے والے تحقیقی کاموں میں یہ کتاب اہم ہے۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ۲۰ روپے۔ تقسیم کار: گوہر بک ڈپو، قائدِ ملت روڈ، مدراس ۵۔

○ **گلبن:** [ماہنامہ] احمد آباد (گجرات) سے شائع ہونے والا ادبی ماہنامہ ہر سال پابندی کے ساتھ عام شماروں کے علاوہ خوب صورت سالنامہ شائع کرتا ہے۔ جنوری فروری ۱۹۸۷ء کے اس شمارے میں ہند و پاک کے مشاہیر قلم کاروں کے ذریعہ ۱۱ شعراء کی غزلیں، ۱۰ گراں قدر مقالے، ۲۸ شعراء کی نظمیں، ۸ افسانے، ۹ طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات، ۸ کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور ۱۱ اہم تفصیلی خطوط شامل ہیں۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت ۹ روپے۔
مدیرانِ اعلیٰ: ثریا ہاشمی، سید ظفر ہاشمی۔ پتہ: ۴۹/۲ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی، شاہ عالم، احمد آباد ۲۸، ۳۸۔

○ **صلیب کا درد:** ڈی اے پیرلیس قربان سرار آبادی [?] کا دوسرا مجموعۂ کلام جس کے پہلے حصے میں کلام علماء کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر غزلیں نظمیں دی گئی ہیں اور دوسرے باب میں غزلیں اور موضوعاتی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ سادہ لفظوں اور پُر شعری اسلوب میں تاثراتی، سماجی، موضوعاتی اور سوانحی مواد کو نظم کرنے کا سلیقہ اور پھر غزلوں میں عصریت اور شعریت۔ ایک قابلِ مطالعہ شعری مجموعہ۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت بیس روپے۔
پتہ: ڈی اے پیرلیس قرباں، بی ۵۰۰ آواس وکاس کالونی، سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)۔

○ **عکس برعکس:** کہنہ مشق استاد شاعر شارق جمال کا اولین شعری مجموعہ۔ جدید فکر کے حامل و شعری اسلوب میں ہم آہنگ عمل، الفاظ کی نئی تخلیقی معنویت اور عصری حسیت کا فن کارانہ اظہار۔ ضخامت: ۶۶ صفحات۔ قیمت ۱۵ روپے۔
پتہ: ادارۂ غالب، تکیہ معصوم شاہ، موسیٰ پور [?]، بانکمہ۔

○ **حرفِ مکرر:** شہباز الاحد [?] مرحوم حکیم مسعود (بست ریکردی [?]) کا اولین شعری مجموعہ جسے اتر پردیش اردو اکادمی نے ڈاکٹر اعظم چند برتر کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ ۴۴ صفحات کو مجید مرحوم کی دل چسپ تحریریں الفاظ بھی شامل ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۴ روپے۔ پتہ۔ اتر پردیش اردو اکادمی، [illegible] لکھنؤ (یوپی)

○ **ذکر و فکر** [ایک علمی دینی اور ادبی ماہنامہ] کا مصنف اور صاحبِ اسلوب قلم کار پروفیسر مولانا احمد فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والا گراں قدر جریدہ جس کے شمارۂ اولین میں کئی پُرمغز مقالے جائزے اور تحقیقی مواد دیا گیا ہے۔ زرِ سالانہ ۶۰ روپے، فی شمارہ ۶ روپے۔ ترسیلِ زر اور اشتہارات سے متعلق مراسلت کا پتہ: پی۔ ۱۰، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

○ **ارمغانِ سیفیہ:** مولانا محمد حسین مرحوم (بانیٔ سیفیہ کالج) کی شخصیت اور کارناموں کا پرتو شعبۂ اردو سیفیہ کالج (بھوپال) کا یہ علمی و ادبی مجلہ نہایت ہی دیدہ زیب کتابت و طباعت متنوع مواد کی خوب صورتی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ بانیٔ سیفیہ کے متعلق تاثرات و احوال۔ مرحوم کے فرزند فخر الدین صاحب کے ساتھ ایک شام کے تحت ان کے متعلق مضامین، سیفیہ کے پرنسپل سائنس اور کامرس فیکلٹی کا تفصیلی تعارف، ان کے کارنامے، سیفیہ کے عنوان سے سیفیہ پر نظمیں۔ سیفیہ سے مختلف شعبوں میں جو کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کی تفصیل مضامین کے ذریعہ۔ تیسرے سال میں ایک یادگار شام ایک پُر وقار تقریب پر کی گئی تقریریں پیش کی گئی ہیں۔ بھوپال ہمارا شہر کے عنوان سے بھوپال پر نظموں کے علاوہ بھوپال کی اہم شخصیتیں، طنز و مزاح نگار: بھوپال سے متعلق کچھ اہم قلم کاروں کے تاثرات دیے گئے ہیں اور آخر میں ... کے عنوان سے نظمیں، ایک پُر اثر افسانہ اور دو بہت اہم اور تاریخی خط دیے گئے ہیں جو سیفیہ پر پروفیسر عبد القوی دسنوی نے اشتیاق امام صدیقی اور علیم اختر کو تحریر کیے تھے۔ ان کے علاوہ ۲۹ تصاویر کے ذریعہ اشخاص اور سیفیہ کے ماہ و سال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان شخصیات کے تاثرات بھی اس مجلہ میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں جو بھوپال کی اس عظیم دانش گاہ میں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے ہیں۔ مرتبین: عبد القوی دسنوی، محمد نعمان۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔
پتہ۔ شعبۂ اردو سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال۔

## اردو ترقی بورڈ اور ریاستی اردو اکادمیوں کے درمیان رابطے پر زور

مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم و ثقافت مسز کرشنا شاہی نے اردو زبان کی یکساں ترقی کے لیے اردو ترقی بورڈ اور ریاستی اردو اکادمیوں کے درمیان مناسب رابطے پر زور دیا ہے ترقی اردو بورڈ کی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومت اردو سے گہرا قریبی تعلق ہماری ثقافت اور قومی یکجہتی کی ترقی میں خاص دلچسپی رکھتی ہے ترقی اردو بورڈ کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا رہا ہے کئی ممبروں نے اردو شارٹ ہینڈ اور اردو ٹائپ کے بارے میں [illegible] کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کلاسیں فروغ کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ مختلف اداروں اور رضاکار تنظیموں کو مدد فراہم کرنے کے سوال پر غور کرے۔

## ہندی اردو بہنیں نہیں بلکہ ایک عورت کے دو لباس ہیں

ہندی اور اردو زبان میں کوئی جھگڑا نہیں ہے اصل جھگڑا صرف سیاسی ہے اور حقیقت میں دونوں زبانوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے

ہندی اور اردو کے کئی دانشوروں نے ہندی اور اردو کے آپسی تعلقات کے موضوع پر ایک سیمینار میں ان خیالات کا اظہار کیا اس دو روزہ سیمینار کا اہتمام [illegible] اکادمی دہلی نے کیا تھا۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی کے لفٹیننٹ گورنر جناب [illegible] نے کہا کہ ہندی اور اردو میں جسم اور روح کا تعلق ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان، مذہب اور تہذیب کے نام پر ملک کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش ملک کے اندر اور باہر دونوں طرف سے ہو رہی ہے ایسی صورت میں ادیبوں کو اپنے قلم سے ملک کے ان دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ قلم میں محبت کا قصہ ہو اور بولنے کے معاملے اور لفظوں سے ہی لوگوں میں ترجمانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف نے کہا کہ ہندی اور اردو دو بہنیں نہیں بلکہ ایک عورت ہے جو جب چوڑی دار پاجامہ یا شلوار پہن لیتی ہے تو اردو ہو جاتی ہے اور جب ساڑی زیب تن کر لیتی ہے تو ہندی ہو جاتی ہے دونوں میں فرق بہت معمولی ہے۔

انھوں نے کہا کہ کبیر اور منشی پریم چند ہندی کے بھی ادیب ہیں اور اردو کے بھی۔ پروفیسر اشرف نے کہا کہ دونوں زبانوں میں جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں ایک قومی زبان کی ضرورت ہے جو ہندی ہی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ہندی کو عام فہم بنانا ہوگا۔ ہندی کو سہل بنانے میں اردو سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سابق چیئرمین اور ممتاز مورخ پروفیسر ستیش چندر نے کہا کہ ہندی اور اردو کا تعلق اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ تاریخی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔

## ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو زبان اور صحافت کا اہم کردار

حیدرآباد گورنر آندھرا پردیش [illegible] نے [illegible] میں کہا کہ اردو زبان اور صحافت نے جدوجہد آزادی میں [illegible] حصہ لیا ہے [illegible] زبان نے [illegible] گورنر صاحب [illegible] لوگ [illegible] کی کوشش کے [illegible] دیگر اردو صحافیوں [illegible] کی جانب سے [illegible] صحافیوں کے سلسلے کو [illegible] صدر [illegible] گورنر صاحب نے [illegible] عوام کو بیدار کرنے میں بھی اردو صحافت نے قابل قدر کام کیا ہے گورنر نے اردو صحافیوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کی یکسوئی کے لیے سرکار اور عوام انتظامیہ کو بھی توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ فیڈریشن صحافیوں کے ساتھ ساتھ مالکان کے مسائل پر بھی توجہ کرے۔ انھوں نے اخبارات کے انتظامیہ کو مشورہ دیا کہ وہ عوام کے وسیع آبادی کے مسائل پر بھی مناسب انداز میں توجہ کریں کیونکہ ان میں بیداری لانا ہے اور یہ کام انگریزی اخبارات سے کہیں زیادہ اردو اور دیگر زبانوں کے اخبارات کر سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ آبادی کا ایک فیصد حصہ ترقی کر چکا ہے، [illegible] فیصد لوگ اس کے ساتھ ہیں اور [illegible] فیصد لوگ ان کے دور [illegible] باقی ۵۰ فیصد کسان، مزدور، عورتیں وغیرہ ہیں [illegible] ان شعبوں پر بھی متوجہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ صحافیوں کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے [illegible] پر توجہ دیں۔

گورنر نے آگے چل کر کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو [illegible] اور تلگو کا کوئی لسانی مسئلہ نہیں ہے [illegible] مشہور وکرم راؤ صدر فیڈریشن نے اردو کے کارکن صحافیوں کی حالت کو [illegible] کی حالت سے تشبیہ دی اور کہا کہ حکومت اور انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ اس کا [illegible] اور ریاستی حکومت [illegible] کے مطابق [illegible] قائم کرنا چاہیے [illegible] کو مشورہ [illegible] اشتہارات [illegible] اردو اخبارات کے لیے [illegible] اتر پردیش کی حکومت نے [illegible] صحافت کا ذکر [illegible] اخبارات شائع ہوتے ہیں انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد [illegible] ۳۶ برس بعد بھی اردو صحافیوں کا [illegible] انھوں نے [illegible] اردو [illegible] قرار دیا

## اردو ڈائرکٹوریٹ اردو کا ایک حق ہے۔ بیگ ڈے

سکھ ریاست میں اردو ڈائرکٹوریٹ قائم کرنے کے لیے یہاں کی انجمن اردو [illegible] ایک وفد نے [illegible] کی قیادت میں وزیر اعلیٰ [illegible] بیگ سے ملاقات کر کے ان کا شکریہ ادا کیا [illegible] اردو ڈائرکٹوریٹ کی تشکیل کے لیے [illegible] خاکہ بھی پیش کیا۔ [illegible] وفد نے کہا کہ انھوں نے اردو کو اس کا ایک حق دینے کے لیے پہلا فریضہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام کی تجویز پر جلد غور کریں گے۔

## اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

[illegible] (اردو) [illegible] کانفرنس کا انعقاد [illegible] ہوا جس میں [illegible] ترقی پسند مصنفین [illegible] پر [illegible] اور [illegible] نے اظہار خیال کیا

کانفرنس میں [illegible] کے مطابق [illegible] قرارداد [illegible] اردو کے [illegible] کی ایک [illegible] ہے اردو کا [illegible] مختلف [illegible] ادب کا [illegible] کی [illegible] اردو کا [illegible]

[illegible] کہ [illegible] کی تعلیم [illegible] حکومت کے خلاف [illegible] کے متعدد شاعروں [illegible] اتر پردیش [illegible] کہ وہ [illegible]

[illegible] کیا ہے [illegible] مقام [illegible]

[illegible] ہائی اسکول تک کے طلبا کو اردو سیکھنے کا موقع مل سکے۔

ہم تمام مالکان کے [illegible] سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو کی حمایت میں [illegible] اردو کی حمایت میں [illegible] تیار کرنے میں تعاون کریں

## "صادقین" چل بسے

[illegible] صادقین [illegible] کراچی میں ۱۰ فروری ۱۹۸۷ء کو انتقال کر گئے مرحوم گذشتہ دو ماہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے وہ پہلے [illegible] اسپتال میں [illegible] آئی اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ان کا انتقال ہو گیا

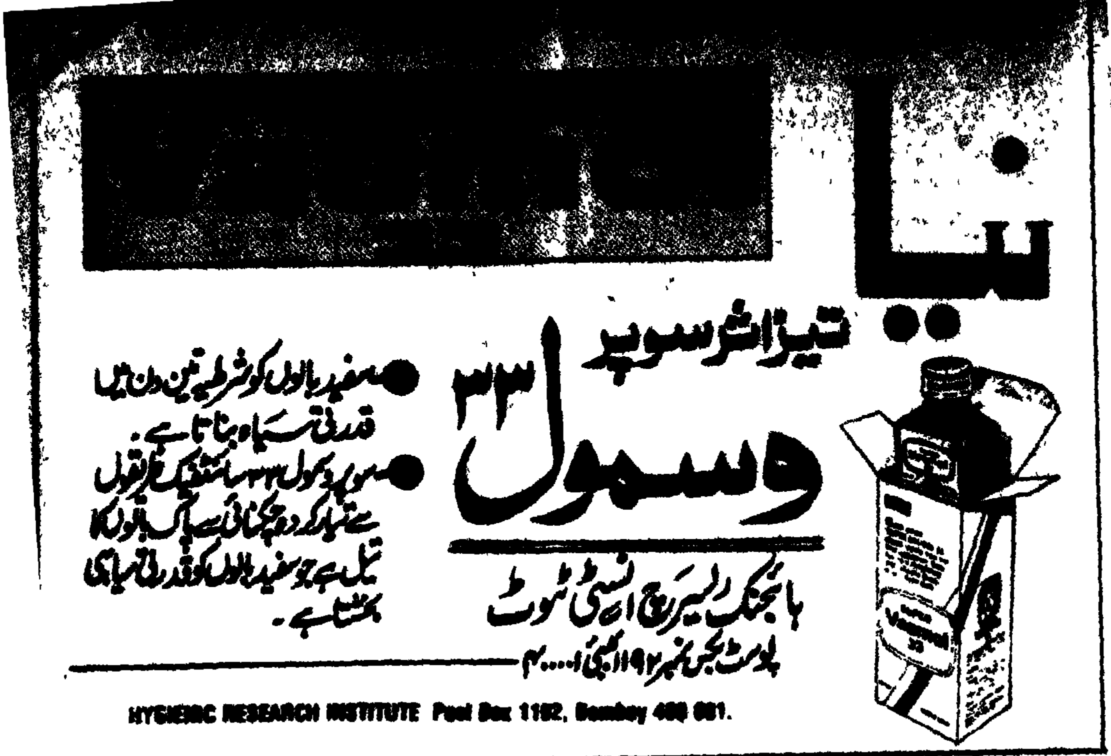
صادقین نے [illegible] کمال حاصل کیا تھا [illegible] پاکستان [illegible] ۱۹۶۰ء میں [illegible]

۱۹۶۱ء میں [illegible] پاکستان آرٹسٹ [illegible] فرانس میں انعام حاصل کیا [illegible] پاکستان [illegible] انگلینڈ، فرانس، ترکی، ایران [illegible] اور دیگر ممالک کی آرٹ گیلریوں میں [illegible]

[illegible] ان کی [illegible] دلکشی ہوتی تھی [illegible] چھپتا [illegible]

صادقین [illegible] مستقل [illegible] آگرہ [illegible] آرٹ [illegible] حاصل

صادقین [illegible]



نیا
تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳
سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
سپر وسمول ۳۳ سائنٹیفک فارمولے سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔
ہائجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001.




IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
253
EXCELLENT
PLAYING CARDS
T.M.R.No.176412
METRO PLAYING CARD CO.

The "SHAIR" (Monthly) Bombay 400 008.

58 Years of Publication ISSUE No:- 2-3- 1987 Telephone No. 35 99

(Publishing Date 27-28)

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57





پرنٹر پبلشر مالک، ناظر نعمان صدیقی نے [illegible]



# فکرِ امروز



*

جب خصوصیاتِ شاعری پر کہیں بحث ہوتی ہے تو ملٹن، شیکسپیئر اور ہومر وغیرہ شعراء کے نظریات بیشتر ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں اور ہم اپنی شاعری کو مغربی شعراء کے اصولِ تنقید پر رکھنے اور تولنے کے خوگر نظر آتے ہیں گیا ہمارے یہاں پانچ سو یا تین سو سال میں کوئی ایک باکمال شاعر بھی ایسا نہیں گذرا جس کا نظریہ شاعری کے متعلق ہمارا خضرِ راہ ہوتا۔ ہم میر و غالب، ناسخ و آتش اور داغ و امیر کو دنیائے شاعری کا خدا سمجھنے میں اپنے معتقدات کی نشاط سمجھتے ہیں لیکن ان کے اقوال و ملفوظات پر ہمارا ایمان اتنا بھی نہیں کہ ہم کم از کم مغربی شعراء کے نظریوں ہی سے بے نیاز ہو جائیں۔

حالی و شبلی جو ہماری قوم اور ہمارے ملک کے علمائے محققین مانے جاتے ہیں، وہ بھی جب خصوصیاتِ شاعری کی بحث چھیڑتے ہیں تو ملٹن اور ہومر کے نظریوں کو اپنا موضوعِ بحث بنانے ہی میں اصابتِ رائے کی تسکین پاتے ہیں اور اگر آج بھی کوئی ادیب اس بحث پر قلم فرسا ہوتا ہے تو وہ مغربی نظریات ہی کو اساسِ بحث بنانا تسکین خیال کرتا ہے۔

[مشاعرہ بزمِ ادب ڈبائی ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کے خطبۂ صدارت سے اقتباس]

**سیماب اکبرآبادی**



# شاعر

اشاعت کا ۵۸واں سال

جلد ــــــ ۵۸
شمارہ ــــــ ۴

۲۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۴ روپے

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

تاحیات خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے (جلد شمارے)

[illegible]

# صرف ایک جھٹکے سے

# رسی کے بل ٹوٹ جاتے ہیں

# اور سب کچھ پیچھے گر جاتا ہے

رسی کے بند
ڈھیلے ہوں تو
اس سے بندھی چیزیں
بھی کھل کھل جاتی ہیں
پورا وزن بیٹھ جاتا ہے
ترقی رک جاتی ہے
متحدہ قوت ہی سے آگے
بڑھ سکتے ہیں

ایک ملک صرف ایک
جغرافیائی وجود کا نام
نہیں ہے بلکہ ایسے مردوں
عورتوں کے مجموعہ کا نام ہے
جن کے اندر مساوات اور
یکجہتی کا زبردست جذبہ موجود
ہو اور ایسے ہی لوگ ملک کو
مضبوط بناتے ہیں

---

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## بساط سخن (جدید)



## جرعات



## آثار لفظ لفظ



## بازیافت



## چہرہ چہرہ یادیں





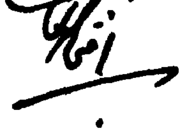
## رفتار

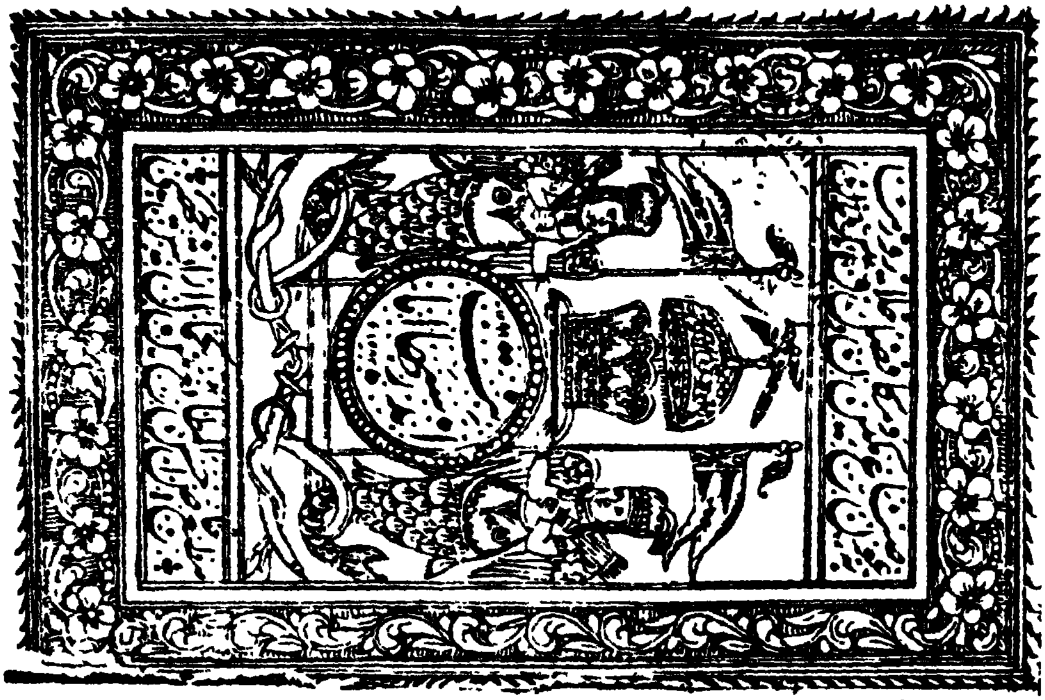
# احتجاج ہی احتجاج

کشت وخوں کرنے والوں ، مذہبی جنونیوں ، قومی یک جہتی کے دشمنوں،
علاحدگی پسندوں ، دہشت گردوں ، چھوٹی ذہنیت کے نام نہاد
سیاست دانوں ، بونی شخصیتوں ، بر خود غلط جماعتوں،
اوچھے مفادات کے لیے فسادات کروانے والوں اور ملک
کو تباہی کی طرف لے جانے والی طاقتوں کے خلاف
احتجاج ہی احتجاج

کہاں ہے دانشور طبقہ ؟ ملک کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں
کے ادیب و شاعر، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے
حساس فن کار ، وطن دوست اور وطن پرست
ہم کیا کر رہے ہیں ؟ ؟
ملک کہاں جا رہا ہے ؟

موجودہ صورتِ حال کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک
پل کے خلاف شدید ترین غم و غصہ اور
احتجاج ہی احتجاج







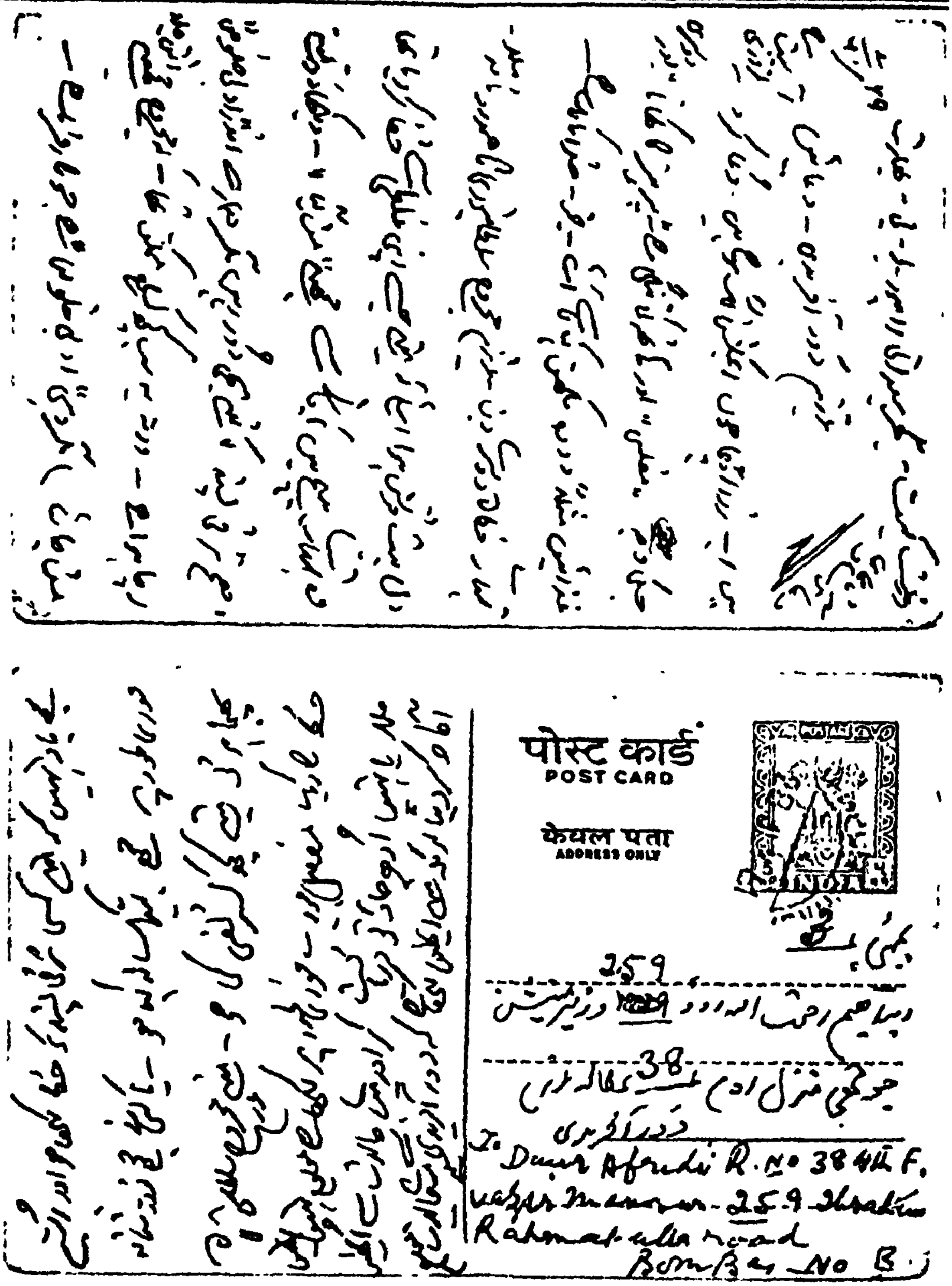
امانت اندر سبھا [۱۲۷۰ھ] کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں انھیں میں سے ایک ایڈیشن مطبع خاص احسن المطابع پٹنہ سے ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوا تھا۔ اسی مصور ایڈیشن کے دو صفحات کا عکس۔ [بہ شکریہ ابراہیم یوسف بھوپال]



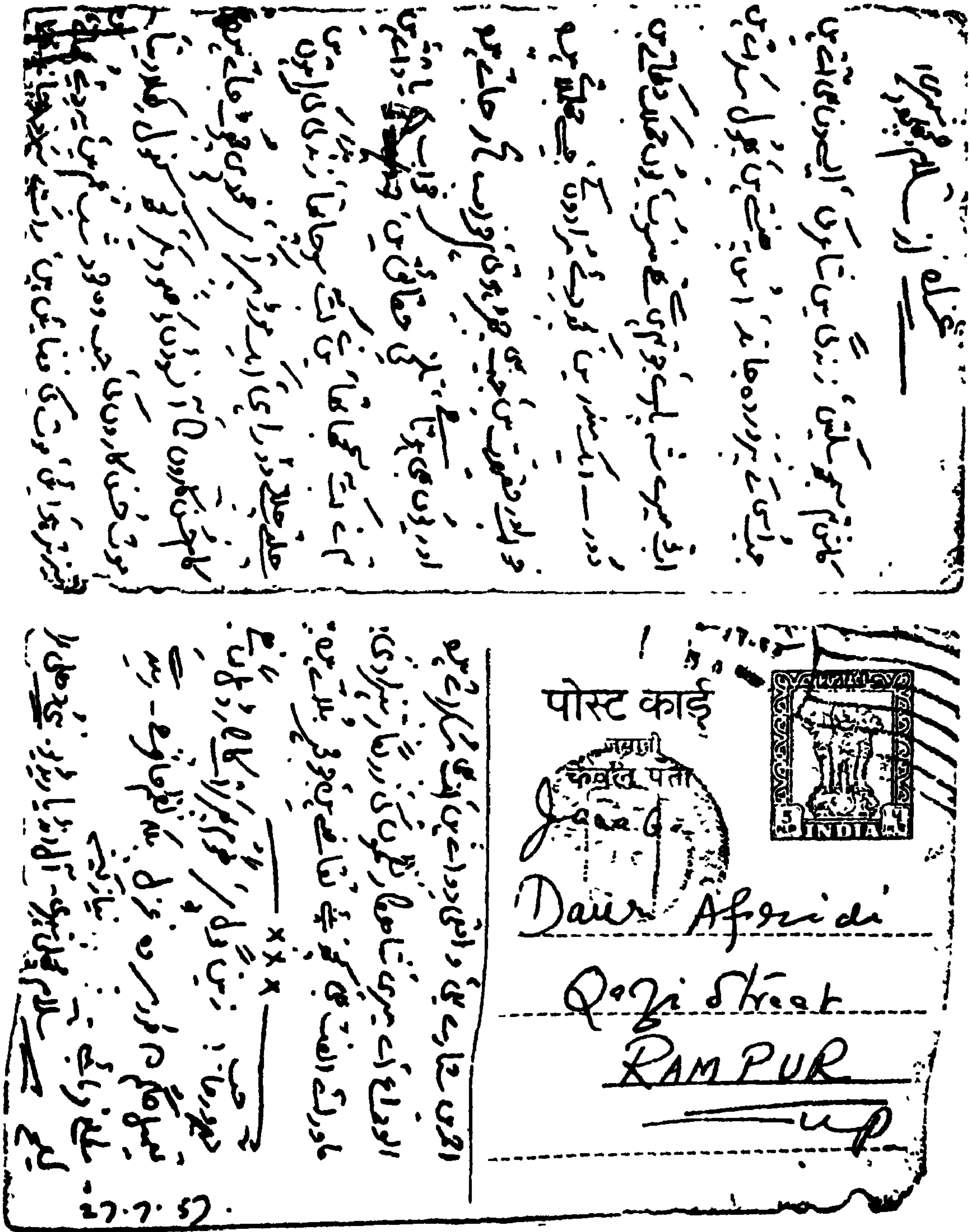
حیدرآباد میں منعقد جشنِ شاہدار (الہ آباد) کے سلسلے میں لی گئی ایک یادگار تصویر ۱۹۶۵ء

[کرسیوں پر دائیں جانب سے] پروفیسر عالم خوندمیری، سری نواس لاہوٹی، جینسن ریحانی، مخدوم محی الدین، نور محمد نور، علاء الدین حبیب، اطہر افسر۔

[ایستادہ] کنول پرشاد کنول، شجاعت علی [سب ایڈیٹر شاہکار] محمود خاور، وقار خلیل، غیاث صدیقی۔ [بہ شکریہ اطہر افسر حیدرآباد]




شاد عارفی بنام دور آفریدی




سلام مچھلی شہری ۔ بنام دور آفریدی

بہ شکریہ دور آفریدی رامپور (یوپی)

# رباعیات

## فضا ابن فیضی

پیاسے کو کنواں، دشت کو دریا دے گا
کانٹے کو کنول، دھوپ کو سبزا دے گا
فردا سے ہو تم کس لئے اتنے مایوس
موسم کوئی سر سبز اشارا دے گا

خاموش ہو، جوش و روانی دے گا
ساحل کو سمندر کی کہانی دے گا
اے بزدلو! تیشہ وار جینا سیکھو!
پتھر کو نچوڑو گے تو پانی دے گا

صحرا کو، سراب آب پیرا دے گا
دریا کو، غبار دشت آسرا دے گا
مجبور ہیں، کہ میں خود اپنا تماشہ دیکھوں
کیا اور مجھے دیدۂ بینا دے گا

آئینہ ترا شے گا، نہ چہرا دے گا
کھولے گا کوئی در، نہ دریچا دے گا
تم کو، مرے ماحول کا منظر نامہ
دے گا بھی، تو اندوہ تماشہ دے گا

مفہوم سے لبریز، پیالہ دے گا
لفظوں کا، مرے منہ میں نوالا دے گا
کچھ یوں ہے، کہ وہ جب بھی ملے گا مجھ سے
ہر بات پہ، میرا ہی حوالا دے گا

ناخن کو سلگتا ہوا عقدا دے گا
تیور کو پگھلتا ہوا شعلا دے گا
پلتا ہے جو ذہنوں میں بغاوت کا شعور
کچھ تو نئی نسلوں کو سہارا دے گا

مئوناتھ بھنجن (یوپی)

## احقر کاشی پوری

ہر صبح، سیہ کار نظر آتی ہے
ہر شام، گنہگار نظر آتی ہے
معبود مکرم، ہمیں دنیا تیری
ابلیس کا اوتار نظر آتی ہے

ہر تار نفس میں ڈھونڈ پرولی میں نے
بھر لی، خلش یاس سے جھولی میں نے
اے سازش ایام، ذہن بھاری کر
لے کھیل تو لی عمر کی ہولی میں نے

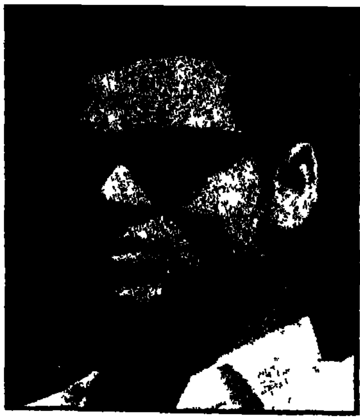
گلزار جنوں خیز ہوں یا ویرانے
غم خانۂ جاں سوز ہوں یا مے خانے
اک سانس میں دنیا میں سمٹ آتی ہیں
اک سانس کی وسعت کو کوئی کیا جانے

آلام و مصائب سے جدا ہو جائے
آئینۂ تطہیر و صفا ہو جائے
بہروپ کی خلوت میں ہے بندہ محبوس
اس خول سے نکلے تو خدا ہو جائے

لو دیتے ہیں لمحات تو من جلتا ہے
لپٹا ہوا رنگوں میں بدن جلتا ہے
وِرہن کا شب یاس وِرہا میں عالم
پروائی میں جیسے کوئی بن جلتا ہے

خاموش ہیں کرنوں سے ڈھکے نظارے
سوئے ہوئے جھونکوں کے بھی ہیں ہنکارے
یہ ہجر زدہ رات، کسی جنگل میں،
سادھو ہو کوئی جیسے سمادھی مارے

پوسٹ بکس نمبر ۴، کاشی پور (نینی تال) یوپی



شارب ردولوی
۱۸/۵ ڈی ، موڈل ٹاؤن ۔ دہلی - ۹

# جدید غزل میں علامت نگاری

اُردو غزل میں علامت کا معاملہ خود علامت ہی کی طرح الجھا ہوا ہے اس لئے کہ جب علامت یعنی SYMBOL کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ گفتگو اشاریت کے بارے میں ہے، استعارے کے بارے میں یا علامت کے بارے میں۔ چوں کہ ان تینوں میں معنوی مماثلت ہے اور لغت کے مترادفات انہیں ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتے ہیں اس لئے اسے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

یوں تو ادبی اظہار میں استعمال ہونے والا ہر لفظ ایک علامت ہے یا علامت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن جب ہم شعر و ادب میں علامت کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں تو اس کی حدوں کا تعین کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ الفاظ کا استعمال جمالیاتی مقصد کے لئے بغیر کسی منطقی دلیل کے بھی ہو سکتا ہے لیکن معنی کے تجزیے کے وقت الفاظ کے ان پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھنی ضروری ہو جاتی ہے جو تاریخی یا تمثیلی ہوں۔ بنیادی طور پر الفاظ اشیا کے لئے اشارے ہوتے ہیں اور روزمرہ کے استعمال میں ان کے بنیادی یا لغوی معنی کافی ہوتے ہیں لیکن جب کسی نظریے یا ادبی اظہار کی بات ہو تو اس کے کئی معنوی پہلو ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہاں عجیب رسم ہے کہ بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں اس لئے کوئی دعا نہ مانگے ، تو اس کے ایک ہی معنی ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن جس وقت یہ کہا جائے ؎

عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں [افتخار عارف]

تو ان الفاظ کا مجموعہ وہی معنی نہیں دیتا جو ان الفاظ کے بنیادی معنی کے ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ الفاظ صرف اشارہ ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے اندر معنی کی بہت سی تہیں رکھتے ہیں جو وقت، حالات اور استعمال کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں۔ یہی الفاظ کہیں ظاہری تقابل پیدا کرتے ہیں اور کہیں ان میں تقابل ظاہر نہیں ہوتا صرف اشارہ ہوتا ہے۔ لیکن اشارہ لفظ کے مفہوم کو ایک مخصوص سمت میں کچھ دور تک لے جاتا ہے اس کے بعد وہ لفظ کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی حال استعارے کا ہے۔ استعارہ اپنی معنوی تہہ داری میں لفظ کو زیادہ دور تک لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاح میں دلالت کا تابع رہتا ہے اس کی معنویت بھی اپنے حدود میں ہی لطف دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علامت میں زیادہ گنجائش ہے۔ وہ معنی کے اعتبار سے استعارے کا احاطہ بھی کرتی ہے اور اس کی جہتوں میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ لیکن علامت کا استعمال آسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر لفظ علامت کے بجائے ASSEMBLY OF ASSOCIATION تلازمۂ خیال ، رعایتِ لفظی ، یکہ استعارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں علامت کی وسعت اور گہرائی نہیں پیدا ہو پاتی اس کے علاوہ ، اس حقیقت کے باوجود کہ ہر لفظ میں علامت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اسے علامت کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ کا ایک SOCIAL CONTRACT ہوتا ہے یعنی جو کچھ کہا جائے گا سننے والا اس سے وہی مراد لے گا۔ اسی طرح علامت بھی سماجی اعتبار SOCIAL SANCTION کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور اسے اس اعتبار کے حاصل کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے ۔۔۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سمبل یا علامت ایجاد نہیں کی جاتی بلکہ تمدنی ورثے سے در آتی ہے۔ کسی لفظ کے ساتھ رفتہ رفتہ کچھ قدریں اور تصورات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تصورات علاقے ، تہذیب ، عقائد ، معاشرت ، تاریخ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی تصورات لفظ کو علامتی اقدار دیتے ہیں۔ جو اُسے موقع و محل کے مطابق معنی کی نئی جہتوں سے روشناس کرتے ہیں ۔

علامت کے لئے ایک تہذیبی پس منظر ضروری ہے۔ اگر کہیں گلاب کا پودا ہی نہیں ہوتا اور کوئی گلاب سے واقف ہی نہیں ہے تو ان کے لئے گلاب ، رنگ ، خوشبو ، حُسن اور نزاکت کی علامت کیوں کر بن سکتا ہے۔ اس لئے ایسی علامتیں جو بالکل ذاتی اور شخصی ہوں تو ذہن پوری طور پر ان کی معنویت کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اردو شاعری میں ابہام کا سبب بنتی ہیں۔ سیاسی سماجی تبدیلیاں علامت میں نئی معنویت ضرور پیدا کرتی ہیں لیکن اس کے پس منظر سے واقفیت کے بغیر اس کی تہہ داری کا لطف نہیں لیا جا سکتا۔ مثلاً جنت سے بے دخلی کی علامت صرف ان معاشروں کے لئے پُر معنی ہو سکتی ہے جہاں آدم و حوا کی کہانی مذہبی یا تہذیبی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح قدیم ہندستانی پس منظر میں ابھیمنیو کا چکرویوہ سے نکلنا ایک روایتی

علامت ہے لیکن اسے انگریزی کا کوئی شاعر اس تہذیبی پس منظر کے بغیر استعمال کرے تو وہاں کے لوگوں کے لئے یہی علامت مبہم ہو جائے گی۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامت کی معنویت اپنے تہذیبی، سماجی اور سیاسی پس منظر کی محتاج ہوتی ہے۔

اُردو غزل قدیم ہو یا جدید اس کی بنیادی خصوصیت رمزیت وایمائیت اور تہہ داری رہی ہے۔ یہ رمزیت و تہہ داری کبھی اشارے و کنائے ALLUSION سے پیدا ہوئی اور کبھی استعارے اور علامت سے۔ غزل گو شعرا نے ہر عہد میں علامتوں سے کام لیا ہے۔ کبھی لالہ و گل، سنبل و نسترن، سرو و شمشاد، سبزہ، بہار، خزاں، سبزۂ بیگانہ اور چمن کی علامتوں کے پردے میں اظہارِ خیال کیا اور کبھی پیرِ مغاں، ساقی، میخانہ، ساغر و مینا، نامہ بر، گلچیں، قفس، آشیانہ، ناصح، واعظ، محتسب، زاہد، کعبہ، بت خانہ اور اسی طرح کی بے شمار علامتوں کے ذریعے اپنے محسوسات کو پیش کیا۔ یہ علامتیں قدیم و جدید غزل میں یکساں طور پر ملتی ہیں۔ لیکن علامت کی یہ خوبی ہے کہ وقت اور زمانے کے ساتھ اس کے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ علامت ایک معنی تک محدود نہیں رہتی اس لئے جب یہی علامتیں میر اور سودا کے یہاں آئیں تو اس کے معنی کچھ اور تھے اور جب ان کا استعمال فیض اور فراق کے یہاں ہوا تو وہ دوسری معنوی جہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس طرح ایک ہی علامت ہونے کے باوجود اس کی معنوی سطح بدل جاتی ہے۔ فراق، فیض، مجاز، مجروح، تاباں اور ان کے دوسرے ہم عصر شعرا کے کلام کی دلکشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے قدیم روائتی لفظیات اور علامتوں سے معنی کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ ان کے یہاں جب یہی علامتیں استعمال ہوتی ہیں تو ذہن قدیم معنوں کی طرف نہیں بلکہ نئے مفاہیم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی — وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے — نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی [فراق]
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو — کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے — ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے [فیض]
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ — جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لَویں شمعوں کی کتر لو — زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ [مجروح]
دورِ کم عیاری ہے کچھ پتہ نہیں چلتا — کون میرا قاتل ہے کون چارہ گر میرا
سوچتے کیا ہو جلاتے رہو زخموں کے چراغ — دیکھیے کیا ہو ابھی صبح کے آثار کہاں [غلام ربانی تاباں]
کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل — اس طرف فتنۂ ابلیس اُدھر ربِّ جلیل
یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دم بہ دم — چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے [مجاز]

ان شعرا سے تھوڑا سا پہلے حسرت اور یگانہ کے یہاں غزل کے نقشے میں نئی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ تبدیلیاں صرف موضوع کی نہیں تھیں بلکہ فکر اور نقطۂ نظر کی تبدیلیاں بھی تھیں۔ محبت جو کبھی عشق پر دہ نشیں تک محدود تھی یا ترکانِ جفا پیشہ، دریچہ کا فراد کا پردہ، منبر کر رکھا تھا یا پھر بالا خانوں پر تکلفات سے بے نیاز سطر آتی تھی اسے حسرت نے حقیقت آشنا بنایا اور یہ محسوس ہوا کہ اردو غزل کا محبوب بھی عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے دوسری طرف یگانہ کے تیکھے اور کھردرے پن نے اس کچھ کلاہی کو پیش کیا جسے بعض لوگوں نے مردانہ پن سے تعبیر کیا۔ ان دونوں لہجوں نے غزل کو وہ سمت دی جسے ہم جدید غزل کا نام دیتے ہیں۔ غزل میں اس تبدیلی کے سلسلے ہماری صدی کی چھٹی دہائی سے کچھ زیادہ تیز ہوئی۔

ترقی پسند شعرا نے پرانی علامتوں کو نئی اور سیاسی معنویت دی۔ ساقی، میخانہ، قفس، دار، صلیب، واعظ اور محتسب تو وہی تھے ان کی معنویت اور تہہ داری میں ان شعرا نے ضرور اضافہ کیا۔ لیکن انھوں نے نئی علامتیں نہیں تخلیق کیں۔ ممکن ہے بعض نئے استعارے یا ایسے لفظ جن کے علامتی معنی کا تعین سیاسی و تہذیبی تبدیلیوں سے ہو گیا تھا انہیں علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہو ورنہ اس زمانے میں علامت کی تخلیق کے بجائے اس کو نئی معنویت دی گئی۔

ترقی پسند تحریک کے جوش و خروش میں کمی آنے کے ساتھ ہی کچھ دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ ادبی فضا بالکل بدل گئی ہے۔ اس کا ایک سبب بعض ترقی پسند ادیبوں کے سخت رویوں اور بلند آہنگیوں کا ردِّ عمل تھا دوسری طرف جدیدیت کی شکل میں رومانویت کا احیا تھا یعنی دو ردِّ عمل یکجا ہو گئے تھے ایک ترقی پسندی کے خلاف اور دوسرا ہر طرح کے ضابطے، قاعدے اور پابندی کے خلاف۔ رومانویت اور اصول و ضابطے کا ازلی بیر ہے اس لئے اگر ایک طرف ہر طرح کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثر کی نفی کی گئی اور فنکار کو ماحول اور سماج کے مطالبات سے آزاد ایک فرد قرار دیا گیا تو دوسری طرف شاعری کے لئے مروجہ استعمالات اور علامات کو

ترک کرکے نئی لفظیات، تشبیہات، استعارات اور علامات کی تخلیق کی گئی۔ کسی بھی چیز کے معینہ حدود کو توڑ دینے سے نقصان ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں وسعت اور تجربے کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ اُردو غزل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پرانے تلازمات، پیکر اور علامتیں اچانک ترک ہو گئیں اور نئے تلازمات، پیکر اور علامتوں کا ایک سیلاب سا آگیا۔ جو الفاظ، تشبیہیں اور آوازیں غزل کے لئے قبیح سمجھی جاتی تھیں ان کا عام استعمال ہونے لگا اس طرح ایک بار پھر معیارِ حسن و عشق تبدیل ہوا جس کے ساتھ غزل کی زبان استعارے اور علامتیں بھی تبدیل ہوتی گئیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ جب صورت حال ہی بدل گئی یعنی غزل میں جس عورت سے عشق میں پردہ بہ پردہ بے نہاں کے دعوے کئے جاتے تھے اب نہ وہ عورت ہے اور نہ بالاخانوں کی وہ غیرتِ ناہید جس کی ہر تان پر شعلہ سا لپک اٹھتا تھا تو اس طرح کا اظہارِ عشق بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارے عہد کا تصورِ عشق اس سے مختلف ہونا لازمی ہے۔ اور یہ بات فطری بھی تھی اسی لئے احمد فراز نے کہا۔۹

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا　　　دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

اس میں شک نہیں کہ اس نئے رجحان نے غزل کے دامن کو وسعت دی اس کی ارضیت نے اسے تازگی اور مقبولیت بخشی لیکن ان ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے سیلاب میں جس طرح علامتوں کی تخلیق کی گئی اور ہر شاعر نے الفاظ اپنے معنی دینے شروع کر دیے اس نے غزل میں ابہام کے لئے راہیں کھول دیں۔ یوں تو اس ابہام کا رشتہ بین الاقوامی سطح پر فرانسیسی ابہام پسند شعراء سے ملا ہوا ہے لیکن اس میں ترقی پسند تحریک کے خلاف ردِّ عمل کا بھی دخل ہے۔

علامت نہ کسی شاعر کے تخیل کی اختراع ہوتی ہے نہ صرف وسیلۂ ترسیل۔ اس میں بہت سی معنوی سطحیں ہوتی ہیں جو اپنی تہذیبی اور معاشرتی قدروں سے متعین ہوتی ہیں پہلے بھی جن علامتوں کو شعراء نے استعمال کیا ہے وہ ان کی ایجاد یا اختراع نہیں تھیں وہ علامتیں پہلے سے موجود تھیں یہاں تک کہ شاہین کی علامت بھی پرندوں کی ان علامتوں کی توسیع ہے جو اُردو اور دنیا کی دوسری زبانوں میں پہلے سے موجود تھیں۔ علامہ اقبال نے اس علامت کو نئے معنی دیے۔ ہر بڑا فنکار علامت کی معنوی سطح میں اضافہ کرتا ہے لیکن نئے شعراء کی علامتیں ان کی اپنی تخلیق کردہ تھیں اس لئے ان کا رُخ متعین تھا نہ معنی۔ ہر شخص ان کی تعبیر و تشریح اپنے اندازِ فکر سے کرتا تھا۔ علامت کی سب سے بڑی خوبی COMMUNICATIVE VALUE ترسیلی قدر ہے اگر وہ اپنے معنی اور مفہوم کی ترسیل نہیں کرتی تو اسے صحیح علامت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ علامتوں کے معنی کا تعین صرف اندازوں پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کے معاشرتی پس منظر کو سمجھنا اور اس روایت کی ہر منزل کو جانچنا ضروری ہوتا ہے جس پر وہ علامت منحصر ہوتی ہے۔ علامت کی کثیر جہتی کو اندازے کے سپرد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے ہر استعمال کو اس کے تہذیبی و تمدنی پس منظر میں ہی متعین کرنا ہوتا ہے۔ لیکن نئی رومان پسندی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور شاعروں کو ذاتی و شخصی علامتوں کے اختراع کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔۱۰

چیختے چلاتے اندیشوں کی آنکھیں سرخ تھیں　　　جسم کی ناپختہ سڑکوں سے گذرنا چھوڑ دیے　　　[ظفر اقبال]
لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا　　　پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا　　　[محمد علوی]
چمک چمکارنے شبِ تیرہ　　　منہ سے لکھم الف زنجیر نے کی　　　[ظفر اقبال]
پنجوں سے زمیں کھود رہا ہے　　　امید کا پرکٹا کبوتر　　　[محمود سعیدی]
ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اتارے　　　دریا کی چڑھتی ہوئی موج کیسے ہائے　　　[بشیر بدر]
میں کھڑا ہوں آئینے میں اور مرا بیزار دل　　　سانپ سا جو کھٹ پہ پھن کاڑھے ہوئے جھوما کیا　　　[زیب غوری]
بستر پہ اک چاند تراشا تھا لمس سے　　　اس نے اٹھا کے چائے کے کپ میں ڈبو دیا　　　[عادل منصوری]

ان چند ذاتی علامات کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ صرف اہم جدید شعراء کے کلام سے انہیں لیا جائے۔ ظفر اقبال، بشیر بدر، محمد علوی، زیب غوری، عادل منصوری اور محمود سعیدی جدید غزل کے معتبر نام ہیں لیکن جب انہوں نے ذاتی علامات وضع کیں یا استعارات کو علامتی رنگ دینے کی کوشش کی تو علامتی تہ داری اور معنویت نہ پیدا ہو سکی اسی لئے وہ استعارے اور رعایتِ لفظی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکیں۔ یوں تو مفسرین ان علامات کی تعبیر و تشریح میں کیا کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن بات تو تعبیر اور مفسر کی۔ ہمیں سے کسی نے اس لئے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ اپنی تاویلات سے قرآن کو پاژند بنا سکتے ہیں۔

ان مثالوں کا مقصد نئی غزل کی توانائی اور قوت کا انکار نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار ہے کہ نئے شعراء نے غزل میں جو علامت گری کی وہ ایک وقتی ردِّ عمل سے زیادہ اہم نہیں رکھتی اس طرح کی علامتوں میں نہ رمزیت ہے اور نہ تہ داری۔ اسی لئے بہت جلد اس رجحان کا زور کم ہو گیا۔ ردِّ عمل کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے اس لئے اس ردِّ عمل کی گرد بھی جلد ہی بیٹھ گئی۔ حدود کے ٹوٹنے سے نقصان جو وسعت آئی اس سے نئی غزل کے کینوس نے بھی وسیع کیا اور فکر و احساس کی تازگی بھی دی۔ شاید یہ بات غلط نہ ہو کہ صحیح معنوں میں جدید

ں ابتدا اس صدی کی چھٹی دہائی سے نہیں بلکہ ساتویں دہائی سے ہوئی ہے۔ جہاں غزل ایک بار پھر SHE کی طرح غسل آتش کرکے نئی تازگی اور دلکشی کے ساتھ سامنے آئی۔ س جدید غزل نے استعاروں کو نئی جہتوں اور علامتوں کو نئے معنی سے آشنا کیا اور نئے غزل گو نے اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کو پیش کرنے کے لئے نئی تراکیب تلازمات وضع کئے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

گئے تھے لوگ تو دیوار قہقہہ کی طرف ۔ مگر یہ شور مسلسل ہے کیسا رونے کا [شہریار]

شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر ۔ کس اہتمام سے پروردۂ شب نکلا

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے ۔ فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے [مظفر حنفی]

تندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے ۔ یوں احتجاج کر کے اشجار کر گئے [ظفر اقبال]

کیوں ہاتھ میں خالی کہ ہمارا کوئی رشتہ ۔ جنگل سے نہیں جا کر سمندر سے نہیں تھا [.... ]

مجھے تو پاؤں کے نیچے کچلی ہوئی کونپل تھے ۔ نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے [شہاب جعفری]

برگ خزاں کی زرد سی تحریر ہے مگر ۔ وقت شفق میں پھول سنہرا کھلا بھی ہے [...]

آشیانوں کا نشہ پرندوں کی موتی ۔ سبز پتوں کے لئے آزار گروں ملا گیا [حکیم منظور]

پتھر کی قبا پہنے تما جو بھی ملا ہے ۔ ہر شخص یہاں سوچ کے صحرا میں کھڑا ہے [زبیر رضوی]

جاناں نہ تو چہرہ چہرہ شیشہ محل میں رہتے ہو ۔ دریچے کشکول کا سکہ ہے سارا کہ سارا تھا [قمیر رحمان]

ہر جہاں ستے تھے اس بستی میں ۔ اب فقط سائے ملا کرتے ہیں

بچھاؤ دام طلسمات کے زمیں والو ۔ گزر رہے ہیں فرشتوں کا شہر ... میں [محی الدین ...]

اس شاخ سے اک سانپ سا لپٹا ہوا تھا ۔ لیکن وہیں جا کر بھی چھپتے ہے نہ دیکھا [مصحف اقبال]

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں ۔ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی سے چلیں [ناصر کاظمی]

جدید غزل کا یہ مختصر سا انتخاب ممکن ہے کہ جدید غزل کی نئی معنویت اور نئی لفظیات سے پیدا ہونے والی فضا کو پیش کر سکے۔ یہ انتخاب مشکل ہے لیکن یہاں ہر شاعر کے کلام سے مثالیں دینا مقصد بھی نہیں تھا۔ ان مثالوں کے ذریعے صرف اس کی نشاندہی کرنی تھی کہ جدید غزل میں علامتوں نے نئی معنویت اور نئی جہتوں کو پیش کیا ہے جس میں ایک طرف زندگی کی تازگی، اپنی زمین سے قربت اور اس کی سوندھی خوشبو ہے تو دوسری طرف جہاں زندگی کی وہ تصویر بھی ہے جو ہجرت اکر لیا آفتاب، مسلک، ہیولیٰ، نیزے، تیر، سیاہ شام وغیرہ کے تلازمات، اور علامتوں سے سامنے آتے ہیں، اور فکر و اظہار کی نئی بصیرت کو پیش کرتے ہیں۔ ❁

【 بقیہ صفحہ ۱۶ سلگتی آنچ 】

دفت، غریبی اور اپنوں سے کٹے ہم لوگ سکون کی تلاش میں ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے۔ سکون جو ہمارا مقدر نہیں!"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ ڈال کر بولے: "اچھا چھوڑیئے ان سب باتوں کو! آپ کو سہگل اور شمشاد بیگم کی کچھ غزلیں سنواتے ہیں!" انہوں نے قریب پڑے کیسٹ پلیر پر ایک کیسٹ چڑھا دیا۔

ان گیتوں کو سنتے سنتے مجھے یوں لگا جیسے سہا صاحب اپنی بیتی زندگی کے خول میں لوٹ گئے ہوں۔ دفعتاً سیڑھیوں کا دروازہ کھلا۔ ماضی کی آواز آج کے ڈسکو سنگیت سے ٹکرائی اور اس عجب سے بے ہنگم شور نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حال جو ماضی پر بے صبری سے حاوی ہے، حال جس نے ماضی کی مشکیں باندھ رکھی ہیں!

شاید گیتا ایک بار پھر ہماری محرومیوں کی خبر لینے آئی تھی۔

نیو یارک کی جگمگاتی روشنیاں اور دور میں ہزاروں آسمان کو چھوتے عمارتوں کے روشن قد و قامت نے ہمیں اچانک احساس دلایا کہ رات کافی گزر چکی ہے اور ہمیں صبح روانہ ہونا ہے۔ ہم نے سہا صاحب اور گیتا سے اجازت لینا چاہی۔ سہا صاحب نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر دیر تک تھامے رکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں خوش قسمت ہیں آپ لوگ جو اپنے وطن لوٹ رہے ہیں! سہا صاحب کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے، میں ان کی محرومیوں کی سلگتی آنچ کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا! ❁

## محمد احمد رمز



[redacted]

نہ اپنی راہ میں حائل ہوس میں نظر رکھنا
مرے خدا ابھی جاری مرا سفر رکھنا

بنا دیا ہے مجھے پارا تار کر تو نے
نثارِ آب میں بنیادِ رہگذر رکھنا

عجیب کارِ ہنر ہے یہ حکمت تخلیق
صدف کے بطن میں گنجائشِ گہر رکھنا

رہے جو حد میں تو یاروں کا طنز ہے تریاق
یہ زہر جب ہو میسر سنبھال کر رکھنا

پھرے نہ رُخ کبھی رن میں کہ ہارے یہ بھی
لگے نہ زخم کوئی پشت پر نظر رکھنا

انا کو لوگ سمجھتے ہیں طرۂ دستار
ہر ایک کے لئے آساں نہیں ہے سر رکھنا

[redacted]

کس موڑ سے ہستی کا سفر کاٹ رہا تھا
دیکھا تو وہ خود اپنا ہی سر کاٹ رہا تھا

بچھڑا تھا کوئی اُس سے کہ ٹوٹی تھی قیامت
بھاری تھی وہ رات اُس پہ مگر کاٹ رہا تھا

گہنایا ہوا چاند تھا کل اس کا تصور
تاریکیاں ایسی تھیں کہ گھر کاٹ رہا تھا

سمجھا تھا کہ بجھ جائے گا پرواز کا شعلہ
اُڑتے ہوئے طائر کے وہ پر کاٹ رہا تھا

بشاش کچھ ایسا تھا تہہ سنگ گراں رمز
جیسے وہ کوئی فصلِ ہنر کاٹ رہا تھا

[redacted]

آج پہلو کے لئے اک تیز خنجر چاہیئے
نیند جیسی ہے مجھے ویسا ہی بستر چاہیئے

زلف بکھراؤ کہ ہر کروٹ پہ دوں تم کو دعائیں
شب ڈھلے جتنی فضا اتنی معطر چاہیئے

ہاتھ کب سے قبضۂ شمشیر پر ہے اور غنیم
دوش پر سر ہی نہیں رکھتا تو کیا سر چاہیئے

جی رہا ہوں میں بھی کس بے قامتی کے دور میں
اک بلندی کم سے کم قد کے برابر چاہیئے

لاکھ ہنگامے فضائے جاں سے باہر ہیں تو کیا
رمز اک گہرا سکوت اب اندر اندر چاہیئے

● فوٹو آرٹ اسٹوڈیو، ۴۶ ۳ بریڈ کاجور (یوپی)




ستیش بترا

سیکٹر ۵۲۰/اے-۱۶، فریدآباد ۱۲۱۰۰۱۲


# سُلگتی آنچ

"آپ یقیناً بہت ہی دلچسپ شخص ہیں!" سنہا صاحب میرے بارے میں فرما رہے تھے۔ نیویارک میں ان سے ہماری یہ تفصیلی ملاقات تھی حالاں کہ یہ کہنا بالکل دُرست ہوگا کیوں کہ چند روز پہلے مانٹریل جاتے جاتے ہمارے میزبان نیر صاحب کے ہاں ان سے ایک سرسری سی ملاقات ہو چکی تھی۔ کچھ لوگوں سے نہ جانے کیوں خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کو جی چاہتا ہے۔ انہیں تو میری بیوی نے بھی پسند کیا تھا حالاں کہ وہ ہر کسی سے اتنی جلدی مرعوب نہیں ہوتیں۔

"کل رات آپ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں!" یہ ان کا ایک طرفہ فیصلہ تھا اُن کے مزاج کا آئینہ دار۔ جیسے وہ ہر کسی کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے پر یقین رکھتے ہوں۔

"کل رات —— سنہا صاحب ہم آپ کی دعوت کے لئے بے حد ممنون ہیں لیکن پرسوں صبح ہی ہمیں ایک دن کے لئے واشنگٹن جانا ہے! —— ایک بہت ضروری کام سے! اور پھر ہمیں اگلے روز ہی دہلی بھارت لوٹ جانا ہے!"

"پھر تو واقعی وقت بہت کم ہے!" میرا قیاس تھا کہ وہ ٹل گئے ہیں لیکن وہ بولے "اسی لئے آپ سے ملاقات اور بھی ضروری ہو گئی ہے! آپ انکار کر ہی نہیں سکتے!" انہوں نے فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ پھر وہ ہمیں ہچکچاتے دیکھ کر بولے "آپ نیر صاحب کی فکر نہ کریں! وہ بھی مدعو رہیں گے! میں انہیں ابھی فون کئے دیتا ہوں!"

معلوم ہوتا تھا جیسے سنہا صاحب اپنی بات منوا کر ہی رہتے ہیں۔ اور پھر دوسروں سے اپنے حق میں فیصلہ کروانا، ان کے پیشے کی ضرورتوں میں شامل تھا! ——

سنہا صاحب کو امریکہ آئے ایک عرصہ گذر گیا تھا۔ ان کا تعلق بہار سے تھا۔ ان کا پیشہ جائداد کی خرید و فروخت کی دلالی تھا جسے اپنے ہاں پراپرٹی ڈیلر اور امریکن اصطلاح میں اسٹیٹ ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں جائداد کا خریدنا بیچنا ایک اہم بزنس ہے۔ اپنے ہاں تو ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے لئے بھی عمر بھر کا اثاثہ درکار ہے اور یہ سہولت بھی آخری زندگی میں ہی نصیب ہو پاتی ہے جب کہ یہاں جائداد حاصل کرنے کے لئے بینک فراخ دلی سے اُدھار دے دیتے ہیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بچوں اور گھر کے بالغوں کو الگ کرتے جاتے ہیں۔ یہاں کی سرکار ان ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے بڑے مکان خریدنے کی صورت میں ٹیکسوں میں بہت چھوٹ دے دیتی ہے۔ اسی لئے لوگ چھوٹے سے بڑے اور بڑے سے وسیع تر مکان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے اسٹیٹ ایجنٹ کا بزنس ایک ترقی پذیر بزنس سمجھا جاتا ہے۔

سنہا صاحب نے بتایا تھا ان کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بچے یہیں بڑھے پلے۔ یہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ ان کی بڑی لڑکی گیتا ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتی تھی جب کہ چھوٹی لڑکی سا لنی نیویارک کے کاروباری علاقے مین ہٹن کی کسی فرم میں کام کرتی تھی۔ لڑکا نیویارک اسٹیٹ میں ہی واقع ٹرائے نامی قصبہ کے کسی انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ان کی بیوی چند سال ہوئے، انہیں اکیلا چھوڑ کر چل بسی تھیں۔

سنہا صاحب کے مزاج اور اُن کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں اُردو ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہیں اُردو نثر میں افسانہ اور شاعری میں غزل بے حد پسند تھی۔ شاید ہمیں مدعو کرنے میں اس بات کی بھی اہمیت رہی ہوگی۔

اگلی شام ہم نیر صاحب سمیت سنہا صاحب کے ہاں جانے کو تیار ہی تھے کہ نیر صاحب کو اچانک کسی گاہک کا فون آ گیا اور انہیں مجبوراً رکنا پڑا۔ لہٰذا میری بیوی اور مجھے اکیلے ہی ان کے گھر جانا پڑا۔

سنہا صاحب کا گھر نیویارک کے ایک متمول علاقے میں تھا جہاں صرف دو منزلہ عمارتیں ہی تھیں۔ نیویارک میں، چاہے وہ مضافاتی علاقہ ہی کیوں نہ ہو، ایک دو منزلہ خود مختار مکان کا ہونا، بذاتِ خود ایک بہت بڑی بات تھی خصوصاً جب کہ ایسے مکان کے ساتھ باغیچہ بھی شامل ہو۔ اس وضع کے مکانوں میں عموماً پہلی منزل پر ڈرائنگ روم، کچن اور کھانے کا کمرہ رہتا ہے اور اُوپر والی منزل پر بیڈ روم۔ ان کے گھر سے ڈسکو سنگیت اچھلتے دودھ کی طرح بہہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سنہا صاحب نے ہماری پارٹی کا کچھ زیادہ ہی زور دار انتظام کر رکھا تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں سے کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں سنگیت کی لہروں پر ناچتے تھرکتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں ایک بار شک گذرا

کہیں ہم غلط جگہ پر نہ آگئے ہوں۔ پھر سے مکان نمبر چیک کیا۔ کوئی غلطی نہ تھی گیٹ پر سنہا صاحب کے نام کی تختی واضح الفاظ میں لگی ہوئی تھی!

قدرے جھجکتے ہوئے دروازے پر لگی کال بیل بجائی تو ایک خوبصورت اسمارٹ لڑکی باہر آئی۔ شاید یہ گیتا تھی! اس نے ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ ہمیں اندر لے آئی۔ ہال ڈسکو سنگیت گونج رہا تھا در اصل آج کا سنگیت ہی نہیں ہوتا جب تک وہ کان پھاڑنے والی بلند آواز میں نہ بجایا جائے۔ جسموں کو موڑ موڑ کر، ڈسکو کے مخصوص تال سُر میں ہر انگ پھڑکایا جا رہا تھا۔ ڈسکو ناچ میں سوائے تال کے اور کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس لئے آپ اپنی مرضی سے، جیسے چاہیں، ہاتھ، پاؤں اور کمر کو حرکت دے سکتے ہیں۔ ان موسیقاروں اور ناچنے والوں کی نگاہوں کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے ہم گیتا کے ساتھ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

سنہا صاحب نے ہمیں بیڈ روم کے ساتھ منسلک بالکونی میں بٹھایا جہاں انہوں نے ہمارے کھانے پینے کا پیشگی انتظام کر رکھا تھا انہوں نے معذرت طلب لہجے میں کہا "مجھے ان لڑکیوں کی پارٹی کا کچھ علم ہی نہ تھا!"

ہمیں بٹھاتے ہی گیتا نے میری بیوی سے تکلفاً نیچے جانے کی اجازت چاہی "آنٹی! میں ذرا نیچے بھی مہمانوں کو دیکھ لوں" اور وہ کسی بھی جواب کا انتظار کئے بغیر، تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

سنہا صاحب کے چہرے پر گیتا کے خلاف خفگی کے آثار تھے۔ پھر وہ سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولے: "مجھے افسوس ہے آپ کو یہ شور شرابا برداشت کرنا ہی ہوگا" انہوں نے ایک بار پھر اپنی بیچارگی کا احساس ظاہر کیا۔ "در اصل زندگی سمجھوتے کا ہی دوسرا نام ہے!" ان کے لہجے میں مکمل بے بسی تھی گویا وہ اپنے آپ کو سمجھا رہے ہوں۔

نچلی منزل سے ڈسکو کا شور ساتویں آسمان کی طرف پرواز کرنے میں کامیاب تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایسے ہنگامے پر کسی پڑوسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ امریکہ میں تو پڑوسیوں کے آرام میں خلل اندازی کا تصور تک گناہ ہے! ذرا سا شور و غل ہونے پر پڑوسی فون کر کے پولیس بلوا لیتے ہیں۔ یہاں یا تو پڑوسی آئے دن کے شور سے مانوس ہو گئے تھے یا پھر مدعو لوگوں میں پڑوسی کی ہی لڑکیاں لڑکے شامل تھے۔ آپ اپنوں کے خلاف تو آواز نہیں اٹھا سکتے نا!

سنہا صاحب نے اٹھ کر سیڑھیوں والا دروازہ بند کر دیا۔ نچلی منزل کا شور اب قدرے گھٹ کر رہ گیا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ نیو یارک کیسا لگا؟ امریکہ میں کون کون سے مقام دیکھے؟ ہمیں کیا پسند آیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران گیتا ہر بار کے لئے اوپر آتی، ہماری ضرورتوں کو پورا کر کے تیزی سے نیچے چلی جاتی۔ اس کا من تو نچلی منزل کے ہنگاموں اور ساتھیوں کی رفاقت میں الجھا ہوا تھا۔ شالنی کی تو ہم نے صورت تک نہیں دیکھی جیسے ہر کوئی آپنے آپ میں ہی معروف ہو۔ سنہا صاحب نے شالنی کو ہم سے ملوانے کی غرض سے اوپر بلوایا بھی تھا لیکن اُس نے پاپا کی بات سُنی اَن سنی کر دی تھی۔ نئی پیڑھی آج کل ویسے ہی باغی ہے اور پھر ہم تو سنہا صاحب کے مہمان تھے، شالنی اور گیتا کے نہیں۔!

سنہا صاحب کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا میری بیوی نے جب باتوں باتوں میں ان لڑکیوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: "یہ اپنا دیش تو ہے نہیں! یہاں رہ کر بچے یہیں کی تہذیب ہی تو سیکھیں گے! یہ تو خیر ہے کہ مجھے پاپا کہہ کر پکارتے ہیں ورنہ یہاں تو ماں باپ کو بھی ان ہی کے نام سے پکارا جاتا ہے" پھر وہ رک کر بولے: "دس برس ہوئے۔ ان بچوں کی ماں گذر گئی! میں اس کی موت کے بعد بالکل اکیلا پڑ گیا ہوں۔ میں ان کا باپ بننے کی تو کوشش کرتا ہوں لیکن — ان کی ماں بننے کی اہلیت مجھ میں کبھی نہ ہو سکی"!

ہم ان کے اس المیے کو بھی سمجھ سکتے تھے۔ میری بیوی نے جذبات سے مغلوب ہو کر پوچھا۔

"آپ کے لئے تو ان لڑکیوں کی نگرانی بہت مشکل ہوتی ہوگی! آپ ان کے بارے میں ضرور فکر مند رہتے ہوں گے؟"

"فکر کیوں نہیں ہوتی! ہم ہندوستانی والدین ہیں" ا ہم اس کا چاہے ذکر نہ کریں لیکن یہ مرحلہ ہر ہندوستانی کے لئے باعثِ فکر ہوتا ہے! ہم وطن لوٹنے کی سوچتے ہیں تو اقتصادی مجبوریاں پاؤں پکڑ لیتی ہیں! چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ہندوستانی تہذیب کو اپنائیں لیکن گھر اور باہر کے ماحول میں ہمیشہ ایک کھائی رہتی ہے آخر ہم مجبوری سے سمجھوتا کر لیتے ہیں" اور پھر اگر ان بچوں کو اس نئے ملک میں ہی رہنا ہے تو انہیں یہاں کے طور طریقے یہاں کی تہذیب تو سیکھنی ہی ہوگی۔ در اصل ہماری زندگی دو ملکوں میں بُری طرح تقسیم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نہ تو ہم ایک کو پوری طرح اپنا پاتے ہیں" اور نہ ہی اپنے وطن کو بھلا پاتے ہیں"۔ مانا آپ کو اقتصادی مجبوریاں یہاں کھینچ لائیں لیکن خوشحال ہونے کے بعد تو آپ واپس لوٹ ہی سکتے ہیں! کیا آپ کو اپنا وطن اچھا نہیں لگتا؟ میں نے پوچھا۔

"اچھا کیوں نہیں لگتا!" ان کے لہجے میں ایک کسک تھی: "میں دو بار اپنا سارا سامان بیچ کر ہندوستان گیا ہوں لیکن ہم تو اپنے وطن کے لئے بھی اجنبی ہو چکے ہیں۔ یہاں رہتے ہیں تو اپنے لوگ، اپنے شہر کی گلیاں کوچے یاد آتے ہیں وہاں جانے پر تو یہاں کی سہولتیں اور زندگی یاد آتی ہے! سچ بات تو یہ ہے کہ تارک الوطن غریب الوطن ہوتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس پر دونوں جہاں تنگ ہیں! ہمارے بچے کسی تہذیب کو اپنا کہہ پائیں گے؟ ان کی شادیاں کہاں کہاں ہوں گی۔ ان کا دھرم کیا ہوگا ان کی اخلاقی، مذہبی قدروں کا کیا ہوگا؟ جب سوچتے ہیں تو ذہن تھرا اٹھتا ہے

[بقیہ صفحہ ۲۱۶ پر]



صدیقے عالم
۱۳/۷ اینچ، بنیابگان روڈ، کلکتہ۔۱۴

# مٹی فروش

" مائی لیو.... مائی لیو... مائی لے لو ! "

عینک پر جمی گرد پر جانے کونسا سایہ آن گرا۔ آسمان کے فرشتے تک دکھائی دینے لگے۔ بوڑھا حمید و اس عورت سے نالاں تھا۔ ساٹھ سال کا وہ اور یہ پچیس سال کی چھوکری اور زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لئے گھر کے آنگن میں رکھی نوکری۔ جب اس نے اس سے شادی کی تھی تو وہ ۱۲ سال کی تھی۔ وہ اسے اپنے گاؤں سے اٹھالایا تھا۔ وہ کنوارا نہ تھا، مگر اس کی بیوی بانجھ مری تھی۔ قسمت، وہ اب بھی بے اولاد ہی تھا اور اب تو خیر! یوں دن کے انتہائی روشن لمحوں کو چھوڑ کر، وہ عملی طور پر اندھا ہی ہو چکا تھا۔ پانچ سال پہلے تک اونچی اونچی عمارتوں کو رنگنے میں اس کا ثانی کوئی نہ تھا۔ ایک پتلے بانس پر کھڑا، سو فیٹ یا اس سے اوپر، اس کا منحنی سا وجود۔ دنیا کانی بدل چکی ہوگی، نیچے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والی دنیا اور پر ٹنگا ہوا مریل سا آسمان اس کا جی چاہتا ایک دو چھپکے اس پر بھی مار دے کلکتہ! وہ بارہ برس کا ہوگا جب اس شہر میں آیا تھا۔ بارہ برس سے وہ اس شہر کو مختلف جگہوں سے رنگتا رہا تھا، مگر اس کی بدنمائی تھی کہ اس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"بوڑھا حرامی مرے تو میں چین لیوں" عائشہ کہہ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ہانڈی میں کھد بد کرتے ہوئے چاول میں اس کے آنسو گر رہے ہوں گے۔ عائشہ نے تیرہ برس کی عمر سے جوان ہونا شروع کیا تھا اور پچیس برس تک آکر رک گئی تھی۔ کلکتہ کے نواح میں، ریلوے لائن سے لگی ہوئی اس چھوٹی سی بستی میں، جسے ٹاٹ سے گھری ہوئی ایک کچی مسجد نوآباد مسلم علاقہ ثابت کرتی تھی، ان کا اپنا ایک الگ گھر تھا، ایک کمرے والا، مٹی کی دیواریں، ٹاٹ کا چھپر۔ اس کمرے میں اس نے عائشہ کو ننگا کیا تھا، اس کی بری طرح پٹائی کی تھی، اسے ہفتوں بھوکا رکھا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ جو وقت مسجد سے بچ رہتا اپنی بیوی سے خوفزدہ اس قبر نما کمرے کی نیم تاریکی میں آرام کرتا۔

اب عائشہ اس کا پیٹ بھرتی۔ وہ اس کا خدا تھی۔ وہ کھیت سے مٹی ٹوکری بھر کر کلکتہ بیچنے جاتی۔ کیا بیچتی۔ کیا لاتی۔ یہ تو اس کا علم تھا وہ جانے۔ مٹی فروشوں کو اس نے کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا آدمی ٹھہرا خاک کا پتلا۔ مٹی کے کاروبار اور آدمی کی خرید و فروخت میں کیا فرق ہے بھلا۔ مگر اس حرامزادی کو اچانک اس دھندے کا خیال کیوں آیا؟ اتنے برس ساتھ رہی، ایک بچہ تک تو نہ دے سکی۔ ارے اس کا کیا، وہ ٹھہرا بوڑھا کھوسٹ، قبر کی مٹی چاٹتا ہوا کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اسے کچھ تو اپنا سوچنا چاہیئے تھا۔ اس کی جوانی یوں سدا رہنے والی نہیں۔ بڑھاپے کا کوئی تو سہارا ہونا چاہیئے۔ عائشہ کی جوانی کے تصور سے اسکی ڈاڑھی کانپنے لگی۔ شاید راکھ سے اٹی ہوئی کوئی چنگاری سلگ اٹھی تھی۔ وہ دیوار کو ٹٹولتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ مٹی کے برآمدے کے باہر امرود کے پیڑ میں جانے کہاں سے ٹوٹیوں کا جھنڈ آبیٹھا تھا۔ چہار دیواری کے باہر دوپہر کا آسمان گہرا نیلا تھا۔ عائشہ آنگن کے کونے میں بیٹھی اپنے پالتو چوزے کو دانا بیچ ڈال رہی تھی۔ کھیت میں مٹی کھودتے کھودتے یہ جو بانس مل گیا تھا۔ بہار کے دور افتادہ گاؤں سے لائی گئی یہ گنوار عورت اتنی جلد پر نکالے گی یہ اسے معلوم نہ تھا۔

" عائشہ!" اس نے ڈرتے ڈرتے اسے آواز دی۔

" لو —!" عائشہ نے بدستور چوزے میں مصروف رہتے ہوئے کہا

" ذرا اندر آنا۔ دیکھ تو کتنا درد ہے میری کمر میں۔ مجھ سے تو اٹھا تک نہیں جاتا۔"

" اٹھنے کی ضرورت ہی کون سی ہے؟"

" دیکھ حرام زادی۔ زیادہ چیں چیں نہ کر۔ طلاق نصیب میں لکھوانا ہے کیا؟"

"طلاق! - دی تو، تو اور دے بھی کیا سکے ہے۔ مگر میں پوچھوں میں نہ رہوں تو تیرا جہنم کون بھرے۔ کام کاج نہ نماج۔ میں تو کہوں، جا کو مسجد کے صحن میں بیٹھو۔ اللہ مہربان ہوگا تو جلدی اٹھا وے گا بھی۔"

"چپ کر تیری ماں کے۔" مگر اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا کہیں اپنے اندر وہ عائشہ سے خائف تھا۔ واقعی کہیں وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تو بھیک مانگنے کے علاوہ اس کے پاس اور کیا راستہ رہ جائے گا۔ وہ بھی مانگنے کے لئے اسے کلکتہ کے اندر جانا پڑے گا۔ وہیں کہیں کسی فٹ پاتھ پر، کسی گندے ہوٹل کے باہر سڑنا ہوگا۔ بھلا اس بستی میں ایسے لوگ ہیں کتنے جو اسے بھیک دے سکیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا عائشہ کو دیکھتا رہا جو چہار دیواری سے باہر کھیت کی منڈیروں سے ہوتی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ فصل کٹے کھیتوں کے درمیان کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جانے اس کے بعد کس کو ڈسنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کلکتہ کا وہ حصہ بہت خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ جہاں عام طور پر وہ مٹی بیچنے جایا کرتی تھی۔ وہاں لوگوں کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ اپنے لان میں یا اپنی بالکنیوں اور چھتوں میں پھول اگانے کے بارے میں سوچ سکیں۔ وہاں عمارتیں اتنی اونچی اٹھتی تھیں کہ آدمی سب سے اوپر کی منزل میں چلا جائے تو آسمان کو چھو سکے۔ حالانکہ ایک دن وہ وہاں بھی جا چکی تھی۔ مگر آسمان پھر بھی دور ہی نکلا۔ کٹھور آسمان، کبھی اتنا قریب نہیں آتا کہ آدمی اپنی مٹھی میں تھوڑا سا بھر لے، مٹی کی طرح۔ کلکتہ کے نواح کی مٹی بھی کتنی خوبصورت تھی۔ تھوڑا سا پانی ڈال دو تو مکھن کی طرح ملائم ہو جائے۔ تھوڑی سی دھوپ پڑی نہیں کہ گھاس کی ہری ہری پتیاں نکل آئیں۔ مگر پانی نہ ملے تو پتھر کی طرح سخت۔

"متیا، کاہے جوانی برباد کرو ہو مٹی بیچ بیچ کو۔" ہاتھ رکشا والا عثمان اکثر اسے تھیٹر روڈ اور کمک روڈ کے موڑ پر مل جاتا۔

"اچھا تو اسے آباد کرنے کا طریقہ بھی بتا دو۔" جانے کیوں عثمان رکشا والا پسند تھا۔ ادھیڑ عمر کا، کڑی مونچھوں والا، تہبند اور کرتا پہنے اسے دیکھتے ہی وہ من ہی من کھِل جاتی۔۔۔ مگر عثمان بڑے گھر کا آدمی تھا۔

"ارے، تو چاہے تو ایک گھنٹے کے اندر ہفتہ بھر کی کمائی کر لے۔"

عثمان بولتا۔ وہ اپنی سواریوں کو بڑی بے ہودگی سے ٹال جاتا جیسے وہ مکھیاں ہوں جنہیں وہ ہاتھ سے بھگا رہا ہے۔ یوں بھی، یہ رکشا تو ایک بہانہ تھا۔ اس کا اصل کام تو بابو لوگوں کو ان شرفا کی بیویوں تک پہنچانا تھا جو اپنے فلیٹ کے اندر ہی پیشہ کرنا پسند کرتی تھیں۔" بولتو کسی سیٹھ کے ساتھ چلتا کر دوں۔ آدھا ہندوستان گھوم آؤ اور گانٹھ میں اتنے پیسے کہ میرے جیسے کو نوکر رکھ لو۔"

وہ عثمان کی زبان کی قینچی سے گھبرا جاتی۔ شرم سے پلو منہ پر تھام کر ادھر ادھر تاکتی، پھر ٹوکری سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔ اسے اپنے پیچھے عثمان کا ٹھٹھا کہ سنائی دیتا ایسا لگتا، یہ عثمان کبھی اسے دیکھے گا ہی نہیں۔

"تو مسلمان ہے نا؟ تیرا گھر والا کام نہیں کرتا؟" ایک بار ایک بوڑھی گجراتی سیٹھانی نے کہا تھا۔ بڑی دیالو بڑھیا تھی۔ اس نے اسے پان پراگ کا مسالہ کھانے کیلئے دیا تھا۔ بڑی تنہا لگ رہی تھی۔ اتنی شان شوکت سے رہنے والے بھی زندگی سے ناخوش ہوتے ہیں یہ سوچ کر اسے تعجب ہوا تھا۔ واقعی اگر کوئی زندگی سے ناخوش رہنا چاہے تو اس کے سو بہانے ہیں۔ مٹی بیچنے کے فن کے ساتھ ساتھ اسے بھانت بھانت کے لوگوں سے بات کرنے کا فن بھی آگیا تھا۔ یہ لوگ جو مٹی کی طرح ہی کہیں سے گورے کہیں سے کالے، ملائم یا سخت، زرخیز یا بنجر تھے۔ جب خالی ٹوکری اٹھائے ہوئے وہ پارک سرکس کے علاقے کی کسی کم معروف گلی سے باہر آتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنی ٹوکری کے ساتھ ساتھ اپنی روح بھی خالی کر آئی ہو۔ جانے کیوں اسے وہ عمارتیں واپس بلاتی تھیں۔ مگر تقدیر تھی اس کی کہ اسے واپس اس بوڑھے کی طرف ڈھکیل کرلے جاتی۔ وہ اس سے نفرت کرنے کے باوجود اسے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اسے اس پر ترس آتا، اور اپنے آپ پر اور ساری دنیا پر۔ یہاں کوئی بھی خوش نہیں، ورنہ لوگ پھول کیوں اگاتے، بوڑھی سیٹھانی اسے پان پراگ کا مسالہ کیوں دیتی؟

پھر ایک دن، جس کھیت سے وہ مٹی نکالا کرتی تھی، اس سے اسے مٹی ملنا بند ہوگئی۔ زمین کا مالک ادھیڑ عمر کا ایک سیاہ فام بنگالی مسلم تھا جو اپنا تہبند شرمناک حد تک اوپر باندھتا تھا اور مٹی بیچ کر جو پیسہ کماتا اسے شراب اور عورتوں میں اڑا دیتا۔ اس کی بیوی ایک دن اچانک کہیں غائب ہوگئی تھی۔ اس کے بارے مشہور تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو جان سے مار کر اپنے کھیتوں میں ہی کہیں دفن کر دیا ہے۔ وہ بہت دنوں سے عائشہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک دن جب عائشہ مٹی کا پیسہ چکانے آئی تو اس نے زبردستی اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی اور اپنا لہولہان چہرہ لے کر رہ گیا۔ اس دن اس نے عہد کیا کہ وہ عائشہ کو اپنی مٹی نہیں بیچے گا۔ ا[illegible] پورے علاقے میں صرف اسی کے کھیت سے مٹی بیچی جاتی تھی ورنہ بنگا[illegible] یہ علاقہ اتنا زرخیز تھا کہ دوسرے لوگ سبزیاں اور دھان اگا کر اتنا کما لی[illegible]

کہ سال بھر پیٹ پل جاتا۔ جب عائشہ کی مٹی کا کاروبار ٹھپ پڑ گیا تو اس نے کہیں کسی کے گھر میں برتن مانجھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر لوگ اتنی جلد اس پر بھروسہ کرنے کے حق میں نہ تھے اور اکثر گھر والیوں نے تو اسے اس لئے کام دینے سے انکار کر دیا کہ وہ جوان تھی۔ یوں بھی برتن مانجھ کر وہ صرف اپنا جہنم بھر سکتی تھی، اپنا تن ڈھانک سکتی تھی۔ مگر اسے تو بوڑھے کی بھی فکر تھی۔ گذشتہ کئی دنوں سے دونوں کو فاقے کرنے پڑ رہے تھے۔

ایک دن اس نے عثمان رکشے والے کو دیکھا جو ایک بینک کے باہر اپنے رکشے پر بیٹھا کھینی مل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عثمان نے آنکھ ماری۔

"کیوں ری بڑی پریشان لگ رہی ہے۔ خصم نے گھر سے نکال دیا کیا؟"

"بھری مٹی نا ہیں بکت ہے۔"

"کا ہے؟"

"کھیت کا مالک مٹی نا ہیں بیچت ہے۔ بولن رہے ہم اوکا کھیل رہے تب جا کر مٹی ملتو۔"

"تو کسی دوسرے کھیت سے بندوبست کر لے۔"

"دوسرے کھیت والے مٹی نا ہیں بیچت ہیں۔ او لوگ سبزی اگاوے ہے۔"

"مار گولی مٹی کو۔" عثمان نے کھینی پھانکتے ہوئے کہا۔ "ارے کبھی اپنے بدن کی مٹی تو دیکھ۔ بول چلتی ہے ایک اچھا اسامی ہے۔ بالکل بوڑھا ہے۔ تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ربر کا بنا ہے۔ دبایا نہیں کہ ٹیں۔"

عائشہ نے عثمان کی آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہو کیا وہ بھی اسے بیچ دے گا۔ عثمان نے دوبارہ آنکھ ماری جیسے اس سے رضامندی حاصل کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

عائشہ اس دن اپنے گھر کے آنگن میں چارپائی پر بیٹھی سورج کو کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں ڈوبتے دیکھتی رہی۔ بوڑھا جھلایا ہوا کمرے میں بیٹھا تھا۔ آج تیسرا دن تھا فاقے کا۔ بوڑھے نے نہ جانے کتنی گالیاں دی تھیں اسے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ یوں ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دے مگر یہ اتنا آسان تھا کہ اسے بوڑھے پر رحم آگیا۔ شام ہوئی اور سامنے کے گھروں کی بتیاں جل اٹھیں تو وہ بوڑھے کے کمرے کے دروازے پر آئی۔ بوڑھے کی آنکھیں اندھیرے میں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔" عائشہ بولی۔ اس کا سایہ لمبا ہوا اور بوڑھے نے اس کے سر کو اپنی گود میں گرتے محسوس کیا۔

"تم بہت بھوکے ہو نا؟" عائشہ بولی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بوڑھے کے چہرے کی جھریوں کو ٹٹول کر محسوس کیا۔ بوڑھا رو رہا تھا۔ اس کی استخوانی انگلیاں عائشہ کے ملائم سینے کو ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے کسی بچے کی انگلیاں بھوک کے عالم میں ماں کی چھاتیوں کو ٹٹولتی ہیں۔ "میں کل کے گھر سے کھانا ادھار مانگ کر لاتی ہوں۔ تم گھبرانا مت۔ کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور دوسرے دن واقعی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ بوڑھے کو ایک بار پھر سے پیٹ بھر کھانا ملنے لگا، باقاعدہ اور پہلے سے زیادہ اور اچھا۔ عائشہ رات کو دیر سے گھر لوٹنے لگی۔ مگر بوڑھا خوش تھا اور عائشہ کو دعائیں دے رہا تھا ــــــــــــــــــــ۔ اس کے برے دن کٹ گئے تھے۔ بوڑھے نے پھر سے بیڑی پینا شروع کر دیا تھا۔ اور اب تو مسجد سے نماز پڑھ کر نکلتے وقت وہ مسجد کے پھاٹک پر بیٹھے بھکاریوں کو بھی ایک دو سکے پھینک دیا کرتا تھا۔ اب اس نے گالیاں دینا بند کر دی تھیں۔ اور کبھی کبھی اسے اس کے لئے افسوس ہوتا تھا کہ عائشہ جیسی جوان عورت پر وہ سانپ بنا بیٹھا تھا۔ وہ خدا سے دعا مانگتا کہ وہ جلد اسے اٹھا لے اور عائشہ کو کسی اچھے مرد کے پلے باندھ دے جو اسے شوہر کے پیار کے ساتھ ساتھ اولاد بھی دے سکے۔

مگر ایک دن وہ مسجد سے لوٹا تو اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ اس دن وہ مغرب کی اذان سن کر بھی نماز کے لئے مسجد کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ آنگن میں چارپائی پر بیٹھا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ گاؤں کے باہر ریل کی پٹریوں پر ہر دس پندرہ منٹ بعد لوکل ٹرین شور مچاتے ہوئے گذر رہی تھی۔ مگر عائشہ کا پتہ نہ تھا۔ آسمان میں تارے ٹوٹنے لگے تھے۔ خلیج کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور گھر کے پچھواڑے کے راستے سے گذرتے وقت لوگوں کی گفتگو کی آوازیں رات کے سناٹے کو اور بھی گہرا کر رہی تھیں۔ پھر ٹین کے دروازے میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ عائشہ اندر آئی اور بوڑھے کو دیکھے بغیر گھر کے اندر چلی گئی۔ واپس برآمدے میں آکر لالٹین سلگا رہی تھی کہ بوڑھا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"آج کل اتنی دیر سے کیوں آنے لگی ہے تو؟" اس کی کرخت آ

[باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھئے]

# احتشام اختر



کبھی زمیں پہ کبھی نیلے آسمان میں ہوں
ہوا کی طرح میں ہر اپنے مکان میں ہوں

لبوں سے اُس کے نکل کر ہوا ہوں آوارہ
میں ایک لفظ ہوں ہر دم نئی اڑان میں ہوں

ترا وقار تو میرے ہی دم سے قائم ہے
میں مثلِ آبِ گہر تیری آن بان میں ہوں

مرے حصار میں بھی ساری کائنات کبھی
ستم ہے قید میں خود اپنے ہی مکان میں ہوں

اگر ہے شوق تو مجھ کو خرید لے آکر
کہ میں تو شہرِ ہوس کی ہر اک دکان میں ہوں

مجھے تو گہرے سمندر سے جا کے ملنا ہے
ابھی میں رک نہیں سکتا ابھی ڈھلان میں ہوں

یہ اپنی مختصر سی ذات ہی بکھر کے رہ گئی
ہوا چلی تو کائنات ہی بکھر کے رہ گئی

انا کا شور تھا کہ کچھ نہ سن سکا کوئی وہاں
فضا میں میرے دل کی بات ہی بکھر کے رہ گئی

سلام اور پیام ہم تو کچھ نہ لکھ سکے اسے
کہ حسرتوں کی وہ دوات ہی بکھر کے رہ گئی

افق سے غم کے ماہتاب کب نظر تو آئے گا
کہ انتظار میں یہ رات ہی بکھر کے رہ گئی

وہی حسین کتابِ دل کہ جس میں تھی لکھی ہوئی
وہ ساری دل کی واردات ہی بکھر کے رہ گئی

گرچہ مکاں وہی ہے مگر وہ مکاں نہیں
رونق تھی جس سے گھر کی وہ جانِ جہاں نہیں

مر جاؤں گا میں خود ہی تمنا کے دشت میں
ٹھہرا ہوا میں آب ہوں آبِ رواں نہیں

مسمار ہو گئے ہیں خیالوں کے گھر یہاں
تاریکیوں کے شہر میں کوئی مکاں نہیں

کیسے چمک رہے ہیں تمنا کے بام و در
یہ آتشِ وصال ہے اس میں دھواں نہیں

جلنے لگے گی یاد تو گھٹنے لگے گا دم
وہ کون سی ہے آگ کہ جس میں دھواں نہیں

مہتاب کی ضیاء سے منور ہوا ہے دل
یہ وہ مکان ہے جس کا کوئی سائباں نہیں

پرانا خزانہ ہاؤس، سول لائنز، کوٹہ۔ (راجستھان)



نقی حسین جعفری
مکان نمبر ۳۴۳، لین نمبر ۱۷، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

# خواب سے خواب تک
## شہریار کا شعری سفر

اردو کے شعری افق پر گذشتہ دو دہائیوں میں جو نام ابھرے ہیں ان میں اپنے لہجے کی شیفتگی اور لفظیات کے آہنگ سے شہریار پنے معاصرین میں ممتاز اور قابلِ توجہ نظر آتے ہیں۔ شہریار نے جب لکھنا شروع کیا تو سکہ بند ترقی پسند شاعری کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ایک نئی قسم کی شاعری وجود میں آ رہی تھی لیکن اس کے خد و خال ابھی واضح نہ تھے۔ اس کا شاعر کو یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ جہاں ک طرف اسے بندھے ٹکے مروجہ سانچوں میں ڈھلے شعر کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی، وہیں، دوسری طرف، اسے نئے قسم کے شعر کہنے ں ندرتِ طبع دکھانے اور اپنے فطری احساسات کے اظہار کا موقع ملا۔ کسی شاعر کا شعری سفر جب اس طرح کے دھندلکے TWIL IOH میں شروع ہوتا ہے تو اسے جہاں روایت کے جبر سے آزادی کا احساس ہوتا ہے وہاں کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بی تحریکوں کے دورِ عروج میں کبھی کبھی کمتر درجے کے شعرا بھی مروجہ محاورے اور مخصوص لفظیات کے سہارے بڑا مقام حاصل لیتے ہیں۔ لیکن جب ایک روایت ٹوٹ رہی ہو اور دوسری ابھی عالمِ وجود میں ہو تو وہی شاعر کوئی امتیاز حاصل کر سکتا ہے جس کے سوسات سچے اور AUTHENTIC ہوں اور جو حقیقی معنوں میں ایک نیا اسلوب اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اسمِ اعظم سے خواب کا در بند ہے تک شہریار کا شعری سفر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کی کئی نظمیں فکر و احساس کی صداقت سے مملو نظر آتی ہیں۔ ان کی لفظیات نئی اور پیکر تراشی میں ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ اسمِ اعظم کی نظموں میں، خاص طور سے ک عجیب غیر مرئی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کیفیت بڑے غیر محسوس طور پر قاری کو شاعر کے خوابوں کا شریک بنا دیتی ہیں۔ "خواب" جو اسمِ اعظم کی پہلی نظم کا عنوان بھی ہے، شہریار کی پوری نظریہ شاعری پر محیط ہے۔ اس کی تشکیل بدلتی رہتی ہیں اور اس کی تحلیل نفسی کا ل بھی جاری و ساری رہتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ خواب آگیں کیفیت قاری کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ خواب کا پیکر شہریار نظموں میں بار بار آتا ہے۔ وحید اختر نے ان نظموں کو "خواب نگر" کہا ہے۔ لیکن یہ "خواب نگر" کوئی آئینہ خانہ ہے اور نہ ایسا سپاٹ یک رخہ منظر جس کے ذکر سے ہی شاعر مطمئن ہو جائے اور نہ ہی انقلابیوں کے خوابوں کی وہ دنیا جس کی تعبیر صبحِ فردا میں مل جائے گی۔

دور پلکوں سے آنسوؤں کے قریب
نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے
خواب تعبیر کے شکستہ دل
آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں
[خواب]

سرد شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے
[نیا دن نیا عذاب]

ابھی آنکھ جھپکی نہیں فاصلوں کی
ابھی خیرہ خواب، ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں سے
بچائے ہے خود کو،
ابھی بیم فردا کے قصے نہ چھیڑو [ افسونِ امروز ]

وہ چھٹی دھند وہ سورج کی شعاؤں کی پکار
تیر کی طرح سے چبھنے لگی اور سارا خمار
ایک پل میں ہوا یوں ختم کہ جیسے کوئی خواب
اور پھر دن کا عذاب [ دن کا عذاب ]

دن کے صحرا سے جب بنی جان پہ
ایک مبہم سا آسرا پا کر
ہم چلے آئے ہیں اُس طرف اور اب
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں [ فریب در فریب ]

اک گھنیرے شجر کے سائے میں
دو گھڑی بیٹھ کر یہ بھول گئے
قرض ہائے جنوں چکانے میں
ہم کو سورج نے مار اٹھانے ہیں [ آشوبِ آگہی ]

مذکورہ بالا نظموں کے اقتباسات میں "خواب" کے پیکر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اُن میں ایسی پُراسرار اور دلکش فضا کی عمل داری ہے جو تصور کو خیرہ کرتی ہے۔ یہاں خواب ایسا حصار بناتے ہیں جن سے شاعر نکلنا نہیں چاہتا۔ یہ FANTASY اور FANCY کا ایسا خوب صورت امتزاج پیدا کرتے ہیں جن کا متحمل صرف شاعر کا وجدان ہو سکتا ہے اور وہ بھی عالم رویا میں نہیں۔ ان میں عہدِ طفلی کی معصومیت ہے اور شاعرانہ شعور کا طلسم بھی۔ اگر ان نظموں کو اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں کی گئی اردو شاعری کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کے نئے پن اور اچھوتے پن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ واضح طور پر معلوم ہوگا کہ یہ نظمیں ترقی پسند شاعری کی گھن گرج، رومانیت اور قاری سے راست تخاطب کے مقابلے میں ایک مختلف، پُراسرار اور سرگوشیوں میں کہے جانے والے محسوسات کی شاعری ہے۔ نہ یہاں زندگی سے بیزاری کا اظہار مقصود ہے اور شاید نہ ہی خوابوں کے توسط سے کسی نئی تعبیر کی تلاش۔

میرے لیے وحید اختر کی اس رائے سے اتفاق کرنا دشوار ہے کہ "ان نظموں میں زندگی سے محبت کا احساس بھی ہے۔ انسانوں کے مسائل اور اُن کی ذات سے آگہی بھی، اور ایک بہتر زندگی، بہتر سماج اور بہتر دنیا کی آرزو بھی" (پیش لفظ، اسمِ اعظم) میرے خیال میں شہریار کی شاعری سرے سے اس طرح کی شاعری ہے ہی نہیں جس میں زندگی اور اس کے مسائل کی تفسیر اور تفہیم کی شاعر کوشش کرتا ہے۔ اور نہ ہی یہ ان CONCERNS سے فرار کی کوشش کہی جا سکتی ہے۔ وسیلۂ اظہار، لفظیات، اور اپنے آہنگ کے اعتبار سے یہ بالکل مختلف قسم کی شاعری ہے دکھو میاں عہد کے آخری

دیتے ہیں۔ ہمیں بھی اسی طرح کی مراجعت سمبولسٹ شعراء کے یہاں نظر آتی ہے، جسے آرتھر سائمنز نے LONDON GAS LIGHT سے CELTIC TWILIGHT کی جانب مراجعت سے تعبیر کیا ہے۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ سمبولسٹ شعراء نے بالعموم اور ان سے بھی بیشتر اڈگر ایلن پو نے بالخصوص اسی مراجعت میں خواب کے ہی استعارے کو استعمال کیا ہے۔

COME AWAY, O HUMAN CHILD
TO THE WATERS OF THE WILD
FOR THE WORLD'S MORE FULL OF WEEPING THAN YOU CAN UNDERSTAND
EMPTY YOUR HEART OF ITS MORTAL DREAM.
'THE STOLEN CHILD' - W.B.YEATS.

DREAMS ! IN THEIR VIVID COLOURING OF LIFE,
AS IN THAT FLEETING, SHADOWY, MISTY STRIFE
OF SEMBLANCE WITH REALITY WHICH BRINGS
TO THE DELIRIOUS EYE, MORE LOVELY THINGS,
OF PARADISE AND LOVE--- AND ALL OUR OWN !
THAN YOUNG HOPE IN HIS SUNNIEST HOUR HATH KNOWN

OH ! THAT MY YOUNG LIFE WERE A LASTING DREAM !
MY SPIRIT NOT AWAK'NING TILL THE BEAM
OF AN ETERNITY SHOULD BRING THE MORROW,
YES ! THO' THAT LONG DREAM WERE OF HOPELESS SORROW,
'T WERE BETTER THAN THE COLD RE ALITY
OF WAKING LIFE.
'DREAMS' - EDGAR ALLAN POE.

مذکورہ بالا نظموں کے اقتباسات سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ یہ ردِّعمل کی شاعری ہے۔ ردِّعمل اس بلند آہنگ کے خلاف جس سے وکٹوریائی عہد، بلکہ اس سے بھی بیشتر کے رومانوی عہد کی ایک قسم کی شاعری عبارت تھی۔ SUNNIEST HOUR اور WAKING LIFE اور دن کے عذاب کے استعاروں کے مقابلے میں خواب کا استعارہ اڈگر ایلن پو اور شہریار دونوں کو زیادہ عزیز ہے۔ شاید اس لیے کہ شہریار بھی ترقی پسند شعراء کے CONCERNS اور گھن گرج میں اپنی شعری حسیات کو شریک نہیں کر پاتے۔ شہریار کے معاصر شعراء کے یہاں بھی خواب کا استعارہ ملتا ہے اور اسے خوب صورت اور دل کش انداز میں برتا بھی گیا ہے لیکن جس کثرت اور خوب صورتی سے اس کا بار بار استعمال شہریار نے کیا ہے، مجھے دوسرے شعراء کے یہاں نظر نہیں آیا اور شاید اسی بات نے مجھے ان کی شعری وجدان کو سمجھنے کی سمت اکسایا۔ خیال گذرتا ہے کہ شہریار دماغ اور تعقل پسندی کی شعری روایت سے اپنا ناطہ نہیں جوڑتے۔ وہ تمام تر حسیات کے شاعر ہیں۔ اسی لیے نہ تو ان کے یہاں زندگی کی تفسیر اور تفہیم کی کوئی کوشش ملتی ہے نہ ہی شکست اور کامرانی کا عمومی احساس۔ البتہ مشاہدات اور تجربات کی دنیا میں کارفرما ستم ظریفی IRONY کا احساس ان کو اپنی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے اور یہاں بھی ان کا استعارہ "خواب" ہی ہے!

خواب دیکھنے والی آنکھیں روتی ہیں

خواب دیکھنے والی آنکھیں کیا دیکھیں؟ [خواب دیکھنے والی آنکھیں]

اپنے معمول کے مطابق ہم
آج بھی روز کی طرح یوں ہی
دن کے ہم راہ بے خیالی میں
وادیٔ شام سے گذرتے ہوئے
رات کی سرحدوں کو چھو لیں گے
نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے
کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے [خوابوں کا بھکاری]

مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

اسم اعظم کی نظموں کی دنیا ساتواں در کی نظموں سے بہت مختلف ہے۔ اوّل الذکر کے خوابوں کی دنیا ایک ایسے ADOLESCENCE کی یاد دلاتی ہے جو کبھی احساس کی تتلی کے پیچھے دوڑتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی رموزِ کائنات میں غلطاں و حیراں۔ جبکہ مؤخر الذکر میں عصری زندگی کی ستم ظریفی شاعر کا موضوع ہے۔ لیکن یہاں شہریار کی نظمیں اپنے معاصرین کی نظموں سے ممتاز اور مختلف نظر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق، ایک سیاسی نظم، فسادات کی زبان سے، بند کمرے میں مقید روشنی، افتاد، پہلے صفحہ کی پہلی سرخی، اعتراف، ایک اور سال گرہ، زوال کی حد اور خطرے کا سائرن۔ مجھے ان نظموں میں شہریار کی لفظیات اور ان کی حسیت کی وہ چھوٹ دکھائی نہیں دیتی جن سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام، اسم اعظم، عبارت ہے۔ لیکن جہاں جہاں خواب، کے استعارہ کو انہوں نے طنز کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں خواب، کے واسطے سے مشاہدہ اور احساس کی ایک نئی جہت کھلتی ہے اور قاری کو ذہن پر ایک دھچکہ سا لگتا محسوس ہوتا ہے!

خوابؔ دیکھنے والی آنکھیں روتی ہیں خوابؔ دیکھنے والی آنکھیں کیا دیکھیں؟

شاعر کی دنیا میں کون سا تغیر آیا کہ اُس کی آنکھوں کو دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا؟ اب جو کچھ بھی ہے وہ اس کے لیے دل کش اور اہم نہیں ہے۔ اس نظم میں "تیز آندھی"، "رنگ رنگ کی پوشاکوں میں ریت بھرے دستانے"، "لمبے سائے"، "آدھی رات کے سناٹے" خوابوں کی دنیا کے ان حادثات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قاری کا ذہن خواب کے شعری پیکر جو اسم اعظم کی زینت ہیں، جیسے "لہلہاتی ہوئی خواب کی کھیتیاں"، "خیمۂ خواب"، "آئینۂ خواب"، "خوابوں کے ہیبت درخت" کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ "خواب دیکھنے والی آنکھیں کیوں روتی ہیں"؟ کہیں یہ ولیم بلیک کے شعری اسلوب کے INNOCENCE اور EXPERIENCE کا فرق تو نہیں ہے؟ خوابؔ کا استعارہ شہریار نے اپنی غزلوں میں بھی برتا ہے!

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچم خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

سورج کا سفر ختم ہوا، رات نہ آئی
حصے میں مرے خوابوں کی سوغات نہ آئی

کھلی ہے آنکھ یہاں اب تو خوشی یاد
دیارِ خواب کی باقی نہیں نشانی بھی

ہم پڑھ رہے ہیں خواب کے پرزوں کو جوڑ کے
آندھی نے یہ طلسم بھی رکھ ڈالا توڑ کے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

جاگتی آنکھوں سے بھی دنیا دیکھو
خوابوں کا کیا ہے وہ ہر شب آتے ہیں

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسمِ اعظم کے خواب زندگی اور کائنات کے اولین مشاہدات کی تصویریں ہیں جو اپنی پُراسراریت اور طلسم کے باوصف بے حد حسین اور دلکش ہیں۔ انہیں شاعر اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا ہے اور آخری لمحہ تک سینے سے لگائے رہنا چاہتا ہے۔ شاید اُسے اندیشہ ہے کہ مرئی حقیقتوں کے سنگ باری گراں ان خوابوں کو چکنا چور تو بہرحال کر دیں گے۔ 'خواب' شہریار کی کمزوری بھی ہیں اور قوت بھی۔ ناآسودہ خوابوں سے مراجعت بھی انہیں خواب ہی کی طرف لے جاتی ہے!

یہی ہے وقت کہ خوابوں کے بادباں کھولو
کہیں نہ پھر سے ندی آنسوؤں کی گھٹ جائے

اٹھو نیندوں سے آنکھوں کو جگائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

قافلے نیندوں کے آئے ہیں انہیں ٹھہرا لو
ورنہ یہ دور بہت دور نکل جائیں گے

شہریار کی شاعری میں 'خواب' کے مرکزی استعارے کی تہوں اور سطحوں کے بارے میں غور و فکر کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ان کا نیا مجموعۂ کلام 'خواب کا در بند ہے' پڑھنے کو ملا۔ پہلی بار اس مجموعہ کو پڑھتے وقت میری نظر 'خواب' کے استعاروں اور اس کے مختلف اور پہلے سے برتے ہوئے TREATMENTS پر گئی۔ شاید جیسے کسی مصور کی تصویروں میں کسی ایک رنگ اور اس کے مختلف SHADES پہ دیکھنے والے کی نظر جاتی ہے۔ پھر تو مجموعۂ کلام کے عنوان نے ہی پتہ دے دیا تھا اور کچھ اس توقع اور جستجو نے کہ دیکھیں کہ اب شاعر کے خوابوں کی دنیا کیسی ہے، میری توجہ ان اشعار اور نظموں پر مرکوز ہوئی جہاں 'خواب' کا ذکر ہے۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اپنے تازہ ترین مجموعہ میں شہریار 'خواب' کے استعارے میں اسی طرح غلطاں اور پیچاں ہیں جتنے کہ وہ پہلے کے مجموعوں میں نظر آتے ہیں ۔

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے
خوابوں کی کوئی دنیا آباد کریں پھر سے

اک خواب دیکھنے کی آرزو رہی
اسی لیے تمام عمر سو نہ پائے ہم

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا
آنکھیں اگر ملی تھیں کوئی خواب دیکھتے

یہ کم معجزہ ہے مرے خواب کا
حقیقت کا تو بھی اسے نام دے

نقوشِ پا سے منور ہیں سب گزرگاہیں
مگر یہ بات بھی خوابوں کے قافلوں تک ہے

سماں تھا حشر کا ان بے چراغ گلیوں میں
دیارِ خواب پہ جس رات سنگ باری ہوئی

بلا سبب نہیں بے زار آسماں سے ہم
خرید لائے ہیں کچھ خواب اک دکاں سے ہم

تنہا تنہا خواب کی وادی میں پھرتے رہے
ان دیکھی دنیاؤں کے باشندوں کا ڈر لیے

جہاں اشلوک پڑھتی اجنبی پرچھائیاں دیکھو
وہیں ان کشتیوں سے خواب کی تم سب اتر جانا

مذکورہ بالا اشعار اس بات کا پتہ دیتے ہیں، بلکہ REINFORCE اور REASSURE کرتے ہیں کہ بیس سال قبل چھپے مجموعۂ کلام 'اسمِ اعظم' کے خواب، کم پختہ شعور اور ذہن کی FANTASY نہیں بلکہ ایک متحرک اور ارتقائی استعارہ ہے جو شہریار کے شعری سفر کی علامت بن گیا ہے۔ ساتویں دہے میں شامل شعر ہے

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچمِ خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

جس ذہنی کیفیت کا پتہ دیتا ہے اس سے نکل کر شاعر اب جس دنیا میں آیا ہے وہاں!

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی	یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

خواب کا در بند ہے میں شامل نظمیں بھی خواب کے منظر ناموں سے مملو ہیں۔

"صدائے شب"، بہادروں کی واپسی، خواہشوں کا قہر، بند آنکھوں سے، رت جگوں کا زوال، رات کے سمندر اس طرف، خواب سے دست بردار ہونے والوں کے نام، اور مجموعۂ کلام کی پہلی نظم خواب کا در بند ہے۔ تمام نظموں میں مرکزی استعارہ خواب ہے۔ اور جہاں "خواب" مرکزی استعارہ نہیں ہے وہاں اس کے توسط سے مرکزی موضوع تک پہنچنے کی کوشش ضرور ہے۔ البتہ ایک بات یہاں بھی قابلِ غور ہے کہ ان نظموں میں بھی پہلے کے مجموعوں کی طرح خواب کے دو قسم کے TREATMENT ہیں میں ان دو اقسام کو اسم اعظم کے خواب اور ساتواں در کے خواب کے اقسام کے فرق اور رشتوں سے سمجھتا ہوں۔ مثال کے طور اول الذکر کی قسم میں حسب ذیل اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں!

دن ڈھلے تو میں کھولوں نیم خواب
دروازے
اجنبی صداؤں سے طاق طاق روشن ہو	[بند آنکھوں سے]

مری آنکھ اوس سے تر رہی
مجھے خواب بننے کی لت رہی	[رت جگوں کا زوال]

بند کشتیاں لے کر
خواب بادباں کھولیں
رات کے سمندر کے
اس طرف چلے جائیں	[رات کے سمندر کے اُس طرف]

بھولے بسرے خواب کا چہرہ دکھا
مجھ پہ یہ اکرام کر
اتنے سارے بند دروازوں پہ دستک دے کے آئی ہے
ذرا آرام کر	[صدائے شب]

ساتویں در میں "خواب" کے استعارے نے جو دنیا آباد کی ہے اس کی بازگشت جن نظموں میں سنائی دیتی ہے، اس کی مثالیں ذیل ہیں یہاں "خواب" ہی کا استعارہ ہے لیکن اُس کا استعمال مختلف انداز میں ہوا ہے!

خوابوں کی رہ گذر سے
لوٹ آئے ہیں سفر سے	[بہادروں کی واپسی]

.... ایک طرف خواب کی
سوکھی ہوئی کھیتیاں	[خواہشوں کا قہر]

ساکت دریا دھیرے دھیرے جب حرکت میں آیا
کاغذ کی کشتی میں بیٹھے لوگ خوشی سے چیخ پڑے
ریت بھرے، ساحل سے ملتے ہاتھوں نے
رُومالوں میں اپنے اپنے خواب بھرے
اور اُجڑے شہروں کی جانب لوٹ آئے [خواب سے دست بردار ہونے والوں کے نام]

جاؤ جدھر چاہو تم
جاگو کہ سو جاؤ
خواب کا در بند ہے [خواب کا در بند ہے]

نظموں کے ان اقتباسات یعنی خواب کے استعارے کے ہر دو قسم کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہریار کے یہاں دونوں سطحیں متوازی ہیں اور اسم اعظم کی پہلی نظم 'خواب' سے نئے مجموعے خواب کا در بند ہے، جتنی مشابہات کے دو واضح دھارے ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کرنے کے بجائے انہیں SUPPLEMENT کرتے ہیں۔ پہلے تجربے سے نکل کر شاعر دوسرے کی جانب سفر کرتا ہے اور اس کی بے ثمری اور گھٹن کو دیکھ کر وہ پھر پہلے تجربے کی طرف لوٹتا ہے۔ ولیم بلیک نے SONGS OF INNOCENCE اور SONGS OF EXPERIENCE کو ایک مجموعے کی شکل میں چھاپنے کے بعد بھی اپنے پہلے مجموعے SONGS OF INNOCENCE کے کئی علاحدہ ایڈیشن چھاپے تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ ایک کو دوسرے کے بغیر پڑھا نہیں جا سکتا اور شاید اس لیے بھی کہ اوّل الذکر مجموعے کی اہمیت کسی شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام سے کہیں زیادہ ایک پر اسرار اور بے پناہ تجربے کی سی تھی جس کی اہمیت اس کی بعد کی شعری کاوشات سے کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ 'خواب' کے استعارے کے استعمال کے بارے میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جو TREATMENT اسم اعظم کی نظموں میں پہلی بار نظر آتا ہے وہ کبھی تحلیل اور ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ بار بار اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اسی طرح ساتواں در جہاں خواب کی عصمت مجروح ہوتی دکھائی دیتی، یا اس کا سحر کم ہوتا نظر آتا ہے، ایک متوازی تجربے کا سراغ دیتا ہے جو شہریار کے ہاں مسلسل اسی طرح موجود ہے جیسے کہ پہلا تجربہ۔

## [بقیہ صفحہ ۱۹ مٹی فروش]

سنائی دی۔

"کیوں ؟" عائشہ نے سر موڑے بغیر کہا۔ لالٹین کی روشنی میں میلی میں ڈوبا ہوا اس کا چہرہ تمتما رہا تھا جیسے کسی نے انگارے لپکا دیے ہوں۔

"بات کا جواب دے حرامزادی"

عائشہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آنکھوں میں کیا دیکھ رہی ہے؟" بوڑھا نفرت کی شدت سے ہانپ رہا تھا "بول، کہاں جانے لگی ہے تو آجکل ؟"

"مٹی بیچنے"

"جھوٹ! تو مٹی بیچنے نہیں جاتی ہے۔ تو جسم بیچتی ہے سور کی بچی تبھی تو تو نوکری بھی ساتھ نہیں لے جاتی" بوڑھا چلایا اور برآمدے ہی میں بیٹھ گیا اس کا جسم کانپ رہا تھا اور اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے "تو پیشہ کرنے لگی ہے؟ مجھے پیش امام نے خود بتایا ہے۔ یا مولا، تو نے اسے ویشیا بنانے سے پہلے مجھے اٹھا کیوں نہ لیا۔"

عائشہ ایک لمحے کو خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کالے سمندر کی طرح ابل رہی تھی پھر اس کی چیخ رات کے سناٹے کو چیر گئی۔

"جھوٹ کہتا ہے تمہارا ملا! ۔ میں مٹی بیچنے جاتی ہوں بھی۔ تم ہی نے تو کہا تھا، انسان کا جسم مٹی کا بنا ہوا ہے۔ تو میں نے کیا گناہ کیا جو کام پہلے کرتی تھی وہی اب بھی کرتی ہوں پہلے بھی مٹی بیچتی تھی، اب بھی مٹی بیچتی ہوں حرام کے جنے!!"

# شہریار

[redacted]

عکس کو قید کہ پرچھائیں کو زنجیر کریں
ساعتِ ہجر تجھے کیسے جہانگیر کریں

پاؤں کے نیچے کوئی شے ہے زمیں کی صورت
چند دن اور اسی وہم کی تشہیر کریں

شہرِ امید حقیقت میں نہیں بن سکتا
تو چلو اس کو تصور ہی میں تعمیر کریں

ہم میں جرأت کی کمی کل کی طرح آج بھی ہے
تشنگی کس کے لبوں پر تجھے تحریر کریں

عمر کا باقی سفر کرنا ہے اس شرط کے ساتھ
دھوپ دیکھیں تو اسے سائے سے تعبیر کریں

[redacted]

پہلے کب شام و سحر ذکر تھا یوں دنیا کا
چل گیا مجھ پہ بھی آخر کو فسوں دنیا کا

میری وحشت نے عجب عہد کیا ہے اب کے
ہو نہ پائے کسی صورت بھی سکوں دنیا کا

سابقہ میرا پڑا اس سے تو یہ بات کھلی
خوف طاری ہے ہر اک شخص پہ کیوں دنیا کا

میں نے ہر روز نئے رنگ میں دیکھا اس کو
کیا کہوں گر میں قصیدہ نہ لکھوں دنیا کا

ابتدا جو بھی ہو، انجام ہے ہر ایک کا یہ
زندہ رہنے کی ہوس اور جنوں دنیا کا



## چپکے سے ادھر آجاؤ

دروازہ جہاں سے ہو کر
چپکے سے ادھر آجاؤ
اس برف بھری بوری کو
پیچھے کی طرف سرکاؤ
ہر گھاؤ پہ بوسے چھڑکو
ہر زخم کو تم سہلاؤ
میں تاروں کی اس شب کو
تقسیم کروں یوں سب کو
جاگیر ہو جیسے میری
یہ غرض نہ تم ٹھکراؤ
چپکے سے ادھر آجاؤ

■

## میں تجھ سے تو مجھ سے خائف

میرے ہونٹ پہ دو قطرے ہیں
تیرے پاس سمندر ہے
میری آنکھ جدھر بھی دیکھے
تیرا جسم منوّر ہے

میں تجھ سے تو مجھ سے خائف
بس اتنا سا انتر ہے
تو جب چاہے رک سکتی ہے
طاقت تیرے اندر ہے
خود کو اپنی حد میں رکھنا
میرے بس سے باہر ہے۔ ■

● سی ۱۲ میڈیکل کالج کیمپس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)



ویریندر پٹواری
پریم کنج ، بھوری تالاب تلون ، جموں - ۲

# بے چین لمحوں کا تنہا سفر

چھوٹو کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔ مگر اس کو اپنے ساتھ لاتا بھی تو کیسے ؟! ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ یہاں ریلوے پلیٹ فارم پر بے صبری سے بچّوں کی آمد کا انتظار کرنے کی بجائے میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر اور چھوٹو کو اپنے بالکل قریب رکھ کر بچّوں کا استقبال کرتا۔ مگر وہ بھی کیسے ہو سکتا تھا ۔ ؟ تینوں بچوں نے اپنے الگ الگ لکھے خطوط میں اصرار کیا ہے کہ میں ان کو اسٹیشن پر ہی لینے آؤں ۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں ان کو ان کی پڑھائی کے زمانے میں اسٹیشن پر یا بس اسٹینڈ پر لینے جایا کرتا تھا۔ یعنی پلیٹ فارم پر گاڑی جانے سے پہلے ہی جب وہ کھڑکی یا دروازے سے جھانک کر دیکھیں تب ان کا ڈیڈی وہاں موجود ہو۔ بلکہ دور سے ہی نظر آئے ! ڈیڈی ہی کیوں، تب ان کی ممّی بھی وہاں موجود ہوتی ! مگر، تب اور اب میں فرق صرف اتنا ہے کہ آج میں تنہا ہوں اور پلیٹ فارم پر چکر لگا رہا ہوں ۔!! مگر یہ تنہائی کیسی ہم سفر ہے ۔ ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے، نہ بولتی ہے اور نہ نظر آتی ہے ! ہاں کبھی کبھی شور و غل کی طرف جانے کی کوشش کرو تب یوں محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے کوئی تعاقب کر رہا ہو ۔ ! اُف یہ تنہائی ! ۔ ؟ یہ کیسی خاموشی ہے جو پلیٹ فارم کی چہل پہل، انجنوں کی سیٹیوں، ریڑھی والوں کی آوازوں، لڑاکو مسافروں کی گالی گلوچ، یا ہجوم میں کھوئے بچوں کی چیخ و پکار سے متاثر نہیں ہو رہی ہے ۔۔ کم بخت گھبرا کر بھی نہیں ٹوٹ رہی ہے ۔۔۔ ! ! ۔ اُف !!

لیکن جب میں یہاں آیا تھا تب مکمّل خاموشی ہی تھی ۔۔ مگر جانے کیوں اس قدر عجیب سا نہیں لگ رہا تھا ۔ ! ؟ ارے ہاں ۔! دراصل مجھے اتنی جلدی نہیں آنا چاہیئے تھا ۔ مگر اب آ ہی گیا ہوں تو جلدی واپس لوٹ کر جا بھی نہیں سکتا ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ گھر کا ایک چکر لگا کر آؤں ۔ چھوٹو کو دیکھ آؤں ۔ چلو اس کے ساتھ کوئی رشتہ نا سہی ایک ناطہ تو ہے ۔ مگر نہیں ۔ میں گھر نہیں جاؤں گا ۔ کیا معلوم گاڑی قبل از وقت آ جائے ۔ ہاں ۔ ایسا ممکن ہے ! ؟ کبھی بس کے ڈرائیور کو گھر جلدی پہنچنا ہو تو وہ کیا گاڑی بہت تیز نہیں چلاتا ہے ۔ ؟ مجھے انتظار کرنا ہوگا ۔ مگر ؟ ۔ مگر ! مگر یہ گاڑی آ کیوں نہیں رہی ہے ۔ لیکن اس ٹول کے ساتھ کب تک چپکا بیٹھوں گا ۔ چہل قدمی کی جائے تو بہتر ۔ مگر یہ پوچھتا چھ کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی دو آنکھیں جانے کیوں مجھے گھور رہی ہیں ؟ ہاں بھئی بار بار پوچھ رہا ہوں کہ جہلم کب آئے گی ۔ آخر کوئی گناہ تو نہیں کر رہا ہوں ! ۔ لیکن ؟ ۔ ! شاید میں تنگ کر رہا ہوں اس کو جبھی تو ناراض ہو کر اب بتا رہا ہے کہ گاڑی دو گھنٹے کے بعد آئے گی ۔ بکواس کر رہا ہے وہ ۔ ! ۔ !! میں یہاں تین گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں ۔ لیکن کیوں کر رہا ہوں ؟ ۔ ٹھیک ہے اس بار نہیں پوچھوں گا ۔ مگر اس کے ہونٹوں پر یہ طنزیہ مسکراہٹ کیوں بکھری ہوئی ہے ۔ ؟ میرے خیال میں الجھنے سے بہتر ہے کہ میں راستہ بدل دوں ۔ راستہ نہیں ۔ رُخ بدل دوں گا ۔ آخر اتنا لمبا تو ہے یہ پلیٹ فارم میرے گھر کا برآمدہ تو ہے نہیں کہ پڑوسیوں کا کرایہ دار تماشائی بن جائے اور میں ایک تماشا ۔ ہونہہ ! ۔ مگر یہ ریڑھی والا کیوں مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے ۔ ؟ میں کچھ بھی بڑبڑاؤں اس کو کیا ۔ !! کہیں وہ میری کیفیت تو نہیں بھانپ گیا ہے ۔ ؟ ہونہہ ۔ بکی کیفیت بچے تو سبھی کو پیارے ہوتے ہیں ۔ اس کرایہ دار کا کھویا ہوا بیٹا جب مل گیا تھا تب وہ خوشی سے پاگل ہو کر سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا ۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی کم بخت کی ! ۔ لیکن پھر بھی ہر وقت میرا مذاق اڑا کر میرا دل توڑ دیتا ہے ارے یہ کیا ۔ ؟ مجھے معلوم تھا کہ یہ پوچھ تاچھ والا بابو جھوٹ بول رہا ہے ۔ لو ۔ وہ ۔ آ تو رہی ہے ٹرین ۔ ! یہ جہلم ہے نا ؟ ۔ ایئر کنڈیشن کا ڈبہ یہاں لگ جاتا ہے نا ؟ ۔ کیا ! ؟ ارے

یہ تو خالی انجن ہے ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ یہ خالی انجن ڈبوں کے بغیر عجیب سا لگتا ہے۔ گویا کسی کا سر پھدک پھدک کر پٹری پر چل رہا ہو ۔ مگر جسم غائب ۔ ! یا پھر مرغی کٹ کٹ کر چل رہی ہے اور اس کے بچے کہیں نظر ہی نہیں آ رہے ہوں ۔ ! اف کہاں گئے مرغی کے بچے ۔ ؟ ۔ ؟ ؟ ! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے ۔ مانا کہ چوزوں کو چیل اٹھا کر لے جاتی ہے ۔

———— ۔ مگر کیا چیل مرغی کو بھی اٹھا کر لے جا سکتی ہے ؟

نہیں نا ؟ ؟ پھر ! ۔ جانے کیوں بچوں کی ماں یاد آ رہی ہے ۔ لو اگر میں نے اپنے آنسو کوٹ کی آستین سے صاف کر بھی لئے تب بھی کیا ہوا ۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟ ۔ پوچھ لینا چاہیئے اس ریڑی والے سے ۔ مگر نہیں ۔ یہ شاید مجھے بھکاری یا پاگل سمجھ رہا ہے ۔ مگر کیسے ؟ ۔ بھکاری کیا اتنے قیمتی کپڑے پہن لیتے ہیں ؟ اس کو بتانا ہی پڑے گا کہ یہ سوٹ انل نے امریکہ سے سلوا کر بھیجا ہے ۔ یہ بنیان آشا نے لندن سے بھیجی ہے ۔ اور یہ ٹائی اور قمیض انل کی ممی دہلی کے پالیکا بازار سے لائی ہے ۔ ہاں بھئی کالر میلا ہے ۔ کل دیکھ لینا صاف ہوگا ۔ ارے او ریڑی والے میں بہت امیر آدمی ہوں ۔ آنے دے میرے بچوں کو میں تیرے یہ سارے کے سارے گرم سموسے خرید لوں گا ۔ تو بھی کیا یاد کرے گا ۔ چائے بھی پی لیں گے ہم ۔ جانتا ہے کون کون ؟ میں بتاتا ہوں ۔ میرا بیٹا انل اور میری دو بیٹیاں آشا اور انیتا ۔ ہاں ہاں ! ہم کوئی اسپیشل چیز تب کھا لیتے ہیں جب سب اکٹھے ہوں ۔۔ معلوم ہے ! ہمارا ایک بہت بڑا ڈرائنگ روم ہے ۔ ہم لوگ اس کو ایک پارک بنا دیتے ہیں ۔ یعنی قالین مخملی گھاس بن جاتا ہے چھت نیلا آکاش بن جاتی ہے ۔ دیوار پر آویزاں تصویریں درخت بن جاتی ہیں ۔ یہ سب کچھ کیسے بن جاتا ہے یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ احمق ہو ! تخیل اور تصور کو نہیں سمجھ سکتے نا ! ! ہاں بات پارک کی ہو رہی تھی ۔ تو ہم لوگ اس طرح پکنک منایا کرتے تھے دراصل میری بیوی تمہاری طرح احمق تھی ۔ کھانا بنانے اور جہیز سکھ دینے کے سوا کچھ اور اس کو آتا ہی نہیں تھا ۔ ' جانتے ہو ' نہیں ۔ تھا ! ! ۔ صبح سویرے کی چائے سے رات کی کافی تک وہ یہی کہتی رہتی تھی ۔ نیتو کا پانی نہانے کے لئے گرم پانی ۔ ناشتہ ۔ سوٹ نکال کر رکھ دیا ہے دودھ کا گلاس خالی کر دو ۔ اسکول جاؤ ۔ کالج جاؤ ۔ دیر ہو رہی ہے افسانوں کی بات رہنے دو نوکری کی فکر کرو ۔ بہت کھیل کود ہو گیا اب پڑھائی کرو ۔ صبح کا الارم لگا رکھا ہے ۔ تم رات بھر لکھتے لکھتے تھک نہیں جاتے کیا ؟ ۔ شاعروں ، ادیبوں یا مصوروں کو تنہائی پسند ہے تو شادی بیاہ کیوں کر لیتے ہیں ؟ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر پھر بھی ہم کتنے خوش تھے ۔ مگر اچانک جانے کیوں ہم سب مل کر اس آندھی کو روک نہیں سکے جس نے ہمیں اکھاڑ کر دور دور پھینک دیا ! آہ ! ۔ بکھر گئے ہم سب ! ! ۔ آشا لندن میں کیوں رہ رہی ہے ؟ انل اور انیتا کو امریکہ میں کون سی خوشی مل رہی ہے ؟ ۔ ہونہہ ! ! ۔ دراصل میں ۵۰ سال کی عمر میں ہی سٹھیا گیا ہوں ۔ ارے خوشی مل رہی ہے اس لئے تو وہ پچھلے دو سال سے وہاں ہیں ۔ دو سال کیوں ۔۔۔ دو سال چار مہینے اور ۔ اور ہاں دس دن ۔ آج گیارہواں دن تو ہے مگر تھوڑی دیر میں آ تو رہے ہیں تینوں ۔ لیکن ان کی ممی ! ؟ ۔ ایک سال اور تین دن بیت گئے ! راکھ کے ڈھیر میں ڈوبتے ہوئے شاید اس نے پلٹ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی ہوگی ۔ یہ کیسا معاشرہ ہے ؟ کیا کوئی شمشان گھاٹ پر رو نہیں سکتا ۔ ؟ ۔ ؟ ۔ ؟ ۔ ؟ کیا ہو گیا ہے مجھے ۔ ؟ یہ دیوانوں کی باتیں ہیں ۔ انوکھی باتیں ہیں ۔ مگر میں بھی تو انوکھا آدمی ہوں ! بات بچوں اور چھوٹو کی ہو رہی تھی ۔ اور میں بیوی کو یاد کرنے لگا ۔ اس عمر میں بھگوان کو یاد کرنا چاہیئے ۔ ہے نا ؟ ۔ مگر یہ پوچھ تاچھ کا بابو کمرے سے باہر آ کر میرا پیچھا کیوں کرنے لگا ہے ۔۔ ارے بھئی غصہ نہیں آئے تو اور کیا آئے ۔ ؟ میں کوئی جاسوس نہیں ہوں ! ریل کی فرسٹ پلیٹ فارم بھی اتارنے نہیں آیا ہوں ! ۔ میں اپنے بچوں کو لینے آیا ہوں ۔ ! ! ارے کیا ہوا جو وہ جوان ہیں ۔ بچے تو آخر بچے ہی ہوتے ہیں ؟ یقین نہیں آ رہا ہے نا ؟ ۔ باہر میری کار کھڑی ہے ۔ نمبر بتا دوں ۔ ؟ ۔ مگر کیوں ! ؟ ۔ ارے کوئی پوچھے تو کہہ دوں گا کہ آج میرے تینوں بچے ایک ساتھ آ رہے ہیں ۔ ہے نا حسن اتفاق ۔ ؟ جناب اس کو کہتے ہیں زبردست پلاننگ ۔ آخر میرے بچے ہیں ۔ میں نے بھی ان کی واپسی کے ٹکٹ کنفرم کروا دیئے ہیں ۔ ریل میں نہیں جہاز میں ! پوچھئے کیوں ؟ ۔ وہ اس لئے کہ ایک اور دن ہم سب پکنک منائیں گے اپنے ڈرائنگ روم میں ۔ ! ؟ ۔ ؟ ۔ ؟ ۔ ؟ ۔۔ ! ! ! لو شاندار ٹرین آگئی ارے ہاں ۔ جہلم ہی تو ہے ! ! وہ کون ہے ؟ ۔ نہیں ۔ نہیں انل نہیں ہوگا اور وہ لوگ A.C.C میں آ رہے ہیں ۔ مگر A C C کے دروازے پر وہ کون ہے ۔ ؟ انل چشمہ پہننے لگا ہے کیا ؟ ۔ ارے یہ تو راہل ہے ۔ انل کا دوست ۔ راہل بیٹے انل بھی اسی ڈبے میں ہے ۔ ! ۔ ؟ ۔ کیا ؟ ؟ کیا وہ نہیں ہیں ! ! A C C کی اور بھی کوئی کوچ ہے کیا ؟ پھر ! ۔ کیا کہا ان کا پروگرام کینسل ہو گیا ۔ ! چلو مان لیا کہ انل کے دوست کے ذریعہ

بھگوان کو پیارے ہو گئے آشا اور انیتا نے کیوں اپنی ٹکٹیں کینسل کروا دیں ۔؟؟ ہا۔ ہا۔ ہا ایک ساتھ اگر مجھے SURPRISE دینا چاہتے ہیں ۔!! مگر یہ سامان کیوں بھیجا تمہارے ساتھ ۔ ؟ اچھا اچھا یہ دو اٹیچیاں میرے اور چھوٹو کے سامان کی ہیں ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ !!۔ ؟!۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ میری اٹیچی میں کیا ہو سکتا ہے مجھے معلوم ہے مگر چھوٹو کے لئے کیا بھیجا ہے بچوں نے ؟ ۔ چلو! وہ خود ہی دیکھے گا یہ صندوق کھول کھول کر اب مجھے کوفت ہونے لگی ہے ۔ اچھا کیا راہل بیٹے جو اطلاع دی ورنہ میں شاید کئی راتوں تک چکر لگاتا رہتا ۔ کولہو کے بیل کی طرح ۔ طرح کیا ۔ ؟ کولہو کا بیل ہی تو ہوں میں ! ۔ مگر کچھ بھی ہو میں چکر لگاتا رہوں یا خلاؤں میں گھورتا رہوں مجھے کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ ہی پوچھ تاچھ والا بابو مجھے تخریب کار کہہ سکتا ہے ۔ کیا کیا میں نے ؟ ٹھیک ہے جو کہنا ہے کل کہہ ڈالنا ۔ مگر کل میں وقت سے پہلے ہرگز نہیں آؤں گا۔ کیوں نا جانے سے پہلے پوچھ ہی لوں کہ کل جہلم کتنے بجے آئے گی ؟ ۔ ہاں ۔ ہاں مجھے معلوم تھا کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں دے گا۔ ہونہہ !! اس وقت رات کا تیسرا پہر ہے ۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے ۔ نہیں ۔ نہیں میں کچھ بھی لکھ نہیں رہا ہوں ہاں بچوں کے خطوط بار بار پڑھ رہا ہوں ۔ ۔ ! چھوٹو کو بھی شاید نیند نہیں آرہی ہے ۔ بے چارہ بیمار ہے ۔ رات بھر کھانستا رہتا ہے اس لئے اس پر غصہ بھی آرہا ہے اور ترس بھی ۔ چھوٹو جیسا بھی ہے مگر میرے تینوں بچے اس کو بن دیکھے بہت پیار کرتے ہیں ۔ شاید اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ وہ میرا نوکر ہے ۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے ۔ وقت پر چائے ۔ وقت پر کھانا ۔ اور کیا چاہیئے مجھے ۔ ؟ ۔ ؟؟ چھوٹو کھانس رہا ہے اور کھانسی کی کھن کھن گویا دیواروں کو چیر کر میرے کانوں کے پردوں کو تار تار کر رہی ہے ۔ لیکن پھر بھی جب میں بچوں کے خطوط ہاتھ میں لے کر ان دیواروں کو دیکھ رہا ہوں تب یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے قہقہے گونج رہے ہیں ۔ ڈیڈی قالین پر سگریٹ کی راکھ مت جھاڑیئے بقول آپ کے غلطی گھاس پر دہکتا ہوا انگارہ پڑ جائے گا اور خوبصورتی لرز اٹھے گی ۔ ڈیڈی غزل سنیں گے ۔ ٹھمری سنیں گے یا ستار ؟ ڈیڈی آپ رات بھر جاگ کر کہانیاں لکھتے رہتے ہیں یا تاریخ ؟ ۔ ڈیڈی آپ ممی سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے ؟ ڈیڈی سردی ہے ۔ شال اوڑھ لیجئے ۔ ممی کشمیر سلائی ہیں ۔ ڈیڈی کافی بناؤں ۔ ؟ ڈیڈی سوپ بناؤں ۔۔ ؟ ۔ ؟ ۔ ؟ ۔ !!

چھوٹو کھانس رہا ہے ۔ اور کھن کھن کی آواز بار بار دیواروں کو چیر کر میرے کانوں کے پردوں کو اس قدر ہلا دیتی ہے کہ میرے ماضی کی یادیں بھی لرز کر بکھر جاتی ہیں ۔ چٹکی بجاتے ہی سگریٹ کی راکھ کی طرح ۔ اف یہ کیسا درد ہے ؟ یہ کیسی تڑپ ہے ؟ ۔۔ میرے ہاتھ میں آشا کا خط ہے ۔ اسی کے علاوہ کہ وہ کل آرہی ہے اس نے فقط چھوٹو کے بارے میں لکھا ہے ۔ گویا چھوٹو میرے گھر میں ایک ننھا فرشتہ ہے آشا سمجھ رہی ہے کہ چھوٹو بھی مجھے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کافی پلاتا ہوگا بالکل ویسے ہی وہ خود چند سال پہلے مجھے ہر شام پلایا کرتی تھی ۔۔۔ ! بقول انیتا چھوٹو کے بارے میں سن کر اس کا ذہنی انتشار سکون میں بدل گیا ہے ۔ ظاہر ہے کیوں ۔۔۔ ! بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں ۔ ماں باپ کی فکر کر سکتی ہیں خدمت نہیں ۔ مگر ان کو اپنی ذمہ داری کا شدت سے احساس ہے ۔ وہ بھی چھوٹو کو ایک اوتار سمجھ کر میرے بارے میں اب بالکل فکر مند نہیں ہے اور نہ ہی اب وہ رات رات بھر کروٹیں بدل بدل کر یہ سوچتا رہتا ہے کہ ڈیڈی کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا ۔ ہاں اس نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ تینوں نے مل کر چھوٹو کے لئے ڈھیر سارے تحفے اور کپڑے بھیجے ہیں ۔ اور یہ بھی فرمائش کی ہے کہ وہ ایک جوڑا پہن کر میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر آجائے ۔ شاید اس لئے کہ ان کو یقین ہے کہ ایک کاہل اور سست انسان کی زندگی کا ما دمان ایک اچھے نوکر کے ہاتھ میں ہے تب ہی تو ان کو چھوٹو سے بے حد پیار ہو گیا ہے ۔ کیوں نا ہو ؟ ! صبح ہوئی ہے اور میں تینوں خط تقریباً بیس بیس بار پڑھ چکا ہوں ۔ بار بار یہ محسوس کرتا رہا ہوں گویا میرے پاؤں تلے زمین کھسکتی جا رہی ہو ۔ شاید محسوسات کے دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں ۔ مگر ایک بار پھر کھانسی کی کھن کھن نے میرے احساسات کے سلسلے کو توڑ ڈالا ہے ۔

حالانکہ پچھلے کئی مہینوں سے میں اس کریہہ آواز کا عادی ہو چکا ہوں مگر اس وقت جانے کیوں یوں لگ رہا ہے جیسے کسی قیامت خیز زلزلے کے جھٹکوں سے یہ سارا مکان ہل رہا ہو ۔۔ یا پھر میں لرز رہا ہوں ۔۔۔ ! چھوٹو کو دوائی پلانے کا وقت آچکا ہے ۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کو اپنے بچوں کے بھیجے ہوئے تحائف بھی دوں شاید دل بہل جائے بے چارے کا ۔ ! مگر یہ کیا ؟ ۔ ؟ یہ پوشاکیں کیسی گیارہ یا بارہ سال کے لڑکے کے سائز کی ہیں ! ۔ ایک پوشاک پر لکھا ہے "میں ایک فرشتہ ہوں" ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ ! یہ ہنسی بھی کیا اس قدر تکلیف دہ

دسکتی ہے ؟ — مگر کیا کروں — چاہتے ہوئے بھی تو روہ نہیں سکتا ہوں۔ میری بیوی کی آتما کو تکلیف پہونچے گی نا ؟ یہی کیفیت جھوٹو کی ہے۔ وہ اس لئے نہیں روتا ہے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ ہو — بے چارہ میری سیوا کرنے آیا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود کھانسی اور بخار کے بوجھ تلے دب جائے گا۔ کوئی بات نہیں جھوٹو چاہے کچھ بھی ہو میں تمہاری سیوا کروں گا۔ کیا ہوا جو مجھے خود ہی کھانا بنانا پڑے۔ کیا ہوا جو میں لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کیا ہوا جو میں سنگیت نہیں سن سکتا۔ آخر ایک مریض کی نیند میں خلل ڈالنا بھی تو ایک گناہ ہی ہے۔ مگر — اف ! — بھگوان ! کیا گناہ کیا ہے میں نے — ؟؟ — ؟؟

یہ آج صبح سویرے مجھے کیا ہو گیا ؟ یہ وقت آئینے میں اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں۔ سفید داڑھی، سوکھے ہونٹ یا میلے کالر دیکھنے کا نہیں ہے۔ بلکہ چائے کی گرم گرم پیالی کا انتظار کرنے کے بجائے جھوٹو کو دوائی پلانے کا وقت ہے۔ جھوٹو میں آرہا ہوں۔ مگر اف۔ میری کمر ؟ — جھوٹو ! لے دوائی پی لے۔ لو آگئی نا پھر خون کی قے ! ارے کم بخت ! کیوں اپنے خوش بخت بیٹے بیٹیوں۔ پوتے پوتیوں کو چھوڑ کر شہر آیا تھا ؟ — جھوٹے لال شرما سے جھوٹو بن جانے کے لئے ؟ — کتنا جھوٹے بن گئے ہو تم ؟ لیکن کیا کروں تم پھر بھی میرے بیٹوں کے بھیجے ہوئے کپڑے پہن نہیں سکو گے۔ جاؤ ! چلے جاؤ — ارے ... ۷۰ سال کی عمر میں تم کام نہیں کر سکتے۔ تم بیمار ہو — ! تمہارے پھیپھڑوں کو کیڑے کرید رہے ہیں۔ جاؤ ! چلے جاؤ مگر ؟ مگر نہیں ! تم نہیں جا سکتے — میرے بچے تمہیں ایک فرشتہ سمجھ رہے ہیں۔ شاید تم ہو بھی — تم نہ ہوتے تو یہ حویلی ایک بھوت بنگلہ کہلاتی میرے بچے تمہیں بہت پیار کرتے ہیں — جھوٹو ! تم کب ٹھیک ہو جاؤ گے ؟ سنو جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تب تم مجھے اور کچھ نہ سہی صبح سویرے گرم گرم چائے ضرور پلاتے رہنا۔ جیسے ان کی ممی پلایا کرتی تھی مجھے۔ جیسے میرے بچے دل بہلایا کرتے تھے میرا — !! ❁

بقیہ صفحہ ۴۸ اردو ڈراما ۱۹۷۸ء کے بعد

کا ڈراما نمبر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے کاش کار کنان شگوفہ اس میں شامل کرنے کے لیے اردو کے نمائندہ ڈرا۔ مے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

ان آٹھ دس سالوں میں "اندر سبھا اور اندر سبھائیں" سنہ ۱۹۸۰ء اور "ہندی ڈرامے کا ارتقا" سنہ ۱۹۸۵ء کے علاوہ راقم کی اُردو کے اہم ڈراما نگار" تین جلدوں میں (متقدمین سنہ ۱۹۸۱ء) ۔ (آغا حشر سنہ ۱۹۸۲ء) اور (متوسطین سنہ ۱۹۸۴ء) اور اخلاق اثر کی دو کتابیں "اردو ڈرامے کا مطالعہ سنہ ۱۹۷۷ء اور اردو کا پہلا ڈراما سنہ ۱۹۷۸ء" منظر عام پر آئیں۔ اس جائزے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہے کہ ڈرامے میں دلچسپی بڑھی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ناقدین ڈرامے پر صحت مند تنقید کی روایت قائم کریں تاکہ اردو ڈرامے کے امکانات روشن ہوں۔ ❁

بقیہ صفحہ ۵۲ جواب دو

میرے بچو ہمت کرو، بس اب دیس آجاد ہونے والا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، اور ہم بچے آجادی کے انتجار میں بوڑھے ہو گئے — !

شمندر خاموش ہو گیا اور اٹھ کر کیاریوں کی طرف چل دیا تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔

"سائیب ! آجادی تو آگئی پر سائیب — ٹھیک تو کچھ بھی نہ ہوا — !"

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ گلوگیر آواز میں پھر مجھ سے مخاطب ہوا

سائیب ! — سائیب بس — ! بس اتنا بتا دو سائیب کیا۔ کیا ایک آجادی اور آئے گا سائیب — ! ؟ بولو سائیب جواب دو — !!" ❁



نسیم محمد جان
گورنمنٹ انٹر کالج چھپرہ - ۸۴۱۳۰۱ (بہار)

# کیا پانا، کیا کھونا

وہ بھی عجیب آدمی تھا، کئی دنوں سے سارے محلّے والوں کی گفتگو کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آٹھ دس روز قبل جب وہ آیا تھا تو لوگوں نے اسے صرف عام قسم ایک سادھو سمجھا تھا۔ بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں چہرہ بالکل چھپا ہوا۔ سُرخ بڑی بڑی روشن آنکھیں جیسے برسوں سے جاگ رہی ہوں۔ لانبا قد، گیروے رنگ کی معمولی دھوتی میں لپٹا ہوا۔ ہاتھ میں ایک تارا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بھجن گاتا رہتا۔ انگلیوں سے ایک تارے کو بڑے اچھے انداز میں چھیڑتا تھا۔ لوگ اسے عام سادھو نہ سمجھتے تو کیا سمجھتے؟ دو چار روز گذرے تو بوڑھے نیم کے پیڑ کے نیچے کچھ عورتیں نظر آنے لگیں۔ کملا شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے بھی خاوند مانگ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی ایسی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ سادھو سمجھا رہا تھا۔ زندگی ہر حال میں بڑی قیمتی چیز ہے۔ نعیمہ کے ساتھ دو عورتیں اپنے اپنے شوہروں کے لوٹ آنے کے لئے تعویز لینے آئی تھیں۔ ادھیڑ عمر کی عورت بیٹی کی شادی کے لئے گنڈے مانگ رہی تھی۔ لتا اپنی اولاد کے لئے پریشان تھی۔ سادھو سمجھا رہا تھا اس ادھوری دنیا میں سب کچھ آدھا ادھورا ہے۔ ایک خواہش سے دوسری خواہش جنم لیتی ہے لتا بار بار کہہ رہی تھی، مہاراج! بس ایک لڑکی ہی پیدا ہو جائے۔ یہ بچوں کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ کسی کو اولاد ہی نہیں ہوتی اور کل یہاں سے کچھ دور گلی میں صبح کے وقت ایک نوزائیدہ بچہ کوڑے کے ڈھیر میں پڑا ہوا ملا۔ لوگ زمانے کو کوس رہے تھے جیسے زمانہ ان سے الگ کوئی چیز ہو۔ بڑا چرچہ رہا ...... بات گھروں سے گشت کرتی عبادت گاہوں تک پہونچی ...... مذہب کے ٹھیکہ داروں نے سنا تو بہت خفا ہوئے۔ ان کا خیال تھا اس قسم کی گفتگو یہاں نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں اگر کسی جلوس پر ایک آدھ اینٹ گرنے کی بات ہوتی تو پھر یہ کہتے لوگو! گھروں سے باہر نکلو۔ مذہب کی ساری دیواروں کو اس اینٹ کے ایک ٹکڑے نے بنیاد سے ہلا دیا۔ اس خاص حالت میں عورتوں کی عزت لوٹنا، بچوں کا سر کاٹنا اور نہتے آدمی پر پیچھے سے چاقو کا وار کرنا ہی تمہاری پراتھنا ہے۔ الماریوں میں سجی کتابوں والے یہ بے چارے کیا سمجھتے کہ ان پھینکے ہوئے بچوں، شوہروں کی واپسی کا تعویز مانگنے والی عورتوں اور جہیز کے انتظام کے انتظار میں بیٹھی جوانیوں میں کچھ رشتہ بھی ہے......... اور پھینکے ہوئے بچے کا رشتہ ان سے ہو بھی کیا سکتا تھا جب یہ بھی معلوم نہ ہو کہ بچہ کس مذہب کے ماننے والے کا ہے...... سادھو لوگوں کو سمجھا لیتا تو کہتا اوپر والے سے مانگ وہی تم کو بھی دے گا اور مجھے بھی۔ وہ تعویذوں کے بدلے کچھ قبول نہ کرتا جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی بڑا من موجی تھا، جس سمت جی چاہتا نکل جاتا۔ کبھی کبھی کسی کو بڑے غور سے دیکھتا۔ بعض اوقات تنہا کسی گھر کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا جیسے کسی کے باہر آنے کا انتظار کر رہا ہو۔

ایک دن پان والا موہن ہر آدمی سے کہہ رہا تھا سادھو کوئی معمولی سنیاسی نہیں ہے۔ وہ وکیل صاحب کی بیٹی چمپا کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کو تو مرے دس سال گذر گئے۔ آخر وہ چمپا کو کیسے جانتا ہے۔ ایسا سادھو تو یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا، لوگوں نے اس سے دریافت کیا تو وہ جواب دینے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا جواب دوں ان کو، آخر ایک ضعیف آدمی نے مسئلہ حل کیا۔ ضرور کوئی پچھلے جنم کا رشتہ رہا ہوگا چمپا کے ساتھ۔

سادھو لوگوں کی منت سماجت پر ان کے گھروں میں سونے

کے لیے بھی تیار ہو جاتا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی ایک رات جس گھر میں
ٹھہرتا دوبارہ سونے پر کبھی راضی نہ ہوتا۔ منوہر جی کی بیوی بہت
خوشامد کر کے سادھو کو اپنے گھر لائیں۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ ممکن ہے
خیال ہوا ہو۔ کون جانے بھگوان نے ان ہی کی مراد پوری کرنے کے
لیے سنیاسی جی کو بھیجا ہو۔ سادھو کو کمرے کے اندر لے گئیں
بڑے موٹے فوم کے گدے پر بٹھایا۔ دوڑی دوڑی بیرونی ملک کا
بہت قیمتی کمبل بھی لے آئیں۔ سادھو کے پیروں کو اپنے ہاتھوں
سے دھویا۔ سادھو دیوار پر لگی تصویر دیکھ رہا تھا۔ رادھا اور کرشن
کی تصویر...... نظریں تھیں کہ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔
کسی نے پوچھا، مہاراج! کیا دیکھ رہے ہیں۔ بولا! بڑی اچھی کلا ہے۔
...... ہند کا کلاکار جا ہے جتنا بھی بڑا ہو اس کے کلا کی قیمت بیچنے
والے ہی لگاتے ہیں۔ اب سنیاسی بار بار دائیں۔ بائیں، اوپر، نیچے
دیکھے جا رہا تھا۔ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔ دم گھٹ
رہا ہے۔ راکھ بھی مہک رہا ہے، گھر والی بولیں، مہاراج! اگربتی
جل رہی ہے۔ سادھو اچانک منوہر جی سے پوچھ بیٹھا، یہاں تو کوئی
گنیش بابو رہتے تھے نا، صرف ایک جھونپڑی تھی۔ بچہ! تم کام کیا
کرتے ہو؟ سادھو، منوہر جی سے مخاطب تھا۔ جواب کا انتظار
کئے بغیر وہ باہر نکل گیا اور ندی کی طرف چلا گیا۔ لوگ خاموش تھے
گنیش بابو کو گذرے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے
بیٹے نے کس قسم کے دھندے سے یہ محل کھڑا کر لیا تھا۔ مگر سوال یہ
تھا یہ ساری باتیں سادھو کو کیسے معلوم ہو گئیں۔ اب تو ہر آدمی مان رہا
تھا، یہ کوئی بہت پہنچا مہاتما ہے،
لوگ کہنے لگے، وہ آنکھیں بند کرتے ہی ہر آدمی کا ماضی، حال
اور مستقبل دیکھ لیتا ہے، اب سادھو کے پاس جاتے ہوئے لوگ
ڈرنے لگے۔ انتظار میں رہتے کہ سادھو اکیلا ملے پہلے میاں بیوی
بے خوف ایک ساتھ اس کے پاس چلے آتے تھے۔ مگر اب اکثر شوہروں
کی کوشش ہوتی ان کی بیوی ساتھ نہ ہو۔ اور بعض بیویوں کا بھی یہی

حال تھا۔
اور ایک دن لوگوں کے ہوش اڑ گئے جب وہ کھڑی بھیڑ سے
پوچھ بیٹھا، وہ سواتی ہے نا۔ بے چارہ نرندر، کسی نے کہا ہاں مہاراج
سواتی ہے۔ کل ہی یہاں آئی ہے سسرال سے۔ اس کا بھائی نرندر
تو برسوں پہلے جب دس برس کا تھا ندی میں ڈوب گیا تھا۔"

ہفتہ عشرہ گذرا تو خبر گرم ہوئی۔ یہ سادھو سی۔ آئی۔ ڈی ہے۔
کسی بڑے شکار کے پیچھے ہے۔ اس بات کے پھیلتے ہی شہر کے دو چار
بڑے تجارتی قسم کے آدمیوں کا آنا بالکل بند ہو گیا۔ ایک بڑے سرکاری
افسر نے آنے جانے کا راستہ بدل دیا۔ پہلے وہ دفتر جاتے اور آتے
وقت بلا ناغہ موٹر روک کر سادھو کے پیر چھو کر آشیرواد لیا کرتے تھے۔
منوہر جی لوگوں سے رازداری کے لہجے میں کہتے پھر رہے تھے۔ بڑا خطرناک
آدمی ہے۔ باتیں کم کرتا ہے۔ کہیں بھید نہ کھل جائے۔ اب تو اسے اپنے
گھر میں آنے نہ دوں گا۔ سادھو کے پاس ہر آدمی کی بات لوگوں کے ساتھ
پہونچ جاتی۔ سن کر خاموش رہتا مگر ایک روز کہنے لگا۔ سوارتھ،
آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ دنیا کو حاصل کرنے کے لئے انسان جو
جال بنتا ہے خود اسی میں زندگی بھر کے لئے قید ہو کر رہ جاتا ہے۔۔
جتنا حاصل کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ کھو دیتا ہے۔ بھگوان سب
کے من کو شانتی دے۔"
ایک دن اچانک عجیب ہنگامہ ہوا۔ بھیڑ اکٹھا تھی۔ سادھو
بار بار کہہ رہا تھا۔
"میرا نام رام ناتھ ہے۔ میں بیجو کا بڑا بھائی ہوں،
بیجو نے کہا،
"جھوٹا ہے، ڈھونگی ہے"
مگر وہ کہے جا رہا تھا۔
دمیں جب نو برس کا تھا۔ گھر چھوڑ کر ایک سنیاسی کے پیچھے پیچھے

چلا گیا تھا۔"
گھبراتے ہوئے بیجو نے کہا" میرا کوئی بڑا بھائی نہیں۔ یہ ماضی
کی باتیں جان لیتا ہے۔ آج میرا بڑا بھائی بن رہا ہے کل کسی کا باپ
بن جائے گا۔ اسے دھن کا لوبھ ہے"
بزرگ خاموش تھے، سوچ رہے تھے، یہ سچ ہے" اس کا بڑا
بھائی نو دس سال کی عمر میں غائب ہو گیا تھا۔ ممکن تھا بیجو اپنا بڑ
بھائی مان لیتا مگر ماننے اور نہیں ماننے کے درمیان دکان جائداد او
مکان حائل تھا۔ جب بھیڑ کم ہوئی، سادھو چلا گیا تو بیجو اپنی ما

کو سمجھا رہا تھا۔
ماں اس ڈھونگی کو تو بیٹا نہ ماننا، باقی میں دیکھ لوں گا" بیجو
بیوی کے سمجھانے پر ماں کا باہر نکلنا بند کر دیا۔ سنیاسی روز آ
گھنٹوں ایک تارا بجاتا۔ اوروں کی دلچسپی اب اس سادھو

کم رہ گئی تھی۔ فائدے اور نقصان کی میزان پر لوگوں نے اس معاملے کو رکھا ہر آدمی نے دیکھا: بجو کی دشمنی مہنگی پڑ سکتی ہے اور فیصلہ بجو کے حق میں رہا۔ نقصان کا پلّہ بھاری ہوگیا۔ ایک دن سادھو ایک تارا بجاتے بجاتے تھک گیا۔ بجو قریب آکر کہنے لگا

"تم پہچانو! میں رام ناتھ ہوں تمہارا بڑا بھائی۔ جب تم چھوٹے سے تھے میں گود میں لئے پھرتا تھا"

بجو کو غصہ آگیا

"تو رام ناتھ نہیں ہو سکتا"

"میں رام ناتھ ہوں"

"جھوٹ بکتا ہے۔ صرف دکان اور جائداد کے لالچ میں رام ناتھ بن گیا ہے"

"میں سادھو ہوں"

"اب جو تو یہاں آیا تو پولیس کے حوالے کر دوں گا"

بجو نے سوچا ایک بار اسے جو بھائی مان لیا تو پھر کوئی طاقت بٹوارے سے نہیں روک سکے گی۔ وہ اندر گیا اور ماں کو پکڑ لایا۔ سادھو 'ماں' 'ماں' کہتا رہ گیا مگر اس نے بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔

بجو کہہ رہا تھا:

"اس جعلی رام ناتھ کے بچے کو پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا"

دوسرے دن جب سادھو آیا تو اسے پہچاننا بھی دشوار تھا۔ پہلے چہرے کے نام پر صرف داڑھی اور مونچھیں تھیں مگر اب ایک دم سے چہرہ سامنے آگیا تھا۔ وہ آتے ہی ماں کی طرف لپکا اور کہنے لگا۔

"دیکھ ماں! ...۔ تو اگر مجھے نہیں پہچانتی تو سر کے اس زخم کو تو پہچان۔ یہ وہی زخم ہے نا جس پر کالی والی دوا ایک سال تک لگائی تھی تو نے؟"

ماں نے غور سے زخم دیکھا اور پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔

وہ کہہ رہی تھی!

"تو رام ناتھ ہے میرا رام ناتھ ...... کہاں چلا گیا تھا تو؟ ...... بجو یہ رام ناتھ ہے تیرا بھائی!"

سادھو اپنے بھائی کے قریب آیا اور بولا!

"تو جی چھوٹا مت کر میرے بھائی ...... میں سادھو ہوں مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ زنجیریں میرے کام کی نہیں"

ماں بار بار پوچھ رہی تھی، کہاں چلا گیا تھا تو ....."

بڑے دھیمے لہجے میں سادھو نے جواب دیا

"کچھ کھونے کچھ پانے ...... گرو کا آدیش ہوا ایک بار گھر سے ہو کر لوٹ آؤ۔ مان لوں گا، گھر بار، مکان جائداد، رشتے ناطوں میں انسان کو جکڑنے کی بے پناہ شکتی ہوتی ہے اسے توڑ کر آجاؤ ...۔ سو میں آگیا ......۔ اب بھگوان کی جب مرضی ہوگی چلا جاؤں گا"

لوگ جا چکے تھے۔ کچھ دنوں کے پہلے کا سادھو، مہاتما، جاسوس ڈھونگی اب صرف رام ناتھ رہ گیا تھا۔

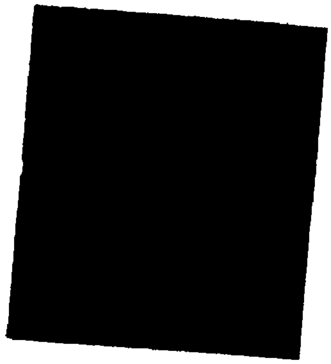
بجو کو جب یقین ہوگیا کہ وہ کچھ نہ لے گا تو اسے احساس ہوا بھیا کو سردی لگتی ہوگی، کتنی ٹھنڈ ہے، ایک بہت قیمتی کمبل دوں گا اپنے بھیا کو۔

رام ناتھ نے کہا "کاروبار بہت اچھا ہے تمہارا بجو!"

"بھیا! تم نے تو وہ حاصل کر لیا جو میں کبھی نہ پا سکوں گا"

"نہیں میرے بھائی نہیں! ۔ اس دنیا سے جب تن کو بھی چھوڑ کر جانا ہے۔ پھر کیا پانا کیا کھونا"

دوسرے دن صبح سادھو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بجو اپنے گھر کے سامنے کھڑا کھاٹ پر پڑے اپنے بھائی کے چھوڑے ہوئے نئے کمبل کو دیکھ کر سوچنے لگا ......۔ یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں، موسم بھی نہیں دیکھتے ......۔ سامنے دور تک پھیلا شہر پوری طرح کہرے میں ڈھکا تھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا جس میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔



## نصیر پرواز

قدم قدم رہ احساس سے گذرتے ہوئے
تجھے چھوا ہے مری آگہی نے ڈرتے ہوئے

نہ جانے کتنے دھند لکے وجود میں جاگے
تمہارے نام شب و روز اپنے کرتے ہوئے

میں سوچتا ہوں کبھی خود کو بے حجاب کروں
ترے وجود کے خاکے میں رنگ بھرتے ہوئے

میں لہر لہر پشیمانیوں کے دشت میں تھا
ملا ہوں سب سے یونہی ڈوبتے ابھرتے ہوئے

ہزار تابشِ آئینہ عکس ریز سہی
مری طرف بھی نظر زندگی سنورتے ہوئے

اب اس عمل کا تحفظ بھی چاہیے مجھ کو
تجھے قبول کیا بارہا مکرتے ہوئے

ہر ایک رشتۂ مہتاب و آفتاب نبھا
بلندیوں سے مری روح میں اترتے ہوئے

● رینٹ ۲/۹۲-۱/ب، گوندپورہ . بھوپال



## خوشتر مکرانوی

برہنہ ارض میں گلزار رکھنا
شگفتی راہ پر اشجار رکھنا

اڑیں آزادیوں کے ساتھ پنچھی
دلوں میں چاندنی کا پیار رکھنا

بہت ڈر لگتا ہے شام و سحر سے
تمیزِ عین کو پُرکار رکھنا

حریصوں میں تنفس رکھ سکوگے
خدا کو اپنا سا سمجھے دار رکھنا

ہوا کے ساتھ پھیلیں گے اندھیرے
بصیرت بر سرِ پیکار رکھنا

یہ بستی ہے ہرے شیشوں کی خوشتر
یہاں پر ابر کے کردار رکھنا

● نور علمی منزل، مکرانہ (راجستھان)



## حسن رضا

بے زمیں کرنا مجھے بے آسماں کرنا مجھے
چھوٹ دے کر سرحدوں کی بےکراں کرنا مجھے

کچھ بھی سانسوں میں منظر دوسرا بھی دیکھ لیں
تو یقیں بن جا سراسر اور گماں کرنا مجھے

زندگی بھر کا صلہ کچھ تو ملے میرے خدا!
تیری پرچھائیں بنوں ایسا دھواں کرنا مجھے

زندہ رہنے کے لئے کیا دوسری صورت نہیں
کیوں ضروری ہوگیا جاں کا زیاں کرنا مجھے

رات کے پچھلے پہر بجھتے الاؤ کے قریں
داستاں کرنا یا زیبِ داستاں کرنا مجھے

رہ روانِ شش جہت سے خوف سا ہونے لگا
آتی جاتی ساعتوں کے درمیاں کرنا مجھے

اب تو شاید سرخ رو ہو جاؤں گا میں بھی رضا
اس کی ہر اک بات پر آیا ہے ہاں کرنا مجھے

● کوارٹر نمبر ڈی - ۷، ایم گاؤں گڈی ضلع گلبرگہ



ابراھیم یوسف
۱۶ - نیم روڈ، امامی گیٹ - بھوپال - ۱

# اُردو ڈراما ۱۹۷۸ء کے بعد

اُردو ڈرامے کے دس سال[1] میں میں نے عرض کیا تھا کہ آج ایک ایسے مصنوعی سماج کی جبریہ تشکیل کا رجحان عام نظر آتا ہے جس کا رشتہ قطعی طور پر ماضی سے ٹوٹ چکا ہے، اخلاقی معیار اور سماجی رشتے بکھر چکے ہیں اور جو سماج تشکیل پا رہا ہے وہ تشدد کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اس مصنوعی سماج میں انسان اپنے آس پاس سے بے نیاز ہو کر یہ سوچ رہا ہے کہ وہ ہے اور صرف وہ ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں اردو ڈرامہ نگار سماج کی اس افراط و تفریط کو عرصے سے محسوس کرتا رہا ہے اور اس افراط و تفریط نے جس انسان کو جنم دیا ہے اسے دیکھا اور لکھا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ آج کا انسان وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے اس نے اپنے چہرے پر متعدد نقاب ڈال رکھے ہیں اور حسب ضرورت ان کا استعمال کرتا رہتا ہے اس نے اپنی شناخت کھو دی ہے اور وہ نقابوں کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ صدیق عالم نے اپنے ڈرامے "کبڑا بچہ[2]" میں سماج کے اس پہلو کو پیش کیا ہے۔ کبڑا بچہ علامت ہے سماج کے اس ٹیڑھے پن کی جو تشکیل پانے سے پہلے ہی کج ہو گیا ہے اور اس کو سیدھا کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ وہ کبڑا بچہ بھی خود کو کسی نقاب میں چھپالے ہر ہر بڑے کو یہ حق ہے کہ وہ جیسا چاہے اپنے لیے نقاب کا انتخاب کرے چنانچہ گدھے کا نقاب کہتا ہے کہ "تمہیں اپنا نقاب خود ڈھونڈنا ہو گا اس دنیا میں یہ کام تمہارے لیے کوئی نہیں کرے گا اور اگر تم بھی نہ کر پائے تو تمہیں انسان بننے کی سزا دی جائے گی" گویا آج کی دنیا میں انسان بننا سب سے بڑا جرم ہے جس کی سزا دی جانا چاہیئے۔ اس طرح خرگوش کا نقاب کہتا ہے کہ "یہ بہت آسان ہے تم اپنے اردگرد نظر کیوں نہیں ڈالتے کہیں کوئی چہرہ ضرور پڑا ہوا مل جائے گا کچھ لوگ ایک چہرے پر دوسرا چہرہ لگانے میں اتنے مصروف ہیں کہ بعض وقت ان کا اصلی چہرہ زمین پر گر جاتا ہے" یہی نہیں بلکہ سماج میں جو تشدد راہ پا گیا ہے اس کا جواز قانون میں تلاش کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے بلکہ یوں کہیئے کہ تشدد کو قانونی شکل دی جا رہی ہے چنانچہ کبڑا بچہ کہتا ہے "مجھے بچاؤ گھڑیال میرا پیچھا کر رہے ہیں انہوں نے اپنے جبڑوں میں قانون کی موٹی موٹی کتابیں اٹھا رکھی ہیں۔ مجھے پناہ دو" اس پر شیر کا نقاب سوال کرتا ہے کہ "وہ کب سے تمہارا تعاقب میں ہیں" کبڑا بچہ جواب دیتا ہے "جب سے انہوں نے انسانی چہرا پہن رکھا ہے" اور یہ ہے وہ سماج کا ٹیڑھا پن جس کو اردو ڈراما نگار شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ اسی ڈرامے میں جانور نما انسان کہتا ہے "اب جنگل کہیں نہیں رہے اور جانور ہر جگہ ہیں"

اسی کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما نگار محسوس کرتا ہے کہ تشدد کا یہ رجحان اور سماج کا یہ ٹیڑھا پن خوف اور اس بے انصافی کا ردعمل ہے جو مقامی فرقہ دارانہ سیاست اور بین الاقوامی سیاست کی اتھل پتھل سے پیدا ہوا ہے جس میں آج کا نوجوان اور کم زور قومیں خود کو غیر محفوظ پاتی ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں ہر لمحہ جنگ کے منڈلاتے خطروں نے انسانی نفسیات ہی کو بدل کر رکھ دیا ہے اور اسے مقصد براری کا واحد حل اسے تشدد میں نظر آتا ہے۔ انفرادی تشدد، اجتماعی تشدد اپنی صحیح اور غلط بات منوانے کے لیے تشدد اور اپنی فوقیت منوانے کے لیے تشدد غرض تشدد افراد اور قوموں کی زندگیوں کا وہ ناسور بن گیا ہے جس نے تمام دنیا کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے ہر طاقت ور قوم

---

[1] شاعر بمبئی جلد نمبر ۵۰ شمارہ ۹ - ۱۹۷۹ء -
[2] شاعر بمبئی جلد نمبر ۵۳ شمارہ نمبر ا - ۱۹۸۲ء -

نے سے کم زور قوم کو تشدد کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کر رہی ہے اور دنیا کو اس مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں کسی بیوقوف کی ذرا سی انگلی پڑ جانے سے ساری دنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ اردو ادیب اس خطرے کو شدت سے محسوس کر رہا ہے اور بلا مبالغہ سیکڑوں نظمیں، افسانے، ناول اور ڈرامے جنگ کو موضوع بنا کر لکھے جا چکے ہیں آنند لہر کا ڈراما "حاصل جنگ"[3] اسی کی ایک کڑی ہے لیکن اس کا کینوس روایتی انداز کی تخلیقات سے زیادہ وسیع اور مختلف ہے اور اس میں چند بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں جن کا جواب نہ تو جنگ باز سیاستدانوں کے پاس ہے اور نہ قوم پرست رہنماؤں کے پاس

بچہ :۔ لیکن میرے پاپا تو مارے گئے

عکس :۔ اب نا چو۔ تمہارے پاپا مارے نہیں گئے شہید ہو گئے

بچہ :۔ ٹھہرو میری اگلی بات سنو۔ کیا جو لوگ شہید ہوتے ہیں ان کے بچے یتیم نہیں ہوتے؟

بچے کے اس سوال کا کوئی جواب ہے اور پھر ایک جنگ دوسری کے لیے ماحول پیدا کرتی ہے۔

آواز :۔ ایک بار پھر اپنے بچے اس لیے پال سترہ دن کر دو ہمیں دشمن سے اپنا علاقہ واپس چھڑانا ہے اور ایک لڑائی لڑنا ہے

اگر ایک ہی لڑائی لڑنا ہو تو مائیں ایک مرتبہ صبر کر لیں لیکن ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری جنگ، جنگوں کا ایک تسلسل ہے آخر مائیں کب تک جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے بچے جنتی رہیں گی جب کہ جنگ میں کوئی بار تا جیتا نہیں

کردار :۔ دشمن جیت تو گیا مگر اس کے سارے سپاہی مارے گئے کاش ہمارے پاس چند آدمی بچ جاتے تو اپنی دھرتی پر قبضہ کر لیتے۔

ہر جنگ کا یہی انجام ہوتا ہے اور ہر جنگ کے بعد یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ جنگ کے لیے اور بچے پیدا کرو۔ میں نے آنند لہر کے اس ڈرامے کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ اس میں جنگ میں لمحہ بہ لمحہ بدلتی نفسیات، مختلف عمروں اور طبقوں کا انداز فکر اور مختلف کرداروں کی آمیزش اور آویزش سے ڈراما بہت متاثر کن ہو گیا ہے اور پیش کش کے لیے جو ہدایتیں دی گئی ہیں اسٹیج پر روشنی اور تاریکی کا جو تناسب قائم کیا گیا ہے وہ روایتی انداز سے ہٹ کر ہے اور ڈرامے کی پیش کش کے لیے نئی سمتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر محمد حسن نے اپنا علامتی ڈراما "ضحاک" لکھ کر اسٹیج کروایا تھا اگرچہ اس سے پہلے بھی چند علامتی ڈرامے لکھے گئے تھے مگر ضحاک کی مقبولیت اور اہمیت نے اردو ڈرامے کو ایک نئی راہ سے آشنا کرایا اور علامتی ڈرامے کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ چنانچہ محمد صدیق عالم نے کبڑا بچہ، بوڑھے درخت کی سمفنی[4] اور جیک اور جل[5] لکھے۔ آنند لہر کا "کالی کہانی"[6] اور بمل کمار اشک کا "ساڑھے پانچ جیب کترے اور ایک تھکا ماندہ خدا"[7] اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آنند لہر نے اپنا ڈراما کالی کہانی میں مونتاژ کا استعمال کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے واقعاتی ٹکڑوں کو جوڑ کر تاثر پیدا کیا ہے اگرچہ یہ واقعاتی ٹکڑے اس قدر مختصر مدت کے ہیں کہ تاثر پیدا کرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی پورا ڈراما پڑھنے کے بعد بات واضح ہو جاتی ہے اور ایک مجموعی تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے ڈراموں میں ترسیل کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے ڈراما نگار کی ذرا سی غفلت تخلیق کو نقصان پہنچا دیتی ہے چنانچہ صدیق عالم نے دونوں ڈرامے "بوڑھے درخت کی سمفنی" اور "جیک اور جل" گنجلک ہو کر رہ گئے ہیں بہرحال اس قسم کے ڈراموں کا رجحان اردو میں پیدا ہوا ہے اور ہمیں اس سے مستقبل میں نیک توقعات رکھنا چاہیے۔

---

[3] شاعر بمبئی جلد نمبر ۵۵ شمارہ نمبر ۵-۶ سنہ ۱۹۸۴ء۔

[4] شاعر بمبئی جلد ۵۵ شمارہ ۱-۲ سنہ ۱۹۸۴ء۔

[5] شاعر بمبئی جلد ۵۶ شمارہ ۴ سنہ ۱۹۸۵ء۔

[6] شب خون الہ آباد شمارہ ۱۲۹ سنہ ۱۹۸۳ء۔

[7] شب خون الہ آباد شمارہ ۱۲۲ سنہ ۱۹۸۱ء۔

پارسی اردو تھیٹر نے اپنے ڈراموں میں خارجی تصادم کو بھی اہمیت دی تھی اور داخلی کشمکش کو نظرانداز کیا تھا جس سے کردار کے خدوخال واضح ہوتے ہیں اردو ڈرامے میں خارجی تصادم ایک روایت بن گیا تھا۔ لیکن معیاری ڈراموں میں داخلی اور خارجی تصادم میں ایک توازن ضروری ہے ان آٹھ دس سالوں میں ایسے متعدد ڈرامے لکھے گئے جن میں کرداروں کی داخلی کشمکش کو موضوع بنایا گیا جیسے رفیعہ شبنم عابدی کا "قطرہ قطرہ زندگی"[8] جس میں ایک ایسی عورت کو پیش کیا گیا ہے جس نے اپنی ماں کو تخلیق کے کرب میں مبتلا دیکھا ہے اور اب وہ اس عمل سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد اپنے شوہر سے جسمانی رشتہ قائم کرنے سے گریز کرتی ہے اس کے ساتھ اس نے اپنے باپ کو اپنی ماں کے جسم کو سلتے رستے بھی دیکھا ہے اور اس سے اسے مرد کی ذات ہی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بچپن کے تجربات سے اس قسم کی نفسیات کا پیدا ہو جانا غیر ممکن نہیں ہے لیکن ڈرامے میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ عمل کا فقدان ہے پورے ڈرامے کی بنیاد مکالموں پر ہے شاید ڈراما ریڈیو کے لیے لکھا گیا تھا بعض بعض ہدایات سے اس کے اشارے بھی ملتے ہیں جس سے ڈرامے کا ڈرامائی عمل متاثر ہوا ہے اس سلسلے میں اگر میں اپنے ایک ڈرامے "پرچھائیوں کا پیچھا"[9] کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں ایک ایسی عورت کی داخلی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے جس کے شوہر نے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے کہ وہ نامرد ہے عورت سے جسمانی تعلق ختم کر لیا ہے۔ عورت محسوس کرتی ہے کہ اگر وہ کسی اور مرد سے رشتہ قائم کرے تو اس کے شوہر کو کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر یہ خیال عورت کے لیے روحانی اذیت کا باعث ہے لہٰذا اگر کبھی وہ جنسی تناؤ کے باعث کسی مرد کی طرف راغب ہوتی ہے تو مرد کی فراخ دلی، اخلاقی اور سماجی قدروں کے ساتھ ایک دوسرے مرد کے رتبہ اور معیار اس کا دامن تھام لیتا ہے اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور ڈراما اسی کشمکش میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ساگر سرحدی کا ڈراما "بھوکے بھجن نہ ہووے گوپالا"[10] ہے جس میں بھوکے انسانوں کی نفسیات کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے ایک ڈراما کلکتہ کے کمال احمد کا ہے "شیشہ کا گھر" جس میں ایک نواب اپنے بیٹے کے انتظار میں ہے جو انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس ڈرامے میں نواب کی تنہائی اور انتظار سے پیدا ہونے والی نواب کی داخلی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے سلیم شہزاد نے اس ڈرامے کے موضوع کو پیش پا افتادہ قرار دیا ہے لیکن صرف موضوع کو زیر بحث لاکر ڈرامے کو نظرانداز کر دینا ڈرامے کے ساتھ انصاف نہیں ہے ایک ہی واقعہ مختلف لوگوں پر مختلف طریقوں سے اثرانداز ہوتا ہے ایسے حالات میں موضوع اس قدر اہم نہیں ہوتا جتنا کہ اس سے پیدا ہونے والے اثرات اور "شیشہ کے گھر" میں انھیں اثرات کو پیش کیا گیا ہے جو متاثر کرتے ہیں۔

اب جب کہ کمال احمد کے ڈراموں کی بات نکل آئی ہے تو ان کے دوسرے ڈراموں پر نظر ڈال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۶ء تک ان کے تین مجموعے "دو ڈرامے تجربانی" ۱۹۷۰ء، "شکران" ۱۹۸۲ء اور "مور کے پاؤں" ۱۹۸۶ء منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈراما "ایدیا ترا مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے رسالہ "روح ادب" کے اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ان تین مجموعوں میں آٹھ ڈرامے شامل ہیں ان ڈراموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ کمال احمد آج کی گندی سیاست اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے سخت نالاں اور بے زار ہیں اور اس بے زاری نے ان کے خون تک میں تلخی پیدا کر دی ہے اور یہ تلخی طنز کے زہریلے نشتر بن کر ہمارے اور آپ کے احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے "ایک تھا راجا" ایمرجنسی کی پیداوار ہے ڈرامے میں فنی نقطۂ نظر سے کچھ کمزوریاں ہو سکتی ہیں مگر بقول ڈاکٹر محمد حسن "ایک تھا راجا میں طنز کے کوڑے برسائے ہیں اور اپنے طور پر احتجاج کا رخ اپنایا ہے ..... گو اس کی معنویت محض ایک ہنگامی واقعہ تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر سماجی نظام پر محیط ہے" کمال احمد کے ڈرامائی فن کا نمونہ "مور کے پاؤں" میں نظر آتا ہے۔ یہ ڈراما جہاں فنی نقطۂ نظر سے مکمل ہے وہیں گلے سڑے سماج، سیاست کی ستم ظریفیوں، خودغرضی ضمیر فروشی

---

[8] شاعر بمبئی جلد ۵۰ شمارہ نمبر ۸ ۱۹۷۹ء۔

[9] شاعر بمبئی جلد ۵۳ شمارہ نمبر ۳ ۱۹۸۲ء۔

[10] شگوفہ حیدرآباد ڈراما نمبر ۱۹۷۹ء۔

تشدد، لوٹ کھسوٹ، غنڈہ گردی، فرقہ وارانہ فساد اور ان کی بنیادی وجہ اور ان سب کے خلاف احتجاج نے اس ڈرامے کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ ان سب مسائل کا جال کچھ اس خوب صورتی سے بُنا گیا ہے کہ اس میں اُردو کا کہیں احساس نہیں ہوتا ایک منظری بہاؤ ہے جس سے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور کردار اپنا اپنا پاٹ ادا کرتے جاتے ہیں۔ غنڈوں کے ذریعہ پبلپ کا قتل ان گندے سیاست دانوں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے جو اپنی بارات غنڈوں کے بینڈ باجے سے سجاتے ہیں۔ یہ سماج کے ناسور سیاست داں ایک پبلپ کو قتل کرا کے بغلیں بجالیں لیکن یہ بھول گئے کہ پبلپ کے ہر قطرۂ خون سے جموڑے پیدا ہوتے رہیں گے اور ایک دن وہ آئے گا جب ہر جموڑا کہے گا "ہم نے پہلے ہی کہا تھا استاد نہ لوگ سمجھانے بجھانے سے ماننے والے نہیں ان پر سختی کرنے کی ضرورت ہے" اور شاید وہ دن ملک کے لیے بہت منحوس ہوگا جس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں کہ اب ہر مسئلہ کا حل تشدد میں تلاش کیا جانے لگا ہے کمال احمد کی عصری مسائل پر نظر بڑی گہری ہے اور ان کی جراحی میں وہ اس قدر سفاک ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ "رلیف" نامی ڈراما اس کی مثال ہے اگرچہ یہ مختصر ڈراما ہے مگر حقائق اور طنز سے بھرپور اس ڈرامے میں آج کا انسان ننگا نظر آتا ہے۔ ہماری سماجی زندگی مسائل در مسائل سے بھری ہوئی ہے جس سے زندگی میں برابر اتھل پتھل مچی رہتی ہے۔ بالخصوص بدلتے ہوئے سماجی ماحول اور پرانی اقدار کی شکست و ریخت نے زندگیوں میں ایک تناؤ پیدا کر دیا ہے۔ ان بدلتی ہوئی اقدار نے انسان کو کس قدر خود غرض، سفاک اور بے حس بنا دیا ہے اس کی مثال ہمیں کمال احمد ہی کے ایک ڈرامے "کت کول" میں نظر آتی ہے جہاں بیٹا اپنے باپ کو مار ڈالنے تک پر تیار ہو جاتا ہے کہ باپ کی جائداد اسے جلد سے جلد حاصل ہو سکے یہ سفاکی اور بے رحمی پرانی اقدار کی شکست اور نئی اقدار کی چمک دمک کا دیا ہوا تحفہ ہے جہاں انسان "میں" کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ رہا ہے۔

مسائلی ڈراموں میں انل ٹھکر کے ان چار ڈراموں کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگا جو ان کے مجموعے "خالی خانے" میں شامل ہیں۔ "اکھڑے لوگ" ۵۷ء، "آپ کیوں روئے" ۷۷ء، "پردہ اٹھاؤ" ۷۹ء اور "خالی خانے" ۸۰ء۔ ان کے علاوہ ان کے دو اور ڈرامے بھی شائع ہوئے ہیں۔ "قم"[11] اور "چلو ساتھ چلیں"[12] لیکن یہ دونوں مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ انل ٹھکر اپنے ڈراموں میں موجودہ سماج کی گلی سڑی اقدار کا پردہ کچھ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ اس کے ساتھ انسانی فطرت کی تہیں بھی آہستہ آہستہ کھلتی چلی جاتی ہیں جس کی مثال ہمیں ان کے ڈرامے "خالی خانے" میں ملتی ہے۔ ہیمندر کا باپ جگناتھ ہیمندر کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہے اور خود ہیمندر پائلٹ بننا چاہتا ہے باپ بیٹے کی اس کشمکش میں بظاہر جیت باپ کی ہوتی ہے لیکن باپ کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ آخر میں بیٹا پاگل ہو جاتا ہے جس طرح کمال احمد کے ڈرامے موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے خلاف احتجاج ہیں اسی طرح انل ٹھکر کا یہ ڈراما صدیوں سے چلے آ رہے اس نظام کے خلاف ایک چیخ ہے جس میں اولاد کی خواہشات کو والدین کی خواہشات پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ______ ان کا ایک اور ڈراما "آپ کیوں روئے" آج کے انسان کی اس مجبوری کی داستان ہے جہاں انسان کو اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے۔ ایک عورت کو اپنے پہلے بچّے کو اس لیے ابارشن کی نذر کر دینا پڑتا ہے کہ اگر وہ ماں بن گئی تو اسے نرسنگ ٹریننگ کورس چھوڑنا پڑے گا اور اسی کے ساتھ ۱۲۵۰ روپے بھی واپس کرنا ہوں گے جو اسٹائپنڈ کی شکل میں اسے مل چکے ہیں اور جنہیں اس کا شوہر واپس کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ انل ٹھکر نے ۵۷ء میں "اکھڑے لوگ" لکھا تھا جس میں ایک ایسے خاندان کو پیش کیا تھا جو بکھر چکا ہے اور آپسی رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ اسی موضوع پر راقم الحروف نے بھی ایک ڈراما "جوتا"[13] لکھا اور جسے بھوپال تھیٹر نے رویندر بھون میں اسٹیج کیا لیکن انل ٹھکر کے ڈرامے کی طرح اس میں ٹھہراؤ اور فضا پیدا نہ ہو سکی۔ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں میں جہیز کا مسئلہ اردو ڈراما نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس موضوع پر متعدد ڈرامے لکھے گئے ہیں لیکن اب موضوع اس قدر فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی نیا پن مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ سوامی حیدر آبادی نے ایک "اکلوتا بیٹا"[14] اسی موضوع پر لکھا ہے اگرچہ روپا کے کردار کو انہوں

---

[11] شاعر بمبئی اپریل ۷۴ء۔

[12] شاعر بمبئی جلد ۵۱ شمارہ ۱۱-۱۲ ۱۹۸۰ء۔

[13] پرواز ادب پٹیالہ ڈراما نمبر حصہ دوم ۱۹۸۵ء۔

[14] شاعر بمبئی جلد ۵۳ شمارہ ۵ ۱۹۸۲ء۔

ایک دوسرے روپ میں پیش کیا ہے جس میں عزم و حوصلہ ہے اور احساسِ فرض نے اس کے کردار کو عام نوجوان عورتوں سے مختلف بنا کر پیش کیا ہے مگر ڈراما عجیب بجھا بجھا سا ماحول پیش کرتا ہے اور کشمکش کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

کرتار سنگھ دگل اردو کے معتبر ڈراما نگار ہیں اور ان کے ڈرامے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن وہ جانے کیوں عرصے سے خاموش تھے اب خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا ہے اور وہ اردو ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اسی دوران کا ایک ڈراما "کس کے گھر جائیں"[۱۵] اور دوسرا "جوبن دے جات دگا"[۱۶] شائع ہوئے۔ جوبن دے جات دگا یک کرداری مونولاگ ہے جس میں دوسرا کردار اسٹیج پر موجود تو رہتا ہے مگر کالموں میں حصہ دار نہیں بنتا صرف ستار بجا کر ڈرامے کے تاثر کو بڑھاتا رہتا ہے۔ ڈرامے کی بنیاد روپ متی اور باز بہادر کی ٹریجڈی ہے جس میں روپ متی زہر کھا کر اپنی عزت بچاتی اور محبت کا حق ادا کرتی ہے۔ روپ متی کی خاموشی میں ہزاروں کہانیاں پنہاں ہیں جن کو دگل نے بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے اور روپ متی کی خاموشی مالویکا کے تکلم پر بڑی خوبصورتی سے چھا گئی ہے۔ مالویکا کے مونولاگ کو نثری نظم کہا جا سکتا ہے۔

عورت ہمارے سماج کا وہ حصہ ہے جس کی مظلومیت اور استحصال پر اتنا کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے کہ اس سب کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا گیا اور عورت نے اس کو اپنا حق سمجھ لیا ہے کہ اس کو مظلوم سمجھا ہی جانا چاہیے اور یہ بھی وہ کہ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے عورت اور مرد کے تعلقات کے سلسلے میں غلط ہو جاتا ہے کہ یہاں تالی صرف مرد کے ہاتھ سے بجتی ہے اس سلسلے کی ایک کڑی زاہدہ زیدی کا ڈراما "وہ صبح کبھی تو آئے گی"[۱۷] ہے جو عورت کی مظلومیت کے فرسودہ اور پیش پا افتادہ پر لکھا گیا ہے زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ صرف ایک عورت کی مظلومیت کی داستان نہیں بلکہ اس میں ہماری سوسائٹی کی کھوکھلی اقدار، فرسودہ خیالات، بھونڈے اندازِ فکر، بے حسی اور عورتوں کے متعلق بے ہودہ تصورات اور قابلِ اعتراض رویوں کی ایک جھلک ہے" اور اپنے انھیں خیالات کو انھوں نے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ موضوع سے قطع نظر اس ڈرامے کی اہمیت اس کی تکنیک میں ہے۔ زاہدہ زیدی نے مونتاژ کی تکنیک کا استعمال کر کے ڈرامے میں بڑی کامیابی سے تاثر پیدا کیا ہے۔ اردو ڈراما نگار اس تکنیک کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور اس کی وجہ اسٹیج کرلینٹ سے ناواقفیت ہے۔ زاہدہ زیدی نے اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس تکنیک کو استعمال کیا ہے۔ اسٹیج کی معمولی معمولی تفصیل دیکر ہدایت کار کے لیے ہی آسانیاں فراہم نہیں کی ہیں بلکہ اس کی ترسیلی اہمیت بھی بڑھا دی ہے بہر حال اپنی تکنیکی خوبیوں کے باعث "وہ صبح کبھی تو آئے گی" ایک کامیاب ڈراما ہے اردو ڈراما نگاروں کو اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ اسٹیج سے علاحدہ رہ کر کامیاب ڈرامے نہیں لکھے جا سکتے، چنانچہ وہ ڈراما نگار جو اسٹیج سے وابستہ ہیں انھوں نے جو ڈرامے لکھے ہیں انھوں نے تجربات بھی کیے ہیں بمبئی کے مجیب خان کا مختصر مجموعہ "لاچار مائی" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا اس میں اسٹیج کے کچھ تجربات کیے گئے ہیں۔ کمال احمد اور انل ٹھکر براہِ راست اسٹیج سے وابستہ ہیں اور اسٹیج کا تجربہ رکھتے ہیں جس کا استعمال وہ اپنے ڈراموں میں کامیابی سے کر سکتے ہیں ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرامے بھی اسٹیج کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ راقم الحروف بھی اپنے ڈراموں میں اسٹیج کو نظر انداز نہیں کرتا۔

اردو کے ثقہ حضرات کے دلوں میں ڈرامے کی طرف سے جو تعصب تھا اب وہ تقریباً ختم ہو گیا ہے اور ڈرامے کی طرف توجہ دی جانے لگی ہے۔ اردو ڈراما اب ادبی حیثیت سے بھی مقبول ہو گیا ہے جہاں رسائل اپنے اوراق میں اسے جگہ دینے لگے ہیں وہیں ڈرامے اور ڈراموں کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آ کر مقبول ہوئے ہیں ان آٹھ دس سالوں میں کمال احمد کے تین مجموعے "دو ڈرامے تجرباتی" ۷۷ء، "کشکول" ۸۲ء اور "موسی کے پاؤں" ۸۶ء۔ مجیب خان کا "لاچارے مائی" ۸۴ء۔ انل ٹھکر کا "خالی خانے" ۸۲ء قمر جمالی کا "مٹی کا

---

[۱۵] تعمیر ہریانہ جون ۱۹۸۵ء۔
[۱۶] پرواز ادب پٹیالہ ڈراما نمبر حصہ اول ۱۹۸۴ء۔
[۱۷] عصری ادب دہلی اپریل تا اکتوبر ۱۹۸۰ء۔

دھول" ۸۰ء۔ سید محمد مہدی کا "غالب کون ہے" ۸۰ء کرتار سنگھ دگل کا "دیا بجھ گیا" (دوسرا ایڈیشن) ۸۰ء پروفیسر مجیب کے ڈرامے رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن کتابی شکل میں وہ انھیں آٹھ دس سالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ "خانہ جنگی" ۸۲ء "آزمائش" ۸۲ء "ہیروئن کی تلاش" ۷۶ء۔ اور "انجام" ۷۶ء۔ اوپندرناتھ اشک نے عرصہ ہوا جب اردو سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا مگر اب پھر انہوں نے اردو کی طرف مراجعت فرمائی ہے اور اپنے ڈراموں کو مجموعوں کی شکل میں شائع کیا "تولیے" ۷۹ء "چھٹا بیٹا" ۸۱ء "گرداب" ۸۱ء۔ ساگر سرحدی کا "خیال کی دستک" ۸۰ء۔ ڈاکٹر محمد حسن کا "تماشا اور تماشائی" ۷۵ء "ضحاک" ۸۰ء۔ ابراہیم یوسف کے "دھوئیں کے آنچل" ۷۹ء "پانچ چھ ڈرامے" ۸۲ء "اداس موڑ" ۸۳ء رفعت سروش کا "شاہ جہاں کا خواب"۔ (اوپر درج فہرست مکمل نہیں ہے اور اس میں ریڈیائی ناٹی ڈراموں کے مجموعوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے) شائع ہوئے۔ بظاہر یہ تعداد قابلِ اطمینان نہیں مگر معیار کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ خاص طور پر پروفیسر مجیب کے خانہ جنگی آزمائش اور انجام۔ ڈاکٹر محمد حسن کا ضحاک، اہل ٹھکر کا اکھڑے لوگ، کمال احمد کا مور کے پاؤں اور بغیر کسی تعلی کے راقم الحروف کے دھوئیں کے آنچل، اور وقت کے کراہتے رنگ مع اس کے دوسرے حصّے کاغذی دھجی" ہندوستان کی کسی بھی زبان کے اچھے ڈراموں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

ڈرامے میں دلچسپی بڑھنے سے ایک خوش گوار پہلو یہ پیدا ہوا کہ دوسری زبانوں کے ڈراموں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا گیا اور وہ اردو میں ترجمے کیے گئے، اس سے جہاں دوسری زبانوں کے ڈراموں کا علم ہوا وہیں ان تجربات کا بھی علم ہوا جو دوسری زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ بنگالی اور مراٹھی ڈرامے کے تعلق سے کافی ترقی یافتہ زبانیں ہیں جن کے ڈرامے کی اپنی روایات ہیں، ترقی یافتہ اسٹیج ہے اور جو نئے تجربات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ ان آٹھ دس سالوں میں مراٹھی اور بنگالی کے علاوہ تلگو، سنسکرت، پنجابی، گجراتی، اور اڑیا کے بھی تراجم کیے گئے۔ انیس اعظمی نے بادل سرکار کے دو ڈرامے جلوس ۸۰ء اور اسپارٹاکس ۸۰ء ترجمے کیے۔ بادل سرکار کا نام بنگالی ڈرامے کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور ان کی پیش کش کی اپنی تکنیک ہے۔ انیس اعظمی نے ان کے ڈراموں سے اردو داں حضرات کو روشناس کر کے اردو ڈراما نگاروں کو ایک راہ دکھلائی ہے جو قابل ستائش ہے۔ یونانی ڈراما سنسکرت ڈرامے کی طرح قدیم ہے لیکن سنسکرت ڈرامے کے برعکس اس نے ٹریجیڈی کو بنیاد بنایا ہے جس سے دنیا کی ہر زبان کا ڈراما متاثر ہوا ہے۔ یونانی ڈرامے کی اس اہمیت کے پیش نظر یونانی ڈرامے کی طرف توجہ دی گئی اور اس کے شاہ کار ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ عتیق احمد صدیقی نے "یونانی ڈراما" ۸۰ء کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا جس میں درج ذیل چار ڈرامے شامل ہیں۔ ۱۔ تن بجولاں از ایکلس۔ ۲۔ شاہ ایڈیپس از سوفوکلیز۔ ۳۔ دیوداسیاں از یوریپڈیز۔ ۴۔ بادل از ایرسٹوفینیز۔ ڈراموں کا ترجمہ رواں اور سلیس زبان میں ہے اور مصنفین کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جناب صدّیقی نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے یوریپڈیز کے ایک اور ڈرامے "میڈیا" ۷۷ء کا ترجمہ شائع کیا۔ یونانی ڈرامے کے سلسلے میں ایکلس کے ڈرامے "پارسی" کے ترجمہ کا خصوصیت سے ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ ترجمہ آصف مرحوم نے احمد نگر جیل میں ۱۹۴۳ء میں کیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ۱۹۷۴ء میں آئی اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بارے میں یہاں چند باتیں کرنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے "پارسی" ایکلس کے اہم ڈراموں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن بقول مولانا آزاد اس کو اس لیے منتخب کیا گیا کہ "اس کا تعلق ایران کی قدیم تاریخ سے ہے اس لیے یہ توقع کی گئی ہے کہ اردو ادب کے شائق اس کے مطالعہ میں زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کریں گے" خود آصف علی مرحوم کے پیش نظر اس ڈرامے کو ترجمہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ذریعہ اردو داں یونانی ادبیات سے واقف ہو سکیں۔ ڈرامے کا ترجمہ نثر اور نظم میں الگ الگ کیا گیا ہے اس ترجمے کی اہمیت اس مقدمہ سے بڑھ گئی ہے جو آصف علی مرحوم نے لکھا ہے اور جو تقریباً سو صفحات پر محیط ہے اس میں یونانیوں اور پارسیوں کے تعلقات، اقتدار کی کشمکش اور اس ڈرامے کے پس منظر پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ ڈرامے کے فنی اور ادبی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے بارے میں خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ اس تاریخی ناٹک کا مصنّف ایکلس (۴۷۲ق م) ہے جو اس نے ۴۸۰ ق م میں ایران پر یونانیوں کی فتح کی یادگار میں لکھا تھا۔ یہ تابلو قسم کی چیز ہے

اس کو ڈراما کہنا زیادہ صحیح نہیں تاہم یہ دنیا کا پہلا تاریخی ناٹک ہے اس میں نہ کوئی ہیرو ہے نہ تصادم ہے نہ آویزش ہے صرف چند عبرت انگیز اور رنج افزا حقائق کی نشان دہی کی ہے "۔ خواجہ صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل ہے کہ یہ ڈراما نہیں ہے اس میں چھوٹے چھوٹے رنج افزا واقعات سے پورا ڈرامائی تاثر پیدا ہو گیا ہے ۔ اور پھر خواجہ صاحب کا یہ فرمانا کہ "اس کو ڈراما کہنا زیادہ صحیح نہیں۔ ہے تاہم یہ دنیا کا پہلا تاریخی ناٹک ہے "۔ الجھن کا باعث ہے اگر خواجہ صاحب ڈرامے اور ناٹک کے فرق کو واضح فرما دیتے تو شاید بات صاف ہو جاتی بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آصف علی مرحوم نے یہ ترجمہ کر کے اردو کی بڑی خدمت کی ہے ۔

ابسن اور برنارڈ شا کے متعدد ڈرامے پہلے ہی اردو میں ترجمہ ہو چکے تھے اب ابو یوسف نے برنارڈ شا کے مشہور ڈرامے MAN OF DESTINY کا کامیاب ترجمہ "آدمی نصیبوں والا" کے نام سے کیا[۲۸]۔ پارسی تھیٹر میں شیکسپیر کے ڈراموں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا رہا لیکن شیکسپیر کی اہمیت اور اردو داں حضرات کی شیکسپیر میں غیر معمولی دلچسپی کے باعث اس کے ڈراموں کے ترجمے شائع کیے گئے چنانچہ فراق گورکھپوری نے ہملٹ کا ۱۹۷۰ء میں مجنوں گورکھپوری نے کنگ لیر کا ۱۹۸۳ء (دوسرا ایڈیشن) سجاد ظہیر نے آتھیلو کا (دوسرا ایڈیشن)، منیب الرحمان نے انٹنی اور کلوپیٹرا کا ۱۹۷۹ء میں ترجمے کیے ان ڈراموں کے معتبر ترجمے ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اردو داں حضرات کو سنسکرت ڈراما نگار کالی داس سے خصوصی دلچسپی رہی ہے چنانچہ شکنتلا کے نظم و نثر میں متعدد ترجمے کیے گئے ہیں وکرم اروشی کا محمد عزیز مرزا نے ۱۹۰۵ء میں ترجمہ کیا تھا اب ۱۹۸۳ء میں عرفان صدیقی نے کالی داس کے تیسرے ڈرامے "مالویکا اگنی مترم" کا کامیاب ترجمہ کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جس کی کمی عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی ترجمہ رواں اور با محاورہ ہے ۔

حیدرآباد سے نکلنے والا ماہنامہ "شگوفہ" طنز و مزاح کے لیئے وقف ہے لیکن ۱۹۷۹ء میں اپنی روایات سے قطع نظر کر کے ایک ضخیم ڈراما نمبر شائع کیا جس میں اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بیرونی زبانوں کے ڈراموں کے تراجم شائع کیے ان میں خصوصیت سے بریخت کا "خدائی فوجدار" مترجم لاجپت رائے، نکولائی گوگول کا "افسر اعلیٰ" مترجم ایس۔ سی۔ مکھیجا اور رشید سمیع جلیل اور نیل گرانٹ کا "خاتمہ بالشر" مترجم برق آشیانوی قابلِ ذکر ہیں۔ "افسر اعلیٰ" تو متعدد بار اسٹیج ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ "خدائی فوجدار" میں سماج میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور غنڈوں کے سیاست میں عمل دخل کو پیش کیا گیا ہے۔ جب اس ڈرامے کو ہم آج کے ہندوستان کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو کہانی ہمیں اپنے ہی سماج کی نظر آتی ہے کہ کس طرح ایک ایمان دار آدمی کو بے ایمان بنانے کے لیے چال بازیاں کی جاتی ہیں۔ مترجم نے کرداروں کو ہندوستانی نام دے کر اور بمبئی کی مخصوص زبان استعمال کر کے اس اجنبیت کو ختم کر دیا ہے جو بالعموم تراجم میں محسوس ہوتی ہے۔ "خاتمہ بالشر" ایک دوسری نوعیت کا ڈراما ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ انسان نے لڑ جھگڑ کر نسل انسانی کو ختم کر دیا ہے جو کرۂ ارض پر فساد اور شر کا سبب تھی اب جانور خوش ہیں کہ وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں خوف ہے کہ اگر ایک بھی انسان بچ گیا ہو گا تو وہ پھر دنیا میں فساد پھیلائے گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ آج سماج ایسی ایسی اقدار جنم لے رہی ہیں جو ہمارے روایتی نظامِ زندگی کے لیے اجنبی ہیں یہ صرف اردو ڈراما نگار ہی محسوس نہیں کر رہا ہے بلکہ دوسری زبانوں کے ڈراما نگار بھی اسے شدت سے محسوس کر رہے ہیں چنانچہ مرتینجا پرساد جھا کا بنگالی ڈراما "لکیروں کے پار"[۲۹] مترجم عاشق ہرگانوی اس کی مثال ہے جس میں ایک بیٹا اپنے ماں باپ کی مالی امداد کرنے سے اس لیے انکار کر دیتا ہے کہ اس کا اپنا خاندان ہے وہ اپنی کمائی سے اپنی زندگی خوش گوار بنانا چاہتا ہے اور بیٹی اپنے باس سے صرف اس لیے ناجائز تعلقات قائم کر لیتی ہے کہ اسے پرموشن چاہیئے اور اپنے ان ناجائز تعلقات کو وہ ضروری سمجھتی ہے اور ان پر شرمندہ بھی ہے۔ اس ڈرامے میں آج کے نوجوانوں کے بدلتے ہوئے خیالات اور نفسیات کا اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ بہر حال کہا جا سکتا ہے

---

[۲۸] مفاہیم گیا۔ اگست تا دسمبر ۸۰ء۔

[۲۹] پروازِ ادب پٹیالہ ڈراما نمبر حصہ اول ۱۹۸۴ء۔

کہ ان آٹھ دس برسوں میں ترجمے کا کام اطمینان بخش رہا تاہم اسے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

اردو ڈرامے کا سب سے کم زور پہلو تنقید کا فقدان ہے اگر کوئی ناقد جراءت رندانہ سے کام لے کر اردو ڈرامے کی تنقید کا بیڑہ اٹھاتا ہے تو وہ تاریخ اور تحقیق میں پھنس کر تنقید سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اردو ڈرامے کو ادبی نقطۂ نظر سے پرکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیش کش کے پہلو کو پرکھا جانا بہت ضروری ہے کیونکہ کسی ڈرامے کے معیار کا تعین اس کے ادبی اور عملی تجزیہ سے ہی ممکن ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے ان مضامین کو دیکھتے ہیں جو تنقید کے نام سے لکھے گئے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ان آٹھ دس سالوں میں اردو ڈرامے کا دامن اس قسم کے مضامین سے خالی ہے اخلاق اثر کا ایک مضمون "ہم عصر اردو ڈراما۔ تخلیق اور پیش کش"[20] کسی حد تک اس کمی کو پورا کرتا نظر آتا ہے جس میں ان چند ڈراموں کی پیش کشوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی "انارکلی" کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈائرکٹر کی اہمیت، مصنف اور ڈائرکٹر کے رشتہ کو واضح کیا ہے۔ ایک اور مضمون بی۔ ایس باول کا ہے "ڈرامے کی تکنیک اور پیش کاری"[21] اوّل تو یہ ایک بہت ہی مختصر مضمون ہے دوسرے یہ کہ اس میں صرف پیش کش کی اہمیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ اکثر ایسے ڈرامے جو اسٹیج کیے جا چکے ہوتے ہیں کتابی شکل میں شائع کیے جاتے ہیں لیکن وہ ڈائرکٹر کے پروڈکشن نوٹس سے محروم ہوتے ہیں جانے اردو ڈراما نگار پروڈکشن نوٹس کو کیوں غیر ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ پروڈکشن نوٹس سے نہ صرف ڈرامے کے اسٹیج کیے جانے کی ایک واضح شکل سامنے آجاتی ہے بلکہ ڈائرکٹر کے ذہن کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اس خیال کو جو ڈراما نگار نے پیش کیا ہے عملی شکل دے رہا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ تنقید کے نام پر ڈرامے کی تاریخ بیان کرنا اردو ڈرامے کے ناقدوں کا محبوب مشغلہ ہے اور پھر تاریخ بیان کرنے میں بھی وہ بے سر پیر کی اڑائی جاتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر جناب محمد سعادت علی صاحب نے اپنے مضمون "ہندوستان میں اردو ڈرامہ"[22] میں خاندانِ بامان۔ خدا دوست۔ ظلم از ظلم، گل بکاؤلی، دو دھاری تلوار اور زنجیر گوہر کو آغا حشر کے ڈراموں میں شامل فرما دیا جب کہ یہ ڈرامے آغا حشر کے ہرگز نہیں ہیں اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں سے نہ صرف غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ اصل مصنفین کی بھی حق تلفی ہوتی ہے پروفیسر آزاد گلاٹی کا "اردو ڈراما کی مختصر تاریخ"[23] اور ڈاکٹر سید ذاکر حسین نقوی کا "اردو ڈراما۔ کل آج اور کل"[24] بھی اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔ ڈاکٹر نقوی نے نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر نقوی فرماتے ہیں کہ "اردو زبان میں ڈرامہ کی روایت کا سرچشمہ چاہے یونانی ڈرامے کو قرار دیا جائے اور چاہے اس کا سلسلہ سنسکرت ڈرامے سے منسلک کیا جائے بہر حال یہ مسلم ہے کہ اردو میں ڈرامے کی ابتدا تراجم کے ذریعہ ہوئی۔" ڈاکٹر نقوی کے یہ دونوں بیانات محل نظر ہیں۔ اردو ڈرامے کی روایت کا یونانی ڈرامے سے منسلک ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سنسکرت سے ان کا رشتہ جوڑنا بھی دور از کار بات ہے کیونکہ خواہ وہ واجد علی شاہ کا رادھا کنھیا کا قصہ ہو یا امانت کی اندر سبھا یہ روایتی طور پر راس لیلا اور بھگت سے جڑے ہوئے ہیں نہ کہ سنسکرت ڈرامے سے۔ اسی طرح ڈاکٹر نقوی کاظم علی جوان کی شکنتلا کو ترجمہ تصور فرماتے ہیں جب کہ جوان نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ سلیس اردو میں صرف اس کا قصہ بیان کر دیا ہے۔

ڈرامے میں دل چسپی پیدا ہونے سے جہاں دوسری زبانوں سے ڈرامے ترجمہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا وہیں دوسری زبانوں کے ڈراموں کی

---

[20] شاعر بمبئی (عصری ادب نمبر) مئی تا جولائی ۱۹۷۷ء۔
[21] پرواز ادب پٹیالہ ڈراما نمبر حصہ دوم ۱۹۸۵ء۔
[22] شگوفہ حیدرآباد۔ ڈرامہ نمبر ۱۹۷۹ء۔
[23] پرواز ادب پٹیالہ ڈرامہ نمبر حصہ اول ۱۹۸۴ء۔
[24] ایضاً حصہ دوم ۱۹۸۵ء۔

روایات سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور ان روایات کے بارے میں مضامین لکھے گئے چنانچہ اختر قنبر کا "جاپان کا نغرہ ڈراما"[25] عبدالحق صاحب کا "مصر میں عربی ڈراما کی نشوونما"[26] اور ابراہیم یوسف کا "فارسی ڈرامے کی ابتداء"[27] اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اختر قنبر صاحب نے "نغرہ" ڈرامے کی نہ صرف تکنیک اور بنیادی مقاصد پر ہی روشنی ڈالی بلکہ ایک نغرہ ڈرامے کا ترجمہ بھی پیش کیا جس سے جاپان کے اس ڈرامے کو سمجھنے میں مدد ملی۔ عبدالحق صاحب نے ابتدا میں عربوں کی ڈرامے سے عدم دلچسپی کے وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عربی میں ڈرامے کی ابتداء اور پھر اس کی ترقی کو بیان کیا جب کہ ابراہیم یوسف نے ایران میں تازیہ گردانی کی روایت اور ایران میں موجودہ نشوونما کو بیان کیا۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ سکہ رائج الوقت بریخت کا نیا تھیٹر ہے جس نے ہندوستان کی ہر زبان کے ڈرامے کو متاثر کیا ہے۔ بریخت پر ایک مضمون ڈاکٹر مسیح الزماں نے "فن ڈراما کا فرہاد۔ بریخت"[28] لکھا پھر اس کے ایک ڈرامے "ہاتھی کا بچہ"[29] ترجمہ کیا افضل حسین نے آر۔ ایم سنگھ کے ایک مختصر مضمون "برتولت بریخت"[30] کا ترجمہ شائع کیا جس میں "بریخت کے تھیٹر کے ایپک تھیٹر کا نظریہ اور اس کا پس منظر"[31] اس مضمون میں عزیز قیسی نے بریخت کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان عوامل کی نشان دہی کی ہے جن کے اثرات سے اس کا اپنا نظریہ فن ابھر کر سامنے آیا اور جن سے ایپک تھیٹر پر اس کے خیالات کی وضاحت ہوتی ہے بریخت پر لکھے گئے مضامین یہ مضمون بہت اہم ہے۔ احمد سہیل نے اپنے مضمون "یورپ کا سفاک تھیٹر"[32] میں انیتونن آخطر ANTONIN ARTAUD کی تحریک اور تھیٹر کے متعلق اس کے نظریات کو پیش کیا۔ اینٹی تھیٹر پر ایک مضمون شاعر بمبئی کے ڈراما نمبر ۱۹۶۴ء میں دیویندر اسر نے لکھا تھا جس میں سیموئل بیکٹ کا ڈراما "گھر دو کے انتظار میں" زیر بحث آیا تھا پھر کرشن چندر نے "گھر دو کے انتظار میں"[33] میں ترجمہ کیا اب ظہیر انور نے "سموئل بیکٹ اور گھر دو کے انتظار میں"[34] پر ایک اہم مضمون لکھا جس میں گھر دو کے انتظار پر سیر حاصل بحث کی گئی اور لایعنی تھیٹر ABSURT THEATRE پر بھی روشنی ڈالی گئی اور لایعنی تھیٹر کے بنیادی مقاصد اور فلسفہ کو واضح کیا گیا غرض یہ کہ اب یہ طلسم ٹوٹ گیا ہے کہ ڈراما فن شریف نہیں ہے اور اردو ادیب اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

اس سب کے باوجود ابھی ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ڈرامے پر بہت کم کام ہوا ہے اور سنسکرت، مراٹھی، بنگالی اور دوسری علاقائی زبانوں کے ڈرامے پر بہت کم کام ہوا ہے —————— راقم الحروف نے "ہندی ڈرامے کا ارتقاء" کے عنوان سے کتاب لکھی جس کو مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا اس میں میں نے ویدک دور، پراکرت ڈراما سنسکرت اور ہندی ڈرامے کا جائزہ لیا، لوک ناٹکوں میں راس لیلا، جاترا اور سوانگ پر بھی مختصر طور پر لکھا اس سے پہلے میں اپنی کتاب "اندر سبھا اور اندر سبھائیں" میں بھی کچھ لوک ناٹکوں پر روشنی ڈال چکا تھا لیکن ان لوک ناٹکوں کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی لوک ناٹکوں کی روایتیں موجود ہیں مثلاً راجستھان کا خیال، مہاراشٹر کا تماشا، چھتیس گڑھ کا ناچا (حبیب تنویر نے اپنے اکثر ڈرامے اسی کے فارم میں پیش

---

۲۵ عصری ادب دہلی جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

۲۶ عصری ادب دہلی اکتوبر ۱۹۸۰ء تا اپریل ۱۹۸۱ء۔

۲۷ شاعر بمبئی جلد ۵۵ شمارہ ۸۔

۲۸ شب خون الہ آباد ۱۹۶۶ء۔

۲۹ ایضاً ستمبر ۱۹۶۹ء۔

۳۰ شگوفہ حیدرآباد ڈراما نمبر ۱۹۷۹ء۔

۳۱ شاعر بمبئی جلد ۵۴ شمارہ ۱۹۸۳ء۔

۳۲ عصری ادب دہلی جنوری ۱۹۸۳ء۔

۳۳ شب خون الہ آباد مئی ۱۹۶۹ء۔

۳۴ انکشاف ہوڑہ مئی تا ستمبر ۱۹۸۴ء۔

کیے ہیں) مالوے کا ماچ وغیرہ پر اردو میں لکھا جانا ضروری ہے کنول ڈبائیوی صاحب نے "اردو کی ترقی میں عوامی ڈراما (سوانگ یا نوٹنکی) کا حصہ"[35] کنول صاحب کے اس نظریہ سے تو اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ ان عوامی ناٹکوں نے اردو کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ لیکن ان کے اس نظریہ سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ سوانگ اور نوٹنکی لوک ناٹک کے ایک ہی فارم کے دو نام ہیں۔ سوانگ ہندوستان کا ایک بہت قدیم لوک ناٹک ہے جب کہ نوٹنکی جدید ہے بعض حضرات کو اندرسبھا پر نوٹنکی کے اثرات نظر آتے ہیں جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے نوٹنکی اندرسبھا سے متاثر ہوئی ہے بہرحال کنول صاحب سے چند اختلافات کے باوجود مضمون معلوماتی ہے اس قسم کے دیگر لوک ناٹکوں پر بھی مضامین کی ضرورت ہے۔

اندرسبھا امانت اردو کا بنیادی ڈراما ہے اور شاید سب سے زیادہ غلط فہمیوں کا شکار بھی۔ اول اول تو اس کے نام کا تعین ہی نہ ہو سکا کسی نے اسے رہس کہا کو کسی نے جلسہ اور کسی نے جلسۂ جدید اور بعض حضرات اسے مثنوی کہتے رہے۔ اسے ناٹک تسلیم کرنے کے بعد اس پر جو تنقید اور تبصرے کیے گئے ان میں اسے مغربی ڈراموں کے اصولوں پر پرکھا گیا۔ لالہ کنور سین سے لے کر احتشام صاحب تک اسے مغرب کے اصولوں پر ہی پرکھتے رہے۔ ایسا ہی ایک مضمون "اندرسبھا۔ تنقید و تبصرہ"[36] ڈاکٹر صفیہ پروین صاحبہ کا شائع ہوا جس میں صفیہ صاحبہ نے اندرسبھا کو نہ صرف مغربی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی بلکہ یہ تک فرما دیا کہ "ہم جانتے ہیں کہ ادبی نقطۂ نظر سے اندرسبھا کوئی بلند پایہ شاہکار نہیں اس کی اہمیت محض تاریخی ہے" امانت ایک مسلّم الثبوت شاعر اور زباں داں تھے ان کے اس کارنامے کی ادبی حیثیت پر شک ڈاکٹر صفیہ ہی کر سکتی ہیں ورنہ آج تک ہر شخص کم از کم اس کی ادبی حیثیت کا قائل رہا ہے۔ اور ان کا یہ فرمانا کہ "سبز پری کا کردار بھی کوئی معیاری نہیں وہ اپنے بابا راجہ اندر ہی کی طرح عیاش اور حسن پرست ہے" سبز پری کے ساتھ راجا اندر کو بھی عیاشوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اول تو راجا اندر کے حسن پرست ہونے کا ثبوت اندرسبھا میں کہیں موجود نہیں ہے دوم یہ کہ ہر حسن پرست کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عیاش بھی ہو۔ سوم یہ کہ گانے ناچ کے شوقین کا عیاش ہونا بھی ضروری نہیں اور پرانوں میں بھی اندر کو عیاش نہیں بتلایا گیا ہے۔ اور پھر معیاری کردار سے ان کی کیا مراد ہے؟ وہ سبز پری کے کردار کو اخلاقی معیار سے دیکھ رہی ہیں جب کہ ڈرامے میں کردار کو اس کے عمل سے پرکھا جاتا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صفیہ نے اندرسبھا کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" لکھ کر اندرسبھا پر غیر معمولی تحقیقی کارنامہ انجام دیا تھا۔ راقم الحروف نے "اندرسبھا اور اندرسبھائیں"[37] کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی کہ اس طلسم کو توڑا جائے کہ اندرسبھا کا کوئی تعلق مغربی ڈرامے سے ہے اور کوشش کی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اندرسبھا کی روایت لوک ناٹک راس لیلا اور بھگت سے جڑی ہوئی ہے۔ اب محمد شاہد حسین نے "اندرسبھا کی روایت"[38] کو اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے منتخب کیا انھوں نے مقالے کے تین ابواب قائم کیے (1) اندرسبھا سے پہلے ہندوستانی ڈرامے کی روایت (2) اندرسبھا کا تجزیہ (3) اندرسبھا کا اثر بعد کے ڈراموں پر۔ شاہد حسین صاحب نے نہایت عرق ریزی سے اس تمام مواد سے جو اندرسبھا سے متعلق ہے استفادہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اندرسبھا کی روایت ہندوستانی لوک ناٹکوں سے ملتی ہے مغربی ڈرامے سے نہیں اپنے مقالے کے پہلے باب "اندرسبھا سے پہلے ہندوستانی ڈرامے کی روایات" میں وہ ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا سنسکرت ڈرامے سے کرتے ہیں اور سنسکرت ڈرامے سے پہلے ویدک اور پراکرت ڈرامے کو نظرانداز کر جاتے ہیں جب کہ پراکرت ڈرامے کی روایت سنسکرت ڈرامے سے قدیم ہے۔ دوسرے باب میں اندرسبھا کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن کتاب کا سب سے اہم حصہ

---

۳۵ شاعر بمبئی جلد ۴۵ شمارہ ۵ ۱۹۱۳ء۔
۳۶ نیا دور لکھنؤ۔ نومبر ۸۲ء۔
۳۷ نسیم بک ڈپو ۱۹۸۰ء۔
۳۸ ناشر محمد شاہد حسین دہلی ۱۹۸۴ء۔

اس کا تیسرا باب "اندرسبھا کا اثر بعد کے ڈراموں پر" ہے۔ اندرسبھا نے نہ صرف اندرسبھائی ناٹکوں کو متاثر کیا ہے بلکہ پارسی تھیٹر کے ڈرامے بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ شاہد حسین صاحب اگر اس جانب بھی توجہ فرماتے تو غیر مناسب نہ ہوتا۔ بہرحال شاہد حسین صاحب نے ایک معیاری کام کیا ہے۔

انارکلی اردو کا تاریخ ساز ڈراما ہے اس کے شائع ہوتے ہی ایک انقلاب سا آگیا یہاں تک کہ پارسی تھیٹر میں کھیلے جانے والے ڈرامے بھی اس سے متاثر ہوئے اور ان کے ڈھانچہ میں تبدیلیاں ہوئیں۔ انارکلی پر سیکڑوں مضامین لکھے جاتے رہے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک مضمون ایس مسعود سراج کا "اردو ڈراما اور انارکلی"[۳۹] شائع ہوا جس میں ڈراما انارکلی کا کوئی نیا گوشہ تو تلاش نہیں کیا گیا پھر بھی روایتی انداز میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے "انارکلی"[۴۰] اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ڈاکٹر حسن کا مقدمہ اپنی نوعیت کا منفرد مقدمہ ہے۔ جس میں ڈرامے کی تفہیم اور ترسیل کے سوالوں پر بحث کی گئی ہے۔ ہدایت کار کی اہمیت اس کی اپنے طور پر ڈرامے کی تفہیم اور ترسیل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر حسن فرماتے ہیں کہ "ایک ذہین ہدایت کار ڈرامے کے اس اندرونی ربط کا پتہ لگانا چاہتا ہے جس کی مدد سے ڈرامے کی تسلی بخش توجیہہ کی جا سکتی ہو۔" اور اس توجیہہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ انھیں بنیادوں پر ہو جو ڈراما نگار نے پیش کی ہے بلکہ ہدایت کار کو حق ہے کہ وہ اپنی توجیہہ میں ڈرامے کے اندرونی بنیادیں تلاش کرے اس نقطۂ نظر سے یا یوں کہیے کہ ڈاکٹر حسن نے ہدایت کار بن کر انارکلی کی توجیہہ کی ہے اور انارکلی میں نئے گوشوں کو تلاش کیا ہے۔ یہ مقدمہ نہ صرف انارکلی بلکہ اردو ڈراموں پر لکھے جانے والے مقدموں میں منفرد ہے۔

۱۹۷۵ء میں ایک ڈراما "سجیع الدولہ کا ناٹک" تجور میں دریافت ہوا جسے ماہنامہ "آجکل" دہلی نے شائع کیا[۴۱] لیکن اردو ڈرامے کے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اس کی وجہ شاید اس کی وہ الجھی ہوئی تکنیک ہے جس میں یہ لکھا گیا ہے اور جو اردو کے لیے غیر مانوس ہے۔ راقم نے اس کی تکنیک سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنے مضمون "اردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش"[۴۲] میں اسے اردو ڈرامے کی ایک گم شدہ کڑی قرار دیا اور خیال ظاہر کیا کہ ڈاکٹر نامی کا یہ دعویٰ کہ اردو ڈرامے کی ابتدا پرتگالیوں کے ہندوستان میں آنے سے ہو گئی تھی بالکل مفروضہ نہیں ہے حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی "علی بابا چالیس چور" ہے جسے ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے دریافت کر کے "اردو کا پہلا نثری ڈراما اور کیپٹن گرین آدے"[۴۳] کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر افضل نے اس پر مفصل مقدمہ قلم بند کیا اور اردو کے اولین ڈرامے پر مختلف نظریات بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ "علی بابا چالیس چور" ۱۸۵۲ء میں چھپا تھا جب کہ اندرسبھا امانت ۱۸۵۴ء میں اور گوپی چند اور جالندھر ۱۸۵۳ء۔ ڈاکٹر نامی کی تحقیق کے مطابق گوپی چند اور جالندھر ۱۸۵۳ء میں اسٹیج کیا گیا تھا یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ اس کے چھپنے کی نوبت آئی بھی یا نہیں۔ بہرحال ڈاکٹر افضل اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "علی بابا چالیس چور" کو امانت کی اندرسبھا پر دو سال کا اشاعتی تقدم حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دو سوال تحقیق طلب پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں کہ اس ڈرامے کو کیپٹن گرین آدے نے کس زبان سے ترجمہ کیا اس کا اصل مصنف کون ہے اور یہ ڈراما اسٹیج کیا گیا یا نہیں۔ بہرحال ڈاکٹر محمد افضل نے اس ڈرامے کو تلاش کر کے اور پھر ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کر کے اردو ڈرامے کی قابلِ ستائش خدمت انجام دی ہے۔

ان آٹھ دس سالوں میں کچھ اردو رسائل نے ڈراما نمبر شائع کیے آجکل دہلی نے فروری ۱۹۷۶ء میں آغا حشر نمبر، شگوفہ حیدرآباد نے ۱۹۷۹ء میں ڈراما نمبر اور پرواز ادب پٹیالہ نے نومبر دسمبر ۸۴ء ڈراما نمبر حصہ اول اور جنوری فروری ۸۵ء میں حصہ دوم شائع کیے تیگوذ

---

۳۹۔ نیا دور لکھنؤ نومبر ۸۲ء

۴۰۔ مکتبہ الفاظ علیگڑھ ۸۳ء

۴۱۔ آجکل دہلی مارچ ۷۵ء

۴۲۔ تعمیر ہریانہ مارچ ۸۵ء

۴۳۔ محمد علیم الدین محی الدین تاجران و ناشران کتب جیب نگر نامپلی حیدرآباد۔ [باقی صفحہ ۳۳ پر دیکھیے]



## خمار قریشی

[redacted]

یہ کیسا سانحہ ہے موت کے غم، زندگی کے تھے
ہمارے پیرہن میں جیب و داماں اجنبی کے تھے

متاعِ جان و دل شبنم کے قطروں سے مثالی تھی
کہاں خود کو چھپاتے مسئلے سب بے گھری کے تھے

ہمیں تاریکیوں سے برسرِ پیکار رہنا تھا
نظر کے سامنے سارے نشانے روشنی کے تھے

بدن زخمی ہُوا پودے لگانے، بیج بونے میں
جب آیا موسمِ عیش و طرب تو پھل کسی کے تھے

بہت مہنگا پڑا خاکسترِ دل کو نمو کرنا!
کھلے در اور دریچے کے نظارے خستگی کے تھے

ہمیں فرصت سے آئینے میں چہرہ دیکھ لینے دو
کہ دورانِ سفر لمحے، عدیم الفرصتی کے تھے

ترے رخسار و لب کی سرخیوں نے جام بخشے ہیں
ہمیں شوقین برسوں تک فقط اِس میکشی کے تھے

[redacted]

آئینے تجھ پہ ہی صیقل نہیں ارزانی کا
مرحلہ صرف بچا ہے مری، حیرانی کا

تجھ سے مل آئے بہت پیچ بہت تاب کے بعد
قرض اُترا ہی نہیں دل کی پشیمانی کا

چاہے جس بات پہ تو مجھ کو رہائی دے دے
مجھ پہ مشکل نہیں رستہ تری آسانی کا

مجھ سے رہنا کبھی بیساختہ جلنا کیا ہے
خوب انداز ہے جاناں تری مہمانی کا

یہ کتابوں، یہ رسالوں کا سفر کچھ بھی نہیں
استعارہ ہی بہت ہے تری پیشانی کا

[redacted]

نمو کی بارش کے موسموں پر عذاب ہوں گے
ہرے بھرے شاخچوں پہ جلتے گلاب ہوں گے

مسافتوں کی یہ سرد راتیں طویل ہوں گی
قدم قدم پیر برہنہ سر ماہتاب ہوں گے

ہمیں بھی اپنے نیازمندوں میں گن کے دیکھو
ہمارے دم اور قدم سے جاری ثواب ہوں گے

تمہیں بھی عالم پناہ کہنے کا وقت آیا،
تمہارے کتنے نہ جانے ہم پر عتاب ہوں گے

وہ گرد چہرہ، وہ دھول آنکھیں، وہ دھند منظر
یہ لمحۂ شام ڈھل گیا تو سراب ہوں گے

● قریش چوک، گلبرگہ، ۸۵۱۰۴ (کرناٹک)



محمد بشیر مالیر کوٹلوی
اوقاف آفیسر، پنجاب وقف بورڈ، گرومنڈی۔ سونی پت۔

# جواب دو

تبادلہ ہونے پر جب میں پہلی بار اس دفتر میں آیا تو اس کی حالت قابل رحم تھی۔ نہ ضرورت کے مطابق فرنیچر، نہ دیگر سہولیات رہائشی کمروں کے سامنے والے کھلے میدان میں کوڑے کے ڈھیر اور گندگی دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے والا افسر اس جگہ بھینس باندھا کرتا تھا۔ ایک دو دن تو مجھے چارج سنبھالنے اور دفتری کاموں سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے میں لگ گئے بعد میں میں نے جب دفتر کے حدود اربعہ کا جائزہ لیا تو میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ یہاں سے کوڑا وغیرہ ہٹا کر ایک چھوٹا سا پارک بنا لیا جائے اس سے اسٹاف کو اور دوسرے لوگوں کو بیٹھنے اُٹھنے کی سہولت تو ہوگی ہی دفتر کی بھی شان بڑھے گی اور پھر فرصت کے اوقات میں باغبانی کا شغل بھی رہے گا۔ میں نے ہیڈ آفس کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو مجھے ایک معقول رقم کی منظوری مل گئی اور میں نے پارک کا کام شروع کروا دیا۔ نشان دہی وغیرہ کے بعد مزدور لگا کر کھدائی کروائی۔ اینٹ پتھر نکلوا کر زمین کو ایک دم صاف کروایا اور دو بگھی پرانی کھاد بھی منگوا لی۔ اب مسئلہ ایک مالی کا درپیش تھا۔ ایک دو مالیوں سے بات ہوئی۔ مگر کوئی ڈھنگ کا آدمی نظر نہ آیا۔

ایک شام میں صحن میں ایزی چیئر ڈالے مطالعہ میں مصروف تھا کہ کسی نے پھاٹک کھٹکھٹایا۔ میری نظریں دفعتاً اسی طرف اٹھ گئیں۔ ایک سیاہ فام بھیا پھاٹک کے پاس کھڑا ہوا پان کی جگالی کر رہا تھا مجھ سے نظریں ملتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر نمسکار کیا، میں نے چپراسی کو آواز دی کہ وہ پھاٹک کی کنڈی کھول دے، وہ شخص پچیس تیس کے درمیان ہوگا، تیکھے نقش اور اچھی صورت کا مالک تھا۔ کپڑے نہایت معمولی درجے کے تھے۔ میرے قریب آکر اس نے ایک بار پھر نمستے کیا اور بولا "سنا ہے آپ کو مالی کی ضرورت ہے سائیب —!

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہمارہ نام سندر ہے سائیب —! ہم ادھر سائیکل کمپنی میں مالی ہیں.....!"

میں دل ہی دل میں ہنسا۔ رنگ اس قدر سیاہ اور نام سندر! مجھے مالی کی ضرورت تو تھی، مگر میں نے تھوڑا سا ضبط سے کام لیا اور اپنی ضرورت کی شدت کا اظہار نہ کیا۔ آدمی کائیں ہوشیار نظر آرہا تھا ممکن ہے ایک دم دام بڑھا دیتا۔ میں نے سرد مہری سے جواب دیا:

"مالی کی تو ضرورت تھی —! ایک مالی سے آج صبح ہی بات چیت ہوئی ہے۔ وہ کل سے کام شروع کر دے گا —! ویسے تم کرنا چاہو تو اُسے جواب دے دیں گے۔"

کامیابی کا تھوڑا سا راستہ دیکھ کر وہ ایک دم بول اٹھا:

"پورے سہر میں ہم ایک نمبر مالی ہیں سائیب! کمپنی کی طرف سے چنڈی گڑھ، دلی، پھولوں کے مکابلہ میں اپنے پھول لے جاتے ہیں۔ اس بار ہمارا ڈہلیا کا پھول پھسٹ آیا ہے سائیب!"

اس کے بولنے کی رفتار دیکھ کر میں نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک نمائش تو پچھلے ہفتہ بھی لگی تھی دہلی میں —!"

وہ تھوڑی سی لفٹ پاتے ہی مزید بہہ گیا۔

"ہاں سائیب۔ ہاں وہی اُدھر راجوب بھی آیا تھا سائیب"

میں نے اُسے بیچ میں ہی ٹوکا "راجوب —! یہ کون ہوا بھائی —!؟"

وہ ہنس کر بولا "کمال ہے سائیب! — راجوب۔ اپ[illegible]

دیس کا پردھان منتری کبسورت — آدمی ہے سائیب! ایک د[illegible]

چکاچک، گوراچٹا، اور سائیب اس کا ولایتی گھر والی بھی ساتھ تھی!" میرے ذہن نے اس کی بات کو کسی حد تک تسلیم کر لیا۔ کیوں کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ نمائش میں ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی اور ان کی اہلیہ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ میں نے سندر سے کام کے بارے میں پوچھا: "بھیا جی۔ یہ بتاؤ پارک کا کام تو اچھا کر دوگے نا؟ اپنے نام کی طرح۔ رنگ کی طرح نہیں!" وہ تھوڑا تنک کر بولا: "دیکھو سائیب ہم کو بھیا مت بولو، ہم پورب کے ضرور ہیں۔ پر گونڈہ و بنڈہ کے نہیں نکھلؤ کے ہیں نکھلؤ کے ——! دوسری بات رنگ کی بھی مت کہیو سائیب، کرشن جی بھی تو کالے تھے۔ گوپیاں کتنا آگے پیچھے پھرتی تھیں اُن کے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ مگر میں پہلی ہی ملاقات میں اس سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا: "تم خاص لکھنؤ کے ہو —!؟"

"نہیں سائیب! —— ہمارا گاؤں رُدَولی ہے۔ نکھلؤ سے دس بارہ کوس دور۔!"

"اچھا سُندر! —— کام کی بات کرو۔ پارک میں گھاس کیسی لگاؤ گے کیاریاں کہاں کہاں بنیں گی۔ اور یہ کھاد چیک کر لو۔ ٹھیک ہے کہ نہیں اور کیا کچھ منگوانا ہوگا —!"

"سائیب! بس ایک بار تم حکم کر دیو۔ ایسا پارک بنائیں گے کہ سارا سہر دیکھنے آیا کرے گا۔ ایک بار سری لنکا دیس سے جہاں کا راون تھا ایک میم سائیب آئی، نمائش میں ——" میں اس کا کوئی قصہ سننے کو تیار نہیں تھا اور مجھے کہیں جانا تھا۔ ضروری معاملات طے کر کے میں نے اسے اگلے ہی دن کام شروع کرنے کے لئے کہہ دیا۔

میرا اصول ہے کہ دفتر کے چپراسیوں، مزدوروں اور سوئیپروں تک سے میں دوستی محبت اور ہمدردی سے پیش آتا ہوں۔ اس درجہ کے لوگوں کو جب کہیں سے پیار اور اعتماد مل جاتا ہے تو یہ دل و جان سے محنت کرتے ہیں۔ سندر بھی تھوڑے ہی دنوں میں مجھ سے اور میرے اسٹاف سے گھل مل گیا۔ وہ صبح شام پارک کا کام کرنے آتا اور ہنسی مذاق سے سب کا دل بہلاتا۔ چھٹی کے دن وہ زیادہ وقت ہمارے ہی ساتھ گزارنے لگا۔ وہ شہر میں کئی جگہ پارٹ ٹائم کام کرتا تھا مگر وہ جانے کیوں مجھے ہی شہر کا سب سے بڑا افسر مانتا تھا۔ حالانکہ میں ایک چھوٹے سے محکمہ مال کا آفیسر تھا۔ ایک دن کام سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آ بیٹھا۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے بائیں ہتھیلی پر زردہ مسلتے ہوئے وہ بولا۔

"سائیب! یہ کمپنی والا ہم کو پانسو تنخواہ کے دیتا ہے اور کام گدھے کی طرح لیتا ہے اگر سائیب اِدھر اُدھر کام نہ کریں تو روٹی کی مشکل پڑ جائے سائیب ——!"

میں نے ازراہِ ہمدردی کہا: "کیا کریں سُندر! مہنگائی بہت بڑھتی جا رہی ہے۔"

وہ تھوڑا سا سنجیدہ ہو کر بولا: "آپ اتنا بڑا آپھیسر سائیب! کہیں گورمنٹ کا نوکری دلوا دو، بچے یاد کریں گے آپ کو ——!"

اس نے اس انداز میں کہا جیسے میری جیب میں دو تین مالیوں کے اپائنٹمنٹ لیٹر پڑے ہوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب اسے کیا جواب دوں جس سے اس کا اعتماد بھی نہ ٹوٹے اور میرا بھرم بھی بنا رہے۔

"میری جان پہچان میونسپلٹی میں تو ہے سُندر۔ کہو تو کسی پبلک پارک میں تمہاری ڈیوٹی لگوا دوں۔"!

نہیں سائیب! اُدھر کا داروگا بہت حرامی ہے۔ سالا ٹمپرلی مالیوں سے ہر مہینے بیس پچاس کی گھوس لیتا ہے جو کوئی نہ دے اس کی چھٹی کر وا دیتا ہے، دلوانا ہے تو گورمینٹ کا نوکری دلواؤ سائیب۔" میں نے اسے ایمپلائمنٹ کا راستہ بتایا۔ کچھ اس کی سمجھ میں آیا اور کچھ نہیں بھی، وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا ہوا چلا گیا۔

سندر اب کافی دلچسپ ہو چلا تھا، وہ دھارمک ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت رومانٹک بھی تھا۔ ایک دن صبح سویرے آکر بولا: "کمال ہو گیا سائیب۔ کیا جمانا آگیا!"

وہ بات کم کر رہا تھا ہنس زیادہ رہا تھا میرے پوچھنے پر وہ ایک نیا قصہ بیان کرنے لگا۔

"چودہ سیکٹر میں بی بی جی رہتی تھیں۔ ان کا گھر والا ایک بہت بڑی پھیکٹری کا مالک ہے، آج جب ہم ان کے باگیچہ میں کام کرنے گیا تو سیٹھ مونڈھ پکڑ کر (سر پکڑ کر) بیٹھا ہوا تھا۔ ہم کو دیکھ کر بولا مالی اب ادھر کوئی بگیچہ وگیچہ نہیں دیکھنا۔ بس سب برباد ہو گیا، ہم بولا کیوں سائیب کیا ہوا؟ بولا۔ تمہارا بی بی جی بھاگ گیا، ہم نے پوچھا کیسے بھاگ گیا بی بی جی، بولا وہ کتیا کی بچی سارا روپیہ جیور لے کر گھنسا ماں کے ساتھ بھاگ گیا!"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "گمنساماں کیا مطلب!؟ ـــ کیا مطلب!؟"
"ارے سائیب! گمنساماں! مطلب رسوئیا، جو کھانا بناتا ہے۔ بڑا ہٹا کٹا لڑکا تھا سالا، روزانہ مکھن انڈے پتہ نہیں کیا کیا مال پاڑتا تھا، بس لے گیا سالا بھگا کر۔"
"میں نے اس سے سوال کیا" اس بی پی جی کا سیٹھ شندر نہیں ہے کیا!؟"
وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ارے! ـــ شندر ہونے سے کیا ہے سائیب۔ یہ سیٹھ لوگ تو پھول کی مالا کا وجن نہیں اٹھا سکتا! ـــ یہ سالا اورت کیسے رکھ سکتا ہے۔!" اور اس طرح شندر روز ہی نت نئے قصوں کے ساتھ آنے لگا۔
شندر کی محنت رنگ لائی۔ چھ مہینے میں ہی پارک اچھا لگنے لگا، گھاس بہت خوبصورت ہو گئی، چاروں طرف کیاریوں میں قلمی گلاب، موتیا اور دوسرے پھول اپنا رنگ دکھانے لگے، چاروں کونوں میں بوگن بلیا کے پودوں نے بھی سر اٹھا لیا تھا۔
ایک شام میں پارک میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ سامنے سے شندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک چالیس پینتالیس سال کا آدمی بھی تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی مالی ہے، عجیب و غریب شکل تھی اس کی، پارک میں داخل ہو کر انہوں نے نمستے کی اور میرے ساتھ ہی گھاس پر بیٹھ گئے۔ سندر کچھ سنجیدہ نظر آرہا تھا وہ تین منٹ کی خاموشی کے بعد چھوٹی چھوٹی گھاس کو نوچتے ہوئے وہ بولا!
"سائیب ـــ! آج ایک ضروری کام سے آئے ہیں ـــ!"
میں نے خندہ پیشانی سے پوچھا "بولو ـــ کیا کام ہے ـــ!"
شندر نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو بالکل خاموش بیٹھا گھاس کو گھورے جا رہا تھا، اور بولا "سائیب! یہ بھائی ہمارے گاؤں کا ہے اور ہمارہ ہی کمپنی میں بیس سال سے کام کر رہا ہے۔ اس کی لڑکی کی شادی ہونا ہے۔ ایک مہینہ کو۔ اس کو لون چاہئے سائیب!
دس ہجار۔ وہ کیا ہوتا ہے ـــ ہاں پراوی ڈینٹ پھنڈ (پراوی ڈینٹ فنڈ) اس میں سے لینا ہے کمپنی سے، سائیب دلوا دو! میں نے سٹپٹاتے ہوئے جواب دیا ـــ میں کیا کر سکتا ہوں یہ تو تمہاری کمپنی کا معاملہ ہے!" وہ ہاتھ گھما کر بولا "کمال ہو گیا سائیب۔ اتنے بڑے آپھیسر ہو، اور یہ کام نہیں کروا سکتے ـــ!" لیکن سندر! میری کون مانے گا۔ تمہاری کمپنی سے میری کوئی جان پہچان بھی نہیں ـــ!"
نہیں سائیب میں خوب جانتا ہوں آپ کمال بھی کر دیوگے اس غریب کا کام بن جائے گا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ جب اس نے مجھے زیادہ ہی مجبور کیا تو میں نے ایک درخواست جنرل منیجر کے نام لکھ کر اُسے تھما دی کہ وہ کل کمپنی کے دفتر میں دے دے۔
اس کے بعد تین چار روز تک شندر نہیں آیا، میں فکرمند تھا کہ اس کو کیا ہوا پارک کا کام بھی ٹھپ پڑا تھا۔
ایک دن شام کو شندر پھر اسی آدمی کو ساتھ لے کر آیا، میرے پاس ایک دو سائل بیٹھے تھے جن کو نپٹا کر میں شندر کی طرف متوجہ ہوا اس کے ساتھ والا آدمی کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آرہا تھا۔ "ارے تو تین چار دن سے کہاں غائب ہے شندر م! گلاب کے پودے ختم ہو رہے ہیں اور تو آلڈریکس ALDREX بھی نہیں لایا۔"
الڈرن گھر رکھی ہے سائیب ـــ! کل چھڑک دیں گے بس تھوڑا پریشانی تھی اس لئے نہیں آیا سائیب ـــ! اس کا کام نہیں بنا ابھی تک
میں نے پوچھا "اس درخواست کا کیا ہوا ـــ؟ جو میں نے لکھی تھی ـــ!؟"
"کیا ہونا تھا سائیب ـــ یہ آدمی کھود تو پاگل ہے ہی مجھے بھی پاگل بنا دیا ہے اس نے!"
"ارے تو ہوا کیا ـــ؟" میں نے ذرا زور دے کر پوچھا۔
"آپ کی لکھی ہوئی درکھاست دیکھ کر ہمارا سائیب بہوت کھوش ہوا اور پھوراً منجوری دے دیا۔ سارا کام ہو گیا، اب نیچے والا آپھیسر گھوس مانگتے ہیں ایک ہجار روپیا، اور یہ پاگل مانتا نہیں، اب آپ ہی اسے سمجھاؤ سائیب ـــ! گھوس کے بگیر یہاں کوئی کام ہوتا ہے!" اس کے آخری جملے پر میں نے نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے ساتھی سے کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر اپنی بھاری آواز میں کہا۔
"ما بھی دینا۔ ہم گنوار آدمی ہیں سائیب ـــ! ایک بات پوچھنا سائیب ہم کو!"
"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پوچھو۔ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا
شندر نے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنی شہادت کی انگلی کا پور کنپٹی پر گھما کر اس کے پاگل ہونے کا اشارہ دیا۔ میں نے شندر کی طرف دھیان نہ دیا۔
وہ عاجزی سے بولا "سائیب! جب میں بچہ تھا جب ہمارے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں پکتا، اور ہم سب بھوکے رہتے تب باپو کہا کرتا تھا کہ

[باقی صفحہ ۳۲ پر دیکھئے]

ایس۔ آر۔ کوبنج تالی تل۔ نانی تل۔ ۲۶۳۰۰۲



ترجمہ۔ جاوید اقبال

*پربھات خبر۔ روزنامہ۔ ۱۵ پی۔ کوکرا انڈسٹریل ایریا رانچی

# گھر کہاں ہے؟

ہلکا سا ہوش تھا یا تو بارش کی نمی کے درمیان چھایا ہوا گہرا سا دکھائی دیا۔ دو ایک لمحوں کے لئے آنکھیں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ دماغ بھی سُن۔ گھپ اندھیرا۔ پھر دور کہیں سے دیئے کی کانپتی لو۔ کہیں ہزاروں میل دور سے آتی ہوئی، جیسے کہ دو ارب نوری سال سے کوئی سورج دماغ کی جانب بڑھا ہو۔ دیئے کی لو یکایک مشعل میں بدل گئی اور گہرا جنتا گیا۔ گہرا چھن گیا اور اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ کون لوگ اسے گھیرے ہوئے کھڑے ہیں؟ یہ لوگ مہذب اور صاف ستھرے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی پتلیوں کے بیچ جا ہوا سورج دو ارب نوری سال دور دکھائی دے رہا ہے؟ جیسے جیسے گھنے اندھیرے کے درمیان جلنے والا مدھم روشنی کا بلب بجھ گیا ہو۔ کچھ لمحوں تک بلب کے اندر قید اور پھر چھٹک کر آنکھوں کی پتلیوں کے آگے ناچتی ہوئی روشنی۔ کہیں کچھ نہیں۔ نہ کوئی اجالا، نہ کوئی دماغ۔ کچھ بھی نہیں —! گویا پورا جسم ایک کائنات بن جائے اور پوری کائنات ایک صفر بن جائے۔ نہ وہاں شعور ہے۔ نہ آسمان، نہ پانی، نہ ہوا، نہ آگ نہ دھرتی۔ لیکن شعور تو ہوتا ہی ہے۔ خواہ باقی کچھ بھی نہ ہو! شعور کبھی نہیں مرتا۔ دھیرے دھیرے اربوں نوری سال دور سے آتے ہوئے سورج کی طرح .....

"یا اللہ! مقبول حسین نے اس روشنی کو گھور کر آہ بھرنے کی کوشش کی، لیکن شاید کوئی آواز نہیں نکلی۔ ساری آہ، پورے جسم میں، جو اسے مکمل کائنات کی طرح لگ رہی تھی، قطرہ قطرہ بن کر پھیل گئی۔ کہاں ہے وہ؟ کون ہیں یہ سامنے کھڑے لوگ؟ "ابا جا ااا ن" مقبول کے اندر سے پانی کے بلبلے کی طرح آواز اٹھی لیکن یہ بھی شاید درمیان میں ہی غائب ہو گئی۔ اب وہ سب کچھ ٹھیک سے دیکھ رہا تھا... سامنے کتنی لوگ کھڑے تھے۔ ڈاکٹر، شہر کے کچھ لوگ اور پولس کے سپاہی..... سب اجنبی لیکن ساری پوشاکیں جانی پہچانی، سفید ایپرن، کالا اسٹیتھسکوپ، سفید کرتے، دھوتیاں، ٹوپیاں، خاکی قمیص، پتلون، بھوری چکتی پیٹیاں اور پیلے تمغے سب کچھ مانوس تھا ابا نہیں تھے، امی جان نہیں تھیں، گوہر بانو، رفیق، سرور، اکبر، قلعہ گھاٹ کی گلی، مسجد کے چوڑے دروازے، آلے پر رکھا گیا جستے کا لوٹا نیم کا پیڑ... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — الحمد للہ رب العالمین ...... الرحمٰن الرحیم.... مالک یوم الدین.... ایاک نعبد و ایاک نستعین.... شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ سب تعریف اللہ کو ہے جو مالک سارے جہاں کا بہت مہربان نہایت رحم والا۔ مالک انصاف کے دن کا۔ ہم تیری ہی بندگی کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں— "کون ہو تم لوگ؟" "کہاں سے آئے ہو تم؟ کیا تم اللہ کے پیغمبر ہو؟ تمہارے یہ کپڑے میری آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ کھولو ان کپڑوں کو۔ آدمی کی طرح کھڑے رہو۔ اُلّو کے پٹھو... آدمی بنو! تمہارے جسم کا کالا رنگ ان سفید کپڑوں سے زیادہ پاک ہے۔ کیوں آئے ہو حرامزادو .... جاؤ۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہارا رحم... مجھے نہیں چاہیئے تمہاری محبت ... بند کرو یہ بکواس.... مجھے چین سے مرنے دو...."

"کہاں بول رہا ہے وہ؟ اس کی آواز سنائی کیوں نہیں دے رہی ہے؟ لوگ اسی طرح کے اداس اداس سے چہرے لئے مجھے کیوں گھور رہے ہیں میری بات وہ لوگ سنتے کیوں نہیں اپنی بات میں خود کیوں نہیں سن پا رہا؟" اچانک مقبول کو محسوس ہوا کہ داہنے پاؤں کی ایڑی سے کے کر پنڈلی تک کا حصہ نہیں ہے۔ "میرا پاؤں...." مقبول کے اندر پھیلی ہوئی کائنات میں کوئی آواز گونجی مگر وہ بھی قطرہ قطرہ ہو کر روئی کے گالو کی طرح نہ جانے کہاں پھیل گئی!

"تم لوگوں نے میری زبان بند کر دی ہے کمینو... تم لوگوں

میری زبان میں تالہ لگا دیا ہے۔۔ ۔ تم لوگ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ تمہارے چہرے کی مایوسی نقلی ہے جاہلو۔ جاؤ ہٹو یہاں سے۔ تمہاری دہلی، تمہارا لکھنؤ اور تمہاری بمبئی۔۔۔۔ کھٹ کھٹرر۔ کھرررر۔۔۔ کھٹرر۔ کھرررر ۔۔۔ مقبول، خطوط کے بنڈل کو مہر لگنے والی مشین کے کھانچے میں ڈال رہا ہے اور چشم زدن میں ہی دسیوں خطوط پر اُبھر آیا ہے۔ نئی دہلی، قرولباغ ۲۷ ر۔ ا۔ ۸۴/۳۰ ۔۔ ۱۰۔ اے۔ ایم۔۔۔ چھوا چھوت خدا اور انسانیت کے تئیں جرم ہے۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافوں، انلینڈ اور پوسٹ کارڈوں کا بنڈل اور دماغ میں محلے کے لوگوں کے ترتیب وار کھدے ہوئے نام۔۔ شری شیام کشور، ا، بڑا بازار، شری، شری جھمن لال کرانے والے ۱/۲ بڑا بازار، ڈاکٹر شمبھو پرساد اگروال، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ایم۔ ڈی۔ ہارٹ اسپیشلسٹ، ۲/۲ بڑا بازار، مولانا شفیق الرحمٰن جوتے والے، لالہ طوطا رام والی گلی کے پیچھے ہری مسجد کے پاس، بڑا بازار، شری شیتلا پرساد، بینگ والے، دوکان نمبر ۱/ بڑا بازار، ڈاکٹر بی۔ ڈی جوشی، ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی، بی۔ ایڈ، ایل۔ ایل۔ بی، ڈپ ان جرنلزم، ڈپ ان فرنچ ۔۔۔ مادر۔۔۔ کدو کی اولاد و۔۔۔ بھارت ماتا کے۔۔ سالو۔۔۔۔

یاد آگیا مقبول کو کہ وہ اس سے پہلے جیل کے سیلن بھرے کمرے میں تھا کمرے کے دروازے کی سلاخوں کو پکڑے ہوتے۔ دروازے کی سلاخیں بیچ کی ایک موٹی لوہے کی پٹی سے جڑی ہوئی تھیں اور نیچے اوپر دونوں طرف لوہے کی سلاخیں بے ترتیبی سے کھلی ہوئی پھیلی تھیں۔ پتہ نہیں کتنے دن بیت گئے ہیں؟ معلوم نہیں آج کون سی تاریخ ہے؟ کتنا بجا ہے۔ اس وقت اسے نہیں معلوم۔ صرف اتنا یاد ہے کہ وہ لوہے کے دروازے کو ہلا ہلا کر توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ اس سے نہیں ٹوٹا اور وہ پہلی اور آخری بار چیخا تھا۔ "میں بے قصور ہوں، مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔" اور ایک چیخ کے ساتھ اپنے دائیں پاؤں اور سر کو اس نے لوہے کی سلاخ سے دے مارا تھا۔ لوہے کی سلاخ کا نچلا سرا اس کے پنجے اور ایڑی کے درمیان گھس کر آر پار نکل آیا تھا اور اسی لمحے اس کی چیخ بند ہو گئی تھی۔۔۔۔!

"آبا جا ا ا ن۔۔۔" وہ چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن آواز نہ جانے کہاں درمیان میں ہی کھو گئی؟

"یا اللہ۔۔۔" وہ چیخنا چاہتا تھا مگر وہ آواز بھی نہ جانے کہاں درمیان ہی میں غائب ہو گئی؟ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔۔۔۔ اسے خود ہی نہیں سنائی دیا تھا۔ بسم اللہ۔۔۔۔۔

پیارے قارئین! معاف کیجیے گا۔ مقبول حسین کے اس جذباتی ہذیان سے آپ میں سے کچھ لوگ اکتا سکتے ہیں۔ دراصل اس طرح کا ہذیان حقیقی ہوتے ہوئے بھی ایک کھاتے پیتے اور آسودہ حال شخص کو بے ہودہ اور ناخوشگوار لگ سکتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ جو پریشانی جھیلتا ہے وہی اس کے درد کو جانتا ہے۔ لیکن کریں کیا، چاروں طرف پھیلے ہوئے اس ماحول میں زندہ رہنے کے لئے ایک حفاظتی خول، ایک گھیرا ہمیں بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ ہر دم گھگھیانا، چاپلوسی گیری کرنا۔ ہر موجودہ لمحے کو لپ اسٹک کی طرح اپنے ساتھ چپکائے رہنا اور عورتوں کو اپنا آگا، ـــــ ـــــ، مردوں کو اپنا پیچھا پروسنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اپنی ڈیوٹی میں ذرا بھی چوکے کہ آپ کا حفاظتی خول ٹوٹا اور آپ کو مقبول حسین کی طرح ایسے ہی جذباتی ہذیان بکنے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔

کل ہی کی تو بات ہے بھائی، کہ مقبول حسین کے سامنے اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹروں، وکیلوں، لیڈروں اور پولیس والوں کے ساتھ میں بھی کھڑا تھا۔ سامنے مقبول حسین اتنی مایوسی سے ہمیں گھور رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے کہ اس کے دو چہرے اگ آئے ہیں۔ ایک سے وہ بسم اللہ کر رہا ہے اور دوسرے سے ہم سبھوں کو ایک ایک کر کے گالیاں بک رہا ہے۔ دس بارہ سال سے مقبول حسین کو میں روز ہی دیکھتا ہوں۔ دن میں دو بار وہ بازار سے ڈاک لے کر گزرتا ہے اور ان دس بارہ برسوں میں محلے کے بچوں، نوجوانوں اور کام کاجی عورت مردوں کا وہ نہ صرف چہیتا بن گیا ہے بلکہ رشتہ دار بھی ہو گیا ہے۔ برج کشور بابو کے بچے اسے ماموں کہتے ہیں، شیتلا پرساد جی کے بچے مقبول چچا، شفیق جوتے والے کا سارا خاندان اس کا بیٹا ہے۔۔ اور پریم لال ڈاکٹر کے عمر دراز بیٹے بیٹوں کے لئے وہ سگے بھائی کی طرح ہے ہولی، دیوالی، عید، محرم، بڑا دن ہر موقع پر روپیہ آٹھ آنہ ہر خاندان بغیر مانگے اسے دے دیتا ہے اور بھیا دوج، راکھی بندھن کے دن تو مہینے دو مہینے پہلے سے ہی صبح و شام کے کھانے کا پروگرام اس کا بک ہو جاتا ہے۔ تیوہاروں میں کسی گھر کی چھٹی ہو یا نہیں وہ بلا ناغہ ہر گھر میں جاتا ہے اور گھر کے ایک ایک فرد سے مل کر ہی گھر سے نکلتا ہے

مقبول حسین ہمارے اس چھوٹے سے شہر نما قصبے کا ایک خاندانی فرد ہے۔ کچھ سرکار کی بھی مہربانی ہے کہ اس کا کسی دوسرے محلے یا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ نہیں کیا گیا۔ وہ اتنا ناقابل تقسیم حصّہ ہو گیا ہے اس محلے کا کہ بازار کا کوئی شخص اس کی جگہ دوسرے پوسٹ مین کا تصور

ہی نہیں کرسکتا۔ بچوں اور نوجوانوں کے لئے تو ڈاکئے کا مطلب ہی مقبول
حسین ہے۔ شیام کشور کے لڑکے نے ایک دن انگریزی کے ایک رسالے
میں کسی بہت بڑے مصور کا نام پڑھا، تو وہ مصور بھی اسے ان تصویروں
کے درمیان خاکی وردی پہنے ہوئے تصویر بناتا نظر آیا۔ بڑا بازار کے ڈاکٹر
لال کی لڑکی نے ایک دن سنیما ہال میں چپل نکال لی تھی، جب مقبول حسین
نے سادے کپڑوں میں اس سے کہا تھا "سلوچنا جی، آپ پہلے سے
جانتی تھیں کہ اس پکچر کی ہیروئن نے کون سی ساڑی پہنی ہے؟" چپل
ہاتھ میں لئے لئے وہ مقبول کو دیر تک گھورتی رہ گئی "مقبول انکل کا
بھائی تو نہیں ہے تو... بے ہودہ..." اور بغیر مقبول کی بات سنے وہ
چلی آئی تھی۔

مقبول نے بیس سال میں ڈاکئے کی نوکری شروع کی تھی تقریباً
دو سال تک وہ خطوں پر مہر لگانے اور ڈاک بکسوں سے ڈاک اکٹھا کرنے
کا کام کرتا رہا۔ پھر تیلا، تیز طرار مقبول جلد ہی افسروں کا منظور نظر بن گیا
اور دو سال بعد ہی ڈاک سپرنٹنڈنٹ نے اسے پوسٹ مین بنا دیا۔ جگہ بھی
شہر کی سب سے خاص بازار دی گئی ڈاک زیادہ ضرور ہوتی تھی لیکن
مقبول حسین ڈاک بانٹنے کا کام پوری ایمانداری سے کرتا۔ خطوط تقسیم
کرنے کے بہانے رفتہ رفتہ لوگوں کے ذوق، ان کی شخصیت سمجھنے لگا اور
خط دیتے وقت پانے والے کے لئے اس کی اہمیت تک کا اندازہ لگانے
لگا تھا۔

چالیس کی عمر میں بھی مقبول حسین کے چہرے پر نوجوانوں کی سی
چنچلتا دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں محلے والوں
کو زیادہ علم نہ تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ فرخ آباد کی طرف کا
رہنے والا تھا اور بچپن میں ہی اس پہاڑی شہر میں چلا آیا تھا۔ یہیں مسجد
میں جھاڑو دینے کا کام، جمعہ کے روز وضو کے وقت پانی بھرنے کا کام
کرتا رہا اور اس دوران اسکول بھی جاتا رہا۔ شروع ہی میں مسجد میں اردو
کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بعد میں ہندی اسکول سے آٹھویں پاس کر لی
تھوڑے دنوں ایک بیکری میں بھی رہا اور ایک دن ڈاک خانے میں لگ گیا
شادی اس نے نہیں کی تھی۔ محلے والوں کے دماغ میں کبھی یہ بات آئی ہی
نہیں کہ پوسٹ مین گھر اور خاندان والا بھی ہو سکتا ہے۔ بازار کی عمر رسیدہ
عورتیں کبھی کبھی پوچھتیں "مقبول، برس بھر یہیں دکھائی دیتے ہو، گھر
پریوار کہاں رہتا ہے تمہارا؟"
اپنے سدا بہار بھولے پن میں مقبول جواب دیتا "اتنا بڑا بازار

پریوار ہے میرا بھائی! کتنے تو چاچا، تاؤ، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے، بھائی
اور نہ جانے کیا کیا ہیں..." رسمی ڈھنگ سے پوچھی گئی بات نہایت
غیر رسمی بن کر ختم ہو جاتی۔ مقبول کو شاید کبھی خاندان کی کمی نہیں کھلی۔ کبھی
بھی۔ نہایت گھریلو ماحول کے دوران بھی اس نے گھر اور خاندان کا دکھ
کہا ہی نہیں!

پیارے قارئین! اصل بات سے ہٹ کر میں یہاں پر داستانِ مقبول
لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ آپ اس سے ضرور برافروختہ ہو رہے ہوں گے۔ آپ تو
مقبول حسین کو ایک کہانی کے کردار کے روپ میں دیکھ رہے ہیں کہانی
پڑھتے ہوئے آپ "ہائے کیسی حالت ہو گئی بے چارے کی" سسکتے ہوئے
دو چار آنسو پہلے ہی بہا دیں، مقبول حسین کو ایک خیالی کردار ہی مان کر
چلیں گے۔ لیکن میرا منشا مقبول کے لئے آپ کا رحم اور ہمدردی بٹورنا
نہیں ہے۔ دراصل، اس سے جو میری قربت ہے، اس کے بہت
نزدیک نہ ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں اس کے لئے جو عزت ہے
وہ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ مقبول کے بارے میں ذرا باریکی سے آپ کو بتا سکوں
اور ہو سکے تو اسے اپنی طرح آپ کا بھی دوست بنا دوں۔
اس کی زندگی کا المیہ تو مجھے بیان کرنا ہی ہے۔ حالانکہ میں خود اس
واقعے سے اتنا خوف زدہ ہو گیا ہوں کہ کہہ نہیں سکتا، اس کے دل کی
دہشت کا من و عن بیان کر بھی پاؤں گا یا نہیں؟ بہرحال واقعہ
بیان کرنے سے پہلے میں ذرا اپنے محلے کے بارے میں بھی بتا دوں۔ بس
اتنا سا اور سن لیجئے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں یہ شہر کا خاص بازار
ہے اس لئے ہر طرح کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ زیادہ تر بنئے ہیں۔ لیکن
دوکانوں کو چھوڑ کر بالائی منزل میں شہر کے روایتی مکین رہتے ہیں جن میں
زیادہ تر ہندو ہیں۔ تقریباً سبھی کم آمدنی والے گروپ کے ہیں اور دس
فی صد کے قریب ایسے ہیں جو اپنی دوکانیں خود چلاتے ہیں۔ باقی نے
دوکانیں کرائے پر اٹھا رکھی ہیں اور خود شہر کے سرکاری، غیر سرکاری دفاتر
میں کلرکی یا کوئی دوسرے شہروں میں اسی طرح کا کام کرتے ہیں۔ سبھی
لوگ مذہب پرست ہیں۔ متحدہ خاندانوں کے صدیوں پرانے اعتقادات
ہیں اور انہیں کے سہارے دھیمی، سست اور سپاٹ رفتار سے وہ لوگ
زندگی جی رہے ہیں۔

بس، گذشتہ تین سالوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی ہے تو
بہت معمولی لیکن تبدیلی کے اس عمل نے اتنا کچھ کر دیا ہے کہ چاروں طرف
بدامنی اور بے یقینی کا ماحول بڑھتا چلا گیا ہے۔ تقریباً تین سال پہلے

جوتوں کی ایجنسی والے بھنڈاری کو اپنی جڑواں لڑکیوں کی شادی کے لئے یکمشت بڑی رقم کی ضرورت پڑی تو انھوں نے دس ہزار کی پگڑی اور پانچ سال کا یکمشت کرایہ لے کر اپنی دوکان سردار بنتا سنگھ کو دے دی۔ بنتا سنگھ نے دوکان کے اوپر کے ایک سیٹ کو رہنے کے لئے بھی کرائے پر لے لیا۔ اور جلد ہی وہ بازار کے خاندان کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی دوران شیتلا پرساد کے دو لڑکے جو ابھی تک ایک مشہور پبلک اسکول میں پڑھ رہے تھے، ایس۔ ایس۔ ای۔ ایس پاس کرکے اپنی پشتینی راشن کی دوکان پر بیٹھنے لگے۔ تیسرے پلاننگ افسر، مراد آباد میں ہیڈ کلرکی سے ریٹائر ہونے کے بعد شیام لال جی اپنے پشتینی مکان میں آئے اور اپنے دونوں لڑکوں اور ایک لڑکی کو انھوں نے یہاں کے کالج میں داخل کرا دیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کون سی نئی بات ہوئی؟ عام زندگی میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آدمی مکان بدلتا رہتا ہے۔ نسلوں میں بھی فرق آتا ہے اور اسی تناسب میں سماجی روایتوں کا روپ بھی بدلتا ہے۔ ہوا بھی یہی۔ بنتا سنگھ نے دیکھتے دیکھتے چھ مہینوں ہی میں جوتے کی دوکان ساڑیوں اور ریڈی میڈ گارمنٹس، کی دوکان کے روپ میں ایسی چمکا دی کہ یہ یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں پر جوتوں کی کوئی بھوہڑ دوکان بھی رہی ہوگی۔ موزیک کا فرش، سن مائیکا کا کاونٹر اور چاروں جانب امپورٹیڈ شیشوں کے شو ونڈو۔۔۔۔ بازار میں وہ دکان الگ ہی دکھائی دینے لگی۔ اسی طرح راشن کی دوکان میں شیتلا پرساد کے لڑکے جم گئے۔ اپنے پبلک اسکول کی تعلیم کا انھوں نے فائدہ اٹھایا اور سال بھر کے اندر دہ راشن کی دس ایک اہم مدوں کے ایجنٹ ہو گئے۔ جو شیتلا پرساد اب تک ایک دو روپے کی ہینگ، بتاشے، سپاری، الائچی وغیرہ کی پڑیا بنا کر بیچا کرتے تھے، بیٹوں نے روپے آدھے روپے کا یہ کاروبار بند کر دیا اور اسکولوں، کالجوں، آفس کینٹینوں کی سپلائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ رہی مراد آباد سے آئے ہمارے ریٹائرڈ ہیڈ کلرک شیام لال جی کے لڑکوں کی بات، دونوں لڑکے اپنے مراد آباد کالج کے تجربوں کی بنا پر (دو سال فیل ہونے کی وجہ سے ان میں سے ایک کو بی۔ اے کا چار سال کا تجربہ تھا) اس پہاڑی کالج کے جلد ہی دادا بن گئے۔

مقبول حسین صبح کی ڈاک تقسیم کر رہا تھا۔ پہاڑی شہروں میں گیارہ بجے سے پہلے ڈاک نہیں بٹتی اور تب تک ساری دوکانیں کھل جاتی ہیں جھمن لال کرانے والے کی بیٹی کی رجسٹری دے کر مقبول نے جھمن لال کا سیاہی لگا انگوٹھا اپنے بالوں میں پونچھا اور ”جے رام لالہ“ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

دوسری رجسٹری کا پتہ گنگناتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ شیتلا پرساد پنسا ہینگ والے، دوکان نمبر دس، بڑا بازار۔۔۔

”دوکان بہت بڑھیا بنا دی ہے بابو صاحب آپ نے“ گلا پر بیٹھے شیتلا پرساد کے بڑے لڑکے سے مقبول بولا اور اپنی پرانی عادت مطابق کاونٹر کے بغل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سامنے بنچ پر بیٹھو۔۔۔“ روکھے لہجے میں شیتلا پرساد کا لڑکا مقبول نے گویا کچھ سنا نہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کہا ”شیتلا ہینگ والوں کی ایک مہر بھی ٹھونک دینا یار، تگڑے میں روپے پڑے ہو دے دو۔ شام کے پھیرے میں بینک سے بلٹی بھی لیتا آؤں گا“

انگریزی شان سے، پیشانی پر بکھر آئی بالوں کی لٹ کو اوپر جھٹکتے ہوئے لڑکا بولا ”بڑے بدتمیز ہو میاں۔ کیوں دے دیں تمہیں رجسٹری دے دی۔ اب اپنا راستہ ناپو۔ بڑے منہ لگے لگتے آئندہ سے دھیان رکھو۔ اس دوکان کا نام، ایس پرساد اینڈ سنز ہول سیل مرچنٹس، ہے۔ فالتو باتیں جھاڑنے کی ضرورت نہیں“

مقبول اب بھی بیٹھا رہا۔ ”شیتلا پرساد ہینگ والوں کی ڈاک آئے تو کہاں دوں گا بابوجی؟ وہ بھی تو آپ ہی لیں گے یا۔۔۔۔“ مستی میں مقبول بولا۔

”بند کر بکواس۔ دو کوڑی کا پوسٹ مین، مذاق کرتا ہے مجھ سے تیرے جیسے دس تو میں نے نوکر رکھے ہیں“

مقبول اب کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ رسید اٹھا کر کاونٹر سے باہر آگیا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ رسید میں مہر بھی لگی ہے یا نہیں بازار کے کونے تک مشینی انداز میں خطوط تقسیم کرتا رہا مقبول اپنی نوکری کے اتنے لمبے عرصے میں اس نے خود کو پہلی بار سنجیدہ محسوس کیا۔ پہلی بار اس نے دوکان کے باہر سے ہی چٹھیاں اندر کو پھینکیں اپنا یہ طرز عمل اسے خود ہی پہلی بار گندہ اور بے ہودہ لگا۔

دو چار دنوں ہی میں مقبول اپنی پرانی عادت میں لوٹ شیتلا پرساد ہینگ والوں کے یہاں وہ البتہ کچھ نہیں بولتا۔ کبھی کبھی شیتلا پرساد بھی بیٹھے رہتے تو وہ چپ چاپ کاونٹر پر خط رکھ کر بڑھ جاتا۔ شیتلا پرساد ہی نے ایک دن ٹوکا۔ ”ارے بھائی مقبول یار بینک تک تو جا ہی رہا ہے، تمباکو کی بلٹی بھی لا دینا۔ یہ پیسے“ ادھوری بات کاٹ کر ہی مقبول بولا ”لالہ جی اب آپ کے آگے ہیں۔ وہ برا مانیں گے“

"وہ یہاں نہیں ہے یار۔ تبھی تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ ایک منٹ بیٹھ تو سہی تجھے ادھر ہو کیا گیا ہے! بغیر بیٹھے تو تو آگے بڑھتا ہی نہیں تھا۔۔۔" شیتلا پرساد مانوس لہجے میں بولے تو مقبول اتنا کہہ کر ٹال گیا

"ذرا جلدی میں ہوں لالہ جی"

بازار کے نسبتاً سنسان گوشے میں ایک لڑکے نے مقبول کو شلیے سے روکا اور پانچ روپے کا ایک نوٹ زبردستی اس کے ہاتھ میں دیتا ہوا بولا "مکان نمبر ۲ میں یہ چٹھی سریتا شرما کو دے آؤ تو میاں۔ دھیان رکھنا چٹھی اس کے علاوہ اور کسی کو نہ ملے"

جیسے ہاتھ میں کوئی گھناؤنی چیز چپک گئی ہو، ہاتھ جھٹکتے ہوئے مقبول نے خط اور نوٹ لوٹاتے ہوئے کہا "پچاس پیسے کا ٹکٹ لگا دیجئے بابو صاحب۔ جہاں کہیں گے میں وہاں دے آؤں گا۔ لائیے پچاس پیسے دیجئے۔ میں ڈاک خانے ہی جا رہا ہوں۔ خود ہی ٹکٹ لگا کر پوسٹ کردوں گا۔ مگر بغیر ڈاک خانے کی مہر کے چٹھی گھر میں نہیں پہنچے گی۔"

"کیوں نقصان کر رہے ہو اپنا میاں۔ تمہیں صرف چٹھی دینی ہی تو ہے ٹکٹ لگانا تو میں بھی جانتا ہوں۔ ساڑھے چار روپے صحیح ہاتھوں میں پہنچانے کے ہی تو دے رہا ہوں"

"ایسے کھوٹے کام میں نہیں کرتا صاحب، معاف کیجئے گا۔ کسی اور سے کروا لیجئے" مقبول آگے بڑھ گیا۔

لڑکے نے پیچھے سے مقبول کا کالر پکڑ کر کھینچا۔ تیزی سے مڑ کر مقبول نے لڑکے کا ہاتھ جھٹکا اور اتنے ہی معتدل لہجے میں بولا "اچھے گھر کے لڑکے لگتے ہو یار۔ اس طرح کی حرکت کیوں کر رہے ہو؟"

"تم سے جو کام کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ ورنہ نوکری کرنا بھلا دوں گا۔"

"بیس سال سے یہی نوکری کر رہا ہوں بابو صاحب۔ آگے اٹھارہ سال بھی یہی کرنی ہے"

"جانتا نہیں مجھے تو ابھی۔ ابھی شرافت سے کہہ رہا ہوں"

"جانتا کیوں نہیں بابو جی۔ شیام لال جی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں آپ، رام بہاری لال عرف منّا۔ مرادآباد سے پڑھ لکھ کر آئے ہیں آپ کے چار پشتوں کی جانکاری رکھتا ہوں اسی لئے تو کہہ رہا ہوں صاحب، اچھے گھر کے ہیں آپ۔ ان چکروں میں۔۔۔"

"دیکھ لوں گا تجھے۔۔۔" دھمکی بھری چنوتی دیتا ہوا منّا خط اور نوٹ اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونستا ہوا بازار کی جانب چلا گیا۔

مقبول کے لئے اس طرح کا طرزِ عمل نیا ضرور تھا۔ لیکن اپنی طویل نوکری کے دوران اس نے اس طرح کے واقعات کے بارے میں کئی بار سوچا تھا۔ بڑے شہروں سے تبادلے پر آئے ہوئے ملازمین کبھی کبھی ایسے واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ دو چار دن تک اس کے دماغ پر اس واقعے کا اثر رہا۔ لیکن جلد ہی وہ بدستور نارمل ہو گیا۔

میسرس بنتا سنگھ کلاتھ مرچنٹس، ۲۰۳، بڑا بازار کی رجسٹری بنڈل میں لگاتے ہوئے مقبول کی نظر رجسٹری کے اوپر ٹائپ کئے ہوئے "نوٹس" لفظ پر پڑی۔ ہمیشہ کی طرح اسے اچھا نہیں لگا یہ لفظ۔ اداس دل سے رجسٹری بنڈل کے درمیان اپنی جگہ پر ڈالی اور بنڈل کو اپنے بیگ میں ٹھونس کر کندھے پر ڈالنے لگا۔

"زمانہ بدل گیا مقبول بھائی۔۔۔" بغل میں بیٹھے نمبر چار نے خطوط چھانٹتے ہوئے مقبول کی جانب بغیر دیکھے ہی سنجیدہ لہجے میں کہا "ایک وہ زمانہ تھا جب پوسٹ مین کو دیکھتے ہی دسوں ہاتھ اٹھ جاتے تھے.. تھوڑی دیر کسی کے گھر ٹھہر جاؤ، تو دودھ ناشتہ حاضر ہو جاتا تھا۔ آج یہ حالت ہے کہ پوسٹ مین لٹنے لگے ہیں"

"کیوں کیا ہوا؟" مقبول نے جھٹکے سے مڑ کر تعجب سے کہا "کس کو لوٹ لیا بھائی؟ کس نے لوٹا؟"

"کیوں تمہیں تو کہہ رہے تھے کہ کسی نے پانچ کا نوٹ دکھا کر تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ آج نوٹ دکھانے کی ہمت ہو گئی، تو کل کو نوٹ چھیننے بھی لگیں گے۔ ایسے ہی تو ہمت بڑھتی ہے۔۔۔"

"ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے یار!" مقبول نے کندھے پر لٹکے ہوئے اپنے جھولے کو سنبھالتے ہوئے کہا "آپ سچے ہوں تو جہان سچا ہے بھائی ایسی وارداتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ ایک آدمی کو لوٹ لیا تو اس کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہے کہ سبھی لوگوں کو لوٹ لیا جائے گا۔ تبدیلی تو ہو گی ہی پنڈت اور ہمیں زندہ بھی اسی درمیان رہنا ہے" یہ کہتے ہوئے مقبول پوسٹ آفس کے باہر نکل آیا اور گنگناتے ہوئے بازار کی جانب بڑھ گیا۔

میسرس بنتا سنگھ کے بورڈ کو دیکھ کر مقبول کو یاد آیا کہ پندرہ بیس سالوں تک یہاں ایک پرانا سا بورڈ جس پر سولہویں صدی کے طرزِ تحریر میں بڑی بڑی انگریزی عبارت میں شوز SHOES لکھا رہتا، بازار میں الگ ہی دکھائی دیتا تھا۔ کئی بار مہینوں تک اس میں الگ الگ قسم کے کاغذ کے پوسٹر چپکے رہتے تھے، جو خود ہی کبھی بارش یا ہوا سے نکل جاتے تھے۔ "شوز" اور اس بورڈ کے نیچے لکھی عبارت کو پڑھنے کی مقبول نے کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی لیکن یہ بورڈ کسی بھی آتے جاتے کو

کو متوجہ نہ کرے ایسا ممکن نہیں تھا۔ لال زمین پر سفید، نیلی اور سنہرے رنگ کی ابھری ہوئی تحریر میں لکھا تھا "میسرز بنتا سنگھ، کلاتھ مرچنٹس"

سارے بازار میں یہی ایک نئی دوکان تھی مقبول کے لئے "آداب عرض سردار جی" مقبول نے کاؤنٹر کے پاس جاکر سردار جی کی طرف رجسٹری بڑھائی اور شو ونڈوز میں سجی ہوئی پوشاکوں کو دیکھنے لگا۔

سردار جی نے ایک نظر رجسٹری پر ڈالی اور فوراً ہی گلّے سے دس کا ایک نوٹ رجسٹری کے اوپر پھینک کر کہا "لکھ دو کہ یہاں اس نام کی کوئی فرم نہیں ہے"

جھٹکے سے مقبول کا دھیان شو ونڈو سے ہٹا "جی میسرز بنتا سنگھ تو آپ ہی کی فرم ہے۔ آپ نے بڑا شاندار بورڈ لگایا ہے"

"ہے ضرور میاں۔ مگر اس خط کا بنتا سنگھ نہیں ہے"

"کیا مطلب سردار جی؟ یہ رجسٹری تو آپ ہی کی ہے نہ؟"

"کیوں مذاق کرتے ہو یار؟ یہ نوٹ رکھو اور واپس بھیج دو رجسٹری۔ جاؤ اپنا کام کرو"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے سردار جی؟" دس کا نوٹ سردار کی طرف بڑھاتے ہوئے مقبول بولا "میں ایسا کیسے لکھ دوں کہ یہ فرم شہر میں ہے ہی نہیں"

"ارے بھائی، دس کا ایک نوٹ اور پکڑاؤ۔ معاملہ ڈبل دس نمبر کا ہے ..." مقبول نے مڑ کر دیکھا۔ دوکان کے ایک کونے پر گھٹنے ہوئے سر کا، لال رومال گلے میں لپیٹے ہوتے ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ مقبول نے فوراً پہچان لیا۔ شیام لال جی کا بڑا لڑکا تھا۔

بنتا سنگھ نے دس کا ایک اور نوٹ نکالا اور دونوں نوٹ مقبول کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ارے میاں، اتنا لالچ بھی اچھا نہیں۔ پیٹھ پر لاد کر تو نہیں جاؤ گے پرلوک۔ ابھی تو کتنی بارات اور کمائی ہوگی۔ چلو تم بھی کہو گے سردار جی نے بات نہیں مانی"

"معاف کیجئے گا سردار جی..." مقبول پوری طرح ہوشیار ہو گیا۔ "میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ آپ رجسٹری لیجئے، ورنہ میں یہ لکھ کر واپس کر دوں گا کہ پانے والے نے انکار کیا"

"کیسے لکھ دو گے مولوی صاحب؟" کہتے ہوئے کونے پر بیٹھا ہوا شیام لال جی کا بڑا لڑکا کاؤنٹر کے پاس آگیا "یہ دکشنا کس لئے دی جا رہی ہے آپ کو۔ میاں، بیس روپے کے بچے کے لئے تعلیم بن جائے گی۔ اگر شوق فرماتے ہیں تو ایک ادھ بوتل سے مزے میں آجائے گا"

نوکری کے دوران پہلی بار مقبول کو غصہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ غصے کو پی گیا اور شیام لال جی کے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر بولا "حضور میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ آپ بڑے لوگ ہیں۔ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا مجھ سے نہ کروائیں کہ میرا دین ایمان ختم ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو ہی منہ دکھانے لائق نہیں رہوں گا"

"کس زمانے کی بات کرتے ہو میاں! ان باتوں کا زمانہ بہت پہلے گذر گیا۔ کام تم کو کرنا ہوگا۔ خواہ سیدھے ہاتھ سے کرو یا الٹے ہاتھ سے ویسے تم سمجھتے ہو کہ تمہارے لکھنے سے قیامت آجائے گی۔ اس غلط فہمی میں نہ رہو۔ ہم سب جگہ سے کروا سکتے ہیں"

"آپ کروالیں حضور۔ آپ کروا سکتے ہیں۔ مگر مجھے غلط کام کے لئے مجبور نہ کریں مجھے اجازت دیں" دس دس کے دونوں نوٹ سردار جی کی طرف سرکا کر مقبول نے رجسٹری اٹھائی اور دوکان سے باہر نکلنے لگا۔

سردار جی نے مقبول کا ہاتھ اندر کو کھینچا اور اطمینان بھرے لہجے میں شیام لال جی کے لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا "جانتے ہو میاں یہ ضلع یووک کانگریس کے صدر ہیں"

"جی ہاں جانتا ہوں۔ چٹھیاں تو میں ہی پہنچاتا ہوں"

"پھر بھی اس طرح کی جرأت کر رہے ہو"

"جرأت نہیں کر رہا ہوں حضور۔ جو ٹھیک سمجھتا ہوں وہی کر رہا ہوں"

"جانتے ہو، اگلے مہینے تمہارا تبادلہ ہو جائے گا اور کسی پہاڑی گاؤں میں پھینک دیئے جاؤ گے جہاں دس پندرہ میل پہاڑی راستہ پیدل طے کرنا پڑے گا؟"

"بیس سال سے بازار میں ہی کام کر رہا ہوں حضور۔ کل کیا ہوگا یہ تبھی دیکھا جائے گا۔ نیتا اندھا تو نہیں ہے۔ وہ میری نوکری کے اتنے برس نہیں دیکھے گا کیا؟"

"سوچ لو میاں۔ بیس روپے بھی جائیں گے اور یہ کمائی نوکری کا"

مقبول بغیر کچھ جواب دیئے ہی چلا آیا۔ تیسری بار وہ آج پیدل ہو کر خطوط تقسیم کرنے لگا۔ اسے اپنا یہ طرز عمل آج پھر خود ہی گندہ بے ہودہ محسوس ہونے لگا۔

ڈاک چھانٹتے ہوئے نمبر چار نے دوسرے ہی دن اپنا فیصلہ سنا دیا تھا "مقبول میاں! بوریا، بستر باندھو۔ سیدھے لکھنؤ ہی آرڈر آئے گا۔ اس زمانے میں مبلغ علیہ السلام کے بعد دوسری

ہے نیتا شکتی "

"کون سی تیاری کرنی ہے یار مجھے۔ اکیلا آدمی۔ چل دوں گا جہاں کہیں گے۔ مگر سچائی اور انصاف کی طاقت ابھی اتنی مردہ نہیں ہوئی ہے پنڈت "! مقبول کہہ تو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تمام چہرے، مختلف رشتے اس کی آنکھوں کے سامنے تیر آئے۔ کیا وہ یہاں سے جا پائے گا؟ "چھوڑ دوں گا نوکری کو پنڈت! کس کے لئے کرنی ہے مجھے نوکری؟ ارے مدرسے میں پڑھانے لگوں گا۔ مونگ پھلی بیچ لوں گا — مجھ سے نہیں ہوتی یہ غلامی۔ اچھے آزاد ہوئے یار ہم۔ اس سے پہلے تو انگریز کے زمانے میں تھے۔

ایک ماہ تک کوئی حکم نہیں آیا۔ اس دوران نمبر چار نے پوسٹ ماسٹر کے کانوں میں بات ڈال دی تھی۔ پوسٹ ماسٹر مقبول کے کام سے اچھی طرح واقف تھا۔ نمبر چار سے اس نے کہا "مقبول سے کہنا وہ فکر نہ کرے۔ اپنے بھی منسٹر ہیں۔ دیکھیں، کون مائی کا لال اس کا تبادلہ کرواتا ہے۔ میں لڑ دوں گا اس کے لئے "

نمبر چار نے خوش ہو کر مقبول کو مبارک باد دی۔ لیکن مقبول پہلے سے زیادہ اداس ہو گیا۔

سرتیا شرما کا خط دیکھتے ہی مقبول کی نظر لفافے کی تحریر پر گئی اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ تحریر وہ نہیں تھی۔ اس نے لفافے کو خطوط کے بنڈل میں رکھا اور نمبر چار کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا تھیلا سنبھالنے لگا۔ نمبر چار اپنے خطوط ہی میں کھویا ہوا تھا۔ مقبول نے تھیلا کندھے پر لٹکایا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ مکان نمبر پچیس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سرتیا شرما کا چہرہ آنکھوں کے آگے آ گیا۔ شرما جی کی یہ اکلوتی اولاد تھی اور سولہ سترہ سال پہلے جب سرتیا پیدا ہوئی تھی تو سارے بازار کو دعوت دی گئی تھی۔ اسے بھی بلانا نہیں بھولے تھے شرما جی۔ سرتیا مقبول کے سامنے ہی بڑی ہوئی تھی۔ گھنٹی کا بٹن دبانے ہی والا تھا کہ ایک دبی ہوئی سی چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ گھنٹی بجانے کے لئے پھر ہاتھ بڑھایا کہ چیخ اور صاف ہو گئی۔ جیسے کسی نے منہ دبایا ہوا ہو۔ اسی طرح کی گھٹن بھری چیخ۔ اچانک مقبول نے سوچا کہ سیڑھیوں سے نیچے اتر جائے۔

دروازے کے شگاف سے خط اندر ڈال دے۔ خط دروازے کے شگاف سے اندر ڈالا ہی تھا کہ دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ چیخ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سرتیا کے بچپن کا چہرہ مقبول کی آنکھوں کے سامنے کوند گیا وہ دعوت یاد آئی جو سرتیا کی سالگرہ پر اس نے دی تھی — دروازے کو دھکا دیا تو مڑے ہوئے پردے کے کونے سے اندر کمرے میں سرتیا نظر آئی۔ کندھے کے پاس سے قمیص پھٹی ہوئی تھی اور چھٹپٹاتی ہوئی وہ خود کو آزاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مقبول تیزی سے اندر گھس گیا اور سرتیا کے منہ کو ڈھکے ہوئے ہاتھ کو پیچھے کھینچتے ہوئے اس نے جوان کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ اس کا شبہ درست تھا۔ وہ جوان منا ہی تھا۔ شیام لال جی کا چھوٹا لڑکا۔ منا تیزی سے اٹھا اور جیب سے چاقو نکال کر تانے ہوئے مقبول کی طرف بڑھا۔ منا کے ہاتھ کو پکڑ کر مقبول نے چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور اس کا ہاتھ پکڑے باہر آ گیا سرتیا کی سسکیاں اسے ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔

سیڑھی کے پاس مقبول نے منا کو چھوڑ دیا۔ منا پھنپھکارتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا "بتاؤں گا سالے کو۔۔۔" سب سے نچلی سیڑھی سے آئی کوئی آواز مقبول کے کانوں میں پڑی "دروازہ بند کر لو" مقبول نے سرتیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور خود بھی سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک ساتھ ایک طرح کے کئی واقعات سے مقبول حسین کے دماغ میں یہ یقین مستحکم ہو گیا تھا کہ گرھنے والے رستے نہیں۔ وہ حسب معمول کام میں لگ گیا۔ نمبر چار کو بھی اس نے سرتیا والا واقعہ نہیں بتایا۔ اسے لگا کہ صورت حال جب بگڑ ہی جاتی تو خود بہ خود لوگوں کو معلوم ہو جاتا۔ بات اس تک ہی محدود رہے گی تو اس قصبہ نما شہر میں سرتیا کی بدنامی نہیں ہوگی۔ یہ بات وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ چھوٹی سی بات کا کتنا بھاری بتنگڑ بن جاتا ہے اس شہر میں۔

لیکن اس واقعے کے تقریباً دس دنوں کے بعد ہی، بازار میں داخل ہوتے ہی پولس کے چار چھ آدمیوں نے اسے گھیر لیا تھا اور تھانیدار نے اس کا بیگ چھین کر کہا تھا "پاکستان کی جاسوسی کرتے ہو میاں! سرکاری محکمے میں رہ کر غداری کرتے ہو؟"

مقبول ششدر رہ گیا۔ کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟ اس کی آنکھوں کے سامنے بازار کے وہ سارے خاندان تصویروں کی طرح تیرنے لگے جن کے درمیان اس نے گذشتہ بیس سال گزارے تھے۔

تھانیدار اپنے سپاہی سے کہہ رہا تھا "دیکھو، مولانا شفیق الرحمٰن جوتے والے کے نام کا کوئی خط ہے؟"

"جی صاحب، ہے" سپاہی نے خطوط کے بنڈل میں سے ایک خط نکالا۔

"مہر کہاں کی ہے؟" تھانیدار پھر گرجا۔

"علی گڑھ کی ہے صاب۔"

"پھاڑو لفافہ۔"

سپاہی نے لفافہ کھولا اور اردو میں لکھا گیا ایک خط نکالا۔

"پڑھو اسے ..." تھانیدار مقبول کی طرف خط بڑھاتے ہوئے گرجا۔

کانپتے ہاتھوں سے مقبول نے خط پکڑا۔ شروع کی دو چار سطریں پڑھتے ہی وہ دنگ رہ گیا۔ خط میں علی گڑھ کے کسی مولانا نے شفیق الرحمان جوتے والے کو اس کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی معرفت ہتھیار بھیجے جانے کی بات لکھی تھی۔

"پڑھو کیا لکھا ہے؟" تھانیدار پھر گرجا۔

مقبول کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"بس گھبرا گئے۔ ہتھیار منگانے کے لئے ہمت کہاں سے آئی۔۔۔ پڑھو مادر۔۔۔"

مقبول پرنم آنکھوں سے تھانیدار کو گھورنے لگا۔

تھانیدار نے ایک سپاہی کو ڈاک کا تھیلا پوسٹ آفس میں جمع کر کے رسید لانے کا حکم دیا اور دوسرے کو ہتھکڑی ڈال کر مقبول کو تھانے لے جانے کا۔ مقبول نہ اپنے ہاتھ اٹھا پایا اور نہ جھٹک ہی پایا۔ مبہوت سادہ تھانیدار کے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلا گیا۔ بازار کے آخری موڑ پر مقبول نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا کہ منا اور اس کا بڑا بھائی بھی تھانیدار کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تھانے تک جاتے جاتے سارا بازار اور پھر سارا شہر تھانیدار کے ساتھ شریک ہو گیا۔

پندرہ بیس منٹ ہی میں مقبول چچا، ماموں، تاؤ، بھیا پاکستان کا ایک ظالم جاسوس بن گیا جو بیس برسوں سے مولانا شفیق الرحمان جوتے والے کے یہاں بندوق، طمنچے، بارود اور ہتھ گولے منگایا کرتا تھا۔

مقبول حسین کچھ نہیں بولا۔ نہ تھانے میں اور نہ جیل کے کمرے میں۔ داروغہ نے ایک کالا کمبل ڈال کر اسے پٹوایا بھی، اپنے لوہے کی نعل لگے بوٹوں سے اس کے پاؤں بھی کچلے آنکھوں کے پاس جلتی ہوئی لال سلاخیں بھی لے گیا لیکن مقبول حسین کچھ نہیں بولا۔ اس کے پاس بولنے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں۔ علی گڑھ اس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ گذشتہ بیس برسوں سے اس نے اپنا گھر اسی بازار کو مانا تھا۔ ان بیس برسوں میں اسے نہ اپنے ابا کی یاد آئی تھی نہ امی جان کی۔ نہ اپنے بھائی رفیق، مسرور، اکبر کی یاد آئی تھی نہ بہن گوہر بانو کی۔ نہ قلعہ گھاٹ کی گلی یاد آئی تھی، نہ مسجد کے چوڑے دروازے اور نہ نیم کا درخت۔۔۔ کچھ بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ایک ہی جگہ کئی ابا، چچا، ایک ہی جگہ کئی امی جان اسے ملے تھے۔ کیا کہہ رہا ہے تھانیدار؟ کیا میں اپنے ابا جان، امی جان، آپا گوہر بانو، اکبر، مسرور، رفیق کو گولیوں سے بھون ڈالتا؟ کیا کہہ رہا ہے تھانیدار؟ کیا میں اپنی مسجد کو، اپنے گھر کو، اس بازار کو پیچ ڈالتا؟ کیا کہہ رہا ہے یہ؟ مقبول حسین ششدر و مبہوت جیل کے دروازے کی سلاخوں کو پکڑے، نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا؟ کہاں ہے اس کا گھر؟ کون ہیں اس کے ابا؟ کون ہیں اس کی امی جان؟ کون ہے اس کی گوہر بانو؟ سارا دن اور ساری رات وہ آنکھیں پھاڑے، جیل کے دروازے کی سلاخوں کو پکڑے خلا میں تکتا رہا۔ اور دوسرے دن ٹھیک دس بجے، ٹھیک ڈاک چھانٹنے کے وقت یکایک چلایا "دنہیں، میں بے قصور ہوں۔ مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ ابا۔ ا۔ ا۔ ا۔۔۔"

اور ایک چیخ کے ساتھ اپنے دائیں پاؤں اور سر کو اس نے لوہے کی سلاخ پر دے مارا تھا۔ سلاخ کا نچلا سرا اس کے پنجے اور ایڑی کے درمیان گھس کر آر پار نکل گیا تھا۔ سر سے خون کی دھار بہنے لگی تھی۔ اور یہ اس کی پہلی اور آخری چیخ تھی۔۔۔۔

پیارے قارئین! یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں ہے جس وقت میں یہ واقعات قلمبند کر رہا ہوں، مقبول حسین اس دنیا میں نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی۔ صوبائی اور مرکزی حکومت کے لیڈروں نے اس معاملے میں کافی دلچسپی لی اور کل ہی میں ایک روزنامے میں پڑھ رہا تھا کہ شیام لال جی کے لڑکے نے ایک پریس ریلیز میں یوتھ کانگریس کی جانب سے کہا ہے کہ اقلیتی فرقے سے صوبائی اور مرکزی حکومت کو گہری ہمدردی ہے حالانکہ مقبول حسین جیسے غدار وطن لوگوں سے عوام کو ہوشیار رہنا چاہئے۔ تاہم مقبول حسین کی خودکشی کی کوششوں نے چونکہ یہ دکھا دیا ہے کہ اس نے اپنے گناہ کی تلافی کی ہے اسلئے اس کے علاج کا سارا خرچ یوتھ کانگریس برداشت کر رہی ہے اس واقعے سے کچھ اور ممکنہ سراغ مل سکیں، اس لئے ہم بھگوان سے یہ پرارتھنا کرتے ہیں کہ ملک کے مفاد کو دھیان میں رکھتے ہوئے مولانا مقبول حسین، علی گڑھ والے کو جلد صحت ملے۔ بیان میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ مقبول حسین کانڈ سے کچھ ایسے اشارے بھی ملے ہیں کہ مسلم لیگ اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے درمیان سرکار کو بدنام کرنے کے لئے اور اس لئے کہ رجعت پسند (؟) انتشاری طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع ملے خطرناک گٹھ بندھن ہو رہا ہے۔ عوام کو ان فرقہ پرست طاقتوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔۔۔۔

# مکتوب

**تاراچرن رستوگی** ——— بریلی ۲۴۳۰۰۱

شاعر شمارہ ۱۲ء ۸۵ یعنی ماہ جنوری ۸۵ء سے متعلق اپنے تاثرات اس لیے انتر ویٹڈ پر تحریر کر رہا ہوں تاکہ مراسلہ مضمون کی سرحد تک نہ پہنچ سکے۔ بساطِ سخن پر ندا فاضلی کے احوال و کوائف سے مسرت ہوئی، بالخصوص اس لیے بھی کہ میں ندا مرحوم کو جانتا تھا اور ان کو تاری کو بھی۔ اسی کے ساتھ حضرت سیماب مرحوم کا فوٹو دیکھ کر یادوں میں کھو گیا۔ ان سے آخری ملاقات ۱۹۳۷ یا ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی جب بریلی یوپی میں میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ مرحوم کے ہمراہ برادرم ساغر نظامی مرحوم بھی تھے یعنی نصف صدی پہلے کا منظر چشمِ دل کے سامنے آگیا ؎

برکشا ریشم سیر خلوت دل داشتیم
بیدل آموختیں ملک ہم درون این جا بود

(بیدل)

یادِ رفتہ، چہرہ چہرہ یادیں، آثار لفظ لفظ رشتے اچھے تبصرے ہیں یکجے ان کا یہ سلسلہ دلکش بھی ہوتا ہے اور معلوماتی بھی۔ جناب نشتر خانقاہی کے قطعات اور اشعار غزل، وحدتِ تاثر کے آئینہ دار ہیں اور ثبوت فراہم کرتے ہیں اس حقیقت کا کہ موصوف اچھے استاد ہیں اور پختہ شاعر ہیں۔

تنقید جدید افسانے کا قابلِ توصیف تجزیہ ہے۔ اگر ہندی اور بنگالی کے افسانوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہوتا اور تقابلی طور پر تجزیہ کیا گیا ہوتا تو زیادہ فائدہ ہوتا۔ بہرکیف غنیمت ہے۔ مگر عابد بیگ صاحب کا مضمون "ادبیات عالم میں ترجمے کی روایت" محض فہرست ہے جو کسی انسائیکلوپیڈیا کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جا سکتی ہے۔ اس کو کس لیے شاملِ اشاعت سمجھا گیا؟ افسانے قریب قریب سبھی اچھے ہیں مگر "ایک اداس کہانی" بہت خوب ہے۔ قومی بچت اسکیم بھی اچھی کہانی ہے۔

ندا صاحب کا یہ شعر بھی عجب ہے کہ ؎

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی
سیدھی نہیں ہے دور تک الجھی ہوئی ہے زندگی

(ندا)

یعنی زندگی کوئی فرد یا شے ہے ایسا معلوم ہو سکتا ہے۔ کاش اس مطلع پر توجہ دی گئی ہوتی۔

شاعر میں شمول مکتوبات بھی خاصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ شاداب رضی صاحب نے اپنے مکتوب میں جس ذاتِ گرامی کی بات فرمائی ہے کہ SELF IMOBITION میں حق سے دور جا پڑتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بزعم خود وہ جو کچھ بھی کہیں وہ انتقاد سے بالکل ناواقف ہیں، احساسِ برتری ان کے لفظ لفظ ٹپکتا ہے اور ادا ادا سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ بیٹھے ہیں کہ ان سے زیادہ وسیع مطالعہ کا دائرہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اردو میں دھڑے بازی ہے۔

ایک جریان القسان نے ان کو شمس العلما بنا ڈالا۔ میری رائے اعتقاد بھی ہو سکتی ہے۔ ایک اور مانند ہیں جو ... داغ کو شاعر اور دل کو مومن کہہ کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معرکہ سر کر لیا۔ ایک اور عجیب و غریب مخلوق ہے جو اقبال کے تصورِ خودی و تصوفِ بے خودی کی تعبیر تصادم اسلام اور غیر اسلام سے کرتا ہے۔

اداریہ اردو کے مسائل سے متعلق ہے جو پوری معلومات سے عبارت نہیں معلوم ہوتا ہے۔ نو دہ دھرتی گیا (ہفت وار) میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "منقطع اردو تحریک"۔ باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ۔ ہم اردو والے اپنے محسنوں کو بھی نہیں پہچانتے ہیں۔ گورنر بہار عزت مآب سید ظفر حسین برنی نے وہ کر دکھایا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد جو آنجہانی کردہ وزیر تعلیم تھے، اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر مرحوم جو جمہوریہ سے قبل وہ نائب صدر تھے لاکھوں دستخطوں پر مشتمل ایک محضر نامہ صدر جمہوریہ کو پیش کیا تھا وغیرہ نہیں کر پائے۔ برنی صاحب ہی کی پشت پناہی سے تلخیص اکبر صاحب کا مشورہ کہ اردو کو دوسری زبان کا درجہ دلوایا جائے اور سفارشات بہار سے کی جائیں کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ پورا کرنے والے لاتعداد ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی کی اہمیت قائم رہے گی ورنہ پورا ملک بے وقوفوں سے بھر جائے گا۔ کہیں کہیں انگریزی کا معیار بھی متاثر ہوا ہے۔ اردو کے ایک صاحب ہیں اور انگریزی پڑھاتے ہیں مگر BUT کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ کوئی زبان شعری سرمائے سے بڑی نہیں ہوتی۔ بڑی زبان بنانے کے لیے محنت چاہیے، تمام علوم و فنون پر کتابیں دستیاب ہونا پہلی شرط ہے۔ اب ہمارے روزمرہ میں انگریزی داخل ہو چکی ہے اور اس کو کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی۔

**عنوان چشتی** ——— ل – ۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاعر لگاتار موصول ہو رہا ہے۔ گوشۂ حامدی کاشمیری پسند آیا۔ اس کے بعد دو شمارے اور ملے۔ ان میں نئے چہروں کا ہجوم ہے۔ جس کا ایک حصہ نئی نسل کا بھی ہے۔ شاعر نئے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ مگر اس عمل میں معیار اور توازن کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ حضرت اعجاز صدیقی مرحوم کی ادارت میں "شاعر" کا اپنا ایک خاص مزاج تھا۔ آپ نے اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ مگر اس ہم آہنگی کے عمل میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان کی سمت و رفتار پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ شاعر اپنے نئے تشخص کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب شاعر کے نئے دور کی نئی شناخت قائم ہو چکی ہے۔ مگر "شاعر کی روایت" (دورِ اعجاز صدیقی مرحوم) کا تسلسل بھی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ ان دونوں میں ایک توازن باقی رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔

**نظام صدیقی** ——— ۲۲ء دائرہ شاہ محب اللہ، بہادر گنج، الہ آباد

شاعر کے گوشۂ حامدی میں حامدی کا انٹرویو مبنی بر حقیقت ہے۔ ان کی صاف گوئی قابلِ تعریف ہے۔ لیکن ان کا آرٹیکل خود بے حد آسودگی بخش ہے۔ وہ تخلیقی عالمی اور قومی تنقید و تناظر سے ہم آہنگ لگتا ہے۔ دعاوی ضرور بہت بلند ہیں۔ لیکن وہ خود ایک خاص از کار رفتہ جرگے کے صوبہ زدہ معلوم ہو رہے ہیں جو بہ حالت کی حد تک فرقہ پرست ہے۔ وہ نئی تنقید کے علاوہ کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے نام نہاد رسالۂ ادب اپنے صحیح ترجمے تنقیدی دو قالب سے کس قدر ناآشنا اور جبلی مرکب میں مبتلا ہیں۔ اس کی ایک مثال اور شاعر کے تازہ شمارہ سے ہی فراہم کر رہا ہوں۔

(۱) "۲۰ویں صدی کے فرانسیسی علامت ساز شاعروں خصوصاً رامبو، ورلن اور ملارمے کے تراجم نے دنیا بھر کے ادب کی کایا پلٹ دی۔ فرانسیسی علامت پسند تحریک انیسویں صدی کی رائج اور پروردہ تھی)

(ادبیات عالم میں ترجمے کی روایت مولوی ڈاکٹر عابد بیگ صفحہ ۱۹)

(۲) اسے ۱۹ویں صدی کی تجریدیت" (چہ معنی دارد؟) کے بعد فرانس، روس، جرمنی اور برطانیہ میں زوال پسند ادیبوں کے اثبات کا نتیجہ بھی کہنا چاہیے اور بیسویں صدی کی آواں گارد تحریک کا آغاز بھی۔ (صفحہ ۲۰)

یہاں پر انہوں نے علامت پسند تحریک اور جدیدیت کو خلط ملط کر دیا ہے۔ جدیدیت کو زیادہ سے زیادہ ... تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ زوال پسند شعرا DECADENTS علامت پسندوں کو ہی کہا جاتا ہے۔

حتیٰ اس نوعیت کے مقالات "الندوۃ" اور "معارف" میں بہت شائع ہو چکے ہیں۔ "آج کل" میں بھی جو تحقیقی مقالات شائع ہوتے ہیں۔ وہ صرف تالیفات ہوتے ہیں۔ اس ادارے کے آرٹیکل ہم لوگ طالب علمی میں شباب بہت پڑھتے تھے۔ اس میں میٹر یاد کرتے ہیں۔ بہرحال تحقیقی مضامین سے شاعر کو بچایئے۔ ویسے صحیح تحقیق کی اپنی اہمیت ہے۔

پھر بھی شاعر بہت آسودگی بخش پرچہ ہے۔ اس کی نو بہ نو تبدیلیاں اس کے خوش گوار مستقبل کی بشارت ہیں۔ تاہم مزید تازگی فکر و مواد کی اشد ضرورت ہے۔ ابھی شاعر موجودہ عہد کے مزاج اور روح سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ گو اس کی وسیع المشربی اور ذہنی رواداری قابلِ قدر ہے۔ مجھے خصوصی طور پر اوم کرشن کمار کا آرٹیکل بہت پسند آیا تھا۔ بشر نواز اور سلیم شہزاد کے آرٹیکل بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ گوشۂ ندا فاضلی کو اور بھرپور ہونا چاہیے تھا۔ بشیر بدر کی غزلیں تاثر انگیز ہیں۔ وہ فارم میں ہیں۔

**شارق جمال** ——— محلہ معصوم شاہ مومن پورہ، ناگپور

شاعر کے تمام پرچے مل رہے ہیں۔ ان دنوں شاعر کو انداز سے ترتیب دے رہے ہیں۔ اس انداز ترتیب کو لوگ پسند بھی کر رہے ہیں۔ بساطِ سخن، بازیافت، آثار، لفظ لفظ کا معلوماتی اور معیاری ہیں۔ یہ صرف رسالہ شاعر کی اپنی جدت ہی کہی جا سکتی ہے۔ مقالات بھی کافی ٹھوس اور افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ منظوم حصہ بھی پہلے سے بہتر ہے۔ مکتوبات کا حصہ ذریعۂ معلومات ہی کہا جا سکتا ہے۔

شمارہ نمبر ایک (تازہ شمارہ) میں فرید پربتی صاحب کا خط پڑھ کر تعجب ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسعد بدایونی کی غزل عشرہ میں رکن کی کمی کھٹکتی ہے۔ انہوں نے کچھ مصرعوں کی تقطیع بھی پیش کی ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اسعد صاحب کی غزل میں کل ۱۲ مصرعے ہیں۔ یہ غزل بحرِ کامل مثمن سالم میں ہے۔ اور اس غزل کے ۱۱ مصرعے پورے ارکان میں ہیں۔ ایک مصرع جو یوں ہے

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

تقطیع م الجھ گیا کسی پھول سے۔ لپٹ گیا کسی خار سے

پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک غزل کے ۱۱ مصرعے بحر میں ہیں تو ایک مصرع میں شاعر کیسے بے بحر ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع بھی یوں تھا۔

~~میں~~ الجھ گیا کسی پھول سے میں لپٹ گیا کسی خار سے

یہاں شاعر کے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے یا کتابت کی غلطی ہوئی ہے۔ پھر ایک حرف کے وزن کی کمی کو رکن کی کمی کہنا بھی غلط ہے۔ یہ علم عروض سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

آگے فرید پربتی لکھتے ہیں کہ پرکاش تیواری نے مایوس کیا اب کی بار ان کی غزل غیر معیاری رہی مثلاً

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

(۱) تمہارے ہجر میں زندہ کہاں ہوں
میں تو دن زندگی کے گن رہا ہوں

دوسرے مصرع میں "میں تو" کھردرا سا لگ رہا ہے۔ اور پوری طرح سے ضم نہیں ہو پایا ہے۔

پھر اپنی طرف سے مصرع میں ترمیم بھی کر کے دکھائی ہے۔ اس مصرع کی تقطیع دیکھیے

مفا عیلن مفا عیلن فعو لن
تما رے ہج رمے زندہ کہا ہو
م تو دن زن دگی کے گن رہا ہو

پرکاش تیواری کی غزل کی یہ صحیح تقطیع ہے۔ فرید صاحب کو تقطیع بھی کرنا نہیں آتا اور ارکان قائم کرنا بھی نہیں آتا۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

پرکاش تیواری کی غزل کے صحیح ارکان نہیں۔ صحیح ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہی ہیں۔ یہ ارکان بحرِ ہزج مسدس محذوف کے ہیں۔

اب رہ گئی میں تو کے کھردرا ہونے کی بات تو فرید صاحب کو اپنی کی ہوئی اسعد بدایونی کی تقطیع پر نظر کر لینی چاہیے (میں الجھ گیا متفاعلن) اس میں بھی م تو تقطیع میں آتا ہے۔ اسعد اور پرکاش دونوں نے اپنے مصرع میں "میں" کی یائے مجہول کو گرایا ہے۔ جو جائز ہے۔ اگر فرید صاحب کو یہ سقوط یا شعر بعد کھردرا سا لگ رہا تھا تو دونوں جگہ اس عیب کو ماننا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ضمیر کو یعنی "میں" کو فصحا اور متاخرین شعرا رکنِ اول کے شروع میں ایک حرفی نہیں لاتے درمیاں میں لانا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ فرید صاحب کی نظر تیواری صاحب کے مذکورہ شعر کی ہی حالی

پر نہیں گئی۔ شعر ہے

تمہارے ہجر میں زندہ کہاں ہوں
میں تو دن زندگی کے گن رہا ہوں
قافیہ ردیف

اس شعر میں تقابلِ ردیف کا عیب ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔ اہلِ فن اسے کبھی گوارا نہیں کرتے۔

اسی شمارے کی دیپک قمر کی غزل پر بعد میں نظر پڑی جس کے اشعار۔ اور مصرع دو بحروں میں ہیں۔ جب کہ یہ اجتماع عروضیوں کے نزدیک جائز نہیں۔

مطلع، دوسرا اور آٹھواں شعر اور ہر شعر کا ثانی مصرع بحرِ رمل سالم مسدس میں ہے۔ بحرِ رمل سالم مسدس کے ارکان ہیں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن تیسرے، چوتھے۔ ساتویں آٹھویں نویں شعر کے پہلے مصرع کا وزن ہے۔

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن (بحرِ رمل مسدس محذوف)

پانچویں اور چھٹے شعر کے پہلے مصرع کا وزن ہے۔

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات (بحرِ رمل مسدس مقصور)

دیپک قمر کی غزل کا یہ عروضی عیب ایسا تھا۔ جس کی بنا پر شاعر جیسے جریدے میں اس غزل کو شائع کرنا مناسب نہیں تھا۔

**اسرار اکبرآبادی** ۲۵۴ء مستول، آگرہ — یوپی —

ستارہ مئی ۱۹۸۳ء نئے اضافے کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ منہ کی بات چھین لی۔ تم نے اس شمارے میں "بساطِ سخن — حدیث" کے ذریعہ ایسا ہی کیا ہے۔ کئی مہینوں سے میرے دل میں قدیم شعراء کا تعارف پڑھ کر اکثر یہ بات آتی تھی کہ موجودہ دور کے شعراء کا مختصر اور جامع تعارف بھی اگر شاعر میں شائع ہونے لگے تو بہت مفید اور دلچسپ رہے گا۔ اس شمارے میں اپنی اس آرزو کو عملی صورت میں اچانک دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تمہارے ملیح جملوں نے تو اس باغ میں چراغاں بھی کر دیا۔ دلی مبارکباد۔

**سید الابرار** — سی ۲۹/۴ جی ٹی روڈ، شب پور باوڑہ — ۲

شاعر کا شمارہ ملاحس کا سرورق دیدہ زیب تھا اور دل نشیں ہونے کے ساتھ، دماغ نشیں بھی تھا۔ ہند و پاک اردو ادب کی دنیا میں شاعر اپنی ایک روشن تاریخ کے ساتھ روشن مستقبل بھی رکھتا ہے۔ اس کی قابلِ قدر معیاری کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ اردو کے اکثر مسائل کے ساتھ یہ اشتہارہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی زندگی چند روزہ تو نہیں ہے۔ لیکن شاعر کو دیکھ کر اس طرح کا کوئی خوف نہیں پیدا ہوتا۔ خدا اس کی زندگی کو اور جلا دے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مقالہ "ادبیاتِ عالم میں ترجمے کی روایت" بہت خوب ہے۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف نے ان تمام ادبیاتِ عالم کا بڑا جائزہ لیا ہے۔ جو جامع ہونے کے ساتھ مستند علمی حوالے بھی رکھتا ہے۔ ندا فاضلی پر بشر نواز کا مضمون "اپنے لہجے کی دریافت" ندا فاضلی کی شخصیت صداقت پسند، تلخ، ترش اور شیریں شاعری کے بہت سارے

گوشوں کو روشن کرتا ہے۔ محترم بشر نواز کا بیان بہت دلا ہے۔ سلیم شہزاد کا مضمون قصہ جدید افسانے کا "جدید اس پر دو ٹوک باتوں سے مرتین رہ کر کچھ بہت سچی باتیں کہہ گیا ہے جس طرح سے "روایتی نظریہ کو فن کے تحت لا کر اس میں لچک پر کر لی گئی اور اب واقعے کے من و عن اس کے واقعہ ہونے کی روداد کا بیان افسانے میں ملنے لگا ہے"۔ وغیرہ

منظوم مشمولات میں حمید الماس کی نظمیں اور اپنے لاڈ شاعر ندا فاضلی کی رسیلی نظمیں بہت خوب ہیں۔ خاص طور سے ان کی نظم میوزیم نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کی غزل کا یہ شعر بہت پسند آیا۔ اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ، اک آنکھ سے روتی ہے، جیسی دکھائی دے مجھے، اس کی دہی سے روداد

اپنے بارے میں خود کچھ کہنا حماقت ہے۔ لیکن افسانوی مشمولات کی تمام کہانیاں زندگی کے نئے گوشوں کے ساتھ نئی افسانوی سمت کو بھی سامنے لا رہی ہیں۔ جس میں انیس رفیع کی کہانی "اوکھلی" تک بہت پسند آئی گرچہ موضوع نیا نہیں ہے لیکن اظہار کی رہائی نئی ہے۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ موصوف نے اس افسانے میں مواد اور ہیئت کے درمیاں کی جو دوری ان کے دوسرے افسانوں میں نظر آتی ہے، اس کو کم کیا ہے۔

**صدیق عالم** — ۷/۱ اے/۳، ہاتھی باگان روڈ، کلکتہ

شاعر کے شمارہ نمبر ا (جلد ۵۰) میں ندا فاضلی پر مضمون پسند آیا اس کی بہت ضرورت تھی، ندا فاضلی اردو شاعری کا اہم ستون بن چکے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اچھی لگیں، خاص طور کون تنائے

---

اس بار افسانوی حصے میں ست پرکاش سنگر اور سید الابرار، کی تخلیقات اچھی لگیں، انیس رفیع کی "اوکھلی" بیکار تھی۔

ڈاکٹر حامد بیگ کا "ادبیاتِ عالم میں ترجمے کی روایت" ایک اچھا ایک عمدہ مضمون ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں گرچہ کہیں کہیں انہوں نے بڑا ہی یک طرفہ فیصلہ دے دیا ہے مثلاً یہ کہنا کہ روسی ادب ابتدا سے ہی ایک خاص قسم کے جبر کا شکار رہا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ روسی ادب زار کے دور میں کتنے عروج پر تھا جب کہ بقول ان کے زار کے زمانے میں زبان و ادب کے نام کی کوئی شئے ملتی ہی نہیں۔

**اقبال کرشن** — ۲۲ ڈی، ستاگرودت لین، کلکتہ

شمارہ نمبر ا بہت پاک صاف ہے۔ سلیم شہزاد صاحب کا مضمون ہم کم علموں کے لیے بہت معلوماتی ہے۔ لیکن ان کا یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ذرا تشریح کر دیتے تو احسان ہوتا۔ خصوصاً کی ذہنی ترجیح اس رجحان کی طرف ہے۔

انور مینائی کی غزل بحرِ شاکل مضاعف مضاعف میں ہے فاعلاتن / فعولن / فعولن / فاعلاتن / فعولن / فعولن // نئی نئی مضاعف بحروں کا استعمال مستحسن ہے۔ انیس اور سید الابرار کے افسانے بھی خوب ہیں۔ فکر امروز کا سلسلہ جاری ہے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے درخواست کروں گا اردو ادب میں ترجمے کی روایت پر کچھ لکھیں۔

# کتب و رسائل

کتب و رسائل کا یہ کالم نقد و نظر سے قطعی الگ اور مختلف ہے۔ اس کالم میں نئی مطبوعات کا اعلان اور احوال دیا جاتا ہے۔ تبصروں اور تجزیوں سے اس کالم کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے بعض قارئین کتب و رسائل ہی کو نقد و نظر تصور کیے ہوئے ہیں۔ اس سے ہر دو کالم پر اثر پڑا ہے۔ ایک بار پھر وضاحت کی جاتی ہے کہ کتب و رسائل کے تحت ان تمام رسائل و کتب کی تفصیل دی جاتی ہے جو نقد و نظر کے لیے موصول ہوتی ہیں یا مصنفین اعلان کی شکل میں ارسال کرتے ہیں۔

ناشرین اپنی نئی مطبوعات کا تفصیلی اعلان ارسال کریں۔ مصنفین اپنی مطبوعات ارسال کرتے وقت کتاب یا رسالے کا تفصیلی اعلان علاحدہ سے بھجوائیں۔ (ادارہ)

○ **اردھانگنی کے نام۔** نگار پاشی کی ہی نظموں کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ نظمیں انہوں نے اپنی شریکِ سفر کے نام لکھی ہیں۔ سیدھے سچے محسوسات کو عام فہم زبان کے ذریعہ تخلیقی کائنات سجائی گئی ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ۔ مطبوعہ پبلیکیشنز ۱۰/۳۳۰۳، دہلی گیٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

○ **رباعی۔** ڈاکٹر وحید اشرف کی رباعیات کا مجموعہ جس میں مناجات، حمد و نعت و منقبت، مدحیات، اصلاحیات، عالم کی دعا، خمریات، عشق و محبت اور زندگی کے وسیع تر موضوعات پر نہایت ہی سادہ زبان میں رباعیاں شامل ہیں۔ ساتھ ہی پچاس سے زائد صفحات میں کچھوچھا شریف کی علمی، دینی اور تہذیبی تاریخ کے ساتھ فن رباعی پر ایک عالمانہ بحث بھی شامل ہے۔ پیش لفظ، ڈاکٹر سید محمد طلحہ رضوی برق۔ ضخامت ۴۹۶ صفحات۔ قیمت ۲۴۰ روپے۔ پتہ۔ سید وحید اشرف اشرفی جیلانی، ۴۔ تقی الدین خاں بہادر اسٹریٹ، ٹرپلیکین ہائی روڈ۔ مدراس ۶۰۰۰۰۵۔

○ **اسلام اور عصر جدید** (سہ ماہی)۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ۹۰ویں سالگرہ کے موقع پر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ذاکر صاحب کی ۲۰ اہم انگریزی تحریروں کے اردو تراجم، بعض کمیاب اردو تحریریں اور تقریریں، چند نہایت ہی اہم غیر مطبوعہ خطوط کا یہ مجموعہ مرحوم کی یاد میں بطور خراج عقیدت شائع کیا گیا ہے۔ مدیر، ضیاء الحسن فاروقی۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ۔ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

○ **تلاشش۔** پاکستان کے ایک ابھرتے ہوئے معروف شاعر خالد سہیل کا اولین شعری مجموعہ جس میں زندگی، انسان، عورت اور شاعر کے اپنے انفرادی ماحول کے شعری سفرنامے غزلوں، پابند اور آزاد نظموں اور قطعات کے اسلوب میں سمٹے ہوئے ہیں۔ موضوع و مواد کا تنوع، محسوسات کی نئی لذتوں اور اظہار کی ندرتوں نے اسے قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ سرورق۔ موحد۔ ضخامت ۱۲۶ صفحات۔ قیمت دس ڈالر۔ پتہ۔ ایو آئی پبلشرز ۱۲۹۶، بلور اسٹریٹ (ویسٹ)، ٹورنٹو (کینیڈا)

**دھوپ چھاؤں۔** بھاشا سنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش۔ شملہ نے اس سے قبل ایک شعری انتخاب "آبشار" [۱۹۸۴] کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ محکمہ کی طرف سے منعقد کیے جانے والے کل ہند مشاعروں میں شریک ہونے والے شعراء کے منتخب کلام کا یہ دوسرا انتخاب ہے جس میں چالیس سرکردہ شعراء اور شاعرات کا کلام، ان کی تصویریں اور سوانحی اشاریہ شامل ہے۔ مرتب، دھرم پال عاقل۔ نہایت ہی دیدہ زیب کتابت و طباعت، خوبصورت سرورق۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ قیمت: ۱۴ روپے۔ پتہ۔ ڈائرکٹر بھاشا سنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش، شملہ (ایچ۔ پی)

○ **حرف حرف آئینہ۔** نوجوان شاعر مختار شمیم کا ایک اور شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ محسوسات کے شعری دھنک رنگ۔ شعر شعر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۴ روپے۔ پتہ۔ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی۔ ڈی۔ ۷۴ پروفیسرز کالونی، بھوپال۔ (ایم پی)

○ **سدابہار چاندنی۔** اردو دنیا کے مقبول ترین افسانہ نگار رام لعل کا چوتھا افسانوی مجموعہ شائع ہو گیا ہے جس میں ان کے ۱۷ افسانے شامل کیے گئے ہیں جو اس سے قبل ہند و پاک کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ مکتبہ کی معیاری طباعت و کتابت، ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت تیس روپے۔ پتہ۔ نئی آواز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

○ **نئی غزل نئی آوازیں۔** نوجوان شاعر اسعد بدایونی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے جس میں "جدید غزل اور اس کی روایت" "نئی غزل کا مزاج" "نئی غزل میں اظہار کا موضوع" "آٹھویں دہائی کی غزل" "نئی غزل نئی آوازیں" اور رفتار کی نئی لیں اور ترقی پسندی جیسے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت بیس روپے۔ پتہ۔ مکتبہ جامعہ، دہلی، علیگڑھ، بمبئی۔

○ **اردو انٹرنیشنل۔** شمالی امریکہ سے شائع ہونے والا علمی و ادبی جریدہ جس کا ۱۲واں شمارہ منظر عام پر آ گیا ہے۔ اس میں گوشہ "سبط حسن" کے تحت تین مضامین سبط حسن کی شخصیت اور فن پر شامل کیے گئے ہیں۔ سبط حسن مرحوم کا ایک طویل مقالہ "نئی سیاسی تبدیلی" بھی شامل کیا گیا ہے۔ عالم اردو کے مشاہیر قلم کاروں کی ۱۲ نظمیں۔ ۳ افسانے۔ ۱۲ غزلیں اور ۲ تراجم اس معیاری رسالے کی زینت ہیں۔ سالانہ تین شمارے۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ زر سالانہ ۸ ڈالر۔ فی شمارہ ۳ ڈالر۔ مدیر اشفاق حسین۔ پتہ۔ اردو انٹرنیشنل ۱۲۹۶۔ بلور اسٹریٹ ویسٹ، ٹورنٹو کینیڈا۔

## مہاراشٹر اردو اکادمی کے انعامات

مہاراشٹر اردو اکادمی نے سال ۸۶-۱۹۸۷ء کے لیے درج ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے:

گیارہ ہزار روپیہ کا پہلا قومی انعام پروفیسر آل احمد سرور کو دیا گیا ہے۔ دوسرا تین ہزار روپے کا انعام واجدہ تبسم، ثریا صولت حسین اور عرفان عارف کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔ ان کو یہ انعام ان کے علی الترتیب شعری کلام "ساتواں پہر"، "مقدس حور" اور "صدیوں کے لوگ" پر دیا گیا ہے۔

شاعری پر چار ہزار روپے کا پہلا انعام ظفر گورکھپوری کو ان کے مجموعۂ کلام "گوکھرو کے پھول" پر اور تین ہزار روپے کا دوسرا انعام میر الم حنیف کو "ہم دیا رسا" پر اور سید عارف کو "دھوپ کا آخری ٹکڑا" پر دیے گئے۔

دوسرے انعامات میں چار ہزار روپے کا انعام "کتاب اردو رسم" پر فضیل جعفری کو، تین ہزار روپے کا انعام "جدید ہندوستانی سماج، معلم اور تعلیم" پر عالم نی مومن کو اور اس سلسلے کا تیسرا انعام دو ہزار روپے کا ہے جو ام عباسی اور حاجرہ بیگم کو دیا گیا ہے۔

## دلی اردو اکادمی کی طرف سے انعامات

دلی اردو اکادمی نے اردو کے مشہور و معروف ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر مرحوم کی ان کی اردو خدمات کے پیش نظر کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم دہلوی کو برائے اردو تنقید و تحقیق، جناب گلزار دہلوی کو برائے اردو صحافت، جناب شمیم جے پوری کو برائے اردو شاعری اور جناب زبیر رضوی مرحوم کو برائے بہترین استاد اردو میڈیم اسکول ۱۹۸۶ء کے لیے ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

## جدید اردو شاعری میں سانحۂ کربلا کا علامتی استعمال

غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" کا اردو کے دانشوروں اور نقادوں نے بحث انگیز قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے اردو تنقید میں اختلافی شاعری پر نئی جہت تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ کتاب کی رسم اجرا ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی نے انجام دی۔ افتتاحیہ کلمات کرنل بشیر حسین زیدی نے کہے۔ جلسے کی صدارت جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی۔ جلسے کا اہتمام سید نقی سکریٹری انجمن غالب اکیڈمی اور جناب ذہین نقوی نے کیا تھا۔ "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" میں ان علامتی ابعاد سے بحث کی گئی ہے جو اردو شاعری بالخصوص جدید شاعری کی نئی غزل اور نئی نظم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یوں تو پروفیسر نارنگ نے کربلا کے انسانی آفاقی تخلیقی استعمال کا سراغ میر تقی میر، ذوق و مومن اور داغ کی شاعری تک میں لگایا ہے لیکن یہ استعارہ اپنی پوری شان سے علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر کی شاعری میں نمایاں ہوا ہے۔ پروفیسر نارنگ کا خیال ہے کہ عہد حاضر میں سانحۂ کربلا اور اس کے تعلقات مرثیے کی روایتی ساخت سے بالکل ہٹ کر عام شاعری یعنی جدید غزل اور نظم میں نئی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ نمایاں ہو رہے ہیں۔ نارنگ صاحب نے وضاحت کی ہے کہ ایسی شاعری کا بڑا حصہ مزاحمتی ادب کی ذیل میں آتا ہے جو بیسویں صدی کی شاعری کا خاص رجحان ہے۔ جمالیاتی توسیع و تقلیب کے عمل سے گزرنے کے بعد اس میں ایک آفاقی شان پیدا ہو گئی ہے جس کا اطلاق عام انسانی صورتحال کی علامت صورت حال اور موجودہ عہد میں سماجی و سیاسی استبداد اور استحصال کے خلاف برسر پیکار ہونے کی مخصوص صورت حال پر بھی ہو سکتا ہے۔

اس جلسے میں لکھنؤ سے کاظم علی خاں اور ڈاکٹر ایس اشفاق، حیدرآباد سے ڈاکٹر امام رضی نقوی اور دہلی سے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر سادب رودولوی، منظر اعظمی، رشتی گلزار دہلوی، دلاور علی رہبانی، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر صبا اسعدی اور ڈاکٹر عصمت حسین نے اظہار خیال کیا اور پروفیسر نارنگ کی نئی کتاب کو اردو تنقید میں ایک نئی بحث کا آغاز قرار دیا۔

---

## مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے انعامات

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی اعزازی کمیٹی نے اس سال کے اکادمی اعزازات کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ تمام اعزازات اعزازی کمیٹی کی متفقہ رائے سے دیے گئے ہیں۔ ان اعزازات کے لیے آرا طلب کی گئی تھیں۔ موصول شدہ آرا کی بنیاد پر سولہ ادیبوں اور شاعروں کے ناموں میں سے کمیٹی نے فنکاروں کی طویل اور بے مثال ادبی خدمات کو دھیان میں رکھتے ہوئے جن اردو ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کو اعزازات کے لیے منتخب کیا ہے ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

۱۔ میر تقی میر کل ہند اعزاز برائے تخلیق: اختر الایمان، بمبئی۔

۲۔ نواب صدیق حسن خاں صوبائی اعزاز برائے تنقید: پروفیسر عبدالقوی دسنوی، بھوپال

۳۔ سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز برائے تخلیق: کوثر صدیقی، بھوپال

۴۔ سہا مجددی صوبائی اعزاز برائے تخلیق: حیتق برہانپوری، برہانپور

۵۔ سید محمد یوسف قیصر صوبائی اعزاز برائے تخلیق: قمر جمالی، بھوپال

۶۔ محمد علی تاج صوبائی اعزاز برائے نوجوان سال تخلیق کار: راحت اندوری، اندور

کل ہند اعزاز کے لیے گیارہ ہزار روپیہ اور صوبائی اعزازات کے لیے پانچ پانچ ہزار روپے کے ساتھ ساتھ توصیف سند بھی پیش کی جاتی ہے۔ اب تک جناب خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، منصور عثمانی، شعری بھوپالی، کیف بھوپالی، عنوان انصاری، مقصود عرفانی، حیتق حنفی اور وکیل بھوپالی کو کل ہند اور صوبائی اعزازات دیے جا چکے ہیں۔

## ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے کتابوں اور مسودات پر مالی امداد

ہریانہ اردو اکادمی کی پالیسی کے مطابق دو شعری مجموعوں، ایک افسانہ ناول / ڈرامہ، ایک تنقید / تذکرہ اور ایک گیر شری موضوعات پر انعامات دیے گئے جو ڈھائی ہزار روپیہ فی کتاب پر مشتمل ہیں۔

۱۔ شاعری میں پہلا انعام جناب بشیر بیتھو کو شعری مجموعے "حرف حرف" پر دیا گیا۔

۲۔ حقیقت فرماں اور گل اسپالی کی کتابوں بالترتیب "سورج کی حیال" اور "شبنم گل" کے برابر آنے پر انعام کی رقم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ۲۲۵ سے پہلی کتاب والوں مصنفین کو دینے کا اعلان کیا گیا۔

۳۔ افسانہ / ناول / ڈرامہ میں یہ انعام نسیم سیفی تیاگی کے افسانوی مجموعے "سدرۂ" کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۴۔ کتابوں پر چوتھا انعام حبیب الرحمان خاں میواتی کی کتاب "تذکرہ صوفیائے میوات" پر تجویز کیا گیا۔

مسودات برائے مالی امداد

۱۔ شعری مسودات میں جناب ادم کرشن ناقت کے شعری مسودے "ابو رنگ" اور نائب حید جبار کے شعری مجموعے "نشیب و فراز" پر مالی امداد منظور کی گئی ہے جو چار ہزار روپیہ سے زائد نہ ہوگی۔

۲۔ افسانہ / ناول / ڈرامہ کے تحت یہ امداد دو افسانوی مسودوں پر تجویز کی گئی ہے جن میں نشیر ایر کنٹوری کا "قدم قدم دوزخ" اور ہیرانند سوز کا "ساحل اور سیپ" ہیں۔

۳۔ تنقیدی مسودے پر بہتر رپورٹ نہ ہونے کے سبب امداد منظور نہیں کی جا سکی۔ البتہ میو قوم سے متعلق ڈاکٹر نارنگی کے مسودہ "مسلمات میو" پر برائے اشاعت مالی امداد منظور کی گئی۔

## دہلی اردو اکادمی کی اردو لغت کا اجرا

نئی دہلی چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے ۷۹ صفحات کی ایک اردو لغت کا اجرا کیا۔ اس لغت کو دہلی اردو اکادمی نے شائع کیا ہے اور یہ سال اس کی نظر ثانی کی جاتی ہے۔ جناب جگ پرویش چندر نے کہا کہ یہ لغت جس کو مکمل ہونے میں تین برس لگے ہیں، کتاب اردو داں طلبہ کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگی۔

## بچوں کا ادبی ٹرسٹ کا سالانہ جلسہ

نئی دہلی ٹرسٹ کی کاؤنسل کا سالانہ جلسہ کرنل بشیر حسین زیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ٹرسٹ کی سالانہ رپورٹ پیش کیے گئے نکتوں پر گفتگو ہوئی۔

ٹرسٹ ملک کی تمام اردو اداروں سے بچوں کے ادب کی ترقی اور بہتری کے لیے اشتراک عمل اور تعاون حاصل کرنے کی ایک بار پھر بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ چونکہ ٹرسٹ محسوس کرتا ہے کہ اردو میں بچوں کے اچھے ادب کی تخلیق پوری زبان کی بقا کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹرسٹ کو اداروں سے اپیل کرنی چاہیے کہ وہ ٹرسٹ کے تعاون سے بچوں کے ادب کی ترغیب و تربیت کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سیمینار، ورکشاپ اور تربیتی پروگرام منعقد کریں اور اس میں نوخیز ادیبوں اور پڑھنے والوں کو بھی شریک کیا جانا چاہیے۔

کاؤنسل نے فیصلہ کیا کہ ٹرسٹ اس امر کی کوشش کرے کہ اردو میں بچوں کے ادب کی مختلف شاخوں مثلاً سائنسی ادب، معلوماتی ادب، سائنس، ٹیکنالوجی، سائنس فکشن، اخلاقیات وغیرہ کے لیے ملک کی کچھ عظیم ہستیوں اور اداروں کے نام پر مستقل بنیادوں پر سالانہ انعامات قائم ہو جائیں۔ اس سلسلے میں جن ناموں اور اداروں کے ناموں پر انعامات قائم کیے گئے منظوری دی گئی وہ یہ ہیں:

۱۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، ۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، ۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، ۴۔ شفیق الرحمن قدوائی مرحوم، ۵۔ بیگم قدسیہ زیدی، ۶۔ رشید شروانی، ۷۔ فخرالدین علی احمد، ۸۔ جواہر لعل نہرو میموریل فاؤنڈیشن، ۹۔ سائوتھ ایشیا بک ٹرسٹ، ۱۰۔ غالب میموریل ٹرسٹ، ۱۱۔ بدم تری رچنا رنگوں والا، ۱۲۔ سید ناظر محمد سرال۔

اس کے علاوہ کچھ دوسرے افراد یا اداروں کے نام پر انعامات قائم کرنے کی کوششوں کی اجازت دی گئی۔ ٹرسٹ کے لیے کسی جگہ مناسب زمین کے حصول کی کوششوں کی تجویز کو منظوری دی گئی۔

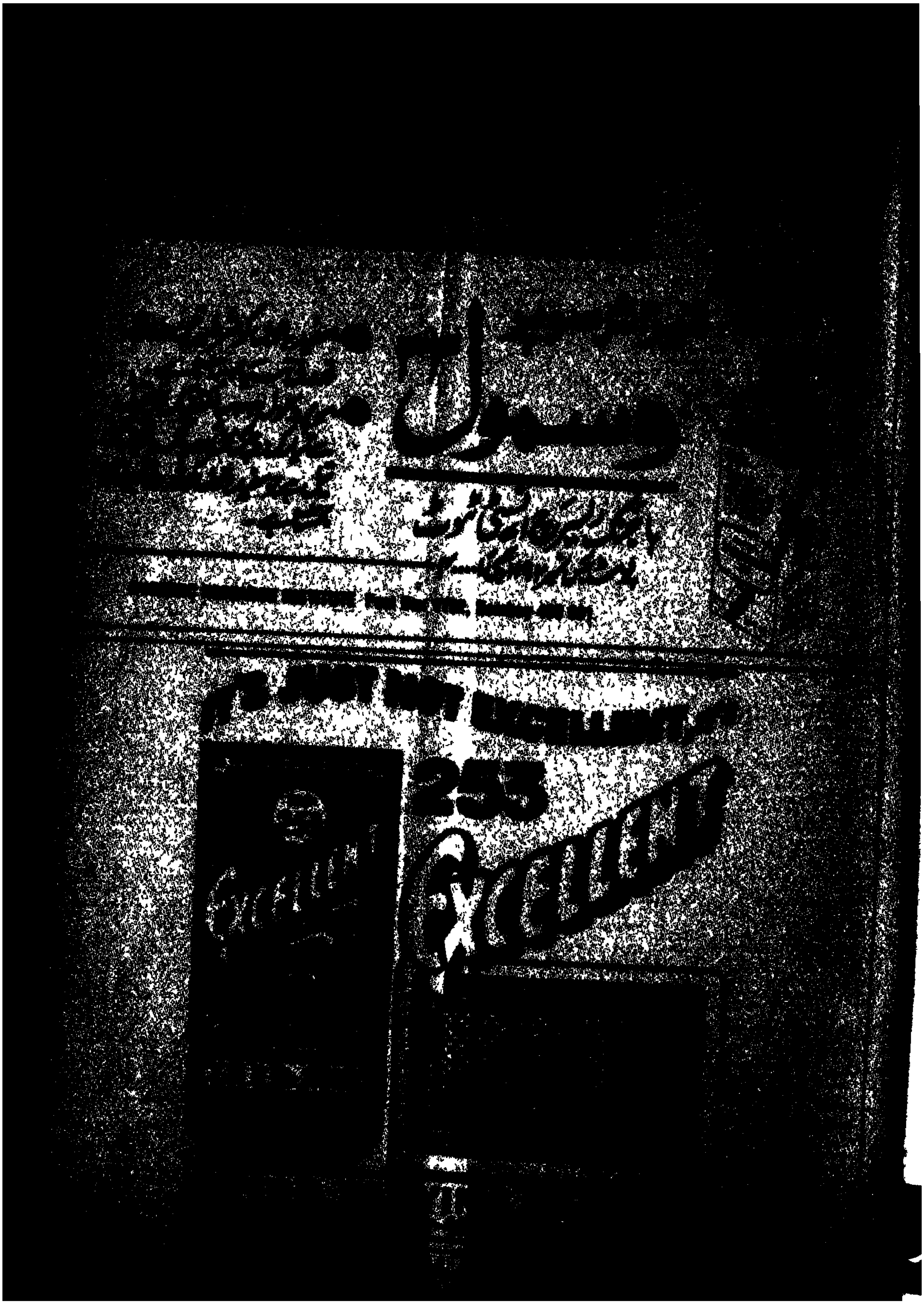
فیصلہ کیا گیا کہ قومی یکجہتی پر جو انعامی مقابلہ پچھلے سال کیا گیا تھا اور اس میں کم مسودوں کی شرکت کی وجہ سے انعامات نہیں دیے گئے تھے اس کا پھر سے دو بارہ اعلان کیا جائے۔

## اردو نیوز ایجنسی کا قیام

دہلی: اردو زبان و ادب کے مرکز شہر دہلی کی ادبی، تہذیبی، سیاسی، سماجی سرگرمیوں کو پوری طرح اردو دنیا میں پہنچانے اور دنیا بھر میں ہونے والی تخلیقی و تعمیری سرگرمیوں کی بر وقت اطلاعات اردو اخبارات کو فراہم کرنے کے لیے اردو نیوز ایجنسی کا قیام عمل میں آیا ہے۔

رابطہ قائم کریں۔
سید فاضل (پریس فوٹو جرنلسٹ)
بیورو اردو نیوز ایجنسی، ۲۳۲۹، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رفتار


253

... of Publication ISSUE No. 4 1987 Telephone No. ...99 04
(Publishing Date 27/28)
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. I. ... 14482/57

# بول ابول کے بعد دیپک قمر

## کا ایک اور شعری مجموعہ

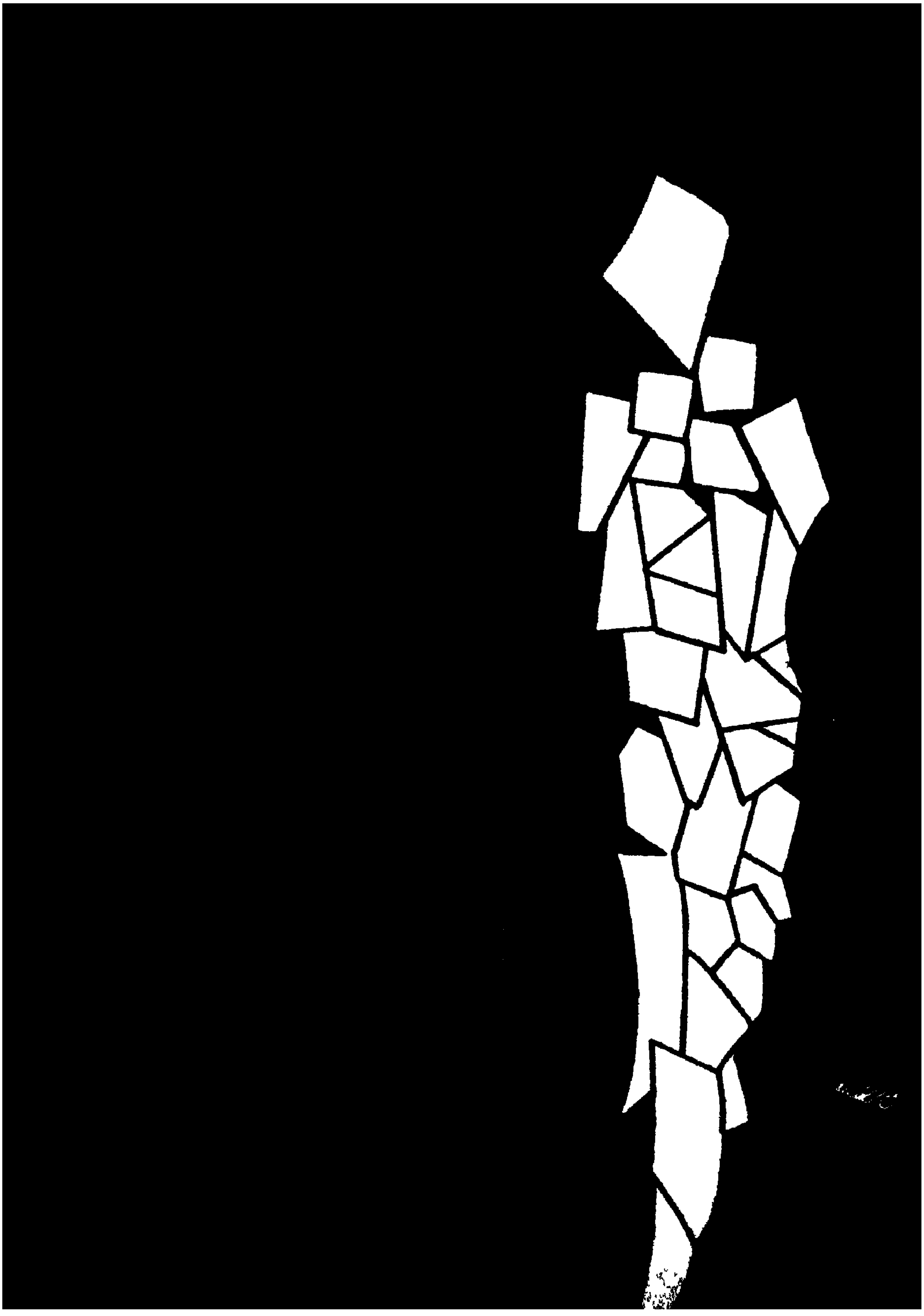
# انمول

شعری مزاج میں نیاپن ، اسلوب کی تازگی و اثر پذیری، سادہ
زبان کی نت نئی تخلیقی جہتیں ، فکر و جذبہ کی تہہ داری سے آراستہ
ایک خوب صورت قابل مطالعہ شعری مجموعہ
آپ کے شعری ذوق کی تسکین کے لئے

دیدہ زیب سرورق — معیاری کتابت و طباعت
۱۲۸ صفحات — قیمت چالیس روپے

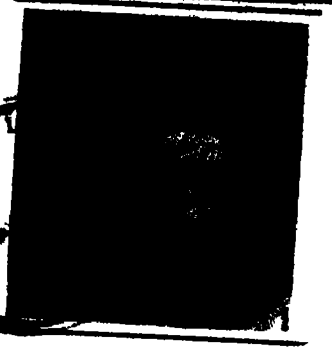
پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۱۸۵ - اولین ، میرٹھ چھاؤنی - ۲۵۰۰۰۱ (یوپی)





# فکر امروز



اس میں شک نہیں کہ آج اردو زبان کی عالم گیری وہمہ گیری ادارتی تعینات سے ماورا اور بالاتر ہے۔ ایک دکنی شاعر بھی ایک لکھنوی شاعر کی طرح زبان و محاورات پر حاوی ہے۔ ایک پنجابی شاعر بھی ایک دہلوی شاعر کی طرح فصیح انداز بیان میں غزل کہہ لیتا ہے۔ اور ایک کشمیری شاعر بھی ایک اکبرآبادی شاعر کی طرح معیاری فکر و نظم پر قادر ہے اس لیے اب ان اداروں کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی۔ لیکن میرے خیال میں ان اداروں کا قیام اب بھی ضروری ہے۔

محاورات کی تصحیح اور الفاظ کی تذکیر و تانیث کی سند کے لیے ہمیں کسی نہ کسی ادارۂ الخیال کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔ اور متروکات و مختارات کی تعین میں کسی نہ کسی ادارے کا حوالہ دینا ہی پڑے گا۔ میں اسے تقلید نہیں سمجھتا گو اس میں اساتذۂ سلف کی تائید ضرور ہے تاہم اجتہاد کے دروازے ہر شخص کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔ متروکات و مختارات کی جو فہرستیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں تنقیح و ترمیم کی گنجائش ہے۔ خصوصاً اس تحقیقی اور علمی دور میں آنکھیں بند کرکے لکیر کا فقیر بنا رہنا تجاہل عارفانہ ہے۔ اگر تنقید و تحقیق کی قوتیں زبان و محاورات کی تعین میں نئے نظریات پیدا کریں اور وہ قابل قبول بھی ہوں تو ممکن ہے کہ ہندستان کے تینوں ادارہ ہائے مخیلہ بے کار و معطل ہو جائیں۔ بصورت دیگر ان کی ضرورت اسناد کیلئے ہمیشہ باقی رہے گی۔ دستور الاصلاح

**سیماب اکبرآبادی**

# شاعر

اشاعت کا ۵۸واں سال

ماہنامہ


جلد ——— ۵۸
شمارہ ——— ۵
فون: ۳۵۹۹۰۲

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی



ہمیشہ یادگار رہنے والا مقام
اگست کرانتی میدان
آزادی کے بہادروں کا یہ عظیم مبارک مقام ہیں
پر گونجا تھا کبھی بیداری کا نعرہ "چھوڑو بھارت"
یہیں لگا تھا۔ باپو کا یہ فیصلہ بھی یہیں ہوا تھا۔
یہاں کی مبارک مٹی کو ماتھے پر لگائیں۔
آیئے ہم اپنے ملک
کو
طاقتور بنائیں
بھارت کی آزادی کے ۴۰ ویں سالگرہ کے دن۔ نیز جدید ہندستان کے عظیم معمار پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ کی دوہری خوشی کے موقعہ پر ملک بھر میں منائے جانے والے جشن کے سلسلہ میں بھارتی آزادی کی جنگ میں اپنی زندگی کی قربانی دے کر شہادت پانے والے سبھی ذات اور مذہب کے مجاہدین آزادی کو خلوص دل سے مبارکباد۔
محکمہ اطلاعات و روابط عامہ
حکومت مہاراشٹر

*

سرورق

نئے عہد کا حساس آدمی اور وقت

عمل

سلطان سبحانی

********

شمارہ نمبر ۵ ● ۱۹۸۷ء

# قارئین شاعر سے ایک گذارش

ملک کی ناگفتہ بہ صورتِ حال و انتشار اور غیر متوازن بڑھتی ہوئی گرانی نے زندگی کے ہر شعبہ کو بے طرح متاثر کیا ہے۔ روزہ مرّہ استعمال کی معمولی اشیاء کی قیمتیں بھی اپنے بنیادی دائرے سے باہر نکل گئی ہیں۔ یہ گرانی روز افزوں ہے۔

شاعر اپنی عظیم روایت کے تناظر میں ہندستان کا ایک اہم ترین ادبی رسالہ ہے جو ۵۰ ویں سال میں بھی متنوع معیاری تجربوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے لیکن اپنے بنیادی مسائل کو پھر بھی حل نہیں کر سکا ہے۔ آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ گذشتہ تین برسوں میں ہم نے بڑھتے ہوئے اخراجات کو ہر ممکنہ طور پر قبول کرنے کی بھرپور سعی کی لیکن چونکہ شاعر محض ایک علمی اور ادبی رسالہ ہے اور اس کی کاروباری یا تجارتی سطح نہیں کے برابر ہے اور سخت ترین حالات کا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے لہٰذا اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ شاعر کے بدلِ اشتراک میں معمولی سا اضافہ کیا جائے جو ہمارے معزز قارئین کے لیے بھی قابلِ قبول ہو سکے۔ چنانچہ اس تازہ شمارے سے شاعر کی نئی شرح درجِ ذیل ہوگی:

| | |
|---|---|
| ○ زرِ سالانہ | پچاس روپے |
| ○ عام شمارہ | پانچ روپے |
| ○ معاونین سے | سو روپے [ایک سال کے لیے] |
| ○ لائبریریوں سے | ساٹھ روپے |
| ○ تاعمر خریداری | ایک ہزار روپے |
| ○ غیر ممالک سے | ساڑھے تین سو روپے |

ہمیں یقین ہے کہ شاعر کے باذوق قارئین و معاونین اپنے عملی تعاون سے بدستور نوازتے رہیں گے اور مستقبل میں شاعر کے جو خاکے ہیں اور جو ضخیم نمبروں کے پروجیکٹ ہیں ان کی تکمیل کے لیے ہمارا حوصلہ بنیں گے۔

## شاعر کے سالانہ ممبران سے:

جن ممبران شاعر کی مدتِ خریداری اپریل کے شمارے کے ساتھ ختم ہو گئی ہے وہ تجدیدِ خریداری کے طور پر تبدیل شدہ زرِ سالانہ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا خط لکھ کر دفتر کو ہدایت کریں کہ ان کے نام وی پی کر دیا جائے۔

جو نئے خریدار اپنا زرِ سالانہ چالیس روپے بھجوا چکے ہیں ان سے مزید رقم نہیں لی جائے گی۔

اپریل کے شمارے تک جن خریداروں کی طرف بقایاجات ہیں وہ نئی شرح کے ساتھ اپنی رقمیں ارسال فرمائیں۔

کتابت، طباعت، کاغذ، بائنڈنگ، ڈاک خرچ اور رسالے کے دیگر ضروری امور میں غیر معمولی اضافے ہوئے ہیں، ایسے میں وی پی کی واپسی، بر وقت زرِ سالانہ ارسال نہ کرنا اور بقایاجات کی عدم ادائیگی سے شاعر کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

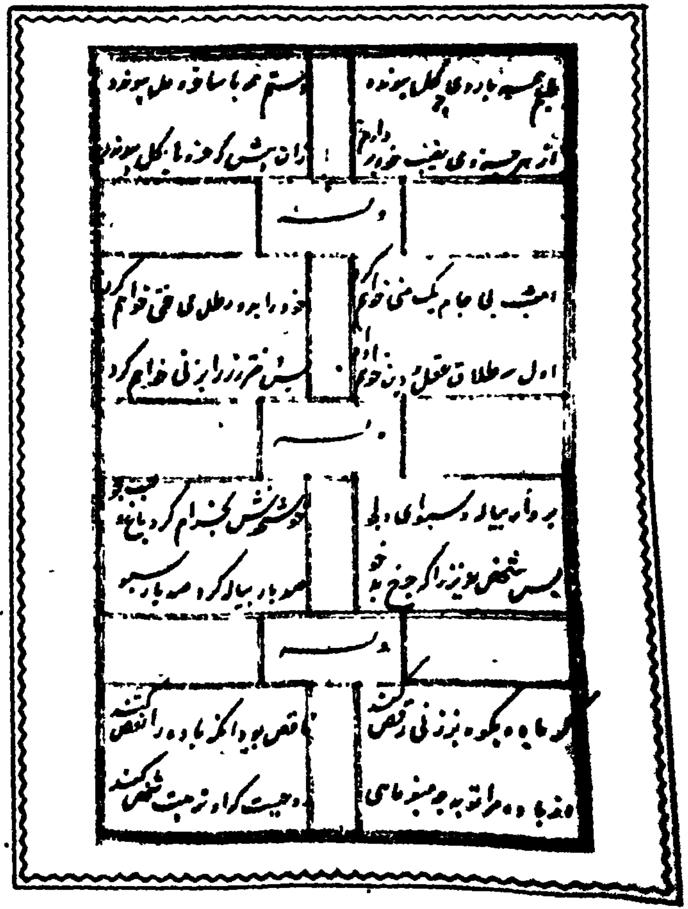
اپنے حلقۂ احباب میں شاعر کو متعارف کروائیے۔ زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کیجیے۔

عطیات و اشتہارات ارسال کیجیے۔

ہمیں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازیے۔

[illegible]

[illegible]



رباعیاتِ خیام کے نسخۂ اصلی متن سے ایک عکس۔ اسی قدیم نسخے کی اساس پر خیام کی رباعیوں کا یہ ایڈیشن ترتیب دیا گیا۔

— ۲۶۹ —

این چرخ چو طاسی است (۱) نگون افتاده
در وی همه زیرکان زبون افتاده
در دوستی شیشه و ساغر نگرید (۲)
لب بر لب و در میانه (۳) خون افتاده

— ۲۷۰ —

بنگر ز صبا دامن گل چاک شده
بلبل ز جمال گل طربناک شده
. در سایهٔ گل نشین که بسیار این گل (۴)
در خاک فرو ریزد و ما خاک شده (۵)

---

(۱) حه ، این تاسهٔ چرخ بین . (۲) جه ، در دوستی صراحی وجام نگر . (۳) طه ، در میان ۰ (غ) . (٤) طه ، حین باده خوریدکای ساگل کزباد . نو ، در سایهٔ گل نشین که بس گل که زباد . (٥) طه ، برخاک فروریزد و ماخاک شده . نو ، دو خاک فرورفته و باخاک شده . نک ، وین ، از خاک برآمدست و برخاک شده . از تمام اینها متن صحیح تر ومضمونش عالی تر است .



عمر خیام [پ: ۴۱۰ھ — م: ۵۱۶ھ] کی رباعیوں کا مجموعہ "رباعیات حکیم عمر خیام" مرتبہ ڈاکٹر فریدرخ روزن (برلن) مطبوعہ ۱۳۰۴ھ کے صفحہ کا عکس۔

# چہرہ چہرہ یاد ہیں



قتیل احمد آبادی، حکیم الدین اور ل ۔ احمد اکبر آبادی
۹ اپریل ۱۹۴۵ء کی ایک یادگار تصویر ۔

THE IDARA-I-TAHQIQAT-I URDU

PATNA-4

۲۰ اگست ۸۲ء مشفق مکرم آپ کا خط ملا۔ تحقیق کے جس شمارے میں آپ کا مقالہ ہے وہ ابھی نکلا ہے [illegible]

کتاب کا تبصرہ بھی ہے اور یہ تبصرہ اصلاً میں دو کتابوں (تذکرہ سرور، اور [illegible] کہانی) کا ہے [illegible] جگہ کی کمی۔

آپ کی کتاب کا تبصرہ شمارہ ۱۳ میں [illegible] ہوگا [illegible]

آپ کا مضمون [illegible] زبان میں [illegible] دیکھا، [illegible] آپ [illegible] نظر آتی ہے

جلیل کی عبارت [illegible] سبق آموز ہے۔ [illegible] ملاقات [illegible]

[illegible] ایک [illegible] کتاب [illegible] آپ نے دیکھی [illegible] معیار [illegible]

میں ایک عکس چھپا تھا [illegible] اردو ادب کی تصویر [illegible]

[illegible]

[illegible] لکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ [illegible] مخلص عبدالودود

قاضی عبدالودود [پ: ۱۸۹۷ء - م: ۱۹۸۴ء] بنام ابو محمد سحر

۲۶/۳

[illegible]

[illegible] موضوع [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] کتابیں [illegible]

[illegible]

[illegible] موضوع [illegible]

نیاز

نیاز فتحپوری [پ: ۱۸۸۴ء - م: ۱۹۶۶ء] بنام ابو محمد سحر

دستور العمل جلال بے کمال

یار دلدار ہر لفظ اوس یا وہ کا معشوق کرنا جانان جانا ہر کا
استعمال بدون مضاف الیہ ہو تکلی جا ستان کان خون سکون نون
وہی جبین سین شین جنین کا حالت انفراد میں باخفائی نون
لانا متروک ہے لفظ سدا متروک ہے وصلت وشب وصلت کی جگہ وصل
باست کا محل قافیہ متروک ہے دن بدن کو بصورت کون تشخص کا استعمال کو نیز
کو بصورت کو بشکل کی جگہ پر ہوا تو بھی کے الف واو یا کا گرانا
مصارع میں بھی متروک ہے تا نام کو لفظ عربی و فارسی کی الف واو یا کا گرانا
مفرد مجہول کی گردش متروک ہے گیا کی جگہ پر لینا اوس سوا تم سو کا استعمال
ہمیں سوا تمہا جیسا کی مقام پر تجانی کیا جانی کی مقام پر متروک
اہل کا اطلاق شخص واحد پر اسطرح کرنا فلاں شخص اہل مقصد یا اہل دل
ہی متروک ہے جمع مخالف جانند جیبو قربو عزیز و یاروں کی لفظ ای کا معشوق کرنا
متروک ہے سوائی یار قاتل ساقی زاہد ناصح ولفظ فلک صبا ہمہ مخاطب
[illegible] کی اور لفظ کا محل خطاب میں لفظ ای ویا حضرت وجناب
لانا متروک ہے لیکو کا واو گرانا اور نون اعلان کا اعلان متروک الا استعمال تم ہی
ہم ہی تم ہی یہ ہی وہ ہی [illegible] ہمیں تمہیں ہمیں یہی وہی
ملک تک کے مقام پر متروک ہے اونہوں جنہوں کا استعمال کا سی کو
پیچھے ساتھ متروک ہے لی کی ساتھ مختار کبھی لیجی دیجی وغیرہ کیجیو دیجیو
لیجیو وغیرہ بسبب ثقل کی ان وزن پر متروک ہے فاعلن کی وزن پر مختار

آئیو دکھائیو جائیو سنائیو اوٹھائیو وغیرہ متروک ہے اور ترجمہ واو
عاطفہ کا مختار ہے یاں وہاں فعل وفع دونو وزن پر مختار جلانا
دکھلانا سکھلانا بٹھلانا مختار ہیں کی ہی کا گرانا ابتدا میں
مصرع کی مہو خورہ درمیان ہر جگہ مختار ہے جبین ہمیشہ زمین
دو ہیں تمہیں ابرو کمان ہی لستان خوش جان ہر زبان نمک دان
وغیرہ اس قبیل کی الفاظ کا حالت انفراد میں باخفائی نون
واعلان نون دونو طرح لانا مختار ہے نواہدا یا ہما واعتقاد
وغیرہ کا استعمال متروک ہے اگر آگر کا جگہ پر متروک ہے تخفیف رکا
جو مگر کے معنی پر آتا ہی متروک ہے بسمل بمعنی ذبح متروک ہے ذبیح مختار
مگر اگر جو حرف شرط میں دونوں کا استعمال مختار کم حوصلہ ہی ایا یہ
غالب ترہ سایہ وغیرہ اس قبیل کی جملہ الفاظ کا مد یا صحرا کی قافیہ
میں الف کی ساتھ لکھنا مختار ہے کا جگہ تخفیف حروف معدم
متروک ہے اور نیا لکھا بچھایا تخفیف حرف دوم دو
طرح مختار کوئی مفعلن وفاع فعل کے وزن پر مختار ہے کی وزن پر
متروک ہے روئی سوئی مفعلن زہد پارہ کی وزن پر مختار فعل کی
وزن پر متروک ہے بچھا ہو ان کا استعمال بجائی بستان متروک
خورد کا استعمال بجائی خود متروک ہے کا استعمال متروک ہے کا
استعمال ہر ایک کی جگہ مثلاً اس طور پر کہ وہ رات آیا ہما یا گیا بیمار و
لفظ بن کا استعمال متروک

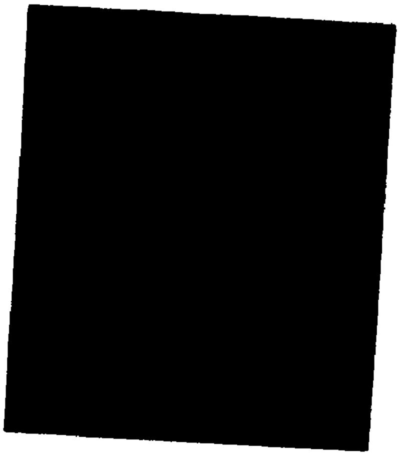
دستور العمل جلال بے کمال ۔ تحریر: امیر ضامن علی جلال لکھنوی
[کتاب خانۂ مسعود حسن رضوی لکھنؤ] مرسلہ: نیر مسعود



## اختر سعید خاں

قصۂ حشر پہ حیرت کیا ہے
ہم نے دیکھی ہے قیامت کیا ہے
رُخ پہ یہ رنگِ ندامت کیا ہے
چارہ گر یہ تری حالت کیا ہے
اک ذرا دیکھ مری آنکھوں میں
زندگی تیری حقیقت کیا ہے
تم سے پیمانِ وفا باندھا ہے
اور اندوہِ محبت کیا ہے
دل کو خوں کرنا تو آتا ہے ہمیں
دل کے بہلانے کی صورت کیا ہے
ہم کہ خوابوں کے مسافر ٹھہرے
اور خوابوں کی حقیقت کیا ہے
کفِ قاتل سے لہو پوچھتا ہے
مجھ سے لوگوں کو عداوت کیا ہے
گھر جلا اس کا بدل دے دیجیے
چھوڑیئے جان کی قیمت کیا ہے
ہم ہیں اور دانشِ ماضی کا عذاب
عہدِ نو تیری بشارت کیا ہے
سرِ شوریدہ سلامت اختر
بارشِ سنگِ ملامت کیا ہے

● اندرونِ اقوارہ، بھوپال (ایم۔پی)



## احمد رئیس

شوخ ہوا کو ہر ہر لکھنا، لکھتے رہنا
رنگ برنگے محضر لکھنا، لکھتے رہنا

سب کے چہرے خاک برابر، خاک لگیں
اپنا پیکر، پیکر لکھنا، لکھتے رہنا

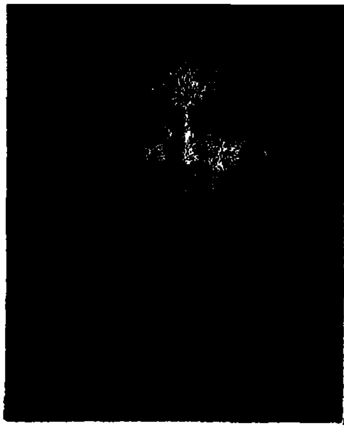
رنگ برنگے موسم کی دیواروں پر
ہنستے بستے منظر لکھنا، لکھتے رہنا

قید نہ کرنا ٹوٹی، اکھڑی سانسوں کو
دل کو کبھی گاگر لکھنا، لکھتے رہنا

دھیان سے پڑھنا، آتے جاتے لمحوں کو
وقت کو سچا محضر لکھنا، لکھتے رہنا

لفظ ہی خوشبو، گہنے، زیور، سرمایہ
لفظ چمکتے دل پر لکھنا، لکھتے رہنا

● ۲-ڈی - ۴۵/۲۶ ناظم آباد - کراچی (پاکستان



ڈاکٹر خورشید سمیع
ایم ۔ آئی ۔ ٹی ۔ مظفر پور (بہار)

# نئی کہانیاں - ایک بازدید

تمام فنی کاوشیں اپنے اظہار کا عمل ہیں۔ مگر فن بہرحال ایسے نقاب کی صورت ہے جس کے پردے میں فن کار خود کو چھپا رہا ہے یا چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لیے فن زندگی کی ایسی تصویر یا ایسا التباس ILLUSION ہے جس سے فن کار گریز یا فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فن کار کا تجربہ دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ زندگی کا تجربہ اور فن کا تجربہ۔ دونوں ہی سطحوں پر داخلی اور خارجی عوامل ہیں۔ فرد کی انفرادیت اور سماج کی اجتماعیت ہے۔ مواد اور ہئیت ہے۔ اب فن کیا ہے؟ اور کہاں پر ہے؟ میری رائے میں فن میں دوئی کی گنجائش نہیں کہ داخلیت اور خارجیت، مواد اور ہئیت، انفرادیت اور اجتماعیت کا وحدت میں پرو دینا ہی فن ہے کہ فن دراصل اکائی ہے اور ایسی اکائی جس میں متضاد جہتیں سمٹ کر یک جہتی بن جاتی ہیں اور ان کے درمیان رشتہ وہی ہوتا ہے جو جسم اور روح کا ہے کہ اگر فن زندہ ہے تو اس میں روح ہوگی اور اگر روح ہوگی تو پہلو میں دھڑکتی ہوئی سنی جا سکے گی لیکن یہ دھڑکن اتنی بلند بانگ نہ ہو جائے کہ برہنہ گفتاری وجود میں آجائے اور غالبؔ کا یہ شعر سنانا پڑے کہ ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی — حدیث خلوتیاں جز برمز و ایما نیست [غالبؔ]

مگر ایسا بھی نہ ہو کہ جسم کے قالب میں روح گھٹ گھٹ کر دم توڑ دے کہ مردہ اور بے جان جسم کو ہم زندہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ افسانہ نگاری کا المیہ یہ ہے کہ کبھی تو افسانہ اس حد تک موادی، خارجی اور اجتماعی ہو جاتا ہے کہ وبالِ جان بن جاتا ہے اور کبھی اتنا ہئیتی، انفرادی اور داخلی ہو جاتا ہے کہ معمّے کی صورت فہم سے بالا ہو جاتا ہے۔ ذاتی نام و نمود، وقتی چکاچوند، گروپ بازی اور ہنگامے بازی سے قطع نظر افسانہ وہی زندہ رہے گا جو فن کے معیار پر پورا اترے اور جس میں وحدت فی الکثرت کی صورت ابھرنے والا انداز ہی نظر آئے۔ وحدتِ مضمون، وحدتِ فن۔ غرض وحدت اور اکائی کی صورت وجود میں آنے والا انداز ہی فن ہے کہ بقول میرؔ ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا — وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا [میرؔ]

اصل بات بہرحال یہی ہے کہ شاعری یا افسانہ نگاری یا کسی بھی پارۂ فن میں اصل میں شخصیت ہی بولتی ہے اور شخصیت تمام تضادات کے جذب کر لینے کے باوجود وحدت کی حامل ہوتی ہے۔

نئی کہانیوں کی معراج یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ نظم ہو گئی ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کہانی نے اپنی صنفی حیثیت اور شناخت کھو دی ہے۔ ہمارے بہت سے نئے افسانہ نگار، شعراء اور نقاد اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "بے حیثیتی اور بے شناختی" ہی افسانوں کی ترقی بے معراج ہے اور اس طرح کے نئے افسانہ نگار سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں کو چھو چکے ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر افسانوں کا باب نامکمل ہے ایسے کم دماغ اور کم علم حضرات شاید کبھی نہیں سمجھ سکیں گے کہ کہانی کسی بھی دور کی ہو، اس کی کچھ بنیادی خصوصیات بہرحال ہیں جن کے سبب کہانی واقعی کہانی ہوتی ہے۔ ان بنیادی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے "کہانی پن" جس کے فقدان کے سبب بہت سی نئی کہانیاں کہانیاں نہیں ہیں۔ ایسے ہی افسانہ نگاروں کا قاری سے رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور ترسیل کا مسئلہ بھی اسی قطع تعلق کا لازمی نتیجہ ہے۔ کہانی میں کہانی پن ہی قاری کی دلچسپی اور تجسس کا باعث ہوتا ہے۔ اور کہانی پن، کہانی کو تہہ دار اور کئی سطحوں کا حامل بناتا ہے۔ قارئین کا حال ب

یہ ہے کہ گویا کہ "بقدرِ پیمانۂ تخیل" تفہیم ہو رہی ہے۔ مزید برآں اب نئے افسانہ نگاروں کو ہر جگہ یہ کہتے پھرنے کی عادت پڑ گئی ہے کہ نئی کہانی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ادب کی جمہوری قدروں سے مکمل انکار اب شیوۂ عام ہے جب کہ سچ یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں، نئے افسانہ نگار فنی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کرتے پھر رہے ہیں۔ افسانوی ادب میں جمود اور تعطل پیدا کرنے والے اور جدید کہانیوں کو خراب اور برباد کرنے والے حضرات صنفی امتیازات پر بہت زور دیتے ہیں۔ اور زور دینے کی بات ہے تخلیقی تجربہ، پیرایۂ اظہار، غیر متعلق اور متضاد باتوں میں اپنے زورِ تخیل سے ایک رشتہ نکال لینا، اور کائنات کے تمام مظاہر کو اکائی کی شکل میں دیکھنا عصری حیثیت سے تخلیقات میں تازگی پیدا کرنا، نئی علامتیں، نئے تلازمے، نئی لفظیات سے اپنی تخلیقات کو ہم مزاج کرنا، یہ سب باتیں اسی وقت ممکن ہیں جبکہ مزاج میں وسعت، فکر میں گہرائی، تہہ در تہہ معنویت اور خیالات میں بالیدگی اور وہی افسانہ نگار کوئی الگ یا نئی بات کہنے کی جرأت کر سکتا ہے جس کے پاس واقعی کچھ ہو۔ قابلِ توجہ افسانہ نگار واقعی بہت کم ہیں ورنہ اکثر افسانہ نگار اپنی ذہنی کم مائیگی اور مستعار لی ہوئی جدیدیت اور تقلید کے بوتے پر جدیدیت کی فہرست میں شامل ہونے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ قارئین کا حال یہ ہے کہ آج بھی نئے افسانوں کی زبان سے اور اس کے مزاج سے لوگ مانوس نہیں ہیں۔ ایک سہل نسخہ یہ ہے کہ مغربی ادیبوں اور نقادوں کے اقوال جا اور بے جا سمجھے بغیر رکھ دیے جائیں اور ان کے حوالے سے تعریف کر دی جائے اور ایک خارجی پیکر اور ہیئت کی ایک ادھوری تصویر دکھا دی جائے کہ یہ کام تو عرصۂ دراز سے لوگ کر ہی رہے ہیں مگر میں ذرا دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہوں کہ کہانی کی روح تک رسائی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ کہانی اکائی ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی اور غیر مربوط کیوں ہے اور پھر اس کے پڑھنے سے کیوں قلب پر کوئی تاثر مرتسم نہیں ہوتا کہ کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا تاثر اور ایسا تجزیہ جو اس راز تک پہنچا دے کہ آخر کہانی کو تخلیق کا امتیاز کیسے ملا؟ ۔ اب ایک سوال کہ اگر نئی کہانی اب نظم بن گئی ہے تو اس میں وہ لطافت اور جمالیاتی صفت کیوں نہیں آتی جو اس نظم یا کہانی میں ہے۔

میں بند پر چل رہا ہوں / میرے ساتھ ساتھ جہلم بھی چل رہا ہے / ہم دونوں مسافر ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں / جس دن میری ماں نے مجھے جنم دیا میں بہت کمزور تھا / جس دن چشمہ ویری ناگ نے جہلم کو جنم دیا وہ بھی بہت کمزور تھا / مگر وہ آگے چلا اور اس میں ندی نالے آکے ملتے چلے گئے / میں آگے چلا اور مجھ میں رات دن آکے ملتے گئے / پھر ہم دونوں زندگی کی چٹانوں پر گھسٹتے گئے اور حالات کی کھائیوں / میں آبشار بن کر گرے / ہم نے کھیتوں کو سیراب کیا اور پھولوں کی خوشبو سونگھی / ہم نے شہروں کا کوڑا کرکٹ اٹھایا اور اس کا تیزاب اپنے سینے میں / گھول لیا اور انسان کی مایوسی کی طرح گدلے ہو گئے / ہم نے لوگوں کے درمیان پل باندھے اور کشتیاں چلائیں اور پانی کے / ہاتھوں سے مصافحے کیے اور ہم ساری دنیا پر پھیل گئے / جہلم ایک انسان ہے / انسان ایک دریا ہے / دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان دونوں کے ساتھ رات بھی / چلتی ہے"۔

[ دسواں پل ———— کرشن چندر ]

یہاں ایک مخصوص فضا ملتی ہے اور یہی فضا پلاٹ ہے۔ فطرت کا شدید احساس اور انسان اور فطرت کے رشتوں کو کائنات کے وسیع تر تناظر میں پیش کرنے کی کوشش اور زبان اور بیان کا حسن ۔ یہ سب مل کر اس تخلیقی فضا کو جنم دیتے ہیں جو کرشن چندر کا امتیازی وصف ہے اور ان کی انفرادیت بھی۔ محمد حسن عسکری نے کرشن چندر کے سلسلے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

فطرت کا شدید احساس، انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو، دنیا کے ظلموں کے خلاف بغاوت، انسانوں کی روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت، ان کے مصائب پر غم کھانا، دنیا کے دکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش، ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش، حسن اور حقیقت کی جستجو۔۔۔ اگر رومانیت سے یہ مطلب لیا جائے تو میں کہوں گا کہ کرشن چندر کی رگ رگ رومانی ہے اور وہ اس رومانیت کی اردو میں عظیم ترین مثال ہیں"۔

[ اردو ادب میں ایک نئی آواز ۔ محمد حسن عسکری، کرشن چندر نمبر ۔ ماہنامہ شاعر بمبئی ۔ ص ۲۰۷ ، سنہ ۱۹۶۷ء ]

میں طوالت کے خوف سے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی وغیرہ کے بابت تفصیل سے نہیں لکھ سکوں گا کہ مضمون کی ضخامت کا مسئلہ بھی ہے لیکن یہ کہہ دوں گا کہ "لاجونتی"، "گھر میں بازار میں"، "گوادنیشن"، "ہم دوش"، "پان شاپ"، "چیچک کے داغ" اور "بیگارِ خدا" اور رماضی کی تمام کہانیاں کسی نہ کسی عنوان سماج کی ان بنیادی حقیقتوں کو ابھارتی ہیں، جن میں طبقاتی نوعیت کا گہرا شعور اور ادراک شامل ہے۔ اسی شعور کو ہمارے نئے افسانہ نگار بری طرح نظر انداز کر رہے ہیں جب کہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں زود یا بدیر اسے ہی مشعلِ راہ بنانا ہوگا۔

بہرحال! ان موضوعات سے الگ ہٹ کر میں براہِ راست قرۃ العین حیدر کی بات کرتا ہوں اس لیے کہ قرۃ العین حیدر نے جس روش کو اپنایا وہی اب طرزِ بیاں ٹھہری ہے کہ اگر نئی افسانوی روایت انتظار حسین سے شروع ہوتی ہے اور سلام بن رزاق تک یہ المیہ پہنچ جاتی ہے تو پھر انتظار حسین تو ایک بیج کا نام ہے اس لیے کہ انتظار حسین کے ڈانڈے قرۃ العین حیدر سے ملتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں وقت ایک ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ تسخیر قوت ہے اور اسی کا تسلسل ہی "آگ کا دریا" کا مرکزی پہلو ہے مگر قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ماضی اور حال تک کی دنیا کو اپنی نظروں سے دیکھا اور دکھایا ہے اور اپنی ذات کی نفی نہیں ہونے دی کہ یہ بات صرف "آگ کا دریا" تک محدود نہیں بلکہ ان کی نمائندہ کہانیوں میں جیسے "پت جھڑ کی آواز" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں بھی موجود ہے اور قرۃ العین حیدر سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" اور کسی حد تک جیلانی بانو کا مشہور ناول "ایوانِ غزل" بھی اسی ڈگر پر گامزن ہیں بات یہاں تک تو ٹھیک تھی اس لیے کہ جیلانی بانو نے "موم کی مریم" جیسی خوبصورت کہانی لکھی۔ اور پھر بعد میں "بند دروازہ" میں عورت کے احتجاج اور غم و غصہ کی ملی جلی کیفیت اور اپ سٹارٹ طبقہ کی جان دار پیش کش کی اور قرۃ العین حیدر سے الگ ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی اور اس میں اپنے عہد کی پیش رو بنیں اور ادھر قرۃ العین حیدر نے بعد میں "آخرِ شب کے ہم سفر" میں اپنے ہی وضع کردہ اسلوب کو دوسری جہت سے پیش کیا ہے۔ مگر انتظار حسین نے اس پردیس کو الٹ دیا اور حقیقت کو بدل بدل کر داستانوں کی شکل دے دی کہ ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ "آگ کا دریا" لکھ کر قرۃ العین حیدر نے جب فراغت پائی تو پاکستان سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی کہ قرۃ العین حیدر نے موجودہ پاکستان کی جڑیں اور تہذیب کو ہندو اور بدھ روایات اور دورِ وسطیٰ کی مشترکہ ہند مسلم تہذیب میں تلاش کیا ہے اور ظاہر ہے مذہبی علاحدگی پسندی پر ٹکا ہوا معاشرہ اسے کسی صورت قبول نہ کر سکا لیکن "آگ کا دریا" کے بیس برس بعد انتظار حسین نے "بستی" میں اس فلسفیانہ شعور کو حاصل کیے بغیر عام جذباتی سطح پر اپنی جڑوں کی تلاش کی فکر میں اسی آگ کے دریا کو پھر کھنگال ڈالا۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین دونوں کی تخلیقی کاوشیں عزاداری کے استعاروں اور کربلا کی روایات سے وابستہ ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر نے تو آگ کا دریا پار کر لیا اور "کارِ جہاں دراز ہے" میں الجھ گئیں جب کہ انتظار حسین نے "آخری موم بتی" کا المیہ پیش کیا اور پھر اسی المیے کو پھیلا کر "آخری آدمی" اور "شہرِ افسوس" تک پہنچا دیا۔ معاملہ صرف یہ ہے کہ ہند و پاک یا پاک و ہند کی قدیم ترین تہذیبوں میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کی مہم دونوں ہی نے چلائی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے گرچہ اپنی تہذیب کا رزمیہ اور بیانیہ انداز برقرار رکھا اور تاریخی حقائق کے پیشِ نظر مذہب کو بہ قدرِ ضرورت استعمال کیا جب کہ انتظار حسین نے پورے کے پورے مرحلے کو مذہبی تعینات میں بدل کر اس میں غم و اندوہ کا پہلو اجاگر کیا اور اس طرح رزمیہ اور بیانیہ کو مرثیہ بنا دیا لیکن اس داستانوی فضا میں انتظار حسین کے یہاں ماضی کو حال سے منقطع کر دیا گیا اور پھر وقت کے تسلسل میں ایک مکمل تہذیب کے تدریجی ارتقا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے عجیب وضع دیدی گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ماضی سے حال تک کو جوڑا ضرور ہے اور آج کو گزرے ہوئے کل کی توسیع قرار دیا ہے اور ان کرداروں کو پہچانا جو ہمیں آج کے معاشرے میں نظر آتے ہیں کہ آج کی تہذیبی فضا قدیم ثقافتی فضا کی توسیع ہے مگر قرۃ العین حیدر کے یہاں ماضی پرستی نہیں اور وہ ہی ژرف نگاری ہے جو ایلیٹ کے اس بند میں ہے ؎

THE PRESENT AND TIME PAST
ARE BOTH PERHAPS PRESENT IN THE FUTURE

**AND TIME FUTURE CONTAINED IN TIME PAST**
**IF ALL TIME IS ETERNALLY PRESENT**
**ALL TIME IS UNREDEEMABLE - ELIOT, T.S.**

جب کہ انتظار حسین نے ماضی میں ہی پناہ لینے کی روش اختیار کرلی ہے کہ ان تمام باتوں میں ان کی قدامت پرستی ہی جانی مضمون۔ ہے کہ بقول خود اصلاحی روایت ہو یا ہندو روایت میں بہرحال قدامت پسند ہوں"۔ ایسی حالت میں انتظار حسین کی کہانیوں کو دورِ حاضر پر منطبق کرنا بے سود عمل ہوگا کہ انہوں نے اپنے عہد کو لکھا ہی کہاں ہے؟ اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب جڑوں کی تلاش کے واسطے سے ہی اس لیے اپنے دور کے خارجی تجربوں اور داخلی اضطراب کی عکاسی کی تلاش کم سے کم انتظار حسین کے یہاں تو فضول ہے۔

مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس داستانوی فضا اور اس داستانوی اندازِ بیان کے سبب ہمارے لیے نئے افسانوں میں ایک تبدیلی رونما ہونے لگی اور بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے انتظار حسین کے اس رنگ کو اپنانے کی کوشش کی اور مقلدین کی ایک جماعت وجود میں آگئی یہاں تک کہ بعض افسانہ نگاروں نے بھی جن کا اپنا الگ رنگ رہا ہے بعض جگہوں پر انتظار حسین کی تقلید کو پسند کیا ہے۔ تمثیلی طور پر انور سجاد کی کہانی "لو اسٹوری" غیاث احمد گدی کی کہانی "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" اقبال مجید کی کہانی "پوشاک" اور سلام بن رزاق کی کہانی "ندی اور بھوگ" میں یہی مخصوص انداز ملتا ہے۔ کسی حد تک "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" میں سریندر پرکاش نے بھی یہی روش اپنائی ہے۔ جب کہ لطف تو یہ ہے کہ انور سجاد نے "کونپل" جیسی کامیاب کہانی لکھی ہے جو پاکستان کی سیاسی اور سماجی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے اور بھرپور طور پر۔ اور پھر اس کے علاوہ ان کے مجموعے "چوراہا" میں جو مجموعی فضا ملتی ہے وہ نئے افسانوں کی فضا معلوم ہوتی ہے۔ داستانوں کی نہیں۔ کہ انور سجاد واقعی افسانہ نگار ہیں، داستان گو یا قصہ گو نہیں کہ انہوں نے تجربے کے طور پر اپنی بعض کہانیوں میں فلموں کی تکنیک تک کو استعمال کیا ہے مگر وہ بعض مختلف اور بظاہری طور پر غیر متعلق مناظر سے بھی کہانیاں اس طرح بُن لیتے ہیں کہ ان غیر متعلق مناظر کے درمیان بھی ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہاں! اس کے علاوہ انور سجاد کے وہ افسانے جو مختلف بیماریوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں، قابلِ التفات ہیں کہ ان میں ان لوگوں کا بیان ہے جو لمحہ لمحہ منتشر ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ خود کو مجتمع کرنے کی کوشش میں تو ضرور لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس ٹریجڈی میں اکثر حقیقت نگاری نکل پاتے ہیں ورنہ اکثر حالتوں میں خود افسانہ نگار منتشر ہونے لگتا ہے اور منتشر ہوتے ہوئے خود کو مجتمع کرنے میں الجھ جاتا ہے کہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرتے کرتے اکثر حالات میں ڈاکٹر خود بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ شکر ہے انور سجاد اس مرحلے سے بھی کامیابی سے نکل گئے۔

غیاث احمد گدی کا معاملہ یہ ہے کہ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" وغیرہ جیسی کہانیوں کے علاوہ، وہ ہر جگہ کامیاب ہیں۔ انہیں گذرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر ان کی ادبی حیثیت کا جس شدت سے میں نے ان کی زندگی میں اعتراف کیا تھا اب بھی وہی شدت باقی ہے۔ اپنے مضمون "نئی افسانوی روایت" میں ان پر لکھتے ہوئے میں نے یہ دکھایا ہے کہ ان کے یہاں کہانی کہنے کا سلیقہ واقعی ہے اور تب تمثیلی طور پر میں نے "بابا لوگ"، "جوہی کا پودا اور چاند"، "آدرا خ کھو" وغیرہ جیسی کہانیاں پیش کی تھیں۔ آج ان پر لکھتے وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے بیدی سے متاثر ہو کر زیادہ لکھا ہے اور جدیدیت سے متاثر ہو کر کم "پرندہ پکڑنے والی گاڑی"، "بھیا" اور "ڈوبنے والا سورج" کو الگ کر دیجیے کہ یہ کہانیاں تو محض اور صرف علامتیت اور تجریدیت کی اساس پر ٹکی ہوئی ہیں۔ اور جدیدیت کے علم برداروں اور فیشن پرستوں کی بات رکھنے کی حد تک ہیں اور پھر ان کہانیوں سے گدی کے فن کی شناخت تو ہوتی نہیں کہ اصل تو کچھ اور ہی ہے جیسے "خانے تہہ خانے"، "اندھے پرندے کا سفر"، "امام باڑے کی اینٹ"، "منظر پس منظر"، "پیاسی چڑیا" وغیرہ۔ چیخوف نے کہا تھا کہ قطعیت اور ایمان داری کے ساتھ سچائی پیش کرنا ہی فکشن کا مقصد ہے۔ گدی نے اسے ثابت کر دکھایا ہے۔ کردار سازی کا کام بیدی کے یہاں بھی ہے اور کرداروں کے عمل اور حرکت سے کرداروں کے نازک گوشوں تک رسائی یا دوسرے لفظوں میں کرداروں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنا بیدی کا وہ منفرد پہلو ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ گدی کے یہاں سادہ انداز میں کرداروں کی نفسیات سامنے آتی ہے۔ اور اس

فطری انداز میں نہ تو قیاس آرائی ہے اور نہ مبالغہ آرائی۔ کہانی کی رفتار البتہ ان کے یہاں سست ہوتی ہے لیکن اس پروسیس میں آہستہ آہستہ چلتے چلتے سب کردار اپنی فطرت کا سبک روی سے اظہار کر پاتے ہیں اور کرداروں کو کھلا ہوا اور کشادہ ماحول بھی مل جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا مکمل طور پر اظہار کر پاتے ہیں پھر ایک عجیب سا تجربہ یہ ہے کہ آج کے دور میں عجیب یہ بحث چل پڑی ہے کہ کہانی ہاتھ سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اور کہانی کا اخراج ہو رہا ہے اور کہانی کھو گئی ہے یا گم ہو گئی ہے تو ایسی حالت میں اپنی کہانیوں میں گدی کا دانستہ یا نادانستہ طور پر کہانی کو اس طرح پیچیدہ اور منحنی کر دینا کہ کہانی اب ہاتھ سے نکل گئی ہے اور ایسا لگے کہ کہانی کے تانے بانے بکھر گئے ہیں اور اسے اب دوبارہ حاصل کر لینا ممکن نہیں اور پھر اسی کم زور نقطے پہ کہانی کو اس مہارت سے سنبھال لینا کہ تمام بکھرے ہوئے حصے ملنے لگیں اور کہانی زیریں سطح پر اس طرح مل جانے کہ ایسا لگے کہ کہانی تو کبھی بکھری تھی ہی نہیں۔ کرامت نہیں تو کمال ضرور ہے۔ کہانی کی بازیافت کی ایسی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ تنقید کی سطح پر افسانوں کی بازیافت کی جتنی راہیں لوگ دکھائیں اور جو چاہیں لکھیں مگر کہانی کی سطح پر عملی طور پر اسے کر کے دکھانا سارے دادر کے مصداق ہے۔ کہانی کے پلاٹ کا یہ انوکھا انداز اور کرداروں کو اپنے واقعات بیان کرنے پہ یہ قدرت گدی کے یہاں تو مل جائے گی مگر ان کے معاصرین میں یہ سعادت کسے نصیب ہو سکی ہے؟ پھر کا شو "نادمتی" اور "اندھے پرندے کا سفر" میں پلاٹ کا رچاؤ گدی کے کمال کا ثبوت ہے۔ مثال کے طور پہ یہ اقتباس دیکھیے!

> "چمپا نے ہدی کو لاش کہا تھا۔ چمپا نے یہ بھی کہا تھا کہ لاش خواہ کیسی ہی عزیز کیوں نہ ہو اس سے لپٹ کر گھنٹہ دو گھنٹہ رویا تو جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ زندگی نہیں گذاری جا سکتی لیکن شانتا کو یہیں اختلاف تھا۔ شانتا کا خیال ہے ہدی جیسا زندہ انسان اس نے نہیں دیکھا۔ دنیا جو بے شمار مردوں کا پر شور گھر ہے وہاں ہدی ایک بھرپور زندہ انسان تھا۔ شانتا نے ہدی سے محبت کی تھی اس وقت سے جب ہدی کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی اور شانتا صرف تیرہ سال کی نا سمجھ بچی۔ اس نے ایسے ٹوٹ کر، بے حال ہو کر ہدی کو چاہا تھا جیسے ہدی نے اپنی بیوی کو چاہا تھا کہ کوئی شانتا کے دل کی بے قراریوں کا حال لکھ دے تو شانتا امر ہو جائے اور شاید لکھنے والا بھی!"
>
> (اندھے پرندے کا سفر۔ غیاث احمد گدی)

یہ اور اسی قبیل کی کتنی ہی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ گدی نے پلاٹ اور کردار نگاری پر بہت زیادہ توجہ کی ہے اور بیدی کی طرح کرداروں کا بہ نظر امعان جائزہ لیا ہے اور یہ ان کا امتیازی وصف ہے۔

گدی کے معاصرین میں ان کے ہم پلہ نام ہے سریندر پرکاش! سریندر پرکاش کی کہانی "بجوکا" پر کچھ لکھنے سے پہلے اس کہانی کا ذکر بھی کروں گا جو مجھے سریندر پرکاش سے قریب نہیں کرتی یعنی "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم"۔ سریندر پرکاش کا کہنا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنی زندگی سمجھ کر نہیں جی رہے ہیں۔ ——— - - - ——— ہم خبط ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی اپنی نہیں لگتی۔ اپنے ہی ڈرائنگ روم میں بیٹھے یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ہے۔ مگر میری رائے میں اس مسئلے اور اس خوبصورت موضوع کو لے کر چلنے کے باوجود سریندر پرکاش اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور یہ کہانی ہیئت پسندی، داستانوی فضا اور تجریدیت کی نذر ہو گئی۔

ویسے اس طویل کہانی کا خلاصہ کم سے کم لفظوں میں یوں ہوتا ہے کہ!

[illegible]

تھی۔ برآمدے سے کسی کے لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آ رہی تھی مسلسل، باقاعدہ، اس نے محسوس کیا کہ یہ سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے اور باہر برف گر رہی ہے۔ لیکن کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا تو برف نہیں تھی وہ تنہا محسوس کرتے ہوئے غم زدہ سا ہو گیا۔ اتنے میں اس کے ذہن سے ایک سانپ نکلا اور اپنی تیز تڑپتی ہوئی زبان نکالے ہوئے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہاں ایک عورت نے انگڑائی لی اور ایک بچی کھیلتی ہوئی نظر آئی۔ لاٹھی ٹیکنے کی آواز پھر آنے لگی۔ برآمدے میں ایک اندھا آدمی لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے اُسے روکنا چاہا لیکن وہ برآمدے کے موڑ سے گذر گیا۔ اس نے سوچا کاش ڈرائنگ روم کی سب چیزیں اس کی ہوتیں۔ لیکن اُس کا وجود اسے قالین پر اوندھا پڑا ہوا محسوس ہوا اور وہ رونے لگا۔ لاٹھی کی آواز پھر آئی۔ اس نے بوڑھے کو لپک کر پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ برآمدے کے پاس کانسے میں ڈھلا ہوا ایک بوڑھا نارین پی رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی اسی طرح اطمینان سے بیٹھ کر تمباکو پیتا رہے۔ لیکن جواب ملا کر کانسے میں ڈھلنا پڑے گا وہ سوچنے لگا کہ ایک بپھرے ہوئے سمندر، ریت اڑاتے ہوئے صحرا اور برف باری کے طوفان میں اکیلا انسان کیا کر سکتا ہے؟ وہ دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دینے لگا جو یہ سب سوچتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ وہ ایک خوش سلیقہ آدمی سے ملاقات کے انتظار میں تھا کہ آواز آئی، چلو، اب دیر ہو رہی ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کی چیزوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آواز پھر آئی۔ یہ سب تمہارا ہی تھا مگر اب مہلت نہیں وہ کسی انجانی چیز کے کھو جانے کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بے بس ہو کر اس نے کہا "اگر کوئی کم زور بے سہارا کشتی ساحل سے آلگے تو سمجھنا کہ وہ میں ہوں"۔ (دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ـــ سُریندر پَرکاش)

شام ہوتے ہی مکان میں داخل ہونا، اداسی کی علامت ہے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ، مادّی آسائش اور آرام طلبی کی علامت، آتش دان میں راکھ کا بجھ جانا، قدروں کے زوال اور یقین کی کمی کی علامت ہے۔ گل دان کو چھونے سے خنکی کا احساس، سرد مہری کی علامت ہے۔ عورت، مرد اور بچی کی تصویر خوش خرم گھریلو زندگی کی علامت ہے۔ برآمدے میں لاٹھی کے سہارے باقاعدگی سے آنے جانے والا آدمی وقت کی علامت ہے جو کبھی گرفت میں آتا نہیں۔ سُرخ زبان والا سانپ جنس کی علامت ہے اور اس کے بعد سانپ کا تیزی سے بیڈ روم میں چلا جانا اور عورت کا انگڑائی لینا، جنسی لذّتیت کی علامت ہے۔ کانسے میں ڈھلے ہوئے انسان کا اطمینان سے تمباکو پینا۔ ماضی میں زندہ رہنے کی علامت ہے لیکن ان علامتوں کے جنگل میں کہانی کھو گئی اور رہ گئی تشریح جو بقدرِ پیمانۂ تخیل بدلتی رہے گی۔ اب اس ڈرائنگ روم کو جدید معاشرے کی علامت بنالیا جائے تو یہ پوری کی پوری کہانی علاحدگی یا ALIENATION کے احساس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ لیکن آخر میں یہ کہہ کر کہ "اگر کوئی کم زور نحیف، بے سہارا کشتی ساحل سے آلگے تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں" اس اُمید کا اظہار کیا گیا ہے کہ ممکن ہے مستقبل میں جدید معاشرے کو کھوئی ہوئی اپنائیت مل جائے۔

ضدی پن کی بات تو بالکل دوسری ہے کہ تب کھرا کیا کھوٹا کیا؟ لیکن جو معقول ہیں اور جن کے اندر ضمیر کی آواز اب بھی باقی ہے، انہیں ادبی دیانت داری سے اس سوال کا جواب تو دینا پڑے گا کہ نیا افسانہ نگار اپنی ذات سے وفاداری اور غیر ذات سے قطعیت سے انکار کے باوجود، ذات کی قید سے، ذات کے خول یا حصار سے باہر نکل کر بھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش ہی کو کیوں دیکھتا ہے؟ اور یہ عجیب سی حسیت کیسے وجود میں آگئی کہ شاہراہوں کے پیڑ کٹتے ہیں تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ کلہاڑیوں کا وار اسی کے جسم پر ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے ذہنی آسائش پر خطرہ منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے تو پھر تو سماجی شعور سے تجریدی عمل کے نتائج وابستہ نہیں کیے جا سکتے تو پھر پہلے تو حالات پھر ان پیدا شدہ بلکہ پیدا کردہ حالات کے اسباب و علل پر غور کیا جائے گا۔ اب رہی بات لایعنیت کی۔ نوجدید یعنی چھوٹا سا گروہ ہے جو بڑی شدّت سے لایعنیت کا اشتہار اور پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ یہ اصل میں ایک تحریک ہے کہ اس گروہ نے اپنی کمزوریوں کو ایک تنظیم کی شکل دے دی ہے اور منظم انداز سے فنی کم زوریوں سے شہرت

حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ انسانی اور اخلاقی پستیوں کو منظم فلسفہ بنا رہے ہیں اور سازش تو یہ ہے کہ علامت نگاری کی صالح روایات کو پیروں تلے روند کر اب ترسیل اور ابلاغ کے سفاک قتل کی سازش کر رہے ہیں۔ کیا ان کی نظر اتنی محدود ہے کہ وہ تمام چیزوں کو صرف ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھ سکتے ہیں؟ کیا وہ ان منتشر اجزاء کی ترکیب یا ترتیب سے زندگی کے مجموعی پس منظر کا بہ نظرِ امعان مطالعہ نہیں کر سکتے؟ کیا افسانہ نگاری اب اتنی جیناتی ہو گئی ہے کہ خود اپنی ہی ذات کے ریزوں سے مسخ شدہ حیثیت حاصل کیے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتی؟ ہم ایک روحانی اور مادی کشمکش کے دور سے گذر رہے ہیں اور ایسے پر آشوب دور میں، جب زبان، اخلاق، ادب و تہذیب، سب کے سب سنگین خطرات سے گذر رہے ہیں۔ ایسی بے بسی، بے چارگی اور کس مپرسی کے عالم میں یہ لوگ کوئی حل تو کیا پیش کرتے کہ اک حرفِ تسلی بھی پیش کرنا انہیں گوارا نہیں کہ یہ خود بھی انتشار کے داعی اور علم بردار بن چکے ہیں اور ان کے پاس توہمات کے سوا کچھ رہ بھی نہیں گیا ہے۔ انہیں نہ تو حقیقتیں نظر آتی ہیں اور نہ حقیقتوں کا التباس ILLUSION مجھے کہنے دیجئے کہ حقیقت کا تصور خواہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو ایک تہذیبی بنیاد کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور دنیا کی کوئی بھی تہذیب انسان کی زندگی کو الگ کر کے وجود نہیں بنا سکتی۔ آج جب کہ انسان نئی تعلیم حاصل کر کے نئی زندگی کی تعمیر میں مشغول اور منہمک ہے تہذیبی صورتِ حال انسانی کوشش کی شعوری سطح تک پہنچ چکی ہے لیکن کچھ نئے افسانہ نگار، علم کی سطح پر، شعور کی سطح پر دیکھنا ہی نہیں چاہتے کہ انہیں لاشعور کے اندھیرے میں روشنی نظر آتی ہے۔ فن تو اسے کہتے ہیں جو پائیدار ہو لیکن پائیداری کا انحصار بہت حد تک تہذیبی صداقتوں اور معروضی حقیقتوں پر ہے لیکن ان عوامل، ہانن ہارانہ شعور اور ادراک سے دوری ہے۔ سچائی ہمیشہ سے جانبدار رہی ہے۔ نئے افسانہ نگاروں کی بیان کردہ سچائی واقعی ہے کہ نام نہاد؟ اگر واقعی ہے تو اس کی طبقاتی بنیادیں کیا ہیں؟ دراصل ایک بڑی ذہنی اور سماجی تحریک ہمارے سامنے ہے۔ نئی سمتوں کا شعور ان سے ابھر تو سکتا تھا مگر جہاں چاہ ہو راہ بھی دریافت ہوتی ہے۔

جب ابھی جدیدیت کی تحریک زوروں پر تھی تو ترقی پسند ادب پر تابڑ توڑ حملے کیے جاتے رہے لیکن حملہ کرنے والے نقادوں کو انقلابی تحریک سے کوئی واقفیت تو تھی نہیں۔ اسی لئے جیسے جیسے ترقی پسند تحریک کے اثرات گہرے ہوتے گئے نقادوں کے تعصب کی شدت میں کمی ہوتی گئی اور وہی ادب برقرار رہ سکا جو یا تو زندگی آموز تھا یا پھر زندگی آمیز۔ اس داستان کا دلچسپ بلکہ انتہائی دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ شعراء اور ادباء جو ترقی پسندی کے عروج سے نالاں تھے اور کسی نہ کسی دوسرے دبستان کی تشکیل میں مصروف بھی تھے یا کسی نہ کسی دوسرے دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کو اسی انداز کی تخلیقات پیش کرنے لگے جو ترقی پسندوں کے مخصوص انداز سے وابستہ کی جا سکتی ہیں سامنے کا نام ہے سریندر پرکاش۔ کہانی "بجوکا"۔

افسانہ نگار کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے وہ افسانے بھی اسی خمیر سے گوندھتا ہے اور اسی معنی میں اس کا فن سچا ہے۔ "بجوکا" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں اسے ایک شاہ کار تخلیق تسلیم کرتا ہوں، مگر اس فرق کے ساتھ کہ یہ کہانی واقعی اسی مٹی سے گوندھی گئی ہے جس مٹی سے خود افسانہ نگار وجود میں آیا ہے۔ انور سدید کا یہ اقتباس بے حد اہم ہے کہ!

> سریندر پرکاش جدید افسانے کی ایک معتبر آواز ہے اس کا افسانہ "بجوکا" پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس جاگتا ہے کہ فیصل آباد (لائل پور) کے دیہات جنہیں سریندر پرکاش نے ۱۹۴۷ء میں چھوڑا تھا اب تک اسے HAUNT کر رہے ہیں۔ چنانچہ بجوکا میں یہ دیہات اپنے ثمرات کے ساتھ سریندر پرکاش کے لوحِ دماغ پر ابھرتے ہیں، تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ درحقیقت خود اپنی ہی ذات کو تلاش کر رہا ہے اور اپنی جڑوں کے ساتھ اسی مٹی میں آسودۂ خواب ہونا چاہتا ہے۔ بجوکا میں چوکیدار کی علامت بڑی معنی خیز ہے۔ یہ کردار کسی فنتاسی کو جنم نہیں دیتا بلکہ ایک تلخ حقیقت کو صداقت سے بیان کرتا ہے۔ سریندر پرکاش کی یہ علامتی کہانی اپنے دامن میں دیہاتی زندگی کے متعدد زاویئے اور بے شمار معنی سمیٹے ہوئے ہے تاہم اس نے معانی کو علامتی دھند میں گم نہیں ہونے دیا۔ دیہات کی کھلی کھلی فضا، ہریالی اور اس کے کھیتوں کی سرسبزی،

فصل پکنے کی خوشی، دھیرے دھیرے فصل کے آگے بڑھنے کا خوف، اپنی ذات کے تحفظ کا احساس، بجوکا کے وجود سے جنم لیتی ہوئی درانتی اور چوپال کا فیصلہ یہ سب کثیرالاضلاع موضوعات ہیں جنھیں سریندر پرکاش نے بڑی خوبی سے ایک ہی افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اردو افسانے میں بالعموم اور دیہات کی پیش کش میں بالخصوص علامت کا اتنا ہوش مندانہ استعمال پہلے کبھی نہیں ہوا۔ چنانچہ "بجوکا" ان معدودے چند افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے دیہات کی پیش کش کے روایتی انداز میں انقلابی تبدیلی کی۔"

(اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش۔ انور سدید صـ۱۷۱ سے صـ۱۷۲ تک)

بجوکا میں تجریدی اور استعاراتی نظام ہے کہ نہیں، اسے الگ کر دیجئے کہ بات کچھ بھی نہیں اور بات اتنی سی ہے کہ سریندر پرکاش نے نئی فہم کو علامت بنا کر پریم چند کے تخلیق کردہ کردار ہوری کی از سرِ نو دریافت کی ہے کہ بجوکا کے بے جان ڈھانچے میں زندگی کا کلبلانا پھر اس بے جان وجود کا زندہ ہو جانا اور اس میں سے درانتی کا نکل آنا اور اپنے حصے کی چوتھائی فصل کا ٹنا اصل میں استحصال کی بدلی ہوئی شکل کی علامت ہے۔ لیکن خود سریندر پرکاش کی ہی کہانی "رونے کی آواز" میں نہ تو علامتی اور استعاراتی نظام ہے اور نہ ہی تجریدیت پھر اس میں کوئی وسعت اور دروں بینی بھی نہیں کہ یہ محض اور صرف ایک اندرونی اور داخلی تجربہ ہے جس پر خارجی حالات کا گہرا اثر ہے ویسے "رونے کی آواز" سریندر پرکاش کی اچھی کہانی ضرور ہے۔ جوگندر پال کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے افسانوی ادب میں مقام حاصل کر لینے سے جو عجیب سی روش پڑی وہی اہم ہے کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جوگندر پال نے افسانے کو بہت حد تک اس کی ابتدا اور اس کے آغاز پر ہی مرکوز اور مرتکز کر کے رکھ دیا۔ ایک طرح سے دیکھئے تو کہانی اپنے آغاز اور اپنی ابتدا پر ہی مکمل ہو جاتی ہے اور دوسری طرح سے دیکھئے تو ایسا لگے کہ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے ویسے ویسے پال کے افسانے کی ابتدا وسیع ہونے لگتی ہے اور پھیلنے اور پسرنے لگتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کہانی میں تلازمۂ خیال پر پکڑ مضبوط ہونے لگتی ہے پھر اچانک کہانی کا فریم ٹوٹ جاتا ہے اور کہانی اس ٹوٹے ہوئے فریم سے باہر نکلتی ہے پھر باقی کی کہانی ہی کیا ہے۔ بس بیان کا خاص انداز۔ اس نئے اور تیکھے ٹریٹ منٹ نے نئی کہانیوں کو ایک بہت بڑی تبدیلی سے روشناس کرایا لیکن اس راہ پر چل کر اکثر لوگ بھٹک گئے جب کہ پال صرف کہیں کہیں بھٹکے اور بہت جگہوں پر اپنی فن کاری کا جوہر دکھا گئے۔ "چہار درویش"، "پراسیس"، "باہر کے بھیتر"، "رامائن"، "عمود"، "بے محاورہ"، "رسائی"، "بازیافت"، "کھوا" اور "آمد و رفت" وغیرہ جیسی کہانیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ پال کا فن متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ رسائی اور بازیافت میں افسانہ نگار بہت حد تک دھرتی سے جڑا ہوا ہے۔ کرداروں کے واسطے سے خود تک اور پھر اپنی ذات کے توسط سے کرداروں تک پہنچنے کی کوشش انہیں منفرد بناتی ہے لیکن اسی چکر میں اکثر کرداروں نے اپنی پہچان گنوا دی ہے کہ ایک مسئلہ جوگندر پال کا یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کہانیوں میں فلسفیانہ انداز بہت ہوتا ہے اور ان کے اکثر تخلیق کردہ کردار فلسفے کی گتھیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ کردار فلسفے بگھارتے ہیں اور عملی سطح پر صفر ہیں۔ لیکن کی بیشتر کہانیاں اسی معیار پر قائم ہیں۔ تمثیلی طور پر یہ اقتباس دیکھئے۔!

"دماغ پر زور ڈال کر یاد کرو دوستو، ہم یہاں کب آئے؟
نہیں دماغ پر زور مت ڈالو، ورنہ ٹوٹ جائے گا۔
ہاں ہمیں اس سے کیا، کیسے آئے، یہاں ہیں تو ظاہر ہے یہاں آئے ہوں گے۔
لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ آئے ہم ہی تھے؟
آیا کوئی بھی ہو پر ہم ہم ہی ہیں تو ظاہر ہے ہم ہی آئے ہوں گے۔
لیکن آنے والے بھی تو چلے جاتے ہیں۔ ہم ہی کیوں رہ گئے۔؟
کیوں کہ ہم نے ڈوبنے سے بچاؤ کا سامان کر لیا، ورنہ ہم بھی کوچ کر گئے ہوتے۔"

(چہار درویش۔ جوگندر پال۔)

یہ فلسفیانہ طرزِ بیان اور یہ کہانی کا عجیب و غریب مکالماتی انداز یقیناً قابلِ غور ہے کہ دونوں ہی کردار فلسفے کی زبان میں محوِ تکلم ہیں۔
بہر حال! اس کے باوجود جوگندر پال کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ "بازیچۂ اطفال" ان کا خوبصورت افسانہ ہے اور بسا اوقات ان کی علامتیں کہانی میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہیں کہ ان کی وضاحت میں کچھ خاص دشواری نہیں ہوتی۔

جوگندر پال کے علاوہ دو نام اور بھی نکل آتے ہیں اور ایسے نام جن کو اس طور پر ان کے معاصرین میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کا دور بھی کم و بیش وہی ہے جو کہ جوگندر پال کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ نام ہیں۔ رام لعل اور انور عظیم۔ یہ دونوں ہی افسانہ نگار میری رائے میں کرشن چندر سے بے حد متاثر ہیں لیکن جب جدیدیت کی رو چل پڑی اور اکثر و بیشتر اہم افسانہ نگار بہہ نکلے تب بھی یہ دونوں توازن قائم کرتے رہے کہ نہ تو یہ جدیدیت کے ساتھ دینے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے، اور نہ ترقی پسندوں کی تحسین تک ہی محدود رہے۔ رام لعل نے نسبتاً زیادہ لکھا ہے جیسے "چابک" "ننھا خدا" "ایک حیرت زدہ لڑکا" "اکھڑے ہوئے لوگ" وغیرہ۔
یہ سب کہانیاں واقعی قابلِ التفات ہیں مگر رام لعل کا مسئلہ یہ ہے کہ رام لعل نے بے شمار کردار تخلیق کیے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے کسی بھی کردار پر بھرپور توجہ نہیں دی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تخلیق کردہ کردار اکثر ان واقعات کی رو میں بہہ گئے جن میں انہیں ابھرنا تھا کہ اصل بات تو یہ ہو گئی کہ واقعہ خود کردار بن گیا اور کردار ایک ضمنی اور اضافی حیثیت کی طرح کا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود "اکھڑے ہوئے لوگ" ان کی کامیاب کہانی ہے اور نئی افسانہ نگاری میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ذرا اس اقتباس کو دیکھئے

> "میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ اشوک تھا۔ نائٹ کیپ لگائے، بدن پر چمڑے کی جیکٹ اور ڈرین پائپ، اس کی ذرا ذرا بڑھی شیو۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان سگریٹ پھنسی ہوئی۔
> "ممی آپ"
> مجھے دیکھ کر وہ واقعی حیران نظر آیا۔
> وہ اتنے سویرے سڑک پر کیوں گھوم رہا ہے؟ یقیناً اسے میری آمد کی کوئی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ اس کا رُخ بھی اپنے گھر کی طرف ہے۔ یعنی وہ اس عورت کے پاس لوٹ رہا ہے۔ میں سمجھ گئی جیسا سروج نے لکھا تھا۔ چند لمحوں تک میں نے اسے کوئی جواب دینے سے خود کو روکے رکھا۔ اس کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔
> جب آدمی کسی بات کی شکایت کرنے کے لیے حق بجانب ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر کافی جرأت بھی پیدا کر لیتا ہے۔ میں بھی تو پوری جرأت سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ میری بیٹی میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو اُن کا بدلہ لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟
> کیا سروج نے آپ کو لکھا تھا؟ وہ ابھی تک میری اچانک آمد کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔"
>
> (اُکھڑے ہوئے لوگ ــــ رام لعل)

انور عظیم نے نسبتاً کم لکھا ہے اور انہیں وہ اہمیت بھی نہیں دی گئی جو انہیں ملنا چاہیے تھی۔ جب کہ انور عظیم ان اہم افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے ابتدا میں تو کرشن چندر سے متاثر ہو کر افسانے لکھے ہیں مگر بعد کو متوازن انداز سے نئی روایت کو بھی سمیٹ لیا ہے۔ ان کے یہاں افسانوں میں پلاٹ اور اس پلاٹ کا فکر سے رچا ہوا انداز ملتا ہے۔ اور وہ ایک افسانہ نگار ہی نہیں ایک طرزِ احساس کا معتبر نام بھی ہے۔ اپنے طرزِ احساس کو افسانوں کے پیکر میں قوی تر پیش کرنے کی روش کا نمائندہ نام۔ ان کے افسانوں میں چھوٹے چھوٹے جملے اور فقرے ہوتے ہیں مگر ان کو جوڑ جوڑ کر وہ چھوٹی سی مکمل اور رنگین تصویر بنا لیتے ہیں۔ "قصہ ایک رات کا" "لرزتی چٹان" "قصہ دوسری رات کا" اور "ٹھنڈی سرنگ" وغیرہ تجریدی کہانیوں سے الگ ہٹ کر بھی دیکھیے تو "درد کا کوئی ساحل نہیں" "اونگھتی ڈیوڑھی جاگتے کھیت" "سات منزلہ بھوت" وغیرہ جیسی کہانیاں انور عظیم کی اصل پہچان کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔

"جب شام گہری ہوئی اور شہر کی روشنیوں نے اچانک آنکھ کھول دی تو ہر چیز اندھیرے میں ڈوب گئی۔

شہر تھا یہ رنگوں کا۔ سارے رنگوں کا رنگ ایک تھا۔ جب رنگوں کا رنگ اڑا تو شام ہوئی اور روشنیوں نے آنکھ کھول دی۔ ساری آنکھیں اندھی تھیں۔ ساری آنکھوں کا رنگ ایک تھا۔ ساری آنکھوں سے ایک ہی رنگ رِس رہا تھا۔ پیلا گندھکی، زہریلا، پیپ جیسا۔ شہر کے بیچوں بیچ دھند لکے میں سرگوشیوں کے درخت دم سادھے کھڑے تھے۔ درختوں کی کالی ٹہنیوں پر پتیوں کی جگہ انسان کے دل اُگے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ہل رہے تھے یا شاید چپکے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کی زبانوں کی طرح درخت اٹھتے تھے اور بیٹھتے تھے اور ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہتے تھے۔ ان کی آوازیں پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی گونجتی تھیں۔ تالیاں سی بجتی تھیں۔ تڑ تڑ۔۔۔۔ شہر کی بڑی آبادی گیدڑوں کی تھی۔ گیدڑ ہو ہو کر رہے تھے۔ مگرمچھ آنسو بہا رہے تھے۔ چیخیں بڑی بھیانک تھیں۔ مگرمچھ اپنے آنسوؤں کے کالے دریاؤں میں تیر رہے تھے۔ جن پر جگہ جگہ سگنل جیسی ہری لال آنکھیں جلتی بجھتی رہتی تھیں۔ مگرمچھوں کے اژدہا نما دھڑوں سے کالی بجلی کی کالی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ درخت سہمے ہوئے تھے۔ سرگوشیوں کی آنکھیں بند تھیں۔ مگرمچھ کے آنسوؤں کے دریا چڑھے آرہے تھے۔ اندھیرا اُمڈ رہا تھا۔" (قصہ دوسری رات کا ۔۔ انور عظیم)

یہ اور اسی قبیل کی کتنی ہی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جو انور عظیم کے فن کی شناخت کراتی ہیں۔

بل واج مین رانے افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ اور بات کہ مین را نے افسانے لکھنے کے علاوہ اور کبھی کبھی افسانے لکھنے کے بجائے خالی خالی پروپیگنڈے بھی کیے ہیں اور بہت زیادہ کیے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیقی ابج بہت ہے۔ افسانوں میں بیانیہ انداز بھی انھیں حل ہے مگر اکثر افسانوں میں کسی ایک منظر کو لے کر چلنا اور محض اور صرف اسی منظر نگاری کرتے چلے جانا" اور پھر شاعرانہ انداز بیان اختیار کر کے افسانوں کو ان کے حدود سے تجاوز کرا دینا" ان کے فن کے لیے مضر ہے اور ان کی شخصیت کے لیے بھی۔ ایک مشکل اور بھی ہے کہ افسانوں کی تکنیک میں ایسے تجربے EXPERIMENTS کرتے چلے جانا" جن سے افسانے اپنی نثری خصوصیات سے مبّرا ہو جائیں کسی خوش امکان صورت کو جنم نہیں دیتا۔ بہرحال "ماچس" ان کی ایک اچھی کہانی ہے اور ان کی صحیح پہچان بھی "ماچس" سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن "آخری کمپوزیشن" وغیرہ میں صرف تکنیکی تجربے ہیں۔ ان کے اس عجیب انداز کی ایک عجیب سی مثال دیکھ لیجئے!

کرسی کے لیے بہت لمبے بازوؤں پر پڑے ہوئے بازو، گری ہوئی ہتھیلیاں اور گری ہوئی انگلیاں کرسی کی،
اونچی بہت اونچی پشت سے جڑی ہوئی اونچی پشت اور اونچی، تنی ہوئی گردن، زمین کی جانب سیدھی لٹکی ہوئی لمبی ٹانگیں۔ ننگے پاؤں، ذہن خالی، دل کی دھڑکن، خاموش، نبض کی رفتار تھمی، مسافروں کے کام کاج بند۔ وہ ساکت بے جان جسم
اور آنکھیں زندہ آنکھیں۔ بے جان جسم اور زندہ آنکھیں، زندہ آنکھیں اور بے جان جسم۔ کون کس کی زندگی اور کون کس کی موت؟
مغرب کی جانب رُخ کیے ہوئے کرسی میں مقید ساکت۔ اور بے جان جسم ساکت اور بے جان جسم میں مقید زندہ اور روشن آنکھیں
آنکھوں کے سامنے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ (کتاب؟) آئینہ؟!
شمال کی جانب شمال کی آخری حد تک آئینے کی دیوار!
آسمان کی جانب، آسمان کی انجانی بلندیوں تک آئینے کی دیوار!!!
آنکھوں کے سامنے آئینہ،
آئینہ اُجلا، صاف، شفاف۔

______ میں نے سگریٹ سلگایا"  (کمپوزیشن پانچ ۔ بل راج مین را)

اسے آپ زبان و بیان کا حسن کہیں گے ؟ یا زبان و بیان کا ایک عجیب و غریب تجربہ ؟ یہ جو کچھ بھی ہو ۔ کہانی نہیں ہے ۔ اور مجھے کہانی چاہیئے۔ میں کہانی شوق سے پڑھتا ہوں لیکن زبان و بیان کے ایسے خوشنما بلکہ بدنما تجربے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ مین را نے جس طرح "ماچس" میں ماچس کو زندگی کی معنویت کی تلاش کی علامت بنا کر پیش کیا تھا یا پھر جس طرح "ریپ" میں ایک سڑک "ڈی مال" کو علامت بنا کر، اسے ایک مشخص کردار بنا دیا تھا، وہی علامتی اور تجریدی انداز، وہی جھنجھلاہٹ اور وہی منفی رُجحان میں تخلیقی اظہار کی صداقت کا احساس ہوتا تو وہ تو نئی افسانہ نگاری کے ماتھے کا جھومر ہوتے ۔ مگر اس کمپوزیشن بازی کے چکر میں وہ نئی کہانیوں کے زوال پذیر رجحان کی علامت بن گئے۔ نقادوں سے گٹھ جوڑ کر کے تحسین باہمی کر لینے سے ایک بار تو آدمی چکر میں آجاتا ہے ۔ لیکن بار بار نہیں ۔ اور ایک ذہین اور فہیم طبقہ ہمیشہ رہا ہے جو کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کر لیتا ہے ۔ اور یہ طبقہ ہمیشہ رہے گا۔

قاضی عبدالستار اُن معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے اکثر سطحوں پر موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے ۔ "پیتل کا گھنٹہ" اُن کی ایک اچھی تخلیق ہے ۔ موضوع یہ ہے کہ عزت مند میزبان اپنی ریاست کی آخری نشانی بھی فروخت کر کے ریاست کی یاد سے بھی دست بردار ہونا گوارہ کر لیتا ہے مگر اپنی روایتی مہمان نوازی سے اور تہذیبی فرائض کی تکمیل میں کوتاہی کرنا گوارہ نہیں کرتا ۔

عابد سہیل کی اکثر کہانیاں تاثر کے وحدت سے انکار کی صورت ہیں۔ ان کا انداز بیان شگفتہ ہے اور جگہ جگہ دکھتی رگوں کو چھو لینے کی عادت انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کر دیتی ہے ۔ "کھوٹا سائم" کی اکثر کہانیاں خوب صورت ہیں اور کم و بیش یہی بات "سوا نیزے پر سورج" میں بھی ہے کہ وہاں بھی سماج کی دکھتی رگ پر ہی انگلی رکھی گئی ہے ۔

اقبال مجید اور اقبال متین ۔ دو ایسے منتخب نئے افسانہ نگاروں کے اسمائے گرامی ہیں جو پروپیگنڈے سے گریز کرتے ہیں ۔ لفاظی اور فلسفیانہ انداز فکر سے پاک اور صاف زبان استعمال کرنا ان کا نمایاں وصف ہے ۔ اقبال مجید ایک حساس اور فہیم افسانہ نگار ہیں. ان کے افسانوں میں تبدیلیاں بہت ہی سُست رفتار سے وجود میں آتی ہیں ۔ ٹیلی فون اور لوڑھا نظام میں کہانی کی فضا اور اس کا پس منظر، ان کی بعض دوسری کہانیوں مثلاً مفاہمت ڈوبھیگے ہوئے لوگ اور پوشاک سے مختلف ضرور ہے ۔ اقبال مجید کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ موضوع پر زور دیتے ہیں ۔ جس موضوع کو بھی وہ لے لیں گے، اُن پر اُن کی گرفت سخت ہوتی جائے گی اور جو بھی کردار وہ لے لیں گے وہ کردار اسی موضوع سے پیدا ہوگا اور اسی موضوع کی باہوں میں پلے گا اور بڑھے گا۔ "ڈوبھیگے ہوئے لوگ" کے بعد "مُفاہمت" نئی شہری زندگی کے مسائل اور موضوع پر لکھی گئی اچھی کہانی ہے "پوشاک" ایسے دور کی کہانی ہے جب ملک میں بہت حد تک سختی اور زیادتی کی جا رہی تھی ۔ اچھے اچھے افسانہ نگاروں اور شاعروں نے اپنے قلم گروی رکھ دیے تھے ۔ ایسے نازک اور سنگین دور میں اقبال مجید نے اینڈرسن کے بادشاہ کو علامت بنا کر، ایک خوب صورت اور تیکھا ٹریٹ منٹ دے کر "پوشاک" جیسی کہانی لکھی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ نیا افسانہ نگار بھی ضمیر کی آواز سنتا ہے ۔

اقبال متین کے افسانوں کی چمک دمک نکھرے ہے۔ "بُجھا ہوا البم" "گرلیو یارڈ" "پرچھائیاں" اور "تار تار" میں موضوع ہے، اظہار ہے اور توازن اور اعتدال ہے نرمی ہے اور زندگی کا ایک سنبھلا ہوا رویہ ہے ۔ "آگہی کے ویرانے" نئے ہندوستان کے ان لوگوں کی کہانی ہے جو اپنی راہ نہیں جانتے ۔ "مزبلہ" میں کرداروں کی نزدیکیاں، جدائی کے غم کو دور نہیں کر سکتی ہیں ۔ اور یہ نازک سی بات اس کہانی کی جان ہے۔

"لکڑی کا آدمی" کا یہ اقتباس دیکھئے اور سوچئے کہ اقبال متین کا فن جب اپنی بلندیوں کو پہنچتا ہے تو عروج کی کون سی منزل سر کر لیتا ہے۔

> ایک وقت جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو خلافِ معمول سارا گھر اس کے بیوی بچے بڑی بوڑھیاں سب ہی نووارد کو گھیرے ہوئے ہنسی مذاق میں خوش تھے ۔ وہ گھر کے ماحول کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ آنے والا کون ہے. یہ اس کیلئے نئی بات نہیں تھی ۔ نووارد جب بھی آیا ہے ۔ اس کا گھر اسی طرح زعفران زار بن گیا ہے ۔ وہ جانتا تھا

کہ جوں ہی اُس کی آمد کی خبر سب کو ہو جائے گی۔ قہقہوں کا دم گھٹ جائے گا۔ سب کے سب گمبھیر اور سنجیدہ ہو جائیں گے۔ ساس کی بیوی اٹھ کر خود ہی اس کا کھانا میز پر چُن دے گی۔ نو وارد بڑے تپاک سے اس سے ملے گا۔ اور پھر گھر بھر کے رت جگے نیند کی تلاش میں کونے کونے پھرنے لگیں گے۔

یہ آدمی وہی تھا جس کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ شادی سے قبل اس کو معلوم ہوا تھا کہ اس کی ہونے والی دولہن اپنے کسی رشتے کے بھائی میں دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن لڑکی کے ماں باپ کو وہ لڑکا ایک آنکھ نہیں بھاتا اس لیے وہ بے روزگار ہے۔ نٹ کھٹ اور کھلنڈرا ہے اور جب اس نے اپنی منگیتر کو پہلی بار دیکھا تھا تو اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا تھا

"نو عمری کی یہ سطحی جذباتیت کچھ دن رہتی ہے اور بس۔ مجھے رشتہ منظور ہے۔"

لیکن اس کے بعد اس کھلنڈرے بے روزگار لڑکے نے اس کا سُکھ چھین کر کہیں مقفل کر دیا تھا۔ اس کو اسی کے گھر میں اس طرح قید کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ باہر بھی جاتا تو اپنا دل یہیں چھوڑ جاتا جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ پتھر کا ہے۔" (لکڑی کا آدمی۔ اقبال متین)

رتن سنگھ ان اہم افسانہ نگاروں میں ہیں جو واقعی غریبوں کے ساتھی ہیں اور ملک کے بٹوارے کے اعلیٰ انسانی قدروں کی بنیاد پر مخالف بھی کہے جا سکتے ہیں۔ مہدی جعفر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "رتن سنگھ کے یہاں بڑی تخلیقی صلاحیت اور تجربوں کا پورا رجحان ہے۔"

(جواز۔ شمارہ ۸)

"تجربے کا آدمی" کے علاوہ رتن سنگھ نے نئی تکنیک پر بھی علامتی کہانیاں لکھی ہیں۔ "سوکھی ٹہنیوں میں اٹکا ہوا سورج" اور "پہلا قدم" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ پہلا قدم سے یہ اقتباس دیکھئے!

"وقت کب سے بہہ رہا ہے، کچھ پتہ نہیں۔ میں نے سوچا کتنے لوگ اس سے کٹ کر ریت کے بے جان ذرّوں میں تبدیل ہو گئے، کچھ پتہ نہیں۔ صدیوں لمبے دریا کے اس پاٹ میں بکھری ہوئی ریت کے ذرّوں کو، کون گن سکتا ہے؟ اور دریا بھی وہ جس کا ایک سرا ہمالیہ اور دوسرا سرا سمندر، سات سمندر۔" (پہلا قدم۔ رتن سنگھ)

انور قمر نے "چوراہے پر ننگا آدمی" لکھ کر لاسمتیت کے المیے کو تجریدیت سے نکال کر علامتیت تک پہنچا دیا اور اس سے جو بات پیدا کی گئی ہے وہ بہر حال یہی ہے کہ ہم لاسمتیت کے شکار ہیں اور ایک بھٹکی ہوئی بھیڑ ہے جسے نہ تو منزل کا پتہ ہے اور نہ راستے کا اور سوچتے ہوئے یوں ہی چلتے جانا آج کا بڑا المیہ ہے ؎

کیا جانیے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

یعنی مستقر کی تلاش اور ذات کے تعین کو پیش کرنے کا افسانوی اسلوب، اُن کی پہچان ہے۔ اس کے علاوہ "ہاتھیوں کی قطار" "قیدی اور کیلاش پربت" جیسے ان کا فن نمو پاتا ہے۔ یہ طے ہے کہ انور قمر نے خود کو علامتی پینترے بازی سے محفوظ رکھا ہے اور انور قمر نئے افسانوں کا ایک روشن امیدوں والا نام ہے۔ لیکن ایک بات جو ہونٹوں پر ہے اگر کہہ دوں تو کچھ قرار آئے گا کہ نئی افسانہ نگاری کے پیچ و خم بے شمار ہیں اور ان میں سے ایک شاید یہ بھی ہے کہ اجتماعی مسائل نے فرد کی زندگی کی انفرادیت چھین لی ہے اور اجتماعی نظام کے نام پر جو مشینی زندگی وجود میں آ رہی ہے وہ ایک جانب تو انصاف، حقوق اور مساوات وغیرہ کی باتیں کر رہی ہے مگر دوسری جانب اپنی اجتماعی اور مشینی تہذیب کے بھاری پہیوں تلے فرد کی انفرادیت کو کچلتی جا رہی ہے۔ اس عنوان دیکھئے تو کوئی بھی اجتماعی نظام صرف اجتماعی مصائب اور اجتماعی مسائل کا دوسرا نام ہے۔ ہر بڑے شہر کا انداز بڑا مشینی ہوگا اور اس میں اضافہ تو ہو سکتا ہے مگر تخفیف نہیں ہو سکتی۔ بسوں کا شور، کارخانوں کا دھواں، روزی کی تلاش میں لپکتی بھاگتی مخلوق کا سیلاب، ہر فرد کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں۔ اور ازیں قبیل بہت سی باتیں ہوں گی ہمارے نئے افسانہ نگار اور ہمارے نئے افسانوں کا نہ تو کوئی کلچر ہوگا اور نہ معاشرہ۔ اور دیر یا بدیر یہ صورتِ حال مستحکم ہو جائے گی

ہمارا معاشرہ یا پرانا کلچر کب کا گم ہو چکا ہے۔ نیا ہم بنا ہی نہیں سکے۔ اس لیے ہمارے پاس اب صرف جذبات رہ گئے ہیں اور کچھ خام تجربات بھی۔ مگر ان سب کی تہہ میں ایک غیر روایتی معاشرہ بھی تو ہے جو نئے افسانوں کو روایات سے وابستہ ہونے نہیں دیتا اور روایات سے قطع تعلق ہونا ممکن نہیں۔ نئی افسانہ نگاری سے وابستہ نقادوں اور بہت سے نئے افسانہ نگاروں کا حال ان افراد کی طرح ہے جو لڑکی کی شادی کرتے وقت جہیز کو ایک گناہِ عظیم قرار دیتے ہیں اور جب لڑکے کی شادی کی بات آتی ہے تو پیسوں کی باتیں کرتے ہیں۔ محبت تو بہت پہلے ہار چکی ہے اور پیسہ جیت چکا ہے اور اب یہ جیت مستحکم ہو چکی ہے اور یہ اور بات کہ ہر جنگ محبت کے اصول پر ہی لڑی جاتی ہے لیکن غور سے دیکھئے تو تہہ سے نکلتی ہے دولت۔ پیسوں کا حصول۔ اور یہ جو احساسِ تنہائی ہے اور جو اس کا اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کیا جا رہا ہے تو یہ تو اصل میں نظامِ زر سے پیدا ہوا ہے اور زر میں ہی اپنا چھٹکارا ڈھونڈ رہا ہے اور چھٹکارے یا نجات کے لیے دوسرا لفظ خدا ہے۔ جو بھی معاشرہ احساسِ تنہائی کا شکار ہو، اس معاشرہ میں باطنی طور پر زر کو ہی خدا سمجھا جاتا ہے اور خواہ جذباتی وجود میں اس خدا کو مانا جائے یا نہ مانا جائے لیکن وجود کی اندرونی اور داخلی تہوں میں اس کی "لاشریکیت" کا احساس ہر حال جاگزیں ہے۔ اور یہ جذبات پرستی، بذاتِ خود، زرپرست معاشرے کی دین ہے بلکہ اس کا حصہ ہے۔ اس لیے نئے افسانوں کی تخلیقی نوعیت افسانوں کو جذبات پرستی کی مسموم فضا سے آزاد کرانے میں مضمر ہے۔ رہی بات ترقی پسندوں کی، تو تخلیق اور تنقیدی سطح پر جس غیر طبقاتی نظام کا نقشہ وہ بناتے ہیں، ان کی حقیقی زندگی اسی نقشے کو مٹا دیتی ہے۔ اقوال اور افعال کے تضادات کو الگ کیجئے اور صرف اقوال اور گفتار کی باتیں کیجئے تو پھر تو رندوں میں کیا برائی ہے؟

ایک موقعے کا شعر سن لیجئے تو پھر کچھ اور افسانہ نگاروں کی بات کی جائے کہ ؎

کوئی رنج ہے نہ ملال ہے مجھے صرف اتنا خیال ہے وہ عجیب دانشِ عصر تھی جو تلاشِ زر میں الجھ گئی

اور ہاں! یہ جو مذہب کے نام پر سیاسی نظام کی آرزو ہے یہ بھی بہ اعتبارِ نتیجہ نظامِ زر ہی کی جانب مراجعت کی کوشش ہے۔ اور نئی نسل اب اچھی طرح سمجھ چکی ہے کہ مذہب کے نام پر بھی جنگ زرگری ہی جاری کی جا رہی ہے اور ہر نظریہ کسی نہ کسی دوسرے اغراض و مقاصد کو زیریں سطح پر لے کر ہی چل رہا ہے۔ اس لیے اب کوئی بھی مشترک نظریہ اور اعتقاد ایسا نہیں رہ گیا ہے جس پر تمام لوگ متفق ہو جائیں گے۔ وقتی مصلحتوں کے پیشِ نظر کچھ حمایت مل جائے گی لیکن ایسی بھیڑ تو بکھرنے ہی کے لیے ہوتی ہے جسے جذبات سے برانگیختہ کر کے یکجا کیا گیا ہو۔ ہمیں اب صاحبِ نظریہ نقاد چاہیئے ہی نہیں کہ ہم اب صاحبِ نظر افراد کی تلاش میں ہیں جو یہ دیکھ سکیں کہ دل کی گرہ کہاں الجھی ہوئی ہے؟ ویسے میں نئی نسل کو صرف یہ کہوں گا کہ نئی نسل اگر ہو سکے تو اپنی تلاش اور اپنی نظر اور اپنے تجربے کو ہی اپنا معتمد رہبر اور رہ نما بنا لے ؎

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

سلام بن رزاق سے نئی نسل کا وہ کارواں وجود میں آتا ہے جو کہانیوں کے اخراج کا منکر تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے ہیئتی تجربوں کے باوجود، بے مہار جدیدیت کی اتباع سے انکار کیا اور کہانی پن کو برقرار رکھا کہ سلام بن رزاق اسی عنوان اپنے عہد کا پیش رو ہے۔ اور مثال کے طور پر "ننگی دوپہر کا سپاہی" جہاں نئے تجربوں کے باوجود کہانی پن کی خصوصیت برقرار ہے اور اعلیٰ انسانی قدروں کی نفی کا ذکر اس لرزہ خیز انداز سے ہوا ہے کہ دل پگھل جاتا ہے۔ "زنجیر ہلانے والے" اور "کالے ناگ کے پجاری" میں بھی یہی کیفیت برقرار ہے۔

بقول پروفیسر محمد حسن

"ننگی دوپہر کا سپاہی" میں لوگ تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سائے کی تلاش میں بھاگے پھرتے ہیں۔ یہ دھوپ محض ایمرجنسی کی دھوپ نہیں ہے جو سنہ ۱۹۷۷ء تک ملک میں باقی تھی۔ بلکہ اس کا رشتہ پورے صنعتی معاشرے کے تشنج زدہ نظام سے ہے جو دھیرے دھیرے ہمارے سماج کو جکڑ رہا ہے۔" (عصری ادب اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء و جنوری سنہ ۸۱ء)

انسانی اقدار کی تذلیل اور انسانیت کی پکار سے وابستہ علامتی کہانیوں میں "سراب زدہ"

"اقتدار" کالے ناگ کے پجاری" اہم ہیں ۔ سلام بن رزاق کی ایک اور علامتی کہانی ہے ۔ "صلیب" اس کا یہ اقتباس دیکھئے ۔

"بجومت" عبا پوش گرجا ۔ جب تک صلیبیں بنتی رہیں گی ۔ مسیحا پیدا ہوتے رہیں گے ۔ اس صلیب کا بھی مسیحا پیدا ہو چکا ہے ۔ وہ دیکھو میری انگلی کے سیدھ میں یہاں سے ٹھیک جو شخص بیٹھا ہے وہی ہماری اس صلیب کا مسیحا ہے ۔ جاؤ اسے نہایت عزت و احترام سے لے آؤ" تاکہ اسے مصلوب کر کے ہم صلیب کی روایت کو برقرار رکھیں ۔" (صلیب ۔ سلام بن رزاق)

ایک معمولی سی بات ہے ریل کے سفر میں اقتدار کی جنگ کی بات ۔ لیکن اس پروسیس میں انسانیت اور شرافت کا خون اور ایک دوسرے پر زور زبردستی کی فضا کو جس خوبصورتی سے سلام بن رزاق نے اس اقتباس میں ابھارا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے ۔

"ارے یہ تو وہی شخص ہے جو پلیٹ فارم کی بنچ پر بستر کر بیٹھا تھا ۔ آہا ۔ اب جگہ نہیں ملی تو کو ۔ کھڑا رہ سالے کھڑا رہ ۔ نہیں میں تو رتی بھر جگہ نہ دوں حرامی کو ۔ مجھے دی تھی اس نے ، مزہ آرہا ہے ۔ کیسا منہ بنا رہا ہے .... میری ہی طرف کھسک رہا ہے مگر میں تو جگہ نہ دوں گا ۔ مجھے کسی نے بٹھایا تھا ۔ جب کہ وہ بٹھا سکتے تھے ۔ چلو آنکھیں بند کر لو تاکہ کوئی جگہ کے لیے درخواست ہی نہ کر سکے ۔"

اب اگر اس ریل کے سفر کو نئے معاشرے کا سفر سمجھ لیجئے تو علامت وسیع تر ہے کہ علامت معنی کو پھیلاتی ہے بڑھاتی ہے اور وسیع بناتی ہے ۔ معنی کا استحصال نہیں کرتی ۔

تاثرات کی بانا آفرینی اور معمولی باتوں میں کہانی پن پیدا کر کے ، اسے کہانی کا فارم دینا سلام بن رزاق کی مہارت ہے ۔ یہ اور بات کہ کسی اور کے تاثر کو اپنے اوپر مکمل طور پر طاری کر لینا ممکن نہیں ۔ مگر سلام بن رزاق کے پیدا کردہ تاثرات کم و بیش قاری کے قلب پر بھی مرتسم ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ بڑی بات ہے ۔

انور خان کا قول یہ ہے کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ پرانے کہانی کار جو تھے انہوں نے انسانی مسائل اور ان کے دکھ سکھ کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے پیش کیا تھا اور کامیابی سے بیان کیا تھا ۔" (شاعر مئی ۱۹۷۹ء)

نئے افسانہ نگاروں میں مگر انور خان بھی ہیں ۔ وہ نئی تکنیک کے باوجود نئی اور پرانی روایات کے تسلسل سے اپنی شناخت کراتے ہیں ۔ مثلاً آج کے دور میں ماڈلنگ گرل کی نفسیات کو سامنے رکھ کر چلئے اور یہ اقتباس دیکھئے کہ :

"آنکھیں کھلیں تو کیبن اس بے خراش سکوت سے کراہ رہا تھا ۔ دیپ اس پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا ۔ یہ کس سے گفتگو کر رہا ہے ؟ اس نے بے لباس جسم کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اسے ہنسی آگئی ۔ دیپ ماڈل گرل سے محو گفتگو تھا " دیپ اس کے ہنسنے پر چونک کر اٹھا اور کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے بولا " تم بہت سرد ہو گیتا " گیتا مسکرائی اور دیپ کچھ خفیف سا کیبن سے باہر چلا گیا ۔ " پرچھائیں کو کون چھو سکتا ہے " گیتا نے کپڑے پہنتے ہوئے سوچا اور پھر ہنس پڑی ۔" (پرچھائیں ۔ انور خان)

ویسے انور خان میری رائے میں کرشن چندر سے بہت متاثر ہیں ۔

شفق کے اکثر افسانوں میں یکسانیت ہوتی ہے تاہم نئے افسانہ نگاروں میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ جدیدیت کی تحریریت کو سمیٹ لینے سے ان کا فن نئے افق سے روشناس ہوتا ہے ۔ بہ قول مہدی جعفر :

شفق کے افسانوں میں جنس جبلی حیثیت کی حامل ہے ۔ اس میں جذباتی اور رومانی سطح نظر نہیں آتی بلکہ اس کا انداز نفسیات سے متعلق ہے اور جبلی کیفیت میں ایک طرف پرسکون اور لطیف احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف کرب زدہ حیوانی زندگی اس طرح سیاہ ناگن کا خوف پیدا کرتی ہے لہٰذا اپنی پہلی صورت

ہیں یہ اولین گداز انسانی تقاضوں کے حصول کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف عصر حاضر کی سنگینوں اور زہریلے اثرات کا نتیجہ ہے اس طرح جنس ایک دہشت زدہ انجام کو پہنچتی ہے"۔

اس اقتباس کی بہترین مثال شفق کا افسانہ "ڈوبتا ابھرتا ساحل" ہے۔

عبدالصمد کے یہاں عرفانِ ذات کی جستجو ہے۔ ان کے ایک افسانے "ٹھہر جانے والا منظر" کا یہ اقتباس دیکھیے۔

"جب عرصہ تک حالت جوں کی توں بنی رہی، سورج اور زندگی کے مقابلے ہوتے رہے تو زمانہ اپنی چال چل گیا اور باہری ہوائیں آنے لگیں جس نے تہذیب کے نئے خدوخال ابھارے"۔

علامتی افسانوں میں یہ پیش رفت ڈاکٹر عتیق اللہ کو پسند آئی اور ان کی نظر میں ان تجربوں میں حقیقت کا سیدھا سادھا[۴] پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کی ژرف نگاہی یقیناً قابل صد ستائش ہے۔

اردو کے صف اوّل کے اہم نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے عبدالصمد کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"عبدالصمد کی کہانیوں میں کہانی پن کا ایک نیا اور اچھوتا احساس ملتا ہے۔ ایک گمبھیر، دل دوز، ڈرامائی فضا ان کی کہانیوں میں۔ قاری کے ذہن میں کچھ گرہیں لگاتی ہے، کچھ گرہیں کھولتی جاتی ہے وہ PARADOX سے بھی کام لیتے ہیں"۔ (عصری آگہی۔ افسانہ نمبر)

ستّر کے بعد کی نسل میں کہانی کی بازیافت کرنے والوں میں سلام بن رزاق، انور خان، شفق، عبدالصمد، انور قمر اور عبید قمر کے اسمائے گرامی واقعی اہم ہیں۔ "مجرم" "نامراد گوتم" "چمگادڑ" اور "گدائے سر رہ گذر" جیسے معیاری افسانوں کے خالق عبید قمر نے "کترن" لکھ کر ایک مکمل فن پارے کو وجود دیا ـــــ علامتی افسانوں میں اُسے سنگ میل کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ ساری علامتیں افسانہ نگار آس پاس سے ہی اخذ کرتا ہے۔ اور ان کے یہاں علامتوں کی سطح پر اسمار ادات یا اشیاء کو شامل کر لینے کی روش ہے۔ افسانے کی ابتدا سے علامتوں کی زیریں لہر اختتام تک رواں دواں ہے اور کمال تو یہ ہے کہ عام قاری بھی اس سے حظ اٹھاتا ہے۔

ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک معتدبہ حصہ ایسے افسانہ نگاروں کا بھی ہے جن کی آواز اصل میں مراقبے کی آواز MEDITATIVE آواز ہے۔ اس قسم کی افسانہ نگاری میں، افسانہ نگار کے انفرادی اور ذاتی خیالات اور احساسات کا اظہار ہوتا ہے اور یہاں افسانہ نگار کسی اور سے مخاطب نہیں ہے بلکہ اس میں ایک طرح کی خود کلامی یا خواب خرامی کی سی کیفیت ہے اس قسم کی کہانیوں کی ابتداء کسی جذبے یا فکر سے نہیں ہوتی بلکہ ایک غیر متعین کیفیت سے ہوتی ہے جس کا اظہار، افسانہ نگار، الفاظ کے سہارے کرنا چاہتا ہے یا پھر ایک غیر واضح خلش ہو سکتی ہے جو اظہار کے لیے بے تاب ہے۔ یہاں افسانہ نگار الفاظ کی تلاش کرتا ہے اور جب تک صحیح الفاظ نہ مل جائیں وہ خود بھی یہ نہیں جانتا کہ اسے کس قسم کے الفاظ کی تلاش ہے۔ ظاہر ہے ایسی کہانی جو نہ تو ناصحانہ ہے نہ بیانیہ اور نہ رزمیہ اور جس میں نہ تو کوئی سماجی مقصد ہے اور نہ ہونے کی کوئی بات ہے اور جہاں محرک کے نام پر ایک غیر واضح خلش ہے وہاں آپ ہی سوچیے کہ الفاظ کی تلاش کتنی شدید ہو گی اور جہاں ایسے الفاظ کی تلاش اتنی شدید ہو جو اپنی تاریخ، مفہوم اور CONNOTATION کے اعتبار سے موزوں ہوں وہاں الفاظ کے انتخاب کے معیار اتنے اہم مگر اتنے عجیب ہوں گے کہ اس کا خیال تو رکھا ہی نہیں جا سکتا کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو قاری اور افسانہ نگار کے درمیان مشترک ہوں اور نہ ہی اس کی فکر کی جائے گی کہ مروجہ ہیئت برقرار رہ سکے کہ سارا مسئلہ تو یہ ہے کہ ایک ایسی کہانی لکھ دی جائے جو اس غیر واضح خلش سے نجات دلا سکے لیکن ایسی کہانیوں کا سمجھنے والا ظاہر ہے کوئی اور نہ ہوگا اس لیے کہ افسانہ نگار کا خطاب کسی اور سے نہیں بلکہ خود سے ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کہانیاں وجود میں ہی اسی لیے آئی ہیں کہ خود افسانہ نگار کو بھی یہ پتہ نہ تھا کہ وہ کس لیے کہہ رہا ہے اور کس کے لیے کہہ رہا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ایسی دنیا میں لکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار تمدن کے بحران سے مایوس ہونے کے سبب باہر کی دنیا سے گریز کرنے لگتا ہے اور خود میں پناہ

لینے لگتا ہے۔ اس اندرونی اور داخلی دنیا میں جہاں اس کا آئیڈیل ہے، اس کے احساسات ہیں اور پھر ماضی کی یادیں ہیں اور ان سب نے مل کر ایک خفیہ اور پوشیدہ باغ SECRET GARDEN بنایا ہے جس کے دروازے وہ دوسروں پر بند کر سکتا ہے اور کچھ لمحے سکون سے گزار سکتا ہے کہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر بیرونی دنیا میں کچھ حاصل نہ ہو سکا تو کچھ بھی نہیں بگڑا کہ اصلی اور حقیقی دنیا تو اس کی داخلی دنیا ہے یا وہ خود ہے۔ کیا ایسی کہانیاں علامتی کہانیاں کہی جائیں گی؟ شاید نہیں کہ بقول وزیر آغا

> "علامت تو قاری کو ایسے تصور کی طرف لے جاتی ہے جو تمام انسانوں کا مشترکہ تجربہ ہے اور یہی چیز علامت کے بقا کی ضامن بھی ہے۔ جیسے ہی علامت اپنے تصور سے جدا ہو کر، کسی فرد کے آزاد تلازمۂ خیال کا حصہ بن جاتی ہے اس میں فریقِ ثانی کے شرکت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور جب علامت یا تجربے میں کسی دوسرے کی شرکت ناممکن ہو تو اسے علامت کہنے کے بجائے مجذوب کی بڑ کہنا مناسب ہے۔"
>
> (اردو شاعری کا مزاج ۔ وزیر آغا ۔ ص ۸۹-۴۸۸)

ایک عجیب سی سازش یہ ہے کہ ایسی کہانیاں لکھی جائیں جو کسی کی سمجھ میں آ ہی نہ سکیں۔ ظاہر ہے دوسرے لفظوں میں افسانوی ادب کو UNPOPULAR بنایا جائے یا ANTIPOPULAR لیکن اس سے نقصان تو پہنچے گا زبان و ادب کو یہ اور بات کہ کچھ نام اس عنوان اپنا قد بلند کر لیں گے لیکن فنی سطح پر ان کی تخلیقات کم کوشی اور زوال پذیری قرار پائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئے افسانہ نگاروں کو میٹھہ ورانہ رقابت اور معاصرانہ چشمک سے اوپر اٹھ کر دیکھنا ہی ہوگا کہ مجھ پر اعتراض کرنے والے اور مجھ سے اختلاف رکھنے والے یہ جان لیں کہ میری اپنی توجہ تو معانی کی طرف رہی ہے اور میری ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ افسانہ بجائے خود اپنے اندر ایک کا حامل ہو اس میں کوئی نیا خیال، نیا تصور ہو جو اپنے انفرادی کردار کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر یوں نقش ہو جائے کہ اس کی "زبانِ بے زبانی" بھی گفتگو بن جائے اور جو اپنے خاموش، پختہ اور سیاہ چھاپے میں بھی مختلف رنگوں کے ساتھ خود زبانِ حال سے بولتا سنائی دے اور وہ ایک "کچھ اور" کا احساس اس کی حیرت انگیز صفت ہو اور ایسا احساس کہ جو "ان کہا" ہے وہ ان سب پر بھاری ہے جو وہ کہہ چکا ہے کہ ——— یہی روح کے اچھوتے سرچشموں کا ادراک ہے۔ ✿

## بقیہ صفحہ ۴۳ عالم تمام

اب موقع ہے کہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ میں نے کہا، "پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں نے اپنے آپ کو اتنے بڑے گھر کا داماد بننے کا اہل نہیں سمجھا۔ دوئم مگر بہت اہم وجہ یہ تھی کہ میں تم سے وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا جس کی خاطر میں تم سے ملا تھا لہٰذا میرے لئے تمہارا مزید مصرف بے معنی ہو گیا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ میری ہو جانے کے بعد بھی تمہارا خود سپردگی کا یہ جذبہ کسی وقت دوسرے کے لئے بھی ابھر سکتا ہے۔ تمہارے جیسی لڑکی کا کیا اعتبار؟

یہ سن کر اسمار باقاعدہ سسکنے لگی اور بولی "میں ناحق آپ کی تلاش آج تک بھٹکتی رہی۔ آج مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ محض ایک سراب ہیں اور وہ بھی نہایت کم ظرف قسم کا سراب۔ افسوس کہ آپ نے ابا حضور کو صرف ایک دولت مند انسان ہی سمجھا اور ان کے دردمند دل کو نہیں دیکھا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میرے لئے وہ آپ کو پا کر کتنا خوش تھے۔ آپ نے میری خود سپردگی کو محبت کی معراج نہیں بلکہ میری کمزوری اور میرے کردار کی پستی سمجھا۔ آپ کو کیا معلوم کہ محبت میں اعتماد کی کس منزل پر پہنچ کر کوئی لڑکی خود سپردگی سے بھی گریز نہیں کرتی ہے۔ مجھے آپکی پست ذہنیت کا آج علم ہو گیا آپ تو حقیقی محبت کے ہلکے سے لمس سے بھی واقف نہیں" اتنا کہہ کر اسمار نے آنسو پونچھے اور قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا۔ میں سہم گیا۔ اف! نفرت کا کتنا وسیع سمندر اس کی آنکھوں میں امڈ آیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب اس نے اچانک میرے منہ پر تھوکا جھک کر بریف کیس اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

میں ششدر اور نادم کھڑا ہوا سوچتا رہا کہ مجھ سے بہتر امریکہ کے نگروہیں جن کو کئی ہزار ڈالر معاوضہ ملتا ہے اور مجھے کیا ملا؟ اسمار کی نفرت، محبتوں کا خلا اور کبھی نہ ختم ہونے والا کرب کا بوجھ۔ ✿

## شاهد میر

جو خستہ حال ہیں اور حشر سامانی میں رہتے ہیں
وہی کچھ لوگ تو فکرِ غزل خوانی میں رہتے ہیں

وہ کچھ تیرہ دیاروں کی سیاحت کرکے لوٹا ہے
کئی سورج فروزاں اس کی پیشانی میں رہتے ہیں

بلائیں لاکھ دریا اور سمندر سب ہے لاحاصل
کہ ہم تو غرق خود اپنی ہی طغیانی میں رہتے ہیں

سنہری دھوپ کا وہ ذائقہ چکھنے نہیں پاتے
جو پودے سبز جنگل کی نگہبانی میں رہتے ہیں

مکمل ہو نہیں پائی ہمارے گھر کی ویرانی
ابھی سائے ہمارے گھر کی ویرانی میں رہتے ہیں

مرے پیغام بے صوت و صدا کیا کوئی سن پائے
یہاں تو محو سب اپنی زباں دانی میں رہتے ہیں

سنا ہے لکھ رہے ہیں تشنہ لب صحرا کے افسانے
جو سر تا بہ قدم بھیگے ہوئے پانی میں رہتے ہیں

● شعبۂ لسانیات۔ گورنمنٹ کالج ۔ اسواڑہ۔

## مضطر مجازؔ

مرے سبب سے جدا تو نہیں وتدؔ میرا
کہ میرے سائے سے آگے نہیں ہے قد میرا

نبٹتا خیر سے کس کس حساب داں سے میں
خدا کا شکر کہ چھوٹا رہا عدد میرا

کنیز حکم یہ تیری تو وہ امانتِ خاک
فغاں کہ روح ہے میری نہ ہے جسد میرا

کتاب تیری تو آواز کو بہ کو میری
ترے زمان و مکاں، لمحۂ ابد میرا

تری ہوائیں، ترے بحر و بر، ترے قلزم
سفینہ میرا، بھنور میرا، جزر و مد میرا

میں کوئی میر تقی میرؔ تو نہیں مضطرؔ
کہ دم بھرے اسد اللہ خاں اسدؔ میرا

● ۲۰-۵-۱۶ - فرحت نگر، حیدرآباد - ۲۴

## غالب عرفان

خلوص و مہر بھی حالات کے دباؤ میں ہے!
مرا وجود دہکتے ہوئے الاؤ میں ہے!

میں سر بلند رکھوں سطحِ آب سے کب تک
تمام شہر ہی سیلاب کے بہاؤ میں ہے

ہوا کی ہم سفری چاہتی ہے برق روی
زمانہ ہے کہ رواجوں کے رکھ رکھاؤ میں ہے

یقیں کی صف میں دکھائی دیا بشکلِ گماں
اذیتوں کا وہ چہرہ جو دل کے گھاؤ میں ہے

نگاہِ وقت میں تاریخ کا سفر ہے اور
معاشرہ نئی قدروں کے بھید بھاؤ میں ہے

مفاہمت کی کسی راہ کا سراغ نہیں!
مخالفت کی فضا دم بدم تناؤ میں ہے

شعورِ ذات کا محور ہے جذبۂ عرفاںؔ
مگر یہ ذہن تو اعصاب کے کھنچاؤ میں ہے

● سائبان ایل ۱۵، سیکٹر ۸/۵-۴ نارتھ کراچی
کراچی ۷۵۸۵۰ (پاکستان)



فیروز عابد
ابڈبرن گورنمنٹ اسکول، ۴ - حیات خان لین، کلکتہ - ۹

# کہانی مجھے لکھتی ہے

میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا، کچھ پگھل رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا روشنی کی ایک بھی کرن باہر نہ آنے پائے ورنہ اپنی ہی نہیں سارے شہر کی پہچان پر بارود کا گھنا اندھیرا پھیلا دیا جائے گا اور ہر کوئی اپنی شناخت کے لیے آئینے خریدے گا اور جب خود اپنی پہچان بھی اپنے آپ نہ کروا سکے گا تو آئینے توڑ دے گا اور پھر اس کی کرچیں، پارہ زدہ کرچیں نسل در نسل لوگوں کو اپاہج بناتی رہیں گی۔

میرا پیارا شہر ہیروشیما بن جائے گا۔!

کون۔؟

میں ہوں۔!

ذرا دیکھ کر چلیے۔

لطیف آواز میں خوف کی گرد تھی۔

مختصر سی بات چیت۔ شک اور شبے کی ہزاروں گنجائشیں۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ سب ہی آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ روشنی کی کرن بھاگ کر باہر تو نہیں آگئی۔؟

ارے فلاں، تمہارے مکان کے چھپر سے روشنی بھاگ رہی ہے اسے روکو ورنہ آسمانی اور زمینی دونوں عتاب کے تم شکار ہو گے اور ہو سکتا ہے دو چار لاتیں ہمیں بھی لگا دی جائیں کہ تم نے اپنے بغل والے کو فلکی آفات کی متوقع آمد سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ مگر زمینی لات۔

کیا اس سزا کے بھی ہم مستحق ہیں۔

کالج کی فضا میں بارود سے بھی زیادہ خطرناک بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ دیمے کچھ اس طرح حرکت کرتے تھے جیسے سارا قصور ہمارا ہو۔ سارے گناہ ہم ہی نے کیے ہیں، ہم ان دیدوں کی حرکت سے کچھ اتنے ہراساں تھے کہ لان پر کھڑے ہو کر خواہ مخواہ اپنا دامن جھاڑتے، اپنی آستین ٹھیک کرتے جیسے کہ دھول جھاڑ رہے ہوں مگر مقصد تو یہ تھا کہ ہم نہتے ہیں، ہماری آستینوں میں خنجر نہیں۔

شگفتہ چہرے والے پروفیسر صاحب کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ انھوں نے اپنوں کے لیے بنائی گئی اپنی پہچان بدل لی تھی اب وہ دوسروں کے لیے ان کی پہچان بن گئے تھے یا پھر اپنی پہچان کو انھوں نے چھپا لیا تھا یا یہ کہ انہوں نے دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونک دی تھی مگر اپنا اندر اپنا دل اور اپنے دل کی اپنی پہچان کیا آنکھیں یہاں عیاری کر سکتی ہیں۔؟

نہیں کر سکتی ہیں ناعیاری۔؟

کہانی نے مجھے لکھنا شروع کیا آنکھوں نے دیکھنا، کانوں نے سنا، ناک نے بو محسوس کی، ہاتھ سینے پر بندھ گئے، پاؤں نے چلنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ دماغ کے کینوس پر کہانی نے لکھنا شروع کیا

جنگ۔ بلیک آؤٹ

پہچان

خلا خلا خاموشی

کہانی مجھے لکھتی رہی۔

ایسے میں ممات بالی سات کے ایک بند کمرے میں گھس گیا لیکن اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لیا کہ اس کے دروازے، کھڑکی اور اسکے چھپر سے روشنی تو نہیں آرہی ہے اس لیے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھٹک کر باہر آنا سزا کی بھٹی میں اپنے آپ کو ڈلوانا ہے اور ایک فرد کی غلطی اجتماعی سزا کے اعلان نامے پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی نے مجھے لکھا، اگر یوں ہوتا۔

دو ملکوں کی سرحدیں آپس میں دست و گریباں ہوئیں۔ اور پھر فلکی عتاب سے شہر کی بنیادیں ہلیں۔

زندگی نے لوٹ کر جا بیٹھنے کی رسم کو ایک متعفن گالی دی اور لنگڑے لولے

شہروں میں آدمی اندر اور باہر دونوں طرح سے اپاہج ہوگیا۔
اور پھر کچھ وعظ و نصیحت کے سہارے کہانی کار نے اپنا فرض نبھا دیا۔
لیکن سچ !!
ہاں سچ رقم کرنے کے لیے سماعت، بصارت اور نطق سب ۔۔۔۔
دیکھتے میں بھی بہکنے لگا اور وعظ و نصیحت کی طرف خواہ مخواہ مڑنے لگا،
ٹھہریئے !
قلم انگلیوں میں پھنسا ہے۔ دماغ کے کینوس پر اپنے ملک کے علاوہ پورب پچھم اور دکھن کے پڑوسی ممالک بھی ہیں، کچھ دور اسلامی ممالک بھی ہیں مگر دور کی بات پھر کرلیں گے ۔۔۔۔
نسل در نسل کے نسلی امتیازات اور لسانی حد بندیاں اور مذہبی تعصبات

جائے پناہ! ؟
تھوڑی دیر کے لیے سوچنا پڑا
آواز گونجتی رہی
جائے پناہ ! ۔ جائے پناہ !!
سب کچھ جیسے گڈمڈ ہوگیا اور تب ہی میں نے اپنے دو پرانے کرداروں کو اپنے قلم کی نوک سے ایک بار پھر پکڑنا چاہا
"میں نہیں جانتا تمہاری باتوں میں کتنی سچائی ہے اور کتنی گہرائی اور اور۔۔۔۔۔۔"
"رُک کیوں گئے؟ ۔ کچھ اور جوڑنا ہو تو جوڑدو ۔ !!"
"نہیں میں اپنے اعتماد کو مجروح کرنا نہیں چاہتا۔"
"گویا تم اعتماد کرتے ہو اور لفظ اعتماد کے صحیح استعمال سے واقف ہو لفظوں کے صحیح استعمال ہی نے تو دھوکے دیے ہیں۔ سچے سچائے مفہوم سے برگزیدہ جملوں نے ہی تو راہوں کو پُر آشوب بنایا ہے۔ ہم نے لفظوں کا اتنا صحیح استعمال کیا کہ ۔۔۔۔"
"رُک کیوں گئے؟ مکمل کرلو ۔ پوری بات کہدو ۔"
آج تک کسی بھی آدمی نے پوری بات کہی ہے ۔ ؟ صبح سے رات اور رات سے صبح تک اس نے اپنی باتوں پر غلاف در غلاف لفظوں کی ساحرانہ، ملمع سازی کی ہے۔ تقریر اور تحریر کے شور و دم کی خارجی چمک کی تہہ میں سیاہ قول و فعل۔
ان لفظوں کے استعمال پر بھی لاکھوں کتابیں ہیں مگر ۔
مگر کیا ۔ مگر مچھ کے آنسو ۔ ؟!

خاموش !!
اُف ! اس خود کلامی سے کس طرح بچا جائے ۔ ؟
ان دو کرداروں کا سہارا نے کر میں خود کلامی میں مبتلا ہوگیا
دل کا بوجھ بڑھ گیا ۔ اوپر بہت اوپر زمین پھیلتی گئی ۔ نیچے بہت نیچے سب کچھ سمٹتا گیا ۔ !
میں خواہ مخواہ اوپر اٹھنے کے قابل نہیں لیکن زبردستی کوئی نیچے دبانے کی کوشش کرے تو پھر قلم کی مات سامنے آتی ہے ۔
لیکن !
قلم کی اہمیت پر زور دینے والے کیا اپنے دلوں کو کھنگال کر کچھ کہنے کی جرأت کرتے ہیں ؟ ۔
جرأت ! ؟
اس لفظ کی تشریح کے لیے ۔
کرداروں کو میں نے اپنے قلم کی نوک سے جھٹک دیا ہے لیکن کیا اس طرح ہر بار اپنے وجود کو جھٹکنے سے بات بن جاتی ہے ؟
کہانی مجھے لکھتی رہی ۔
ریکھائیں صحیح نہیں ہوتیں
امن امن جنگ
جنگ جنگ امن
یاس یاس امید
امید امید یاس
میں سات بائی سات کے کمرے سے باہر نکل آیا
ہر طرف ریڈیو کی آواز گونج رہی تھی ۔
ہفت اقلیم کے صدر مملکت اور سربراہوں کی کانفرنس پر ریڈیو رپورٹ پیش کی جارہی تھی ۔
چاندنی سے بھی زیادہ سبک اور سجیلے جملے، مسکراتے ہوئے مستقبل کی بشارت ۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ میں دوڑتا ہوا
سات بائی سات کے کمرے میں پھر گھس گیا
اور غالب اور آہنگ غالب پڑھنے لگا ۔ !

کرشن موہن

# ناگ پوجا

پالن ۔ نکتہ دانی اور درازیٔ عمر
دولت اور زرخیزی ، صحت اور کمال
ان سب کا سمبل ہے سانپ
ایسی باتیں سنکر دل جاتا ہے کانپ
وائے جہالت' وہم پرستی ، ذہنی پستی ، رنگِ زوال

ناگ پجاری سانپوں کی تصویروں پر
دودھ چڑھائیں' پھول اور پھل
اور چاول
ناگ پجارن مندر میں
منتر پڑھ کر رقص کرے
پیشین گوئی سے بھگتوں کے زخم بھرے
کیسا ہے وشواس کا وِش
جس نے سادہ لوحوں کو گمراہ کیا ، مدہوش کیا
اہلِ عقل و ہوش کو بھی خاموش کیا ۔

● ۵۸ ، پشپانجلی ، آئی پی ، ایکسٹینشن ، پارٹ II ،
دہلی ۱۱۰۰۹۲

اندر سروپ دت نادان

# استفسار

اے دشت غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
وہ ہاتھ کس کا ہاتھ ہے
جس کے اشارے پر یہاں
چلتی ہیں غم کی آندھیاں

اے دشت غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
کس چارہ گر کے فیض سے
آباد ہیں اس دشت میں
بے چارگی کی بستیاں ،

اے دشت غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
کس ڈال کا پنچھی ہے وہ ،
جس کے پرِ پرواز نے
بخشی ہیں تم کو پستیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
اس زخم زار وقت سے
روٹھی ہوئی ہیں کس لئے
رنگیں ، نظر کش تتلیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کچھ تو کہو ، کچھ تو کہو ،
اُس شہر کا بھی نام لو
جس کے دھوئیں کی اوٹ سے
برسی ہیں تم پر تلخیاں

● پی - ۳ / ۲۶۹ ، پچھم وہار ، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳



**مجید جمال**

۲۰ - سیکٹر بی ، دہلی گیٹ ، اورنگ آباد - ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

# کٹی پھٹی تصویریں

دوپہر دو بجے گھر سے نکلا تو میرے ذہن میں کئی لوگوں سے ملنے کی ایک لمبی فہرست تھی۔ گھر سے دو تین کلو میٹر دور ایک سکڑی گلی میں کچھ لڑکے بھاگتے ہوئے واپس لوٹ رہے تھے۔ میں نے گاڑی روک کر بھاگتے ہوئے الف سے پوچھا "کیا ہوا" الف نے گھبراہٹ اور غصے میں سوال کیا "کہاں جانا ہے؟" میں نے پھر سوال دہرایا "کیا ہوا" الف نے پھر پوچھا "کہاں جانا ہے" سوال در سوال کا سلسلہ جب بڑھنے لگا تو میں نے ب سے جو ہماری گفتگو سننے کے لئے رک گیا تھا پوچھا کیا ہوا؟ ب نے فوراً جواب دیا دنگا ہو گیا ہے میں نے شکریہ ادا کیا اور گاڑی پلٹائی۔ تو الف نے حقارت بھری موٹی سی گالی دی اور بولا "ہم تو اپنے والا سمجھ کر پوچھ رہے تھے"۔ صدر راستے پر آکر میں نے سوچا محلّے کے غنڈوں میں جھگڑا ہو گیا ہو گا ختم ہو جائے گا۔ غنڈہ گردی آج کل بہت بڑھ گئی ہے۔ پروگرام کے مطابق مختلف دفاتر میں گیا لیکن سب جگہ لوگ اکھڑے اکھڑے نظر آئے فون کھن کھناتے رہے فون پر گفتگو کرنے والے جو کچھ سن رہے تھے کوشش کر رہے تھے اس کا کوئی تاثر ان کے چہرے پہ نہ آئے۔ اس طرح کے ضبط سے ان کے چہرے پر اسرار ہو گئے۔ پانچ بجے آخری دفتر پہنچا جو ایک دوست کا اسی کی فیکٹری میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا "شہر میں دنگا ہو گیا ہے" واپس گھر چلے جاؤ! مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں سوچنے لگا، میرا گھر کہاں ہے؟ میں اپنے گھر ان سلگتے ہوئے گھروں کو پھلانگ کر کیسے پہنچ سکوں گا۔ میرا گھر جو آگ کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے۔ وہاں پہونچ کر بھی میں کیا کروں گا۔ لیکن مجھے جانا ہی چاہیئے۔ کہ صرف اسی گھر میں دو مدھم موم بتیاں اور چار چنگاریاں میری منتظر ہوں گی اس کے بعد جو ہو گا ہو گا اس دوست کا یہ مختصر جملہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا کیونکہ اس نے آج تک اتنی مختصر بات کبھی نہیں کی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی گفتگو کے لئے وہ کم سے کم پندرہ منٹ خرچ کرتا تھا۔ مجھے ایک دم خیال آیا یہ دوست ب ہے اپنے والا نہیں۔ اپنے والا ہوتا تو پہلے پوچھتا کہاں جانا ہے؟ میں اور میرے والے ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ کیا ہوا۔ اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ کیا ہوا تو شاید ہم یہ بھی طے کر پاتے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ ہم تو صرف دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں ایک پوچھتا ہے کیا ہوا۔ دوسرا پوچھتا ہے کہاں جانا ہے۔ سچ سچ مجھے بھی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے اور کیا ہوا ہے؟ میں نے اس دوست سے تمام تفصیلات پوچھیں اس کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ جھوٹ لگا۔ کیونکہ انہیں راستوں سے تقریباً اسی وقت میں بھی گزرا تھا تب تو سبھی کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ دو دھرموں کے لوگ ایک دوسرے کو نشٹ کرنے پر تل گئے۔ فساد کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ایک دھرم کے لوگ دوسرے دھرم میں سدھار کرنا چاہتے ہیں میرے جی میں آئی آج کی لڑائی فیصلہ کن ثابت ہو۔ روز روز کے مرنے سے اچھا ہے آدمی ایک ہی مرتبہ مر جائے۔ سارے بھگوان مل کر ایک جنگ لڑیں اور سب کو مار ڈالیں جو بچ جاتے ان کا خدا، دھرم، ذات پات ایک ہی ہو۔ مجھے گہری سوچ میں دیکھ کر میرے دوست نے ازراہ ہمدردی پوچھا میری گاڑی لے جاؤ۔ میرا ڈرائیور لے جاؤ۔ میرے دو چار آدمی لے جاؤ نہیں تو ایسا کرو یہیں ٹھہر جاؤ گھر فون کئے دیتا ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور کہا ان سب کی ضرورت نہیں ہے میں چلا جاؤں گا۔ آدھے گھنٹے تک میرا فون نہ آئے تو تم مجھے فون کر لینا۔

واپسی پر انہیں راستوں سے گذرا تو وہ سب کچھ سچ نکلا جو میرا دوست بتا رہا تھا بس وقت کا فرق تھا۔ راستوں پر گاڑیوں کے کانچ کے ٹکڑے، اینٹ پتھر اور خون کے دھبے موجود تھے۔ صدر راستوں پر کھیل ختم ہو چکا تھا۔ گلیوں میں جلا دو، کاٹ ڈالو، چیر دو پھاڑ دو کی آوازیں آ رہی تھیں میں نے زندگی میں کسی بھی جاندار کو اتنی دل جمعی سے لڑتے نہیں دیکھا تھا۔ حملہ کرنے والوں اور دفاع کرنے والوں کی آوازیں یکساں

خوف جھلک رہا تھا۔ اتنی بھیڑ اور بھاگ دوڑ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ہر طرف دھواں دھواں سا منظر تھا۔ میں نے گھبرا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ خدا، بھگوان، گوڈ ، والے گرد و رتے جھگڑتے رہے اور میں ہائی وے پر پہنچ گیا۔ جو نسبتاً محفوظ تھا۔ مجھے ایک عجیب سا ناستک خیال آیا اور مجھ پر پاگل پن سوار ہو گیا۔ میں سوچنے لگا پراچین کال اور چودھویں صدی ہجری تک بھگوان اور خدا اپنے بندوں کی رکھشا کرتے تھے بلکہ اور پندرھویں صدی ہجری میں بندوں کو نہ صرف خود کو بلکہ خدا اور بھگوان کو بھی بچانا ہے۔ اے بھگوان، اے خدا میں نے تجھے خوش کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ خود بھوکا رہا اور تیری مورتی پر پرشاد چڑھاتا رہا۔ مسجدوں میں پنکھے لگاتے اور خود جھلستی سڑکوں پر ننگے پیر پھرا۔ مندر مسجد بنانے تیرے چاہنے والوں کی سمادھیاں اور مقبرے بنانے اور خود جھونپڑی میں زندگی گذار دی۔ ہے بھگوان، اے خدا تو کیسی بھینٹ کیسی قربانی چاہتا ہے۔ اگر میں نہیں رہوں گا تو تو بھی نہیں بچے گا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میرے تین حواس گم ہو گئے۔ اور دو کی قوت بڑھ گئی وہ تھی قوتِ سماعت و بصارت۔ کبھی کبھی سونگھنے کی صلاحیت بھی جاگ جاتی اور بارود کی بدبو جو پٹاخوں کے پھٹنے اور شکار پر گولی چلانے کے بعد خالی بندوق کی نالی سے نکلتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے ابھرتی، سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ گھٹن ہونے لگتی اور پورا جسم آنکھ اور کان بن جاتا پھر اچانک یوں ہوا کہ میری روح جسم کا گھر چھوڑ کر ہواؤں میں گشت کرنے لگی۔ جسم اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ بچوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ روح بے تاب، بے چین ہواؤں میں چھپی ان دیکھی آنکھیں اور کان بن کر پانچ دن تک تڑپتی، پھڑکتی رہی۔ پانچ دن کے بعد حالات معمول پر آگئے۔ میرے سارے حواس پھر جسم کے پنجرے میں جمع ہو گئے زندگی ظالمانہ رفتار سے دوڑنے لگی میرے اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے پایا۔ کچھ جملے میرے کانوں میں اور کچھ عکس میری آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔

پہلا عکس۔

نتھو دو برس سے اخبار تقسیم کرنے کا کام کر رہا تھا۔ جن لوگوں کے گھر وہ اخبار پہنچاتا ان لوگوں نے کبھی نتھو سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ سوائے چند جملوں کے جو اکثر گھروں میں اس نے باجے میں بھری آواز کی طرح سنے۔ اخبار دیر سے کیوں آیا؟ کل کا اخبار کیا ہوا؟ کل اخبار پھٹا ہوا نکلا، اس مہینے چار اخبار کم تھے! پیسے بھی کم لیں گے؟ ان جملوں کے سوا کبھی کسی نے پلٹ کر نتھو کو دیکھا تک نہیں تھا۔ نتھو سوچتا اگر وہ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ آج نتھو بھوکا ہے۔ آج نتھو بہت خوش ہے تو کم سے کم اسے جھڑک ہی دیں۔ نتھو کو لگتا کہ وہ انسان نہیں سائیکل ہے۔ جس کا کام ہے اخبار وقت پر پہنچا دینا۔ لیکن پچھلے چار دنوں میں نتھو نے ان سبھی لوگوں میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی۔ اب ہر آدمی اس سے بڑے چاؤ اور چاہ سے باتیں کرنے لگا تھا اچانک نتھو کو لگا کہ وہ بہت اہم آدمی بن گیا ہے۔ لوگ اب اخبار سے زیادہ اس کی باتیں سننے کے منتظر رہنے لگے ہیں۔

فساد کی وجہ سے جن علاقوں میں کرفیو ہوتا ان کو چھوڑ کر بقیہ محلّوں میں اخبار تقسیم کرنے کا کام جاری تھا۔ نتھو نے دیکھا جو لوگ اسے گھاس نہیں ڈالتے اب چائے اور ناشتے سے اس کی تواضع کرنے لگے "کیا خبر لائے ہو نتھو" "کیا حال ہیں؟" اس قسم کے جملوں سے اس کی آمد کا خیر مقدم کیا جانے لگا۔ دوسرے محلّوں کے چشم دید واقعات سننے کے لئے لوگ بے تاب رہتے۔ نتھو کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جو خشک کام وہ مسلسل پچھلے دو برسوں سے کر رہا تھا وہ اتنا دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مختلف محلّوں کے حالات کچھ سچ کچھ اپنے تخیل اور زورِ بیان سے جو اچانک نجانے کہاں سے اس میں عود آیا تھا۔ بڑے مزے سے چٹخارے لے کر بیان کرتا۔ زندگی بھر کی خاموشی کو آواز ملی تو مانو تالاب کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ایک صاحب نے اس کو مشورہ دیا کہ کل وہ اخبار الٹے سرے سے تقسیم کرے۔ اس طرح خبروں کا تانا بانا مکمل ہو جائے گا۔ دوسرے دن اس نے ایسا ہی کیا۔ پہلا اخبار اس گھر میں ڈالا جہاں کل آخری اخبار ڈالا تھا۔ اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی کیونکہ آج اس نے لوگوں کو بروقت آگاہ کیا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ الٹے سرے سے یہ بات دوسرے محلّوں میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ کہانی ایک ہی تھی لوگ، اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے، پٹرول اور سوڈے کی بوتلیں جمع کر رہے ہیں۔ لاٹھیاں، چاقو اور تلواریں بھی ہیں۔ مختلف محلوں میں حملے کا وقت ایک ہی بتایا تھا۔ ان سب علاقوں میں دنگا ہوا۔ اور کرفیو لگ گیا۔ چند دنوں کے بعد حالات معمول پر آگئے۔ لوگوں نے اس سے بات کرنا بند کر دی۔ پھر وہی ٹیپ کئے جملے "اخبار دیر سے کیوں لائے؟" "کل اخبار پھٹا ہوا نکلا" نتھو کو بہت برا لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ اخبار بیچنے کا کام چھوڑ کر کوئی ایسا کام شروع کرے جہاں لوگ اس کی بات دھیان

سے سیٹیں۔ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آئی اس نے طے کیا کہ وہ ایک سیاسی پارٹی کا ممبر بن جائے گا۔

دوسرا عکس۔

وہ بہت غریب گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے زندگی بھر محنت کی۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد کالج میں ملازمت کرلی۔ ملازمت ملنے پر بھی اس کی محنت کرنے کی عادت برقرار رہی وہ مقالہ لکھ کر ڈاکٹر بن گیا۔ اس کی ڈاکٹریٹ پر کئی دنوں تک کافی ہنگامہ ہوا۔ پھر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ جو اسے قطعی پسند نہ تھا۔ ایک اور ہنگامہ ہوا جس پر دہ بو کھلا گیا۔ ایک طالب علم لڑکی اور اس کے ناجائز تعلقات پر اخباروں میں خبر چھپی۔ مقدمہ بھی چل رہا تھا۔ اخبار میں نام چھپنا اسے پسند تھا۔ لڑکی بھی پسند تھی۔ مگر تشہیر کا طریقہ ناقابل برداشت تھا۔ جن دنوں اس نے شادی کی وہ بہت غریب تھا۔ غریب آدمی کو جس طرح کی لڑکی سے شادی کرنا پڑی وہ حادثہ آج تک اس کے دماغ پر نقش تھا۔ اکثر سوچا کرتا شادی کرنے میں جلد بازی نہ کرتا تو آج۔۔۔ لیکن کالج میں ملازمت ملنے کے بعد یہ بات وہ آہستہ آہستہ بھول گیا۔

وہ بہت خوبصورت نہیں تھا۔ قبول صورت اور ذہین بھی نہیں تھا۔ لیکن اس میں ایک لگن تھی جو دھیرے دھیرے کسی بھی کام کو مکمل کرنے کی وجہ بن جاتی۔ اس نے مکان بنایا تو دنیا بھر کے تمام نقشوں کو ملا کر ہر ڈیزائن اور ہر نمونے کو اپنے گھر میں گھول لیا۔ جیسے ایک ہی جھٹکے میں ساری دنیا جیت لینا چاہتا ہو۔ اس کا گھر دیکھ کر مجھے ایک ایسے آدمی کا خیال آتا جس نے ایک دن میرا کھانا خراب کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا اس نے چاول منگوائے اس میں تھوڑا دودھ تھوڑا دہی تھوڑا سا نمک اور شکر ملائی پھر گوشت کا سالن، دال اور سبزی ملائی اور خوب گھوٹ کر مزے لے کر کھانا کھانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے عجیب سی گھن آئی تھی۔ اسی طرح کی گھن رجب علی کا گھر دیکھ کر آتی ہے۔ میرا جی چاہتا کہ رجب علی کا تخلص رگڑا رکھ دوں۔

رجب علی اپنی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی شخصیت میں کہیں کوئی ایک تانا نامکمل رہ گیا تھا۔ کہاں یہ خود رجب علی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن یہ ضرور معلوم تھا کہ کہیں کوئی ادھورا پن ضرور تھا جو شروع ہی سے اسے کھوکھلا بنا رہا تھا۔ یہ خلا اکثر ابھر آتا اور وہ پریشان ہو جاتا۔ جب اس نے مقالہ لکھا تو سبھی کام اپنے ہاتھ سے اور بڑی محنت ہی سے کئے۔ فوٹو کھینچے خوشخط لکھا۔ مواد جمع کیا۔ کتابیں پڑھیں، تبادلہ خیال کیا لیکن اس کی یہ بہت کمزوری تھی کہ خود اسے اپنے آپ پر شرم آتی تھی۔ وہ جملے صحیح ڈھنگ سے نہیں لکھ سکتا، وجوہات تو سمجھ لیتا، نتائج بھی اخذ کر لیتا لیکن انھیں بالترتیب لکھنا اس کے لئے ایک عجیب مصیبت بن جاتا۔ فوٹو بہت اچھے کھینچتا لیکن وہ زاویہ جو فوٹو میں ابھرنا چاہئے اس کی گرفت سے نکل جاتا۔ لیکن اس کی مستقل مزاجی اس کو ہر کمزوری پر فاتح بنا دیتی۔ مکان کا نقشہ، اس کی وائرنگ، پلمبنگ، پینٹنگ، سبھی کچھ اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ مگر وہ صفائی وہ فن کاری چیزوں کو خوشنما بناتی ہے اس کی گرفت سے نکل گئی۔

وہ بنیادی طور پر اپنے آپ کا اظہار کرنے میں ناکام تھا۔ اسے اسٹیج پر کھڑے ہونے میں جھجک محسوس ہوتی۔ در پردہ رہنے کے باوجود اس کا جی چاہتا کہ اس کا نام چلتا رہے۔ لوگ اس کی عزت کرنے لگیں۔ ملازمت ملنے، ڈاکٹر بننے اور مکان بنانے کے باوجود اسے وہ عزت نہیں ملی جس کی خواہش میں وہ دن رات کام کرتا تھا۔

جس دن فساد ہوا وہ گھر ہی پر تھا۔ بہت گھبرایا ہوا۔ بنیادی طور پر وہ کمزور آدمی تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر اس کا مکان جل گیا تو پھر وہی بے سہارا زندگی جو بچپن میں گذر چکا تھا دوبارہ کیسے جئے گا۔ خوف سے وہ ایک لمحے کے لئے لرز گیا۔ پھر گھر سے نکلا اور پاس پڑوس کے لوگوں کو باخبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرنے لگا۔ نتیجے میں محلے کے کچھ لوگ رجب علی کے ساتھ ہو گئے۔ رجب علی کو ایک عجیب قسم کی لذت کا احساس ہوا اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ وہ فساد کے نتائج بھول گیا۔ رات بھر لوگ اس کے گھر کے چھت پر بیٹھے رہے وہ چائے پلاتا رہا۔ اتنے سارے لوگ اپنی مرضی سے بن بلائے اس کے گھر کبھی جمع نہیں ہوسکے تھے۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ ملازم ہوا تھا۔ ڈاکٹر بنا تھا مکان بنایا تھا۔ دوسرے دن محلے کے چند ایک آدمیوں نے ان سب لوگوں کو جو رات بھر جاگتے رہے تھے۔ سمجھایا کہ اس طرح ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھنا دوسروں کو شک میں مبتلا کر سکتا ہے اور کسی بھی فسادی کی توجہ مبذول کرا سکتا ہے۔ رجب علی کے کان تک جب یہ بات پہنچی تو اسے عجیب سا سکون ملا۔ اسے لگا کہ نام نہاد سمجھدار لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہیں "خوب" ان لوگوں کی گفتگو سے ایک طرح سے لطف حاصل ہوا۔

رجب علی پس منظر میں رہ کر بہت خوش تھا اس نے اپنی UNDER GROUND تحریک تیز کر دی۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ ان کی کالونی کے خوبصورت مکان دوسری قوم کے لوگوں کو اچھے نہیں لگتے۔ ان تیاریوں کی خبر دوسرے

محلّوں تک پہنچی۔ چوتھے دن کالونی پر حملہ ہوا۔ اگلے دن اخبار میں خبر چھپی۔ "ب" سیاسی پارٹی کے کاریہ کرتاؤں نے گلشن نگر پر حملہ کیا۔ رجب علی بہت خوش تھا۔ اس کی زندگی کا ایک خلا پورا ہوگیا۔

تیسرا عکس :-

پانڈورنگ کی عمر کے ۴۵ برس پورے ہوگئے۔ وہ دلت سماج کا سیدھا سادا آدمی تھا۔ غریبوں کے لئے اس کے دل میں بہت ہمدردی تھی۔ اس نے اپنے لئے ایک چھوٹا موٹا گھر بھی بنالیا تھا۔ وہ سماج سیوا کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا۔ پانڈورنگ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ صرف ایک دبی دبی خواہش تھی کہ لوگ اس کے اچھے کاموں کی سراہنا کریں۔ اس سے محبت کریں۔ اسے اب زندگی میں اور کچھ نہیں چاہیے سبھی کچھ تو ٹھیک تھا۔ بیوی بچے، بہو اور وہ خود کام کرتا۔ معقول آمدنی تھی۔ فساد کی رات اس کے محلے میں شانتی تھی۔ پھر بھی اسے نیند نہیں آئی۔ وہ سوچنے لگا ایسا کچھ ہو جائے کہ وہ آج کسی مصیبت زدہ کے کام آجائے تو اس کی دبی دبی خواہش کو تسکین ملے۔ لوگ اس سے پیار کرنے لگیں۔ اور کارپوریشن کے اگلے الیکشن میں اس علاقے سے اس کا انتخاب کر دیں لیکن دلت کو اونچی ذات کے لوگ ووٹ نہیں دیتے۔ پھر وہ سوچنے لگا محلے میں تین ہزار ہندو ہیں۔ ایک ہزار مسلمان اور سولہ سو ہریجن۔ مسلمانوں کی حالت دلتوں جیسی ہی ہے کاش ایسا کچھ ہو جائے کہ اس کو مسلمانوں کے ووٹ مل جائیں۔ یہ خیال آتے ہی اس کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ بڑی سرعت سے اٹھا اور بابا امبیڈکر کا جو مجسمہ اس نے پچھلے سال اپنے ہاتھوں سے نصب کیا تھا، شہید کردیا۔ رات کا اندھیرا اور مکمل سناٹا تھا۔ پانڈورنگ نے مٹی کا تیل لیا اور مسجد کے دروازے پر جو پٹلے سے کچھ دور پر لکڑی اور ٹین سے بنائی گئی تھی آگ لگادی پھر زور زور سے چلانے لگا اور نزدیک ہی جس طرف ہندوؤں کے مکان تھے پتھراؤ کرنے لگا۔ چیخنے چلانے کی آواز سن کر لوگ گھروں سے نکل پڑے۔ پانڈورنگ چلاتا رہا۔ یہ اونچی ذات کے ہندو اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، جے بھیم۔ جوابی نعرہ بلند ہوا جے بھوانی۔ اس ہڑبونگ میں دو ایک لکڑی کے کھوکے جو دکان کہلاتے تھے جلا دیئے گئے۔ پولیس آئی فوراً حالات قابو میں آگئے۔

دوسرے دن شام کو شانتی سبھا کے لئے پورے محلے کے لوگوں کو جمع کیا گیا۔ محبت اور امن کی اپیل کی گئی۔ پانڈورنگ نے بھی تقریر کی اور صرف اتنا کہا کہ وہ کمزوروں اور دُربل لوگوں کا ساتھی ہے۔ اگر مسلمانوں پر ظلم ہوا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دے گا۔ یہ جملے سن کر ہندوؤں کے دلوں کی دراڑ اور بڑھ گئی اس کے باوجود سبھی نے تالیاں بجا کر پانڈورنگ کی ہمت افزائی کی۔ پانڈورنگ کو بہت دکھ ہوا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ فساد کی وجہ سے کارپوریشن کا الیکشن ایک سال کے لئے ملتوی ہوگیا۔

چوتھا عکس :-

ضیاءالدین صاحب کو ریٹائر ہوئے ایک سال ہوگیا تھا۔ بہت شریف اور نیک دل انسان ہیں۔ سارے بچے کام پر لگ چکے ہیں بچیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ پنشن سے جو کچھ ملتا وہ کافی تھا۔ خاندان کو خوشحالی کی اس منزل تک پہنچانے میں انھیں کیا کیا نہیں کرنا پڑا۔ اسی لئے اب ان کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ اللہ کریں اور زندگی بھر کے گناہوں کی تلافی کریں۔ اس رات جب شہر میں دنگا ہوا تو ان کے محلے پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لئے وہ حسب معمول تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلے۔ مسجد کی سیڑھیوں پر کالی کالی کوئی چیز دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے سوچا کتا ہوگا۔ ذرا نزدیک جا کر غور سے دیکھنے پر وہ سکتے میں آگئے۔ ان کی سمجھ میں آگیا کہ کسی نے سؤر کا سر کاٹ کر شرارتاً مسجد کی سیڑھیوں پر ڈال دیا ہے۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد انھوں نے بڑی تیزی سے اس ناپاک سر کو اٹھایا اور نکڑ پر رکھی کچرے کی کنڈی میں ڈال کر اوپر سے خوب کچرا بھر دیا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے پھر پانی لا لا کر مسجد کی سیڑھیاں صاف کیں۔ گھر گئے نہا دھو کر کپڑے بدلے واپس مسجد میں آئے اور نماز شکرانہ کے لئے سربسجود ہوگئے کہ اللہ نے شر کا طوفان رفع دفع کرنے میں ان سے کام لیا۔ دوسرے دن صبح پورے محلے میں یہ بات گشت کر رہی تھی کہ رات کسی نے سؤر کا سر لا کر مسجد کی سیڑھیوں پر ڈال دیا تھا لیکن اللہ نے ایک سفید پوش فرشتہ بھیجا جس نے وہ نجس سر اٹھا کر کچرے کی کنڈی میں ڈال دیا۔ اگر لوگ دین پر عمل پیرا ہو جائیں تو خدا نہ صرف بندوں کی بلکہ عبادت گاہوں کی حفاظت بھی خود کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ان افواہوں کی اطلاع پولیس تک پہنچی۔ کچرے کی کنڈی سے وہ ناہنجار سر نکالا گیا اور جلا دیا گیا۔ ضیاءالدین صاحب نے رات کے واقعہ کی ہوا کسی کو نہیں دی تھی۔ جب ان کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو وہ پریشان ہوئے کہ کیا کسی نے انھیں دیکھا تھا؟ وہ پسینے میں شرابور ہوگئے۔ سوچنے لگے فرشتہ کون تھا وہ جو اپنی شرارت کو مدفون

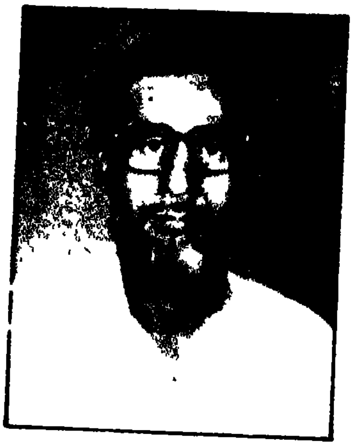
ہوتے دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔ یا وہ خود جو زندگی بھر کے گناہوں کی بخشش کے طلبگار جو بھی ہو، اللہ قبول فرمائے۔ آمین۔

پانچواں عکس :۔

صمد بھائی بارود گر بہت اچھے خاندان کے آدمی ہیں پہلے وہ افرادِ خاندان کے ساتھ کام کرتے تھے بعد میں اپنی الگ دکان بنالی۔ جو اچھی خاصی چل نکلی تھی۔ وہ صبح سے شام تک دکان پر رہتے کافی پڑھے لکھے اور ذہین آدمی ہیں۔ مختلف علوم کی معلومات رکھتے ہیں۔ دکان پر خالی وقت میں کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ بارود کی دکان پر جو لوگ بارود خریدنے آتے وہ سب نچلے طبقے کے غیر تعلیم یافتہ لوگ ہوتے جن سے وہ سوائے دھندے کے اور کوئی بات نہ کرتے اکا دکا پڑھا لکھا آدمی اگر ان کی دکان پر آتا تو وہ مال خرید کر چل دیتا۔ صمد بھائی کی خواہش ہوتی کہ وہ آدمی رکے اور ان سے باتیں کرے اس خواہش کے لئے وہ جاتے جاتے دام بھی کم لگاتے مگر گاہک کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہتے۔ فساد کی خبر ملتے ہی صمد بھائی نے SELF DEFENCE کے لئے بارود کے استعمال کا طریقہ بتایا تو محلے کے لوگ ان کی طرف جمع ہو گئے۔ وہ نئے نئے اس آبادی میں آئے تھے۔ سبھی لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کچھ ہندو بھی تھے۔ صمد بھائی تعصب پسند نہیں ہیں اس لئے ہندوؤں کو بھی SELF DEFENCE سمجھاتے رہے کبھی کبھی بات کرتے کرتے وہ ہندوؤں کے خلاف بھی بول دیتے مگر ان ہندو نوجوانوں کی نظر میں نادان ہیں۔ محلے کے کسی آدمی نے ان کو ٹوکا کہ رات کے وقت لوگوں کو جمع کرنا نہ صرف خلاف قانون ہے بلکہ دوسروں کو شک میں مبتلا کر سکتا ہے۔ صمد بھائی کو یہ بات بہت بری لگی ان کے سامعین جو اب ان کی تقریر سن سن کر بیزار ہو گئے تھے۔ اشارہ ملتے ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے صمد بھائی کی انا کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ تنہا دو گھنٹے تک ٹوکنے والے کے خلاف بولتے رہے بیچ بیچ میں ہندوؤں کے خلاف بھی بول دیتے۔ اسی محلے کے ایک نوجوان ہندو بچے نے رات ہی میں یہ بات شہر کے دوسرے حصے میں پہنچا دی نتیجہ میں اس آبادی پر حملہ ہوا۔ صمد بھائی بارود کا استعمال نہیں کر سکے کیونکہ ان کے گھر پر بارود کا اسٹاک تھا ہی نہیں ان کے لفظوں کی بارود سے پوری آبادی جل اٹھی۔

چھٹا عکس :۔

شانتا رام پاٹل صحت مند اور گرد جوان ہے کھیتی باڑی عزت و شہرت، بنگلہ کار، نام و نمود کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ سماجی کام کر کے کئی مرتبہ اقتدار کی کرسی پر بھی بیٹھ چکا ہے۔ لیکن کسی کمزور لمحے میں اصول کے لئے اس نے اقتدار چھوڑ کر حزب مخالف سے ہاتھ ملا لیا تھا آج کل اس کے پاس کوئی اہم کام نہیں تھا۔ کبھی کبھار کھیتی پہ چلا جاتا یا دن بھر گھر پڑا رہتا اسے وہ دن یاد آتے جب اس سے ملنے کے لئے دن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ فساد کی خبر ملنے پر وہ بہت نارمل تھا اسے نہ اچھا لگ رہا تھا نہ برا۔ دو تین دن تک جب امن بحال نہیں ہوا تو کچھ لوگ اس کے گھر آئے اور درخواست کی کہ وہ چل کر امن کا مورچہ نکالے وہ فوراً تیار ہو گیا۔ گویا وہ ان کا انتظار ہی کرتا رہا ہو کہ کوئی آئے اور وہ چل کر معاملہ رفع دفع کرا دے۔ وہ محلوں میں گشت کرنے لگا اور اس کی آواز پر لوگ جمع ہوتے چلے گئے گویا وہ بھی کسی کے منتظر رہے ہوں کہ کوئی مسیحا آئے اور دلوں کا میل دھو دے۔ دوسرے دن جو شہر میں انتظامیہ نے امن کمیٹی کی میٹنگ بلائی۔ شانتا رام پاٹل کو بھی مدعو کیا گیا۔ شانتا رام جو ایک مدت کے بعد تقریر کرنے کھڑا ہوا تھا۔ بڑی بے باکی سے بولنے لگا۔ اس نے کہا سب سے پہلے ان لوگوں کو پرکھنا چاہیئے۔ جو امن کمیٹی میں بیٹھے ہیں دراصل یہی لوگ ہیں جو امن خراب کرتے ہیں انتظامیہ کو چاہیئے کہ امن کمیٹی کا قیام مستقل طور پر کر دے اور یہ باعزت شہری ہر مہینے ملیں انہیں مصروف رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ امن کمیٹی کا قیام امن بگڑنے کے بعد عمل میں آتا ہے۔ اور امن بحال ہوتے ہی امن کمیٹی برخاست ہو جاتی ہے۔ شانتا رام نے انتظامیہ کو دھتکارا اور کہا اگر انتظامیہ بر وقت عمل کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ حالات قابو میں نہ آئیں۔ امن کمیٹی میں کسی نے شانتا رام پاٹل کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ اس لئے کہ وہاں ہر شخص اچھا بولنے کے لئے آیا تھا سننے کے لئے نہیں۔ اسی وقت منتری مہودے آئے اور امن کمیٹی میں بیٹھے لوگوں کو شانتی مورچہ نکالنے کیلئے کہہ گئے شانتا رام کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ سوچنے لگا اچھی بات کو با اثر بنانے کے لئے اقتدار کتنا ضروری ہے۔ ❁



## شائق مظفر پوری

[redacted]

وہم صورت یقین کیا کرنا
بات اتنی بہین کیا کرنا

آئینہ گرد، گرد ہو جائے
خود کو اتنا ذہین کیا کرنا

کوئی لمحۂ نفس نہ بے مصرف
قد سے زائد زمین کیا کرنا

قربتیں ظرف دیکھنا چاہیں
شکوۂ آستین کیا کرنا

خود حسیں خواب زندگی ٹھہری
اور اس کو حسین کیا کرنا

پیار کا سلسلہ کہیں سے ہو
چھوڑیئے چھان بین کیا کرنا

[redacted]

چڑھی ہوئی ہے وقت کی کمان پھر
کہیں سے سُرخ ہوگا آسمان پھر

جو سیل ریت کو بہا کے لائے گا
بنیں گے ساحلوں پہ کچھ مکان پھر

بصارتوں کی خاک ہے پڑی ہوئی
جو راستے ہوئے ہیں بے نشان پھر

خدا ہی آبرو کا میری پاسباں
منیر لے رہا ہے امتحان پھر

ہوا کا خون چوسنے لگی کرن
اڑیں گے بے پناہ سائبان پھر

چبا کے بات کو نہ بات کیجئے
کٹے گی ورنہ دیکھئے زبان پھر

[redacted]

کسی طرح بھی شہر کی زمیں کا لگان بھر
لہو پلا تو مل سکے گی یہ کہیں مکان بھر

کسی ورق پہ زندگی، لبوں کے پھول بھی کھلا
نہ صرف اشک وخوں سے ہی تو اپنی داستاں بھر

ابھی تو پیاس کی گھٹا ہر ایک سو ہے متحد
ابھی سے جذبۂ سعی نہ خواہشوں کے کان بھر

اگر تری ہوس کے بال و پر ابھی نکلے نہیں
نگاہ آسماں پہ رکھ اڑان بھر اڑان بھر

یقیں ہے اس کو زیست پر یقیں نہ آئے گا کبھی
ملی ہو جس کو زندگی قیاس بھر گمان بھر

اثر دل و دماغ پر نہ شائقؔ اس کا ڈھونڈیئے
وہ شعر جس کا ذائقہ ملے فقط زبان بھر

● ۱۱۰، اولڈ پرولیا روڈ، ذاکر نگر، جمشید پور (بہار)



**نامی انصاری**

۱۰/۹۷ ، پریڈ، کانپور-۱ (یوپی)

# اَدب کی بَدلتی قدریں

اتنا تو سبھی مانتے ہیں کہ زندگی ایک متحرک شے ہے، جامد نہیں، اس کے نامیاتی مظاہر چاروں اُور دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے جب کہا تھا کہ ؎

دمادم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

تو ان کا مقصد زندگی کی اس نامیاتی حقیقت کو ظاہر کرنا تھا۔ ادب چونکہ زندگی ہی سے توت نمو حاصل کرتا ہے اس لیے جب زندگی کی قدریں بدلتی ہیں تو ادب کی قدروں کا بدلنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ اس پر کوئی قدغن لگایا جاسکتا ہے۔

اردو ادب کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے صَرفِ نظر کر کے اگر ہم صرف موجودہ صدی کی ادبی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیں تو ان تبدیلیوں کے بہت سے گوشے از خود روشنی میں آجاتے ہیں۔ مثلاً اس صدی کے شروع میں داستانوں کا بڑا رواج تھا۔ قصبوں اور شہروں میں ہر شب عشاء کے بعد، کسی مقررہ جگہ پر دس دس بیس بیس لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ ایک شخص کتاب سے داستان امیر حمزہ پڑھتا تھا باقی لوگ پورے انہماک اور دل جمعی سے سنتے تھے اور یہ سلسلہ برسوں تک چلتا تھا۔ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب، ایک داستان کے بعد دوسری داستان، گویا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس کا کوئی اَنت نہیں تھا۔

جہاں تک شاعری کا سوال ہے وہ بھی سرتاسر رومانی تھی۔ غزل پر داغؔ، امیرؔ، ریاضؔ، اور جلالؔ وغیرہ کا رنگ چھایا ہوا تھا جس میں نہ تو زندگی کی نامیاتی حقیقت کا عرفان ملتا ہے نہ شاعر کی اپنی سوچ کا عکس، نئے خیالات کا گذر نہیں، پامال اور فرسودہ مضامین کو پیرایہ بدل بدل کر نظم کرنا اور رعایت لفظی و صنعت گری کے شعر کے حسن کو چمکانا ہی اس دور کے شعراء کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ دور ہندوستانی سماج کے ٹھہراؤ کا دور تھا۔ انگریزی سامراج مکمّل ہو چکا تھا اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی عوامل پوری طرح ان کے قبضے میں آچکے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی حالات سے قریب قریب سمجھوتہ سا کر رکھا تھا اور اپنی روکھی سوکھی زندگی پر قانع اور شاکر تھے۔ اس لیے یہ داستانیں اور یہ رنگین غزلیں کم از کم تخیل کی حد تک ان کی زندگیوں میں رنگ بھر دیتی تھیں۔ تفریح کے ذرائع محدود اور عام دسترس سے باہر تھے۔ اس لیے یہ داستانیں اور غزل سرائیاں ذہنی تفریح کا ایک مؤثر ذریعہ تھیں اور عوام و خواص دونوں ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جن چیزوں کا انسانی ذہن صرف تصوّر کر سکتا تھا، داستانیں ان کو مجسّم شکل میں پیش کر دیتی تھیں، طلسمی قالین، عمرو عیّار کی زنبیل، جادوئی گھوڑا، جام جمشید اور ایسی ہی بہت سی طلسمی اشیاء نہ صرف تحیّر اور استعجاب کے جذبات کو ابھارتی تھیں بلکہ تخیل کو بھی مہمیز کرتی تھیں۔ مگر آج جب یہ تخیلی اشیاء، سائنس اور الیکٹرانک کی حیرت انگیز ترقیوں کی بدولت، روزمرّہ کی زندگی کا جزو بن گئی ہیں تو داستانوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر، کمپیوٹر، جمبو جیٹ طیارے اور مختلف النوع کی دیگر ایجادات نے زندگی کی ڈگر کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ناممکن تھا کہ ان تبدیلیوں سے ادب اور شاعری کے موضوعات اور اسالیب متاثر نہ ہوتے۔

مختصر افسانہ اسی صدی کی دین ہے جس کی کونپل داستانوں کے بطن سے پھوٹی۔ سجّاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار تھے۔

اسی زمانے میں پریم چند نے بھی لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۶ء میں اپنی وفات تک، وہ مختصر افسانوں کے بے تاج بادشاہ رہے ان کے فن میں سادگی اور پرکاری کا حسین امتزاج تھا مگر بنیادی طور سے ان کے سامنے ادب کا ایک واضح اور متعین مقصد تھا جس کے لیے وہ عمر بھر اپنی ساری توانائی اور تخلیقی قوت صرف کرتے رہے۔ پریم چند کی روایت کو سدرشن، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی اور حیات اللہ انصاری نے آگے بڑھایا۔ پھر ترقی پسند تحریک نے نئی روایت کی بنا ڈالی جس کا آغاز اگرچہ انگارے کی اشاعت سے ہوا مگر بعد میں سماجی حقیقت نگاری اس کا مطمع نظر ٹھہرا۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، احمد علی اور قرۃ العین حیدر نے اردو کے افسانوی ادب کو نکھی قابلِ رشک بلندیوں تک پہونچا دیا۔ ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ زندگی کے نئے موضوعات بھی تلاش کیے۔ وادیٔ کشمیر کے افلاس سے لیکر بمبئی کے فٹ پاتھ تک کے حالات، نشیب فراز اور پنجاب کے کسانوں سے لے کر ملک کے محنت کشوں تک کے بے شمار سیاسی، سماجی، جنسی اور اقتصادی مسائل افسانوں میں شامل کیے گئے۔ اس دور کا اردو افسانہ عام زندگی کے مسائل سے اتنی مضبوطی سے جڑا ہوا ہے کہ ان افسانوں کے توسط سے ہندوستان کی پوری سماجی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد افسانوں میں علامت نگاری کی تحریک ابھری۔ کردار، مکالمہ، پلاٹ، ماجرا، سب کو شہر بدر کر دیا گیا اور مختصر افسانے ایک طرح سے انشائیے ہو کر رہ گئے۔ انشائیے بھی ایسے جن میں لطفِ زبان تک باقی نہ رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام قاری ان نام نہاد مختصر افسانوں سے بےزار ہو گیا۔ جو افسانہ لکھنے والے وہی افسانے کے قاری۔ مگر ایک طرح سے یہ سب ناگزیر تھا۔ اگر آج کوئی پریم چند کے موضوعات پر انہیں کے انداز میں افسانے لکھنے لگے تو اس کی کیا اہمیت ہوگی! یا کوئی ثاقب، عزیز، آرزو یا اثر لکھنوی جیسی شاعری کرنے لگے تو اسے کون پسند کرے گا۔ جدید شاعری کی طرح جدید افسانے بھی مقبول ہو سکتے تھے اگر ان میں واقعہ نگاری کا عنصر غائب نہ ہو جاتا۔ تبدیلیاں پہلے بھی ہوتی تھیں اب بھی ہوتی ہیں مگر فرق یہ ہے کہ اب ان کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ ایک منظر پر نگاہ جمنے نہیں پاتی ہے کہ دوسرا اور تیسرا منظر سامنے آجاتا ہے۔ ہم لوگ یہاں جدیدیت کی بات کرتے ہیں، یورپ میں تو پوسٹ ماڈرنزم بھی اب پرانا ہو چکا ہے۔ زندگی کی روز افزوں تبدیلیوں سے صرف ادب کے موضوعات ہی نہیں بدلتے بلکہ ان کا پورا ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ ادب کی جن قدروں کی ہم سینہ سپر ہو کر حفاظت کرتے تھے وہ قدریں بھی اب انتشار کی زد میں آکر چکنا چور ہوتی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر شاعری میں زبان کی صحت قدرِ اول کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاعر نے زبان کے معاملے میں ذرا سی آزادی لی اور سننے والوں کی بھویں تن گئیں۔

پیارے صاحب رشید تو اقبال کو اردو زبان کا شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ آج کل بعض جدید شعراء زبان سے کھلواڑ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں یہاں ایک جدید شاعر ساقی فاروقی کے تین اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں زبان کی شکست و ریخت نمایاں طور سے دیکھی جا سکتی ہے:۔

وہ بے حجاب مری یاد سے حجاب کرے — عجب گیا ہے کہ اب تک خیال میں نہ ملا
یاد سے رہا نہ ہو رات سے جدا نہ ہو — نیند سے خفا نہ ہو، خواب انتظار کر
آج روح اور دل، ایک ظلم سے تحمل — یار آدمی سے مل، سر حدیں اتار کر

شمس الرحمٰن فاروقی پاؤں کو पाँव اور سوئی کو सूई نظم کرنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے۔ جدید نقاد اپنی بے لچک ہیئت پرستی کے باوصف زبان کی اس شکست و ریخت کو نہ صرف گوارا کرتے ہیں بلکہ اس کا دفاع بھی کرتے ہیں یا کم از کم اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ زبان صرف اظہارِ خیال کا وسیلہ ہے بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں جیسا کہ پچھلے زمانوں کے لوگ خیال کرتے تھے، مگر اس کے باوجود ایک معیاری زبان کے اصول و قواعد سے بےجا اور غیر ضروری انحراف کر کے ایک بے مقصد شکست و ریخت پر اصرار کرنا عقلمندی کی بات نہیں کہی جا سکتی۔

اردو کے تخلیقی ادب میں شاعری کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ زمانی تقدم کے علاوہ بھی عوام و خواص میں اس کا اثر و نفوذ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اردو شاعری ہر دور میں یہاں کے تہذیبی ماحول سے ہم آہنگ رہی ہے۔ آج کے نئے نئے سائنسی ایجادات کے دور میں بھی یہ سرخرو ہے کیونکہ ہمیشہ کی طرح آج پھر یہ زندگی اور سماج کے بدلتے رشتوں کی عکاسی میں سب سے آگے ہے۔ موجودہ دور علامتی نظموں کا ہے، مختصر نظموں اور بلینک ورس کا ہے۔ ہائیکو اور سانیٹ اور ترائیلے پر بھی طبع آزمائی کی جا رہی ہے مگر نہ کوئی مثنوی اور مرثیہ لکھتا ہے نہ مسدس اور مخمس کا چلن ہے۔ پابند نظمیں بھی بہت کم لکھی جا رہی ہیں رباعیات اور قطعات بھی بہت کم سننے میں آتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں یہ نمایاں تبدیلی حالات کے دباؤ کے تحت رونما ہوئی ہے اس لیے اس تبدیلی کو روک دینا یا اس کو الٹ دینا ممکن نہیں ہے البتہ غزل اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے، اس وقت بھی اپنے پرانے فارم ہی میں موجود ہے اور شاید اسی فارم میں آنے والی صدی میں محفوظ و مامون رہے گی (آزاد غزل اور نثری نظم کو میں صنفِ سخن نہیں سمجھتا اس لیے اس کا ذکر غیر ضروری ہے)۔ غزل اپنی لچک دار شریت اور وسیع القلبی کے باعث کسی زمانے میں از کار رفتہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے موضوعات بدل جاتے ہیں، طرزِ اظہار بدل جاتا ہے، لفظوں کا برتاؤ بدل جاتا ہے مگر اس کے محبوبِ خلائق ہونے کا وصف نہیں بدلتا۔ کلاسیکی غزل میں معاملاتِ حسن و عشق، رندی و سرمستی، یا تصوف کے مسائل تھے اور انھیں کے وساطت سے شاعر انسانی زندگی کے اسرار و رموز کا انکشاف بھی کرتا تھا۔ موجودہ غزل ان موضوعات سے تقریباً خالی ہو چکی۔ نسائی حسن و جمال اب شاعری کا موضوع نہیں رہا، رند و مستی کا زمانہ ختم ہو گیا، عشقیہ جذبات کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ موجودہ سماج میں عورت، محبوبہ کا رول ادا کرنے کے بجائے تعلیمی ڈگریاں بٹورنے اور اقتصادی آزادی حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ اس پر اب وہ قدغن بھی نہیں ہے جو آزادی سے قبل کے دور میں تھا، اس لیے عورت اور مرد کے رشتوں میں دور رس تبدیلی آئی ہے جس کا اثر ادب اور شاعری پر بھی پڑا ہے۔ جدید غزل کے موضوعات اب روزمرہ زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاہدات سے آئے ہیں۔ سماج کی بنتی بگڑتی شکلوں اور انسانی خصائل کی دورنگیوں کو موضوعِ سخن بنایا جا رہا ہے۔ نیوکلیئر وار کے خطرے نے زندگی کی لایعنیت کو ظاہر کر دیا ہے مگر اسے پورے طور سے یورپ امریکہ اور روس وغیرہ ہی میں محسوس کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ممالک براہِ راست اس خطرے کی زد میں ہیں۔ ہندوستان کو دوسرے مسائل کا سامنا ہے۔ یہاں نیوکلیئر وار اور اس سے پیدا ہونے والی لایعنیت کو نہ کوئی محسوس کرتا ہے نہ اس کو اپنی سوچ کا حصہ بناتا ہے مگر اس کے باوجود مغرب کی تقلیدِ محض کے تحت یہاں بھی بعض نام نہاد جدید شاعر اپنی ذات کے بے نام اندھیروں میں ڈوب کر روشنی کی کرن پکڑنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف ہیں اور زندگی کی لاسمتیت اور لایعنیت کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مرشد نے یہی وظیفہ بتایا ہے۔ غزل کی زبان بھی بدل گئی ہے کیونکہ پرانی زبان نئے موضوعات کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ بعض شاعر اگرچہ فارسی زدہ زبان کے دلدادہ ہیں مگر غالب اکثریت کا رجحان گفتگو کی زبان کے تخلیقی استعمال کی طرف ہے اور یہی آج کی مقبولِ عام روش ہے۔ تاہم سادگی کے بجائے پیچیدگی، بیانیہ کے بجائے رمزیت و اشاریت، اور اکہرے پن کے بجائے تہ داری، آج کی شاعری کی واضح شناخت ہے، یہاں تک کہ عوامی مشاعروں میں بھی اب وفا اور جفا والی روایتی ڈکشن کی شاعری نامقبول ہے۔

جیسا کہ ماقبل عرض کیا جا چکا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کی روزافزوں ترقیوں نے روزمرہ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ کمپیوٹر سائنس اور الیکٹرانکس نے ہر شے کی ماہیت اور مقدار کو بیشتر حالات میں متعین کر دیا ہے یعنی دو اور دو چار کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اس لیے میری طرح بہت سے لوگوں کو اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ مشینی واقعیت کہیں انسانی جذبات کے سیال ذخیرے ہی کو خشک نہ کر دے۔ شاعرِ مشرق تو پہلے ہی خبردار کر چکے تھے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — جذبات مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ان دنوں شاعری میں جذبات نگاری کم سے کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ معروضی واقعیت

لے رہی ہے یعنی شاعری سے دل غائب ہوگیا ہے اور اس کی جگہ دماغ آگیا ہے۔ سائنسی عقلیت پرستی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہی، مگر شاعری کے حق میں یہ ستم قاتل سے کم نہیں کیونکہ شاعری پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے سے عبارت ہے نہ کہ ہتھوڑے سے شیشہ پاش کرنے سے۔

تنقید میں علمی انداز فکر کے بجائے ہیئت پرستی کو جدید تنقید کے نام سے ایک قابل فخر کارنامہ سمجھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی ہیئت پرستی نے حسن بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے انھیں بتوں کو پھر سے جوڑ کر مسند پر بٹھانے کی سعی ناکام جدید تنقید کا اپنے نوٹس کو دل سے... ایک جدید ناقد کے نزدیک فیض کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ اس نے اپنے عہد کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کا ادراک کیا۔ ہمارے معاشرے کے مظلوم انسانوں کے دکھ درد کے رشتوں کی زہرناکی کو نظموں میں تحلیل کر دیا ہے، بلکہ فیض کی اہمیت اس میں ہے کہ اس نے اپنے نئے تجربے پیش کیے ہیں اور اس کی شاعری میں تشبیہوں اور استعاروں کے نئے امکانات بروئے کار آئے ہیں۔ میر کا اپنے دور کے سیاسی انتشار سے کیا رشتہ تھا اور ان کے اشعار میں ان رشتوں کی کیسی دل آویز تصویریں پنہاں ہیں، اس سے جدید تنقید کو کوئی سروکار نہیں۔ اسے اگر سروکار ہے تو میر کے فنی دروبست سے، بیان کی پیچیدگی سے اور شاعرانہ پرواز تخیل سے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مریضانہ اور غیر سائنٹیفک رجحان ہے جس سے نہ ہم فیض کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں نہ میر کے ساتھ۔ یوں بھی جدید تنقید کا کوئی معین نظام فکر ہے نہ تنقیدی اصول، اس لیے آجکل یہ لاسمتیت اور لایعنیت کا سب سے بڑا شاہکار بن گئی ہے۔ مغربی تنقید کے اصول و نظریات کو بے سوچے سمجھے قبول کرنے اور ان کو اردو ادب پر منطبق کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جدید نقاد، کلیم الدین احمد بن گیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، اب تو تنقید میں محض گالیوں اور نازیبا بدکلامیوں کو بھی شگفتہ نگاری کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ادب میں بے ادبی جدید تنقید کا خاص الخاص تحفہ ہے۔ یعنی نئی ادب اور شاعری کے پرانے تہذیبی رکھ رکھاؤ، ہزاروں میل پیچھے ہٹتے ہٹتے ہڑپہ اور موہنجوداڑو تک پہونچ جاتے ہیں۔ ترقی پسند نقاد یا تو بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں یا مبہوت و متحیر۔ ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس، سردار جعفری، اختر انصاری اور منیب الرحمن کے قلم کو زنگ سا لگ گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جدید تنقید کی غوغا آرائیوں میں وہ کہاں کھڑے ہیں اور دور جدید کے تقاضے ان سے کیا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تنقید پر ایسا برا وقت شاید پہلے کبھی نہ پڑا تھا جیسا کہ اب پڑا ہے کیونکہ تنقید کا کاروبار اب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو اردو ادب کی تہذیبی میراث سے بے بہرہ اور خود نمائی اور خود ستائی کے دلدادہ ہیں۔ بہرحال یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرے رخ پر بعض ایسے سنجیدہ اور موقر نقاد موجود ہیں جن کے یہاں وژن ہے، فکر و نظر کی گہرائی ہے، ادب کی تہذیبی میراث کا شعور ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادب کے تفہیم و تجزیے کی دیانت دارانہ کوشش کا جذبہ ہے۔ موخر الذکر نقادوں میں پروفیسر ممتاز حسین، وحید اختر، بلراج کومل، گوپی چند نارنگ، عمیق حنفی، اسلوب احمد انصاری، شمیم حنفی، نبیل جعفری، نیر مسعود، عبدالمغنی اور وارث علوی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ادب بنیادی طور سے انسانی فکر و عمل کا فنکارانہ اظہار ہے۔ یہ صرف زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی تہذیب بھی کرتا ہے اور انسانی سوچ پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے اسالیب اور موضوعات میں کتنی ہی دور رس تبدیلیاں کیوں نہ واقع ہوں مگر یہ اپنی بنیادی قدروں، حسن، خیر اور صداقت کی جستجو سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ فن کار کی اپنی ذات بہت اہم سہی، مگر اس کو فرد اور سماج کے پس منظر ہی میں معنویت ملتی ہے۔ ان دنوں ذات کے مسائل اور وجود کے بحران کا چرچا کچھ زیادہ ہی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نیوکلیئر وار کے مسلسل خطروں نے انسانی زندگی کو بے وقعت بنا دیا ہے مگر ادیب اور شاعر اگر خود بھی زندگی کو لایعنی سمجھ کر آہ و بکا میں لگ گیا۔ یا ذات کی توڑ پھوڑ میں مصروف ہوگیا تو اس میں اور عام آدمی میں کیا فرق باقی رہے گا! اگر آنے والی موت کے خدشات سے زندگی کی تہذیب و تعمیر کا کام ٹھپ ہوگیا تو یہ دنیا رہنے کے لائق ہی نہیں رہ جائے گی۔ فن کار بہرحال موت کا نہیں زندگی کا نقیب ہوتا ہے۔ تیرگی، اوہام اور جہالت کا نہیں بلکہ حسن، خیر، صداقت کا علم بردار ہوتا ہے اس لیے زندگی کے سمندر میں تنکے کی طرح بہنا اس کے منصب سے بہت فروتر ہے۔ بحری جہاز کے کپتان کی طرح زندگی کی آخری سانس تک جہاز کے عرشے پر ڈٹے رہنا

[باقی صفحہ ۵۳ پر دیکھیے]



## نجمؔ عثمانی

[redacted]

وہ مرے اندر اگر ہے، میرے باہر کون ہے
روز و شب آخر یہ مجھ پر حملہ آور کون ہے

آہٹیں قدموں کی کس کے لے کے آتی ہیں رُتیں
ہر طرف بکھرا ہوا منظر یہ منظر کون ہے

کس نے ہستی کے نہاں خانے کو روشن کر دیا
ذات کے گہرے سمندر کا شناور کون ہے

آگ پر راہیں بناتا، پھول سا چہرہ لئے
زندگی کے اس سفر میں میرا ہمسر کون ہے

جانے کس گھر سے یہ آتی ہے سسکنے کی صدا
نجم دَر دَر کرب سے بے چین شب بھر کون ہے

[redacted]

میری نظروں میں ہر اک پل ایک ہی منظر ہے رقصاں
آگ کے اِک دائرے میں موم کا پیکر ہے رقصاں

ماہیٔ بے آب کی مانند میں بھی مضطرب ہوں
برق کے جیسی کوئی شئے جسم کے اندر ہے رقصاں

شہر دل میں روشنی کی اک کرن باقی نہیں ہے
ہو گیا مقتول سورج، رات کا خنجر ہے رقصاں

جانے کب سے پیر کے نیچے کی دھرتی جل رہی ہے
اور بارش کا پرندہ پیڑ کے سر پر ہے رقصاں

میں نمائندہ ہوں ایسی نسل کا اے نجم جس کے
ذہن میں ہر ایک لمحہ جانے کیسا ڈر ہے رقصاں

[redacted]

بچپن ابھی گذرا نہ تھا، چہرے پہ آئیں جھریاں
ماحول پر ڈالی نظر، رخصت ہوئیں سب شوخیاں

سب زندگی کے سانحے فلموں کے منظر بن گئے
انسان رخصت ہو گئے بس رہ گئیں پرچھائیاں

سب راستے مسدود ہیں ملنے کے اپنے آپ سے
کوئی تعلق ہی نہیں ہے جسم و جاں کے درمیاں

ہم سب نفاق و بغض کے آسیب کے نیچے ہیں
کیوں چھیڑتے ہیں آپ پھر گنگ و جمن کی داستاں

خود اپنی دھرتی نجم تیرے پاؤں کے نیچے نہیں
حالانکہ اونچا سر مرا چھونے لگا ہے آسماں

سی۔ ایم۔ پی۔ ایف۔ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۵۸، دھنباد (بہار)



خورشید ملک

ناریان مگار، بستا نگما ہالیو، ۱۰۳۰۲۴ ایل

# عالم تمام

وقت کی مانند میں بھی متحرک ہوں جن میں ایک مقام پر زیادہ دنوں تک قیام نہیں کر پاتا ہوں۔ گو مجھے سیاحت کا قطعی شوق نہیں ہے مگر اس کے باوجود میں مستقل سیاحی کرتا رہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے چند اوراق کو دیکھنے سے دور رکھنے کی غرض سے بھاگ رہا ہوں کیوں کہ جب بھی ان اوراق کا کوئی حصہ میرے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے، میں تلملا جاتا ہوں اور کرب کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا وجود حسرتوں کے تنور میں جلنے لگا ہے۔ کسی نہ کسی طور سے اپنا ذہن ہٹائے رکھنے کی خاطر میں سکونت بدل کرتا رہتا ہوں۔ میں حتی الامکان تنہائی سے بھی گریز کرتا ہوں مگر اتنی احتیاط کے باوجود وہ اوراق اکثر و بیشتر میرے ذہن میں ابھر آتے ہیں اور میری سراسیمگی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اوراق بے ربط اور بے ترتیب انداز میں اجاگر ہو کر چبھنے لگتے ہیں۔

بات بہت پرانی نہیں ہے۔ ویسے بھی اگر کوئی بات ذہن پر اچھی طرح ثبت ہو تو وہ کبھی پرانی نہیں ہو سکتی ہے۔ میں ان دنوں کیمسٹری میں ایم۔ ایس سی کر رہا تھا۔ اسمارے آیا حضور آئے ہوئے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے۔ انہوں نے اولڈ بوائز لاج میں قیام کیا تھا۔ اسمارے میرا ان سے تعارف کرایا۔ میں ان کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نوابین کا رعب ماضی کے دھندلکوں میں قریب قریب گم ہو چکا تھا مگر ان کے کر و فر نے مجھے اس عہد کی یاد تازہ کرا دی جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر پڑھا ضرور تھا۔ اپنے چند روزہ قیام کے دوران انہوں نے اپنی امارت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے میرے بیرر کو بیش قیمت انعامات سے نوازا اور یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا عطیہ بھی دیا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں کے کھانے کا ذائقہ اور مینو آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ ان کے زمانہ میں تھا۔ انہوں نے گرمیوں کی تعطیلات میں اپنے وطن آنے کی دعوت دی بلکہ ہر حال میں آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ مگر ان کے رخصت ہوتے ہی میں مختصر میں پڑ گیا۔ مجھ پر عجیب قسم کی الجھن سی طاری ہو گئی۔ میں بہت بڑے ایک دوراہے پر کھڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔ مجھے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ میں کئی روز تک الجھن کے گرداب میں محصور رہا۔ مجھے دن میں سکون تھا نہ رات میں نیند آتی۔ آخر کار دو ذہنی کیفیت سے میں نے نجات حاصل کر لی۔ میں نے وہ راہ منتخب کی جو اسمارے کے شانہ بہ شانہ چلنے والی راہ سے قطعی منافی تھی۔ اس فیصلہ پر عمل کرنے کی غرض سے میں نے ایک دوسرے شہر سے ناطہ ترک کر دیا۔

آج کل میں امریکہ میں ادھر سے ادھر دوڑ رہا ہوں۔ نیو یارک، فلاڈیلفیا، واشنگٹن، ڈی سی، نیو یارک، شکاگو، لاس اینجلس جیسے بیشتر شہروں کی سیر کر چکا ہوں مگر امریکہ اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کو مکمل طور سے دیکھنے کے لیے پوری عمر بھی شاید ناکافی ہو۔ ویسے میں ساری دنیا کا ایک بار سرسری دورہ کر چکا ہوں اور دوبارہ تفصیلی دورہ کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ میری عمر ابھی اتنی مسافت طے نہیں کی ہے کہ میرے اعصاب جواب دینے لگ گئے ہوں۔ مجھے قدرت کی نعمتوں اور لطافتوں کو دیکھ کر میرے اندر صرف ایک ہی جذبہ بیدار ہوتا ہے اور میں حتی الامکان ان سے استفادہ کرتا رہتا ہوں مگر فی الحال میری توجہ کا مرکز امریکہ ہے صرف امریکہ۔ کہتے ہیں کہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر اس سے کوئی ٹکر لے سکتا ہے تو وہ صرف روس ہے۔ مجھے سیاست کی گندی تجارت سے قطعی دلچسپی نہیں ہے لہذا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ طاقت کی بالادستی دکھانے کی دوڑ میں کون سبقت لے گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر حصہ پر امریکہ کی چھاپ ہے۔ بہت سے ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ ممالک محض اس کی مالی امداد کی بنا پر اپنا وجود دنیا کے نقشہ پر قائم کیے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کو اس کی ناجائز اولاد کہا ہی جاتا ہے۔ اقوام متحدہ اور اس کے دیگر اداروں پر بھی امریکہ حاوی ہے۔

اسمارے کو میں نے پہلی بار آزاد لائبریری میں دیکھا تھا۔ وہ بڑے انہماک

سے نونس بنانے میں مشغول تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کہنے میں کہ ایک مخصوص عمر پر پہونچ کر ہر لڑکی حسین نظر آنے لگتی ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ بات صرف ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو جنسی طور پر بھوکے ہوتے ہیں۔ حسن کا ایک معیار ہوتا ہے جو کسی بھی علاقہ کی جغرافیائی حالت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ مگر میں جس علاقہ کا باشندہ ہوں اس کے معیار حسن پر اسماء پوری طرح اترتی تھی۔ اس کے حسن کی تعریف کرنے کے لئے میرا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے جہاں مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ اس کی تعریف کرنے کے لئے الفاظ تخلیق کرنا پڑیں گے جو مجھ جیسے غیر ادبی انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ جس کی تعریف کرنے کی مروّج تمام تشبیہیں اسماء کے حسن کے آگے ماند تھیں۔ بہرحال اس کو دیکھتے ہی میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہوگیا۔ میں اس سے ملاقات کرنے کا حیلہ تلاش کرنے لگا۔ لائبریری کے ایک اسسٹنٹ سے میری دوستی تھی۔ میں نے اس سے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا "پارٹنر وہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔ اس کا نام اسماء اسفندیار ہے، حیدرآباد کے ایک بہت بڑے سابق نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اسی سال آئی ہے۔ سائیکولوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی ہے"۔ اسماء کے بارے میں اتنا معلوم ہوتے ہی میرے تجسس کے فلیتے میں آگ لگ گئی اور اس سے متعارف ہونے کی خواہش میرے وجود کے اندر پھیلنے لگی۔

ظاہری طور پر اتنی عظمت رکھنے والا امریکہ حقیقت میں اتنا عظیم نہیں ہے۔ دوسرے ممالک کو مالی امداد سے نوازنے والے خود امریکہ میں بے حد غربت ہے، ٹیکسوں کی تعداد اور ان کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں مگر مجھے ان سے کیا لینا دینا؟ لیکن اس کا ایک ایسا تاریک پہلو میرے سامنے آیا جس سے اس کی قدر و قیمت میری نگاہوں میں بہت گر گئی۔ یہ بات سخت استعجاب کا باعث ہے کہ امریکہ اب تک اس تاریک پہلو سے بے خبر کیوں ہے؟ اگر باخبر ہے تو ناسور کی مانند رستے ہوئے اس پہلو کو کاٹ کر پھینک دینے کی تدابیر اختیار کیوں نہیں کی گئیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جان بوجھ کر کسی مصلحت کی خاطر اس کی پردہ پوشی کی جا رہی ہے؟ لیکن کسی عیب کو راز میں رکھنے کے لئے گرہ میں باندھے رہنا دانشمندی کی دلیل نہیں ہے۔ عیب کو جتنا بھی چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اس کی اتنی ہی تشہیر ہوتی ہے۔

اسماء سے متعارف ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ انسان کے بعض اہم کام بہت کوشش کرنے پر بھی پورے نہیں ہوتے ہیں اور پھر وہ کام اکثر خود بخود اور اچانک ہو جاتے ہیں۔ اسماء سے میرا تعارف ہونا بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ میں اس سے ملاقات کرنے کی ادھیڑبن میں گرفتار ہی تھا کہ ایک دن میرے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ پروفیسر رحمان نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا "ملک کے دفاعی فنڈ کے لئے یونیورسٹی کے سینئر پروفیسران کی بیگمات نے نمائش میں ایک کینٹین کھولی ہے جس کی منتظم خاص میری بیگم ہیں۔ ان کو کچھ والنٹیرز چاہئے۔ میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہاں اگر تم کو برتن بھی دھونے پڑیں تو ہرگز شرم نہ محسوس کرنا کیوں کہ تمہاری خدمت ایک بامقصد اور نیک کام کے لئے ہوگی"۔ ان کے حکم کے بموجب میں شام کو نمائش گاہ پہونچا اور بیگم رحمان سے ملاقات کی۔ کینٹین کے کچن میں چائے بنانے میں مصروف جس لڑکی سے انہوں نے میرا تعارف کرایا وہ اسماء اسفندیار تھی۔

امریکہ میں نگرو کافی تعداد میں ہیں۔ سیاہ رنگت، لمبے چوڑے اور کسے جسم والے نگرو جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہر شعبہ میں کام کرتے ہوئے ملتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر کا اصل ذریعۂ معاش کچھ اور ہی ہے۔ نگرو امریکہ کی گوری جلد والی عورتوں میں بے پناہ مقبول ہیں، رات کو سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، کلبوں میں، پارکوں میں، سینما گھروں میں اور دیگر نیم تاریک گوشوں میں نگرو دکھائی دیں گے اور ہر ایک کے پہلو میں کم از کم ایک امریکی عورت ضرور ہوگی۔ کچھ شہروں میں بازار حسن کی مانند اس کے باقاعدہ بازار ہیں جہاں دولت مند اور عیاش امریکن عورتیں ان سے سودے بازی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں خود جنسی بے راہ روی کا شکار ہوں مگر امریکی عورتوں کی ان کے تئیں بے حسی دیکھ کر سخت افسوس کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکہ کی آنے والی نسلوں کا اصل روپ کیا ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک وہ دن بھی آ جائے جب امریکہ کی نئی نسل دوغلی ہو جائے اور اپنی احادیت اور انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھے؟ گو اس کا ہٹلر کی مانند نسلی برتری کا کبھی دعوا نہیں رہا مگر اصل نسل کا خواہ وہ کیسی بھی ہو، خراب ہو جانا کوئی بھی گوارہ نہیں کر سکتا ہے۔

اسماء سے اچانک قطع تعلق کر لینے پر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے مجھ سے ملنے کی بارہا کوشش کی مگر میں نے اس کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا۔ مایوس ہو کر اس نے خط لکھنا شروع کئے۔ وہ میری بے التفاتی کی وجہ جاننے کی کوشاں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اسے اپنا قصور ہی معلوم ہو جائے۔ جواب حاصل کرنے کی کوشش میں اس نے ان ملاقاتوں کا حوالہ دیا جو میں نے اس کے ساتھ نقوی پارک میں، لال ڈگی کی شاداب جھیل کے کنارے، قلعے کے وسیع احاطہ کے سائبانوں میں اور تصویر محل میں کی تھیں۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے ان رومانی ایام کا واسطہ بھی دیا جو ہم دونوں نے آگرہ کے دیپ ہوٹل میں گزارے تھے۔ اس نے ان وعدوں کی دہائی دی جو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کئے

ہے۔ مگر میں اسے سرے سے بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا اسی لئے نہ تو میں اس سے ملا اور نہ ہی اس کے کسی خط کا جواب دیا۔ میں اس کی پرچھائیں سے بچنے لگا۔ حتیٰ کہ میں اس کے بارے میں سوچنے سے احتراز کرنے لگا۔

مسی سپی میں ایک نیگرو سے میری دوستی ہو گئی۔ وہ ایک بار میں گانا گانے کے لئے ملازم تھا مگر اس کا اصل دھندہ دوسرا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا "تم لوگوں کا معیارِ حسن قطعی مختلف ہے۔ تمہارے یہاں دبیز ہونٹ، بھاری پستان، لمبے قد، موٹے کولہے اور سیاہ رنگت والی عورت کو حسین سمجھا جاتا ہے۔ پھر تم لوگ چھریرے بدن، پتلے ہونٹ، چھوٹے پستان، پتلے اور سپاٹ کولہے اور گوری رنگت کی امریکن عورتوں کو کیوں کر برداشت کرتے ہو؟" میرے اس سوال پر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا "فرض کیجئے کہ آپ کو دال پسند نہیں ہے لیکن اگر آپ کو سو ڈالر محض دال کھانے کے لئے پیش کئے جائیں تو آپ اسے مرغن غذا سمجھ کر خوشی خوشی نوش کر لیں گے۔ پھر ہم لوگوں کو تو کئی ہزار ڈالر تک دیئے جاتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اپنے معیار کے مطابق حسن دیکھیں یا پیسہ، جب کہ موجودہ دور میں سب سے زیادہ اہمیت پیسے ہی کو حاصل ہے؟" اس کی دلیل سن کر میرے پاس خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا۔

اسمار سے میرا تعارف کیا ہوا کہ خوشیوں کے دہانے میرے لئے کھل گئے۔ بارہ روز کی نمائش میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ فاصلے کم ہوتے گئے۔ تکلف کی ہر دیوار ہم دونوں کی چاہت کے دھکے سے منہدم ہوتی چلی گئی۔ میں پروفیسر ریمان اور بیگم ریمان کا دل ہی دل میں بہت احسان مند تھا کیوں کہ ان کے توسط سے مجھے اسمار حاصل ہوئی تھی۔ میرے شب و روز پُرمسرت طریقے سے گذر رہے تھے۔ میں اپنی قسمت پر رشک کرتا تھا۔ جو ہم دونوں کے خیرخواہ تھے وہ خوشی کا اظہار کرتے تھے مگر بیشتر لوگ دل ہی دل میں جلتے تھے۔ لائبریری کا اسسٹنٹ جس نے اسمار کے بارے میں بتاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میری دال وہاں نہیں گلے گی، حیرت و استعجاب سے ہم دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے ہوئے دیکھتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسمار کو حاصل کرنے کے لئے میں نے کون سا حربہ استعمال کیا ہے۔

جس دن سے میں نے اسمار سے ملنا جلنا ترک کیا، اس دن سے مجھے سکون کا ایک دن بھی میسر نہ آسکا۔ اسمار سے دور رہنے کی غرض سے میں نے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا، صوبہ بدل دیا حتیٰ کہ ملک پر ملک تبدیل کرتا رہا مگر اسمار کا ہیولا میرا برابر پیچھا کرتا رہا۔ میں ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا مگر میری زندگی کا ہر لمحہ خلش میں مبتلا رہنے لگا۔ میں نے اسمار کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے اوراق کو چاروں طرف سے بے وفائی اور بے اعتنائی کے ٹانکے لگا کر بند کر دیا تاکہ اپنی زندگی کے ابواب الٹتے وقت میں ان اوراق سے بچ جاؤں مگر میں ذرا بھی کامیاب نہ ہو سکا بلکہ اس کے بعد میں اذیت ناک کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے ہر وقت محسوس ہونے لگا کہ میں نے اپنے اوپر ایک کربناک بوجھ لاد لیا ہے۔ اپنے ملک کے انجینئر، ڈاکٹر، سائنس دان اور دیگر لوگ دیگر ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں جہاں وہ دولت کے علاوہ نوبل پرائز اور دوسرے قابلِ فخر اعزازات حاصل کرتے ہیں مگر میں نے جس مقصد کے لئے اپنے وطن کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ دار اور دوست احباب چھوڑے اس میں مجھے آج تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

دن پر مہینے اور مہینے پر سال حاوی ہوتا رہا۔ وقتِ مستقبل، وقتِ حال کو پیچھے ڈھکیل کر وقتِ ماضی سے پیوستہ کرتا رہا۔ میں کرب کے لامتناہی شکنجہ میں جکڑتا چلا گیا۔ میری گھٹن، بے چینی اور میرے اضطراب میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ میں راہِ فرار کی ترکیبوں کے بارے میں سوچتے سوچتے مایوس ہونے لگا۔ کبھی میں سوچتا کہ ان یادوں کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں نے خود اپنے آپ کو پریشانی کے جال میں پھنسایا ہے۔ میں نے اسمار کو ٹھکرایا ہے اور اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے لہٰذا پہلے میں اسمار سے پیچھا چھڑا کر بھاگا تھا مگر اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں؟

آج مجھے اپنی اصل اوقات کا احساس ہو گیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اسمار کو ٹھکرا کر میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس غلطی کا ازالہ شاید کبھی ہو سکے۔ میں اس وقت نیو یارک ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بالکل ساکت کھڑا ہوں اور میری پیشانی عرق آلود ہے۔ میرے چہرہ پر ندامت کی اَن کہی تحریر چھپی ہوئی ہے۔ چند منٹ قبل میں بیٹھا ہوا ہوائی جہاز کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک مجھے اسمار آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ بہت افسردہ اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بے ساختہ چونک پڑا۔ وہ میرے اتنا قریب آچکی تھی کہ میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اب میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ میں اس سے مخاطب ہوں۔ وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا، "اسمار، تم یہاں کیسے؟" اس کی حسین آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، وہ بولی "شکر ہے کہ آپ نے پہچان تو لیا۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا نہیں ہے لیکن خدا کے لئے اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ نے مجھ سے دوری کیوں اختیار کر لی؟"

اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے سوچا کہ اب میں بہت تھک گیا ہوں

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے]

سے نوٹس بنانے میں مشغول تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک مخصوص عمر پر پہونچ کر ہر لڑکی حسین نظر آنے لگتی ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ بات صرف ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو جنسی طور پر بھوکے ہوتے ہیں۔ حسن کا ایک معیار ہوتا ہے جو کسی بھی علاقہ کی جغرافیائی حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ مگر میں جس علاقہ کا باشندہ ہوں اس کے معیار حسن پر اسماء پوری طرح اترتی تھی۔ اس کے حسن کی تعریف کرنے کے لئے میرا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے جہاں مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ اس کی تعریف کرنے کے لئے الفاظ تخلیق کرنا پڑیں گے جو مجھ جیسے غیر ادبی انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ حسن کی تعریف کرنے کی مروج تمام تشبیہیں اسماء کے حسن کے آگے ماند تھیں۔ بہرحال اس کو دیکھتے ہی میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہوگیا۔ میں اس سے ملاقات کرنے کا ذریعہ تلاش کرنے لگا۔ لائبریری کے ایک اسسٹنٹ سے میری دوستی تھی۔ میں نے اس سے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا "پارٹنر وہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔ اس کا نام اسماء اسفندیار ہے، حیدرآباد کے ایک بہت بڑے سابق نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اسی سال آئی ہے۔ سائیکولوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی ہے"۔ اسماء کے بارے میں اتنا معلوم ہوتے ہی میرے تجسس کے فلیتے آگ لگ گئی اور اس سے متعارف ہونے کی خواہش میرے وجود کے اندر پھیلنے لگی۔

ظاہرہ طور پر اتنی عظمت رکھنے والا امریکہ حقیقت میں اتنا عظیم نہیں ہے۔ دوسرے ممالک کو مالی امداد سے نوازنے والے خود امریکہ میں بے حد گرانی ہے، ٹیکسوں کی تعداد اور ان کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں مگر مجھے ان سے کیا لینا دینا، لیکن اس کا ایک ایسا تاریک پہلو میرے سامنے آیا جس سے اس کی قدر و قیمت میری نگاہوں میں بہت گر گئی۔ یہ بات سخت استعجاب کا باعث ہے کہ امریکہ اب تک اس تاریک پہلو سے بے خبر کیوں ہے؟ اگر باخبر ہے تو ناسور کی مانند رستے ہوئے اس پہلو کو کاٹ کر پھینک دینے کی تدابیر اختیار کیوں نہیں کی گئیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جان بوجھ کر کسی مصلحت کی خاطر اس کی پردہ پوشی کی جا رہی ہے؟ لیکن کسی عیب کو راز میں رکھنے کے لئے گرہ میں باندھے رہنا دانشمندی کی دلیل نہیں ہے۔ عیب کو جتنا بھی چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اس کی اتنی ہی تشہیر ہوتی ہے۔

اسماء سے متعارف ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ انسان کے بعض اہم کام بہت کوشش کرنے پر بھی پورے نہیں ہوتے ہیں اور پھر وہ کام اکثر خود بخود اور اچانک ہو جاتے ہیں۔ اسماء سے میرا تعارف ہونا بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ میں اس سے ملاقات کرنے کی ادھیڑبن میں گرفتار ہی تھا کہ ایک دن میرے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ پروفیسر رحمان نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا "ملک کے دفاعی فنڈ کے لئے یونیورسٹی کے سینئر پروفیسران کی بیگمات نے نمائش میں ایک کینٹین کھولی ہے جس کی منتظم خاص میری بیگم ہیں۔ ان کو کچھ والنٹیرز چاہئے۔ میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہاں اگر تم کو برتن بھی دھونے پڑیں تو ہرگز شرم نہ محسوس کرنا کیوں کہ تمہاری خدمت ایک بامقصد اور نیک کام کے لئے ہوگی"۔ ان کے حکم کے بموجب میں شام کو نمائش گاہ پہونچا اور بیگم رحمان سے ملاقات کی۔ کینٹین کے کچن میں چائے بنانے میں مصروف جس لڑکی سے انہوں نے میرا تعارف کرایا وہ اسماء اسفندیار تھی۔

امریکہ میں نیگرو کافی تعداد میں ہیں۔ سیاہ رنگت، لمبے چوڑے اور کسے جسم والے نیگرو جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہر شعبہ میں کام کرتے ہوئے ملیں گے مگر ان میں سے بیشتر کا اصل ذریعۂ معاش کچھ اور ہی ہے۔ نیگرو امریکہ کی گوری جلد والی عورتوں میں بے پناہ مقبول ہیں، رات کو سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، کلبوں میں، پارکوں میں، سینما گھروں میں اور دیگر نیم تاریک گوشوں میں نیگرو دکھائی دیں گے اور ہر ایک کے پہلو میں کم از کم ایک امریکن عورت ضرور ہوگی۔ کچھ شہروں میں بازار حسن کی مانند اس کے باقاعدہ بازار ہیں جہاں دولت مند اور عیاش امریکن عورتیں ان سے سودے بازی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں خود جنسی بے راہ روی کا شکار ہوں مگر امریکن عورتوں کی ان سے تیں سے جنسی دیکھ کر سخت افسوس کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکہ کی آنے والی نسلوں کا اصل روپ کیا ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک وہ دن بھی آ جائے جب امریکہ کی نئی نسل دوغلی ہو جائے اور اپنی افادیت اور انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھے، گو ان کا ہٹلر کی مانند نسلی برتری کا کبھی دعوا نہیں رہا مگر اصل نسل کا خواہ وہ کیسی بھی ہو، خراب ہو جانا کوئی بھی گوارہ نہیں کر سکتا ہے۔

اسماء سے اچانک قطع تعلق کر لینے پر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے مجھ سے ملنے کی بارہا کوشش کی مگر میں نے اس کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا۔ مایوس ہوکر اس نے خط لکھنا شروع کئے۔ وہ میری بے التفاتی کی وجہ جاننے کی کوشاں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اسے اپنا قصور ہی معلوم ہو جائے۔ جواب حاصل کرنے کی کوشش میں اس نے ان ملاقاتوں کا حوالہ دیا جو میں نے اس کے ساتھ نقوی پارک میں، لال ڈگی کی شاداب جھیل کے کنارے، قلعہ کے وسیع احاطہ کے سائبانوں میں اور تصویر محل میں کی تھیں۔ آخر کار مجبور ہوکر اس نے ان رومانی ایام کا واسطہ بھی دیا جو ہم دونوں نے آگرہ کے دیپ ہوٹل میں گزارے تھے۔ اس نے ان وعدوں کی دہائی دی جو ہم دونوں نے ایک دوسرے کے

تھے۔ مگر میں اسے سرے سے بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا اسی لئے نہ تو میں اس سے ملا اور نہ ہی اس کے کسی خط کا جواب دیا۔ میں اس کی پرچھائیں سے بچنے لگا۔ حتیٰ کہ میں اس کے بارے میں سوچنے سے احتراز کرنے لگا۔

مسی سپی میں ایک نیگرو سے میری دوستی ہوگئی۔ وہ ایک بار میں گانا گانے کے لئے ملازم تھا مگر اس کا اصل دھندہ دبی تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا "تم لوگوں کا معیار حسن قطعی مختلف ہے۔ تمہارے یہاں دبیز ہونٹ، بھاری پستان، لمبے قد، موٹے کولہے اور سیاہ رنگت والی عورت کو حسین سمجھا جاتا ہے۔ پھر تم لوگ چھریرے بدن، پتلے ہونٹ، چھوٹے پستان، پتلے اور سپاٹ کولہے اور گوری رنگت کی امریکن عورتوں کو کیوں کر برداشت کرتے ہو؟"

میرے اس سوال پر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا "فرض کیجئے کہ آپ کو دال پسند نہیں ہے لیکن اگر آپ کو سو ڈالر محض دال کھانے کے لئے پیش کئے جائیں تو آپ اسے مرغ مسلم سمجھ کر ٹھونس لیں گے۔ پھر ہم لوگوں کو تو کئی ہزار ڈالر تک دئے جاتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اپنے معیار کے مطابق حسن دیکھیں یا پیسہ، جب کہ موجودہ دور میں سب سے زیادہ اہمیت پیسے ہی کو حاصل ہے؟"

اس کی دلیل سن کر میرے پاس خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا۔

[illegible] میرا تعارف اسما سے ہوا، خوشیوں کے دہانے میرے لئے کھل گئے۔ بارہ روز کی ملاقاتوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ فاصلے کم ہوتے گئے۔ تکلف کی ہر دیوار ہم دونوں کی چاہت کے دھکے سے منہدم ہوتی گئی۔ میں پروفیسر رحمان اور بیگم رحمان کا دل ہی دل میں بہت احسان مند تھا کیونکہ ان کے توسط سے مجھے اسما حاصل ہوگئی تھی۔ میرے شب و روز پرمسرت طریقے سے گذر رہے تھے۔ میں اپنی قسمت پر رشک کرتا تھا۔ جو ہم دونوں کے خیر خواہ تھے وہ خوشی کا اظہار کرتے تھے مگر حاسد لوگ دل ہی دل میں جلتے تھے۔ لائبریری کا اسسٹنٹ جس نے اسما کے بارے میں بتاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میری دال وہاں نہیں گلے گی، حیرت و استعجاب سے ہم دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے ہوئے دیکھتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسما کو حاصل کرنے کے لئے میں نے کون سا حربہ استعمال کیا ہے۔

جس دن سے میں نے اسما سے ملنا جلنا ترک کیا، اس دن سے مجھے سکون کا ایک دن بھی میسر نہ آسکا۔ اسما سے دور رہنے کی غرض سے میں نے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا، صوبہ بدل دیا حتیٰ کہ ملک بھی تبدیل کرتا رہا مگر اسما کا ہیولا میرا برابر پیچھا کرتا رہا۔ میں ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا مگر میری زندگی کا ہر لمحہ خلش میں مبتلا رہنے لگا۔ میں نے اسما کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے ادراک کو چاروں طرف سے بے وفائی اور بے اعتنائی کے شکنجے لگا کر بند کر دیا تاکہ اپنی زندگی کے ابواب الٹتے وقت میں ان اوراق سے بچ جاؤں مگر میں ذرا بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ بجز اس کے میں اذیت ناک کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے ہر وقت محسوس ہونے لگا کہ میں نے اپنے اوپر ایک کربناک بوجھ لاد لیا ہے۔ اپنے ملک کے انجینئر، ڈاکٹرز، سائنس داں اور دیگر لوگ دیگر ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں جہاں وہ دولت کے علاوہ نوبل پرائز اور دوسرے قابل فخر اعزازات حاصل کرتے ہیں مگر میں نے جس مقصد کے لئے اپنے وطن عزیز کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ دار اور دوست احباب چھوڑے، اس میں مجھے آج تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

دن پر مہینے اور مہینے پر سال حاوی ہوتا رہا۔ وقت مستقبل، ورق حال کو پیچھے ڈھکیل کر وقت ماضی سے پیوستہ کرتا رہا۔ میں کرب کے لامتناہی شکنجے میں جکڑتا چلا گیا۔ میری خلش، بے چینی اور میرے اضطراب میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ میں راہ فرار کی ترکیبوں کے بارے میں سوچتے سوچتے مایوس ہونے لگا۔ کبھی میں سوچتا کہ اپنی بربادی کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں نے خود اپنے آپ کو پریشانی کے جال میں پھنسایا ہے۔ میں نے اسما کو ٹھکرایا ہے اور اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ لہذا پہلے میں اسما سے پیچھا چھڑا کر بھاگا تھا مگر اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں؟

آج مجھے اپنی اصل اوقات کا احساس ہو گیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اسما کو ٹھکرا کر میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس غلطی کا ازالہ شاید ممکن ہو سکے۔ میں اس وقت نیویارک ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بالکل ساکت کھڑا ہوں اور میری پیشانی عرق آلود ہے۔ میرے چہرے پر ندامت کی ان گنت تہیں جمی ہوئی ہیں۔ چند منٹ قبل میں بیٹھا ہوا ایلین کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک مجھے اسما آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ بہت افسردہ اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بے ساختہ چونک پڑا۔ وہ میرے اتنا قریب آچکی تھی کہ میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اب میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ میں اس سے مخاطب ہوں۔ وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا، اسما، تم یہاں کیسے؟ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، وہ بولی "شکر ہے کہ آپ نے پہچان تو لیا۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا نہیں ہے لیکن خدا کے لئے اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ نے مجھ سے دوری کیوں اختیار کر لی؟"

اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے سوچا کہ اب میں بہت تھک گیا ہوں

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے]

طارق جمال

# ھائیکو

ہے یہیں کہیں
جانتا ہوں ۔ پھر بھی ہے کہاں ؟
سامنے نہیں

—

آئینے ہیں دنگ
کیوں ہیں ؟ سوچتا نہیں کوئی
بے نگاہ تنگ

—

راہ رو سنبھل
دائرے ہیں وہم کے نہ رہ
تیز تیز چل

—

ارتقا کی سوچ
ذہن میں ہے آپ کے اگر
فکر میں ہو لوچ

—

چیخ یا سکوت
دونوں ہیں کھنڈر کے ذیل میں
تارِ عنکبوت

—

اس نے سچ کہا
اب بھی ، اور ہمیشہ چاہیے
سانپ کو عصا

—

شعلہ شعلہ رقص
رقص ہے نہیں کوئی کمال
رقص کا ہے نقص

[illegible]

رفیق اعظم

## سکوں کی خاطر

سکوں کی خاطر
بھٹکتا انساں
سمندروں میں غوطے لگاتا ہے
کبھی غرق ہو جاتا ہے ۔
کبھی موتی ساتھ لاتا ہے

سکوں کی خاطر
بھٹکتا انساں
پہاڑوں پہ کٹیا بناتا ہے
کبھی ناپید ہو جاتا ہے
کبھی بادلوں پہ سوار ہو جاتا ہے

سکوں کی خاطر
بھٹکتا انساں
جنگلوں میں پناہ لیتا ہے
کبھی شکار ہو جاتا ہے
کبھی پیڑوں کی طرح آزاد ہو جاتا ہے

سکوں کی خاطر
بھٹکتا انساں
اپنے اندر اتر جاتا ہے
کبھی اپنے ہی تراشے پیکر میں گرفتار ہو جاتا ہے
کبھی تشبیہ و استعارہ سے پار اتر جاتا ہے

[illegible]

اقبال کرشن

## بلیوں کا خون

بلیوں کے گرم گرم خون سے
اپنے ریت باغوں میں چھڑکاؤ کرنے والو ، کہو
ظلم کی ابتدا ہی ابتدا ہے
ہر ظلم اپنی انتہا ہے
ظلم کی ٹہنیاں پھیل رہی ہیں
بلیاں جل رہی ہیں
ریت کی قتل گاہوں میں مچھلیاں پل رہی ہیں ۔

## پنج اختری ہوٹلوں کے پیچھے

تمہارے کدورت کے پنج اختری ہوٹلوں کے پس پشت
ہمارے محبت کے جھونپڑا خانوں کی گمنام سی میزبانی
کہیں دور سے
تھکے چور آتے مسافر کی تکتی ہے راہ

[illegible]



بنگلہ : عبدالرحمٰن شاداب

ترجمہ ایوب جوہر

۲۶ - لال جند منشی لین ، رحمہ لور ، ڈھاکہ ، بنگلہ دیش

# روایت

جس روز زمیندار باڑی کی بڑی بہو نے اپنے جسم پر کیروسین تیل چھڑک کر خودکشی کی اس روز مختلف حلقوں میں طرح طرح کی باتیں گشت کر رہی تھیں۔ جنھیں زمیندار باڑی کے اندرونی معاملوں میں دلچسپی تھی ان کا خیال تھا کہ بڑے بابو کے گناہوں کا بوجھ اتنا بھاری ہے کہ اس کے بوجھ سے دھرتی بھی کانپ اٹھی ہے۔

لیکن کہتے ہیں کہ طاقت ور کے سات خون معاف ہوتے ہیں، سو زمیندار کے سامنے کسی نے چوں تک نہ کی اور نہ ہی تھانے پولیس میں کوئی ہنگامہ ہوا۔ جس طرح بڑے گھروں میں کوئی جشن جب جیسا گزر جاتا ہے۔ اسی شان سے بڑی بہو کی چتا بھی نذر آتش کر دی گئی۔

ہاں البتہ اس رات کو اتنا ضرور ہوا کہ بڑے بابو کے اکلوتے صاحبزادے نے غصے میں آکر اپنا پستول نکال لیا اور چاہا کہ اپنے بدکردار باپ کے جیون بتی کو ایک ہی گولی میں اڑا دے کہ اپنے باپ کو قطعی خاموش دیکھ کر وہ اپنی جگہ ٹھٹھک پڑا۔ خاموش، کم گو اور تعلیم یافتہ بیٹے کے ہاتھ میں پستول لرزتا دیکھ کر بڑے بابو سناٹے میں آگئے تھے۔ نہ جانے ان کے اندر کون سا بھونچال آیا ہوا تھا۔ جیسے وہ سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ بڑے بابو کو اس طرح گم صم ہوتا دیکھ کر صاحبزادے نے ایک لمحہ اپنی بیوی، بچے اور اپنے مستقبل سے متعلق سوچا اور پھر دوسرے لمحے پستول کو پھینکتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف ہٹ پڑا۔ مگر ان باپ بیٹے کے درمیان ایک کم عمر ملازم گواہ بن کر سامنے آگیا جسے صاحبزادے نے اپنے کمرے میں بلا کر یہ اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے اس کا ذکر کہیں دوسرے کسی سے نہ کرے۔

زمیندار باڑی کی یہ بدنامی بظاہر ڈھک گئی تھی مگر باپ کو راہ راست پر لانے کی کوشش ایک چھاپ بن کر کم عمر ملازم کے دل میں بیٹھ چکی تھی۔

پھر بہت دنوں بعد جب زمیندار چل بسا، زمیندار کا بیٹا ادھیڑ عمر کا اور کم عمر ملازم جوان ہوا تب ملازم نے اپنے مالک سے کچھ دنوں کی چھٹی لی اور اپنے وطن پہنچا۔ اس کا وطن اپنے مالک کی زمینداری میں تھا اس کا باپ جو زمیندار کے ہاں نوکری کرتے بوڑھا ہوا اور برطرف کیا گیا تب اس کے باپ نے مستقل طور پر گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بیٹے کو بہت دنوں کے بعد اپنے سامنے دیکھ کر بوڑھا بہت خوش ہوا اور اسے اپنے سینے سے بھینچ کر روتے ہوئے کہنے لگا۔

"اتنے دنوں بعد تجھے باپ کی یاد آئی رے، کتنی چٹھیاں لکھیں لوگوں کے ذریعے خبریں بھجوائیں تو کیوں نہیں آیا رے؟ پھر اس نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ میں تو بابا تیرے لئے ہی جی رہا ہوں آخر میرا تیرے سوا اور کون ہے۔ دیکھ غریب کا دھان بھرا کوٹھا، مچھلی بھرا پوکھر، باغ باغیچہ سب کچھ تو لٹا دیا۔ اب تو یہیں رہ اور عیش کر اور نوکری ووکری چھوڑ بابا۔ ساری زندگی میں نے خون پسینہ ایک کر کے دیکھا ہے غیروں کی دل بستگی سے کچھ نہیں ملتا ہے رے"

بیٹے نے کہا "بابا۔ ملک بہت اچھا ہے بابا۔ میں اگر دیس نہیں لیا تو انھیں برباد کر ہوگا اور پھر میرے بغیر تو بس ایک لمحہ بھی چین نہیں ملے گا۔"

باپ کے ہونٹوں پر ایک دکھی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے کہا۔ مالک تجھے بڑا پیار کرتا ہے نا رے؟ بیٹے نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے باپ نے کہا۔ یہ سب دکھاوے کا پیار ہے بابا۔ وہ تو اپنا کام نکالتا ہے کام" پھر اس کے باپ نے فوجداری اور دیوانی کورٹ کے کچھ کاغذات دکھاتے ہوئے اس سے کہا۔ یہ دیکھ تیرے مالک کے نائب نے مجھ پر جھوٹا مقدمہ مسلط کر دیا ہے۔ تیرا مالک مجھے بے زمین کر دینا چاہتا ہے" بیٹے نے حیرت سے ان کاغذات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن کیوں؟

"کیوں؟ تو سمجھنا چاہتا ہے؟"؟ — اس کے بعد اس کے باپ نے کچھ پرانی باتیں چھیڑ دیں۔ اس نے کہا۔ اس علاقے کی زمین تیرے مالک کے باپ نے زبردستی دخل کی تھی اس وقت میں اس کا لاٹھی وال (لٹھ باز) تھا۔ اس کے بعد میں اپنی مرضی کے خلاف اس کی رعایا بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بڑی منت سماجت اور رو دھو کر بھی میں اس سے اپنے نام کوئی ملکیت نہیں لکھوا سکا۔ اور اس وقت جب تیرے منہ سے ماں کے دودھ کی بو بھی نہ ختم ہوئی تھی۔ مصیبت اور دکھ کے مارے میں نے تجھے مالک کے ہاں ملازم رکھوا دیا۔ میرے دل پر کیا گذر رہی تھی میں نے کبھی تجھے احساس بھی ہونے نہیں دیا۔ اور میں جسمانی طور پر لاغر اور کمزور ہو گیا تو مجھے تیرے مالک نے لاٹھی والے اپنے خادموں میں شامل کر لیا اور جب میں خدمت کرنے کے لائق بھی نہ رہا تو مجھے زمیندار باڑی سے خالی ہاتھوں نکال دیا گیا۔ میں گاؤں واپس آیا۔ گاؤں میں زمیندار کا لٹھ باز ہونے کے دور میں جن لوگوں پر ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے گلے میں گمچھا ڈال کر معافی مانگی۔ اور اوپر والے سے اپنے گناہوں کی عفو چاہی۔ گاؤں کے لوگ سیدھے تھے وہ میری معافی مانگنے کے بعد میرے تمام ظلم و ستم بھول گئے۔ انھوں نے مجھے اپنی محبتوں سے ڈھک دیا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنوں سے کتنا دور تھا۔ پھر دھیرے دھیرے جسم میں توانائی آئی اور دوبارہ کام کے لائق ہوا تو محنت مزدوری سے اپنی زندگی کا دوبارہ آغاز کیا۔ پھر اللہ نے جب اپنی رحمتوں سے نوازا تو زمیندار کی آنکھوں میں بھی کانٹا بن گیا۔ اس نے اپنے نائب کے ذریعہ مجھ پر حملہ کروا دیا۔ مجھے بھی ضد آئی اور میں نے گاؤں والوں کو لیکر زمیندار کے لوگوں کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ مار پیٹ کر اور لاٹھی لٹھول کرنے کی وجہ سے ان لوگوں نے مجھے ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر دیا ہے اب تجھے باپ کا بیٹا بن کر مقابلہ کرنا ہوگا اور اگر میں مر بھی گیا تو ہرگز ان ظالموں سے سمجھوتہ نہ کرنا۔"

بیٹا اپنے باپ کی باتوں سے متاثر نہ ہوا لیکن اس نے یہ اقرار کیا کہ سابق زمیندار ظالم تھا۔ کسی کو بھی اس نے نہیں بخشا۔ اس کے ظلم و ستم سے گھر کی مالکہ بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ اور اس نے اپنے جسم پر تیل چھڑک کر اپنی جان دے ڈالی۔ جسے دیکھ کر چھوٹے سرکار نے پستول نکال لیا تھا اور اپنے بدکردار باپ کی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہا تھا وہ بات تو میں نے اب تک کسی کو نہیں بتائی۔ بڑے سرکار کو جو بولنا ہے بولو مگر میرے موجودہ مالک کو دوش نہ دو وہ تو بڑے پیارے آدمی ہیں۔"

بیٹے کے غیر متوقع جواب پر بوڑھے کو غصہ آ گیا مگر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بیٹے کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اپنا فائدہ پہلے دیکھ، میں تیرا باپ ہوں میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب تیرے بھلے کے لئے کیا ہے، مجھ سے بہتر تیرا خون چوسنے والا مالک ہرگز نہیں ہو سکتا۔" باپ کی نصیحت لڑکے کے پلے نہ پڑ سکی۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم دغاباز اور نمک حرام ہو، زمیندار سے جھگڑا مول لینا تمہارے لئے بہت خراب ہوگا۔" اس نے کسی گیانی کی طرح اپنے باپ کو سمجھایا۔ باپ اس کے اس جواب پر غصے سے تلملا سا گیا اور پھر اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"جو بیٹا اپنے باپ کی عزت نہ کرے اور اپنے مالک کے گن گاتے وہ ناخلف اولاد ہے۔ میں تجھے اپنی ولدیت سے خارج کرتا ہوں۔" لڑکے نے بھی بے لگام ہو کر جواب دیا۔ "میں حق بولنے والا ہوں مجھے تمہاری پرواہ نہیں ہے میرا مالک مجھ سے خوش ہے تو سب ٹھیک ہے۔"

باپ کی تذلیل کر کے بیٹا زمیندار باڑی واپس چلا آیا۔ یہاں آ کر اس نے کچھ نئے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھی، جن سے پوچھنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ لوگ زمیندار باڑی کی تاریخ لکھنے کے لئے شہر سے آئے ہیں، یہ اونچی بات اس کی کھوپڑی میں نہ سما سکی وہ سیدھا اپنے مالک کے پاس پہنچا۔

مالک اس وقت بہت سارے کاغذات کو تہ بہ تہ کر کے لال فیتے سے باندھنے میں مصروف تھا وہ سب سوانح حیات لکھنے کے معاملے تھے۔ فرمانبردار ملازم کو دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ ذرا اوپر اٹھایا اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا رے کیسا ہے تو سب ٹھیک ہے تو؟

"مالک کی بات سن کر ملازم کی روح تک جھوم اٹھی۔ اف! کتنی مٹھاس ہے مالک کے لہجے میں اس نے سوچا اور پھر کہنے لگا۔

"سب ٹھیک ہے بابو، مگر بابا ذرا گڑبڑی کر رہا ہے۔"

"کس لئے رے، کیا ہوا؟ مالک نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کہا۔ دیکھئے نا بابو، آپ کا نمک کھاتا ہے اور آپ کے خلاف ہی پارٹی بنانے جا رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا کہ مالک کے خلاف تمہیں سازش کرتے ہوتے شرم نہیں آتی، اس پر اس نے

مجھے اپنی ولدیت سے خارج کر دیا ہے اور بابو میں نے بھی اسے اپنے باپ سے خارج کر دیا ہے"

زمیندار انتہائی خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا اور وہ اپنے گھر کی برائیوں کو اگلتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ اپنے لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے کتنی کٹھور سچائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

زمیندار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو آچکا ہے اچھا ہی ہوا رے۔ وہ دیکھ کچھ شریف لوگ شہر سے آئے ہوئے ہیں ان لوگوں کو میں نے اپنے جنتی باپ کی سوانح حیات اور اس گھر کی پوری کہانی لکھنے کو بلایا ہے، تو نے تو بابا کے وقت بھی نوکری کی ہے جہاں ہمارے پورے خاندان کی کہانی لکھی جائے گی۔ اسی میں تیرا بھی ذکر آجائے گا چھپے ہوئے حروف میں تیرا نام آجائے گا۔ تجھے بہت ساری بخششیں ملی ہیں کیونکہ ملا ہے۔ پھر تجھے میرے بابا کتنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ان تمام باتوں کا ذکر کرنا سمجھے" ملازم نے انتہائی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"مالک، آپ نے جو مجھے منع کیا تھا اس واقعے کے بارے میں میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے؟"

"کون سا واقعہ رے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"وہی واقعہ مالک جو بڑے زمیندار کے خراب کاموں پر آپ نے پستول نکال لیا تھا۔ اور ان کا خون کرنا چاہا تھا"

یہ بول کر ملازم اپنی پلکیں جھپکانے لگا۔ برہمی سے زمیندار کے چہرے کا زاویہ بدل گیا۔ اس نے بے وقوف ملازم کو دھتکارتے ہوئے کہا!

"بزرگوں کی برائی کرنے سے اولاد جہنم رسید ہو جاتی ہے۔ ایسی بات منہ پر بھی نہ لانا، آبا و اجداد کا احترام ہی ہماری عزت ہے میرا بیٹا بھی اسی طرح میری نیک نامیاں کرے گا۔ جا یہ سب باتیں تیری کھوپڑی میں نہیں آئیں گی۔ تو اگر ٹھیک سے بات نہیں کر سکتا تو خبردار ان لوگوں کے پاس بھی مت جانا، اچھا اب جا مجھے کام کرنے دے"

آزاد خیال ملازم کی تمام سچائیاں اوب سی گئیں۔ والد کا احترام خاندان کا وقار، اس کے ماتھے میں کوئی بات نہیں اٹ سکی۔ مالک کی دھتکار پر وہ بجھ سا گیا۔ اس نے سوچا گنی والے ہمیشہ سچائیوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی کی غلطیوں پر ان کی نظر نہیں ہوتی مگر میں۔۔۔۔ میں اپنے والد کے ساتھ کتنا خراب سلوک کر کے آیا ہوں؟

ملازم کو سوچ میں غلطاں اور بجھا بجھا دیکھ کر مالک نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"ارے میں تجھ سے ناراض تھوڑے ہی ہوا ہوں۔ اور پھر تیری عقل ہی کتنی ہے؟ بہر حال کوئی بھی بات کرنا تو اس گھر کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے کرنا اس لئے کہ ہم زمیندار لوگ ہیں۔ پورے علاقے میں لوگ ہمیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لہذا ہمیں بہت محتاط ہو کر بات کرنی پڑتی ہے ہم کھلم کھلا کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس سے ہمارے خاندانی وقار پر کوئی حرف آئے۔ اور تم لوگ ہوئے ہمارے فرمانبردار ملازم، لہٰذا ان سب باتوں کو تمہیں ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ یہی آئین وفاداری ہے اور یہی روایت بھی"

## بقیہ صفحہ ۵۶ ایڈز

رکھا تھا اور میرا ببلو میری بغل میں کھڑا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ آنے والا کل کہیں اس سے انتقام نہ لے۔

وقفہ

...

...

سائرن کی آواز!

مردہ لے جانے والی ٹرالی وارڈ میں داخل ہو رہی تھی اور ڈاکٹر اپنے چہرے سے ماسک MASK ہٹاتا ہوا باہر جا رہا تھا یہ کہتا ہوا

" VERY SORRY ACQUIRED IMMUNE DEFFICIENCY SYNDROME IS FATAL "

## زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری مئی ۱۹۸۷ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اور براہِ کرم آئندہ کے لیے مبلغ ۵۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔



## نشتر اکبرآبادی

ذہن میں کارِ پیمبر رکھا
پیٹ پہ باندھ کے پتھر رکھا

پیاس کا نام مقدر رکھا
ریت کے گھر میں سمندر رکھا

میں بھی بہہ جاتا درختوں کی طرح
خود کو بارش سے بچا کر رکھا

اس نے ہر حال میں اپنے قد کو
آسمانوں کے برابر رکھا

بحث کی نذر ہوا دن سارا
کام پھر کل پہ اٹھا کر رکھا

جب ہری شاخ پہ کونپل پھوٹی
اس نے پیشانی پہ جھومر رکھا

سب میں شامل رہا پھر بھی نشتر
خود کو مانندِ قلندر رکھا

---

لال، پیلی، اودی، نیلی بلبلیاں اُڑ جائیں گی
آسماں کی سمت ساری تتلیاں اُڑ جائیں گی

بستیاں تکتی ہوئی رہ جائیں گی برسات کو
بن بھگوئے ہی کھیتوں کو بدلیاں اُڑ جائیں گی

گھر کے دالانوں میں اب جھولے پڑے رہ جائیں گے
موسموں کے پر لگا کر لڑکیاں اُڑ جائیں گی

یہ زمیں بستر کی صورت جب لپیٹی جائے گی
روشنی مر جائے گی، پرچھائیاں اُڑ جائیں گی

چاٹ جائے گی ہر اک کاغذ کو دیمک وقت کی
روزناموں سے پرانی سرخیاں اُڑ جائیں گی

بھوک جب بازار کی جانب اٹھائے گی قدم
زندگی کے جسم سے انگڑائیاں اُڑ جائیں گی

جنگ جب ہوگی اندھیرا ہر طرف چھا جائے گا
مقبروں کے گنبدوں سے بولیاں اُڑ جائیں گی

---

نشاں پاتے ہیں سمتوں کا علاقہ بھول جاتے ہیں
محبت کرنے والے گھر کا رستہ بھول جاتے ہیں

خلا سے جب ہواؤں کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے
تعلق یاد رہ جاتا ہے رشتہ بھول جاتے ہیں

مسافت کربلا کے راستے کی چھاؤں ہوتی ہے
سفر کے بعد سب ہجرت کا صدمہ بھول جاتے ہیں

تمہیں ہو کہ نہ ہو لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے
بڑے وقتوں میں گھر والے بھی چہرہ بھول جاتے ہیں

نگاہیں پڑھنے لگتی ہیں نئے کتبوں کی پیشانی
پرانی تربتوں کو رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں

۴۸۲، سینٹرل اسٹریٹ، پونہ ۔ ۱، مہاراشٹر

ناصر بغدادی

۷۵۰ سی، جمشید روڈ نمبر ۲، حبیب منزل کراچی ۵ (پاکستان)

# ادبی تعصّبات کا مسئلہ

تخلیقی ادب کی ترویج اور نشو و نما تخلیق کاروں کے رشحاتِ قلم کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان، معاشرے کا عکاس اور عصری آگہی کا آئینہ دار اس وقت ہو سکتا ہے جب فن کار نہ صرف آزادیٔ تحریر کی دولت سے مالا مال ہوں بلکہ ادبی فضا بھی عصبیت اور گروہ بندی کے منفی رجحانات سے کلّی طور پر مبرّا ہو۔ معاصر اردو ادب کے تناظر میں اگر ہم تحقیقی تعمق کا استعمال کریں تو اس بات کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہوگی کہ ہمارا اسّی فی صد (۸۰٪) ادب

۱۔ اجتماعی سوچ کا عکاس نہیں ہے۔

۲۔ معاشرتی خصوصیات کا ترجمان نہیں ہے۔

۳۔ عصری آگہی کا آئینہ دار نہیں ہے۔

اس کے علی الرغم معاصر اردو ادب ایک ایسا عربدہ میدان بنا ہوا ہے جہاں ادب کی متحارب ہستیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں، اپنی بھرپور اور بہترین صلاحیتوں کے مظاہرے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ آزادیٔ تحریر کا ذکر تضیعِ اوقات اور خارج از بحث ہے۔ ہمارے اہلِ قلم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کے فنی اجتہادات اور تخلیقی اختیارات کی حدود کیا ہیں؟ جہاں دستوری پابندی آفاقہ نافذ وقت ہو وہاں حقیقتِ حال کا اظہار ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کی فکری عمق اس سطح پر ہی نہیں پہنچی ہے جہاں انہیں آزادیٔ تحریر کے فقدان کا ادراک ہو سکتا! البیر کامیو ALBERT CAMUS نے ہمیں بتایا ہے کہ ادب و فن کی پیدائش آزادانہ فضا کے بغیر ممکن نہیں ہے[1] مگر اب اسے کیا کیجیے کہ ہمارا ادیب ادب کی تخلیق تو کرتا ہے مگر اس ادبی حقیقت سے ہنوز نا واقف ہے۔ ویسے حال خال ہی تخلیقی فن کاروں کے اثر پاروں کے بین السطور میں آزادیٔ تحریر سے محروم ہونے کی کیفیت نیم تجرید اور نیم رسوم شکل میں ہمیں مل جاتی ہے!

معاصر ادب میں انتشار اور اس کے بے تخلیق ہونے کے حقیقی ذمہ دار عصبیت اور گروہ بندی کے مذموم رجحانات ہیں۔ گروہ بندی ادب اور ادیب دونوں کے لیے سمِ قاتل ہے۔ یہ نہ اداۓ ادب کے تخلیق کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور نہ اس کی نمو پذیری کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر معاصر ادب میں مناظرے اور مجادلے کی سیال کیفیت نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ بھی گروہ بندی اور ادبی عصبیت ہے۔ جب ادب میں تعصبات کی تہیں تہ در تہ ہو جاتی ہیں تو ادب کی صالح قدریں کلاسیکی اور تہذیبی سیاق و سباق سے کٹ کر رہ جاتی ہیں! برنارڈ شاہ DERNARD SHVA کے خیال میں ادب کی تخلیق از خود امر بالمعروف ہے لہٰذا تعصبات سے اسے کامل طور پر معرا ہونا چاہیے۔ ای۔ایم۔ فورسٹر E.M. FORSTER نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تخلیقی فن کار اس نصب العین سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے[2]

1. RESISTANCE, REBELLION & DEATH, BY ALBERT CAMUS

2. " CREATIVE WRITERS ARE ALWAYS GREATER THAN THE CAUSES THEY REPRESENT."
E.M. FORSTER IN GIDE & GEORGE

قلم کا جہاد تلوار کے جہاد سے کہیں زیادہ مقدس اور مؤثر ہوتا ہے۔ البیئر کامیو CAMUS نے نوبل انعام قبول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اپنی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک فن کار ایک زندہ معاشرے کے بوقلموں احساسات کا عکاس بن سکتا ہے مگر اس منزہ مقصد کے حصول کے لیے صداقت اور آزادی کی تلاش اور خدمت ضروری ہے!

اگر ہم آج کے ادب کے سیاق و سباق میں معاصر لکھنے والوں کے ادبی کردار کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہمیں شدید مایوس کن حقیقت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کو صداقت کی تلاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کی کوشش میں وہ اپنے خیالات کو منضبط ڈھنگ میں پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ ادب کی نئی معروضی جہتوں کے متلاشی ہیں نہ عصری آگہی کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرنا ان کا تخلیقی مسلک ہے۔ وہ نہ آزادیٔ تحریر کے فقدان کے شاکی ہیں نہ انسانی اقدار اور تجربے کے گوناگوں پہلوؤں کی ترجمانی ان کا نصب العین ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اُن کا ادبی طرزِ عمل اور تخلیقی مزاج کھُل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے ——— بڑا لکھنے والا حیات اور کائنات کا ناقابلِ تسخیر وجدان رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے دور کے بیشتر بڑے لکھنے والوں نے دیانت دارانہ ادبی تصور پر اپنا مدار رکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ انہوں نے تعصبات سے بلند ہو کر حرکی نقطۂ نظر، فلسفیانہ وجدان اور فکری آہنگ کو اپنانے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ادب کے بڑے اور چھوٹے ناموں نے جو کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں ان کا غیر مختتم مطالعہ جاری رکھیں بس یوں محسوس ہوگا جیسے نئے عصری ادب کے نام پر گروہ بندی اور عصبیت کے زہر بھرے عناصر کا احضار کیا گیا ہے!!

شہرت کی خواہش انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو سہی لیکن اس کی تلاش کسی جرم کا ارتکاب نہیں۔ مگر اس کا حصول اس وقت ایک ناقابلِ معافی جرم کا انعکاس پیش کرتا ہے جب ہم ایسی نام نہاد ادبی تحریروں کی حوصلہ افزائی کریں جو متعصبانہ تجربے سے ممزوج اور مخلوط ہوتی ہیں۔ اس نوع کا سستا ادب فکری نہج اور وجدانی بنیاد سے محروم تو ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اجتہادات پر بھی قدغن کا کام کرتا ہے! شہرت کی غرض سے ادب کے نام پر ادبی تجربے کا ارتکاز ایک ناقابلِ معافی ادبی جرم ہے!!

آج کا بیشتر ادب بے روح پروپیگنڈا بازی کا دوسرا نام ہے۔ شہرت کے جھوٹے نشے میں دھت ہونے کی جھوٹی خواہش نے آج کے لاتعداد لکھنے والوں کو کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ آج ادیب کے قلم نے دانستہ طور پر اجمال اور ابہام کو اپنایا ہے تاکہ اس کے پس منظر میں وہ آفاقی صداقت، انسانی جذبات کے خلوص اور معاشرتی بہبود کے تصورات سے دامن بچا کر اپنی تحریروں کو یوں تجریدی رنگ میں پیش کرے کہ قاری کا ذہن الجھ کر رہ جائے قاری کو اس طرح الجھا کر وہ شخصی انانیت EGOTISM اور تجریدی اسلوبِ نگارش کو بڑی دیدہ دلیری سے مخصوص علامتی لب و لہجہ اور منفرد رمزیت کا نام دیتا ہے۔ پروپیگنڈا بازوں کے نقطۂ نظر سے آج کا اردو ادب جدید رجحانات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے ان کے بقول اس گروہ کے ہر لکھنے والے کے پاس شعور اور مشاہدے کی تیز آنکھ ہے، وہ پیچیدہ سماجی مسئلوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسی شدت سے اس سلسلے میں اپنے خیالات کو مربوط اور منضبط ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ سب ہی نام معتبر ہیں اور ہر تخلیق جدید ادب کے لیے فالِ نیک ہے ——— عصری ادب میں نام نہاد لکھنے والوں کا ایک جمِ غفیر ہے۔ سب بظاہر عصری شعور کے ترجمان اور ادب و آگہی کے مضبوط رشتے کے علَم بردار ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پروپیگنڈہ تحریک نے اردو شعر و ادب کو وہ ذخیرہ دیا جو اردو زبان کے لیے باعثِ افتخار نہیں ہو سکتا۔ اسی گروہ بندی کے زیرِ اثر ایسا ادب پیدا ہو رہا ہے جس کی حیثیت کھوکھلے پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں، ان تحریروں کے ایک معتد بہ حصّہ کو اجتماعی شعور، عصری آگہی اور اس دور کے ذہنی و جذباتی سانچوں سے ہم آہنگ نہیں کہا جا سکتا!!

آج اردو ادب کے تقریباً ہر معتبر نام کے گرد غیر معروف بونوں کا ہجوم ہے۔ کچھ تو حقیقتاً معتبر نام ہیں اور کچھ پروپیگنڈا بازی کے طفیل راتوں رات شہرت کے آسمان کا چاند بن گئے ہیں۔ بونوں اور معتبر ناموں کی باہمی گٹھ جوڑ ہی گروہ بندی کی منظم شکل ہے۔ یہ سازشی اشتراک درحقیقت "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے زمانہ ساز اُصول کا تتبع ہے جو اتفاق سے دونوں ہی فریق کے مفاد میں ہے۔ بونوں کی سب سے بڑی اور آخری خواہش کیا ہو سکتی ہے؟ یہی ناکہ وہ بھی ادب کے قدآوروں کی اگلی صف میں شامل ہو جائیں! بس

ابن الوقتی کا لبادہ زیب تن کرنے کے بعد جب ان کو ادب کے چند معتبر ناموں کی جانب سے سنگ میل کا عرفان حاصل ہوتا ہے تو جیسے احساسِ معنویت SENSE OF SIGNIFICANCE کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا قد بھی اونچا ہوتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ ان نام نہاد عہد ساز شخصیتوں کو زندہ جاوید کرنے کی دھن میں لفاظی اور فصاحت و بلاغت کے آزمودہ نسخوں کو آزمانے پر پوری طرح آمادہ نظر آتے ہیں۔ فرماں بردار اور سعادت مند حلقہ بگوشوں کی طرح وہ بھی اپنے پیر و مرشد کی شان میں مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کا غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے توصیفی مضامین کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے جن میں ان SELF-STYLED ہیتر بات ان ادبی شخصیتوں کے لیے بصیرت افروز اسمائے صفت SUPER ADJECTIVES کا احصار کیا جاتا ہے — اگر معتبر نام شاعر ہے تو وہ متفقہ طور پر شیلے SHELLEY اور غالب کا ہم پلہ بن جاتا ہے۔ خوش فکر اور فلسفیانہ وجدان کی حامل شاعری اس پر ختم ہو کر عصری دانش کو متاثر کرتی ہے — اور اگر نامور شخصیت افسانہ نگار ہے تو موپاساں او ہنری اور چیخوف اس کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ اس پر لکھے گئے تنقیدپاروں کی جھلکیاں کچھ اس انداز میں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں

۱۔ "اُن کا منفرد لب و لہجہ، علامتی پیرایۂ اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر ان کی ایک نمائندہ جہت اور اُن کا منفرد تشخص قائم کرتے ہیں"

۲۔ "وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تلمیح کی ٹرانسفارمیشن کے واسطے سے کہہ جاتے ہیں"

۳۔ "اُس نے اردو افسانے کو فارمولا کہانی کی دَل دَل سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کی افسانہ نگاری میں جزئیات کو پرکھنے کا تنقیدی شعور بہت تیز دکھائی دیتا ہے"

قصہ مختصر یہ کہ وہ پیدائشی افسانہ نگار واقع ہوا ہے اور اس صنفِ ادب میں وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اتفاق سے تنقید نگاری قد آور نام کا میدان ہو تو بیچارے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی عافیت اور سلامتی نہ صرف خطرے میں نظر آتی ہے بلکہ اس کی ادبی عظمت بھی صفر ہو کر رہ جاتی ہے — اردو زبان کی یہ عظیم المرتبت ادبی ہستی معروضی اور منطقی تنقید کی علم بردار بن جاتی ہے۔ انتقادی ادب کے شعوری اور لاشعوری تقاضوں کو پورا کرنے والی اس ہستی پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان کی جھلکیاں ان خطوط پر ہمیں ملتی ہیں!

۱۔ "اُن کی تنقید جذبے اور تخیل کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مشاہدہ، فکر اور وجدان باہم دگر آمیز ہو کر ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتا ہے"

۲۔ "اُن کی تنقید کا انداز منفرد اور توضیح کا انداز جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک تنقید کا منصب تخلیقی فن پارے کی تفہیم ہے محاکمہ نہیں"

۳۔ "وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ایک منصف مزاج نقاد ہیں، اس لیے وہ اپنے ہم عصروں کو بھی ذاتی تعصبات اور ترجیحات سے بلند ہو کر پرکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں"

من حیث المجموع موصوف کے عہد آفریں انتقادی مضامین اردو زبان کے لیے موجبِ افتخار ہیں۔ استدلال ان کی تنقید نگاری کا وصفِ خاص ہے۔ قاری کو ان کی تنقیدی تحریروں میں تجزیاتی نظر اور ایک وسیع تر تصور کی جھلکیاں بین السطور میں نظر آتی ہیں۔ وہ پڑھنے والے کو اپنی تحریر کی رنگینی سے نہیں بات کے وزن سے متوجہ اور متاثر کرتے ہیں!!

یہ ہیں معتبر ادبی ناموں کے ارفع ادبی اوصاف جو بونوں کو بلا مستثنیات ان کی ہر تحریر میں نظر آتے ہیں اس موڑ پر بات کا انقطاع ممکن نہیں — الم نشرح کی صورت استنباط کے ساتھ آگے مزید واضح ہو جاتی ہے — سوال یہ ہے کہ بونوں کو یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سوال مشکل نہیں اور اس کا جواب بھی آسان ہے۔ گروہ بندی اور تعصبات نے ادبی دنیا کو ایک بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس بازار میں ہر لکھنے والے کی حیثیت ایک دوکان دار جیسی ہو گئی ہے وہ جو کچھ فروخت کرتا ہے اس کی معقول قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ لہذا جیسی

BORGES نے کہا تھا کہ لکھنے والے کو اپنی قدر دانی APPRECIATION اور داد طلبی کی بابت معلوم کرنے کے لیے دوسرا جنم لینا چاہیئے[1] مگر اس کی اس بات کا اطلاق و انطباق ہمارے لکھنے والوں پر کسی طور نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ زمانے خیال و خواب ہوئے جب لکھنے والا ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بالاتر ہو کر لکھتا تھا۔ اگر آج وہ کسی ادبی شخصیت کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے یا اپنے مضمون میں اس پر تحسین و آفرین کی بارش کرتا ہے تو اسے بھی مناسب وقت پہ دوسری جانب سے داد و دہش اور شرفِ قبولیت کی توقع ہوتی ہے۔ یہ ادبی داد رسی کا مسئلہ نہیں بلکہ داد و ستد کی بات ہے۔ اور پھر جوں ہی ہونے تھا کوئی افسانوی یا شعری مجموعہ طباعت و اشاعت کے مراحل طے کر کے منظرِ عام پہ آتا ہے تو کتاب کی رونمائی کے موقع پہ قدآور صاحب ہونے کی "ناقابلِ فراموش" ادبی خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے حلقہ بگوشوں کی بھیڑ میں تعریفی ریمارکس سے ملو ایک مختصر سا مضمون پڑھ کر اس کے قد میں دو انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہی مضمون کسی مقتدر ادبی جریدے میں اشاعت پذیر ہو کر ہونے صاحب کو قارئین کے سامنے ادب کا فخرِ یکتا بنا کر پیش کرتا ہے۔

اس ضمن میں ایک ہونے نئی شاعری پہ ایک معروف نقاد کا تبصرہ تو ملاحظہ فرمائیں

"روایتی اسلوب کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری ایک مابعد الطبیعاتی نہج اور بنیاد رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ بیسویں صدی میں غزل کی روایت کے تشکیل و ارتقا کے امانت دار ہیں"

یہ ہماری علمی کم مائیگی اور ادبی تہی دامنی ہے کہ اس گراں قدر تبصرہ کے مطالعہ سے قبل اس صاحبِ طرز ہونے شاعر اور اس کے نظامِ فکر کے ابلاغ کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں تھا!!

اگلے وقتوں میں دربار کے شعراء بادشاہ سلامت کی خدمت میں مبالغہ آمیز روایتی تحسین سے بھرپور قصیدے لکھ لکھ کر شاہی تلطف سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اور عالم پناہ بھی ازراہِ نوازش ابتسام فرما کر انعامات و اکرام اور خلعتِ زریں سے ان شعراء کو بے کراں انداز میں نوازا کرتے تھے۔ انھیں خطوط پر آج ادب کے خود ساختہ خداوند ہونوں کی یادگار ادبی خدمات پہ وقتاً فوقتاً انہیں اپنے مضامین میں توصیفی کلمات سے یاد کر کے انہیں تمغۂ امتیاز سے سرفراز کرتے ہیں درباری شعراء کے باب میں معاملہ داد و دہش کا تھا مگر آج ادبی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ داد و ستد کی بات ہے!!

اردو ادب میں قحط الرجال کی کیفیت نہیں۔ مگر غیر جانب دار ثقہ لکھنے والوں کے نرم رو آہنگ پہ حاشیہ بردار ہونوں کا ابلیسی شور و غوغا اس قدر حاوی ہے کہ طوفانِ بدتمیزی کا سماں قاری کے سامنے آجاتا ہے! ادبی دنیا ایک ایسے بازار کے مماثل ہو گئی ہے جہاں معیاری ادب و تنقید کی آراستہ و پیراستہ دوکانیں تو موجود ہیں مگر خریدار وہاں اس لیے نہیں آتے کہ ان دوکانوں کے سامنے سستے قسم کے "فٹ پاتھی تاجر" حلق کے بل چیخ چیخ کر سستی قسم کی چیزیں سستے داموں پہ فروخت کر رہے ہیں!! کم فہم خریدار تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ سڑکوں پر آوازیں لگا کر بیچنے والے وہی چیزیں فروخت کر رہے ہیں جو دوکانوں پہ انہیں مہنگے داموں پہ مل رہی ہیں۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ ہانگ کانگ اور جاپان کے تیار شدہ سامان میں بعد القطبین ہے!!

ادب کی یہ مسخ شدہ صورتِ حال بڑی پریشان کن ہے۔ آج لکھنے والے خانہ بدوشوں کی طرح ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہر ادبی گروہ کا تنقیدی مقیاس اس کے ارکان کے لیے ایک طرح کا امتناعی حکم جاری کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادبی گروہ یا غیر جانبدار لکھنے والوں کی تخلیقات کو پڑھ کر ہدیۂ تحسین پیش کرنا تو دور کی بات ہے، رائے زنی اور تبصرہ آرائی سے بھی گریز کرے۔ اور یوں اپنے غیر وسیع المشرب ہونے کا ثبوت وسیع القلبی اور ڈنکے کی چوٹ کے ساتھ فراہم کرے۔ یہ المیہ یونانی المیہ GREEK TRAGEDY در اصل یہ عصبیت کا زہر ادب کی رگوں میں دور تک سرایت کر چکا ہے۔

---

[1] ...RITER SHOULD HAVE ANOTHER LIFETIME TO SEE IF HE IS APPRECIATED...
...VERSATION WITH JORGE LUIS BORGES. EDITED BY RICHARD BURGIN, 1969.

ہ تأسف کہ بعض معتبر لکھنے والے بھی متخالف گروہ کے ارکان اور غیر جانب دار لکھنے والوں سے یوں الرجک ALLERGIC
جیسے وہ جان لیوا بیماری کے جراثیم ہوں۔ جن لکھنے والوں کی یہ ذہنیت ہو ان کا تنقیدی معیار اور ادبی کردار کیا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ
نے میں ادب کا طالب علم قاری کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا! ــــ بورجیس BORGES نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر ایک لکھنے والا خود
تحریروں پر یقین نہ کرے تو وہ اپنے قاری سے یہ کیسے امید رکھ سکتا ہے کہ وہ انہیں صحیح تسلیم کرے گا [1] ـ عصبیت پر ایمان رکھنے
ہمارے ادیب خوب جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اُس کا ایک بڑا حصہ کذب و افترا کا پلندہ ہے۔ مگر اس کے باوجود
یں اس بات کی قوی امید ہے کہ ان کی بلند آہنگ پروپیگنڈہ بازی ان کے ہر جھوٹ کو سچ میں بدل کر اردو ادب کی تاریخ میں ایک
باب کا اضافہ کر سکتی ہے!!

معاصر اردو ادب کا معتدبہ حصہ لکھنے والوں کے تعصبات کا زائیدہ ہے اگر اس سازشی رجحان کا جلد خاتمہ نہیں ہوا تو اردو
ب کے طفیل PARASITES ان ذہین پختہ کار اور زیرک فن کاروں کو دیمک بن کر چاٹ جائیں گے جو گروہ بندی سے الگ تھلگ
مرانہ چشمکوں سے دامن بچاتے ہوئے، ادب کی بے لوث خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں ــــ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ادبی اقدار
نئے سرے سے تعین کریں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ادب کے پیش پا افتادہ اور عصبیت سے ملو مقیاس ہی کو بدل دیا جائے
کے نام نہاد سرپرستوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لکھنے والے سے اس کی مرضی کے خلاف وہ سب کچھ لکھوانے کی کوشش کریں جو
لکھنا نہیں چاہتا ــــ

ــــ اہلِ قلم کا یہ پیدائشی استحقاق ہے کہ وہ از خود موضوعات کا تعین کرے اور بلا استخفاف ان پر طبع آزمائی کرتا جائے۔
ب پر جب معتبر ناموں کی حکمرانی ہو گی معیاری اور تخلیقی ادب کی تخلیق کوئی آسان بات نہیں۔ آج لکھنے والوں کی ایک بڑی اکثریت
موضوعات پر قلم اٹھا رہی ہے جن کے محرک ادب کے گاڈ فادرز GOD FATHERS ہیں۔ جب ایک لکھنے والا مستعار
موضوعات پر لکھتا ہے تو فی الحقیقت وہ اپنے اندر کے مِن جو تھائی خلیقی ادیب سے دست بردار ہو کر ایک ایسے وظیفہ خوار کی حیثیت
یار کر لیتا ہے جس کا کام وظیفہ دینے والے کی ثنا خوانی کے علاوہ کچھ نہیں، جب صورتِ حال یہ ہو تو لکھنے کا عمل زندگی کی طرح سے
ل دریافت اور انکشاف کا تحیّر خیز سفر ثابت نہیں ہوتا۔ یوں ہنری ملر HENRY MILLER کے بات کی نفی ہو کر رہ جاتی
ہے [2] ـ اور بڑا ادب تو دور کی بات ادب ہی پیدا نہیں ہو پاتا!!

1. " IF A WRITER DISBELIEVES WHAT HE IS WRITING, THEN HE CAN EXPECT HIS READER TO BELIEVE IT."
JORGE LUIS BORGES IN WRITERS AT WORK 4TH SERIES, 1977.

2. " WRITING, LIKE LIFE ITSELF, IS A VOYAGE OF DISCOVERY."
HENRY MILLER.

بقیہ صفحہ ۳۹ ادب کی بدلتی قدریں

س کا مقدر ہے۔ نئی صدی ادب اور ادیب دونوں کے لیے نئے چیلنج اور نئے تقاضے لے کر آئے گی۔ ادب کی روپ ریکھا
بدلے گی، موضوعات بھی بدلیں گے، اور اظہار کے طریقے بھی تبدیل ہو جائیں گے مگر ادب بہر حال باقی رہے گا اور انسانی فکر پر اثر
بھی ہوتا رہے گا، اس لیے ادب کے وسیلے سے زندگی کی تہذیب اور تعمیر کا کام بہر حال مقدم ہے اور حسن و خیر کی جستجو ہی اس زمانے
ور آنے والے زمانے کا بھی، سب سے بڑا تقاضہ ہے جس سے پہلو تہی کر کے کوئی ادیب اور دانش ور درجۂ اعتبار نہیں حاصل کر سکتا۔

## راشد احمد

عکسِ غزل رُخ کے طلب گار ہوگئے
ہم بھی طلسمِ شب میں گرفتار ہوگئے

وہ جن سے بزمِ صوت کا آہنگ تھا کبھی
وہ صاحبِ سخن پسِ دیوار ہوگئے

منسوب جن سے بابِ نفس تھا ہر ایک شام
وہ بھی شریکِ حلقۂ اغیار ہوگئے

کچھ نقش ہائے رنگ بدن پر جو ثبت تھے
وہ رفتہ رفتہ حاصلِ پندار ہوگئے

اپنی فقط شناخت کی اک بات تھی بس
اور شہرِ آرزو میں خطاوار ہوگئے

● محلہ دلاور پور - پوسٹ و ضلع مونگیر (بہار)

## پرویز اختر

ہوا کے شور سے گھبرائے اور مرجائے
حواس باختہ پنچھی بھلا کدھر جائے

میں تیرے چہرے کی ساری اداسیاں چن لوں
میرے معاش کی الجھن اگر سنور جائے

محبتوں میں دیانت کا میں بھی قائل ہوں
وہ بدگماں ہے تو آکر حساب کر جائے

حواس لوٹ لئے اس کے راستوں نے میاں
اگر بحال ہو بیچارہ اپنے گھر جائے

وہ میری بات نہیں سنتا تم بھی کہہ دیکھو
تعلقات کا شاید خیال کر جائے

یہ عمر بھی کسی ساحل کی ریت ہے گویا
میں مٹھیوں میں بھر دوں یہ بکھر بکھر جائے

حدود توڑ کے ساری یہ شاعری کی مہک
ہوا کے دوش پہ بیٹھی نگر نگر جائے

● نزد امام باڑہ - محلہ قاضی سرائے - پوسٹ آفس
چاندپور - ضلع بجنور (یو۔پی)
پن: ۲۴۶۷۲۵

## فضا قیسی

مرا آئینۂ ایقان بننا
مرے بچو! مری پہچان بننا

ترے ساحل کی ریت اڑنے لگی ہے
سمندر! اک ذرا طوفان بننا

میں اپنے آپ ہی کو تول دیکھوں
مرے شہپر! ذرا میزان بننا

خدا نے آدمی ہم کو بنایا
ہمارا کام ہے انسان بننا

فضا میں کیسی یہ سرگوشیاں ہیں
در و دیوار! تم بھی کان بننا

● ندرت کلینک، قاضی پورہ، ٹانڈہ ۵-۱۹،
ضلع فیض آباد (یو۔پی)

خورشید حیات
"الحیات" نیو کریم گنج، گیا۔ (بہار)

# ایڈز

اور پھر وہ دن بھی آیا۔

جب مجھے اپنا گاؤں، اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا تھا جیسے جیسے ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت قریب آرہا تھا۔ میری تو جیسے جان ہی نکلی جارہی تھی۔ کس طرح سے میں نے دل کو کڑا کیا اور پھر اپنے گاؤں، اپنے شہر اور اپنے ملک، ایک ایک کو چھوڑتا ہوا اس سرزمین پر جا پہونچا جو برسوں سے آشی کے لیے ہی بہی زندگی کا نصب العین بنی ہوئی تھی۔

لندن کا ہوائی اڈہ دور سے مشینی زندگی کا تعارف پیش کر رہا تھا اور کشتیٔ حیات ٹربولنٹ موشن میں رواں تھی۔ چاروں طرف آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں، بھاگ دوڑ، چمک دمک، مشینی زندگی اور ان سب کے درمیان لوگوں کی مصنوعی ہنسی۔

جہاز سے اترتے ہی مجھے لگا کہ میں نے باہر کا کچھ پایا ضرور ہے لیکن ساتھ ہی اندر کا کچھ ایسا اپنا پن کھو دیا ہے جو زندہ رہنے کی پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔ آشی ان باتوں سے بے خبر تھی۔ کئی مرتبہ جھک کر اس نے میرا دھیان بھی موڑنا چاہا۔ لیکن میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اکیلے ہی نئی زندگی کو محسوس کرنے میں گم ہوگئی۔

ریموٹ کنٹرول

ٹی۔ وی

رقص

پرچھائیاں

...

...

ہم سب کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے انلارج ہونے لگیں۔ پھر انلارج ہوتے ہوتے ایک عالیشان عمارت میں گم ہوگئیں کمپنی کی طرف سے جو فلیٹ ملا تھا نہایت ہی خوبصورت تھا۔ ایک خوبصورت سا گارڈن

سوئمنگ پول اور احاطے سے باہر گاڑیوں کی آمد و رفت!

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باہر کے مناظر آسانی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ کیونکہ اس کی کھڑکیاں پورب، پچھم، اتر اور دکھن کی طرف کھلتی تھیں۔

میں ابھی پچھم کی طرف کے مناظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک چڑیا سیلنگ فین سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی ہے۔

چڑیا کمرے میں کیسے آئی اور پھر اس کی موت؟

...؟؟

ہم لوگوں کو لندن آتے ہوتے ۲ دو ماہ ہوگئے تھے۔ دن بھر مشینوں جیسی زندگی۔ ہر جگہ بناوٹی تعلق۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس سے ۲ دو منٹ بیٹھ کر گفتگو کی جا سکے۔ یہاں تک کہ اپنے علاقہ کے لوگ بھی ٹھیک سے نہیں ملتے تھے۔ جب اپنے علاقہ کے لوگوں کی یہ حالت تھی تو غیروں سے کیا شکوہ۔ سبھی ایک ہی رنگ میں رنگ چکے تھے۔

اس بندھے ٹکے ماحول میں اکثر میں حسین یادوں میں کھو جاتا۔

بسکومان کی سروس ۔۔۔۔ شام میں دوستوں کے قہقہوں کے بیچ وقت کیسے گذر جاتا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ لمبی چوڑی بحثیں اب بے معنی لگنے لگی تھیں۔ یہاں تو سب کچھ بندھا بندھا سا تھا۔ زندگی ایک دائرے میں محدود، ہنسنا بھی دھیرے سے ہوتا۔ جیسے اس پر بھی پابندی ہو۔ ایک وقت وہ تھا جب بابا، رات گئے تک بلو کو کہانیاں سنایا کرتے تھے اور بلو کی حالت یہ تھی کہ بابا سے کہانی سنے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن یہاں اسے کہانیاں سنانے والا کوئی بابا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی چندریکا مہتو کا لڑکا نہیں تھا۔

حال

مستقبل

ماضی

آشی، ببلو، بابا اور میں!

بس یہی تو تھا چھوٹا سا پریوار۔ ایک مڈل کلاس طبقے کی زندگی گذر رہی تھی۔ لیکن آشی کسی بھی طرح مڈل کلاس طبقے کی زندگی گذارنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ بات بات میں بگڑتی، مجھے طعنے دیتی اور زور دیتی کہ غیر ممالک چلے چلئے۔ اپنے ملک میں کیا رکھا ہے۔ اس نے بڑے بابو، ماسٹر جی، کرانی بابو، ان تمام لوگوں کی زندگی کا حقیقی رنگ دیکھا تھا۔ کڑی محنت کے باوجود تنخواہ اتنی کم ہوتی کہ زندگی گذارنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس نے ان لوگوں کی زندگی کا بھی ایک رُخ دیکھا تھا جن کے مکانوں کی چھت مکمل نہیں ہوتی ہے اور جہاں لوگ خون تھوکتے ہیں۔ آشی پستے ہوئے طبقے کی زندگی گذارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی خواہشوں کا دم گھٹتا ہوا دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ جب دولت کی فراوانی ہوگی تو سوسائٹی میں مقام بھی بلند ہوگا۔

حال

ماضی

مستقبل

اور تمنائیں!

میں نے کئی مرتبہ اس زندگی سے دور بھاگنے کی تمنا کی۔ مگر میں اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ آشی کی خوشیوں کا خیال رکھنا تھا۔ کیونکہ اس کا رشتہ اس شہر اور ملک سے سگما بونڈ سے جڑا ہوا تھا۔

مجھے اپنے قریب بلا لو بابا، اور الف لیلہ والی داستان اپنے ببلو کو سناؤ کہ وہ سونا بھول گیا ہے۔ میرے پاس تو کہنے کو کچھ بھی نہیں میرے جسم کا ایک ایک حصہ مشین میں تبدیل ہوگیا ہے۔ جو کسی ریموٹ کنٹرول کے اشارے پر اپنا کام کر رہا ہے۔ ابتدا میں وہ' [illegible] کے درمیان زبردست جنگ ہوتی رہی تاہم [illegible] کو شکست ہوگئی [illegible]...!

[illegible]

مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ ادھر بابا کی زمین جو صرف دو بیگھہ تھی بیس بیگھہ ہوگئی تھی اور کرایے کے مکان کی جگہ سہ منزلہ عمارت نے لے لی تھی۔

وہ میدان جہاں گاؤں کے لڑکے کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ وہاں بڑی بڑی کوٹھیاں اور عمارتیں تیار ہوچکی تھیں۔ پھلگو کی تپتی ریت جانب جانے والی اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی اب پکی سڑک میں تبدیل ہوچکی تھی۔ یہ سب صرف ایک سال کا کرشمہ تھا۔ گاؤں کے کئی انجینئر، ڈاکٹر بھی دائرے سے باہر نکل چکے تھے روشنی کی تلاش میں!

وہ، قہقہہ لگا رہا تھا اور میں، آکسیجن کی کمی سے دم گھٹ رہا تھا۔

ٹی وی

موسیقی

رقص

پرچھائیاں

ریموٹ کنٹرول

...

...

زندگی تیز رفتار تھی، آرام کی خاطر!

وقت گذر رہا تھا کہ آسانیاں ساری بہم تھیں۔ دوڑ دھوپ دن بھر کا مشغلہ۔ پھر شام کی فرصت عیش کی ضرورت کی جانب مائل کر دیتی۔ تحریکات جسمانی سے مجبور ہو کر آغوش حسن میں پناہ گزیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ صنف نازک سے نفرت ہوتی مگر تسکین کا کوئی نیا سامان بھی ایجاد کرنا تھا۔ ہم سے پہلے یہ سامان وہاں مہیا تھے۔ ایک دو بار استعمال کے بعد جسم نے تسکین پائی۔ دماغ کو لذت ملی۔

مگر لذت، لذت کے لئے تڑپتی رہی اور اس انفنیٹو INFINITIVE کے حدود چھونے لگی جس منزل پر پہونچ کر صرف سراب ہی سراب تھا۔ سراب میں بھی لذت ہوتی ہے۔ مگر میں ایڈز AIDS کا شکار ہوچکا تھا اور ہسپتال کے ایک کونے میں پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ جدید دنیا نے مجھے سب کچھ دیا۔ مگر سب کچھ انسان کی طاقت چھین لی جسم کو [illegible] شکست کھانے والی تھی۔ بیرونی ملک بھی اس BLOOD TRANSFUSION کام نہیں آ سکا [illegible]

# اوکتاویو پاز — Octavio Paz

## Touch

My hands
Open the curtains of your being
Clothe you in a further nudity
Uncover the bodies of your body
My hands
Invent another body for your body

## لمس

میرے ہاتھ
تمہارے وجود کے پردے کھولتے ہیں
تمہیں ایک اور عریانی کا لباس پہناتے ہیں
تمہارے جسم کے اعضا کو برہنہ کرتے ہیں
میرے ہاتھ
ڈھونڈ لیتے ہیں دوسرا جسم تمہارے جسم کے لیے

## The Other

He invented a face for himself
Behind it,
He lived, died, and resurrected,
Many times.
His face today
Has the wrinkles of that face.
His wrinkles have no face.

## غیر

اس نے اپنے لیے ایک نیا چہرا ڈھونڈ نکالا
اس چہرے کے پیچھے،
وہ جیا، مرا اور پھر سے اٹھا
کئی بار
آج اس کے چہرے پر ہے
اس چہرے کی جھریاں ہیں
اس کی جھریوں کا کوئی چہرا نہیں

## Friendship

It is the awaited hour
Over the table falls
Interminably
The lamp's spread hair
Night turns the window to immensity
There is no one here
Presence without name surrounds me

## دوستی

انتظار کا لمحہ
ٹیبل پہ گرتے ہیں
مسلسل
لیمپ کے بکھرے ہوئے گیسو
رات کھڑکی کو کائنات میں بدل دیتی ہے
یہاں کوئی نہیں
ایک بے نام موجودگی گھیر لیتی ہے

## Certainty

If it is real the white
Light from this lamp, real
The writing hand, are they
Real, the eyes looking at what I write?

From one word to the other
What I say vanishes.
I know that I am alive
Between two parentheses

## یقیناً

گر وہ سفید
روشنی ہے اس لیمپ کی، سچ ہے
لکھتا ہوا ہاتھ، تو کیا یہ حقیقت ہے
میں جو لکھ رہا ہوں اسے دیکھتی ہوئی آنکھیں؟

ایک لفظ سے دوسرے لفظ تک
میں جو کہتا ہوں گم ہو جاتا ہوں
میں جانتا ہوں کہ میں زندہ ہوں
دو قوسین کے بیچ



ایم منوجہ
۱۹/۷۹ ساؤتھ ٹی ٹی نگر، بھوپال ۳

# تخم مُردہ

کیبل ملکمے کا بڑا رول چیونٹی کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا۔

شکمدیو نے اپنی جھنڈی دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں پکڑ لی۔ کندھے پر لٹکی ہوئی لال شیدھ صافی سے اس نے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ اور پھر بائیں ہاتھ کی لال جھنڈی دائیں ہاتھ میں واپس لیتے ہوئے اُس نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ چلایا:

"سب مل کو"

"ہیا ۔ ۔ ۔" بڑے بھاری رول کو دھکیلتے ہوئے مزدوروں نے زور لگایا۔

"زیادہ زور سے"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔"

"تھوڑا اور"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔ ۔"

"پاؤں گڑا کے"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔ ۔"

شکمدیو نے پھر اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ کچھ دیر سے وہ لال جھنڈی کو اپنے چہرے کے نزدیک کئے ہوئے تھا۔ تاکہ تیز چمکتی ہوئی سورج کی دھوپ اُس کے چہرے کو جھلسا نہ دے۔ اس سے اس کا دایاں بازو اکڑ گیا تھا اس نے نیچے سڑک پر دیکھا۔ اُس کا سایہ اس کے پاؤں کے نیچے چھپا ہوا تھا پھر اُس نے سڑک کے اوپر چڑھتی ڈھلان کی طرف دیکھا۔ اس چڑھائی کو پار کرنے کے بعد ایک چھایہ دار شیشم آتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ کام رکوا دے گا۔ تاکہ مزدور کھانا کھا کر آرام کر لیں۔

مگر ابھی اس چڑھائی کو اس بھاری بڑے رول کے ساتھ سر کرنا بڑا مشکل تھا اور اس کے لئے تمام مزدوروں کو اپنی طاقت نچوڑ کر لگانی تھی۔

"سب مل کر ۔"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔ ۔"

"تھوڑا اور ۔"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔"

"زور لگا کے ۔"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔"

[illegible]

شکمدیو نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مزدوروں کے جسم دوہرے ہو رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ تار کے کیبل کے رول کی نکل کے پہیے سے چپکے ہوئے تھے۔ جو آگے آگے موٹی میلی رسیوں سے رول کو کھینچ رہے تھے اُن کی ہتھیلیوں میں موٹے رسّوں کی کھردری گولائی اپنی جگہ بنانے کی تکلیف دہ کوشش کر رہی تھی۔ اُن کے پاؤں ربڑ کے بنے ہوئے تھے۔ سڑک کی گرم تپتی ہوئی تارکول اُن کے ہر قسم کے جوتوں سے داخل ہو کر اُن کے تلوے جھلسا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سر اور چہرے لال صافیوں سے ڈھک رکھے تھے اور سورج انتہائی عروج پر تپ رہا تھا۔ ان صافیوں کی وجہ سے سورج کی دھوپ اُن کے دماغوں کے اندر جانے سے رُک رہی تھی ورنہ تمام اُن کے دماغ معطل ہو جاتے۔ اُن کے کھانے کے تھیلے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہلدی مائل رومالوں سے بندھے اُن کی کمر میں اُن کے بغل کے گڑھوں میں گرمی کندھوں سے لٹک رہے تھے۔ اُن کی قمیصیں پسینے سے تر تھیں۔ وہ اس بھاری رول کو ٹیلے سے ڈھکیل رہے تھے۔ اب اُن کے جسم کا سارا ایندھن کھپ چکا تھا۔ اور اُن کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔

کھانے کا وقت اور سایہ شیشم دونوں ہی ابھی دور تھے

شکمدیو نے سڑک پر تپتی تارکول سے نکلتے بخارات کو دیکھا سڑک خالی تھی صرف ایک آدمی فٹ پاتھ پر لگے گلمہر کے چھوٹے درختوں کی چھوٹی چھوٹی مرجھائی ہوئی پتیوں کی چھاؤں سے چپکا۔ منہ اور سر ایک موٹے تولیے سے لپیٹے چلا جا رہا تھا۔ شکمدیو کے منہ سے نکلا "سڑک پر ایک کتا بھی نہیں — اور بیچارہ"

اپنے ساتھیوں سے اُن کے کھوکھلے جسموں میں سے طاقت کی آخری بوند نچوڑنے کے لئے اس نے اپنے قریان تر زبان میں دیا مرود کر دیئے۔ یہ اُس کی ایک پرانی آزمائی ہوئی چال تھی۔ اور اس زبان کی وجہ سے ہی وہ اپنے مزدوروں میں ہر دلعزیز تھا۔ اس تکان کی شدت دور ہو جاتی تھی

"دیکھو بھائیو ۔ ۔ ۔"

"ہی ۔ یاہ"

"سر پہ سورج کے ۔ ۔"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔"

[illegible]

"یاد کرنا ۔ ۔ ۔"

"ہی ۔ یاہ ۔ ۔"

رول چڑھائی چڑھ چکا تھا۔ ماہیو کی نئی نئی ٹوپیا کی ہری باڑھ آنکھوں کو ٹھنڈک دے رہی تھی اُس نے سوچا۔ اس گرمی میں یہ ہری باڑھ اتنی ہی لطف اور آرام دہ ہے جتنی سیاہ رات میں کسی جوان عورت کا جسم۔ ماہیو کے پاس رُک کر اُس نے لال جھنڈی سر کے اوپر اُٹھا دی۔

رول رُک گیا۔ مزدوروں نے کندھوں میں پھنسی ہوئی روٹی کے ڈبوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں اتاریں اور ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اپنے اپنے ڈبے کھول کر۔ ماہیو کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ کھانے لگے کہیں سے کچھ کتے اُن کے پاس آ کر اپنی دُموں کو کچھ مل جانے کی اُمید میں خوشی سے ہلانے لگے۔ اور پیڑ پر بیٹھے کوّے کائیں کائیں کرنے لگے۔

کھانا کھا کر شکمدیو نے بیڑی سلگائی اپنی صافی کو گولا میں لپیٹ کر اُس نے درخت کی ایک موٹی جڑ پر رکھا اور اس کو سر کے لئے تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ بیڑی سے ایک لمبا کش لے کر اُس نے بہت سارا دھواں چھوڑا اور اوپر درخت کی چھتری کی طرف بڑھتے ہوئے دھوئیں کا تعاقب کرتی ہوئی اُس کی نظریں درخت کی دو شاخوں میں بنے ایک گھونسلے پر پہنچ کر رُک گئیں۔ ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "پرندوں کا انداز رہائش نہیں بدلا تھا۔" اس نے سوچا "جس طرح وہ کائنات کے آغاز میں درختوں پر گھونسلے بنا کر رہتے تھے۔ آج بھی رہتے ہیں۔ اسی طرح غریب مزدوروں کا انداز رہائش بھی نہیں بدلا بندر اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے انسان بن گئے ہیں اور درختوں اور غاروں کو چھوڑ کر خوشنما عمارتوں میں رہنے لگے ہیں کچھ اب پالتو ہو کر اصطبلوں میں اور کچھ پالتو ہو کر چڑیا گھروں میں رہنے لگے ہیں مگر پرندے اور مزدور اب بھی گھونسلوں اور جھگیوں ہی میں ہیں۔ جس طرح کئی ہزار سال پہلے سے اُن کے آباء و اجداد رہتے آئے ہیں وہ اسی طرح کی جھگی میں رہتا تھا جس طرح کئی ہزار سال پہلے اس کا دادا رہتا تھا۔

[illegible]

کبھی رہا تھا۔

"یہاں سے راجدھانی چلی گئی ہے۔ نئی راجدھانی میں بہت کام ہوگا۔ مرد عورت بچے سب کو کام ملے گا۔ تم سب ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں ریل بھاڑا اور خرچے کو ایڈوانس دے گا۔"

وہ اس ٹھیکیدار کا ایجنٹ تھا جس نے نئی راجدھانی میں نئی عمارتیں کھڑی کرنا تھیں ——— ۔ اس کے جانے کے بعد پوری بستی میں ہلچل مچ گئی۔

"یہاں سے راجدھانی چلی گئی ہے۔"

"یہاں اب کیا کام ملے گا...؟"

"صرف مرمت کا کام رہ گیا ہے۔"

"پرائیویٹ کام میں بڑی کھٹ پھٹ ہوتی ہے۔"

اس کے بعد کچھ ہی دنوں میں آدھی سے زیادہ بستی اجڑ گئی۔

اپنی ماں اور ماما کے ساتھ وہ نئی راجدھانی میں آگیا۔ یہاں آکر انھوں نے ویسی ہی جھگی بنائی جیسی وہ پرانی راجدھانی میں چھوڑ آئے تھے۔

بہت ساری عمارتیں کھڑی کی جا رہی تھیں سب سے پہلے انھوں نے انجینیروں اور افسروں کے لئے سیکریٹری کوارٹر بنائے۔

بہت بوڑھے مزدوروں اور بہت چھوٹے بچوں کو چھوڑ سب کام پر جاتے۔ اس کا ماما راج مستری تھا اس کو پانچ روپے روز ملتے۔ اس کی ماں اس کی مددگار رہی۔ اس کو ایک روپیہ بارہ آنے ملتے۔ سکھدیو عمر میں بارہ سال سے زیادہ تھا۔ اور وہ بھی ایک روپیہ روز پر کام کرنے والے لڑکوں کے ساتھ مزدوری کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں مانی نہیں تھی۔ اپنا اور ماما کا کھانا ساتھ کے لئے باندھ کر وہ اس سے کہتی۔

"تو کیوں چنتا کرتا ہے رے۔ تیرے ہاتھ پاؤں ابھی چھوٹے ہیں۔ کما لینا جب بڑے ہو جاؤ گے۔" وہ اسے دو آنے کا سکہ تھماتی اور ماما کے ساتھ کام پر چلی جاتی۔

وہ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر بنے پل پر بیٹھ کر آنے والی بسوں اور جانے والی لاریوں کو دیکھتے مونگ پھلی کھاتے ہوئے اپنا وقت گزارتا۔ بستی کے کچھ ایسے اور مجبور لڑکے جو کام پر نہیں جا سکتے تھے انھوں نے دھندے شروع کر دیئے تھے۔ بستی کے چوراہے پر چھوٹے چھوٹے ٹاٹ کے ٹکڑے بچھا کر انھوں نے بیڑی سگریٹ گٹکا سستی شکر کی گولیاں ماچس وغیرہ بیچنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نے پانے، پیچ کش، پلاس اور ایک پمپ اکٹھا کرکے سائیکل مرمت کا دھندہ شروع کر دیا تھا صرف جیبوں میں جو اتنے سے ہی ان کی کافی آمدنی ہو جاتی۔ کچھ جو دلیر تھے۔ انھوں نے گھوم پھر کر مونگ پھلی بیچنا شروع کر دیا۔

ڈالڈا کے ڈبوں کے ڈھکنوں سے ترازو اور پتھر اینٹ توڑ کر چھٹانک کے باٹ بنا کر وہ کچی مونگ پھلی بازار سے لاتے اور اسے گھر پر ریت میں بھون کر کپڑے کے تھیلے میں بھر کر کندھے سے لٹکائے ادھر ادھر گھومتے پھرتے۔ اس نئی راجدھانی کے کونے کونے سے واقف ہو کر وہ دوسرے لڑکوں کو اس نئے شہر کے بارے میں بتاتے۔

"سالے۔ وہ پان کی پیک ہر جگہ تھوک دیتے ہیں کہ جہاں دیکھو دیواریں لال۔"

"ایک سالے نے اتنی تیزی سے مڑ کر تھوکا کہ پان کی پیک پاس سے گذرتی موٹر کی کھڑکی کے اندر چلی گئی۔ کار کا ڈرائیور تو اپنے شہر کا تھا۔ اس نے گاڑی کو روکا اور سالے کی وہ پٹائی کی۔ وہ پٹائی کی کہ بس۔" "ارے جا۔ اس شہر کے لوگ بڑے غنڈے ہیں جیب میں چاقو رکھتے ہیں..." دوسرے لڑکے نے دخل دیا۔

"ابے تو کیا، اپنے شہر میں کیا کم غنڈے تھے!! وہ فقیرا کیا دادا تھا، ٹھاکے کے سامنے سے شراب کی بوتلیں لے کر نکلتا تھا۔"

دوسرے لڑکے نے صفائی پیش کی۔

"ابے جا یہاں کے لوگ تو ہجڑے ہیں ہجڑے۔ عورتوں کی طرح سینما کے باہر کھڑے رہتے ہیں۔" دوسرے لڑکے نے شہر کے بارے میں اپنی جانکاری پیش کی۔

"ابے۔ آج میں نے مینا کماری دیکھی۔" مونگ پھلی بیچنے والے نے اچنبھا پانے کے لئے کہا۔

"کہاں کہاں" سب لڑکوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا

"مالو کوارٹروں میں۔ اس نے اپنے بچے کے لئے مجھ سے مونگ پھلی خریدی۔"

"تو ترے سے مونگ پھلی خریدی؟" وہ سب نے رشک سے پوچھا مگر ان کے لہجوں میں غیر یقینی کی جھلک تھی۔

"ہاں بے سالے ہاں کل جانا میرے ساتھ دکھا دوں گا بالکل مینا کماری۔"

اور وہ مونگ پھلی بیچنے والا اپنے خراب پاؤں کو گھسیٹتا ہوا "بچپن کی محبت کو دل سے نہ بھلا دینا۔ جب یاد میری آئے ملنے کی دعا کرنا" گاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

سکھدیو کو اس لڑکے پر سب سے زیادہ رشک ہوتا تھا۔ اس کے من میں بڑی زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی مونگ پھلی بیچتے ہوئے سینما کے باہر کھڑے ہجڑوں اور مالو کوارٹروں میں مینا کماری کو دیکھے۔

اس کی ماں کو فضول باتوں سے چڑ تھی۔ چاہے وہ ماما سے بات کر رہی ہو یا سکھدیو سے۔ اس کی پوری بات دو تین لفظوں پر مشتمل ہوتی: "نہیں بیا رے۔ قمیص اُتار دے سی دوں۔" "چل کھانا کھا لے رے"۔ اس سے زیادہ وہ بولتی نہیں تھی۔

ماما بھی خاموش وضع کا آدمی تھا۔ مضبوط کاٹھی کا یہ لمبا چوڑا آدمی تھا: "میں جا کر آتا ہوں۔" "کھانا بن گیا؟" "قمیص سل گئی؟" جیسے کچھ ہی جملے وہ بھی بولتا تھا۔ اس کی گھنی بکھری ہوئی مونچھیں اس کے چہرے پر کرختگی لانے کا کام کرتی تھیں۔ سکھدیو کو احساس تھا کہ اس ماما کی وجہ سے بستی کے کئی لڑکوں نے اسے مارنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ سکھدیو سے وہ کم بات کرتا تھا۔

بات چیت اس طرح شروع ہوتی۔ "کیوں رے آج تو سست کیوں ہے رے؟" اور سکھدیو کے ہاتھ میں اکنی یا دونی کے ساتھ ختم ہو جاتی۔

کام سے لوٹ کر ماں کھانا بناتی۔ سب اکٹھے بیٹھ کر کھاتے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے ماما باہر کھٹیا پر بیٹھ کر بیڑی پیتا اور سب سو جاتے۔

کبھی کبھار ہفتے میں ایک بار ماما پاس کی کلالی پر شراب پینے جاتا۔ اس دن وہ سکھدیو کو سینما دیکھنے کے پیسے دے جاتا اور اس دن رات کو ماں جھگی میں اکیلی رہ جاتی۔

سکھدیو نے اپنے مونگ پھلی بیچنے کے دھندے کی شروعات کے لئے ماما کی مدد لینے کے بارے میں سوچا۔ اس دن وہ پلیا پر بیٹھا تھا جب ماما کلالی جاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرا۔

"کائے رے اتنا سست و اداس کیوں بیٹھا ہے" اس نے بڑی شفقت سے سکھدیو سے پوچھا۔

سکھدیو نے اس موقع کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا "ماما۔ میں مونگ پھلی بیچا کروں۔ دو ڈھائی روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔"

"کیوں میرے بیٹے" ماما نے حیرانی سے پوچھا۔ "تجھے جیب خرچ کم پڑتا ہے کیا؟" اس کے لہجے میں شفقت تھی۔

سکھدیو اس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"تم مونگ پھلی بیچنا چاہتے ہو؟ تم اپنے بزرگوں کا دھندہ نہیں کرنا چاہتے۔ تمہارے بزرگوں نے ہندوستان بھر میں بڑی سے بڑی عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ ہندوستان کے خوبصورت مندر۔ مسجدیں۔ قلعے۔ مقبرے [illegible] سب تمہارے بزرگ راج مستریوں نے بنائے اور تم راج مستری بن کر مونگ پھلی بیچنے والا بننا چاہتے ہو۔ بیکار بات نہیں کرتے۔ یہ لو ایک روپیہ سینما دیکھ آؤ۔" سکھدیو کی ہتھیلی پر ایک روپے کا نوٹ رکھ کر ماما کلالی کی طرف بڑھ گیا۔

جھگی میں آکر سکھدیو نے قمیص پہنی۔ اس نے ماں سے کہا۔ "ماما نے مجھے سینما دیکھنے کو پیسے دیئے ہیں۔" اس کی ماں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے روٹی بناتی رہی۔

سکھدیو نے جیب میں پڑے ایک روپے کے نئے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ کو مٹھی میں کس کر پکڑ لیا۔ نوٹ کا نیا پن اس کے جسم میں ایک بہت لطیف ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

"دو آنے بس کا کرایہ۔ آٹھ آنے سینما کا ٹکٹ۔ اور پھر مونگ پھلی اور پان کھانے کے بعد بھی اس روپے میں سے کچھ نہ کچھ بچا رہیں گے۔" سکھدیو نے حساب جوڑا..... لیکن اگر وہ ایک روپے کی کچی مونگ پھلی لے کر اسے بھون کر بیچ آئے تو اس کے تین روپے بن جائیں گے۔ ماں اور ماما کے کام پر جانے کے بعد وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مونگ پھلی والے لڑکے سے اس کا ترازو اور باٹ لے کر وہ آدھی چھٹانک کی پڑیاں بنا کر آسانی سے تھیلے میں لے جا کر بیچ سکتا ہے... مگر اس کے باپ دادا کا پیشہ۔ جس پر اس کے لوگوں کو فخر تھا کہ وہ محل حویلیاں، مندر مسجد بناتے ہیں.... وہ کیا ہوگا۔ وہ ایک کاریگر سے تخلیق کار سے خیانت ہو جائے گا....

اس کو اپنے باپ کے بارے میں صرف اتنا یاد تھا کہ وہ ایک ماہر راج مستری تھا۔ ایک اونچی عمارت بناتے ہوئے وہ تیسری منزل پر بانسوں بلیوں سے بنے پیڑے سے پھسل کر گر گیا تھا جب سے اسے یاد ہے وہ ماں اور ماما

کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اُس کے باپ کے مرنے کے بعد کئی راج مستریوں نے یہ خطرناک پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اُس کا ماما اپنے پیشے کو فخر سے اپنائے ہوئے تھا۔ سکھدیو نے فیصلہ کرلیا۔ نوٹ کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے ہوئے وہ بس اسٹینڈ پر کھڑا رہا۔ جب آخری بس شہر سے آگئی تو وہ اپنی بستی کی طرف لوٹ پڑا۔ جھگی کے دروازے پر پڑے ٹاٹ کے پردے کو ہٹا کر دوسرے ہی لمحے اُس نے چھوڑ دیا۔ ایک لمحے میں اس نے ماما کے سڈول نیم شیم بدن کے نیچے پڑے اپنی ماں کے نرم گندھے جیسے بدن کو تڑپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اکیلے پن کے ایک عظیم احساس نے اُس کو دبوچ لیا۔ اس کی تسلی کو اس کی ایک مشفق ماں ہے ایک محافظ ماما ہے۔ پردے کے ہٹانے اور گرانے کے بیچ کے ایک لمحے کم وقفے میں یہ تسلی چور چور ہوگئی تھی۔ وہ ماما کو اپنی ماں کا بھائی سمجھتا رہا لیکن اس لمحے نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس کی ماں کا بھائی نہیں تھا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ بستی کے کئی لڑکے اس کو ماما کہتے تھے اور وہ ان میں سے کسی کی ماں کا بھائی نہیں تھا۔

اب اس کو ایک ہی جھگی میں ماں اور ماما کے ساتھ رہنے میں کوفت ہونے لگی۔ صبح اُٹھ کر کچھ لکڑی کے کھوکھوں اور کچھ تارکول کے کاٹے ہوئے ڈرموں سے اپنے لئے جھگی کے ساتھ ایک نئی جھگی جوڑنے کا ارادہ کرکے وہ وہیں لیٹا پڑ سو گیا۔ صبح اس کو جھگی سا کر لڑکوں کے ساتھ مارو کے موٹر پر کام کرنے جانا تھا۔

جب سکھدیو کو کام کرتے ہوئے روزانہ تین روپے ملنے لگے تو اُس کی ماں نے اُس کی شادی بستی کی ایک گوری تندرست لڑکی سے کر دی۔ جب بھی وہ اپنے پاس پڑی بیوی کے گورے جوان بدن کو مچلتے ہوئے دیکھتا تو وہ اپنی ماں اور ماما کو اُس تباہ کن قہر آمیز لمحے کے لئے معاف کر دیتا۔

راجدھانی کے سب نئے مکان بن چکے تھے۔ اب صرف ان مکانوں کو برقرار رکھنے کے لئے مرمت سفیدی وغیرہ ہی کا کام رہ گیا تھا۔ عمارتیں بن جانے کے بعد بستی آدھی سے زیادہ اُجڑ گئی تھی۔ بہت سارے لوگ پاس ہی میں بہنے والی ندی کے بڑے پل پر کام کرنے لگے تھے۔ کچھ لوگ جو راجدھانی میں مزدوری کرآئے تھے۔ کاروباری دکاندار اور ٹھیکیدار بن گئے تھے۔

انقلاب آگیا تھا۔ آنے پیسوں میں، سیر کلوگراموں میں اور گز میٹر میں بدل گئے تھے۔ اب شہر کی دیواروں پر پان کی پیک کے نشان کم ہوگئے تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں کی پہچان نہیں رہی تھی۔ کیونکہ دونوں ایک ہی جیسے لباس یعنی جینز اور ٹی شرٹ پہنتے اور ان کا بناؤ سنگھار بھی ایک جیسا ہوگیا تھا۔ بالوگوار فلموں میں اب مینا کماری کے ساتھ ساتھ نندہ، آشا پاریکھ، زینت امان، ہیما مالنی جیسی دکھنے والی عورتیں بھی آگئی تھیں۔

ہر چیز بدل گئی تھی سوائے مزدوروں کی جھگیوں کے وہ ویسی ہی بنی تھیں جیسے آج سے کئی سال پہلے۔ ان جھگیوں میں بھی کچھ انقلاب آئے تھے۔ کسی جھگی میں پرانی راجدھانی سے آئے بوڑھے لوگ مر کھپ گئے تھے۔ کئی جھگیوں میں نئے بچے پیدا ہو چکے تھے۔ سکھدیو کی ماں کی جھگی سے ماما چلا گیا تھا۔ وہ اب کسی اور بیوہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس بیوہ کا مرد نئی راجدھانی کے تالاب کا پانی پی کر کسی مرض کی وجہ سے چل بسا تھا۔ اس کی جھگی میں اس کی جوان بیوی آگئی تھی۔

سکھدیو کی ماں اب کام پر نہیں جاتی تھی۔ اس کا نام تو مسٹر پر تھا مگر اب وہ انجینئر صاحب کے گھر برتن جھاڑو کرنے جاتی تھی۔ اس لئے اپنے رسوخ سے اس نے سکھدیو کو راج مستری بنوا دیا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنے باپ دادا کے پیشے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو سات روپیے روز ملتے تھے۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ مزدور بن کر جاتی۔ وہ خوش تھا اور اس کی وہ جھگی جنت کی طرح تھی۔

اس دن وہ اپنی جھگی سے حسب معمول کام پر نکلے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں اوزاروں کا بھاری تھیلا اور اس کی بیوی نے دونوں کے کھانے کا رومال میں بندھا ڈبا تھام رکھا تھا۔

چوکیدار نے خالی بنگلہ کھول دیا تھا۔ اس کے غسلخانے کی کچھ ٹائلیں اُکھڑ گئی تھیں اور انھیں جمانا تھا۔ یہ بنگلہ نئے آئے ایک بڑے افسر کو ملنا تھا۔

سکھدیو کو کام سمجھانے اور اچھا کام کرنے کی بات کرکے اوورسیئر اپنی بھٹ بھٹی پر چلا گیا تھا چوکیدار اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

اس گرمی میں غسلخانے کی ٹھنڈک بڑی راحت دہ تھی اُس نے اپنا کام بڑی محنت اور مستعدی سے کرنا شروع کیا ٹائلیں جمانے کے بعد وہ اُٹھا۔ کچھ دوری سے اُس نے اسے کام کا جائزہ لیا۔ ٹائلوں کے پاس آکر اس نے ہاتھ سے سیمنٹ کو کریدا۔ اس کرنی سے اس نے ٹائلوں کے بیچ کھانچے صاف کئے۔ اب پرانی اور نئی ٹائلوں میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کام ختم ہو چکا تھا مگر ابھی دن سر پر تھا باہر تپتی ہوئی دوپہر کی گرمی۔ اندر غسلخانے کا ٹھنڈا ماحول سکھ جاں تھا۔ اور چوکیدار اپنے کمرے میں سو رہا تھا اس نے سارا دن وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

دونوں نے کھانا کھایا اور چوکیدار کی صراحی سے پانی پیا۔ سب وہ خوابگاہ جس کے ساتھ غسلخانہ منسلک تھا۔ کی دری پر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کا سر غسلخانہ کی دہلیز کے پاس تھا جس سے بیڑی کی راکھ خوابگاہ کی دری پر نہ گر کر غسلخانہ کے فرش پر گرائی جا سکے۔

چھت پر لگا بجلی کا بڑا پنکھا ساکت تھا۔ حال کی کھڑکی میں سے ٹرینا کی باڑھ سے نکل کر ہری گھاس کے لان سے گزرتی ہوئی داخل ہونے والی ہوا راحت بخش تھی۔ دیوار کے پاس ایک بڑے آئینے والی میز اور ساگوان کی قیمتی الماری لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ پنکھے کے نیچے ایک بڑا پلنگ اور اس پر ایک موٹا گدا۔ کمرے میں عجیب تنہائی۔ سکھدیو ان لوگوں کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ جن کو ان آرام دہ بنگلوں میں رہنے کا نصیب ملا تھا۔ اچانک اُس کو کچھ ہو گیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اُٹھا۔ اپنی بیوی کو جو اُس کے پاس ہی لیٹی تھی اُس نے اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور پلنگ کے موٹے گدے پر لٹا دیا۔

کچھ دیر بعد ——— بدحواس مگر مطمئن سکھدیو نے پلنگ کے کنارے کھڑے ہی اپنی بیوی کو ساڑی ٹھیک کرتے دیکھا۔ آج وہ اُسے مینا کماری اور وحیدہ سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

اُس دن کے بعد جب بھی وہ اپنی بیوی کے گداز بدن کو اپنے جوان بازوؤں میں لیتا تو اُس کو جھگی کے کچے فرش کے کھردرے پن کا احساس بے طرح کاٹتا۔

اُس نے اپنے بزرگوں کی طرح عالیشان عمارتیں کھڑی کی تھیں جن میں بڑے لوگ رہتے تھے مگر اپنے لئے اُنھوں نے صرف جھگیوں کی ہی تخلیق کی اور ان کے کھردرے کچے فرشوں اور سیلن بھری دیواروں کے بیچ تارکول کے کاٹے ڈرموں سے بنی گرمی میں تپتی اور سردی میں سکڑتی چھتوں کے نیچے اپنی زندگی کاٹتے رہے ہیں۔

اُس کو اپنے پیشے سے نفرت ہو گئی۔ محکمہ عمارات کو چھوڑ کر اُس نے اب محکمہ ٹیلیفون میں نوکری کر لی۔ اب وہ گڑھے کھودتا ہے اور ٹیلیفونوں کا کیبل اُس میں گاڑ دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے ٹیلیفون بڑے لوگوں کے گھروں اور دفتروں میں ہوتا ہے۔ وہ اُس پر باتیں کرتے ہیں جو کیبل سے گزرتی ہیں . . . وہ سمجھتا ہے۔ وہ ان آوازوں کو گڑھوں میں دباتا ہے جیسے وہ امارت کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ گڑھے ہی گڑھے سکھدیو اُٹھ کھڑا ہوا۔ صافی کھول کر اُس نے کندھے پر رکھی جھنڈی ہاتھ میں لئے وہ کیبل کے رول کے آگے آیا۔

”سب ہی مل کے“

”ہیّا ہو“

اور کیبل کا بڑا بھاری رول چیونٹی کی چال سے آگے بڑھنے لگا۔ ❁

## چند وضاحتیں

● جناب ایم مینوجہ کا یہ افسانہ تجربے کے طور پر تین کالم میں دیا جا رہا ہے۔ افسانہ نگار سے معذرت کے ساتھ ہم اپنے قارئین سے ان کی گراں قدر رائے جاننے کے خواہش مند ہیں۔ شاعر میں اس نوع کے کیے جانے والے تجربے آپ کو کیسے لگے؟

● گزشتہ شمارے کا سرورق، ڈیزائن مع مصور جناب غیاث قریشی (اورنگ آباد) نے بنایا ہوا تھا، سہواً ان کا نام شائع ہونے سے رہ گیا جس کے لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

# مکتوب

**رشید محمد عقیل** ۔ محمود منزل، دریاآباد، الٰہ آباد ۔ (یوپی)

آپ نے شاعر کو اس طرح وقیع اور حسین بنا دیا ہے مرحوم اعجاز صدیقی بھی نہ کر سکے تھے۔ اگرچہ ۔ تو اب پسر تمام والی مثل آپ نے پوری کر دکھائی۔ یہ بھی اچھا ہے کہ ہر مکتب خیال سے شاعر فیض حاصل کرتا ہے اور کسی پر نہ پابندی ہے، نہ کسی کے ساتھ جانب داری۔

اردو کے مسئلے پر آپ کے اداریے، فکر انگیز اور غور طلب ہوتے ہیں مگر حکومت بہت چالاک ہے اور برملک طور پر اردو زبان والے کا صحیح معنوں میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ تو کچھ رعایتیں اردو کو وقتاً فوقتاً ملا کرتی ہیں، ان کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح یہ مسئلہ دب جائے۔ بس یہ پرانے لوگ جو اردو کے لیے شور مچا رہے ہیں جب ختم ہو جائیں گے تو اردو کے لیے شور مچانے والا بھی کوئی نہ رہ جائے گا۔ نئی نسل کا یہ مسئلہ ہی نہ رہ جائے گا۔ حکومت کے برخلاف جو بی الف کے لوگ جو اردو کے ساتھ ہمدردی کے بیانات دیا کرتے ہیں، وہ کبھی اردو سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندی گردی میں یہاں تک شدت پیدا ہو گئی ہے کہ چاہے ہندوستان برباد ہو جائے مگر ہندی کی بالادستی ختم ہو نہیں ۔۔۔ سے دشمنی نہیں۔ آج تک کسی اردو کے شاعر یا ادیب نے کبھی بھی زبان کی مخالفت نہیں کی ہے پتہ نہیں کیوں ہندی زبان والے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک اردو باقی ہے ہندی تمام ملک پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے ہندی کے بڑے شاعر اور ادیب تو اب خواہ اردو کے خلاف بیانات دیا کرتے ہیں ۔۔۔ ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر ۔۔۔ اردو کے خلاف جس انداز میں لکھا ہے وہ اردو والوں کی تمام خوش فہمیوں کو دور کر دیتا ہے۔ بہر حال۔ آپ لکھتے رہتے ہیں، لکھتے رہیے۔ وقت ہی ایسا ۔۔۔ رہا ہے۔ دیکھنا ہے کہ اردو کب تک زندہ رہ سکتی ہے۔

**وجاہت علی سندیلوی** ۔ ۔۔۔ سندیلہ (یوپی)

شاعر کا شمارہ ۔۔۔ دیکھا۔ زیر نظر شمارے میں ۔۔۔ عثمان فاروقی صاحب کا مضمون سوانح غالب کا ایک پہلو ۔۔۔ اور خصوصاً ان کا ۔۔۔ شمارہ ۔۔۔ استاد عبدالصمد سے متعلق بہت پُر دلیل اور ۔۔۔ غالب کیلیے ۔۔۔ ہے۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں بھی غور طلب ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کا یہ ارشاد کہ غالب اکثر غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں یقیناً اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ مُلّا عبدالصمد کے متعلق بھی انہوں نے لازماً غلط بیانی کی ہوگی۔ لیکن یہ اس سوال کا کہ غالب نے خواہ مخواہ عبدالصمد کا قصہ (اگر وہ فرضی تھا) کیوں گھڑ دیا۔ جواب ہو سکتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ ہندوستانی فارسی دانوں میں اس کی وجہ سے غالب کی فارسی دانی کے وزن میں اضافہ ہوتا تھا۔

اس سلسلے میں کچھ واقعاتی شہادتیں CIRCUMSTANTIAL کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

۱۔ غالب کے قول کے مطابق جب عبدالصمد ان کے یہاں آگرے میں آیا تو ان کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ دو سال اس نے ان کو تعلیم دی۔ غالب جیسے علم کی کم عمری اور مدت تعلیم کی قلت دیکھتے ہوئے یہ امر قرین قیاس نہیں ہو سکتا کہ ایک نو عمر طالب علم نے اس قدر کم عرصے میں تمام حقائق و دقائق زبان فارسی پر مکمل دستگاہ حاصل کر لی ہو۔ خصوصاً جب کہ وہی غالب خود اپنے عربی پڑھنے کے متعلق خود کہتا ہے کہ ایام دبستان نشینی کے بعد وہ لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ غالب کے زمانے کی فارسی میں عربی زبان کا بڑا دخل تھا۔

۲۔ غالب کے قول کے مطابق عبدالصمد ان کے مکان پر آگرے میں دو سال رہا۔ اس تمام عرصے میں کہیں اس بات کا تذکرہ خود غالب بھی نہیں کرتے کہ ۔۔۔ ان کے کن عالموں اور کاملوں سے ملا اور کسی سے غالب نے ملا دیکر اور لوگوں کو بھی پڑھایا۔ وہ آگرے چھوڑتا ہے ۔۔۔ تذکرے میں چھپا گیا تھا

۳۔ غالب نے ۔۔۔ میں بتایا تھا کہ عبدالصمد نے انہیں کوئی ایسی کتابیں پڑھائیں ۔۔۔ صرف فارغ التحصیل ہو گئے بلکہ ایک ایسی زبان کے جو ۔۔۔ زبان نہیں تھی فوقیت لے گئے ۔۔۔ کم از کم وہ اس کے ۔۔۔ پر کچھ روشنی ڈالتے۔

۴۔ غالب ہندوستان کے فارسی دانوں کو نگاہ میں نہ لاتے وہ خود بھی ہندوستانی ۔۔۔ تھے۔ ان کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت جتانے کے لیے ضرورت تھی کہ وہ ظاہر کریں کہ خود انہوں نے ایک ایرانی سے فارسی سیکھی ہے۔ انہوں نے غلط بیانی کی ہو یا نہیں۔ ان کے پاس اس کا سبب ضرور تھا۔

۵۔ مذکورہ بالا امور کے پیش نظر حالی کا یادگار غالب میں یہ لکھنا کہ خود غالب نے بتایا تھا کہ ۔۔۔۔۔ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے چونکہ لوگ مجھ کو بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔ سرسری طور سے ٹالا نہیں جا سکتا۔

۶۔ حالی کو غلط بیانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی خصوصاً جب کہ وہ غالب کے بڑے عقیدت مند اور مداح تھے اور اس بیان سے غالب پر آنچ آتی تھی۔

اب اتنی مدت کے بعد بالکل قطعی طور سے یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ عبدالصمد کے بارے میں غالب کے متعلق غالب نے جو کچھ کہا وہ صحیح تھا یا غلط البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قرین قیاس یہی ہے کہ عبدالصمد کوئی ایرانی ۔ ۔۔۔ معلم نہیں تھا۔ البتہ اس کا ہونا بالکل ہی نہیں تھا تب بھی وہ اتنا بڑا فارسی دان نہیں تھا جتنا کہ غالب نے بیان کیا ہے یا پھر غالب نے اس سے اتنا نہیں سیکھا جو انہیں فارسی کا عالم یا محقق بنا دیتا۔ چنانچہ اس کا ہونا یا نہ ہونا صرف ایک ایسی منطقی بحث کا موضوع بن سکتا ہے جس پر غالب کا ہی یہ مصرع صادق آتا ہے۔

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

**سید یحییٰ نشیط** ۔ کل گاؤں، دولت خان ۴۴۵۲۰۳ (مہاراشٹرا)

سال رواں شمارہ ۹ کا دوسرا حصہ اشتراک شمارہ دستیاب ہوا۔ غالب پر تمام مضامین بہترین تحقیق اور ملی ترین تنقید کے عمدہ نمونے ہیں جن میں غالب پر ہر پہلو اور ہر زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب اور قتیل سے متعلق ۔۔۔ پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون بڑا فکر انگیز ہے۔ موصوف نے غالب کے شعر سے

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

کے ضمن میں حرف "سے" بمعنی "کی طرح" "جیسی مانند" یا "بہ سبب" ہونا لیا ہے اور اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ جیسے "تک" "سے" مانند اور طرح کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ میر کے ایک شعر سے استدلال بھی کیا ہے۔

میں اپنی ناقص رائے میں متذکرہ بالا شعر میں "مجھ سے" بمعنی "میری مانند" نحوی ترکیب کے اعتبار سے کوئی قرینہ نہیں۔ ادوات تشبیہ جیسے "سا" اور "سی" ایسے حروف ہیں جو جنس (مذکر و تانیث) اور تعداد (واحد، جمع) کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً میر کے یہ اشعار

گل شرم سے بہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا
آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھی بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا
کہاں آتے میسر تجھ سے ہم کو خود نما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا

ان اشعار میں "آب سا"، "مہتاب سا"، "آگ سی" اور "تجھ سے" وغیرہ ادوات جنس و اعداد کے مطابق تبدیل ہوتے ہیں۔ پہلے شعر میں گل (مشبہ) اور آب (مشبہ بہ) دونوں واحد ہیں۔ اس لیے ادات تشبیہ "سا" کا استعمال ہوا ہے۔ چہرہ اور مہتاب اور تشبیہ کی مناسبت سے مصرع ثانی میں بھی "سا" لایا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں مشبہ (آگ) مونث ہونے کی وجہ سے "سی" ادات لایا گیا ہے اور تیسرے شعر میں مشبہ (خود نما) کو اتنے "صفت" کو جمع میں بدل دیا گیا ہے۔ اس ترکیب سے مشبہ بہ (تجھ) کے ساتھ "سے" ادات تشبیہ استعمال ہوا ہے۔

عنوان چشتی نے جس شعر سے

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

سے استدلال کیا ہے اس میں مشبہ (داغ) اور مشبہ بہ (آنکھ) دونوں جمع کے صیغے ہیں اس لیے یہاں ادات تشبیہ "سے" کا استعمال ہے۔ زیر بحث شعر میں جام ہر ذرہ ہے کی نحوی ترکیب "جام" کے واحد ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا "مجھ" "میں" کی مفعولی شکل ہے اور یہ واحد ہے۔ اس لیے یہاں نحوی اعتبار سے "سے" کی جگہ "سا" ہونا تھا۔ اگر اس مصرع کی نثر "سے" بمعنی مانند کے مطابق کی جائے تو ہوگی۔ "ہر ذرے کے جام میری مانند (مجھ سے / مجھ جیسے) سرشار

گیا ہے۔ لیکن یہی کی جگہ "ہے" کا استعمال صاف بتا رہا ہے کہ یہاں "جام ہر ذرہ" واحد ہے۔ اگر "جام" بطور جمع کے استعمال ہوتا تو "ہے" کی جگہ "ہیں" لایا جاتا جو از روئے قواعد ضروری تھا۔ اس طرح "مجھ سے" کی ترکیب بھی درست قرار پاتی۔ یعنی مصرع یوں ہوتا ؎

جام ہر ذرہ ہیں سرشار تمنا مجھ سے

اور اگر جام واحد ہے تو مصرع یوں ہونا چاہیے تھا ؎

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے

لیکن میں نہیں سمجھتا ہوں کہ غالب جیسا زبان داں، ماہر فن کہنہ مشق شاعر ایسی فاش غلطی کر بیٹھے اور پھر یہ شعر، معتی کتبہ انوار الحق (مرتب نسخۂ حمیدیہ) مولانا عبدالباری آسی، مولانا امتیاز علی عرشی جیسے غالب شناس اور پروفیسر محمد مجیب اور گیان چند جیسے قدر داں غالب کی نظروں سے گذرا ہے۔ کیا انھوں نے بھی ایسی "فاش غلطی" کو نظر انداز کر دیا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ دراصل غالب کے اس شعر میں نحوی ترکیب کی غلطی ہے ہی نہیں۔ یہ "غلطی" تو اس وقت عود کر آتی ہے جب ہم "مجھ سے" کو "میری مانند" یا "میرے جیسے" کے معنی میں لیں۔ اگر "مجھ سے" بمعنی "میری بدولت" مراد لیے جائیں (یہی درست ہے اور غالب کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے) تو پھر شعر میں کوئی نحوی غلطی نہیں رہے گی۔ ان حضرات نے "مجھ سے" کو "میری بدولت" کے معنی ہی میں سمجھا ہے اس لیے انھیں زیر بحث شعر میں کوئی غلطی دکھائی نہیں دی۔

## پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال۔

تازہ شمارہ شاعر کا ملا، ہر ذوق کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سامان یکجا کر دیا گیا ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے اور بہت نئے لکھنے والے جمع ہو گئے ہیں، شاعر کی یہی خوبی اس کی پہچان بن گئی ہے۔

ہمیشہ سے شاعر کا نصب العین یہی رہا ہے کہ نئے لکھنے والوں کو بھی آگے بڑھائے اور اس مقصد میں وہ ہمیشہ سے کامیاب رہا ہے۔ ہندوستان پاکستان میں ایسے بے شمار فن کار ہوں گے جو شاعر کے سہارے سامنے آئے، پسند کیے گئے اور آگے بڑھے اور بہت آگے بڑھے یہاں تک کہ نامور دوں کی صف میں کھڑے ہو گئے ان میں شعراء بھی ہیں افسانہ نگار بھی، محقق بھی، ناقد بھی اور طنز و مزاح کے دھنی بھی۔

لیکن شاعر کی خوبی ایک اور رہی ہے اس نے ہمیشہ سے اردو زبان و ادب کے لیے فضا ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں اور اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی ہے یہ اس کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس نے ہمیشہ اردو کے لیے نور اٹھائی ہے، نا انصافیوں کے خلاف اہل انصاف کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے، ہم لوگوں کے دلوں میں اردو کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے جس کے لیے سیماب سے لے کر اعجاز (؟) تک سب قابل مبارکباد ہیں لیکن سچ پوچھیے تو اعجاز صدیقی کی شخصیت اردو کی اس طرح صحت کے لیے سب سے زیادہ قابل احترام ہے۔ شاعر کے مدیروں کے درمیان ہی نہیں اردو مدیروں کی فہرست میں بھی تنہا اعجاز صدیقی ہی جو اردو کے، ایک خاص مزاج کے عاشق، اردو کے جاں نثار، اردو کے شیدائی، اردو کے فدائی، اردو کے مشفق، اردو کے خادم، اردو میں خلوص، اردو کی آواز اور اردو کی پکار بنے نظر آتے ہیں، کون نقد ہے جو ان سے آنکھ ملا سکے؟۔

آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے اب تک ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس بار "یاد اعجاز صدیقی" پر سطر پڑھی تو خوشی ہوئی، خواجہ احمد فاروقی صاحب کا مضمون پڑھا تو تسکین نہیں ہوئی بہت مختصر اور سرسری۔ تشنگی رہ گئی۔ خواجہ صاحب نے حق ادا نہیں کیا۔ فرض پورا کرنے کی ضرور کوشش کی۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے، اور ایک نمبر نکالنے کا بھی ارادہ کیجیے۔ اچھا، مفید اور معیاری نمبر۔

## ڈاکٹر تارا چرن رستوگی۔ پروماڈی، گوہاٹی (آسام) ۱۶ ۸۱ ۷

حسب معمول شاعر شمارہ ۲۔۳/ ۸۵ سے متعلق اپنے تاثرات کو قلم بند کرنے بیٹھا ہی تھا کہ شمارہ ۴/ ۸۵ موصول ہوا جس کا مشمولہ اداریہ "احتجاج ہی احتجاج" پڑھ کر شاعر کی ہوشمندانہ غیر ملک و قوم پرستانہ ادارت کو تہہ دل سے داد دینے کو جی کرنے لگا۔ کچھ لوگ قوم پرستانہ ہی سے مدکتے ہیں اس لیے یہاں یہ بتانا برمحل معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں تعبیر "پرستی" وغیرہ مستعمل ہیں جن میں پرستی، معنی انتہائی ذوق و شوق ہوتا ہے۔ مگر یہ جملہ معترضہ ہے شاعر کی ادارت بیدار بھی ہے اور رموز شناس بھی ہے۔

شمارہ ۲۔۳/ ۸۵ بالخصوص توجہ کا مرکز ہو گیا کیونکہ اس میں برادرم اعجاز صدیقی مرحوم کی تین غزلیں، ایک اداریہ بعنوان "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" اور مرحوم پر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا تاثراتی مضمون وغیرہ پیش کیے گئے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اعجاز مرحوم کی شاعری، تحریروں، مضامین و مباحث، سفرناموں، شخصیت خاکوں، تحقیقی و تنقیدی مضمونوں وغیرہ کے اقتباسات پر مشتمل شاعر کا ایک خصوصی نمبر شائع ہونا چاہیے جو آسانی شائع کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کا مضمون دوبارہ اسی شمارے میں شائع کیا جائے مگر اس کی تحریر سے یہ جملہ "واضح رہے کہ ٹیگور (۱۸۶۱۔۱۹۴۱) سے پہلے بنگالی اتنی وسیع نہیں تھی" حذف کر دیا جائے۔ کاش خواجہ صاحب کو مائیکل مدھوسدن کی تخلیقات "میگھ ناتھ کاوینہ"، "تلوتمہ کاویہ" وغیرہ ہی کا علم ہوتا۔ ٹیگور سے بہت پہلے بنگلہ ساہتیہ وسیع مقام و مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔

مزید برآں سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیگور کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیوں کر پیش آئی؟

شمارہ ہذا میں غالب پر تین مضامین شامل ہیں — کالی داس گپتا رضا کا مضمون "بیدل اور غالب" مختصر۔ تو ہے مگر افادیاتی لحاظ سے تو حرف ملت نہیں معلوم ہوتا کیونکہ رضا صاحب نے طرز بیدل کی وضاحت نہیں کی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ غالب اپنے اردو کلام ہی کیا فارسی کلام میں بھی طرز بیدل سے بے گانہ رہے ایک سار گذاری ملاحظہ ہو!

لوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا (غالب)

جو بیدل سے مار لیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بیدل کا شعر ہے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل

ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

شرح غالب کا ایک پہلو اور مالک رام "دانشوری" کم معلوم ہوتی۔ اردو اور فارسی شاعری میں استاد کے اصل معنی یہی ہوتے ہیں کہ اس شخص سے کلام پر اصلاح لی جائے غالب نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ انہوں نے صمد سے شعر پر اصلاح لی تھی لہٰذا صمد کا وجود ہو یا عدم تنقیدی اعتبار لاحاصل ہی نظر آتا ہے۔ غالبیات میں مالک رام صاحب کی بے کم نور تخلیق "تلامذۂ غالب" ہے اور موصوف کی شہرت اور عزت "ایسی تصنیف ہی سے زیادہ عبارت ہے۔ صمد متعلقات پر مالک رام صاحب کی تحریر اور اس کے انداز سے کی نفاست، انگیں وکالت دونوں اہمیت سے عاری ہیں۔

غالب اور مسائل تصوف ایک شعر کے حوالے سے تر زیر مضمون ہے "مسائل تصوف"، کو صرف ایک پیراگراف مقید کر دیا گیا ہے اور کھینچ تان کے ابن عربی کے فلسفے (؟) تان صری ہے۔ غالب نے ابن عربی کی تصنیفات کا کیا تھا مشکوک بات معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی رسائی بیدل کے نظم کردہ تصوف ہی تک تھی مگر بایں ہمہ وہ کو نہیں سمجھ سکے۔ ملاحظہ ہوں، بیدل کے یہ اشعار ؎

حجاب و جلوہ ہر دو بتو برنگ بود است این جا

زلیخا پرس حال لیلیٰ از محمل چہ می پرسی

ہر کجا رفتیم سیر جلوت دل داشتیم

بیدل آغوش ملک ہر دو جہاں این جا بود

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درد

نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے نی خواہد

دل گم گشتہ سراغیست ز کیفیت شوق

فتنہ بالا اگر از دست رود دستینہ ما

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش

من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

الغرض بے شمار اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ عنوان مضمون سے اپنے پورے مضمون میں نقطۂ ایک شعر کے معنی بتانے کی کوشش کی ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے ماسی وقیع ہو۔ بھی گنجلک ہو کر رہ گئی ہے۔ اس غزل کو بیکار گھسیٹا گیا ہے، شعر کی تقطیع بھی کی گئی ہے جو بیکار محض ہے۔ ریسرچ ایسی بے محل باتیں معیاری نہیں سمجھی جاتیں۔ انہوں نے تقطیع کی ہے مگر جو مسود الخواص نہیں ہے وہ ما علاقن ... معلوم ہی کرے گا۔ عروض سے کشتی لڑا کر۔ جانے کتنے داؤں دکھائے جا سکتے ہیں۔ مضمون میں پنگل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اگر معاف ہو اردو کے ادیبوں میں مشہور کوئی ایسا عروض داں جو دائرہ بانے عروضیات سنسکرت کو کہہ سکے "پی جھنگ" ہی کم تیں سواتام ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے علم موسیقی سے بہرہ کی ضرورت ہے ہند و پاک کا کوئی ادیب مجیب کا تعلم:

[باقی صفحہ ۴۹ پر دیکھیے]

# نقد و نظر

## دیوانِ غالب عکسی
چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء

### کالی داس گپتا رضا

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مالک رام کے بعد کی نسل میں کالی داس گپتا رضا صاحب غالب کے سب سے معتبر محقق ہیں۔ غالب کی تنقید میں آج کل جو لکھے چھپا کیے جا رہے ہیں کہ غالب زندہ ہوتے تو ان تشریحات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ غالب کی تحقیق میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ اور کہنے کو باقی نہیں رہا، لیکن ایک صاحبِ نظر محقق کو بہت کچھ خلا نظر آتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے اسے پُر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کا شاہکار "دیوانِ غالب کامل" ابھی سامنے نہیں آیا۔ اس میں غالب کے جملہ اردو کلام کو پہلی بار باوثوق تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں محترم رضا صاحب نے محسوس کیا کہ دیوانِ غالب کے دو اہم ترین ایڈیشن، طبع اول و طبع چہارم کبریتِ احمر کی طرح کمیاب ہیں، کیوں نہ اس دفینے کو منظرِ عام پر لے آیا جائے۔

ان ایڈیشنوں میں بھی طبع اول نایاب تر تھی۔ صرف چار پانچ جلدوں کا پتا چلتا تھا جن میں سے دو خود رضا صاحب کی ملک ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۶ء میں اس کا عکسی ایڈیشن اپنے مقدمے کے ساتھ چھاپا۔ ایک سال سے کم کے عرصے میں حیاتِ غالب کا سب سے اہم ایڈیشن یعنی مطبع نظامی کانپور والا، اسی طرح عکسی طریقے سے شائع کر دیا۔ اس کی ابتدا میں انہوں نے ۱۹ صفحوں کے تحقیقی مقدمے میں غالب کی زندگی کے پانچوں ایڈیشنوں نیز نگارستانِ سخن میں شمولِ کلامِ غالب کا جائزہ لیا ہے۔ یہ رضا صاحب کی انکساری ہے کہ دونوں ایڈیشنوں کے سرورق پر انہوں نے خود کو مرتب نہیں لکھا بلکہ خاکساری کے ساتھ

"پیش لفظ۔ کالی داس گپتا رضا"

لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اگر وہ خود کو مرتب لکھ دیتے تو بھی کوئی معترض نہ ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے وسیع ظرفی کا ثبوت دیا۔

مقدمے کے پہلے جملے ہی کے فٹ نوٹ میں نگارستانِ سخن کا تعارف دیتے ہیں اور اس تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ص ۱۴۳ پر تمام شد لکھ کر ترقیمہ دیا ہے، اس کے بعد مزید ۱۱ صفحات کا متن دے کر دوسرا اور آخری خاتمہ ہے۔ رضا صاحب نے اس کی مناسب تاویل کی ہے۔

مقدمے میں دیوانِ غالب کے پانچوں حیاتی ایڈیشنوں کی مستند تفصیلات دی ہیں۔ چونکہ رضا صاحب نے کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کی ہے اس لیے وہ ایک ایک شعر کی تاریخِ ولادت سے واقف ہیں۔ غالب نے کس زمانے میں کتنے شعر کہے اور وہ کون کون سے شعر تھے، یہ ان کی نوکِ زبان پر ہیں۔ ان کا مطلب کتاب ایسا کھرا ہے کہ اس میں کوئی اڈیٹر ایک عدد کی غلطی نہیں نکال سکتا۔ غالب نے اپنے دیوان کا مشہور فارسی مقدمہ کب لکھا، اس وقت تک کل کتنے اشعار کہے تھے، اُن میں سے کتنے منتخب ہوئے، بعد میں اشاعتِ دیوان تک ان اشعار میں کیا کمی بیشی ہوئی، دیوان کی تقریظ کی کیا کیفیت ہے، یہ سب امور رضا صاحب نے اسناد کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ پھر وہ انکشاف کرتے ہیں کہ پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۳ شعروں میں سے دو شعر دوسرے ایڈیشن میں نہیں لیے گئے اور وہ ان دونوں اشعار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ تیسرے ایڈیشن میں دوسرے ایڈیشن پر ۳۰۶ شعروں کا اضافہ ہے لیکن یہ کہنا چاہیے کہ اس دوران میں غالب نے اتنے ہی اشعار کہے۔ دراصل یہ ۳۰۶ شعر اس دور کی پوری کشت کا انتخاب ہیں۔ چوتھے نظامی ایڈیشن میں تیسرے ایڈیشن پر صرف ۲ شعروں کا اضافہ ہوا۔ پانچویں ایڈیشن میں تیسرے ایڈیشن سے ایک شعر کم ہے۔ اس طرح سب سے زیادہ اشعار چوتھے ایڈیشن میں ہیں۔ اس کے بعد غالب نے مزید ۴۰۳ شعر کہے لیکن ان کے اضافے سے کوئی چھٹا ایڈیشن تیار نہیں کیا کیونکہ آخری دور میں انھوں نے اپنے فارسی مجموعے شائع کرنے پر توجہ دی۔

خلاصہ یہ ہے کہ رضا صاحب کا مختلف ایڈیشنوں کے اشعار کا حساب اتنا چوکھا ہے کہ اسے دیکھ کر ہوش اڑ جاتے ہیں اور تحقیق میں کھوئے بغیر اسے مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ حساب کتاب کی اتنی قطعی درستی ایک گپتا جیسی ذہنیت ہی سے ممکن تھی۔

اس مقدمے سے کم از کم تین نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ پہلے ایڈیشن کے دو شعر منسوخ ہو گئے اور بعد کے ایڈیشنوں میں نہیں لیے گئے۔ دوسرے یہ کہ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بھی جملہ نئی تخلیقات کو متداول ایڈیشنوں میں نہیں دیا گیا بلکہ انتخاب کا عمل ہمیشہ جاری رہا۔ تیسرے یہ کہ یہ تو پہلے معلوم تھا کہ دیوان کے آخری ایڈیشن کے بعد بھی غالب نے کچھ شعر کہے جو غیر متداول ہو کر رہ گئے لیکن یہ عدد دور تک گمان رہتا کہ ان اشعار کی تعداد اتنی زیادہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ غدر کے بعد غالب نے دو تین غزلیں مثلاً پاؤں یا تکیہ کی ردیف والی ہی کہیں۔ رضا صاحب نے بتایا کہ غالب نے ۴۰۳ (چار سو تین) اشعار کہے۔ یہ کون سے ہیں ان کی شناخت کے لیے ہمیں ان کے "دیوانِ غالب کامل" کا ابھی اور انتظار کرنا پڑے گا۔

سمجھا جاتا ہے کہ غالب کی زندگی کے ایڈیشنوں میں نظامی ایڈیشن ان کے کلام کا مستند ترین ایڈیشن ہے، لیکن اس میں بھی بعض اغلاطِ کتابت رہ گئی ہیں جو پروف کو توجہ سے نہ پڑھنے کا نتیجہ ہیں۔ ان میں چند کی مثال رضا صاحب نے ص ۱۵، ۱۶ پر دی ہے۔ ان میں وہ ذیل کی مثال بھی درج کرتے ہیں:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری خوشامد سے

"میری جو شامت آئے" کی جگہ (ص ۸۳) میری رائے میں یہ سہوِ طباعت نہیں، غالب کی شعوری ترمیم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ترمیم سے شعر میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

رضا صاحب نے زیرِ نظر ایڈیشن کی ہر کاپی قدیم ایڈیشن سے مرزا فرقانی زیراکس کر کے تیار کی ہے، اس سے لاگت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس ایڈیشن کی قیمت ۱۴۰ روپے ہے، لیکن اگر وہ نہ چھاپتے تو قدیم ایڈیشن کی کوئی کاپی ہاتھ آنے سے رہی۔ عکس چھاپ کر انھوں نے گویا محققوں کو گھر بیٹھے اصل ماخذ فراہم کر دیا۔

کتاب کا انتساب جین صاحب کے نام ہے۔ مجھے ان کے انتخاب سے اتفاق نہیں۔

○ صفحات ۱۱۶ صفحات ○ سنہ اشاعت عکسی ایڈیشن ۱۹۸۸ء

○ قیمت: ۱۴۰ روپے ○ پتہ: دہلی پبلی کیشنز، ۱۰۷، جلی کھوں نمبر ۱، یونیورسٹی لانتر ... ۲۔

[ ڈاکٹر گیان چند ]

## افکارِ گریزاں

### حقیر آستانی

ڈاکٹر حقیر آستانی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شعر کہتے ہیں۔ شاعری ان کے لیے نہ ذریعۂ عزت ہے، نہ وسیلۂ شہرت۔ معاشی بینکنگ کے ساتھ ساتھ پروفیسر شپ اور ورلڈ بینک کی کنسلٹنسی آرام سے زندگی گزارنے کے لیے بہت کافی تھے۔ پھر وہ شعر گوئی کی کلفت میں کیوں پڑے؟

اس کا جواب ایک ہی ہے کہ حساس اور زندگی میں رچا بسا انسان مادی آسائشوں اور زندگی کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کی تکمیل اور اپنا اظہار بھی چاہتا ہے۔

حقیر آستانی کی شاعری اسی ضرورت کی تکمیل ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مدرسۂ فکر سے وابستہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ویسے طرزِ اظہار کے معاملے میں وہ کلاسیکی رچاؤ اور ادبیات کی شفافیت کے قائل ہیں۔

انہوں نے زندگی کے ہر رنگ کو دیکھا اور ان تمام رنگوں کی قوسِ قزح کو اپنے فن میں جذب کر لینا چاہتے ہیں چنانچہ مجموعے کی پہلی ہی نظم ان کے ذہنی و فنی رویے کی نشاندہی کرتی ہے:

کبھی بے چارگی آہوں میں تیری
کبھی گردش مری راہوں میں تیری
کبھی تیرا مقدر ایک ٹھوکر
کبھی دونوں جہاں بانہوں میں تیری
کہ تو سازندہ ہے تو سازگی ہے
بدلتے وقت کی آوارگی ہے

ان نظموں پر کہیں کہیں جوش و اقبال کی پرچھائیاں پڑتی نظر آتی ہیں جیسے "تخلیق بے تماشہ"، "زاویۂ نگاہ" لیکن بنیادی طور پر وہ ...

مزاج ار کھتے ہیں (ترا ضنا ، فرار ، سوگند ، آتش) کچھ نظموں میں آج کے انسان کی بے چینی ، نارسائی اور کشمکش ذہنی کی کیفیات ملتی ہیں ۔ ان تمام کیفیتوں کو اپنے فن میں سمیٹ لینے کی ہی کوشش یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ شاعری کو محض لفظی بازی گری یا شوقیہ مشغلہ نہیں بلکہ اپنے اظہار کا ایک قابل قدر ذریعہ سمجھتے ہیں ۔

غزلیں ابھی سیدھی سادی ہیں لیکن سچے جذبہ و احساس کی آئینہ داری کرتی ہیں ۔

جو دے تو کرنہ پائے مروت بہت ان پہ لوگ
ہر کشمکش حیات کی دنیا میں کھو گئے
ان جوابوں کی بھیڑ میں ملتا ہی
اک بھٹکتا سوال رہتا ہے
خرید کر انھیں لایا گیا تھا کن دلوں
جو طاق طاق یہاں آفتاب نکلے ہیں
لوگ مظلوم بھی ہیں ظالم بھی
تحفے سب یہ رفاقتوں کے ہیں

خبیر آشتاق نے یہ صاف ستھری ، خوبصورت و دیدہ زیب کتاب بغیر کسی دعوے اور بغیر کسی رسم باطل کے پیش کی ہے شاید انہیں یہ یقین ہے اور سچا یقین ہے کہ صاحب نظر حلقوں میں یہ کتاب ضرور پسند کی جائے گی ۔

○ ضخامت ، ۱۱۶ صفحات ○ قیمت ، ۵۰ روپے ۔
○ پتہ ، ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ ، انصاری مارکیٹ دریا گنج ، نئی دہلی ۲ ۔ ○ سن اشاعت ، ۱۹۸۶ء ۔

[بشر نواز]

## کتب و رسائل

○ **پشکن کے دیس میں** ۔ مشہور شاعر و ادیب پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۸۰ء میں روس کا دورہ کیا تھا اور صرف ۲۱ دن (۳ ستمبر تا ۲۴ ستمبر) وہاں رہے تھے ۔ یہ سفرنامہ جو چھوٹے چھوٹے ۳۳ ۔ ابواب کو محیط ہے ، نہایت ہی دلچسپ اور معلومات افزا ہے جس میں روس کے شعر و ادب فنون لطیفہ اور وہاں کی تعلیمی درس گاہوں کا احوال دیا گیا ہے ۔ معیاری سفرناموں میں ایک اور اضافہ ۔ صفحات ۲۰۰ ۔ قیمت ۲۵ روپے ۔ پتہ ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵ ۔

○ **نظیر اکبر آبادی** ۔ اہم نقاد اور ڈرامہ نگار ڈاکٹر محمد حسن نے نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور فن پر انگریزی میں ایک گراں قدر مقالہ لکھا تھا اسی کا ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی نے ہندوستانی ادب کے معمار کے تحت شائع کیا ہے ۔ مترجم یامین پردیسی ہیں ۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ کتاب نظیر اکبر آبادی کی سوانح ، سماجی حالات اور کتب نظموں کے اقتباسات کے ذریعہ شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ صفحات ۸۴ ۔ قیمت ، پانچ روپے ۔ پتہ ، ساہتیہ اکاڈمی رویندر بھون ۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

○ **کرشن چندر** ۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر پر مشہور افسانہ نگار خاتون جیلانی بانو نے ایک اہم کتاب لکھی ہے جسے ہندوستانی ادب کے معمار کے تحت ساہتیہ اکاڈمی نے شائع کیا ہے ۔

اس کتاب میں حالات زندگی ، کرشن چندر کا نظریہ ادب ، کرشن کا فن ، کرشن چندر کے ناول ، کرشن چندر کی دوسری تحریریں ، ایک افسانہ "کچرے سے چاند کی بات" کو شامل کیا گیا ہے ۔ آخر میں کرشن چندر کی تصانیف کی تفصیل دی گئی ہے ۔ صفحات ۸۰ ، پانچ روپے ۔ پتہ ، ساہتیہ اکاڈمی رویندر بھون ۳۵ فیروز شاہ روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

○ **قطبین** ۔ شمالی مغربی یورپ سے شائع ہونے اردو نظموں کا ادبی مجموعہ جس میں حساس شاعر نصر ملک ۔ اور آفاقی پہلوؤں کے بیشتر بیمار حصوں کی نشاندہی اور تشنہ تخلیقی سطح پر کی ہے ۔ دھرتی کے باسیوں کے دکھ درد کے مداوا دردھری خواہش نصر ملک کی نظموں کا منشور و منتہا ہے ۔ ۱۰۸ صفحات ۔ قیمت ، درج نہیں ہے ۔ پتہ ،

بقیہ **مکتوبات** ۶۲

غالبیات پر تیگانہ چنگیزی کا سایہ کیوں نہیں پڑنے دیتا ؟ ماضی سے روگردانی کیوں روا رکھی گئی ہے ۔

افسانے غزلیں اور رباعیات وغیرہ معیاری بھی ہیں سماجیاتی و نفسیاتی کیفیات کی آئینہ دار بھی ہیں ۔ مگر ظہرا کے ہائیکو اور عتیق حنفی صاحب کی نثری نظمیں میری سمجھ بالاتر ہیں ۔ سرورق المجموع ستارہ بہت اچھا ہے ۔ یہ سطر لکھتے وقت ذہن و دل پر مرادم انداز کا جاندار شعر ابھرا

دیکھنا ہے کون اب کس کا اڑاتا ہے مذاق
وقت سنجیدہ ہے لیکن لوگ سنجیدہ نہیں

---

# علمی ، ادبی اور تہذیبی خبریں

## گورنر کے خطبے میں اردو عوام خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں

کلکتہ ۔ آل انڈیا اردو کو آرڈی نیشن کمیٹی کی مجلس عاملہ اور رشنا وتی لوڈل ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی جس میں ریاست مغربی بنگال میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ۔ میٹنگ کا اجلاس موصوف محترمی ملک کے کو ۔ رپورٹ میں سید ابو الحسن افتتاحی صدر تھا جو اصولوں نے اصول میں پیش کیا تھا ۔ گورنر موصوف کی تقریر میں اردو کا خاص طور پر ذکر آیا تھا اردو کے تعلق سے سرکاری اعلان شیا سرکاری تالاب میں تر زیادہ استعمال اور چار کے ساتھ تین مختلف حلقوں کا نام آسنسول سب ڈویژن (ضلع بردوان) ، اسلام پور سب ڈویژن (ضلع مغربی دیناجپور) اور کلکتہ کارپوریشن کے اسے جلچیا ، مختلف حلقوں کے نام سرکاری گزیٹ میں درج ہے ۔

ڈاکٹر ابو جاوید منظر نے کہا کہ اردو عوام کو گورنر موصوف کے خطبے میں اردو کے ذکر سے خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں اردو کے جائز حقوق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کو تیز کرنا چاہیے

## علامہ اقبال کے خطوط

ہندوستان کے اقبال شناسوں میں جناب سید مظفر حسین برنی ، گورنر ہریانہ کو ممتاز مقام حاصل ہے ۔ موصوف عرصہ دراز سے شعر اقبال کے بعض مباحث اور اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بابت میں مصروف ہیں اس ضمن میں ان کی تصنیف "محب وطن اقبال" قابل ذکر ہے جس کا ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اس تصنیف کو اقبالیات میں گرانقدر اضافہ قرار دیتے ہوئے کانپور یونیورسٹی نے اس سال مالی جناب برنی صاحب کو ڈاکٹر آف سائنس کے اعزاز سے نوازا ہے ۔ "ما برا قبالیات" برنی صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملنے کے باعث سے پرستاران اقبال میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے ۔ برنی صاحب کی مختلف مجموعوں کی صورت میں منتشر اس مکاتیب کو یکجا کرنے کی یہ کوشش لائق تحسین ہے ۔ ان کے مطالعے سے حضرت کی ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی یہ "کلیات مکاتیب اقبال" پانچ جلدوں میں ہے جن میں سے ایک جلد انگریزی خطوط پر مشتمل ہے ۔

## بسوں پر مقامات کے نام اردو میں بھی تحریر کرنے کی ہدایت

حیدر آباد ۔ ورکرز ڈیموکریٹ منسٹر ذ ۵ حتیٰ اے آر ٹی سی بسوں کی تختیوں پر مقامات کے نام اردو میں بھی تحریر کرنے کے متعلقہ عہدیداروں کو ہدایت دی ہے ۔ اسمبلی ایک ماہ ار ٹی سی بسوں پر اردو میں مقامات کے نام تحریر کر دیے جائیں گے ۔ انھوں نے یہ تیقن نظام آباد کے تلگو دیشم ناؤمین وودہ کرسی کے ایک وفد کو دیا جس نے جنہوں نے ضلع نظام آباد کو بسوں پر منشی احمد علی کی درخواست

## ازبکستان کی جامعات میں اردو ، ہندی اور بنگالی تدریس کا انتظام

حیدر آباد ۔ سوویت سوشلسٹ جمہوریہ ازبکستان نے تعلیمی میدان میں غیرمعمولی ترقی کی ہے ستر سال قبل اکتوبر انقلاب کے بعد جبکہ یہاں کی آبادی ۳ ہم فیصد علی اور جس کا صرف دو فیصد طبقہ تعلیم یافتہ تھا ۔ آج یہاں کی آبادی ایک کروڑ تو سے لاکھ سے زائد ہے اور صد فی صد خواندگی ہے اس کا انکشاف یہاں ازبکستان کے وزیر اعلیٰ تعلیم صلاح الدین نے کیا انھوں نے کہا کہ ازبکستان میں ناخواندگی نیلم و رکھی ہے وہاں پندرہ زبانیں بولنے والے بستے ہیں اور بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہے رابطہ کی زبان کے طور پر روسی زبان دوسری جماعت سے لازمی ہے جو طلبہ روسی زبان کو ذریعہ تعلیم جانتے ہیں انھیں دوسری زبان سے کوئی اور زبان لازمی ہوتی ہے

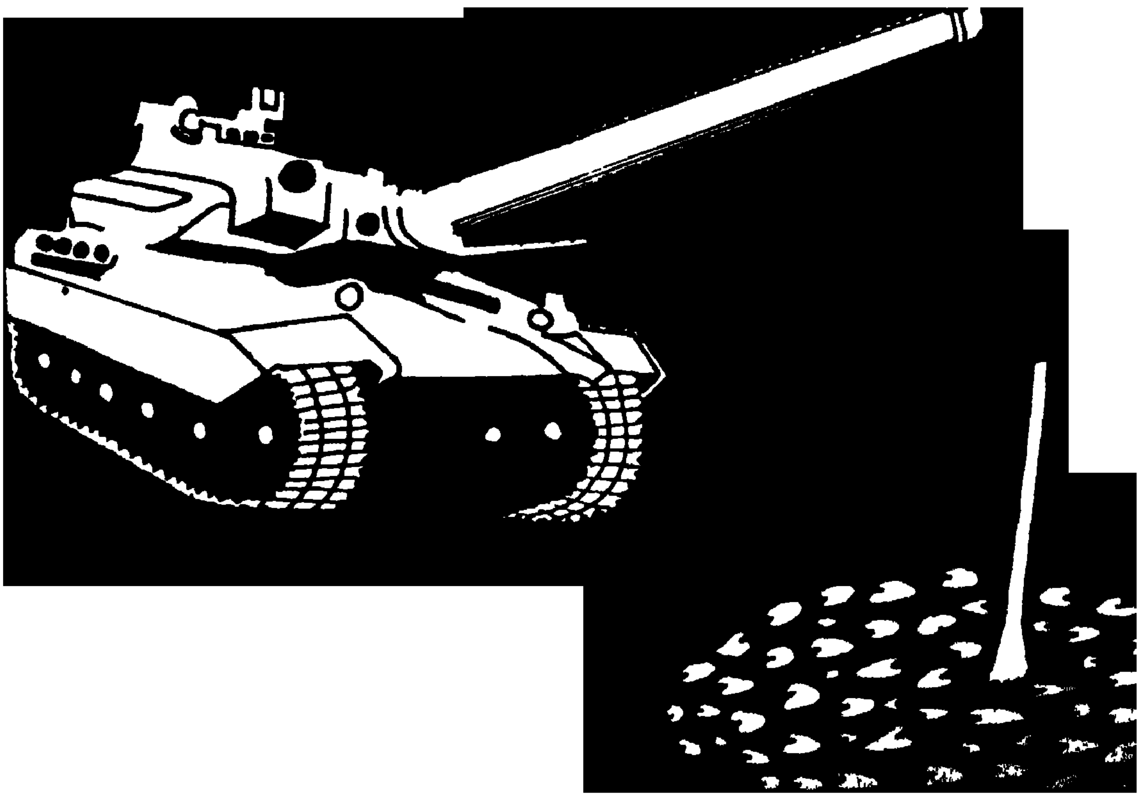
مسٹر صلاح الدین اور ساتھ ہی وزیر مسٹر ... ان سے ملاقات کی جن کمالوا نے بتایا کہ ازبکستان میں ۲۸ ، ہندوستانی طلبہ زیر تعلیم ہیں ۔ ہندوستانی زبانیں اردو ہندی اور تدریس کا بھی انتظام ہے ۔

## تلگو دیشم سے وابستہ ارکان سے مستعفی ہو جانے کی

حیدر آباد ۔ مسٹر ایم باغ ، چیرمین حیدر آباد اربن ڈیولپمنٹ ، تلگو دیشم پارٹی سے وابستہ تمام ارکان کے ساتھ خالص سے اپیل چیف منسٹر و صدر پارٹی این ٹی (را ؤ) اردو مخالف پالیسیوں کے خلاف و شم پارٹی سے فوری مستعفی

رف

Publication Issue No. 5 1987 Telephone No. 35 99 ...
(Publishing Date 27-28)
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57



# فکر امروز



اردو ادب میں صنفِ شعر بھی آج اپنے پست مرحلہ میں ہے لیکن وہ قلیل المعلومات اور کم سواد شعراء جو دورِ موجود میں بھی دورِ ماضی کی تقلید کے خوگر ہیں اور جن کی شاعری آج بھی گیارہویں صدی ہجری کی شاعری سے کسی طرح آگے نہیں بڑھی، صنفِ شعر کے اس عروج سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ جتنا علم کا مطلع صاف، اتنا غزل کا مطلع صاف۔ یہ میرا نظریہ ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ پہلے علومِ متداولہ میں درکِ تام اور استعدادِ تمام حاصل کریں۔ ترقی یافتہ اور کہنہ مشق شعرائے دورِ جدید کے کلام کا تادیر مطالعہ کریں اس کے بعد شعر کہنے کی جرأت فرمائیں۔ شاعری اتنی آسان اور سستی نہیں ہے جتنا اسے عوام نے سمجھ رکھا ہے۔ شعر و ادب کا عروج دیکھنا ہو تو وہ مشاعروں میں نہیں اساتذۂ فن کے مجموعوں میں نظر آئے گا۔ ہمارے مشاعرے تو ابھی بہت پست اور ذلیل ہیں جہاں اہل اور نااہل، شاعر و متشاعر سب کو دوش بدوش بیٹھنے اور رطب و یابس اشعار سننے اور سنانے کی اجازت ہے۔ مشاعروں میں بلند ادب کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے ادب کو ان مشاعروں سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ان شاء اللہ اگر مشاعروں کا معیار ادب سے متوازن ہو جائے تو البتہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ہم مشاعروں میں ادبِ اردو کی معراج دیکھ لیں، لیکن ایسے مشاعرے ابھی ذہنوں میں محفوظ ہیں اور ان کے رواج کو بھی ایک زمانہ چاہیے۔

[انجمن معراجِ ادب آگرہ کے سالانہ مشاعرے منعقدہ ۵ جولائی ۱۹۳۴ء کے خطبۂ صدارت سے ایک اقتباس مطبوعہ شاعر (آگرہ) ستمبر ۱۹۳۴ء]

سیماب اکبرآبادی


# شاعر

بانیٔ مجلّہ سیماب اکبرآبادی

ماہنامہ ادبیہ و تہذیب

اشاعت کے ۵۸ ویں سال

جلد ــــ ۵۸

شمارہ ــــ ۶

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## بساط سخن (جدید)



## جرعات



## آثار لفظ لفظ



## بازیافت



## چہرہ چہرہ یادیں





## رفتار



سرورق
جنگ کا منظر نامہ اور ردعمل

عکسی
سلطان سبحانی

*********

شمارہ نمبر ۶ ● ۱۹۸۷ء

# اُردو ادب کی تاریخ (۱)

کیا ہمارے پاس اردو ادب کی کوئی مکمل اور مستند تاریخ موجود ہے ؟ جواب نفی ہی میں ہوگا، اس لیے کہ کوئی ایسی مکمل تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکی ہے۔ انفرادی سطح پر یہ کام تذکروں سے تاحال کسی نہ کسی عنوان ہوتا رہا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے حامد حسن قادری، جمیل جالبی، سلیم اختر، انصار اللہ اور علی جواد زیدی تک ایک طویل سلسلہ ہے اور بھی بہت سے نام ہیں جن کی انفرادی کاوشیں مستحسن قرار دی جاسکتی ہیں لیکن یہ سارے انفرادی تحقیقی کام جو کئی صدیوں سے چلے آرہے ہیں ان کی یک جائی کا کام پھر بھی نہ ہو سکا ہے۔ سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا یہ کسی ایک فرد کا کام ہے ؟ اگر ایسا ہوتا تو اردو ادب کی کوئی انسائیکلوپیڈیا ہی مرتب ہو گئی ہوتی۔ بے شمار تذکرے، مخطوطات، کمیاب اور نایاب کتابیں بڑی بڑی لائبریریوں میں محفوظ ایسے ہی کسی بڑے کارنامے کی منتظر ہیں۔

تحقیق ایک صبر آزما، صحرا صفت اور پتہ پانی کر دینے والا کام ہے، کسی بھی اہم تحقیقی کام کے لیے تحقیقی مزاج، علم، شعور، بے پناہ تجسس اور ذہنی تربیت بہت ضروری ہے۔ کیا نئی نسل ان خصوصیات سے آراستہ کی جارہی ہے ؟ آج تحصیل علم کا دار شوق نہیں ضرورت ہے۔ آج وہ اساتذہ نہیں رہے جو اپنے آپ میں علوم و فنون کا سمندر ہوا کرتے تھے، وہ طالب علم نہیں رہے جو حصول علم کے لیے سخت سے سخت ریاضت کیا کرتے تھے۔ آج یہ سلسلے ٹوٹ گئے ہیں۔ ہم ماضی کو کیوں یاد کرتے ہیں ؟ ماضی کا علمی و ادبی اور تحقیقی ورثہ آج سے زیادہ کیوں وقیع، بے پناہ اور بھرپور ہے ؟ اس معاملے میں تو ہمیں اپنے ماضی سے بہت آگے ہونا چاہیئے تھا ؟ ارتقاء پذیری کا دستور تو یہی ہے لیکن اپنے اسلاف کے گراں قدر کارناموں اور تجربوں میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔ بہ ظاہر تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کل کی بہ نسبت آج زیادہ اہم علمی و ادبی اور تحقیقی کام ہو رہے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

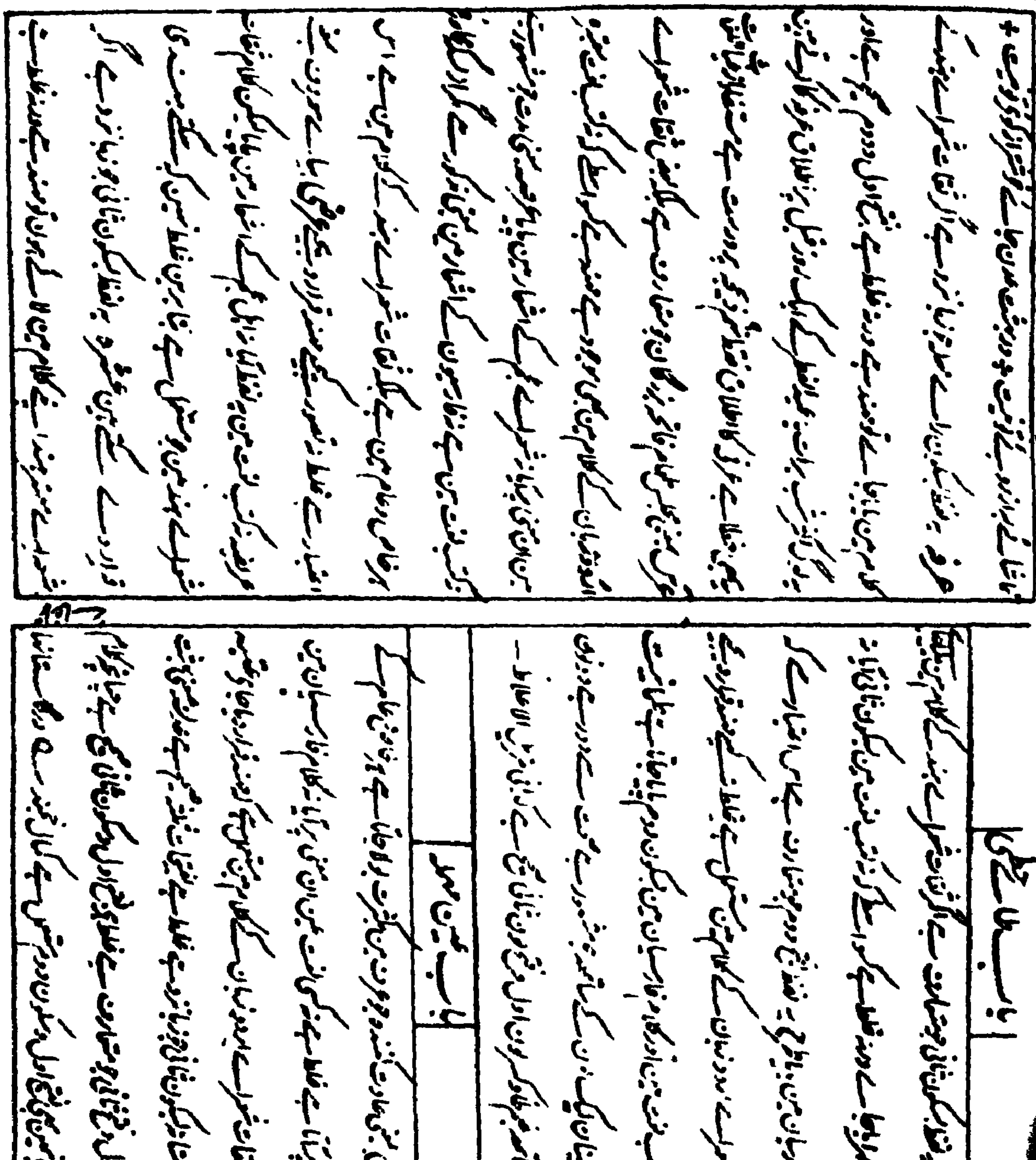
نگاہ دوڑائیے تو بس کچھ ہی لوگوں کا دم غنیمت ہے مگر ان کے بعد ------- ؟

صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہندستان ایک ترقی پذیر ملک مگر زیادہ پس ماندہ اور اردو زبان کے مسائل بے چیدہ کہ کروڑوں روپے سالانہ کی قوت و طاقت بھی نہ تو اس زبان کو اس کے حقوق کی بازیافت میں مدد دے رہی ہے اور نہ ہی علم کے غیر معمولی کام انجام پا رہے ہیں۔

ہندستان اپنے بدترین سیاسی بحران کی زد پر ہے، قدرتی آفات مستزاد، پھر ہندستان ہی کیوں، اس وقت تو پوری دنیا آتش فشاں کے دہانے پر ہے۔ بیسویں صدی اپنی پوری ہولناکیوں اور سفاکیوں کے ساتھ سمٹ رہی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے حیرت انگیز تجربے اور کارنامے آدمی کے لیے لمحۂ فکریہ بنے ہوئے ہیں کیوں کہ آدمی اپنے ہی کارناموں میں گم ہوتا جا رہا ہے، اس کے جذبات دن بہ دن کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب بچوں کی پیدائش آنے والے کل میں کیا شکل اختیار کرے گی یہ بعید از قیاس نہیں۔ اکیسویں صدی کے اختتام تک آدمی کیا ہو جائے گا ؟

تجربوں کی ہوائیں مشرق سے مغرب کی طرف بہتی ہیں۔ مغرب سے مشرق کی طرف آنے والی ہواؤں کو ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔ آدمی کا مقدر کیا ہے یہ اسے معلوم ہے لیکن وہ مجبور ہے۔ بہت سی مسموم ہوائیں ابھی باقی ہیں ہمیں ان سے استفادہ کرانا چاہیئے۔ وقت کی فیصلہ ہو چکا ہے، ہمیں بدلنا چاہیئے ؟ علم لا پتہ، ختم ہوتا جا رہا ہے، ذہنی ساخت و پرداخت کا وہ ماحول نہیں رہا ہے۔ ہماری زبان کو خول ہمیشہ کی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ آنے والے کل کا انتظار کیے بغیر کہ وہ کل آئے ہمیں اپنی زبان و ادب کو جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ محفوظ کر لینا چاہیئے۔ کمپیوٹر ہماری آج کی ضرورت ہے۔ کمپیوٹر ہر شعبہ زندگی میں داخل ہے، جدید تین پرنٹنگ اکیسویں صدی کے مستقبل میں کمپیوٹر چھپے ہوئے لفظوں کو بھاری ہو جائے گا، دیکھتے ہی دیکھتے حروف مٹ رہے ہیں، لفظ بیمار پڑ رہے ہیں۔ آنے والی نسلوں کو ہمیں کچھ تو دینا ہی ہے۔

ڈوب جائے گی شور میں دنیا



"تنقیح اللغات" از جلال لکھنوی [پ: ۱۸۳۴ء - م: ۱۹۰۹ء] کے دو صفحات کا عکس۔
مطبوعہ: ۱۔ اگست ۱۸۷۵ء [طبع دوم] مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ ضخامت: ... صفحات
سائز: ۹½×۶ انچ۔ کتب خانہ کالی داس گپتا رضا میں۔ اس کے علاوہ طبع اول ۱۸۷۳ء اور
ایک مخطوطہ موجود ہے۔



برہانی کالج بمبئی میں منعقدہ ایک یادگار ادبی نشست [ ۱۹۶۸ء ] کی تاریخی تصویر میں بائیں سے دائیں فراق گورکھپوری [پ: ۱۸۹۶ء – م: ۱۹۸۲ء] اعجاز صدیقی [مائک پر کلام سناتے ہوئے۔ پ: ۱۹۱۲ء م: ۱۹۷۸ء] سید شہاب الدین دسنوی اور پروفیسر عشرت حسین فاروقی [سابق پرنسپل برہانی کالج]

اللہ

۱۵ ۔ جون ۱۹۴۹ء
مولوی گنج ۔ لکھنؤ

عزیزِ گرامی منزلت زاد اللہ شرفکم

سلام مسنون و دعا ۔ خط مورخہ ۱۲ ۔ جون موصول ہوا ۔ متعلق تبصرۂ ذوقیات آپنے مکرر جو تحریر کیا ہے اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں ہرگز دریغ نہ کرتا ۔ میرے مشاغل روزمرہ کیلئے خود وقت کافی نہیں ہے ایسی صورت میں مزید ذمہ داری کا بار کیونکر اٹھا سکتا ہوں ۔ اس خدمت کیلئے آپ کسی اور صاحب کو منتخب فرمائیں ۔ مجھے معذور سمجھ کر معاف فرمائیں ۔ آپنے چند استفسارات (ا ۔ ب ۔ ج) درج کئے ہیں چنانچہ استفسار (ا) کلام حضرت عبید رحمانی کے متعلق ہے جنکی غزل کے چند اشعار سے آپکو اختلاف ہے ۔ اور انہیں چند ترمیمیں آپنے پیش کی ہیں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایرادات جذبۂ انتقام کے تحت میں کئے گئے ہیں لہذا میں اسکی نسبت رائے زنی خلاف مصلحت سمجھتا ہوں اور آپکو بھی یہی مشورہ دونگا کہ ان باتوں میں اپنا وقت کیوں ضائع کیجئے ۔ باقی دو استفسارات (ب ۔ ج) کے جواب درج ذیل ہیں

ب = لفظ متاع ہمارے روزمرہ میں مونث ہے ۔ چنانچہ اسکے فارسی گردانتے ہیں مصرعہ ہے ۔ عشق کے مول میں نہیں بکتی متاعِ دل ۔ میرا ایک شعر ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے ۔ سبھی ہیں حضرت واعظ نہ کیں تکلف سے × متاعِ زہد و ورع میرے میکدہ میں بکی

ج = تبدیل خود عربی مصدر ہے ۔ مگر اعاجم ایسے مصادر کے آخر میں یائے زائد استعمال کرتے ہیں جیسے استفسار کو استفساری ۔ خدمت کو خدمتی ۔ تبدیل کو تبدیلی ۔ لکھتے ہیں اور یہ ایک قسم کا تصرف ہے ۔ اردو زبان میں بھی دو لفظ روزمرہ ہیں جیسے فلاں جگہ سے اسکی تبدیلی ہوگئی ۔ یعنی وہ تبدیل ہوگئے

آجکل لکھنؤ میں آگ برس رہی ہے ۔ بخار روزانہ ان دنوں حرارتی رہتے ہیں ۔ اسلئے میں ۱۲ ۔ جون کو ان شاء اللہ بغرض تبدیل آب و ہوا نینی تال جاؤنگا اور وہاں چند ہفتے قیام رہیگا ۔ غالباً جولائی کے وسط میں واپسی ہوگی ۔ امید ہے کہ اب آپکی صحت قابل اطمینان ہوگی ۔ زیادہ دعا ۔

خیر اندیش
صفی عفی عنہ

صفی لکھنوی [پ: ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء ۔ م: ۲۵ جون ۱۹۵۰ء] بنام راغب مرادآبادی [کراچی]

## اُردو کانفرنس احمدآباد کے لئے

اُردو ہمارے ملک کی وہ اہم زبان ہے جو مختلف صوبوں میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کے درمیان ایک ایسے رشتے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات اور احساسات کا تبادلہ کرتے ہیں، اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے سے بانٹتے ہیں۔ اس رشتے کے بغیر ہماری قومی شیرازہ بندی کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ ہم اس رشتہ کو ٹوٹنے نہ دیں۔ یہ خدمت ملک کی چودہ زبانوں میں سے صرف ایک زبان کی خدمت نہیں ہے پورے ملک اور پوری قوم کی خدمت ہے۔

جاں نثار اختر

23.10.57

⁕ جاں نثار اختر۔ [م: اگست ۱۹۷۶ء] کی ایک تحریر۔

---

سنتوش پور، [illegible] ۳۳

۱۰ اپریل ۸۵ء

مکرم گستر، تسلیم و نیاز

۷ اپریل کا مرسلہ تار مل گیا تھا۔ ۱۰۰ برس سالگرہ پر آپ کی مبارکباد میرے سر آنکھوں پر۔ میں [illegible] البتہ جینے پر [illegible] ہو گیا ہوں"۔ [illegible] جینے کی ہے [illegible] کروں؟"

جہاں عالم [illegible] کے نام سے ایک بزم قائم [illegible] جشن کیا تھا۔ [illegible] کرنے [illegible] مگر بزم [illegible] کہ [illegible] جمع کر کے [illegible] سے منزل [illegible] لیا۔

[illegible] شائع ہو گا مگر [illegible] میں [illegible] زیر بار احسان ہوں۔ [illegible]

اپنے مخلص کو ہم [illegible] فرماتے رہیے [illegible] مبارکباد کا شکریہ۔

نیاز کیش

لطیف الدین احمد

⁕ ل۔ احمد [پ: ۸ مارچ ۱۸۸۵ء ۔ م: ۲ جولائی ۱۹۹۰ء] بنام علقمہ شبلی [کلکتہ]



## محسن احسان

بسی یار سے ناراض ، نہ اغیار سے ہم
پر بھی ہیں شہر میں بے یار و مددگار سے ہم

کوئی دستِ غنی ، رہتے ہیں کشکول بدست
تے مانوس ہوئے درہم و دینار سے ہم

سرِ بام ستارہ ، نہ سرِ خاک چراغ
کتنے شرمندہ ہیں گھر کے در و دیوار سے ہم

و گرفتارِ محبت کو یہ معلوم نہیں
کیوں پلٹ آئے ہیں چپ چاپ کوچۂ دلدار سے ہم

دل میں تو ہیں تمنا کے تھے سوزِ غم مگر
مطمئن ہو گئے اک حرفِ لبِ یار سے ہم

ہم نے پائی ہے عجب طرزِ طبیعت محسن
بارہا اُلجھے ہیں خود اپنے طرفدار سے ہم

چلا ہے اُوڑھ کے زر کا پیرہن مہتاب
جگر جگر ہیں ستارے کرن کرن مہتاب

شجر حجر کے بدن ہو گئے ہیں مہتابی
جلا گیا یہاں قندیل ہر بدن مہتاب

فلک پہ تان گیا کوئی شامیانۂ ابر
اِدھر اُدھر سے زمیں پر ہے ضوفگن مہتاب

میں اُس کی چاندنی پلکوں سے چن رہا ہوں کہ ہے
مرے لئے مرا ہر قریۂ وطن مہتاب

نہ آفتاب یقیں ہے نہ ماہتاب گماں
گہن گہن مرا سورج گہن گہن مہتاب

برونِ لفظ کہاں ہے تجلیٔ معنیٰ
ہے حرف حرف ستارہ سخن سخن مہتاب

اسلامیہ کالج ، پشاور (پاکستان)



## آزاد گلاٹی

میں جو کھو جاؤں مجھے منظر بہ منظر دیکھنا
کوئی مل جائے گا تجھکو مجھ سے بہتر دیکھنا

جب سے اپنے دل کی گہرائی میں اترے ہیں ہمیں
آ گیا ہے خشک آنکھوں میں سمندر دیکھنا

پھول سے کھلتے ہوئے بچوں کے خوابوں میں ہے اب
جب بھی سونا ہر طرف جلتے ہوئے گھر دیکھنا

اک اسی عادت نے کتنے لوگ بونے کر دیئے
دوسروں کے قد سے اپنا قد بڑھا کر دیکھنا

کیسے لَو دیتے ہیں کچھ بھرتے ہوئے زخموں کے داغ
تم بھی تنہائی میں اپنے سے اُلجھ کر دیکھنا

تھی ہمارے عہد کی قسمت ہی صحراؤں کی پیاس
راس کیا آتا ہمیں خوابوں میں ساگر دیکھنا

تیرے گرد و پیش بھی آزاد ہے دنیائے نو
جب تجھے فرصت ملے اپنے سے باہر دیکھنا۔

گورنمنٹ کالج ، نابھہ ۱۴۷۲۰۱ (پنجاب)



بلراج کومل

ی ۱۲۹، کالکاجی، نئی دہلی - ۱۹

# ادبی تنقید، عملی تنقید

میں غیر رسمی لب ولہجے کو غیر دلچسپ، رسمی لب ولہجے پر ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن الفاظ کے خود رو پودوں کے غیر واضح مبہم بے سمت ہجوم سے تماشائی کی حد تک واقف ہونے کے باوجود بہر حال گریز کرتا ہوں۔ مکمل معروضیت کا معیار شاید کسی حد تک ناقابلِ حصول ہے۔ لیکن معروضیت کی آرزو کچھ ایسا سراب بھی نہیں ہے جس کو دائرۂ عمل سے خارج کر دیا جائے۔ ہمارے دور میں حادثہ یہ ہوا ہے کہ اکثر تحریریں جن کو ہم تنقید کے ذیل میں رکھتے ہیں یا تو غیر واضح، مبہم، بے سمت ہجوم کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں یا پھر انتہائی محدود ذاتی اور قبائلی تعصبات کا شکار ہو چکی ہیں۔ ادبی تنقید کو ہم نے مخصوص خانہ بندیوں کی بنا پر بہ حد سہولت اپنی ذاتی حد بندیوں کا اسیر بنا دیا ہے۔ نظریاتی تنقید، ہیئتی تنقید، فکری تنقیدی، لسانی تنقید، جمالیاتی تنقید۔ حق تو یہ ہے۔ ادبی اصطلاحات کی افادیت کے باوجود یہ سب حد بندیاں خانہ بندیاں ہمارے محدود تعصبات کی آئینہ دار بنتی جا رہی ہیں۔

نظریاتی تنقید کی مجبوری یہ ہے کہ اس کے نام لیوا۔ مختلف عقیدوں سے وابستہ نام لیوا ایک طے شدہ رویے اور ایک طے شدہ نقطۂ نظر سے نام نہاد مقام ارفع نگاہ سے دنیا کی ہر شئے کو دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں۔ نظریاتی تنقید جب سماجی، سیاسی یا مذہبی تقاضوں کی وساطت سے ادبی تنقید کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو فن پاروں کی غیر معلوماتی نامیاتی تخلیقی سطح کو عمومی بیان کی مفید معلوماتی نوعیت کے ساتھ گڈمڈ کر دیتی ہے۔ لہٰذا جو لکھنے والے براہِ راست مفید معلوماتی سطح پر ایک طے شدہ نظریاتی معیار پر پورے نہیں اترتے، بالعموم منافق اور دشمن ٹھہرائے جاتے ہیں یا پھر بہ اعتبار شرطِ وفاداری مشکوک ٹھہرائے جاتے ہیں۔

اردو زبان کی نظریاتی تنقید کی روشنی میں، میر، غالب، اقبال کے علاوہ دورِ جدید کے پرانے اور نئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی ایک مدت تک اس میزان پر ناپا گیا۔ یا تو ان میں غیر موجود طے شدہ مفید عناصر تلاش کیے گئے یا پھر مشکوک غیر مناسب عناصر۔

لفظ اور معنیٰ کی بحث جب کچھ آگے بڑھی تو اشکال اور صوتیات کے شمار و میزان کا شکار ٹھیک اسی طرح ہو گئی جس طرح کچھ عرصہ پہلے نظریاتی تنقید کی بحث اپنی مخصوص حد بندیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ پہلی قسم کی حد بندی نے شاعر اور ادیب کو سماجی دستاویز نگار کا درجہ عطا کیا تھا، اسے مصلح قوم و ملت ٹھہرایا تھا۔ دوسری قسم کی حد بندی جب ترتیب اشکال تک پہنچی تو اقبال کی حد تک اردو زبان کے شاعر الفاظ و صوتیات کا مجموعہ بن کر رہ گئے۔ انحراف کی جو بھی صورتیں ہمارے سامنے آئیں ہم نے ان کو جذباتی اور فکری ردعمل کی نوعیتوں سے الگ کر کے صرف ترتیب اور تشکیل کی حدوں میں رکھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

اردو زبان و ادب کے ساتھ ایک اور مخصوص، منفرد حد بندی بھی وابستہ ہو گئی۔ جوں جوں اردو زبان کی تعلیم اور ترویج و ترقی کے مشتہر ذرائع ایک مخصوص طبقہ کے ساتھ وابستہ ہوتے گئے، اور اپنی متوقع اثر پذیری کھوتے گئے۔ اردو زبان میں لکھنے والے شاعر، ادیب اور نقاد غیر ادبی منفعت بخش کاروباری نوعیتوں کے ساتھ منسلک ہوتے گئے۔ تسکینِ انا کا مسئلہ انہوں نے توسیعِ علم کی بجائے ذاتی، قبائلی تعصبات کے بل بوتے پر حل کرنا شروع کر دیا۔ 'ا' نے 'ب' کی تخریب کاری کا بیڑا اٹھایا۔ 'ب' نے 'ج' کی تخریب کاری کا اور 'ج' نے 'د' کی تخریب کاری کا ایک سلسلہ چل نکلا اگر تخریب کاری کا یہ سلسلہ بدگوئی اور دشنام طرازی اور لاف زنی سے آزاد ہوتا تو مستحسن ہوتا اور شاید علمی اور ادبی سطح کو بلند

نے کے لیے راہ ہموار کرنے کا باعث تھا لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہ سلسلہ ذاتی انہدام تک، ذاتی تخریب کاری تک محدود ہو کر رہ گیا۔ عملی تنقید بالعموم تعریف و توصیف تک محدود ہو گئی یا پھر باہمی تحریف تنقیص کا شکار ہو گئی۔

ذاتی طور پر میں تنقید کی حد بندیوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں ادب کا طالب علم ہونے کے ناطے تنقید کی طرف ایک اصطلاح کو تسلیم کرتا ہوں وہ ہے ادبی تنقید۔ میں خالص نظریاتی، خالص سماجی، خالص لسانی اور خالص جمالیاتی تنقید کی اصطلاحات کو محدود طریق کار اور محدود ردعمل کے مظاہر سمجھتا ہوں۔ اور ادبی تنقید کے وہ وسائل جو فن پاروں کی روح تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں لیکن وہ اس دور رس عملی تنقید کی جگہ نہیں لے سکتے۔

میرے نزدیک فنی اظہار کی کوئی بھی تشکیل، کوئی بھی ہیئت معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ معلومات اور اطلاعات سے واقف ہونے کے لیے ہم سب اخبارات و رسائل اور کتابوں کے ان حصوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں جن میں الفاظ کی نوعیت اور ان کا منزل ہی ہوتے ہیں جو ان سے متوقع معانی و مطالب کے ساتھ منسوب کیے جاتے ہیں نظریاتی افادی سماجی طے شدہ مقاصد کے تحت بعض لوگ ادب پاروں میں محض مفید معلومات اور اطلاعات تلاش کرتے ہیں۔ تحریر اور تخلیق کا بنیادی فرق الفاظ کو برتنے کے رویے کا فرق ہے ہر تحریر کی ایک بصری جسمانی شکل ہوتی ہے۔ جب ہم صرف فراہمی معلومات کے لیے کوئی تحریر پیش کرتے ہیں تو ایک محدود مقصد کے تحت الفاظ کو میزان و ترتیب کی محدود سطح پر رکھتے ہیں۔ الفاظ تخلیقی سطح اس وقت اختیار کرتے ہیں جب ہم ان کو استعاراتی پرواز سے سرفراز کر دیتے ہیں۔ اچھی تحریر میں ہم نہ تو غیر مطلوب معانی داخل کرتے ہیں اور نہ ہی اس میں سے غیر مطلوب معانی برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترتیب الفاظ کا طریقہ عام تحریر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور تخلیق میں بھی لیکن تخلیق میں تخلیق شدہ اکائی عام تحریر کی طرح جامد و ساکت نہیں رہتی بلکہ وجود میں آنے کے بعد اپنے ہی باطنی تحرک سے منور ہو جاتی ہے۔

تخلیقی اظہار مختلف تحریروں مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے آتا ہے شعر کی صورت میں، انشائیہ، افسانہ، ناول اور ڈرامہ کی صورت میں مخصوص اصناف سے وابستہ مخصوص عناصر کے علاوہ استعاراتی طریق کار کی سرگرم پیش قدمی ہی فیصلہ کن انداز میں اصناف کی ہیئتی مجبوریوں کے باوجود تحریر کی فنی سطح کا فیصلہ کرتی ہے۔ تخلیق کا بنیادی وصف الفاظ کا استعاراتی استعمال ہے۔

شعر میں انتخاب و ترتیب، الفاظ میں اور دیگر اصناف ادب میں الفاظ کے انتخاب و ترتیب کے علاوہ جزئیات و تفصیلات کردار و واقعات کی تفہیم اور تہہ داری میں جو تحریر ترتیب الفاظ کی محض بصری سطح پر رہ جاتی ہے اس تحریر سے یقیناً کم تر درجے کی ہے جو اپنی ذات میں کفیل پرواز ہے۔ شعر برتر ہے یا نثری تخلیقی تحریر (افسانہ) یا ڈرامہ۔

یہ سوال بے معنی ہے۔ اگر ہم فن پارے کو نامیاتی اکائی کے روپ میں قبول کرنے کے اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں تو ہم اس کی مشتہر بصری شکل سے قطع نظر اس کے باطنی تحرک سے وابستہ امکانات کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں۔ شعر اور فکشن کی جانی پہچانی حد بندیاں استعارے اور استعاراتی رویے کی اثر پذیری کی مقدار کے مطابق ایک دوسری کے اندر دراڑیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ محض تحریر اور فعال تخلیق کا بنیادی فرق بہرحال اظہار کی تمام صورتوں، ادب کی تمام اشکال و اصناف میں رویے کا فرق ہی ہوتا ہے۔ غیر تخلیقی اور تخلیقی رویے کا فرق !!۔

آئیے ہم اس صورتِ حال کو دو مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ پہلی مثال شعری مثال ہے۔ مجید امجد کی نظم: "آٹوگراف" دوسری مثال راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ہے "لاجونتی"۔ مجید امجد کی نظم "آٹوگراف" پیشِ خدمت ہے۔

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے\
کتابچے لیے ہوئے\
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں\
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر حسین لڑکیاں

---

مہیب بھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
ابل پڑے الجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پُرہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی راستے پہ اک طرف
بیاضِ آرزو بکف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بدم
کمانِ ابرواں کا خم
کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبز رک گئی

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

وہ باؤلر وہ ایک مہوشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر
بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پابہ گل
نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

اس نظم کے سلسلے میں، میرے ذہن میں کچھ سوال ابھرتے ہیں شاید آپ کے ذہن میں بھی کچھ سوال ابھریں۔ بہرحال ان سوالوں کے جوابات تلاش کرتے ہوئے ہم سب اس نظم کی تخلیقی سطح اور تخلیقی قدر و قیمت سے روشناس ہو سکتے ہیں۔

سوالات یہ ہیں۔

۱۔ اس نظم کے نثری ڈرافٹ کے کیا معنی ہوں گے۔

۲ ۔ یہ نظم خود نوشت دستخط سے متعلق ہے یا کرکٹ کے میدان میں کھیل ختم ہونے کے بعد کی صورتِ حال سے متعلق یا پھر شاعر کے کسی نجی مسئلہ سے متعلق یا کسی سماجی مسئلہ سے متعلق یا اقدار کے کسی مسئلہ سے متعلق ۔

۳ ۔ نامیاتی اکائی کے طور پر اس میں مختلف النوع معانی کے کیا امکانات ہیں ۔

ایلکزینڈر بلرک کی نظم "دہ بارہ" THE TWELVE اقبال کی مسجد قرطبہ، شیلے کی اوزی مینڈس OZYMANDIS اور کالرج کی کبلا خاں کے بارے میں بھی ہم اسی قسم کے سوالات اٹھا سکتے ہیں اور اس عمل میں ان نظموں کی تخلیقی نوعیت اور قوت سے واقف ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں ۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ "لاجونتی" کے بارے میں بھی ہمارے ذہن میں بہت سے سوال ابھرتے ہیں ۔

۱ ۔ کیا یہ افسانہ فسادات اور فسادات سے پیدا ہونے والے مسائل کا افسانہ ہے ۔

۲ ۔ کیا یہ افسانہ محض اغوا شدہ عورتوں کے مسائل کا سامنا ہے ۔

۳ ۔ کیا یہ افسانہ سندر لال کے پچھتاوے کا افسانہ ہے ۔

۴ ۔ کیا یہ افسانہ ہندوستانی عورت کے ناگزیر مقدر کا افسانہ ہے ۔

۵ ۔ کیا یہ افسانہ مرد اور عورت کے بھرپور جسمانی اور جذباتی رشتے کا افسانہ ہے ؟

وغیرہ وغیرہ ۔

ٹھیک اسی قسم کے سوال "بابو گوپی ناتھ" اور "ہتک" پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں ۔ ایسے ہی دوسرے ان گنت سوالوں کی یلغار میں جوزف JOSEPH CONRAD کا افسانہ "اندھیرے کا دل" HEART OF DARKNESS اور دوستوفسکی کا ناول BROTHERS KARAMAZUV انتہائی پر اسرار امکانات کی آماجگاہ بن جاتے ہیں ۔

اگر عملی ادبی تنقید فن پاروں کی مکمل شخصیت سے ہمارا بھرپور تعارف نہیں کراتی تو محض الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے ۔

ہمارے دور میں ترسیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے میں ترسیل کی کامیابی اور ترسیل کی ناکامی کے مسائل سے قطع نظر ترسیل و ابلاغ کا بھی قائل ہوں اور تخلیقی تحریروں کی فنی کم تری اور فنی برتری یعنی فنی معیاروں پر غور کرنے کا بھی میں آرچ بالڈ میکیلش کے بیان

A POEM SHOULD NOT MEAN BUT BE

کا اس حد تک معترف ہوں کہ شعر یا تخلیق کو معنی کی سطح تک پہنچنے کے عمل میں ناگزیر طور پر شعر اور تخلیق ہونا چاہیئے ۔ میں شعر اور تخلیق کو سراسر معنی سے آزاد نہیں کرتا ۔ لیکن تخلیق، ترسیل و ابلاغ اور درجۂ قبولیت کی توقع صرف فن کار اور قاری کے درمیان ایک جذباتی فضا، ایک جذباتی تعلق، ایک متکلم جذباتی رشتہ پیدا ہونے کے بعد ہی کر سکتی ہے ۔ یہ جذباتی ابلاغ ہی جہانِ معانی کو جنم دیتا ہے ۔ یہ عناصر جس قدر متکلم، متحرک تہہ دار اور پُر امکاں ہوں گے، اسی تناسب سے تخلیقی تحریر، برتری، عظمت اور قبولیت سے سرفراز ہو جائے گی ۔

تخلیقی تحریریں نہ سماج کی براہ راست اصلاح کا فریضہ انجام دیتی ہیں نہ سماج کی تخریب کا ۔ تخلیقی تحریریں صرف وہ فضا پیدا کرتی ہیں جس میں سانس لیتے ہوئے ہم ہزار سلاسل، ہزار مجبوریوں کے باوجود اپنے آپ کو جذباتی طور پر متحرک، ارفع اور آزاد محسوس کرنے لگتے ہیں شاید انہی معنوں میں کچھ تخلیقی تحریریں برتر اور عظیم قرار پاتی ہیں جب کہ کچھ دوسری تحریریں کم تر اور محدود ہو کر رہ جاتی ہیں ۔

ادبی تنقید اگر ترسیل و ابلاغ کے مسائل کو نظر انداز کر دیتی ہے تو وہ تخلیقی ادب کے ایک کٹھن لیکن بنیادی مسئلے کو نظر انداز کرنے کے گناہ کی مرتکب ہوتی ہے ۔

عتیق اللہ

# میں سُن رہا ہوں

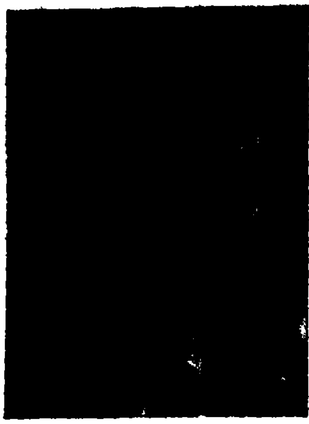
میں سُن رہا ہوں
تمہاری آنکھوں کا شور
تمہارے مساموں سے بوند بوند ٹپکتی ہوئی آوازیں
تمہاری چھاتیوں کی نیلی نیلی لکیروں کے درمیان
کنمناتے ہوئے بچوں کی سرگوشیاں

پلک جھپکتے ہی
شہر کا شہر ہجرت کر گیا
پڑاؤ ڈال دیئے گئے وہاں
جہاں کوئی موسم نہیں ہوتا
درخت پرندوں سے خالی
بچوں کو نیند نہیں آتی
کچھ رونما نہیں ہوتا
چیزوں نے اپنے معمول بدل دیئے ہیں،
رسول آتے ہیں اور بے بیان چلے جاتے ہیں
خدا کی بستیاں کبھی اتنی ویران نہیں ہوئی تھیں
اب تم آؤ گے
تو دیکھو گے
وقت!
جہاں تہاں سے پھٹ گیا ہے بکھر گیا ہے
اسے اپنی راہ پر لانا کتنا آسان ہے، کتنا مشکل
کتنا مشکل ہے
اُن ساعتوں پر کمندیں ڈالنا
جنھوں نے موقع پاکر اپنی رفتار پکڑلی
دیکھتے ہی دیکھتے
دوسری آبادیوں کی طرف نکل گئیں

بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر میں
تسلیاں منھ بسورے ہوئے پڑی ہیں
املتاس کی سوکھی شاخوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
صبر کے کچھ چیتھڑے
پُرزوں میں بدل چکے ہیں

آرزوں کے بے پایاں تسلسل
ڈھ چکے ہیں
اندر ہی اندر شیرخوار اُمیدوں کے ٹیلے
جنھیں دیکھ کر
نہیں یاد آئے گا
رشتوں کے بھرم کتنے سفاک ہوتے ہیں
کتنے پرزور ہوتے ہیں واسطے
جو ٹوٹتے ہیں
تو ان سے ایک چیخ بھی برآمد نہیں ہوتی
سارا جہان ہی ٹوٹ بکھر جاتا ہے
گردش کرتے ہوئے خون میں
—— برف کی کیلیں گڑ جاتی ہیں

— جیسے سارا جسم ہی آگیا ہو کسی سرکش آندھی کی زد میں
اور ایک ایک کرکے
ہڈیوں کے سارے جوڑ ہی کھلتے جا رہے ہوں
بکھرتے جا رہے ہوں سارے مسام
گرتے جا رہے ہوں
ہم، ان جوہڑوں پر
جہاں صرف خوابوں کے بیج بوئے جاتے ہیں
اور فصل کے نام پر
ملفظے کے عذاب کمو پاتے ہیں
جیسے ہم
ایک عظیم ہجر کی پیداوار ہیں
عمریں —— دکھوں کے حساب طویل
دکھ —— دشمن کی بیدار نگہی سے زیادہ زندہ
اپنے کاندھوں پر
اپنی سانسوں کے خمیازے ہیں
اور میں
اپنی ہی نیندوں میں
دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں۔



انل ٹھکر
۱-اے - شمبھوا پارٹمنٹس ، ۳۸۱ آدرش نگر ، ہبلی ، کرناٹک

# جہنم کا خریدار

سگریٹ کے چہرے پر جمی ہوئی راکھ کو چٹکی کے جھٹکے سے جھاڑا ، ایک کش لیا اور اپنا چہرہ دائیں طرف گھما کر دیکھا تو لوگ ابھی لاش کو غسل دے رہے تھے ۔

صبح دفتر پہنچنے کے بعد ابھی میری سانس بیٹھی بھی نہ تھی کہ فون پر خبر آئی ، کیسگو انتقال کر گیا ہے ۔ ہارٹ فیل ۔ ہر انسان کی طرح اس کا مرنا بھی طے شدہ بات تھی مگر وہ اپنے دوستوں سے ڈنکے کی چوٹ پر کہا کرتا تھا " ہم مریں گے تو دل کے دورے سے ، ادھر دھڑکن رکی نہیں کہ ہم چل دئے ۔"

دراصل وہ مرا نہیں تھا اس نے خودکشی کی ہے ۔ برسوں سے روزانہ ٹھرا حلق میں انڈیل کر وہ قطرہ قطرہ خودکشی کرتا رہا اور پھر خودکشی کرنے والا کسی سے کہہ کر تو خودکشی کرتا نہیں ۔ چاہے وہ یک لخت خودکشی کرے یا قطرہ قطرہ ۔

کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں ۔ یہ بھیڑ اس کے نام کی نہیں ہے ۔ یہ بھیڑ تو قاضی کے کتے کے جنازے کی بھیڑ ہے ۔ اس کا ماما اچھے نام اور رتبے کا آدمی ہے ۔ بھیڑ مرنے والے کا منہ دیکھنے نہیں آئی ۔ مرنے والے کے ماما کو منہ دکھانے آئی ہے ۔

اس کو غسل دینے والے خاموشی اوڑھے ہوئے اسے نہلا رہے ہیں ۔ انھیں اس کی زندگی کی طرح اس کے جسم میں بھی تعریف کرنے جیسا کہیں کچھ نظر نہ آیا ۔ ورنہ ایسے وقت پر تو لوگ بڑے سے بڑے دشمن کی لاش کے سامنے بھی چن چن کر اس کی خوبیوں کے قصیدے پڑھنا نہیں بھولتے ۔

میں نے منہ پھیر لیا ۔ ایک ساتھ سگریٹ کے دو لمبے کش لئے ۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے مرنا ہی تھا تو دوسرے مرنیوالوں کی طرح خاموشی سے مر جاتا ۔ مجھے جھمیلے میں پھنسا کر مرنے سے اسے کیا ملا ۔

اس کی موت کی خبر سن کر میں دفتر سے نکلا تو راستے میں یہی سوچتا رہا کہ وہاں جاکر اس کے بیوی بچوں کو ، ماں اور بھائیوں کو کیا کہہ کر تسلی دوں گا ، مگر بھگوان کا شکر ہے کہ ایسی نوبت ہی نہیں آئی ۔ اس کی گلی میں پہنچ کر میں نے اسکوٹر ایک طرف کھڑا کر دیا ۔ اس کے گھر کے دروازے پر اس کے ماما اور چھوٹا بھائی گفتگو کرتے ہوئے ٹھہرے تھے ۔ میرے پہنچتے ہی سب نے میری طرف دیکھا اس کا چھوٹا بھائی میری جانب بڑھا ۔ میں کچھ کہہ کر اسے تسلی دینے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ وہ میرے قریب آکر بولا ۔

" انل صاحب ، آپ کو ایک کام کرنا ہوگا ۔"

" کہو ؟" میں کچھ کر گذرنے کو تیار ہو گیا ۔

وہ جیسے مناسب لفظ تلاش کر رہا ہو ، ویسے رک رک کر بولا " بات . . . کچھ . . . یوں ہے کہ . . ." بچا ہوا جملہ وہ ایک سانس میں کہہ گیا " بھابی کہہ رہی ہیں ، ایک دن بھیا نے ان سے کہا تھا کہ جب ان کی موت ہو تو ارتھی کے آگے آگ کی ہنڈیا آپ ہی لے کر چلیں ۔" یہ سنتے ہی میں نے پریشان ہو کر کہا " مگر آگ کی ہنڈیا تو . . ."

" ہاں یہ تو سچ ہے ، آگ کی ہنڈیا مرنے والے کا بیٹا یا ـــــ مگر بھابی کا کہنا ہے کہ اس کام کو آپ ہی انجام دیں ـــــ یہی بھائی کی آرزو بھی تھی ۔" اس نے کہا ۔

اتنا سنتے ہی میرا ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آرزو کا پھندا میرے گلے میں ڈال دیا گیا ہو مجھے گھٹن کا احساس ہوا ، میرے منہ سے اتنا ہی نکلا " ہوں " میرے منہ سے نکلی " ہوں " کی آواز کو میری رضامندی مان کر وہ پلٹا اور اپنے ماما کے پاس جاکر باتیں کرنے لگا ۔ میں بے وقوفوں کی طرح ان کی طرف دیکھتے ٹھہر گیا ، پھر آہستہ سے ہٹ کر ایک طرف

چبوترے پر بیٹھ گیا۔ میں نہ جانے کب تک خیالوں میں کھویا ہوا وہاں بیٹھا رہتا کہ کیسٹو کے بھائی نے میرا شانہ ہلا کر مجھے بیدار کیا۔

"چلئے" اس نے کہا۔

میں اٹھا، پلٹ کر دیکھا، لاش کو ارتھی پر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے آخری سفر کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ سب کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میرے انتظار میں ہیں۔ ارتھی کے سرہانے جلتے ہوئے اُپلوں کی ہنڈیا رکھی ہوئی تھی اور اُپلے دھواں دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ہنڈیا اٹھائی۔ لوگوں نے رام نام ستیہ ہے کہتے ہوئے ارتھی کو کندھا دیا۔ گھر میں عورتوں کا رودنا عروج پر پہنچ گیا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ رونے کی آواز دہلیز پر ڈھیر ہو گئی۔ رام نام ستیہ ہے کی تازہ تازہ دھن میرے ہاتھ میں لٹک رہی ہنڈیا کی ہمقدمی کرنے لگی اور بدلتے کاندھوں کے سہارے کیسٹو کا سفر آخرت طے ہونے لگا۔

ارتھی بازار سے گذر رہی تھی۔ میں نے ایک دُکان سے لال میاں کو باہر آتے ہوئے دیکھا ہماری نظریں ملیں تو وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہوا مگر فوراً وقت کی نزاکت کو سمجھ کر اس نے جیب سے رومال نکالا اور کندھا دینے آگے بڑھ گیا۔ مجھے مڑ کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ورنہ میں یقیناً پلٹ کر دیکھتا کہ وہ شخص جس نے ایکدن لال میاں کے گھر کا پانی پینے سے انکار کر دیا تھا آج وہ اس مسلمان کے کندھے پر سوار ہو کر کیسا لگ رہا ہے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے، پچیس ستائیس سال پہلے وہ اپنے ماما کی چھت کے نیچے اپنے لئے تھوڑی سی جگہ بنانے، اپنے وطن کو چھوڑ کر آیا تھا۔ ملک کے اجڑتے گاؤں میں خاندانی کنبوں کے اکھڑتے ہوئے خیموں کا وہ فرد اپنے ترقی یافتہ ماما کے شہر کو آتے ہوئے راستے میں نہ جانے کتنے خواب اپنے مستقبل کے لئے بُنتے ہوں گے۔ چوبیس سال کا گورا چٹا گبرو جوان، قد ذرا چھوٹا مگر سینے میں گاؤں کی تازہ ہوا بھری ہوئی۔ چہرے پر گھر کے دودھ اور گھی کی چکناہٹ اور منہ میں عوامی زبان کی چاشنی۔ اس پر کسی کنواری لڑکی جیسی جسم کی مہک سے بھرپور اس کی معصوم سی فطرت۔ وہ جب بھی ملتا، اس سے، دو باتیں کرنے کو جی للچاتا۔

ایک دن شام کو میں اپنے دوست لال میاں کے گھر جا رہا تھا کہ وہ راستے میں مل گیا اور میرے اصرار کرنے پر وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ لال میاں کے گھر پہنچ کر ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ ابھی دو باتیں ہوئی بھی نہ تھیں کہ چلمن کے اُس پار چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ میں اِس کھنک کا عادی تھا لال میاں اٹھا۔ کیسٹو دیوار پر ٹنگی تصاویر دیکھنے لگا۔ چلمن ہٹا لال میاں نے ٹرے میں سے دو گلاس اٹھائے، ایک گلاس مجھے اور دوسرا کیسٹو کو پیش کیا۔ کیسٹو نے پانی کے گلاس کو دیکھا اور تیز بولا" میں مسلمان کے گھر کا پانی نہیں پیتا۔"

یہ جملہ سنتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے پانی نہیں تیزاب میرے سے اتر رہا ہو۔ مگر میں نے دیکھا کہ لال میاں مسکراتے ہوئے گلا تپائی پر رکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر چوڑیاں کھنکیں، لال میاں چلمن کے پیچھے سے چائے کی ٹرے لی اور لاکر تپائی پر رکھا میری سانس رک سی گئی۔ جانے اب کیسٹو کون سا دھماکہ کرے

اتنے میں لال میاں اس سے مخاطب ہوا۔

"کیسٹو صاحب! آپ کو شاید اس بات کا علم ہو گا کہ۔۔

کیسٹو اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ لال میاں۔ بات آگے بڑھائی۔

"ملک کی تقسیم کے بعد پنڈت جی ایک مسئلہ پہ بہت پریشان تھے ــــ بوجھئے کیا؟"

کیسٹو نے میری طرف دیکھا پھر لال میاں سے پوچھ کیا؟!

لال میاں نے حکم کا پتہ پھینکنے کے انداز میں جملہ پھینکا۔

"وہ اس مسئلہ پہ پریشان تھے کہ تقسیم کے بعد ملک میں قو یکجہتی کیسے پیدا کی جائے؟"

کیسٹو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لال میاں نے بات جاری رکھی

"پنڈت جی نے شملہ میں بڑے بڑے سائنس دانوں کا ایک سے منار کرایا۔ بحثیں ہوئیں تب کہیں جاکر ایک چیز ایجاد کی گئی اب اس چیز کے آجانے کے بعد آپ کسی کے بھی گھر میں چائے پی سکے ہیں۔ اس سے کسی کے مذہب کو کوئی خطرہ نہیں۔"

لال میاں نے ٹرے سے اسٹیل کا مگ اٹھا کر کیسٹو کی بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے کہتے ہیں اِسٹین لیس اسٹیل، کیا؟۔۔۔ اسٹین لیس اسٹیل۔۔۔ اور پھر چائے بناتے وقت پانی کے اُبا سے اس میں اگر کوئی مذہبی جراثیم بچ بھی گئے ہوں تو مر جاتے ہیں لیجئے، چائے پیجئے۔"

۔ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی لال میاں نے مگ اس کے ہاتھ میں تھما دیا
۔ نے میری طرف دیکھتے ہوئے بھی زبان میں کہا" سالو آنجو دستا ہوشیار لگے تو۔"

میں نے سنجیدگی قائم رکھتے ہوئے اسے اپنی زبان میں کہا۔ "لیو پیا، نہیں پینا تمہاری مرضی۔ مگر اس سے فی نار کی بات تو میں نے اخباروں میں پڑھی تھی۔"

"اب سچ اور جھوٹ کیا ہے تم دونوں کو معلوم، میں تو پی لیتا ہوں چائے سے خوشبو بھی اچھی آ رہی ہے۔" کیشو نے اتنا کہا اور چائے کی چسکی لی۔

لال میاں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے مگ کو ہونٹوں سے ہٹاتے ہوتے کہا۔ "ابتدائے عشق ہے . . . ."

کیشو نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "مگر لالہ! ہمارے گاؤں میں تو ہم آج بھی کسی مسلمان کے گھر کا پانی نہیں پیتے۔"

"تمہارے گاؤں میں ابھی اسٹین لیس اسٹیل کے برتن نہیں آئے ہوں گے۔" لال میاں نے جواب دیا۔

"ہاں یہ بات سچ ہے لالہ"، اس نے دوسری چسکی لیتے ہوئے کہا جہاں تک مجھے یاد ہے اس سے پہلے میں نے کسی کی زبان سے لال میاں کو لالہ کہتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اور اس دن جب کیشو نے اسے لالہ کہا تو پھر اس کے بعد سے آج تک میں نے کسی کو لال میاں کہتے نہیں سنا۔ جیسے لال میاں کو لالہ بنا کر کیشو نے اس کی چائے کا قرض اتار دیا ہو۔

ہاں اس کے بعد کیشو نے کہا تھا" ہمارے گاؤں میں میرا ایک دوست ہے۔ جگری دوست، علی ـــــ ہم ساتھ پڑھے، ساتھ ساتھ دھول بھری گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے مگر آج بھی گاؤں میں جب ہم ہوٹل میں چائے پینے بیٹھتے ہیں تو میں یار ہوٹل کے لڑکے کو پکار کر کہتے ہیں سنو اے چھوکرے! ایک ہندو ایک اسلامی لے آ۔"

لال میاں نے قہقہہ لگا کر کہا" اب ایسا نہیں کہنا ـــــ کیا؟"

"اب کیا کہوں گا، میرا سر! تمہارے پنڈت جی نے تو مجھے آج آدھا مسلمان بنا ہی دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بھی ہنسا تھا۔

"آدھا مسلمان نہیں پورا انسان بنا دیا ہے" لالہ کا یہ جملہ سن کر اس نے چائے کی آخری چسکی لی تھی۔

میں ہنڈیا اٹھائے شمشان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہنڈیا کا دھواں راکھ کی چادر اوڑھ کر اونگھنے لگا تھا رام نام ستیہ ہے کی دھن تھک کر میرے قدموں کی آہٹ کے پیچھے رینگتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ اتنے میں کیشو کے چھوٹے ماما نے میرا کندھا چھوا اور میرے کان کے قریب آ کر کہا۔

"ذرا رکئے۔ پیچھے مت دیکھئے گا۔ ارتھی کا رخ بدلا جا رہا ہے ابھی تک لاش کا سر آگے کی طرف تھا اب پیچھے کی طرف کیا جا رہا ہے۔"

میں نہیں جانتا ایسا کرنے کے پیچھے کیا فلسفہ ہے یا دھرم کا کون سا حکم ہے ؟ کیونکہ مجھے حکم ہوا اس لئے میں رک گیا ہوں۔

اچانک ناریل پھوڑنے کی آواز آئی جیسے دیا بجھنے سے پہلے اس کی لو ایک بار بھڑکتی ہے ٹھیک اسی طرح رام نام ستیہ ہے کی دم توڑتی ہوئی دھن ایک دم بھڑک اٹھی۔ میں نے اسے اپنے لئے آگے بڑھنے کا حکم مان کر چلنا شروع کر دیا۔ میری ناک کی سیدھ میں شمشان کا ٹین کا چھپر نظر آ رہا تھا جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ دروازہ شاید اس لئے نہیں ہے کہ یہاں آنے والوں کو دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کے اطراف کوئی دیوار نہیں ہے کیونکہ یہاں کسی قسم کی چوری کا خطرہ نہیں ہے۔

مگر یہ کیا!! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!! میں دیکھ۔ با ہول خوش و خرم کچھ عورتیں بچے اور مرد کلکاریاں بھرتے ہوئے شمشان سے کچھ دوری پر آباد جھونپڑیوں سے نکل کر تیز قدموں سے شمشان کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ماتم زدہ ارتھی دوسری طرف خوش و خرم وہ لوگ۔ دونوں شمشان کی طرف بڑھ رہے تھے ـــــ قدیم زمانے میں ہمارے بزرگوں نے یہ سوچ کر کہ شمشان میں چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے در و دیوار کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی مگر یہ انہیں کبھی گمان بھی نہیں ہوا ہوگا کہ دنیا میں ایک دور ایسا بھی آئے گا جب زندگی اس قدر بدنما ہو جائے گی کہ حوا کے بچے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شمشان تک پہنچ جائیں گے۔

شمشان پہنچ کر میں نے کیشو کی آرزو کو زمین پر رکھا اور اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگا۔ میں اب پیچھے مڑ کر دیکھ سکتا ہوں، سگریٹ پی سکتا ہوں . . . . اور اپنی آزادی کے اس احساس کو برقرار رکھنے کے لئے میں نے سگریٹ جلائی۔

مڑ کر دیکھا، ارتھی زمین پر رکھ دی گئی تھی۔ لوگ موٹی موٹی لکڑیاں چن کر ایک شخص کے سامنے رکھ رہے تھے اور وہ شخص ان لکڑیوں کو ایسے سجا کر رکھ رہا تھا جیسے کیسُو کی سہاگ رات کی سیج سجا رہا ہو۔

نہ جانے لال میاں میری بغل میں کب آکر ٹھہرا، اسکی موجودگی کا علم ہوتے ہی ہم دونوں ذرا ہٹ کر ایک طرف ٹھہر گئے۔ لوگ چتا کے چاروں طرف ٹھہر کر اس کی اونچائی کو نظروں سے ناپ رہے تھے کسی کی نظروں میں چتا کو تیار کرنے کے انداز سے حیرت جھلک رہی تھی۔ کوئی یہ سب دیکھ کر دنیا کو فانی محسوس کر رہا تھا۔ اور وہ لوگ جو جھونپڑیوں سے آکر اب آدھے دائرے میں پھیل گئے تھے موٹی موٹی لکڑیاں دیکھ کر ان کی آنکھوں سے لالچ کے رنگ چمک رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہے تھے کہ کونسی لکڑی کا کتنا حصہ ادھ جلا رہ جائے گا اور کون سی لکڑی سے کتنا کوئلہ حاصل ہوگا جس سے ان کے چولہے کتنے دن سانس لے سکیں گے۔

چتا تیار ہوتے ہی لاش کو ارتھی سے کھولا گیا، دوسری طرف دو آدمی آگ کی ہنڈیا کو زمین پر الٹ کر اس کے ادھ جلے اُپلوں کو پھونک مار مار کر روشن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ مٹی کے تیل کی بوتل لے کر ان کے پاس آئے کچھ چھوٹی لکڑیاں اُپلوں پر رکھیں مٹی کا تیل ڈالا اور آگ روشن ہوئی ان بزرگ کی نظر خالی ہنڈیا پر پڑی انھوں نے فوراً ان دونوں سے پوچھا "یہ کیا! اس ہنڈیا کو تم نے پھوڑا نہیں؟"

اتنا کہہ کر انھوں نے ہنڈیا اٹھائی تو دوسری طرف ان سے ذرا دور ایک لڑکا جو اپنے دونوں گھٹنوں کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ جس طرح ارجن کی آنکھیں مچھلی کی آنکھ پر جمی تھیں ٹھیک اسی طرح اس لڑکے کی آنکھیں بھی اُس ہنڈیا سے چپک گئیں۔

"شاستروں کے مطابق اِسے خالی کرتے ہی فوراً پھوڑ دینا چاہئے" اتنا کہتے ہوئے انھوں نے ہنڈیا کو دور پھینکا۔ وہ لڑکا چیتے کی طرح اُچھلا اور ہنڈیا کو ہوا ہی میں دبوچ لیا مگر لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کی بانہہ تھام لی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے پوچھا:۔

"کیا کروگے اسے لے کر؟"

"اس میں کھانا پکائیں گے صاحب" اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

میرے ہاتھ کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہوگئی۔ لڑکا اپنی بانہہ چھڑا کر بھاگا۔ اُسے بھاگتا دیکھ کر وہ بزرگ چلّائے، "پکڑو سالے کو!" مگر لڑکا کافی دور نکل گیا تھا تو وہ بڑبڑانے لگے:۔

"سالوں نے شمشان تک کو نہیں بخشا!"

کیسُو کی لاش کو چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ ارتھی اس کی چتا پر سے وار کر دوسری طرف پھینک دی گئی۔ حوّا کے بچّے ان بانس کے ٹکڑوں کو ہڑپنے کے لئے آگے بڑھے تو انھیں روک دیا گیا۔ چتا سجانے والے نے ارتھی سے ایک لمبے بانس کو الگ کیا اور بچا ہوا حصّہ ان محتاجوں کے نوچنے، کھسوٹنے کے لئے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ لوگ اپنے چولہے کی سانسوں پر جھپٹ پڑے۔

یہ جھپٹنا ایسا ہی تھا جس طرح کیسُو کی کنوار جوانی کو ہڑپنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہ گھبرایا ہوا ایک رات میرے گھر آیا تھا۔ تب تک وہ مکمل طور پر ترقی پسند نہیں ہوا تھا۔ البتہ لالہ کے گھر کی چائے سے بقرعید کی بریانی تک اس نے کافی ترقی کر لی تھی مگر وہ اب بھی لالہ کے گھر میں کانچ کے گلاس میں پانی نہیں پیتا تھا۔ لالہ بھی ہمارے پہنچتے ہی باورچی خانے کی طرف دیکھ کر پکارتا "بھئی ایک گلاس گنگا جل اور ایک اسلامی پانی تو بھجوانا ذرا"

ہاں، تو ایک رات وہ میرے گھر آیا، اسے رات کو آیا دیکھ کر میں ذرا پریشان ہوگیا، ادھر دو تین مہینوں سے اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ فربہ سا نظر آیا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا مگر اس نے باہر چلنے پر اصرار کیا۔ میں نے سگریٹ اٹھائی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ ٹہلتے ٹہلتے ہم کافی دور نکل آئے۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی، میں نے سگریٹ جلا کر اسے بھی پیش کی مگر اس نے اپنی جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بولا "میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

"تم مجھے یہاں کچھ پوچھنے کے لئے لائے ہو یا کچھ کہنے؟"

رات کی سیاہی میں نہ تو اس نے میری مسکراہٹ کو محسوس کیا اور نہ ہی میری جانب دیکھا۔

"پہلے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ——— پھر سب کچھ بتاؤں گا"

"پوچھو؟"

"اگر کوئی عورت کسی کا بار بار راستہ روکے تو اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟"

اتنا سنتے ہی میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اندھیرے میں پیڑ پر بیٹھے کسی پرندے نے پر پھڑپھڑائے۔ وہ چلتے چلتے رُکا اور میری طرف احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔

"تم جیسے کچی گگڑی چھاپ لڑکے کا راستہ روکنے والی کو لڑکی کہتے ہیں، عورت نہیں، بے وقوف!"

"نہیں۔ وہ لڑکی نہیں ہے، عورت ہے — شادی شدہ" اس نے دبی آواز میں کہا۔

میں نے اس کا پہلا جملہ سُن کر سمجھا تھا کہ یہ عشق کا چکر ہے مگر اب محسوس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔

"کون ہے وہ؟" میں نے تجسس کو دباتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنی دھن میں کہنے لگا۔

"اس کے روکے ہوئے راستے سے کترا کر نکل جانے کی کوشش کرنے سے اگر وہ اپنے جسم کے ان حصّوں کو.... میرا مطلب ہے.... جسم کے ان حصّوں کو..... تم سمجھ رہے ہو نا.... جن کو تنہائی میں دیکھ کر وہ خود بھی شرما جائے۔ اگر جسم کے وہی حصّے انجان بنتے ہوئے کسی مرد کو دکھا کر اسے اُکسائے تو وہ مرد....!"

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہوں وہ کسی معصوم بچّے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے قہقہے کی آواز سُن کر جس پرندے نے صرف پَر پھڑپھڑانے تھے وہ اس کے رونے کی آواز سُن کر اپنے ڈیرے سے اڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں آپ لوگ مجھے جاہل گنوار سمجھتے ہیں مگر ہم گنوار مردانگی کے نام پر اپنی مونچھوں پر نیبو لٹکائے گھومتے ہیں!"

"اس میں مردانگی کی کیا بات ہے؟"

"یہی تو رونا ہے۔ مردانگی کسی عورت کی ہوس مٹانے میں نہیں ہوتی" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور پھر ایک بیڑی جلاؤ اور پورا قصہ کہہ سنایا تب ہی دو تین مہینے تک اس کی غیر حاضری کا اور موٹاپے کا راز مجھے معلوم ہوا۔

اس نے ان دو تین مہینوں میں ذہنی کوفت کو جھیلا اور جسمانی سکون کو بھوگا تھا۔ جسمانی سکھ کی ابتدا اس وقت ہوئی ہے جب ایک دن وہ نہا کر کام پر جانے کے لئے بال سنوار رہا تھا۔ آئینے میں اس نے دیکھا کہ دروازے پر اس کی مامی کھڑی تھی، وہ اس وقت صرف تولیہ لپیٹے ہوئے تھا اس لئے شرما گیا اسے شرماتے دیکھ کر اس کی مامی نے شرارتی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔

"یہ کیا، عورتوں کی طرح کیوں شرما رہے ہو؟"

کیشو نے بش شرٹ اٹھائی اور جلدی سے پہن لی۔ مامی نے پینترا بدلا۔

"ارے، ایسے گندے کپڑے کیوں پہنتے ہو، اس سے تمہارے ماما کا نام خراب ہوتا ہے۔"

مامی نے اس کے ماما کی اُترن کو گھر میں بیٹھے درزی کے پاس سے ٹھیک ٹھاک کروا کے اس کے لئے کپڑے بنوا دیئے پھر ہر روز مامی نے اس کے کھانے پینے کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ پہلے پہل تو کیشو کو مامی کی نظر عنایت کا راز سمجھ میں نہیں آیا، مگر جوں ہی مامی کے چہرے کے تاثرات رنگین ہونے لگے تو کیشو چکرا گیا، وہ جتنا ہی مامی سے کترانے لگا وہ اتنی ہی کھلتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ بے تکلف ہونے لگی۔ اسطرح کیشو اس کی حرکتوں سے بدک کر اپنا جی ہلکا کرنے میرے پاس چلا آیا۔

اس رات کیشو چلا گیا۔ پھر مہینوں تک نہ وہ ملا اور نہ ہی اس کی خبر۔ خبر نہ ملنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لالہ اسکول کے امتحانات کی تیاری میں لگ گیا اور میں اپنے ڈرامہ کی ریہرسل میں مصروف ہو گیا۔ ایک رات بارہ بجے جب میں ریہرسل سے لوٹ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سامنے سے کیشو اپنے خیالات میں کھویا ہوا چلا آ رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ خیالوں سے چونکا اور مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ ہم دونوں اسکول کے کمپاؤنڈ کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ ابھی وہ ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کمپاؤنڈ کے اندر جا گرا۔ میں نے دیکھا وہ اپنے کپڑے صاف کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا وہ جیسے ہی میرے قریب آیا تو مجھے اس کے منہ سے آتی ہوئی ٹھرّے کی بو

محسوس ہوئی۔ میں سوچنے لگا، جو شخص کل تک اپنے دوست کے گھر کا پانی پینے سے کترا رہا تھا آج وہ ٹھرے تک پہنچ گیا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں کل یگ کا راجہ ہرش چندر ہوں ــــ سُنی ہے نہ کہانی اسکی؟ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ میں بھی ــــ جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ بات اور ہے کل یگ کے حساب سے کبھی کبھار ایمرجنسی میں چھٹانک بھر جھوٹ بول لوں۔ ورنہ ــــ نہیں، کبھی نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ رکا تو میں سمجھ گیا ٹھرے کے نشے میں سیدھے مقصد پر نہیں آئے گا۔ اس نے بات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"سچ بولتے میں بڑا دکھ ہے مگر بعد میں سکھ ملتا ہے، یہ قدرت کا اصول ہے اسی لئے میں ہرش چندر بنا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا اس لئے پوچھ ہی لیا۔

"مگر اتنے مہینوں تم کیا کرتے رہے؟"

"تجارت" اس نے فخر سے کہا۔

"تجارت!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ایک بڑا سودا کیا ہے میں نے۔" اتنا کہہ کر اس نے جیب سے بیڑی نکالی۔

"کیسا سودا؟"

"میں نے ہاتھ میں آئی جنت کو چھوڑ کر جہنم کو خریدا ہے۔" اس نے یہ کہہ کر جھٹکے سے ایک تیلی ماچس پر رگڑی اور اپنی بیڑی جلائی۔ اس نے ایک بیڑی مجھے بھی پیش کی۔ میں نے بیڑی تو لے لی مگر سوچتا رہا پیوں یا نہیں، کیونکہ بیڑی پینا میرے لئے اپنے معیار سے گرنے کے برابر تھا۔

"سوچو مت پیو۔ میں چار سال کا تھا تب سے پی رہا ہوں۔ میرا آبا اپنی گود میں بٹھا کر مجھے دم مارنے دیتا تھا۔ اس نے تیلی جلائی میں نے بیڑی منہ میں رکھی اس نے آگ دی۔ کیسو کے لڑکے نے برستی آنکھوں سے کیسو کی لاش کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو آگ دی ــــ دھواں اٹھا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ اس رات میری بیڑی کو کیسٹو نے آگ دی تھی، میں نے بیڑی کا کش لیکر دھواں چھوڑا تھا تو وہ دھواں بھی اوپر اٹھ کر بکھر گیا تھا۔ دھوئیں کی طرح انسان کی آہ کے مقدر میں بھی لکھا ہے بکھر جانا۔ ایسے ہی بکھر رہی اپنی آہ کو رات کے اندھیرے میں آنکھوں میں سمیٹ لینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اور اسکول کے کمپاؤنڈ کی دیوار پر بیڑی کو رگڑ کر بجھاتے ہوئے اس نے مجھے جہنم کو خریدنے کی روداد سنائی تھی۔

دھول جیسی معمولی چیز کو بھی اگر ٹھوکر ماری جائے تو اُڑ کر سر پر چڑھتی ہے۔ کیشو کی مامی تو مست ڈولتی ناگن تھی۔ اس کے سامنے کیشو نے بین بجانا چھوڑ کر جب اس کی جنسی خواہش کو ٹھوکر ماری تو بھلا وہ انتقام لئے بغیر کیسے چپ رہ سکتی تھی۔

بلی کے لئے تیار کیا جانے والا بکرا یک بہ یک لاوارث ہو گیا۔ اسے دی جانے والی غذا بدل گئی، ماما کی اترن سے بنوائے گئے کپڑے کون اور کب چوری کر گیا اس کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ اس پر آئے دن ماما کی ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو گئی۔ اسطرح پریشانی میں مبتلا کیشو ذہنی طور پر اپنے کام سے دور ہونے لگا۔ کام میں اس کی غلطیاں اس کے ماما کے کان بھرنے لگیں۔ روز روز کی اس کچ کچ سے بدگمان ہو کر ماما نے اس کے کام کی نوعیت بدل کر دور دراز کے گاؤں سے مال کے نمونوں کے بنڈل لے آنے کا غیر ذمہ دارانہ کام اس کے حوالے کر دیا۔ انا کے لئے مونچھوں پر نیبو لٹکا کر گھومنے والے اس گنوار نے ذہن کے تبادلے سے گھائل ہو کر اپنے غم کو بھلانے کے لئے ٹھرے کا سہارا لے کر خاموشی اختیار کر لی۔

جلتی چتا سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹے سیاست، فلم یا کاروبار کی باتیں کرتے بیٹھے تھے۔ چتا کی آگ کے شعلے رقص کر رہے تھے۔ آگ، شعلے جلتی ہوئی چیز کو راکھ کر کے سرد ہو جاتے ہیں مگر انتقام کی آگ اتنی آسانی سے ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ ویسے تو کیشو کی مامی نے انتقام کی آگ میں تپتے ہوئے اپنے جسم کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے اپنے چھوٹے دیور کو مائل تو کر لیا تھا مگر پھر بھی اس کی سُرخ آنکھیں کیسٹو کی جوانی کو اپنے اندر اتار لینے کے لئے مچلتی رہیں۔

آخری بار کیشو مجھ سے شام کے وقت اسٹیشن کے قریب ٹکرا گیا تھا۔ بغل میں سیمپل کا بڑا بنڈل لئے وہ ٹھرے کی دُکان سے باہر نکل رہا تھا کہ میں وہاں سے گذرا۔ ہماری نظریں ملیں۔ میں نے اسکوٹر فٹ پاتھ کے پاس کھڑا کر دیا وہ میرے قریب آیا۔ وزن دار سیمپل اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور بیڑی سلگانے لگا۔

میں نے پوچھا "کہو کیا حال ہے؟"



## حامدی کاشمیری

◆

...نت میں خلد بریں لے آنا
...ابانے میں یقیں لے آنا

...ں معلق ہوں ہوا میں کب سے
...وں دھرتی کو زمیں لے آنا

...وشۂ قبر بھی شاید ہی ملے
...سب جہاں زیرنگیں لے آنا

...ہاں بہت دور اسے جانا ہے
لحہ بھر دل کے قریں لے آنا

کچھ ملے یا نہ ملے اُس در سے
خونِ آغشتہ جبیں لے آنا

آنکھ اُٹھا کر مجھے دیکھیں شاید
ہاتھ میں مہرِ مبیں لے آنا

◆

شہر کا شہر مست خواب میں تھا
رات بھر جا بجا پیچ و تاب میں تھا

تھا کناروں پہ ایک شہر خیال
ایک شہر خیال آپ میں تھا

آنکھ کھولی تو سامنے دیکھا
کو وہ زرتاب میرے خواب میں تھا

شہر آئینہ جھلملانے لگا
مدتوں دھند کے حجاب میں تھا

کوئی بھی لوٹ کر نہیں آتا
اک عجب سحر اس سراب میں تھا

پیڑ پتے پگھل کے بہتے رہے
جانے کیا لمس ماہتاب میں تھا

● "مسعود منزل" بانی ٹاؤن، میرک آباد، شالیمار، سری نگر (کشمیر)



## ظفر اقبال

انگلیاں زخمی ہیں اور پتھر سے ہے رشتہ مرا
نقش ہر دیوار پہ ہے خون کا لکھا مرا

آئینے کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتا ہوں میں
کھو گیا ہے حادثوں کے شہر میں چہرا مرا

کیا بتاؤں میرے اندر کس طرح کا حبس تھا
جسم سے باہر نکل کر آ گیا سایہ مرا

اُس طرف سے جب گذرتا ہوں دھڑکنے لگتا ہے دِل
جانے کیا ہے اُس گلی کے موڑ سے رشتہ مرا

دے کے دستک خوشبوئیں بھی ہو گئیں واپس ظفرؔ
تھیں مقفل کھڑکیاں بھی، بند دروازا مرا

● ۱۰۰ - جیلدار، فتح پور - ۱-۲۶۰۲۱۲ (یوپی)



مشتاق مومن
۲۹۸/۱۹ - مرتجی بھش، سکنڈ فلور، شاستری مارگ، کرلا بمبئی ۷۰

# قبول کرتا ہوں

بظاہر بات بہت معمولی سی تھی،

دوستوں کے ساتھ شام گذار کر وہ حسب معمول گھر لوٹ رہا تھا۔ اس وقت تک تو اس کے ساتھی اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے تھے بس اسٹاپ پر پہنچنے کے بعد اچانک اس نے محسوس کیا کہ جیسے سرد اور گرم لہریں بیک وقت اس کے سینے سے ٹکرا رہی ہیں قدم لرزیدہ ہو لیے اور اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے سامنے کی ہر شئے اپنی جگہ بدل رہی ہے اس میں ذرّہ برابر بھی سکت نہیں تھی وہ بس اسٹاپ پر بیٹھ گیا اور بے دھیانی میں اسٹینڈ کی دیوار کو ناخنوں سے کھرچنے لگا۔ اِدھر سے اور اُدھر سے، نیچے سے اوپر سے۔ چاروں طرف دھند اور کہرے کا راج تھا اچانک کہرے کو چیرتی ہوئی روشنی کی دو سلاخیں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا ------

وین ایک جھٹکے کے ساتھ رکی چند باوردی نوجوان وین سے بلٹ کی طرح برآمد ہوئے اور پھر ایک لمحے میں وہ ان کی گرفت میں تھا دوسرے پل وہ وین کا ایک حصّہ بن گیا۔ اندھا اندھیرا ------ اندر بہت اندھیرا تھا... پھر وین۔ کچھ دیر بعد رکی، دروازہ کھلا اور روشنی کا ریلا وین کے اندر گھس آیا۔ باوردی نوجوانوں نے بغل میں پھندا لگا کر اسے نیچے اتارا اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک گول چبوترے پر پایا چاروں طرف روشنی تھی اور چاروں طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شور بھی بہت بلند ہوتا کبھی مدھم ہو جاتا وہ چپ چاپ کھڑا رہا اس سے پہلے کہ حالات اور ماحول کو وہ سمجھ پاتا ایک سفید پوش اپنی جگہ سے اٹھا اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا کوڑا لٹک رہا تھا۔ مسکراتا ہوا وہ اس کے پاس آیا قبل اس کے کہ اس کے چہرے پر تاثر کا کوئی رنگ جھلکتا شائیں کی سرسراہٹ کے ساتھ کوڑا اس کے بدن کو چومتا ہوا نکل گیا۔

شائیں سڑاک۔ کوڑے نے پھر اس کے جسم کو چاٹا۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ زور سے چلّایا۔ نہیں، مت مارو مجھے۔ میں ایک شریف شہری ہوں۔ شٹ شاں ایک اور... میری بیوی ہے، بچے ہیں۔ مجھے مت مارو۔ وہ چلّاتا رہا۔ پھر لگا جیسے اس کے بدن کے مسامات نے خون اگلنا شروع کر دیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ خون میں اس کا سارا بدن بھیگ پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ پھر نہ جانے کب اسے ہوش آیا چاروں طرف سنّاٹا سائیں سائیں بول رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ہوا اور اندھوں کی طرح اندھیرے میں ہاتھ چلاتا رہا۔ چٹ کی سے بتی جلی، روشنی کونے کھدروں سے باہر بھاگنے لگی اس نے اپنے آپ کو دیکھا پسینے سے اس کا سارا بدن بھیگ گیا تھا اور وہ کمرے میں تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا سب بے خبر سو رہے ٹی وی کے دونوں چینل چپ تھے صرف دودھیا رنگ کا بے اسکرین نظر آ رہا تھا۔ اس نے مٹکے سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلا پیا اور وہیں سے سوچنا شروع کیا جہاں سے اس کی سوچ گئی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کر کے شا گذار کر رات گئے واپس لوٹ رہا تھا۔ نیند اس کے دماغ حاوی تھی وہ تھک کر بس اسٹاپ پر بیٹھ گیا تھا پھر بس کی ہیڈ لائٹس نظر آئی تھیں اس نے بس کو ہاتھ بتلایا تھا بس آ کر رکی و بس میں سوار ہوا اور ٹھیک اپنے گھر کے سامنے آ کر اترا تھا گھر آ کر سو گیا تھا...... اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرا اچھا تو یہ کوئی بھیانک خواب تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرایا، تین دفعہ دائیں طرف تھوکا اور تین دفعہ بائیں طرف اور سیدھے ہاتھ کی کروٹ بدل کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

فجر کی اذان کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی، من ہی من میں لبیک کہہ کر وہ اُٹھ بیٹھا اور ٹیپ ریکارڈ پر قرأت کا کیسیٹ لگا کر بیٹھا جھونکے کھاتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی بیوی کو آواز دی "اٹھو! صبح ہو گئی"، بیوی ہوں کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کروٹ بدل لیتی ہے "ارے اٹھو! ـــ ڈیوٹی پر نہیں جانا ہے؟" ڈیوٹی کے ڈر سے عورت کی آنکھ کھل جاتی ہے وہ ایک بوجھل سی جمائی اور تھکی سی انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور بکھرے بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی کچن میں چلی جاتی ہے۔ بچے بھی اٹھتے ہیں، میکانیکی انداز میں اسکول جانے کی تیاری کرتے ہیں۔

خدا حافظ ممی! خدا حافظ ڈیڈی!

کھٹ، کھٹ، کھٹ

معمول کے مطابق وہ ریڈیو پر خبریں سنتا ہے، اخبار دیکھتا ہے اور اور نہا دھو کر رات کے خواب کا اعادہ کرتے ہوئے باہر جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔

بس کا سفر جھنڈے، جلوس، پوسٹر آفسیٹ کے اور دیواروں پر لکھے ہوئے نعروں کو پڑھتے ہوئے گذر جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے بس اسٹاپ پر اتر کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگتا ہے، اچانک اسے کچھ یاد آتا ہے، رات کی بات، وہ مڑ کر دیکھتا ہے، سامنے والے بس اسٹاپ کو جہاں سے رات اس نے بس پکڑی تھی۔ بیخودی اور بے خیالی میں اس کے قدم سامنے والے بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اچھا تو یہی ہے کہ وہ جگہ جہاں رات میں نے ـــ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے وہ ہنسنے لگتا ہے۔ اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ اس سے دو تین قدم دور ہو جاتے ہیں۔ بس اسٹینڈ کی دیوار کو دیکھتے ہی اچانک اس کی ہنسی رک جاتی ہے ـــ اٹیچی کے سہارے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور غور سے اسٹینڈ کی دیوار کو دیکھنا شروع کرتا ہے ـــ دیوار پر ناخنوں کی کھرونچ صاف طور سے نظر آتی ہے۔ نئے کھرچے ہوئے رنگ کے پیچھے سے پرانا رنگ جھانک رہا ہے اور ایک بھیانک قسم کے نعرے کے درمیان کھرچن موجود ہے، وہ رومال سے کھرچی ہوئی جگہ کو صاف کرتا ہے، شاید کچھ لکھا ہوا ہے، وہ جھک کر غور سے تحریر کو دیکھتا ہے تحریر واضح نہیں ہے مگر صاف طور سے پڑھا ضرور جا سکتا ہے۔

چوہے،

پلیگ،

کوارنٹین

اچانک وہ محسوس کرتا ہے جیسے سرد اور گرم ہوائیں بیک وقت اس کے سینے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اسے لگتا ہے جیسے اطراف کی ہر چیز اپنی جگہ بدل رہی ہے۔ اس کا سر جھکتا چلا جاتا ہے اور بالآخر اسٹینڈ کی دیوار سے لگ جاتا ہے۔

نہ جانے کب تک یہ کیفیت رہی، اچانک اسے لگتا ہے جیسے کسی تیز دھار آلے سے اس کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے اور کوئی ہاتھ اس کی آنتوں کو ٹٹولتے ہوئے، آہستہ آہستہ پیٹ سے نکال رہا ہے اور نکال نکال کر اپنی گردن میں لپیٹتا جا رہا ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے۔

...... ڈاکٹر گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لگائے اس کا معائنہ کر رہا ہے وہ نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھتا ہے، بیوی پاس کھڑی ہے، وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے دلاسا دیتی ہے اور خاموش رہنے کو کہتی ہے، وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے ڈاکٹر اس کی بیوی سے پوچھتا ہے۔

"انھوں نے کیا کھایا تھا؟"

"کیا پیا تھا؟"

"کیا دیکھا تھا؟" "کیا سنا تھا؟" "کیا کیا تھا؟" "کیا کہا تھا؟" "کیا کرنا چاہا تھا؟" وغیرہ وغیرہ۔

پھر ڈاکٹر دوبارہ کہتا ہے۔

"ویسے گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں ـــ پھر بھی پوری باڈی کا چیک اپ تو کرانا ہی پڑے گا"

...... آئینے کے سامنے کنگھی کرتے ہوئے وہ موڈ میں سیٹی بجاتا ہے اور سرگوشی کے عالم میں تھرکتا ہے۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر بیوی کہتی ہے "کہاں چلے؟" "کہیں نہیں۔ بس ذرا ناکے تک جا رہا ہوں"

"کیوں آرام نہیں کرو گے؟" وہ بڑے پیار سے بیوی سے کہتا ہے "میڈم تم نے سنا نہیں کہ..." کمرہ کا قہقہہ سے لگا کر وہ ٹاٹا کہتے ہوئے گھر سے نکل جاتا ہے۔

سڑکیں ویران اور سنسان پڑی ہیں، فٹ پاتھ کے دونوں طرف سوکھے بانس کی سرحد پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ کوچہ و بازار کی نبض رک سی گئی ہے۔ سیکوریٹی والے کھلی سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ بیچ سڑک سے ٹرافک کی اسٹیشن ویگن پیچھے کرین لٹکائے گذر جاتی ہے

چند لمحوں کے بعد دو تین موٹر سائیکلیں زوں زوں کی آواز پیچھے چھوڑتے ہوئے چشم زدن میں آنکھوں کے فریم سے نکل جاتی ہیں، پھر گاڑی آتی ہے اور وہ بڑی تمکنت اور پُروقار انداز میں گاڑی سے اترتا ہے، کیمرے کی بجلیاں چمکنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہ مونا مسکراہٹ کے ساتھ بستی کے دل میں اتر جاتا ہے۔ آہیں، آنسو اور خون بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

"ایک عورت بین کرتے ہوئے اس آدمی سے کہتی ہے " یہ میرے پانچ سال بچے کا کرتا ہے۔ اس پر خون کے چھینٹے اور پانچ گولیوں کے نشان ہیں۔ آپ مجھے بتائیے کیا پانچ سال کا یہ لڑکا۔ لوٹ مار کرنے، فساد کرنے گیا تھا؟۔ آپ مجھے بتائیے۔ "وہ جھک کر فریادی عورت کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور مدھم لہجے میں کہتا ہے: ماتا جی آپ فکر نہ کریں، ایسا لگتا ہے کہ پولیس نے زیادتی کی ہے تو میں ضرور اس کی تحقیق کراؤں گا۔ مجرموں کو اس کی سزا ملے گی ضرور ملے گی۔

ائیرپورٹ پر پریس گفتگو سے پہلے وہ ان سے ملتا ہے۔ "اس اندوہناک واقعے کے پس منظر میں پولس ایکشن کے تعلق سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟"

"پولس نے اپنا فرض انجام دیا ہے"۔؟

وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں جواب دیتا ہے اور آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے دوسرے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگتا ہے —

اچانک گرم گرم تیزابی دھارا اس کے منہ پر پڑتی ہے اور وہ سانس روک لیتا ہے۔

پھر ایک گھونسہ اس کے پیٹ پر پڑتا ہے اور اوہ کی آواز کے ساتھ دہرا ہو جاتا ہے۔ یہ عمل کئی بار کیا جاتا ہے۔ پھر نل سے لگا ہوا ایک پائپ اس کے منہ میں ڈال کر نلکا کھول دیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پیٹ غبارے کی طرح پھولنا شروع ہو جاتا ہے"

"سالا ہمارے خلاف بولتا ہے، تیری تو۔۔۔ لٹکا دو سالے کو الٹا ۔۔۔ اور۔۔۔۔۔" آواز دھیمی ہو جاتی ہے۔ رات گئے لڑکھڑاتے قدموں سے وہ گھر میں داخل ہوتا ہے بالکل چوروں کی طرح، مگر گھر میں سبھی جاگ رہے ہیں۔ بیوی، بچے، پڑوسی، رشتے دار، "کہاں رہ گئے تھے؟"

"کیا ہوا؟۔ کیا ہوا"؟ مختلف آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی ہیں اور وہ سبھوں کو سب ٹھیک ہے کا اشارہ کرتے ہوئے چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا ہے مگر یہ کیا، سب چپ چاپ کھڑے ہیں۔ "اچھا وہ مسکرانا بھول گیا تھا اس لیے۔ وہ ہنستا ہے اور مسکراتا ہے اور بیوی سے کہتا ہے۔ "ارے کھانا نکالو مجھے بھوک لگی ہے" اور پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"۔۔۔بہت ہو گیا اب بس!"

"جی بالکل! اب کچھ کرنا چاہیے"

"کیا کرنا چاہیے؟"

"احتجاج، ستیہ گرہ، بند، مورچہ، دہشت گردی، بائیکاٹ؛ "ہم تحریک چلائیں گے، میمورنڈم شائع کرائیں گے، سماج کی ایسی تیسی۔۔۔۔"

وہ سر جھکا کر اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا ہے۔

"کمال ہے! آج تم چپ چاپ بیٹھے ہو؟ کچھ بولتے کیوں نہیں"

"نہیں میں سن رہا ہوں" وہ سر اٹھا کر جواب دیتا ہے۔

"ہم مقابلہ کریں گے"۔

"مقابلہ کرو گے!! — مگر کیسے؟" وہ اپنے ساتھیوں سے پوچھتا ہے

"بس کریں گے، میں اپنے محلے کے لڑکوں کو لاؤں گا" ایک ساتھی سوڈا واٹر کے کیبنٹ کی طرف دیکھ کر جواب دیتا ہے۔

"ہاں تو پھر۔۔۔۔"

"ہاں بس اب دشمنوں"

"ٹھہرو!" — وہ آہستہ سے کہتا ہے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے ذرا غور سے سنو۔ اس سے پہلے بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور یہ سب تم لوگ بھی کرتے رہے اور کرتے رہو گے مگر اس کا اثر و ثمر تو خیر دور کی بات ہے۔ نتیجہ معلوم ہے اس کا کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟"

"ہو گا یہ یار — میری آنکھ کے تارو، میرے راج دلارو کہ ایک دن تمہیں الٹا لٹکا کے مرچوں کی دھونی دیں گے اور ڈنڈا کریں گے، سمجھے!!"

"سالا ڈر گیا" ایک زور سے ہنستا ہے۔

"چھوڑ یار اس کو یہ پچھاڑ تو عین وقت پر فیل ہو جاتا ہے"

باقی صفحہ ... پر دیکھیے

# عبدالرحیم نشتر

◆

دور تک پھیلا ہُوا ہے دشت سا کوئی نہیں ،
مَیں کسے آواز دوں میرے سوا کوئی نہیں

ہر طرف سے باندھ رکھا ہے صداؤں نے مجھا
منفرد آواز بھی پہچانتا کوئی نہیں !

گھر سے نکلا ہوں تو اک اک موڑ پر سنگِ گراں
دیوتا بن کر کھڑے ہیں ، دیوتا کوئی نہیں

ایک خوشبو تھی کہ جس نے مجھ کو پاگل کر دیا
ڈھونڈتا پھرتا ہوں لیکن پھول سا کوئی نہیں

پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا تک رہا ہوں دیر سے
ڈالیوں میں پھل مرے ہی نام کا کوئی نہیں

◆

دھیان رہے ، رستے لگ جانا پڑتا ہے
گھر سے چلے ہو ، آگے زمانا پڑتا ہے

آنکھوں میں گلزار سجا کر نکلے ہو؟
لیکن رستے میں ویرانا پڑتا ہے

اپنا ہی سر کاٹ ہتھیلی پر رکھ لوں ،
اکثر یوں بھی رن میں آنا پڑتا ہے

بے رنگ و روغن جینا آسان نہیں
جھوٹے سچے خواب سجانا پڑتا ہے

اپنی اپنی لاش اٹھانی پڑتی ہے
اپنا اپنا جشن منانا پڑتا ہے

◆

جیسے تیسے حیات کر جاؤں
آخری موڑ سے گذر جاؤں

موت آواز دے رہی ہے مجھے
اس سے وعدہ کروں ، مُکر جاؤں

ہر طرف اک لکیر ۔ اک کھائی
گھر سے نکلا تھا اب کدھر جاؤں

سانس ٹوٹے تو بزدلی ہوگی ،
وقت کی زد پہ ہوں ، ٹھہر جاؤں

منصفو ! تم مرے گواہ رہو ،
جھوٹ جیتا ہوں جھوٹ پر جاؤں

● دیگھی ہائی اسکول تعلقہ شری وردھن ۔ دیگھی ۴۰۲۴۰۲ مہاراشٹر

شمیم حنفی
بی - ۱۱۴، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی - ۲۵

# اُردو نظم کو ایک نئے اسلوب کی دین

زمانے کی طرح انسان بھی ایک ساتھ کئی موسموں میں سانس لیتا ہے۔ زبیر رضوی کو میں پچھلے بیس برسوں سے جانتا ہوں۔ علی بن متقی سے ملاقات نئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زبیر نے ایک زمانے تک کسی کو علی بن متقی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی جبکہ علی بن متقی کا سایہ زبیر کی اپنی شخصیت سے کہیں زیادہ لمبا ہے علی بن متقی نے جتنی جگہ کی خاک چھانی تھی۔ زبیر کی عمر شاید اس کا حساب نہیں کر سکتی جب ہی تو چلتے چلتے ایک ایسی انہونی اور بڑی واردات ہو گئی۔ لوگوں کو ہوش اس وقت آیا جب علی بن متقی کے نام و نسب کی جستجو انہیں زبیر تک لے آئی، گویا کہ یہ ایک سفر تھا اونچے آسمانوں سے خاک و خطا کی اس وادی کی طرف جس کی حدیں متعین اور معلوم ہیں۔ اس سفر میں وقت اپنا آغاز ایک انجانے نقطہ سے کرتا ہے اور اپنے انجام کی خبر دینے کے لیے اس علاقے سے گذرتا ہے جس پر ہم سب متصرف ہیں۔

پہلے پہل مجھے یقین نہیں آیا زبیر کی شاعری سننے میں اچھی لگتی تھی اس میں کچھ کرشمہ زبیر کے ترنم کا بھی تھا یہ شاعری پڑھنے میں بھی اچھی لگتی تھی اپنی جانی پہچانی کائنات اور اس کائنات کی ترکیب میں شامل ایک مانوس عنصری سادگی کے سبب لہر لہر ندیا گہری سے خشتِ دیوار اور مسافتِ شب تک اس دنیا کے قرینے اور اس میں جینے کے آداب و اطوار کم و بیش ایک جیسے تحیر اور کسی طلسم آمیز تفکر کی غیر متوقع جہات سے عاری، یہ دنیا خود کار بے ساختگی کے ساتھ ہماری اپنی دنیا میں جذب ہو جاتی تھی اور حواس اچانک ضرب کی زد سے محفوظ رہتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ملال یا آسودگی کی ایک لہر آئی اور دل دو پل کو ٹھہر کر گم ہو گئی

مجھے یہ بات معلوم تھی کہ زبیر کا تعلق امروہہ کے ایک ممتاز دینی خانوادے سے ہے امروہہ سے ایک دو بار گذر ہوا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مکاں کے دائرے اور ہر علاقے میں وقت کی حیثیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، طبیعی پس منظر کے ساتھ وقت کی نوعیتیں ہی نہیں اس کے حدود اقتدار بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں وقت کہیں غالب دکھائی دیتا ہے کہیں مغلوب، کچھ آبادیوں میں وقت کا دائرہ پھیل جاتا اور اس کی اڑان کا ساتھ دیتے دیتے آنکھیں ہلکان ہو جاتی ہیں لیکن کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار اس درجہ سست ہوتی ہے جیسے ٹھہراؤ کا گمان ہو، آم کے پرانے باغوں، پرانی حویلیوں، مسجدوں اور امام باڑوں سے لبالب بھری ہوئی امروہہ کی اس بستی میں بھی وقت کی ایک علاحدہ کائنات ہے اپنے عہد کی عمومی کائنات سے بہت مختلف بہت خاموش اور خوابِ آثار۔

زبیر نے اس بستی میں بچپن اور لڑکپن کے کچھ سال گذارے تھے یہاں سے نکل کر حیدرآباد اور پھر دلی میں زندگی بسر کرنا وقت کی ایک نئی کائنات میں سفر کرنے کے مترادف تھا۔ کم عیار آدمی زماں و مکاں کی نئی کائنات میں ڈوب جاتا ہے باطن کی اساس مستحکم ہو تو نئی کائنات سے وابستگی کے بعد بھی پرانے وقتوں کی دنیا سے رشتے منقطع نہیں ہوتے آدمی سطح کے اوپر تیرتے ہوئے بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے اور اپنی پہچان سے غافل نہیں ہوتا، کبھی گم شدہ اس کے لیے موجود کی مثال ہوتا ہے کبھی موجود غائب کی مثال یہ ایک بھول بھلیاں سی صورت ہوتی ہے جہاں راستے یاد نہیں رہتے، ذہن کی تختی پر کوئی نشان مرتسم ہوتا ہے تو یہ کہ سفر کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں کوئی الجھن نمودار ہوتی ہے تو اس بات کی کہ کس طرف جانا تھا اور کدھر آ پہنچے۔

پرانی بات ہے، سلسلے کی تمام نظمیں اسی لیے مجھے اپنے ماضی و حال میں ایک ساتھ پیوست دکھائی دیتی ہیں یہ ایک نیا اور نامانوس اسلوب تھا۔ تجدد پرستی کے پیدہ شدہ ان تمام اسالیب کے مقابلے میں جو اپنی تکرار کی بنا پر پرانے ہو چکے تھے، اس معاشرے میں جہاں رات دن کی غلام بن چکی ہو اور وہ ساری کہانیاں جن کا رشتہ رات سے ہے ایک ایک کر کے آنکھوں سے اوجھل ہوتی جاتی ہوں، انھیں اپنے حافظے کے حوالے سے ازسرِنو دریافت کرنا، اپنی ذات میں سفر کرنا ہے، اس اعتبار سے زبیر کی یہ نظمیں بہت شخصی یا اس عہد کے محاورے کے مطابق وجودی ہیں کہ ان کے واسطے سے اثبات اپنے نفس کا ہوتا ہے یا اس کائنات اصغر کا جو بے حد و حساب پھیلی ہوئی کائنات بس ایک ننھی سی اکائی ہے مگر وجود کی کائنات معین اور محدود ہوتے ہوئے بھی چہار سمتوں میں پھیلتی جاتی ہے بشرطیکہ خود نگری حواس کا آسیب نہ بن جائے اور اپنے ہونے کا شعور گرد و پیش کی دنیا سے لاتعلقی کا بہانہ نہ بن جائے مجھے اسی لیے شاعری یا تخلیقی اظہار کے حوالے سے شخصی یا غیر شخصی واردات میں کوئی بڑا تصادم نظر نہیں آتا، شخصی تجربہ اتنا وسیع المعنی ہے کہ نہ جانے کتنے غیر شخصی تجربے، احساسات، مظاہر اور مناظر آپ ہی آپ اس میں جذب ہو جاتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی حافظے کے اعتبار سے تہی اور بصیرت کے لحاظ سے ضعیف نہ ہو۔

ٹرلنگ نے کہا تھا ماضی کا احساس حال کی تخلیقی سرگرمی کے لیے ایک بنیادی قوتِ متحرکہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ احساس ہمیں اپنے حصار سے رہائی کی راہ دکھانے کے علاوہ ہمیں اپنی شخصیت کے غیب اور موجود، معلوم اور نامعلوم حصوں سمیت ہمارے ہونے کی خبر بھی دیتا ہے ایسا نہ ہوتا تو زبیر کی یہ نظمیں میرے لیے مسئلہ بنتیں۔ دوستوں کی آپ بیتی میرے لیے اسی صورت میں دل چسپ ہوتی ہے جب بہ حیثیت سامع یا قاری میں اپنے حواس کی وساطت سے اس تجربے میں شریک ہو سکوں ورنہ تو پھر اچھی سی اچھی کہانی بھی بالآخر اکتاہٹ کا احساس پیدا کرنے لگتی ہے۔

پرانی بات ہے، سلسلے کی پہلی نظم سامنے آئی تو ایک انوکھی کیفیت سامنے لائی، یہ ایک وسیلہ تھا زبیر سے آگے ان چہروں تک رسائی کا جو گم ہونے پر بھی اپنی موجودگی کا اور ایک طرح کے مستقل روحانی خسارے کا احساس دلاتے ہیں۔ ایک ہیبت، تشدد، مہلک انحطاط حس کی حدوں افراط کے ساتھ ساتھ ایک پورے اجتماعی تجربے، ایک تہذیب اور اقدار و افکار کے ایک پورے نظام کے گرد پھیلی گئیں، نظموں کے اس سلسلے کا بنیادی موضوع ہیں، یہ نظمیں حال کے ملبے سے رینگتی ہوئی نکلتی ہیں۔ ماضی کی سمت جاتی ہیں پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ آتی ہیں، آخری نظم کا قصہ جو اس پُرپیچ و پُراسرار کہانی کا اختتامیہ بھی ہے اور قصہ گو کے انجام کا اشاریہ بھی، حال کی متلاطم سطح میں جذب ہوتے ہوئے زمانوں کے حشر سے پردہ اٹھاتا ہے، گویا کہ کہانیوں کا دور ختم ہوا اب ان کی جگہ ان حقیقتوں نے پاؤں جما لیے ہیں جن کی کہانی کبھی آئندہ لکھی جائے گی۔

صاحبو
تم اپنی نیندیں بستروں پر چھوڑ کے آنا
میں کل کی شب تمہیں
اپنے سلف کا
آخری قصہ سناؤں گا
جگہ کو تھام کر کل رات تم چوپال پر آنا
وہ شب بس آخری تھی
گاؤں کی چوپال پوری بھر چکی تھی
رات گہری ہو چکی تھی
حقے ٹھنڈے ہو گئے تھے
لالٹینیں بجھ گئی تھیں

گاؤں کے سب مرد و زن
قصہ گوئی کی راہ تکتے تھک گئے تھے
دور تاریکی میں گیدڑ اور کتے
مل کے نوحہ کر رہے تھے
دفعتاً بجلی سی کوندی
روشنی میں سب نے دیکھا
قصہ گو برگد تلے
بے حس پڑا تھا
اس کی آنکھیں
آخری قصہ سنانے کی خلش میں جاگتی تھیں
پر زباں اس کی کٹی تھی
رات وہ بس آخری تھی
قصہ گو کا اَن کہا
اپنے سلف کا
آخری قصہ لبوں پہ کانپتا تھا !

ستائیس[۲۷] راتوں کے اندھیرے میں روشن چہرہ کہانیوں کے اس سلسلے کے مرکزی کردار قصہ گو کا ہے، یہ زبیر کا اپنا چہرہ ہے۔ سا رنگ [ کراچی فروری ۱۹۶۲ء ] کے شمارے میں "صحرا صحرا گلشن گلشن" کے عنوان سے زبیر کا ایک مضمون اور پھر "پرانی بات ہے" والی نظموں کے حوالے سے زبیر کے بعض بیانات میرے سامنے ہیں۔ وہ ذات کی آسودگی جو مجھے اس مضمون میں یا نظموں کے ہر سلسلہ بابت زبیر سے بات چیت میں دکھائی دی اگر یہ نظمیں لکھتے وقت بھی زبیر پر مسلّط ہوتی تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نظمیں تباہ ہو گئی ہوتیں شاعری کے واحد متکلم چاہے آپ بیتی کے بیان کا بہانہ ہو اور اس صیغے کے استعمال سے فرضی بات بھی خواہ کتنی ہی سچی کیوں نہ محسوس ہو ذرا سی بے احتیاطی اس معاملے میں شاعر اور شاعری دونوں کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ ان نظموں میں علی بن متقی زبیر کی اپنی ذات پر تو ہے۔ لیکن زبیر سے الگ وقت کے ایک دوسرے منطقے پر کھڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ خود زبیر کی ذات اور علی ابن متقی کے وجود میں ہم آہنگی کی کئی شہادتوں کے باوجود ایک دوری در آئی ہے ان نظموں میں یہ دوری ایک طرح کی فنی حکمتِ عملی کی حیثیت رکھتی ہے، قرب بُعد کا احساس پیدا کرتی ہے اور شخصی واردات کو بھی ایک غیر شخصی واردات کا آہنگ عطا کرتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہاں شاعر کی اپنی ہستی زیادہ سے زیادہ ایک تماشائی کی ہے۔ علی بن متقی بھی ہر چند کہ تماشائی ہے لیکن مجموعی طور پر اس تماشے میں شامل ہے جس کے قصے ز نے نظموں کے اس سلسلے میں پروئے ہیں۔ "پرانی بات ہے" سے شروع ہوتے ہی ہر قصہ حقیقت کی بساط سمیٹ دیتا ہے اور ہمیں ان واقعہ کی طرف لے جاتا ہے جن کے گرد گذری ہوئی ساعتوں کی دھند پھیلی ہوئی ہے، یہ گذری ہوئی ساعتیں گم شدگی اور موجودگی کے فرق کو حقیقت ٹھہراتی ہیں کہ گذر جانے کے باوجود ان کی حرارت ابھی ختم نہیں ہوئی اور زبیر کے حواس کی سرزمین ان سے ابھی بھی آباد ہے سچ تو یہ ہے کہ گذری ہوئی ساعتوں کا طلسم جیتی جاگتی کہانیوں، واقعات، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ واضح تاریخی حوالوں کو بھی تاریخ کے دا سے نکال کر تخیل کی غیر معین غیر محدود اور مبہم سطح تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زبیر نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے عہا سچائیاں ہیں ان سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں، کچھ اس لیے کہ یہ سچائیاں ابھی مستحضر نہیں ہوئی ہیں اور ہمارے حال یا حاضر کی مجموا

واردات کا قصہ ہیں، کچھ اس لیے کہ زبیر نے نئی سچائیوں کے اظہار اور انکشاف کا وسیلہ بھی پرانے علائم اور استعاروں کو بنایا ہے۔ "سوادِ ترق کا ایک شہر"، بنی قدوس کے بیٹے کا نوحہ، "پانی کی بشارت"، اصحابِ گریہ اور حسن بن کوزہ گر کی سوداگری، بنی عمران کے بیٹے اور ان کے مویشیوں کے قصے، نسب زادوں کی مہمات، پھر گورکنوں کی کہانی، یہ ہیں طلسماتی فضا کے وہ تار و پود جہاں دو ٹوک سچائیاں کہانیاں بن گئی ہیں۔ ان کہانیوں کا مجموعی تاثر زوال کا ہے جس نے ماضی و حال کی حدیں ملا دی ہیں کل اور آج ایک ہو گئے ہیں۔ زبیر کا شاعرانہ ادراک اسی لیے روحانی خسارے کے احساس سے بوجھل ہونے کے باوجود اس احساس کی ہلاکت سے محفوظ دکھائی دیتا ہے یہاں زبیر نے اپنے ادراک کا دفاع بڑی ہوشیاری کے ساتھ کیا ہے۔ زبان، لب و لہجہ، بیان کے اسالیب، علائم اور استعارے، تاریخی حوالے اور واقعات سب کے سب بظاہر سادہ لیکن سیال سطح پر قائم ہیں اور اپنی دور بینی کے باوجود ایک طرح کی معروضیت کا تاثر باقی رکھتے ہیں۔

بنیادی اعتبار سے یہ کہانی مشرق کی ہے وہ زوال جو ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے اس کے تناظر میں مشرق و مغرب کا امتیاز بے معنی ہے تاہم ان نظموں کے حوالے سے یہ بات یوں اہم ہو جاتی ہے کہ زبیر نے اپنے تجربے کی دریافت اور اس کا اظہار فطری سیاق میں کیا ہے۔ نوحے، مناجاتیں، وضو کے لوٹے، محل سرائیں، کنیزیں، خدام، چوپال، الاؤ۔ الاؤ کے گرد دور دور تک پھیلا سناٹا، کبوتروں کی آواز اور ان کے پروں کی سہما دینے والی پھڑپھڑاہٹ، ان نظموں میں رنگوں کی صورت سامنے آتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہر رنگ کی ایک مخصوص منطق ہوتی ہے اور ایک منفرد، ذہنی، جذباتی اور تہذیبی فضا اگر اس سے تیار ہونے والی تصویر کا تناظر شاعر کے ذہن میں پہلے سے واضح اور روشن ہو، زبیر نے اس معاملے میں قیاس آرائی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے اور پہلی ہی نظم میں علی بن متقی کا تعارف اس طور کروایا ہے کہ ہم ایک فرد ہی نہیں اس فرد کی اپنی ہستی سے وابستہ کائنات اور اس کائنات کی مخصوص اور منفرد روح سے بھی متعارف ہو جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ نظمیں ایک لمبی داستان کا بدل ہی نہیں اس کا اشاریہ بھی ہیں کیوں کہ زبیر نے یہ داستان نظموں کے واسطے سے سنائی ہے جن میں جتنا کچھ کہا جا سکا ہے اس سے زیادہ اَن کہا رہ گیا ہے اور وہ جو اَن کہا رہ گیا ہے اس کے لیے علی بن متقی کی واپسی ضروری ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ زبیر کے حواس، ادراک اور تخیل کی کمند کیا ایک بار پھر اس انوکھے انجان اور اسرار آمیز منطقے تک پہنچ سکے گی جس کی تہہ سے علی بن متقی کا ظہور ہوا تھا؟؟!۔

یہ نظمیں ہمارے عہد کے طرزِ احساس اور فکری ضابطوں کے ساتھ ساتھ خود زبیر کے لیے بھی ایک چیلنج بن گئی ہیں۔ ❁

زبیر رضوی

# تیرگی میں جاگتی مخلوق

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
عجب وہ رات تھی
چاروں طرف کہرے کی چادر تھی
نظر کچھ بھی نہ آتا تھا
صدا کے لب سلے تھے
دور تک آہٹ نہ تھی کوئی
وہ ایسی رات تھی جو ختم ہونے میں نہ آتی تھی
مکیں سارے گھروں میں قید تھے
ان کے دلوں پر ایک نیلا خوف طاری تھا
رگوں میں خون جامد تھا
مکینوں نے ہرے طاقوں میں رکھے
آسمانی سب صحیفوں کے ورق کھولے
عذابوں کے وہ سب ابواب
اک اک کر کے پڑھ ڈالے
جہاں منحوس راتوں کا بیاں تھا
اور قیامت خیز راتوں کے جہاں آثار لکھے تھے
مگر اس رات کا کوئی بیاں اُن میں نہ مل پایا
مکیں سب آبدیدہ ہو گئے
اور پھوٹ کر روئے

سُنا ہے پھر مکینوں نے
حکیموں کی وہ سب نادر کتابیں کھول کر دیکھیں
جنھوں نے نوعِ انساں کو رموزِ آگہی بخشے
مگر وہ سب کتابیں بھی
طلوعِ صبح کا مژدہ نہ دے پائیں
مکیں پھر آبدیدہ ہو گئے
اور پھوٹ کر روئے
اچانک اک کرن
کہرے کی چادر چیر کر نکلی
گھروں کے اندھے آنگن میں اُتر آئی
مکیں خوش تھے کہ اب کچھ دیر میں
سورج کے ہاتھوں قتلِ شب ہوگا
مگر سورج نہیں نکلا
مکینوں کے دلوں پر پھر سے نیلا خوف طاری تھا
رگوں میں خون جامد تھا!! ■



اُس نے گھر چھوڑ کے شاید یہی سوچا ہوگا
اجنبی شہر میں کوئی تو شناسا ہوگا

دوسرے شخص کے ہمراہ کہاں جاؤ گے
راستوں پہ مری آواز کا پہرا ہوگا

اس دلاسے پہ مرے موندلیں آنکھیں اس نے
اب کے جو خواب بھی دیکھے گا وہ سچا ہوگا

وہ سدا پھول سے موسم میں ملا تھا اُس نے
شاخ سے ٹوٹتے پتوں کو نہ دیکھا ہوگا

اس کے رونے کا سبب جان لیا ہے ہم نے
چاندپانی کے کٹوروں میں نہ اُترا ہوگا

وہ بھی میری ہی طرح جاگا ہوا لگتا ہے
رات گھر اس کا بھی سیلاب میں ڈوبا ہوگا

شب کی دیوار میں روزن ہی نہیں تھا کوئی
کیسے دیکھیں وہ کِس انداز سے سوتا ہوگا

شہ نشیں تھا جو ہر اک بزم ہر اک محفل میں
اُس کو معلوم تھا اک روز وہ تنہا ہوگا

میں جو بچھڑوں تو بچھڑ جانے کا غم مت کرنا
دِل کو افسردہ کبھی آنکھ کو نم مت کرنا

کچھ بھنور مجھ کو بھی پانی کے سَفر میں دینا
اے ہَوا شورشِ امواج کو کم مت کرنا

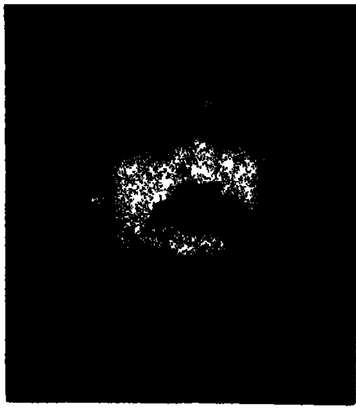
اُس کو چھولوں تو سہی اُس کا قصیدہ لکھ لوں
اُس سے پہلے مرے ہاتھوں کو قلم مت کرنا

اک شبستاں ہے بہت وصل کی راحت کیلئے
دوستو تم کبھی آباد حَرم مت کرنا

کل نہ ہو یہ کہ ترس جائے ہنسی کو چہرہ
خود کو اس طور سے وابستۂ غم مت کرنا

ہجر کے چاند نے اک بار کہا تھا یہ زبیر
دامنِ دِل پہ کوئی نام رقم مت کرنا

سی - ۳۱۲ ، منٹو روڈ کمپلیکس ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



طارق سعید
۶۴۵ - اردو باغ، بسری منڈی فیض آباد - ۱ (یوپی)

# گوتم نیلمبر

انسان کی تلاش میں گوتم نیلمبر سے کتابوں میں شرفِ نیاز حاصل ہوگیا۔ میں نے اس سے پوچھا،
"اے احمق! تو دن کی روشنی میں چراغ لیے کس شئے کا متلاشی ہے؟"
"انسان کا" گوتم نے کہا۔
"انسان؟ وہ تو بھیڑیوں اور حیوانوں کے دیس سے کب کا چلا گیا، تو نہ ملنے والی شئے کا متلاشی ہے"۔
میں نے کہا۔ "ہاں! میں اسی شئے نایاب اور اسی مقصود تخلیق کائنات کا خواہاں ہوں جو کہیں چلا گیا ہے اور
آرزو بھی ایسی شئے کی کیا جو آسانی سے دستیاب ہوجائے"۔
اس نے کہا۔
"مقصود تخلیق کائنات" میں نے استعجاب وسکتہ کے عالم میں پوچھا۔
"ہاں" اس نے کہا۔[1]

میں اپنی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن گوتم کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میری باتوں پر کان دھرتا۔ اس کو ابھی نہ جا۔ کتنے میل چلنا تھا اس نے چلتے چلتے شاید یہ بھی بتایا تھا کہ اسے آگے ایک آگ کا دریا عبور کرنا ہے۔ اس دریا کو عبور کر کے شا. وہ پورا آدمی جس کا وہ متلاشی تھا، سے نیاز حاصل کر سکے۔

انسان کیا ہے؟ اوڈی پس ایٹ دی کالونس یا اوڈی پس دی کنگ۔ ارسطو کا ہنسنے اور بولنے والا حیوان ہے یا ڈراؤن کا بندر۔ فرائڈ کا جنسی شیطان ہے یا مارکس کا جدلیاتی و مادی حیوان، انسان میکادل کے نظریے کی مثال ہے یا انسان اشرف المخلوقات۔ انسان ایک آگ کا دریا بلکہ بلاخیز سیل رواں ہے جس سے آگ تو آگ، بے پناہ پانی بھی موجود ہے زہر تو زہر۔ زہر ہلاہل کے ساتھ بھی دستیاب ہے۔ اور سنگ تو سنگ گہر کا ذخیرہ بلکہ پہاڑ اس کے سینے میں موجود ہے۔ لگتا ہے انسان ایک "اجتماع الضدین" خل ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے بلکہ وہ ایک محیّر العقول تخلیق ہے جو اختلافات و اتحاد، انحراف و اتفاق، انقلاب و انجماد، اجتہاد و انتشا تخریب و تعمیر اور تجدید و تنقیص کی وحدت سے تکمیل پائی ہے اور جس کی گداز جمالیاتی موشگافیوں میں آنسو بھی ہیں اور تبسم بھی کرب ہے اور طرب بھی اور رسانیں، دھڑکنیں اور ترنگیں بھی ہیں۔ اور حبس، گھٹن اور خاموشیاں بھی گویا "انسان سے پیدا آہنگ بہشت" مدلی ہے اس کی شخصیت شش جہتی ہے۔ اس کا سوز ساز ہے ساز آگ، آگ دریا ہے دریا رواں ہے، روانی مسلسل ہے، تند مائل بہ ارتقاء ہے۔ ارتقاء ہر لحظہ متحرک ہے۔ حرکت اپنی صورت گری کی مکمل و اکمل تشکیل نو میں مصروف ہے اور صور کا ایک نمونہ "انسان" ہے اور انسان کامل کی مثال نوح و آدم ہے۔ انسان جس کی روشن جبیں، خوش دل، گرم اختلاط اور رسا ہے۔ نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز کا مالک ہے۔ لذت کردار کے ساتھ افکار عمیق اور حسن و جمال کے ساتھ جلال کی، کلیمی کا بھی محافظ ہے۔ جس کی طبع بلند ستارے کی طرح روشن زندگی سراپا سوز، زندگانی مہتاب سے تابندہ تر ہے اس کے سو

---

، دلوں کی کھیتیاں سر سبز ہوتی ہیں اور اس کی کشتِ فکر سے عالم سبزہ زار اُگا رہا ہے ۔ آج آسمان اس کی خد مقدس پر شبنم افشانی رہا ہے ۔

دوسری صدی ہجری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ سیستان و رخج کے فرماں روا نے جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا بنی امیہ کے عمال کو راج دینا بند کر دیا ، پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا ۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لیے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا "وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے ۔ ان کے پیٹ فاقہ دوں کی طرح سٹے ہوئے تھے پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور وہ کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے"
کہا گیا وہ تو گذر گئے ۔ رتبیل نے کہا ،

اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے ۔ مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور تقریباً نصف صدی تک وہ آزاد رہا[2] دراصل رتبیل نے انسان کے متعلق دریافت کیا تھا اور جب چلا چلا کر کہا تھا " لوگوں اس آدمی کو ان درندوں سے بچاؤ " پھر کوئی زور سے ہنسا ۔ یہ کون ہے جو ہزاروں سال قبل صلیب پر لٹکے آدمی کو بچانا چاہتا ہے ؟ بھلا اب تک وہ زندہ ہو گا[3] کیا اب وہاں جھاڑیاں ہیں ، پتھر ہیں اور کچھ نہیں جیسے ان جھاڑیوں اور پتھروں کے کانٹوں اور نوکوں نے اسے نگل لیا ہو اسے وہاں نہ پا کر تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوتے کہ وہ آدمی کہاں گیا جو ان جھاڑیوں میں پھنسا بیٹھا تھا[4] یہ سوچ کر گوتم تیلمبر آگے بڑھ جاتا ہے ، اس نے چندر گپت سے بھی ملاقات کی جس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے ، جس کا پایۂ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے ، جس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوف زدہ ہیں[5] اور جس نے معدنیات ، بازار ، نہریں ، آب پاشی ، شفا خانے ، مالیات ، تجارتی گودام ، باغات ، محصول ، دیوانی ، فوج داری ، طلاق ، شادی ، وراثت کے قوانین ، تعلقات عامہ ، امورِ خارجہ ، دفاع ، چراگاہوں ، اور قصاب خانوں کے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں[6] لیکن گوتم اس سے اس لیے مطمئن نہ ہو سکا کہ اس نے اپنے پایۂ تخت اور انسان پر انسان کی حکومت قائم رکھنے کے لیے ناکام سوداگر ، حجام ، نوکر چاکر ، طوائفیں اور کما ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے ، سارے ملک میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے ۔ جو برہمن اپنے علم کے ذریعہ روزی نہیں کما سکتے[6] جاسوسی کو اپنا پیشہ بنا سکتے ہیں پھر اس نے مشہور زمانہ سکندر وقت ویر ارجن سے ملاقات کی " یہ ارجن بھی خوب شئے تھے " ...... سب سے پہلے انہوں نے دروپدی سے بیاہ رچایا ۔ پھر جب بارہ برس کی بن باس انہیں ملی تو دوسری کرشن کی بہن سبھدرا کو بھگا لے گئے[7]

گوتم مہا بھارت کی ان شخصیتوں کو بے بنیاد یا اپنے خواب کا فتور قرار نہیں دے سکتا تھا کیونکہ یہ سارے کردار جنگ جو ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھے ۔ ان کو دماغ کا وہم یا عقل کی تشکیک بھی نہیں کہا جا سکتا ، یہ تاریخی شخصیتیں تھیں حتیٰ کہ نیم الوہی ہی کردار بھی صیحم تھے جن کی دیوی لکشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی اور جن کی چٹانوں سے گنگا بہتی تھی[8] لیکن یہ تاریخی کردار ، یہ شاعر ، صورت گر اور فلسفی جنگ جو کیسے ہیں جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے ، اور اگر کچھ سوار نہیں ہے تو پیدل بھی نہیں ہے[9] یہ سوچ کر گوتم آگے بڑھ گیا ۔ اس کی ملاقات کبیر سے بھی ہوئی جس نے گوتم کو اپدیش دیتے ہوئے کہا سہ

ہے ملنی تو کاہے کمہلانی      تیرے نال سرودر پانی
جل میں اپیت جل میں واس      جل میں ملنی تو رنواس

دھیان گیان کی یہ وانی میاں گوتم کے دل میں بھی گھر کر گئی ۔ لیکن جل میں نواس کرتے کرتے جب وہ تھک گیا اور شانتی اس کے ہاتھ نہ لگی اور اس کے اندر کا جل بھی بہہ چلا اور وہ خود اپنی نظر میں ہی حقیر نظر آنے لگا ، اور اس کی تشنہ کامی حد درجہ فزوں ہو چلی تو اسے یاد آیا کہ یہ ذکر نیم شبی ، یہ مراقبے ، یہ سرود کی راتیں مجھے میری خودی سے دور کہیں تاریک غار ظلمات میں لے جا رہی ہیں ۔

پھر اس نے تزکیہ نفس کا یہ طریقہ جو چاشت، اشراق، تہجد، نوافل، ذکر و فکر، شغل، مراقبہ، دھیان گیان بلکہ ایذائیں جسمانی او نفی خودی پر وقت کر رکھا تھا، سے کنارہ کشی اختیار کیا اور اس کے کاندھے پر یہ "چُنیاں بیگم" جو ویدک دور سے بدھ تک او شنکر اچاریہ تک، صوفیائے کرام سے کبیر اور جدید دور تک سوار تھی، زمین پر دے مارا، کیونکہ گوتم نے کرشن سے ہی سیکھا تھا کہ انسانوں کو کام نہ کرکے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے[10] ہر شخص کو اپنے کرم کا پھل بھگتنا ہے۔ ایک انگلی بھی اگر کٹ جائے تو اس میں بھی کرم کا ہی فلسفہ رہتا ہے[11] اب گوتم نیلمبر میں "سردار نداد دست در دست یزید" کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ وقت کی تسخیر کے لیے خورشید پر کمندیں ڈالنے کے ضمن میں منصوبے تیار کر رہا تھا۔ وہ دنیا میں تنہا پرند تھا۔ وہ آفتاب کے مانند جو سمندروں میں ڈوب چکا ہے، انسان جو اسے جان جائے، موت پر سے گزر جائے گا[12] یہاں تک کہ زمین اور آسمان، چاند اور تارے سب اس کے بڑھتے قدم سے لرزاں ہیں۔ ویدک دور سے جدید دور تک کے مسافر گوتم نیلمبر کا سفر ابھی مکمل نہیں ہوا کیونکہ یہ قدرت الٰہی ہے کہ کم تر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند درجہ کی چیزیں پیدا کر رہی ہے، مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے، اس کے بعد نباتات پھر حیوانات اور حیوانات میں بھی پہلے کمتر درجہ کے حیوانات پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے، یہاں تک کہ بلند ترین نوع کی مخلوق یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بہ حیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے۔ یعنی موجودہ نظام عالم بہ حیثیت مجموعی ناقص ہے[13] لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظام عالم ہونا چاہیے جو اس سے کامل تر ہو[14] گوتم کو بارہا صدائے کن فیکون کی آوازیں سنائی دیتی اور وہ سوچتا کہ شاید ابھی کائنات ہی اپنے سفر کی تکمیل میں مصروف سفر ہے، تبھی تو نا تمام ہے، گوتم جو دنیا کا تنہا پرندہ ہے اس بستی کا آخری آدمی تھا جس نے وقت کی تسخیر کی آخری کوشش کی تھی۔ اس نے سعادت حسن منٹو سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے تقسیم سن رکھے تھے، اس لیے وہ ہوشیار ہو گیا کہ زندگی کی آگ کے دریا میں وقت سب سے اہم ہے جو ندی ہے بلکہ دریا ہی بہتا ہوا وقت۔ وہ جانتا تھا کہ دریا سے برابر آوازیں اٹھ رہی ہیں اس کی موجیں جب کبھی مضطرب ہوتیں تو جنون کی آگ میں بھڑک کر چیختیں۔ مجھے پہچانو! میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا، تمہارا خیال تھا۔ کم لمحے اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ لیکن تمہارا یہ خیال غلط تھا۔ مجھے دیکھو مجھے جانو! میں جا رہا ہوں پل پل چھن چھن پردوں کے پیچھے، تہہ در تہہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں، مجھے پہچانو! میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا ..... میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا ..... دراصل تمہارے سارے فیصلے، سارے ارادے میری دسے پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس ظالم وقت کے تیز دھارے نے گھاٹ پر چمپا کے پھول سے مزین زلفوں والی کیسری ساری میں ملبوس دوشیزہ سے دو گھڑی آنکھ بھی ملانے نہ دیا تھا جب کہ گوتم کا دل بے قرار تھا۔ لیکن وقت نے اس کو اتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ نظروں سے ہی لکشمی کا دیدار کر سکے دریا میں اس کے ہاتھ پاؤں غوطہ زن تھے اور وہ موجوں سے برسر پیکار تھا اس کا سفر طویل تھا اور آگ طویل ندی بھی۔ بحد تیز رفتار تھی۔ اسکی ہر دم "وقت نہیں ہے" کی آوازیں برابر اٹھتی رہتیں وہ برابر ندی سے نبرد آزما ہے اور وقت پانی کی طرح سرسراتا تیزی سے بہہ رہا ہے جس طرح سبک خرام ندی پُرخطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہونچ کر تند رو ہو جاتی ہے۔ گوتم بھی اس مقابلے میں غوطے لگا لگا کر مسلسل جہاد کر رہا ہے کیونکہ مجاہد ہی کامیاب ہے کیونکہ کرم سے نجات نہیں۔ یہاں تک کہ گوتم کشمکش حیات کے عالم مہیب میں ارتقاء کے منازل طے کر رہا ہے۔ اور بین الاقوامی وقت پر قابو پانا چاہتا ہے[15]

ہمارے ساتھ یہی شرط ہے کہ جو بھی چلے     وہ اپنی تیغ پہ اپنا لہو سجا کے چلے     [لطف الرحمٰن

وقت کی قوت کا ہر شخص قائل ہے سورج جو وقت میں غروب ہوتا ہے اور وقت سے نمودار ہوتا ہے۔ زمین جو وقت سے ہے آسمان جو وقت سے ہے کشتیٔ زیست جو وقت کی مرہونِ منت ہے اور بیداری حیات جو وقت سے ممکن ہے سب وقت کی لامتناہی شرک پر ایڑیاں گھس رہے ہیں لیکن گوتم کے سینے میں ابھی زور باقی ہے وہ برق رفتار اور شرر انگیز ہے اس میں روشنی کی اور بادلوں اور بجلیوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ اسے وقت جلا وطن کر دے وہ بھلا کوئی بابو گوپی ناتھ تھوڑے ہی ہے کہ دھول دھپول

ندگی جیسی بیش قیمت شئے کو برباد کردے۔ وہ ہر وقت جہادِ زندگانی میں مصروف ہے کیونکہ گوتم جانتا تھا کہ "ہر کسی کو اپنا زہر آپ پینا ہوتا ہے" [19] وقت جس نے اس کو بری طرح کچل ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور لاشوں کو پھلانگتا گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا جہاں اس کی ماں تھی جو اس کا زخم دھلائے گی اس کو اپنی گود میں سلائے گی مگر وہ بر وقت گھر نہ پہونچ سکا۔ گھر پہونچتے پہونچتے اسے بیس سال گذر گئے۔ اس کا گھر سنسان پڑا تھا۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا لڑکھڑاتا ہوا شہر سے باہر آہستہ آہستہ میوسے کے باغ میں داخل ہوا۔[20] اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو ارغوانی کر دیا۔ شفاف پانی کی ارغوانی دھارا، کہاں سے کہاں تک پہنچی۔۔۔۔ کیسے معلوم؟ صبح اس دھارا سے اخباروں میں ایک سرخی چھپی "صدرِ جمہوریہ نے بڑے جوش و خروش سے ہولی منائی" ہندوستان شاکیہ منی کی یاد میں بہت رو دیا ہے

سحر گہہ عید میں دورِ سبو تھا ۔۔۔ پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

ہندستان جس نے ویدک دور میں ہوش سنبھالا اور مختلف حملات اور حادثوں کو جھیلتا ہوا آگے کی طرف مائل بہ عروج تھا۔ اس ہندستان میں ان گنت اسرار تھے۔ مذہب، فلسفہ، آرٹ، رسریت، تصوف، ادب، موسیقی۔ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک زبردست عظیم الشان ورثہ تھا۔[21] اور دوسری طرف انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔[19] یہی انگریزی تمدن برطانوی کردار کی علامت ہے۔ ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد باضابطہ طور پر وکٹوریہ امپائر میں شامل ہو چکا تھا۔ ہندوستان جو اپنے آپ میں اکیلا مست تھا اور اپنی مشکلات سے خود دوچار تھا، اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور سیتلا دیوی کا مندر [2] اس ہندوستان کے ایک حصے میں اجودھیا کے راجہ دسرتھ کی دو بیویاں تھیں ایک کا نام کیکئی اور دوسری کوشلیا۔ ہندو پرانو اور دیو مالاؤں کے قصے، مغل بادشاہوں کے قصے، نوابوں کے قصے، جاگیرداروں کے قصے، پھر ان قصوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قصے بھی شامل ہونا شروع ہو گئے۔ پھر عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی ۔۔۔ ۸ اگست ۴۲ء کو کوئٹ انڈیا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ ماضی کے شاکیہ منی کے قدیم ہندی طالب علم جدید دور کے یونیورسٹیوں کے طالب علم تھے، اس بغاوت میں پیش پیش تھے۔ دس ہزار ہندوستانی پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے۔[21] لیکن گوتم نے تو اخباروں میں پڑھا تھا کہ لگ بھگ ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔ پتہ نہیں کیا سچ ہے۔ پریم چند کا خیال ہے کہ تاریخ میں سب جھوٹ اور فریب ہے سوائے نام اور مقامات کے۔ پتہ نہیں کیا سچ ہے شاید یہ سب ظالم وقت کے سبب ہی ہوا تھا۔ کیونکہ زندگی مختلف ادوار میں منقسم ہے اور ہر دور وقت کی جابر اور قاہر سلطنت کی رعایا تھا، ہے اور رہے گا۔ کیونکہ وقت برابر موجود ہے مسلسل ہے ماضی حال ہے۔ حال میں ماضی ہے اور مستقبل بھی[22] وقت کی شعبدہ بازی نے ہر زندگی کو متحیر کر رکھا ہے وقت ندی ہے ندی بہتی رہے گی ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔ ندی کی چھاتی پر ہمیشہ نت نئی کشتیاں اور نت نئے جلوس گذرتے رہتے ہیں اور چاند ندی کی لہروں پر بہتا رہے گا۔[22] چاند ہی کیا ندی پر ایک عظیم الشان طاقت ور دنیا قائم ہے۔[59] لیکن وقت انسان سے انفصل نہیں ہے۔ اور اس لیے گوتم آج وقت ہی کی کشتی پر سوار ہو گیا تھا اگرچہ اس کا کارِ جہاں دراز ہو گیا تھا اور کام بھی تو بہت مشکل تھا۔ "میاں انسان" کی تلاش جس نے نہ جانے کتنے شیطانوں کا جام و سبو توڑا ہے اور جو "زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز" کا نعرہ لولاک باطل کو سنایا ہے۔ گوتم نے دیکھا کہ یہ میکا دلی کے بندے انسانیت کے اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچہ کر کے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ تو وہ احتجاج کے ممبر پر کھڑا ہو گیا کہ احتجاج کے سوا وہ اور بھی کیا کر سکتا تھا ان میں سبھی تو مردان تھے۔ گوتم چیخ رہا تھا "فضا کو دھوؤ، آسمان کو دھوؤ، ہوا کی دھوؤ پھر تحریر کو علاحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے، ہمارے جانوروں کے گلے، ہم خود، خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ دماغوں کو دھوؤ۔[22] یہاں ملک، انسان، نظریے، روحیں، ایمان، ضمیر، ہر شئے تلواروں سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں[23] دلوں پر نفرتوں کا بوجھ ہے دماغ پر آلودگیوں کا انبوہ ہے۔ اور چشم بینا پر موٹے

موٹے لبادے پڑے ہیں۔ حقیقی اصل انسان کہاں ہے؟ سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد وہ کس کا متلاشی تھا وہ کلکتہ، ڈھاکہ، لندن، سلہٹ آسام، پنجاب، مرادآباد، علی گڑھ ہر جگہ گیا لیکن ظلم و بربریت اور خون کی ندیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ لیکن وہ بڑھتا ہی گیا کیوں نہ بڑھتا وقت کے دوش پر سوار تھا ؎

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد　　ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

پھر وہ مہالکشمی کے پل کے قریب دھرنا دینے کے منصوبے کے ضمن میں سوچنے لگا کیونکہ اس کا احتجاج ہر بھرتری کے خیال جو اقبالیات کے قالب میں یوں ڈھلا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کا مصداق بن گیا تھا۔ لیکن اس کے پروگرام بناتے بناتے ذہنی فضا ہموار کرتے کرتے اُسے لو، باتوں باتوں میں وزیراعظم کی گاڑی گئی وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیراعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے۔ اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف ٹنگی رہی ہیں۔ چھ ساڑیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑیاں ہیں۔ ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیا ہے کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑیاں ہیں جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں، ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں، ہماری "پانچ ہزار سالہ تہذیب" کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیراعظم صاحب یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں، تم سے کچھ مانگتی ہیں یہ کوئی بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں یہ کوئی بڑا ملک کوئی بڑا عہدہ کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ کوئی ٹھیکا، کوئی پراپرٹی، یا ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں دیکھیے یہ شانتا بائی کی ساڑی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے یہ جیونا بائی کی ساڑی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے یہ ساوتری کی ساڑی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں، اور جس کے پاس اپنے بچوں کے اسکول کے لیے فیس ہے نہیں۔ یہ گرنیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے۔ اور جس کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے، یہ نئی دلہن کی ساڑی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی ساڑی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کے پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے، تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر نکل اٹھے۔ اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں ...... لیکن وزیر اعظم کی گاڑی نہیں رُکی[24] کاش ان غریب اور مفلس لوگوں کا چراغِ دل "خوف کی سائیکولوجی[25]" میں مبتلا نہ ہوتا اور تیغِ دل پرچم لیے آگ کے دریا میں کود پڑتے اور تمنائے سرفروشی کا سبق پھر سے دہرا دیتے اور شیرِ خدا او رستم کی آرزو کرتے تو یقیناً پھر ساقی کا وہی فیضِ عام جاری ہو جاتا، جو تین سو سال قبل جاری تھا۔ یہ گوتم کی زندگی پر سب سے بڑا نکتہ اعتراض ہے کہ اس نے وزیر اعظم کی گاڑی کیوں نہیں روکی، وہ سینہ سپر کیوں نہیں ہوا اس کی پرواز میں کوتاہی کیوں پیدا ہوئی۔ وہ زہرِ ہلاہل کو زہرِ ہلاہل بہ زبانِ شمشیر قلم کیوں نہ کہہ سکا؟ ؎

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل　　جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

لیکن گوتم تو صوفی و ملا و جادات سے کب کا توبہ مانگ چکا تھا وہ تو پیرانِ کلیسا اور شیخانِ حرم دونوں سے ملاقات کر چکا ہے ان میں لذت کردار ہے، اور نہ ہی لذت گفتار ان کی محفل میں سوز و ساز کا جامِ آتشیں کہاں؟ ؎

حلقۂ صوفی میں ذکر بے نم و بے سوز و ساز　　میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام

کہیں ایسا تو نہیں کہ گوتم نیلمبر کمہار کی اس گڑیا کے مانند پیدا ہوا ہو جس کی رچنا میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہو۔ اور یہی گوتم کی ناکامی کا

ہاں! یہی کہ اس گڑیا نے اپنی رچنا کے دوران کمہار کے وجود سے منکر ہونے کا پاپ کیا اور کمہار نے اسے ادھورا چھوڑ دیا؟ یہ جانتی تھی ..... یہ بے چاری نہیں جانتی تھی۔ کیا نہیں جانتی تھی؟ یہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ ایک آنچ کی کسر کا نتیجہ کتنا المناک ہے۔ ایک آنچ کی کسر آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گوتم مابعد الطبیعات اور مافوق العقل فلسفوں کے میں پھنسا پڑا ہو اس نے ویدک دور سے لے کر زمانۂ حال تک کے سبھی خاص و عام سے حتیٰ کہ جس کا تصور بھی اس نے نہ کیا ملاقات کی تھی۔ پھر اس کو دنیا کے اس طویل و عریض میدان بازار میں انسان کیوں نہ ملا؟ بالفرض اگر ہندوستان کی دھرتی سے انسان کا موتی اسے ڈھونڈ نکالنا ہے تو بنیادی طور پر یہ غلط ہے کہ کیونکہ درویش خدامست نہ شرقی ہوتا ہے نہ غربی اور کا گھر ساری کائنات ہے پھر بھی گوتم کو یہ کیوں نہ سوجھا کہ انسان تو اس کے ہی دل میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ دنیا میں تنہا پڑا ہے۔ آفتاب کے مانند جو سمندروں میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اپنے جان جائے موت پر سے گذر جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گوتم مائل نظری میں الجھ گیا ہو اور اس کے اندر کا شعلہ ماند پڑ گیا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بار بار ناکامی اور تشنہ کامی سے گوتم کا احساس اس ہی دل سے جاتا رہا ہو اور وہ خود بے چشمۂ حیواں کا مصداق بن گیا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ گوتم دارا شکوہ سے بھی گیا گذرا نکلا۔ گرچہ دونوں میں مماثلتیں بہت ہیں۔ دونوں گیانی، فلسفی اور شکست خوردہ ہیں۔ لیکن گوتم کی زندگی میں کوئی لالہ نہیں ہے جب دارا کی زندگی میں لالہ بھی ہے اور شمشیر بھی۔ گوتم نے ہزارہا صدیاں دیکھیں، ہاتھ آیا، سفر اور صفر لیکن دارا نے ایک صدی بھی نہ دیکھی لیکن ہاتھ آیا کنارہ اور تاریخ کا ایک باب، تحریک الف ثانی سے آخری ٹکر اور وہ قلم جس نے تلوار کو ہمیشہ شکست فاش دی ہے افسوس کا مقام ہے، گوتم کی پوری زندگی میں ایسا کوئی قلمی سانحہ دستیاب نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اس کو تیغ چنگیز کے سامنے پیش کر پاتے بلکہ بہت دیدو دریافت کے بعد گوتم کی پوری زندگی میں محض صفر ہی میسر ہو پاتا ہے۔

دراصل گوتم صفر کی حقیقت ہی نہ سمجھ سکا۔ اس کی شخصیت کی بنا ہی غلط پڑی تھی۔ اگر وہ جو دو ہزار برس اور بھی جیا ہوتا تو یقیناً خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اس کا جینا ہی کیا جینا جس کے جیتے رہنے سے کسی چیز میں خلل واقع نہ ہو۔ ایسی زندگی موت کی مترادف ہے اور موت سے انسان کو چڑھ ہے۔ اور انسان کا جوہر، اس کا شعلہ کبھی بھی عدم یا موت سے ہم کنار نہیں ہوتا بلکہ محض ظاہری آنکھوں سے غائب ہوتا ہے۔ گو کہ فراق کی تقدیر جہاد ہے لیکن ایسا بھی فراق کیا جو صفر ہی کو سمجھ بیٹھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن اس نے اوپر نظر اٹھائی تو اس کے سامنے ایک مضبوط ڈنڈا تھا ذرا غور سے دیکھا تو وہ اصل میں بڑی سی سیڑھی تھی۔ اس نے گردن اور بھی اوپر اٹھائی مگر سیڑھی کا اوپری سرا حدِ نظر سے آگے جانے کہاں تک تھا۔ خلا کی وسعتوں کو چیرتی ہوئی یہ سیڑھی جانے کہاں تک چلی گئی تھی۔ جہاں سے وہ نظر آتی تھی وہ محض نقطہ تھا موہوم سا نقطہ یہ نقطہ اس کی طرف آتے ہوئے بڑا ہوتا گیا پھر وہ سیڑھی کے خط و خال میں ڈھل گیا تھا ایک موہوم سا نقطہ نیچے آتے آتے اپنی صورت کھو دیتا یا وہ صورت پالیتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ گوتم کے دل میں سیڑھی جو بے معنی نقطہ تھا پکڑ کر چھو لینے کی خواہش ہوئی۔ اور خواہش بڑھتی گئی اور وہ اوپر کی جانب بڑھتا ہی گیا۔ اسے لگتا کہ کوئی ہے اور یہ سوچ کر وہ چونک پڑتا، لیکن کوئی نہ تھا، ہوتا تو نظر آتا' وہ خدا، انسان یا خود کی تلاش میں تھا لیکن جس چیز کو اس نے ذریعہ سفر بنالیا تھا۔ وہ نقطہ ہی تھا موہوم سا نقطہ۔ اس نے ایک جست لگائی اور اوپر والے ڈنڈے پر آگیا بے انتہا مسرور کن اور مدہوش کر دینے والی لذت تھی۔ ایک دم نئی، انتہائی نشہ آور شئے اور جب وہ انتہائی بلندی پر پہونچ گیا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہ زمین پر چت اوندھا پڑا ہے۔ سیڑھی بھی اوپر وہ نقطہ تھا۔ اور گوتم کے دل کے نہاں خانے میں بھی صرف ایک نقطہ تھا موہوم سا۔ یہ گوتم کے ڈھائی ہزار سال کی کمائی تھی جو اس نے ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے بے کراں سمندر میں چھلانگ لگا کر پایا تھا اس تاریخ کے آتشیں دریا میں نہ جانے کتنے انمول موتی موجود تھے۔ لیکن گوتم بھی عجیب فطرت و طبیعت کا مالک تھا کہ اپنے مالک کی شناخت نہ کر پایا اور ہر کسی کو اپنا امیر تصور کر لیتا گوتم ہر رہ رو کے پیچھے چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ مسلمان بھی نیشلسٹ بھی اور کمیونسٹ بھی بننے کو تیار ہے، فاشیشی اصولوں کو تسلیم کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں مغرب کے مختلف مکتبۂ افکار اور مابعد الطبیعی نظریات کا مقلد ہی

ہیں بلکہ وہ مبلغ بھی ہے، ہندوستان کی کوئی ایسی سیاسی اجتماعی یا تمدنی تحریک نہیں جس میں کچھ نہ کچھ گوتم شریک نہ ہوا ہو۔ اور لطف یہ کہ گوتم کو اپنے اس رویئے کے برے نتائج کا پتہ بھی نہیں۔ گوتم کی زندگی میں ایک برقِ آگیں جہاد اور ایک آتشیں کشمکش انقلاب یقیناً مخفی ہے۔ جس سے اس کی شخصیت میں آفاقیت اور طمانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے طارق بھی گوتم ہے لیکن یہ نقطۂ اتصال وہاں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے جہاں سے گوتم نقطہ ہی کو سیڑھی سمجھ کر آسمانوں کی سیر کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ گوتم نیلہ نہ پیغامبر حق ہے نہ داعی انقلاب۔ اور نہ ہی اس کے بغل میں کوئی کتاب ہے۔ اگر ہے تو محض ایک موہوم نقطہ ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

## حواشی

۱؎ از مثنوی مولانا جلال الدین رومی ۲؎ ماخوذ از ابن کثیر و ابن خلدون ۳،۴؎ پنجرے کا آدمی۔ رتن سنگھ ۵،۶،۷،۸؎ آگ کا دریا ۹؎ رشید احمد صدیقی ۱۰،۱۱،۱۲؎ آگ کا دریا ۱۳؎ کائنات کا خاتمہ چوہے کی موت کی طرح یقینی ہے آگ کا دریا ص ۳۹۹ ۱۴؎ علامہ مودودی ۱۵؎ آگ کا دریا ص ۴۸ ۱۶؎ جوگیندر پال ۱۷،۱۸،۱۹،۲۰،۲۱؎ آگ کا دریا ۲۲-۲۳؎ آگ کا دریا ۲۴؎ مہالکشمی کا پل۔ کرشن چندر۔ ۲۵؎ آگ کا دریا۔ ص ۴۲۱-۴۲۷-۴۵۵-۶۹۵۔
۲۶؎ ایک ٹانگ کی گڑیا ۲۷؎ افسانہ صفر۔ کلام حیدری ۲۸؎ ایضاً۔

بقیہ صفحہ ۲۰ جہنم کا خریدار

"حال دوسرا کیا ہو سکتا ہے، ایک ٹانکا مارتا ہوں تو تیرہ مل جاتے ہیں ۔۔۔ رام پور گیا تھا سیمپل لانے، کل پہنچا دوں گا دفتر میں، ابھی جاؤں گا تو رات کو ہی کہیں جانے کا فرمان تھما دیں گے سالے۔"

میں نے اس کے چہرے اور جسم پر نظریں گھمائیں تو وہ مجھے کسی عالی شان عمارت کے کھنڈر جیسا نظر آیا جو اپنے ماضی کی شان و شوکت کو اپنی آغوش میں چھپانے گونگی سسکیاں لے رہی ہو۔ اسکا یہ حال دیکھ کر میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس سے پہلے ہی اس نے اپنی بات شروع کر دی۔

"انل صاحب! آپ لوگ بہت سی کتابیں پڑھتے ہیں تو کبھی شاستروں کو بھی پڑھا ہوگا۔ شاستروں میں لکھا ہے۔ بھگوان کبھی کسی کے گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ ایک دن پرلے ہوگا۔ بھگوان سب کا حساب کرے گا۔ حساب کے مطابق سب کو اس کا معقول پھل ملے گا۔ پھل! ہاں سورگ یا نرک۔ اوپر والا بھی سالا بہت ہوشیار ہے۔ صرف دو ہی راستے، سورگ یا نرک۔ ادھر یا اُدھر، بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے بجھی ہوئی بیڑی کی طرف دیکھا، انگلیوں میں دبا کر توڑا اور پھینک دیا۔

"میرا بھی اپنا ایک شاستر ہے، اس میں کیا لکھا ہے معلوم؟" اس نے سوال کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ٹھرے کی دکان سے راجہ ہریشچندر بن کر آگیا ہے۔ پھر بھی میں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟"

"حساب رکھنے والا کبھی بھی صحیح حساب چاہتا ہے۔ بھگوان کا حساب رکھتا ہے اسی لئے وہ کسی کو معاف نہیں کریگا، مگر انسان معاف کر دیتا ہے۔ معاف کرنا اسکی فطرت میں شامل ہے۔ میں نے سب کو معاف کر دیا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

چتا کو سجانیوالا شخص لمبے بانس سے کیتو کی کھوپڑی پر وار کر رہا تھا۔ کھوپڑی کے تڑخنے کی آواز آئی تو اس آدمی نے لمبے بانس کو جلتی چتا میں ڈال دیا۔

میں اور لالہ اٹھے، دل ہی دل میں اپنے دوست کو الوداع کہہ کر اُسے اس مقام پر چھوڑ کر واپس ہوئے جس مقام پہ آگے کوئی دوست یا رشتہ دار ساتھ نہیں دیتے۔ وہ جہنم کا خریدار راکھ بننے کے بعد نہ جانے کس سمت بکھر جائے گا۔

اقبال محشر رائے بریلوی

# چراغ

ابتک تمہارے ہاتھ میں اک کھیل تھے چراغ
اب ڈر ہے گھر نہ پھونک دیں بھڑکے ہوئے چراغ
مار سیاہ دیکھ لیں جلتے ہوئے چراغ
وہ دور اب نہیں کہ بجھیں خوف سے چراغ

ان آندھیوں کو وقت کے سینے پہ روک لو
بجھنے نہ پائیں دوستو جلتے ہوئے چراغ
جب آندھیاں چلیں تو کسی کا پتہ نہ تھا
اب پوچھتے ہیں لوگ یہ کیسے بجھے چراغ

یوسیوں سے پُر ہیں جو دل ان کا حال کیا
دیکھے تو ہوں گے آپنے بجھتے ہوئے چراغ
ہم اپنے فرض خاص کی تکمیل کر چکے
یہ کہہ کے صبح سو گئے جاگے ہوئے چراغ

خاموش جب وہی رہے جن کے چراغ تھے
تو پھر ہوائے وقت سے کیا بولتے چراغ
تاریک راستوں پہ ہے دشمن بھی گھات میں
ہے یہ سوال ہاتھ میں اب کون لے چراغ

سب کو دکھائیں راہ یہی ان کا کام ہے
راہی سے ذات پات نہیں پوچھتے چراغ
تو دل کی تیرے نام پہ ہم تو بڑھا چکے
اب گھر جلے کہ شہر جلے یا جلے چراغ

ظلمت جھکا سکی نہ کبھی روشنی کا سر
سورج اُبھر کے آیا ہے جب تھک گئے چراغ
سو بار بھی بجھیں تو جلائیں گے ہم انھیں
محشر ہوا کی ضد ہو تو وہ توڑ دے چراغ

معرفت - وجے اوپٹیکل ہاؤس . گڑیک گنج - سیتاپور (یو-پی)

---

حفظ الکبیر قریشی

کوئی ہمسایہ نہیں بیچ میں دیوار نہیں
ہے کھلا دشت یہاں زیست گرانبار نہیں

زی آنکھوں کا تبسم ہے سراب منظر
ایک اخلاق محض، شوق کا اظہار نہیں

حائل راہ جو دریا ہوں گذرنا ان سے
راہ بر دل ہو اگر ساتھ تو دشوار نہیں

ہر قدم سے ہے نمایاں مری سعئی رفتار
طبع جولاں کے لئے راہ کی دیوار نہیں

اک عجب عالم تنہائی ہے یارب دل پہ
کوچۂ جاں میں نوائے قدم یار نہیں

اک لچکتی ہوئی سرشار شگفتہ ٹہنی
ابھی پھولوں سے مہکتی ہے، ثمربار نہیں

نور ریز رہیں تری نظروں کی شعاعیں جاناں
یہ طلسم شب تاریک کا اسرار نہیں

11, NUR LINGHAM CRESCENT
DON MILLS, ONTARIO (CANADA)
M3 B 2P9




م۔ ق۔ خان

حکیم عنایت کالونی گیا (بہار)


# فیئر فیکس

یہ اس سانحہ کا دوسرا دن تھا جب ایک حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ یہ حادثہ محض اس شخص کی جانفشانی اور فرض شناسی کی وجہ سے ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس لیے میں نے اس گمٹی والے کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ میرے دل میں اس شخص کے لیے نہایت ہمدردی اور احترام کا جذبہ تھا۔ آج بھی اس کے سر پہ نیلے رنگ کی پگڑی تھی اور بغل میں لال اور ہری جھنڈیاں تھیں۔ وہ ڈرائیور سے بات چیت کر رہا تھا۔ ڈرائیور بھی وہی تھا۔ دونوں بات کرتے ہوتے انجن کے عقب میں چلے گئے۔

واقعہ یوں ہے کہ میں گرینڈ کارڈ لائن پر سفر کر رہا تھا۔ دہرہ دون ایکسپریس گیا جنکشن سے قریب آدھے گھنٹے دیر سے روانہ ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پار کرنے کے بعد ہی گاڑی کافی تیز رفتار ہوگئی تھی۔ اور اب تو گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ کہ یک بیک ڈبے کے اندر بھونچال سا آگیا۔ اوپر برتھ پر رکھے سامان نیچے گرنے لگے۔ نشستوں پر بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے یا اوندھے منہ گرے گاڑی یوں تلملا رہی تھی جیسے کانٹے میں پھنسی مچھلی۔ پتہ نہیں یہی عالم تھوڑی دیر اور رہتا تو کیا ہوتا کہ گاڑی ایک زوردار دھکے کے ساتھ رک گئی اور ہماری جانوں میں جانیں آئیں۔

گاڑی رکتے ہی لوگ ڈبوں سے نکل پڑے۔ کوئی گارڈ کی جانب جا رہا تھا کوئی انجن کی جانب دوڑ پڑا۔ ہر شخص کے سر میں بس ایک ہی سودا تھا کہ وہ یہ پتا چلائے کہ کیا ہوا اور گاڑی کیوں رک گئی تھی؟ دیکھتے دیکھتے ریل کی پٹریوں پر میلہ سا لگ گیا تھا۔ انجن کے پاس دھیرے دھیرے بھیڑ بڑھتی گئی۔ کیونکہ گارڈ نے لوگوں کو کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ آخر کار میں بھی انجن کی جانب چل پڑا۔

ڈرائیور لوگوں کے سامنے صورت حال کا پس منظر پیش کر رہا تھا

"میں نے دور سے ہی ایک شخص کو ٹھیک ریلوے لائنز کے بیچوں بیچ کھڑا دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ گاڑی پوری رفتار میں تھی۔ میں نے سیٹی بجانا شروع کیا۔ اس کا اثر میں نے الٹا ہی دیکھا۔ بیچ سے ہٹنے کے بجائے وہ گاڑی کی جانب دوڑتا ہوا آیا۔ وہ برابر لال جھنڈی دکھا رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ ضرور کوئی خطرہ ہے۔ اگر میں فوراً گاڑی نہیں روکتا تو اس شخص کے پرخچے اڑ جاتے اور گاڑی روکنا بھی اتنا آسان یا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے یہ خطرہ مول لیا۔ میں نے پوری ہمت یکجا کی اور بریک کا استعمال کیا۔ ایک منٹ کی بھی دیر ہوتی تو نہ جانے کیا حشر ہوتا؟"

ڈرائیور ابھی رکا ہی تھا کہ گمٹی والے نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ میں اپنی گمٹی کے سامنے بیٹھا لائنز کی جانب یونہی بے خیالی میں دیکھ رہا تھا کہ چند لوگوں کو جو بھالے برچھے اور نہ جانے کون کون سے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ انھیں لائنز کے اوپر کھڑا دیکھا۔ اس کے بعد وہ جھکے اور چند منٹوں کے بعد وہ لائنز سے اتر کر قریب کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں بڑھ گئے۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میری چھٹی حس نے کسی آنے والے خطرے کی بو سونگھ لی۔ آپ جانتے ہیں یہ علاقہ تخریب کاروں کا مسکن ہے۔ آئے دن لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ کسی خطرے کی پرواہ کیے بغیر میں دوڑتا ہوا اس جگہ پر پہنچ گیا، گو یہ میری ڈیوٹی نہیں تھی۔ یہاں آکر مجھے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ کئی فش پلیٹس غائب ہیں اور ساتھ ہی لائنوں کو جوڑنے والے نٹ ڈھیلے پڑے ہیں۔ مجھے اس ایکسپریس کے آنے کا وقت معلوم تھا۔ اب میرے پاس سوچنے کا بھی وقت نہ تھا۔ میں کسی کو خبر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے دیکھا تو یہ گاڑ

ہی تھی۔ مجبوراً میں لائنز کے درمیان کھڑا ہوگیا اور لال جھنڈی ہلانے لگا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ کسی قیمت پر بھی گاڑی کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دوں گا خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

ئے حیرت زدہ اس گمٹی والے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرون اور ان کی زبانوں پر گمٹی والے کے لئے تعریف کے کلمات تھے۔

دی اس منظر کا نقشہ کھینچ رہا تھا کہ حادثہ ہوتا۔ پوری گاڑی ٹ جاتی تو کیا ہوتا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں قرب وجوار میں نہ کہیں زار تھا نہ دور دور تک گاؤں۔ جنگل بیابان کا سا منظر تھا۔ دونوں جانب اسٹیشن کئی میل دور تھے۔ ایک شخص نے بڑھ کر لہا کہ یہ شخص بلاشک تعریف کے قابل ہی نہیں بلکہ انعام واکرام کا مستحق بھی ہے۔ سرکار کو اسے بڑے سے بڑا انعام دینا چاہیئے۔

"حضور ہم جیسے ادنیٰ ملازم کو سرکار انعام واکرام تو کیا دے گی الٹے کیفیت طلب کرے گی۔ آفس کا چکر لگاتے لگاتے اور آفس کے بابوؤں کی خوشامد کرتے کرتے جوتے گھس جائیں گے۔"

ڈرائیور نے گمٹی والے کی تائید میں کہنا شروع کیا۔ "ایک حادثہ ہوتا ہے تو سرکار دنیا بھر کی جانچ کراتی ہے۔ نوکری سے برطرف یا معطل کرتی ہے اور کہیں کوئی قصور ثابت نہیں ہوا تو بھی برسوں تک کے لئے مشاہرے میں ہر سال ہونے والا اضافہ تو ضرور ہی بند ہوجاتا ہے۔ پھر بھی ہم مطمئن ہیں اور ہمارے لئے سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ آپ کی قیمتی جانیں بچ گئیں۔"

"سرکار انعام نہیں دے گی تو کیا ہوا میں اس گمٹی والے کو انعام دیتا ہوں،" اتنا کہتے ہوتے ڈرائیور نے دس روپئے کا ایک نوٹ اس گمٹی والے کی جانب بڑھا دیا۔ گمٹی والے نے روپئے لینے سے انکار کرتے ہوتے سب کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور کہا "آپ کی جان اور آپ کا مال بچ گیا یہی میرا انعام ہے۔"

گمٹی والے کے اندر ایثار وقربانی اور فرض شناسی کا یہ جذبہ دیکھ کر سارے لوگ حیرت میں پڑ گئے اور اس کے انکار کے باوجود لوگوں نے اپنی جیبیں اور پرس خالی کر دیئے اور گمٹی والے پر روپئے اور پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ اور کتنی دیر تک چلتا کہ ڈرائیور نے اعلان کیا کہ وہ گاڑی واپس کر رہا ہے۔ اس نے انجن پر سوار ہوکر سیٹی بجائی۔ لوگ گاڑی پر سوار ہونے لگے۔ لوٹتی گاڑی کے ساتھ چلتا ہوا گمٹی والا لوگوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر سلام کرتا رہا۔ اور آخر میں ڈرائیور کو جھک کر سلام کیا۔ دونوں کے چہروں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

اسی گمٹی والے کو دوسرے دن اسی ڈرائیور کے ساتھ محو گفتگو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں اسی جگہ کھڑا ہوگیا —— اور دوسری جانب غور سے دیکھنے لگا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔

ڈرائیور نے دریافت کیا "کل کتنے پیسے جمع ہوئے تھے؟"

"آپ نے خواہ مخواہ جلدی کردی۔ ابھی تو لوگ پیسے دے ہی رہے تھے" "زیادہ لالچ بری چیز ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کل کتنے پیسے جمع ہوئے؟" "کہاں ہوئے، کوئی ایک ہزار سے دو چار روپئے زیادہ ہوں گے۔" —— "کتنے پیسے ہمارے ہوئے؟" ڈرائیور نے عجلت سے کہا۔

"چار سو آپ لے لیں،" گمٹی والے نے روپئے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"محض چار سو؟ ارے میں گاڑی نہیں کھڑی کرتا تو تجھ کیا ہوتا؟"

"ٹھیک ہے! لیکن یہ سارا کھیل تو ہمارا کھڑا کیا ہوا تھا۔" گمٹی والے نے پچاس روپئے ملا کر ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہی تھے کہ میں ان پر عقاب کی طرح جھپٹ پڑا۔ وہ اس بات کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں نے کہا "میں نے تمہاری ساری گفتگو سن لی ہے میں تم لوگوں کو پولیس کے حوالے کروں گا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "ہمیں آپ جہاں چاہیں لے چلیں لیکن اس کام میں ہم دونوں ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی شامل ہیں اس رقم میں ان کا بھی حصہ ہے، جیسے اسٹیشن ماسٹر، گارڈ بابو اور پولیس"

"تمہیں شرم نہیں آتی، لوگوں کو اس طرح فریب دیتے ہو۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں،" میں نے دھمکی دی۔

"یہ کون سا ایسا اہم معاملہ ہے کہ آپ ایسے کسی فیئر فیکس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہیں تو کچھ پیسے لے لیں اور معاملہ اسی جگہ رفع دفع کریں اور اس نے سو روپئے میری جانب بڑھائے۔

میں جھلایا تو ضرور لیکن خاموشی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔ جب لوگوں کے اخلاق ایسے پست ہوجائیں تو کوئی ذلیل حرکت بھی قابل ملامت نہیں۔



روسی سے ترجمہ
راجندر سنگھ ورما

انّا اخماتووا

# مہمان

میں نہ مانگوں گی تری چاہت کی بھیک
وہ تو آسودہ ہے کب سے زیرِ خاک
اس کی مٹی بیٹھ جانے دو ذرا
مت سمجھ لیجو میں تجھ کو آئے دن
ایسے رشک آمیز خط بھجواؤں گی
جو تری دلہن کا دل برمائیں گے
تاہم اتنا مشورہ تو سُن ہی لے
اس کو دینا میری نظموں کی کتاب
لیٹ کر بستر میں پڑھنے کے لئے
اور مری تصویریں رکھنے کے لئے
شادی تازہ ہو تو ایسی بخششیں
ہوتی ہیں شوہر کی دانش کی دلیل
کیونکہ ایسی سادہ فطرت عورتیں
ہلکی پھلکی اور شیریں گفتگو
اور رسِ ماہِ عروسی کے بجائے
(لذت انگیزی ہے جس کی یادگار)
جان و دل سے چاہتی ہیں جاننا
کہ مکمل جیت ان ہی کی ہوئی

اور جب اپنی نئی دلہن کے ساتھ
تو بتا کر عیش کی کچھ ساعتیں
ایک نفع بخش سودا کر چکے
اور اس پل بھر کی لذت کی طرح
جس سے اکتا جاتے ہیں کام و دہن
تیری رُوح انجام کو پہچان لے
تیں تیں کرتے وقت چلے آئیو مرے
بسترِ خلوت میں پلے کی طرح
میں کہ تجھ سے مطلقاً بیگانہ ہُوں
تیری خاطر کچھ نہیں کر پاؤں گی
عارضہ شادمانی سے ابھی
جانِ من! پائی نہیں میں نے شفا ◆

● گھاس منڈی، تیران والا گیٹ، پٹیالہ (پنجاب)



نصیر پرواز

# اندھو، بہرو... سُنو

اندھو، بہرو — سنو!
تم ہر تب، ہمارے گھروں پہ چھاپے مارتے ہو
ہم نے کاغذ کے کٹوروں میں
محبت بھری نظموں اور گیتوں کی صُورت میں
آنے والے دن کی نذر کرنے کے لئے
جو کچھ رکھا ہوتا ہے،
تم "قومی مفادات کے تحفظ" کے نام پر
ضبط کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہو، اور
پھر اُسے شہر کے چوراہے میں جلا دیتے ہو
لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے، کہ
ہماری نظموں اور گیتوں کو،
تمہارا آگ لگا دینے کا عمل،
انہیں دوآتشہ بنا دیتا ہے
تم اندھے تو ٹھہرے ہی، شاید بہرے بھی ہو
کیا تم کو سُنائی نہیں دیتا، کہ جب تم
ہماری محبت بھری، امن و دوستی کی خواہشوں سے
بھرپور،
نظموں اور گیتوں کے مسودے جلا رہے ہوتے ہو، تو
ہوائیں وہی پیار بھرے گیت اور امن کی نظمیں
گاتی ہوئیں
کوچہ کوچہ، کریا کریا، پھیل رہی ہوتی ہیں ◆

● VAEREBROVEJ, 20-4-3,
DK-2880 BAGSVAERD
COPEN HAGEN, DENMARK.



مشرف عالم ذوقی
بھاریوا روڈ، آرہ (بھوجپور) بہار

# اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے

"میں بیتے ہوئے تمام لمحوں کو سمیٹ کر تو نہیں سکتا
کہ ان میں کچھ لمحے ایسے بھی ہیں
جو اپنے سیدھے تعلق کی بنا پر
میری موت کو آسان بنا دیں گے"

(۲)

خلاء میں دیر تک دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئی ہیں۔ معمولات کے سدھے بندھے اصولوں کا آدمی ہانپ رہا ہے۔ گزرے ماہ و سال سے کتنی یادیں پرالائی ہیں، آنکھیں —— ایک جگہ بیٹھے بیٹھے طبیعت بھی اکتا جاتی ہے۔ یادیں میرے ساتھ ساتھ چھت پر ٹہلتی ہیں۔ میری لمبی لمبی سانسوں میں الجھتی ہیں۔ ہانپتی ہیں اور جب یادوں کی یلغار ایک دم سے مجھے پریشان کر دیتی ہے، شریانوں میں خون کے گرم گرم لاوے دوڑ جاتے ہیں۔ دماغ کی نسوں میں تناؤ آجاتا ہے اور سب مل کر مجھے مجبوط الحواس بنا دیتے ہیں۔ تو اچانک بالکل اچانک چھت پر پاگلوں کی طرح دوڑنے لگتا ہوں... دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگتا ہوں.. دونوں ہونٹ کھلے ہوتے ہیں اور آنکھیں دہشت زدہ ہو کر گزرے مناظر سے نجات چاہتی ہیں اور یادوں کا سکڑا چہرہ تب دیوار کی الگنی پر کسی چمگادڑ کی طرح لٹک جاتا ہے۔ ... !"

لمبی لمبی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آتا ہوں۔ مگر نہیں کوئی نہیں... بے خواب کواڑوں کی طرح مقفل سارے کمرے.. اور اکیلے گھر میں بھٹکتا ہوا تن تنہا صرف میرا وجود... یادیں پھر سے حملہ آور ہوتی ہیں۔" کہ وہ لوگ کہاں گئے جو تمہاری اپنی کہانی کے حصہ دار تھے۔ جو تمہاری اپنی زندہ کہانی کے کردار تھے۔ تمہارے وقت بے وقت کے قہقہے تھے.. مشغولے تھے.. تمہارے شب و روز میں سمائے ہوئے لمحات تھے —— مشکی گھوڑے کی ہنہناہٹ تھم گئی ہے جو یادوں کے حملہ آور ہوتے ہی میرے سارے بدن میں سما جایا کرتی تھی... مگر یادیں... لمبی لمبی سانسوں کو درست کرتے ہوئے پیچھے چھوٹتی جا رہی ہیں۔ اب گھر کے سارے بند دروازے کھولے ہو گئے کہ شب دیجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ پھر مجھ سے سوال کرے گا۔" کہ مجھے لکھ پائے یا نہیں؟

"نہیں؟ تو کیوں نہیں لکھا؟

یا لکھ ہی نہیں سکے ——

تمہارے قلم ٹوٹ گئے۔ کوتے بن گئے۔

دنیا کے بڑے بڑے فلسفوں کو جا بک دست ہاتھوں کی ہتھکڑیاں پہنانے والے میرے معصوم ادیب اپنی ہی کہانی سے ڈر گئے...!"

اور اس طرح کے سوالوں کا ایک طویل سلسلہ۔ سوال جو ڈیڑھ سال سے برابر مجھے پریشان کرتے آرہے ہیں... مگر اب سوچ رکھا ہے اس عفریت کو خود سے الگ ضرور کروں گا۔ لکھوں گا ضرور....

سردی شباب پر ہے۔ لمبی بھاگ دوڑ کے نتیجے نے کھلے آسمان کے نیچے چھت پر مجھے ہانپنے کے لئے مجبور کر دیا ہے.. چھت کی چکنائی سے تلووں کو ٹھنڈک مل رہی ہے۔ اندر بے پسینی سی بے چینی بھر گئی ہے سارے دروازے بند ہیں۔ پورے گھر میں اکیلا ہوں۔ اور یادیں جب شب خون مارنے لگتی ہیں تو.....

"یہ شور کیسا ہے؟" ابا حضور مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

میں حیران حیران سا ابا کو دیکھ رہا ہوں آنکھیں ملتے ہوئے حیرت سے".. آپ! خوشی کے مارے میری آواز نہیں نکل رہی ہے... آپ ہیں... آپ ابھی بھی ہیں۔ شاید بھولنے کی بیماری ہو گئی ہے مجھے۔ ایکدم سے سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ جو ہے اس کے وجود کو بھی... کہ کل تو سارے کے سارے تھے مگر سب اتنی جلد چلے گئے کہ یاد ہی نہیں رہا... اب کون بچا ہے اور کون نہیں.... مگر آپ....!"

"چلو سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے"

"آنکھوں میں نیند نہیں ہے ابّا" حیرت و خوشی کا ملا جلا رنگ میری آواز پر غالب آگیا ہے۔

"نیم شب میں چھت پر دوڑتے رہو گے تو لوگ کیا کہیں گے۔"

بغیر کچھ بولے میں ابّا حضور کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہوں۔ ابّا حضور صرف ایک چھوٹی سی تنبیہہ کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے ہیں۔ "کہ رات کے وقت بالائی منزل کی روشنی مت بجھانا۔ جو دروازے بند ہیں انہیں کھولنا نہیں۔ بند دروازوں کے اندر کی روشنی کو جلتے رہنے دینا۔" اس نے اقرار میں سر ہلا دیا ہے۔ ابّا شام ہوتے ہی گھر کی ساری بتیاں روشن کر دیتے ہیں۔ اور رات کے اندھیرے میں وہ تمام بتیاں گل کر دیتا ہے۔ پتہ نہیں کن جذبوں کے تحت......!

چُپ چُپ ابّا حضور کو جاتے دیکھتا رہا۔ خوشی و انبساط کی لہریں سارے جسم میں دوڑ گئی ہیں۔ میں تنہا نہیں۔ اس ویرانے میں تنہا نہیں۔ ابا بھی ہیں.... مگر آپ نے بند کمروں میں جانے سے منع کیا ہے۔ چُپ چاپ نیچے آکر اپنے بستر پر سو جانے کو کہا ہے... اس سے کیا... ابّا ڈرتے ہیں... رات کے ویرانے میں کمرے میں اندھیرا دیکھ کر شاید روحیں بے چین ہو جائیں کہ گھر والوں نے اب تک غمی اوڑھ رکھی ہے.... رات کا پچھلا پہر، چوکیدار کے گھنٹوں کی آوازسے گونج رہا ہے... ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جسم میں طوفان مچا گئے ہیں۔ میں ایک دروازے کے قریب آکر ٹھہر گیا ہوں... یہ میری امی کا کمرہ ہے... میری امی کا پیارہ کمرہ... اسی کمرے میں سوتی تھی امی... اسی کمرے سے کتنی بار مجھے صدا دی تھی... مجھ پر بگڑی تھی۔ میرے آنسوؤں میں خود بھی شامل ہوئی تھی۔ مجھے مارا تھا۔ پھر منایا تھا... مجھ سے روٹھی تھی۔ غصہ ہوئی تھی پھر خوش خوش مجھے مٹھائیوں سے نوازا تھا... یہی کمرہ! — سہمے سہمے قدموں سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ پھر ایک چیخ میرے منہ سے نکل جاتی ہے... آنکھیں خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ جسم لرزنے لگتا ہے... بستر پر ایک مردہ جسم پڑا ہے امی کا بے جان جسم — اوپر سے نیچے تک چادر سے ڈھکا ہوا۔ اس کے باوجود امی کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے اشارے سے بلا رہی ہیں۔

"منّا، بیٹے ایک گلاس پانی لانا"

"دیکھو... آپس میں شرارت مت کرنا۔ منّو تمہارا چھوٹا بھائی ہے لڑنا جھگڑنا نہیں۔"

امی کی کھلی کھلی آنکھیں چادر سے باہر نکل کر میرے سامنے معلق ہو جاتی ہیں۔ میں دیوانہ وار کمرے سے بھاگتا ہوں... سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے... امی حضور کے مردہ جسم کی زندہ آنکھیں میرے تعاقب میں چھت پر نکل آئی ہیں۔ جہاں میں الجھنوں اور وحشت میں سمایا ہوا لمبی لمبی سانس لے رہا ہوتا ہوں...

خدا کے لئے امی حضور! میری یادوں سے دُور چلی جایئے

"منّا، بیٹے! رات کی تنہائی میں ممتا پھر سسک اٹھی ہے

مولوی صاحب آموختہ پڑھا رہے ہیں... میں رو رہا ہوں ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پڑھتے پڑھتے امی کے پاس بھاگ آیا ہوں چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ چائے بناتی ہوئی امی میری حالت زار پر کھلکھلا اٹھتی ہیں۔ "مولی صاحب کے پاس سے پھر بھاگ آیا۔ مولوی جی مارتے تو نہیں پھر اٹھ کے کیوں آیا... یہ چائے پہنچا دے... اپنے آنچل سے میری ناک پوچھتی آنچل اجلی بھلی بھلی دعائیں میری جانب اچھال دیتی ہیں امی۔ چائے کی ٹرے لے کر دوبارہ مولوی صاحب کے پاس آکر دو زانو بیٹھ جاتا ہوں۔ آموختہ کے سبق شروع ہو جاتے ہیں....

"اللہ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے اس جیسا اور کوئی نہیں...."

"اللہ رہتا کہاں ہے۔"

"تمہارے اپنے دل میں۔ ہر جگہ"

"امی کے یہاں؟"

"ہاں"

"دادی امّاں کے یہاں"

"ہاں"

"نانی امّاں کے یہاں"

"ہاں"

مولوی صاحب اس بچپنے پر مسکرا اٹھتے ہیں۔ میں دوڑ کر دادی امّاں کے پاس آتا ہوں۔ دادی امّاں ایک لمبے عرصے سے بستر کی ہو کر رہ گئی ہیں... گٹھیا کے پرانے حملے نے توڑ دیا ہے... مجھے دیکھتے ہی پوپلے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ "بھاگ آتا ہے پڑھتے پڑھتے دل ہی نہیں لگتا تیرا... جا پڑھ..."

"دادی امّاں خدا کو دیکھا ہے کبھی؟"

"ایسی بات نہیں کرتے۔ مولوی صاحب کیا کہیں گے۔" دادی امّاں ڈانٹتی ہیں۔

بستر سے مکھیاں اڑاتے ہاتھ — پوپلے ہونٹوں کی بڑبڑاہٹ

سب ختم ہو گئی ہے۔ اوسارے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی نانی اماں کے پنکھا ہلاتے ہاتھ مجھے دیکھ کر ٹھہر جاتے ہیں ــــ "منا، مولی صاحب چلے گئے کیا؟ کیا وقت ہوا ہے؟ حسام ابھی تک نہیں آئے... خدا معلوم کہاں رہ گئے"۔

"نانی اماں آپ نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟" میں ٹھہر کر نانی اماں کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔

"پگلے! ــــ" نانی اماں ہنس پڑتی ہیں۔

"تب لوگ کیسے کہتے ہیں"... معصوم بنا دوبارہ مولوی صاحب کے پاس آکر دوزانو بیٹھ گیا ہوں... "اللہ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے۔ اس جیسا اور کوئی نہیں۔ وہی سب سے بڑا بادشاہ ہے..."

سوچتا ہوں۔ معصومیت میں ڈوبے قہقہے اور انجانے طور پر میری جانب اچھالی گئی دعائیں اب کتنے فاصلے پر سمٹ گئی ہیں... اور تب دیکھو۔ الگنی پر لٹکا چمگادڑ سرد ہوا کے تھپیڑوں میں کانپ اٹھتا ہے...

وقت اس قصاب کی طرح ہے جو تیز چھری زندہ جانور کی گردن پر پھیر رہا ہوتا ہے۔ پھر اس کی دل شگاف چیخ سنتا ہے اور اپنی بے حس آنکھوں سے اس کی چھٹپٹاہٹ کا لطف لیتا ہے اور جب جانور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو چھری سے اس کی بوٹی بوٹی الگ کرنے لگتا ہے....

وقت!... بے رحم وقت!!

تو امی حضور کو تو لے گیا۔

مگر اس جسم کو نہ لے جا سکا جو آج بھی اس بند کمرے میں موجود ہے۔ جو دروازہ کھلتے ہی اور مجھے دیکھتے ہی زندہ ہو جاتا ہے۔ پھر میرے پورے وجود میں پیوست ہو جاتا ہے..."

ایک بار پھر سے ہانپنے لگا ہوں...

"میرے گھر کی بزرگ ہستیو! تم سب کہاں چلے گئے؟!"

نیم شب کے سناٹے میں میری پاگلوں جیسی چیخ دُور دُور تک گونج جاتی ہے....

اچانک ہی میرے ہاتھوں میں چمڑے کا بیلٹ آجاتا ہے۔ ایذا رسانی کا بھوت پھر سے مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ گہرے آسمان چھا گئے ہیں۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ پیروں سے چپل الگ کرکے شرٹ اتار کر ایک جانب رکھ دیتا ہوں۔ بوکھلائی ہوئی حالت میں ننگے جسم پر بیلٹ کی بوچھار کرنے لگتا ہوں....

ایک....

دو....

تین... چار... پانچ...

"کچھ ہی فاصلے پر امی حضور کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں میرے پاگل وجود کو تک رہی ہیں..." رات کافی ہو گئی ہے بیٹے۔ چلو سو جاؤ۔ ضد نہیں کرتے۔"

سہمے ہوئے جانور کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ سانسیں اب تک درست نہیں ہوئی ہیں۔ اسی حالت میں بستر پر لیٹ جاتا ہوں... مگر نیند کہاں... بے چینی کی چیونٹیاں کاٹے جا رہی ہیں۔ اور شب دیجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ مجھ سے پوچھ رہا ہے... "مجھے لکھا کہ نہیں... اب تک کیوں نہیں لکھا.. یا لکھ نہیں سکتے کیا؟!"

کیسے کہوں کہ تمہیں ایک ساتھ قلمبند کرنا میرے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اس لئے کہ اپنی کیفیات کے ملبے میں دب کر ترتیب کا راستہ بھول جاتا ہوں... مگر اس کے باوجود تمہیں لکھوں گا... کہ جو اب تک ہوتا رہا ہے اور جو ہمیشہ ہوتا رہے گا... یعنی آنکھوں کا کھلنا پھر ہمیشہ کے لئے بند ہو جانا... ان دو غیر معمولی باتوں کو ہم نے اب تک کتنے معمولی انداز سے لیا ہے.... مگر میرے محسوسات کے صحرا میں اب بھی وہ وحشی گھوڑا ہنہنا رہا ہے جو اچانک مجھ میں داخل ہو کر مجھے بند کمرے سے جھانکتی امی کی لاش دکھا دیتا ہے.. جہاں ڈھکی ہوئی چادر سے باہر نکلی ہوئی آنکھیں مجھے پکارتی ہوئی نظر آتی ہیں ...اس لئے تمہیں لکھوں گا... قلمبند کروں گا...!"

(۳)

زیبا مجھ سے پوچھ رہی ہے ــــ "سوچتے سوچتے تمہیں عجیب نہیں لگتا... ہر وقت سوچتے رہتے ہو۔ کبھی میرے بارے میں۔ کبھی گھر کو لے کر.... اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تم نے جو روز اپنی چمک کھوتی جا رہی ہیں۔"

میں اس کی معصومیت پر ہنس دیتا ہوں... "بس اپنے ہی بارے میں نہیں سوچا زیبا! تم لوگوں کی باتیں اتنا وقت ہی نہیں دیتیں کہ اپنے بارے میں کچھ سوچ سکوں۔ مگر جانے کیوں لگتا ہے... یہ سارے لمحے مجھ سے چھنتے جا رہے ہیں.. دُور ہوتے جا رہے ہیں.. گھر کے لوگ بھی... یہ چہل پہل بھی... اور تم بھی... !"

"ہش"۔ زیبا ہنستی ضرور ہے مگر سنجیدہ ہو گئی ہے ــ "ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم الگ ہو رہے ہیں"

ایسا کل تک نہیں تھا۔ مگر اب ایسا اس لئے ہے کہ عمر جاگ رہی ہے..

اور میں سب کو دُور ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں... ٹھہرو تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں..."

کچھ بولنے سے قبل ہی اُس کے سُرخ ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دیتا ہوں۔ اب یہاں سے کوٹھے کے نیچے ہونے والی باتوں پہ کان لگاؤ —— کیسا شور ہے؟ آپا کھانا پکار رہی ہیں۔ عصمت باجی اور زینت باجی میں کسی بات پر جنگ ہو رہی ہے.. اور ان سے الگ وہ دیکھو... دھوپ کی نرم نرم آغوش میں بڑی اماں اور اماں پلنگ پر بیٹھی ہوئی گپ شپ میں مشغول ہیں.. نانی اماں کسی کو آواز دے رہی ہیں... آواز کیا... خدا کو کوسنے دے رہی ہیں کہ موت ہی نہیں آتی۔ اور ان سے الگ دادی اماں کی تھکی تھکی آواز سُن رہی ہو جو مریم بُوا کو پکارتے پکارتے کھانسی میں تبدیل ہو گئی ہے.."

"ہاں! ـ اس میں کون سی نئی بات ہے؟" زیبا کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"جانے کیوں لگتا ہے۔ کل اگر یہ سب ختم ہو گیا تو کیسا لگے گا.... بہنوں کی شادی ہو گئی اور یہ سارے منظر ایک دم سے جُدا ہو گئے تو یہ گھر کیسا دکھے گا... پُرانے لمحوں کو پھر کیسے سمیٹ پاؤں گا میں... نئے لمحوں سے سمجھوتا کر لیتے میں ہی بھلائی نظر آئے گی کیا؟...."

"ایسے میں نئے لمحوں سے سمجھوتا کر لینا چاہئے۔" زیبا نے سر جھکا لیا۔ "تم بہت سوچتے ہو۔ اچھی بھلی بات کیوں نہیں سوچتے؟"

اچانک ہی اُس کے نرم نرم سے ملائم ہاتھوں کو تھام لیتا ہوں۔ "تم نہیں جانتی زیبا! میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے.. مجھے روکو زیبا.. سنبھالو... پتہ نہیں کیوں.. اپنے آپ سے دُور ہوتا جا رہا ہوں.. تم نے سچ کہا ہے.. اب میری آنکھوں میں وہ پہلے سی چمک نہیں رہی۔ یہ چمک بھی میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے..."

برتن ٹکرانے اور خوش گپیوں کی فضا میں جانے کیسے ایک قطرہ آنسو ٹپک گیا..."۔ میری آنکھوں میں پرچھائیاں اُتر رہی ہیں زیبا! منٹو اسکول گیا ہے اور بھیا کالج —— آنکھوں میں کتنے ہی ڈستے اور چبھتے سوال ہیں جو سانپوں کی طرح میرے اردگرد کستے جا رہے ہیں.... مجھے نجات دلاؤ زیبا.. میرا دم گھٹ رہا ہے..."

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ پریشان ہو گئی ہے۔

"لگتا ہے ایک دن ابھی طرح منوں سوالوں کے بوجھ تلے کچل جاؤں گا۔ تب تم مجھے یاد کرو گی۔"

زیبا اچانک سکتے میں آ گئی ہے۔ آنکھوں کے نیلگوں آسمان پر تیرتی سیاہ کشتی میں آنسوؤں کے موٹے موٹے ڈورے تیر گئے ہیں۔

"میں اکثر سوچتا ہوں زیبا کہ یہ لمحے ٹھہرتے کیوں نہیں۔ ان لمحوں کو جاودانی کیوں نہیں حاصل ہے۔ میں جب جب سوچتا ہوں۔ بڑے حساس پر اُچھالے گئے پتھر مجھے زخمی کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لمحہ بھی جس میں ہم تم سمٹ کر باتیں کرنے میں مشغول ہیں.. یہ لمحہ بھی ہم سے ضرور چھن جائے گا.. یہ بھی ایک بڑا حادثہ ہو گا کہ تم نہیں مل پاؤ گی اور میرے اپنے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیں گے.. یہ بڑا سا گھر.. ہنگاموں میں پلتے پکتے جسم.. دادی اماں، نانی اماں کے پوپلے ہونٹوں سے پھوٹتی آوازیں.. امی اور بڑی اماں کی گپیں.. ابا کے ہر وقت بڑبڑاتے اور قصے کہانیاں کہتے ہوئے ہونٹ، بڑے ابا اور چھوٹے ابا کی سنجیدگی سے نکلا ہوا لمحہ.. ان کے قہقہے،، جن سے لمحے زندگی کی روح میں داخل ہو جاتے ہیں... کل یہ سب کچھ نہیں ہوں گے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ کل کچھ بھی نہ ہو گا۔ نہ ہم نہ تم۔ پھر یہ سب کیا سوچنا۔" زیبا کے لرزتے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا.. "یہ سب کیوں سوچتے ہو؟"

"اس لئے زیبا! کہ میں آج جینا چاہتا ہوں۔ میں ان لمحوں سے فرار نہیں چاہتا۔ سچ کے نام پہ مجھے بیزاری اور گھٹن کا احساس ہے۔ میں ان لمحوں کو سمیٹ کر اور گھر کے تمام افراد کو لے کر —— کبھی ختم نہیں ہونے والی زندگی اور کبھی ختم نہیں ہونے والی دنیا کو تصور کے پردے سے کھینچ لانا چاہتا ہوں..."

میں ایک بار پھر ہانپ رہا ہوں...

میلوں لمبی دوڑ کے بعد تکان کے احساس سے چور ہو گیا ہوں۔

"مجھے سنبھالو زیبا! پرچھائیاں مجھے گھیر رہی ہیں۔ آنکھوں کے آگے دھندلے دھندلے خاکوں کا رقص اب زور پکڑتا جا رہا ہے۔ تم نے کہا تھا میری آنکھوں کی چمک دن بہ دن ختم ہوتی جا رہی ہے.. کیا میری آنکھیں سچ مچ میرا ساتھ چھوڑ رہی ہیں...؟"

"عالم —— زیبا مجھے جھنجھوڑ دیتی ہے —— "اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل بنائے دے رہے ہو! ہوش میں آؤ۔ وحشی دنیا میں انسان بن کر جینا سیکھو۔ آج کی صدی میں احساس اور جذبات کے نام پر تم ایک پل بھی جی نہیں سکتے۔"

میں پھر بیٹھ گیا ہوں —— پسینے میں تر بتر اپنے حیوانی وجود کے سا

یشان پریشان سی زیبا اب بھی ایک ٹک مجھے گھورے جا رہی ہے
"مگر میں ایسا کیوں سوچتا ہوں کہ میں اس بھرے پُرے گھر میں
یلا ہوں۔ تنہا ہوں۔ اور سب کے سب مجھ سے رخصت ہو گئے ہیں۔
سارے دروازے بند ہیں، اور میں ایک ایک دروازے کے اندر جھانک
رہا ہوں جہاں گھر کے مختلف افراد کی نعشیں مجھ سے مخاطب ہیں اور مجھے
گزرے دنوں میں لوٹ چلنے کو کہہ رہی ہیں....

"میں ایسا کیوں سوچتا ہوں تم مجھے بتا سکتی ہو؟"

مگر زیبا چپ ہے... اور آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے...

تو وقت رخصت ہو گیا ہے۔

اور وقت اُس قصاب کی طرح ہے جس نے مردہ جانور کی کتنی ہی بوٹیاں الگ کر ڈالی ہیں....

"زیبا... زیبا.. !!"

آواز بھی دینا چاہوں تو زیبا اپنے دوسرے گھر سے واپس نہیں آئے گی ہاں گزرے دنوں کی ڈاری سے اس کے معصوم قہقہے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوں گے۔ تھکن سے چور ہو کر بند کمرے سے نجات چاہوں گا تو آس پاس کی یادوں کا حملہ شروع ہو جائے گا۔ بھولنا چاہوں گا تو ایذا رسانی کا بیلٹ رات کی دودھیا چاندنی میں پھر سے میرے ہاتھوں میں چمک اٹھے گا اور انجانے طور پر دیکھتی آنکھیں میرے اندر اُس شیطان کو محسوس کر لیں گی جسے میں نے نہ پہچاننے کی قسم کھا رکھی ہے

گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ایک ایک کمرہ بند ہے ... میں تمام کمروں میں جھانک آیا ہوں.. کوئی نہیں ہے۔ بے خواب کواڑوں کی طرح مقفل ... اور چھت پر میری وحشت زدہ آنکھیں دیر تک خلا میں دیکھتے دیکھتے تھک چکی ہیں .. اور پھر ایک نئے منظر کو اپنی گرفت میں لے رہی ہیں.....

لوگوں کے کندھوں پر سوار ــــ چار نعشیں ــــ آخری منزل کی جانب رواں دواں ہیں...

انا للہ و انا الیہ راجعون

آگے آگے :.. دو بوڑھے سر جھکائے ہوئے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے.. پیچھے پیچھے سوگواروں کی بھیڑ... سُرخ سُرخ آنکھیں۔ آگے آگے ابا، بڑے ابا... پیچھے منصور، منو بھائی، جھنو بھائی منجھلا بھیا۔ اور حیران حیران سا پاگلوں جیسا دیکھتا ہوا میں .... بڑی اماں، امی دادی اماں اور نانی اماں تم سب کہاں کھو گئے... کہاں چلے گئے... اب کبھی نہیں واپس آؤ گے کیا..

"گھر کی بزرگ ہستیو!"

الوداع... الوداع....

آخر کو تم نے رخت سفر باندھ ہی لیا...

تمہارے دم سے ہم نے اُجالوں سے تعلق پیدا کیا تھا اور تم ہی یہ گھر بے جان چھوڑ کر جا رہے ہو۔

تار عنکبوت اگر اس گھر کا مقدر ہے تو مقدر رہے... کہ خوشیاں تقسیم کرنے اور دیکھنے والی آنکھیں اب تمہارے بغیر اس ٹوٹتے اُجڑتے گھر میں چونا گردانی نہیں کر سکتیں....

الوداع.. میرے بزرگو! کہ اب اس غریب الدیار کو تمہارے بعد تنہائی سے ہی رشتہ قائم کرنا ہوگا...!!

الوداع الوداع۔ !!

آسمان سب کچھ چُرا کر لے گیا ہے.. کبھی کبھی لگتا ہے زندگی ایک بے زبان مکالمہ ہے جو خود سے کیے جا رہا ہوں...

زیبا اُداس اُداس سی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے...
"جو لوگ وقت سے سمجھوتا نہیں کر پاتے وہ ٹوٹ جاتے ہیں..!"
"ہاں ٹوٹ جاتے ہیں"! جھنجھلاہٹ میں جواب دیتا ہوں۔ کہ اب وہ تار ہی ٹوٹ گیا ہے۔ جو موسیقی کی لہروں کو آواز دیا کرتا تھا۔ اور خالی پن کا عجیب سا احساس مجھے دکھاتا ہے.. اپنے ہی گھر میں زندگی سے جوجھتے ہوئے بڑے ابا کو... اور دوسری طرف محض زندگی کاٹتے ہوئے ابا کو... یعنی دو بوڑھے پیکر اور ان سے علیحدہ ہم... اور حادثوں سے متاثر دکھائی دینے والا میرا چھوٹا بھائی... میرے بھیا.. کیا یہ تمام باتیں چیخ چیخ کر نہیں کہتیں کہ سمجھوتے کی فصل اب دل میں نہیں اُگ سکتی... تغیرات ہر ایک کا نصیبہ نہیں ہو سکتا... اور تم بھی اس قدر دُور ہو گئی ہو کہ کل کو زندہ بھی کرنا چاہوں تو ممکن نہ ہوگا... اور جب جب میں یہ سب سوچتا ہوں.. تب تب یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا سارے کے سارے میری ہی طرح سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو پھر یہ سارے کے سارے جیتے کیسے ہیں؟ کیا وہی ایذا رسانی کا بیلٹ رات کی دودھیا روشنی میں ان کے ہاتھوں میں چمک جاتا ہے.. کیا شرٹ ڈھکی پیٹھ پر اَن گنت زخم رات کے سناٹے میں جاگ جاتے ہیں۔ دکھنے لگتے ہیں... اور وہ شب دیجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ کیا سب سے

ایسے ہی سوال کرتا ہے کہ مجھے لکھا کیوں نہیں... لکھ کیوں نہیں سکتے... تمہارے قلم ٹوٹ گئے ہیں کیا...؟"

تو زیبا چپ ہے...

اور تب دیجور کی الگنی پر لٹکنے والے چمگادڑو!

میں نے تمہیں لکھنے کی حامی بھر لی ہے... اور دیکھو کہ میں تمہیں لکھ بھی رہا ہوں...

اب میری آنکھوں نے پرچھائیوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے... اور گھنیرے دشت میں گم ہوتی جا رہی ہیں... دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال کے کیکٹس نے اپنے نوکیلے کانٹے میرے جسم میں گاڑ دیئے ہیں اور میری دبی دبی دلخراش چیخیں بلند بانگ فضا میں رینگ جاتی ہیں...

"مجھے کچھ نظر نہیں آتا... کچھ دکھائی نہیں دیتا"

دکھائی دینے والو منظرو!

تم سارے کے سارے میرے جسم میں اتر گئے ہو...

اور اب پھر سے میں سورج کی گرم گرم شعاؤں کو اپنے اندر اُتار لینا چاہتا ہوں۔ ہواؤں کا پاگل رقص دیکھنا چاہتا ہوں.. دودھیا چاندنی راتوں میں اپنی پاگل حرکتوں کا لطف لینا چاہتا ہوں.. میرے لوگو! میرے بزرگو!! میرے عزیزو!!! میری زیبا... ٹٹولتے ٹٹولتے اپنا ہی گریبان ہاتھ لگتا ہے اور اسے ہی پکڑ کر میں چیخ پڑتا ہوں..

آہستہ آہستہ مجھ پر غشی طاری ہوتی جا رہی ہے.. اور نیم غنودگی کی حالت میں محسوس کرتا ہوں... ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا ہے.. میرا معائنہ کر رہا ہے.. بڑے بڑے آلوں کی مدد سے مجھے دیکھ رہا ہے اور پھر اپنا حتمی فیصلہ سنا دیتا ہے..." آنکھیں بے حد کمزور ہو گئی ہیں ــــ بے حد کمزور۔ ریٹینال ڈیٹیچمینٹ

آپریشن کرنا ہوگا.. بے حد نازک آپریشن..."

آنکھیں سچ مچ بے حد کمزور ہو گئی ہیں..

اور ایک طویل وقفہ ہوا کے پنکھ پر سوار ہو کر اڑ چکا ہے.. کمزور آنکھوں سے گھر کے سارے بند کمرے جھانک آتا ہوں ــ مگر کوئی نظر نہیں آتا....

کوئی دکھائی نہیں دیتا.. مشکی گھوڑا اندر تیزی سے ہنہنا رہا ہے... نیم شب کے سناٹے میں چھت پر دوڑتا دوڑتا ایک جگہ ٹھہر گیا ہوں...

میرے گزرے دنو!

تمہیں سمیٹنا آسان نہیں ہے...

میں چاند کی دودھیا روشنی میں اشکوں سے غسل کر رہا ہوں...

"بیٹے سو جاؤ... سو جاؤ بیٹے" ــ یہ ابا حضور کی آواز ہے ــ ایک بار پھر نیم شب کی سناٹے میں میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے ہیں

" سو رہا ہوں ابا حضور! مگر آسمان میں اڑنے والی چڑیوں کو وہ کہانی تو سنا دوں جو مستقل مجھے ڈیڑھ سال سے پریشان کرتی آ رہی ہے جب پہلی بار آپریشن تھیٹر میں واقعات کے اتنے گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد جو پرچھائیاں میری آنکھوں میں پیدا ہو گئی تھیں... اور ڈاکٹر انہیں پرچھائیوں کو میری آنکھوں سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا ــــ

تو انہیں پرچھائیوں کی کہانی ابا حضور! میں آج آسمان میں اُڑنے والی اُن چڑیوں کو سنانا چاہتا ہوں...

اب پرچھائیوں کے نکل جانے کے بعد کا میں آپ کے سامنے موجود ہوں اور یہاں میری کہانی ختم ہوتی ہے اور وہ کہانی شروع ہوتی ہے جسے آنکھوں میں اترتی ہوئی پرچھائیوں نے بارہا مجھ سے لکھنے کو کہا تھا ــــ "

(۴)

اور جب آنکھوں میں اترتی ہوئی پرچھائیاں لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ روشنی روز بروز میری آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی تو کہانی [جو آپ کو سنانے والا ہوں] میں مختلف شکلوں میں دیکھتا رہا اور محسوس کرتا رہا ہوں۔ روز ایک ہی کہانی۔ آنکھ لگتے ہی لق و دق صحرا میں بھٹکنے والا وہ تن تنہا انسانی وجود میری آنکھوں میں کھٹکنے لگتا۔ روز ایک ہی قصہ۔ ایک ہی کہانی۔ بچپن میں ابا نے کہا تھا۔ ایک ہی کہانی بار بار دستک دے تو اُسے لکھ لینا چاہئے...

اُسے میں نے جب بھی دیکھا مادر زاد ننگا ہی دیکھا۔ جانوروں کی چیخنی چنگھاڑتی ٹولیوں سے الگ اپنی نسل کا واحد جانور تھا وہ... خواب نے اس کا تعارف پہلے انسان کی حیثیت سے کرایا۔ اس وقت دنیا تو بن گئی تھی مگر صفحۂ ہستی پر انسانی وجود کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اکیلا جانور۔ خواہشات کے ننگے مردہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔ وہ وجود میں کیسے آیا اس کے بارے میں خواب نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید عناصر اربع کے میل سے۔ مٹی، آگ، ہوا، پانی نے اُسے انسانی شکل دے دی تھی۔ کبھی کچھ اپنے منہ سے عجیب

آواز نکالتا۔ [خواب کے بار بار آنے سے میں نے اُس کا ایک نام رکھ لیا تھا "مدا"] ایسا لگتا ہے جیسے مدا اپنی تنہائی کا شکوہ کر رہا ہو۔ کہ سب کچھ تو ہے مگر میری تلاش کو وہ "تُو" نہیں مل سکی جس کے لئے میں دوڑا دوڑا پھرتا ہوں... اور پھر جب اپنا جیسی کسی مخلوق کی تلاش میں وہ ناکام رہا اور تنہائی کا جان لیوا احساس، گھنیرے دشت اور لق و دق صحرا میں دوسرے چرند پرند کی موجودگی میں اُسے پریشان کرتا رہا تو اچانک ہی ایک انوکھے خیال نے اُسے بچوں کی طرح خوش کر دیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خاک سے اپنے ہی جیسی انسانی مخلوق بنائے گا۔ اور نادیدہ قوتوں سے اُن میں زندگی عطا کرنے کی دعا کرے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ مدا اپنے کام میں جُٹ گیا۔ مدت گزر گئی عرصہ بیت گیا اور شاید صدیاں گزر گئیں۔ مدا اپنے کام میں لگا رہا۔ شب و روز کی محنت نے کتنے ہی خاکی پتلے اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر دیے.. یہاں تک کہ ایک دن وہ تھک گیا۔ اور تھکنے کے بعد اچانک اُسے خیال آیا کہ اس کی محنت میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ یعنی کہ پتلوں کے چہرے پر جو خالی گڑھے ہیں، اُن میں آنکھ لگانا بھول گیا ہے۔ پتلے تیار ہو چکے تھے اور مدا تھک چکا تھا۔ اور دوسرے، سارے پتلوں کو ملانا اور خالی گڑھوں میں آنکھ بھرنا پیچ پیچ ایک مشکل امر تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مٹی کی بوٹیوں سے آنکھ کے شکل کی کئی پتلیاں ترتیب دے گا اور پتلیوں کو اُن کی قسمت کے حوالے کر دے گا... مدا پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ وقت بہتا رہا اور پھر ایک لمبی مدت گزر گئی۔ مدا تھک چکا تھا اور اس کی مٹی کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ پس ایک روز مدا نے اپنے کام کو بیچ میں ہی روک کر نادیدہ قوتوں سے یہ دعا کی کہ ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ سارے پتلے اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مٹی کی بوٹیوں سے نکلتی شعاؤں نے لق و دق صحرا کو گلزار بنا دیا۔ لیکن آنکھوں میں جوت نہ ہونے کے سبب پتلے چل پھر سکنے سے معذور تھے۔ مدا نے اُن کی بے چینی دیکھی اور حکم دیا کہ "جاؤ... جا کر اپنی آنکھیں اٹھا لو... خود کو قسمت کے حوالے کر دو۔ اور قسمت کی روٹیاں کھاؤ۔ پتلے تیزی کے ساتھ دوڑ گئے۔ پتلوں کو اپنے درمیان سے روپوش ہوتے ہوئے مدا نے بس اتنا دیکھا کہ اس کے تخلیق کردہ پتلوں کے درمیان ذہنی کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے اور ایک سرد جنگ کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں مگر پتلے پہلے لپکے تھے ان کے حصے میں دو دو

آنکھیں آئیں۔ لیکن بعد والوں کے حصے میں ایک ہی آنکھ آسکی۔ اور جو بالکل پیچھے تھے وہ آنکھوں سے محروم رہے بس مدا اتنا ہی دیکھ سکا۔ پھر وہ گھنے جنگل میں لاپتہ ہو گیا۔

پھر صدیاں گزر گئیں۔ معاً مدا کو خیال آیا کہ اپنی تخلیق کا حشر دیکھنا چاہئے۔ اور پھر وہ ان کی قسمت کا حال دیکھنے نکل گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے دیکھا کہ عالیشان عمارتیں شان سے کھڑی ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔ لوگ بگ برق رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ طرح طرح کی گاڑیوں کا ایک زبردست شور مستقل فضاؤں میں بکھر رہا ہے۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی کہیں ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب کے سب نامعلوم سمتوں میں بھاگے جا رہے تھے...

"ان دوڑتے ہوئے لوگوں کو ہوش ہے کہ نہیں" — مدا نے سوچا ٹھہر کر اُس کو بھی یاد کریں جو ان کی موجودگی کا سبب بنا۔ جس نے انہیں صدیوں کی جان توڑ محنت کے بعد پیدا کیا..." مدا نے اپنے اس خیال کو آواز دے دی۔

اس کی بات سُن کر ان میں سے ایک شخص جھنجھلا کر بولا.. ہم اس طرح کی دقیانوس سوچوں سے دُور نکل آئے ہیں۔ اب ہمارے یہاں اس طرح کی نغویات پر ریسرچ بھی نہیں ہوتی۔ یہ سب پُرانی باتیں ہیں۔

مدا کے دل کو چوٹ پہنچی۔ جس نے بنایا اُسی کے بارے میں یہ خیال.. شاید ایسا ہی ہوتا رہا ہو.. اب وہ ایک آنکھ والوں کی دنیا میں اُن سے ملنے جا رہا تھا۔ اس دنیا میں اس نے دیکھا کہ ترقی تو وہاں بھی ہوئی ہے مگر ایسی نہیں... جیسی کی دو دو آنکھ والوں نے کی ہے۔ اچھے پکے مکانات یہاں بھی ہیں۔ مگر اتنے اونچے نہیں تھے۔ سڑکوں پر گہما گہمی بھی تھی۔ مگر اس دنیا کی طرح نہ تھی۔ لوگ باگ، بھاگ دوڑ میں مشغول تھے... مگر زندگی کی وہ اڑان نہ تھی جو دو آنکھ والوں کی دنیا میں مدا دیکھ آیا تھا۔

"خیر! تم سے باتیں ہو سکتی ہیں۔ مدا نے سوچا... شاید تمہیں اس کا احساس ہو کہ تمہاری موجودگی کا سبب کون ہے؟"

ایک شخص کو روک کر جب اس نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے شکوہ کرنے کے انداز میں مدا کو دیکھا اور کسی قدر غصے سے بولا... وہ جو بھی ہو اُس سے ہم سب کو ایک جیسی شکایت ہے کہ اُس نے ہم پر

ظلم کیا ہے۔ بہت بڑا ظلم ۔ اس نے ہماری ایک آنکھ کو روشنی سے محروم رکھا... ورنہ ہم ترقی میں دو آنکھ والوں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں رہتے..."

مدا پھر سناٹے میں آگیا تھا شاید اسے اپنی پیدا کردہ مخلوق سے اس طرح کے جواب کی امید نہیں تھی۔ اب مدا اپنی اس بدنصیب مخلوق سے ملنے جا رہا تھا جو آنکھوں کی دوڑ میں پیچھے رہ گئی تھی۔

افسوس۔ صد افسوس!

ان کے درمیان آکر مدا کو بے حد رنج ہوا کہ ان کے یہاں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ نہ کوئی گہما گہمی تھی، نہ ہی شاندار مکانات تھے کچھ کچی پکی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں جہاں سر جھکائے کچھ لوگ زندگی کی معنویت سے پرے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ مدا نے اُن کے قریب آکر دریافت کیا... تم میں سے کوئی واقف ہے کہ تمہاری موجودگی کا سبب کون ہے..." ایک شخص نے اپنی خالی گڑھے والی آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا یوں گویا ہوا ....." وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا... نہ ہمیں اُس سے کوئی شکایت ہے۔ مگر وہ جب چاہے ہمارے درمیان آکر بیٹھ سکتا ہے..."

مدا اس بار سناٹے میں نہیں ڈوبا۔ اس بار اُس کے دل کو کسی طرح کی چوٹ نہیں پہنچی۔ اور وہ سچ مچ ان کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا......

صدیاں گزر چکی ہیں اور مدا انہیں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان کی گفتگو کا ایک حصہ بن گیا ہے...."

(۵)

میری کہانی کے ساتھ ساتھ مدا کی یہ کہانی بھی ختم ہوتی ہے کہ آج ایک مدت کے بعد اپنے جسم سے وہ کثیف لبادہ اُتار رہا ہوں جو ڈیڑھ سال سے مستقل مجھے اذیت میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ دونوں کہانیوں میں کوئی قدر مشترک ہو یا نہ ہو لیکن میں سوچتا ہوں.. کہ اگر سچ مچ میری آنکھوں کی چمک نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا میں مدا کو اپنے اندر پناہ دے پاؤں گا!!؟؟

## بقیہ صفحہ ۴۴ قبول کرتا ہوں

ہاں میں فیل ہو چکا ہوں" وہ بش شرٹ کے بٹن کھول کر اپنا سینہ انھیں دکھاتا ہے جس پر نیل فام سپنولے رینگ رہے ہیں دفعتاً سبھوں کے چہروں کے غبارے میں کانٹا چبھ جاتا ہے۔

"تم لوگ اپنا کام کرو، ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ابھی ان لوگوں کی میٹنگ تو شاید شروع بھی نہیں ہوئی۔ میمورنڈم تیار؟"

"یار تم نے تو ڈسٹرب کر دیا۔ اب تم ہی بتاؤ کیا کریں؟" ایک ساتھی قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔

"کر دیار کچھ تو کرو"

"آریا پار" وہ سرگوشی کرتا ہے۔

"آخر ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے" اس کی سن کر ـــــ

اُن میں سے ایک مضحکہ خیز انداز میں گانے لگتا ہے"

فوجی جب گیا گاؤں میں" مگر اب کی بار کوئی نہیں ہنسا۔

وہ پھر سرگوشی کرتا ہے۔ "اپنے وجود کا اعلان کرو۔ کچھ ایسا کہ دسترام، سے۔ سا ڈھاں اور سا دھان سے آگے بڑھ آواز پر سب لبیک کہیں ہم سب اپنے لیے، سب کے لیے.. آنے والی نسلوں کے لیے .... اپنے وجود"۔

اچانک کچھ شور سنائی دیتا ہے۔

سب باہر دیکھنے لگتے ہیں۔

ہوٹل کے دروازے کے باہر ایک وین آکر رکتی ہے۔

وین میں سے مسلح اور باوردی نوجوان بلٹ کی طرح برآمد ہوتے ہیں ہوٹل کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔

مارچ کرتے ہوئے ایک آفیسر اندر داخل ہوتا ہے اور کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر با آواز بلند کہتا ہے۔

"آپ لوگ PAINICKY نہ ہوئیے، گھبرائیے مت، جیسے ویسے ہی رہئے، ابھی ابھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس ہوٹل میں ایک بم رکھا گیا ہے...."

## احترام اسلام

۔ کی کشتی تلے سونے کا ساگر جم گیا
س کی آنکھ میں خواب سکندر جم گیا

دلوں کے درمیاں کیا فاصلہ تھا سوچئے
۔ گئے پربت پگھل کر اور سمندر جم گیا

نعتِ چرخِ بریں محدود ہو کر رہ گئی
ب سروں پر دھند کا سفاک لشکر جم گیا

دیدۂ گریہ سے کیا پھوٹیں شعاعیں خوف کی
پھڑپھڑایا تک نہیں زندہ کبوتر جم گیا

اہلِ دنیا سے مجھے تو کوئی اندیشہ نہ تھا
نام تیرا کس لئے میرے لبوں پر جم گیا

● ۵۴۷ - اہتر سوئیا، الہ آباد
۲۱۱۰۰۳

## جاوید اختر

کچھ بولنا چاہے تو کوئی بول نہ پائے
پاگل سی ہوا جاتی ہوئی شور مچائے

جو گیت پہاڑوں پہ سنا کرتے ہیں طائر
اُس گیت کی لے سینے میں اک آگ لگائے

گرمی ہے کہ گرمی سے بدن آگ بنا ہے
موسم سے کہو آئے ذرا برف لگائے

حیدرؔ کی طرح کون ہے جو دشمنِ جاں کو
بخشش کی دعا دے اُسے مشروب پلائے

کچھ لوگ بضد ہیں کہ وہ تحریر پڑھیں گے
پانی پہ وہ تحریر ہے اب کون دکھائے

● ۳۳/۱ مل خانہ، بحرہ ڈلین، ہوڑہ

## صابر مرزا

جیسے اب ہیں لوگ پہلے ایسے سنجیدہ نہ تھے
زندگی کے رنگ بھی کچھ اتنے پیچیدہ نہ تھے

ہم پہ موسم بھی نہیں تھا سرگراں اب کی طرح
آنکھ جب حد میں نہ تھی جب ہونٹ ترسیدہ نہ تھے

چپکے چپکے سُن رہے تھے جب کی جاں لیوا صدا
ساحلوں کے پیڑ پودے کوئی خوابیدہ نہ تھے

شام کی بے حس دھنیں کیا چھیڑتیں صبحوں کی لے
دور تک پھیلے خلا کے خواب شوریدہ نہ تھے

لکھ چکے تھے موسموں کے رخ پہ اپنا نام سب
جاگتے پیڑوں کے سارے خواب بوسیدہ نہ تھے

کھیلتے رہتے تھے صابرؔ ہم بھی کیا لفظوں کا کھیل
ذہن کے کچے گھروندے جب کہ سنجیدہ نہ تھے

● ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، جموں یونیورسٹی
کنال روڈ، جموں -



ارون کمار
لکشمی نواس، سول لائنز-۲، سلطانپور-۱ یوپی

# اسلحہ بابو

"اسلحہ بابو مر گئے!"

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح کلکٹری میں پھیل گئی۔ سارے ملازم سرپٹ ان کے گھر کی طرف بھاگنے لگے۔ نسیم اور شفیق نے بھی سائکلیں اٹھائیں اور ہجوم کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

"آج صبح ہی انتقال ہوا ہے غالباً۔" شفیق بولا۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے ورنہ دفتر سے پہلے ہی پتہ چل جاتا۔" نسیم نے جواب دیا۔

"ہاں یار اگر پہلے معلوم ہوتا تو چھٹی وقت پر ہو جاتی۔ بیوی بے چاری بہت دنوں سے فلم دیکھنے کی رٹ لگائے ہوئے ہے، آج میٹنی دیکھ ہی لیتے۔"

"ہاں بھئی، میں بھی ٹانگیں پسار کر دھوپ سینکتا۔"

"اب پتہ نہیں کتنی دیر لگے، سلامت دادا بھی اچھے ہیں۔ لیڈری چمکانے کے لئے ہنک دیا سب کو اسلحہ بابو کے گھر کی سمت جیسے ہم کوئی بھیڑوں کے ریوڑ ہوں۔"

"ارے چھوڑو ان باتوں کو۔" نسیم بولا "ہم ان کے رفیقِ کار ٹھہرے، کم از کم تجہیز و تکفین کے وقت ہی پہنچ جائیں، گورستان ان کے گھر سے کوئی زیادہ دور نہیں ہے، دیر تو نہیں لگنی چاہئے۔"

اسلحہ بابو کا جسدِ خاکی لے کر رشتہ دار اور ساتھی گورستان آ پہنچے تھے۔

اب نمازِ جنازہ ادا ہونے والی تھی۔ کفن کا ہی ایک ٹکڑا جا نماز کی صورت میں بچھا کر پیش امام اس پر کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ دونوں بھی صف بستہ ہو گئے۔ تین چار منٹ میں نماز پوری ہونے کے بعد دونوں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ اب اسلحہ بابو کے جسدِ خاکی کو لحد میں اتارنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چار ہٹے کٹے نوجوان اس کام کو پورا کرنے کے لئے آگے آئے۔ ایک نے سر اور دوسرے نے پاؤں کی طرف سے بندھے کفن کے کپڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ بقیہ دو نے میت کی کمر کے نیچے سے کپڑے کا ایک لمبا ٹکڑا آر پار نکالا اور قبر کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ پھر دھیرے دھیرے میت کو نیچے اتارنے لگے۔

"باڈی کافی وزنی ہے۔" نسیم نے کہا۔

"ہاں خود بھی تو تنومند تھے، پھر لاش وزنی ہو بھی جاتی ہے۔" دونوں سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش کھینچنے لگے۔

"اب دیر لگے گی کیا؟" نسیم نے پوچھا۔

"نہیں، اب زیادہ دیر نہیں۔"

"دیکھو یار، ابھی سالے نیچے اتار ہی نہیں پائے۔"

"نہیں اب ختم ہی سمجھو، میں نے بھی اپنے باپ کو دفنایا تھا، میں جانتا ہوں کہ اب زیادہ دیر نہیں۔"

جسدِ خاکی کو اب لحد میں اتارا جا چکا تھا، اور پٹرے بچھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ شفیق نے ڈھیر سا دھواں اگل کر کہا۔

"پٹرے لگ رہے ہیں صاحب، پیسہ ہے! پیسہ بہت ہے۔ میرے باپ کی قبر پر بانس بچھائے گئے تھے۔ پٹرے کہاں سے آتے، کانی کوڑی تو باپ نے کمائی نہیں اور جو میں نے کمائی بھی وہ اس کے علاج میں صرف ہو گئی۔"

"ہاں یار لکڑی بہت مہنگی ہو گئی ہے! جلونی ہی سالی ۵۰ روپے من ملتی ہے۔ پٹرے تو اور بھی مہنگے ہیں۔"

"گاؤں میں تو فوراً چندا ہو جاتا ہے، کسی کے یہاں سے بانس تو کسی کے یہاں سے کچھ، اور مٹی دے دی جاتی ہے، مگر یہ شہر ہے۔ یہاں تو لوگ نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھنا چاہتے کم از کم مرحوم کو کچھ ثواب ہی مل جائے۔"

پٹرے لگ چکے تھے۔ اسلحہ بابو کا بڑا لڑکا کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے پانچ پانچ ڈھیلے ہتھیلیوں میں بھر کر قبر میں ڈالنے لگا۔ لوگ باری باری سے آتے اور ڈھیلے ڈالتے جاتے۔ جب سب لوگوں نے یہ رسم پوری کر لی تو میاں نے پھاوڑا چلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس جگہ مٹی کا ایک ڈھیر کھڑا ہو گیا۔

رات ہو چلی تھی۔ بچے سو رہے تھے۔ شفیق نے اپنی بیوی کو غور سے دیکھا، چارپائی پر ایک گوشے میں بچے کو سینے سے لگائے بے حد معصوم سی لگ رہی تھی۔ سوتے وقت وہ کتنی خوبصورت نظر آتی ہے۔ بے چاری کے پاس ایک ہی

ور وہ بھی بوسیدہ ہو چلا ہے۔ نیا بن جاتا تو وہ اس میں کتنی جچتی۔ شفیق سوچنے لگا بیسوں کی قلت نے ہمیں کتنا کمزور کر دیا ہے۔ ہم ڈھنگ سے جینا بھی بھول گئے ہیں۔ میں تو کبھی کبھی گوشت کھا بھی لیتا ہوں مگر گھر میں اس کی خوشبو اٹھے ایک زمانہ ہو گیا ہے اب تو سب اس کا ذائقہ بھی بھول چکے ہوں گے۔" اس نے بچے کو اس کی ماں کے سینہ سے الگ کیا اور اپنے سینہ پر لٹا لیا۔ "کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اگر کسی طرح اسلم بابو بن جاتا تو کام کافی سہل ہو جاتا۔ تب ہم ڈھنگ سے رہنے لگتے۔ کسی کے یہاں سے چائے کی پتی تو کسی کے یہاں سے شکر مانگنا! کم از کم یہ سلسلہ تو ختم ہو جاتا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی چیز ختم ہوتی رہتی ہے۔ آج کے زمانہ میں چار سو روپلی سے کیا ہوتا ہے۔ یہ کہو کہ اوپر سے دس، پانچ روپے مل جاتے ہیں اور گھر کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی کو ایک بار ڈاکٹر کو دکھا دو تو بس کلیان ہی سمجھو۔ کچھ نہ کچھ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ کل ہی میں پیش کار سے اس کے متعلق بات کروں گا۔"

دوسرے دن صبح شفیق کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ رات بھر وہ سوچتا رہا کہ غالباً کلکٹر صاحب اس کی طرف متوجہ ہوں اور اسے اسلم بابو بنا دیں۔ انہیں خیالات میں ابھرتے ڈوبتے اسے کب نیند آئی پتہ ہی نہ چل سکا۔ جب آنکھ کھلی تو سورج اوپر آن چڑھا تھا اور گھڑی نو بجا رہی تھی۔ اس نے رضائی ایک طرف اچھالی اور اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوئے ناشتہ کیا اور سائکل اٹھائے دفتر روانہ ہو گیا وہاں پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس بج گئے۔ بڑے صاحب کا اجلاس لگ چکا تھا۔ ے کی لحن دار آواز کاری ڈور میں گونج رہی تھی۔

"سعادت حسین بنام رحمت علی!"

شفیق نے اندر جھانک کر دیکھا، کہ صاحب عینک چڑھائے کسی فائل کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔ "آج تو مارے گئے"۔ اس نے سوچا۔ "پیش کار صاحب کو فائلیں خود ہی نکالنی پڑی ہوں گی۔ میں خود اتنی دیر سے آ رہا ہوں۔ لنچ کے وقفے میں آج خیر نہیں"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے سب کی نظر بچا کر بغل کے کمرے میں گھس گیا۔ اجلاس میں بھیڑ لگ چکی تھی۔ وکیل لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے کیاتے اپنے دعوے صاحب کے منہ کے سامنے ٹھونس دیتے اور بحث شروع کر دیتے۔ پکار پر پکار لگتی جاتی اور بھیڑ پر بھیڑ چھٹتی جاتی۔ صحت مند وکیل کے موکل کی شنوائی ہو جاتی اور کمزور وکیل کے موکل کو تاریخ پر ہی قناعت کرنا پڑتی۔ شفیق تذبذب کی حالت میں تھا۔ اگر کہیں صاحب نے سوچا ہو کہ اس کو ہی اسلم بابو بنانا ہے تو آج دیر سے آنے پر وہ اس کا پتہ ہی نہ کاٹ دیں۔ اے میرے خدا! رحم کر! رحم کر!"

لنچ کے وقفے میں صاحب اٹھ گئے۔ اپنے چیمبر میں جاتے وقت ان کی نظر یوں ہی اس کی طرف اٹھ گئی تو وہ دفعتاً گھبرا گیا۔ اس نے سوچا "اب خیر نہیں! ہو سکتا ہے کہ مجھے طلب کیا جائے اور گھر کی راہ دکھا دی جائے۔" لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تو اس کی جان میں جان آئی۔ لنچ کے بعد صاحب نہیں بیٹھے اور انہوں نے باقی مقدموں میں تاریخیں لگانے کی ہدایت دے کر گھر کی راہ لی۔ شفیق کو موقع مل گیا۔ وہ اچھل کر پیش کار صاحب کے پاس جا پہنچا اور اپنی ساری باتیں ان سے کہہ ڈالیں وہ اسے بہت مانتے تھے انہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اسے اسلم بابو بنانے میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

پانچ بج چکے تھے۔ سارے ملازم دھیرے دھیرے شل قدموں سے واپس لوٹ رہے تھے۔ شفیق ابھی تک اپنی اور پیش کار صاحب کی بات چیت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نسیم آیا تو دونوں ساتھ چل پڑے۔ راستہ میں بڑے صاحب کا بستہ باندھے جمعدار اختر علی مل گیا جو رشتہ میں نسیم کا خالو تھا۔ تینوں کلکٹری کے سامنے والی حلوائی کی دکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ شفیق بولا

"اسلم بابو یہاں بہت آتے تھے جب دیکھو برفی کھاتے مل جاتے۔ دیکھ لیتے تو ساتھ بٹھا کر کھلانا نہ بھولتے تھے۔"

"ہاں بھائی! بڑے اخلاق کے آدمی تھے۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے"۔ نسیم نے ٹھنڈا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اب کیا بتاؤں لائسنسوں کی کم از کم پچاس درخواستیں تو زیرِ تصفیہ پڑی ہوں گی۔ کوئی ہے ہی نہیں"۔ اختر علی بولا۔

"کسی کا تقرر نہیں ہونے والا کیا" شفیق نے آہستہ سے دریافت کیا۔ اختر علی نے برفی کا ایک نرم ٹکڑا منہ میں ڈالا اور اسے اندر ہی اندر گھولتے ہوئے کہا

"ارے ہو گی کیوں نہیں! کسی کے فوت ہو جانے سے کام تھوڑے رکتا ہے۔"

"جیسے کلکٹر صاحب چاہیں گے وہی ہو گا" شفیق نے آگے بات جوڑی۔

"کریں گے تو وہی مگر بھیا وہ ہیں موڈی۔ ان کے من کو کوئی نہ جانے"۔ وہ دفعتاً چونک کر بولا، "ارے شفو! اگر تمہاری طبیعت کرتی ہو تو میں صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچاؤں۔"

نسیم نے میز کے نیچے سے خالو کے پاؤں میں ٹھوکر مار کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، مگر وہ اس رو میں بولتے گئے۔

"بھائی اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے، تم ٹھہرے نقل نویس طریقۂ کار سے بخوبی واقف ہو۔ پھر دو پیسے بھی جوڑ سکو گے۔ ایک کلرک کی زندگی کیا مجھ سے چھپی ہے؟"

"ارے چھوڑیے خالو"۔ پھر شفیق کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے آگے بولا۔ "دیکھا جائے گا کہ کس کا تقرر ہوتا ہے۔ ہم تو ٹھہرے فقیر، ہوں گے، ہوں گے، نہ ہوں گے نہ سہی۔"

رات کی تاریکی بتدریج ہر سو پھیل رہی تھی۔ جمعدار نے بستہ سائیکل کے کیریر میں پھنسایا اور صاحب کے بنگلے کی سمت روانہ ہو گیا۔ شفیق اور نسیم نے کانوں پر مفلر کس کر لپیٹا اور اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار ہو گئے۔ راستہ بھر وہ خاموش رہے۔ دونوں اُردو بازار کی بڑی والی مسجد سے منسلک گلی میں رہتے تھے۔ جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی وہاں کئی دکانیں تھیں جن میں بیشتر ڈھابے تھے۔ نکڑ پر عیدو کی پان کی دکان تھی۔ ڈھابوں سے ہر وقت پکتے گوشت کی خوشبو اٹھا کرتی۔ جب دونوں میں سے کسی ایک کی اچھی کمائی ہوتی تو وہ دوسرے کو گوشت کھانے کی دعوت دیتا تھا۔ گوشت کھانے کے بعد دونوں عیدو کے یہاں سے ایک ایک بیڑہ سفیدہ پان منہ میں دابتے اور گھر کی سمت سائیکل دوڑا دیتے۔ آج بھی جب وہ نکڑ پر پہنچے تو نسیم نے جھٹ سے سائیکل روک دی۔

"کیوں بے! کیا ارادہ ہے!" "نہیں یار! آج جی نہیں کر رہا ہے۔"

"ابے چل میں کھلا دیتا ہوں، کیا خوشبو اٹھ رہی ہے!"

"نہیں یار، آج بالکل طبیعت نہیں کر رہی"

"کیا بات ہے بے! آج بڑا اداس لگ رہا ہے!"

"لگتا ہے طبیعت خراب ہو جائے گی، آج ٹھنڈ کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"پان تو کھاؤ گے کہ وہ بھی نہیں۔"

"پان تو کھایا ہی جا سکتا ہے۔"

نسیم نے زور کی ہانک لگائی ،

"ابے عیدو، چار پان پھٹا پھٹ، دیر مت کریو۔"

گھر پہنچ کر نسیم نے کھانا کھایا اور خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے خاموش پڑا دیکھ کر بیوی نے پوچھا۔

"اس طرح چپ چاپ کیوں پڑے ہو، کیا بات ہے ؟"

"کچھ نہیں بیگم! اسلم بابو کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

"جو چلا گیا، سو چلا گیا، پھر اب کہاں تک کسی کو یاد کرو گے۔"

یہ سن کر نسیم نے اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"خالو مجھے اسلم بابو بنوانا چاہتے ہیں!"

"اچھا؟ کیا یہ ممکن ہے ؟"

"دنیا میں بیگم! سب ممکن ہے، سفارش ہو یا پیسہ۔"

بیوی نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا، اور دھیرے سے بولی۔

"تنخواہ بڑھ جائے گی کیا ؟"

"آں ... ہاں! پیسے زیادہ ملنے لگیں گے، ہماری ضروریات جلد پوری ہو جایا کریں گی۔"

اس کی بیوی نے گہرا سانس لیا اور اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں
تب تم سرکاری کالونی میں کوارٹر لے لینا۔ میں یہاں نہیں رہوں گی، و
سبھی اچھے ہوں گے؟ یہاں کے لوگوں کی طرح تو ہوں گے نہیں ؟

"ہاں یہ تو ہے!"

"بجن بی کو ذرا دیکھو! چھی دانت کتنے گندے ہیں، تمباکو کھا کر ہر جگہ پچ کرتی ہیں، اتنی عمر ہو گئی ان کی مگر جہاں دیکھو تہاں غراسہ پنڈلیوں تک اٹھا سے پسر جاتی ہیں، سچ سے مجھے تو اتنی شرم آتی ہے۔ اور وہ عیدو کی عورت ناک کھودتی رہتی ہے، چھی! کتنے گندے لوگ ہیں۔"

نسیم نے اس کی یہ سادگی دیکھی تو اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اسے اندازہ کر وہ مضطرب ہو چلا۔ یوں تو وہ روز ہی پاس تھی مگر جوش و خوشی کے باعث آج وہ سی لگ رہی تھی۔ روز بروز کے جھگڑوں نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کبھی یہ نہیں تو نہیں۔ آج اس کے چہرے کی چمک ہی کچھ اور تھی۔ اچھے دنوں کی امید نے نسیم پر توانائی بھر دی تھی اور دونوں قریب سے قریب تر آتے گئے۔ کچھ دیر بعد اس تو پُر سکون نیند سو گئی۔ لیکن نسیم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی، اسے شفیق یاد "ہو سکتا ہے کہ وہ پیش کار سے سفارش کروائے اور خود اسلم بابو بن جائے۔" ا سگریٹ سلگائی اور ڈھیر سا دھواں اگل دیا۔ "اگر اسے لگ گئی تو میری تو مٹی پلید ہو گی، اسے روکا کیسے جائے؟ ہوں ... بچو کی وہ بات مجھے یاد ہے کہ اسے تو سے نکال دیا جائے گا۔ مجھے اس نے بتایا تھا کہ اس نے اور پیش کار نے ایک ہزا لے کر کس طرح فائل سے ایک کاغذ غائب کیا تھا۔ مدعی کا وکیل ایک درخواست د تھا جسے پیش کار نے بلا فرد احکام میں درج کئے رکھ لیا تھا اور بعد میں انہیں صاحب سے اس پار کر دیا تھا۔ کتنا تڑپا تھا موکل مگر دونوں صاف مکر گئے تھے۔ بتاؤں گا سالے کو بے ایمان کی اولاد۔ اسی دوران اُس نے جو سگریٹ جلائی تھی گئی تھی۔ اس نے ماچس نکالی اور اسے سلگا کر زور کا کش لیا۔ اس نے پھر سو یہ راز کھول کر کہیں میں غلطی تو نہیں کروں گا؟ اس بے چارے کو اپنے باپ کے علا سے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ مگر خدا کی خدائی دیکھئے بے ایمانی کے پیسے کروانے کی وجہ سے اس کا باپ فوت ہو گیا، یہ ہے انصاف، خدا نے اسے سزا ہی دی۔ استغفراللہ! مگر اب بھی سالا رشوت لیتا ہے۔" جب سگریٹ سلگتے سلگتے کی انگلیوں کے پوروں تک پہنچی تو وہ چونک پڑا اور سگریٹ پھینک کر دور نہیں! بے چارہ صرف اپل مدبی تو ہے، پھر اس نے مجھے دوست مان کر ہی بتایا تھا۔ نہیں ... نہیں ... میں اس سے دغا نہیں کر سکتا اس کی نظروں میں حقیر ثابت ہوں گا، مجھے کوئی دوسری ترکیب کرنی چاہئے۔" اس نے رضا تک تان لی۔ رضائی کے اندر نرم نرم گرمی سمائی ہوئی تھی، بیوی کے گدا

نرم و گرم لمس پاتے ہی وہ بے قابو ہو گیا۔ بھاڑ میں جائے سالا شفیق! مجھے تو سلطان اچھا لگتا ہے۔ کس معصومیت سے اپنے خالو سے سب کچھ پوچھ رہا تھا، پیش کار سے کہلوانے کا بھی حقیر ہے سالا، اب پہچان میں آیا ہے۔

دوسرے دن صبح جب شفیق نسیم کو بلانے گیا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ نو بجے ہی کہیں نکل گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا، پھر آج کیا بات ہو گئی۔ اس نے سائیکل اٹھائی اور سیدھے دکان پر پہنچا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ نسیم صبح ہی اپنے خالو کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ شفیق کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ خائف سا ہو گیا کہ کہیں وہ میرا راز فاش نہ کر دے۔ "آج پیش کار صاحب بڑے صاحب سے بات کرنے والے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نسیم اس کے پہلے ہی اس کی چغلی نہ کھا آئے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔" اسے اپنی پشت پر سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی جیسے کوئی کیڑا رینگ رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ تلوے ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اب اس سے پیڈل نہیں مارا جا رہا تھا۔ ڈاک کے چوراہے پر اس نے بڑی مشکل سے سائیکل روکی اور دھم سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے سارے جسم میں جھنجھناہٹ ہو رہی تھی اور وہ بڑی تیزی سے پورے جسم کو کھجا رہا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر لوگ اس کے اطراف جمع ہونے لگے۔ جب اس کا دھیان اپنے اطراف جمع بھیڑ کی طرف گیا وہ برا سا منہ بناتے ہوئے آئسکریم کی دکان میں گھس گیا، اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ "اگر بات کھل گئی تو پیش کار صاحب تو صاف بچ جائیں گے اور پھنسوں گا صرف میں کیوں کہ فائلیں تو اپر ڈویژن کلرک کی ہی نگہداشت میں رہتی ہیں۔ مگر نہیں، پیش کار صاحب تو ہمیشہ ہی اس کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ مگر نسیم سالے کا کیا کیا جائے، وہ راز فاش کرنے سے نہیں چوکے گا۔" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مفلر اس کے گلے میں کسا جا رہا ہو۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ مفلر کو اپنے گلے سے الگ کر دیا۔ دکان میں بیٹھے لوگ چونک پڑے اور اسے گھور کر دیکھنے لگے۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ سلگائی۔ جب تلخ دھواں اندر گیا تو اسے کچھ ہوش آیا۔ اس نے سوچا کہ ثبوت تو کوئی ہے نہیں، نسیم ثابت تو کر نہیں سکتا، مگر بڑے صاحب کے دل میں شبہ تو پیدا کر ہی سکتا ہے۔" اس کی طبیعت اب اکتا چکی تھی۔ اب دفتر جانے کو جی نہیں کہہ رہا تھا لیکن وقت بھی تو کاٹنا تھا۔ چنانچہ اس نے فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

فلم دیکھنے کے بعد وہ یہاں وہاں آوارگی کرتا رہا۔ شو تو تین بجے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے ابھی دو گھنٹے اور گزارنے تھے۔ جب شام ڈھلنے لگی تو وہ بس اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ اس نے اپنا ایک پسندیدہ جریدہ خریدنے کا فیصلہ کیا۔ کم از کم موج مستی تو رہے گی۔ اس نے باہر سڑک سے دیکھا کہ بک اسٹال پر غنی چچا بیٹھے ہوئے تھے۔ سلطان سالا کہاں مر گیا! وہ ایک کنارے شہتوت کے پیڑ کے پاس والی دکان پر کھڑا ہو گیا اور غنی چچا کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں چچا باہر آتے دکھائی پڑے۔

"السلام علیکم چچا!"

"وعلیکم السلام! ٹھیک تو ہے نا بیٹا؟"

"سب آپ کی دعا ہے۔"

جب چچا دور نکل گئے تو وہ لپک کر دکان کے اندر جا گھسا۔ اسے دیکھتے ہی سلطان نے دانت نکوس دیے۔ اور اس کا پسندیدہ جریدہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے پانچ کا نوٹ پھینکا اور کتاب بنیان کے اندر ڈال کر جیسے ہی مڑا، اسے اپنے سامنے نسیم کھڑا دکھائی دیا۔

"کیوں بھائی! راتیں گلابی ہو رہی ہیں کیا؟" اس نے طنز کیا۔

نسیم کو دیکھتے ہی اس کا حلق سوکھنے لگا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے جواب دیا،

"اوہ، تم! آہا! اور بھائی کہاں تھے! بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی!"

"بڑے صاحب سے میری ملاقات کی تو کوئی تک ہی نہیں۔ اپر ڈو تو تم ہو"

"تم آج کہاں تھے؟"

"سر میں ذرا درد تھا، اس لیے نہ آ سکا۔"

"کتاب خریدنے کے لیے سر درد ختم ہو گیا، کیوں؟"

"نہیں یار وہ تو ذرا یوں ہی..." شفیق جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

دونوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ نسیم زمین کو گھورتا رہا پھر اچانک بول پڑا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو،

"تم نے آج چھٹی کی درخواست بھی نہیں دی، ایسے ہی غائب ہو گئے؟"

شفیق اوپر لٹکے ایک فلمی رسالے کے سرورق پر چھپی ایک نہایت ہی بھونڈی تصویر دیکھنے میں مصروف تھا۔

"آج کہاں غائب تھے بھائی؟"

نسیم کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔

"آہ!..... کیا ہوا؟ .... ہاں! ...."

"پیش کار صاحب تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے؟"

وہ پھر چونک پڑا۔

"کیا... کیا ... پوچھ رہے تھے، تم سے پوچھ رہے تھے؟"

"آج تم آئے نہیں ...."

"اوں!" اس نے چین کا سانس لیا، پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا،

"چھوڑو ان باتوں کو، گھر چل رہے ہو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"نہیں تم چلو، میں ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں"۔

"اچھا تو پھر۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

شفیق کے آگے بڑھ جانے پر نسیم نے اس کے پیچھے ہوا میں ایک بھدی سی گالی اچھال دی۔ کلکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ کے لئے کچھ رسالے خرید کر اس نے سائیکل بنگلے کی طرف موڑ دی۔ میم صاحبہ ایک چھوٹا سا کتا گود میں لئے چہل قدمی کر رہی تھیں۔ نسیم دست بستہ ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اختر علی دودھ بھری پیالی لئے انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا، کتا اختر علی کے سپرد کیا اور جھک کر نسیم کے ہاتھوں سے رسالے لے لئے۔ رنگ برنگی نیم عریاں تصاویر والے فلمی جریدے۔ نسیم نے انہیں آج پہلی بار دیکھا تھا۔ اور ان کی خوبصورتی اور صباحت دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو اٹھی تھیں۔ جب وہ چلتیں تو گاؤن میں مستور ان کے متناسب اعضاء حرکت کرنے لگتے۔ جب انہوں نے پیسے دئے تو اس نے بڑے خلوص سے منع کر دیا اس نے ان کا کتا اٹھایا اور اسے انسان کے بچے کی طرح گود میں کھلانے لگا۔ اختر علی نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور سر کو ذرا خم کر کے کام ہو جانے کا اشارہ کیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ خالو کی عرضداشت میم صاحب نے منظور کر لی تھی کہ وہ صاحب سے آج رات کو ہی بات کر لیں گی تاکہ نسیم کل اسلم بابو کی کرسی پر بیٹھ سکے۔

آج نسیم بہت جلد اٹھ گیا تھا۔ گذشتہ رات اس نے بڑی بے صبری سے کاٹی تھی۔ آج سے اسلم بابو بننا ہے۔ خالو ہی اس کی تقرری کا آرڈر لائیں گے۔ مزہ آ جائے گا۔ وہ سالا شفیق دیکھتا رہ جائے گا۔ سے تو اپنی مراد رچا ہے اسلم بابو بننے۔ آنا جانا تو کچھ ہے نہیں، ہوں.....!" اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے اور دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاتے جاتے بیوی کو کوئی میٹھی چیز بنا رکھنے کی ہدایت بھی دیتا گیا۔

وہ وقت سے کافی پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ چند گدھے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ بڑے صاحب کے دفتر کی سیڑھیوں پر وہ بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے تمام کمرے کھلنے لگے۔ اب لوگ آنا شروع ہو گئے "تھوڑی دیر بعد یہی جگہ شور و غل سے بھر جائے گی"۔ اس نے سوچا۔ کلکٹر صاحب کو آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے دور ایک گوشے میں ہیڈ کلرک اور شفیق کو سرگوشی کرتے دیکھا۔ "وہ اب بھی اسلم بابو بننے کی خواہش کر رہا ہے۔ سالے کا سارا راز میم صاحب تک پہنچا دیا ہے، ابھی نوکری ختم ہوئی جاتی ہے، دیکھتا رہ جائے گا۔ ابھی سے جا کر اسلم بابو کے کمرے میں منڈلانے لگا ہے۔ وہ سوچنے لگا کرسی پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلا کام تو یہ کرے گا کہ شفیق کو آنے سے ہمیشہ کے لئے منع کر دے گا۔ سالا جب دیکھو تب ڈسٹرب کرنے پہنچ جایا کرے گا، کام کروں گا کہ اس سالے کو اینڈ کر دوں گا، اتنی درخواستیں پڑی ہیں، سب اسے ہی تو نپٹانی ہیں"۔ ایک خیال تھکان سے بھر کر اس نے ایک انگڑائی لی، اور سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا۔

اسی اثنا میں بڑے صاحب کی گاڑی آ گئی۔ صاحب پچھلی نشست پر ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آگے اس کا خالو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اختر علی تیزی سے نیچے کودا اور دروازہ کھول کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ صاحب کے قدم اسلم بابو کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا بستہ اٹھائے اختر علی مستعدی سے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ نسیم نے اپنے کو لعنت بھیجی کہ اسے وہاں رہنا چاہئے تھا۔ شفیق سالا وہیں ہے، کہیں بھول سے صاحب اسے ہی نسیم نہ سمجھ بیٹھیں"۔ اس نے سگریٹ پھینکی، اور کمرے کی طرف دوڑا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صاحب کے ساتھ آیا نوجوان اسلم بابو کی کرسی پر بیٹھ چکا ہے اور صاحب تمام لوگوں سے اس کا تعارف کروا رہے ہیں۔ تعارف کے بعد بڑے صاحب وہاں سے چلے گئے۔ نسیم دم بخود کھڑا نوجوان بڑی تمکنت سے کاغذوں پر دستخط کر رہا تھا۔ نسیم کبھی اسے دیکھتا کبھی اپنے کو جیسے موازنہ کر رہا ہو۔ اس کا تنفس بڑھنے لگا۔ اس کے بالائی دانت نچلے ہونٹ کو کاٹنے لگے۔ اچانک اس نے اپنا قلم پوری طاقت سے دروازے میں کونچ دیا۔

دوسری طرف شفیق آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، پھر زور زور سے بازو جھٹکتے ہوئے سیڑھیاں اتر گیا۔ ❁

---

بسمل صابری

# ایثار

دُھوپ میں چلنے والے مُسافر کی تسکین ہو
چھاؤں سے
پیار پیاسے کریں
بہتے دریاؤں سے
ہاں مگر
اپنے ہی خون میں ڈوب کر
رہگذاروں کو آواز دینا بڑا کام ہے
یہ وہ پیغام ہے
عام جو جذبۂ درد مندی کرے
آدمیت کی شیرازہ بندی کرے ۔

● ۱۷۱ ۔ ای ، بی ۔ ۷۱۱ ، کورٹ روڈ
ساہیوال ( پاکستان )

مینا کشی

درد بھی اچھا ہُوا
کون کب اپنا ہُوا

دور تک جائے مگر
خواب کب سچّا ہُوا

بھول ہی جاتے مگر
وقت ہے ٹھہرا ہُوا

ڈوبنے والے تجھے
کیا خبر پھر کیا ہُوا

ہم عبادت کیا کریں
یاد ہے بیتا ہُوا

● اے / سی ۔ ٦ ، نیوکوی نگر ،
غازی آباد ( یو پی )

ملکہ نسیم

جو لکھ لیا ہے اس کو سمندر میں ڈال دے
حالات اب جو ہیں انھیں لفظوں میں ڈھال دے

پہلے تو آفتاب سی فطرت مجھے بھی دے
پھر شب کی کالی جھیل میں مجھکو اچھال دے

آسان ہو جواب تو اس میں مزہ نہیں
تا عمر کشمکش رہے ایسا سوال دے

ذہنوں کو اپنے ایک نیا موڑ دے کے دیکھ
یہ کیا کہ ہر فسانے میں ہجر و وصال دے

قسمت کی شاہزادی ابھی جاگ جائے گی
پلکوں میں سوئیاں ہیں انھیں بھی نکال دے

سُلجھا نا ہو زمیں کی کشش کا جو مسئلہ
ہاتھوں میں گیند لے کے ہوا میں اُچھال دے

● نزد کورٹ ، سیوہارہ ۲۴۶۷۰۱ ( ایم ۔ پی )

# مکتوبات

**بلراج ورما** — ۲۳۔ ڈی، پاکٹ ۱۱۱، میور وہار فیس۔۱ نئی دہلی ۹۱ ۱۱

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ آج ہندوستان میں شائع ہونے والے ادبی پرچوں میں شاعر سرفہرست ہے۔ بہت کم لوگ اپنی وراثت کو اس طرح سنبھال کر رکھ سکتے ہیں، تم ہم سب کی مبارکباد کے حق دار ہو۔

شاعر کا تازہ شمارہ (جلد ۷۰ شمارہ نمبر ۳) زیر مطالعہ ہے۔ ابھی تک ستیش بترا کی سنگتی آپ نے کیا نام رکھا ہے، اور صدیق عالم کی "مٹی عروس" پڑھی ہیں۔ شہریار کی نظمیں شہریار ہی کی طرح خوب صورت ہیں۔ شہریار پر ستر نواز کا مضمون اور تمہارا نوٹ ابھی نہیں پڑھا البتہ اندر صفحات کے دو صفحات کا عکس دیکھا ہے اور ڈرامے پر ابراہیم یوسف کا مقالہ بھی پڑھا ہے۔ یہ بھائی ڈرامے کی تاریخ سے خوب واقف ہے۔ یہ دونوں چیزیں میرے کام کی ہیں۔ آج کل تمہارا ہر شمارہ گذشتہ سے بہتر ہوتا جارہا ہے۔ اسی طرح چلتے رہے تو جنت میں بیٹھے اپنے ابا کی دعائیں کماتے رہو گے اور ہم لوگوں کی بھی۔

ایک بات اور۔ نکرام وزیر (؟) جو سیماب اکبرآبادی کے ایک خطبۂ صدارت سے اقتباس ہے (؟) میں شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے سیماب صاحب نے ملٹن، شیکسپیر اور ہومر کے نظریات کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیر نے شاعری کے بارے میں نظریات کی بات کبھی نہیں چھوئی تھی۔ وہ تخلیق کار تھا اور تا عمر تخلیق ہی میں مشغول رہا۔ جن نظریات کو اس سے منسوب کیا جاتا ہے وہ تو نقادوں اور دوسروں نے خود ساخت کیے تھے اور آج تک دنیائے ادب اس عظیم فن کار کی کہی ہوئی باتوں میں سے نئے معانی اور نظریے تلاش کیے جارہی ہے۔ یہی بات کم و بیش ملٹن اور ہومر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے جو تخلیق کیا اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا۔ کم از کم انگریزی ادب کا طالب علم ہونے کے ناطے میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ سیماب صاحب کی بات البتہ سو فی صدی درست ہے کہ ہم ابھی تک اپنی شاعری کو مغربی شعراء کے تنقیدی اصولوں پر ہی پرکھنے کے لیے مجبور ہیں کیوں کہ ہم نے تنقید لکھی تو ہے لیکن کسی اصول یا قاعدے کے پابند ہیں۔ اگر تخلیق کار تمہارا دوست ہے تو اسے داد دو، اگر دوست نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کیا شعر ہے احمد ندیم قاسمی کا۔

ان کی گردن کا تناؤ ہے کہ فطرت کا اصول
جو لچک جائے تو دنیا میں قیامت آجائے

اور لچکے تو کسی کو پتہ بھی۔ چلیے۔ سیماب اکبرآبادی بہت عمدہ شاعر تھے۔ بہت اہم اور بڑے شاعر تھے۔

**رفعت سروش** — ڈی ۲۰ اے، ڈی ڈی اے فلیٹس، منیرکا دہلی ۶۷ ۱۱۰۰

آپ نے شاعر کا معیار نہایت بلند کر دیا ہے۔ قابل تعریف ہیں آپ کی انتھک کوششیں، یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ آج ہندوستان میں شاعر واحد ادبی رسالہ ہے جو نئی، روایتی آن بان اور جدید تقاضوں کے ساتھ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ زیر نظر شمارے میں شہریار کا تعارف اور ان کی شاعری پر مضمون خوب ہے اور اس سے زیادہ ابراہیم یوسف کا مضمون "اردو ڈراما ۱۹۰۰ کے بعد" اردو ڈراما اور تو قعیا بتاتے ہیں۔ ابراہیم یوسف سے متفق ہوں کہ اردو ڈرامے پر تنقید کی کمی ہے۔ مضمون پڑھ کر خیال آیا کہ منظوم ڈراموں پر تو بالکل کام نہیں ہوا ہے۔ اس صنف میں راقم الحروف نے چالیس سال کے عرصے میں مقدور بھر لکھا ہے۔

ماریاست، اور آرائہ ظافظ دونوں سلسلے بہت اچھے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ تن تنہا اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں۔

**انور خان** — ۲۰ نرم کنکھی والا چال، شیخ ٹی تر الدین اسٹریٹ، ممبئی ۸ ۳

اس بار شاعر میں شرد دتی کی کہانی گھر کہاں ہے؟ بہت پسند آئی۔ خیال گرچہ ذرا طویل ہو گئی مگر اس کے باوجود کہانی متاثر کرتی ہے۔ یہ دنیائیں ایسی ہیں جیسے بوڑھے کا تحرکس وغیرہ کا ذکر وہاں آتا ہے کہانی انگریزی سے ترجمہ ہوتی تو شاید اس کی اشاعت میں آپ کو تامل ہوتا۔ تاہم آج کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ اس سے مفر نہیں۔ سیاست ہو یا سیکس، ان سے الگ ہو کر ادب تخلیق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ کہ میرا خیال غلط بھی ہو کیونکہ ادھر پنجاب کے تعلق سے آپ لوگوں نے کئی اچھی اور دلدوز قسم کی کہانیاں شائع کی ہیں۔ یہ تبدیلیاں شاعر کے لیے یقیناً خوش آئند ہیں اور اس کے بدلتے مزاج اور عصری حسیت کی آئینہ دار بھی۔

**اختر لکھنوی** ـــــــــ ریڈیو پاکستان کراچی (پاکستان)

ماشاء اللہ آپ بڑی عرق ریزی سے شاعر ترتیب دے رہے ہیں۔ صوری اور معنوی اعتبار سے اب شاعر برصغیر میں ایک منفرد جریدہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ پاکستانی رسائل کو فوقیت حاصل تھی، آپ نے اس فوقیت کا رخ شاعر کی طرف کر دیا۔

**ہرچرن چاولہ** ـــــــــ اوسلو ناروے

اس بار افسانے بھی اچھے لگے، نظم اور مضامین بھی۔ نقد یامہ میں آج کے حالات کی بات کہی گئی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اپنے ہندوستان میں؟ دل بہت دکھتا ہے۔ آپ شاعر کو بڑے سلیقے سے ترتیب دے رہے ہیں، مبارکباد۔

**کمار پاشی** ـــ ۱۷۳۰ د بلی گیٹ، نئی دہلی ۲ ۱۱

شاعر باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ماشاء اللہ آپ یہ پرچہ بہت خوب صورت نکال رہے ہیں۔ لندن میں بھی آپ کے پرچے کا ذکر رہتا تھا۔

**ستیش بترا** — ۳۵، سیکٹر ۱۹ اے، فرید آباد ۱۲۱ ۰۰۲

شاعر باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ پرچے کی گاڑی، کتابت و طباعت اب بہت معیاری ہیں۔ مواد بھی بہت جاندار اور فکر انگیز ہوتا ہے جس کے لیے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔

شاعر اور آج کل ہی ہندوستان کے معیاری رسالے ہیں۔ آپ نے جس طرح سے حال ہی میں گذشتہ شاعری کا بیانیہ بھی جدید کے تحت ندا فاضلی کو پیش کیا، قابل ستائش ہے۔

**علقمہ شبلی** — ۳۰۔ پی اسٹریٹ، پہلی منزل، کلکتہ

شاعر میں آپ کے مزاج کی انفرادیت اور ذوق نے اس کے رنگ و روپ میں جو نکھار پیدا کیا ہے آپ نے تخلیقات کا تنوع اور ترتیب کی دلکشی، کنڈ کر حال ہی حاست۔

اعجاز صاحب کی طرح آپ نے اداریے بھی دلچسپ ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ارباب اقتدار اس پر اور ہم اردو والے بھی عملی اقدام کی طرف کم ہی توجہ کرتے ہیں۔

**جاوید اقبال** — برہانت حد، روورام ۱۵۔ ایریا

شاعر شمارہ ۳ کا سر ورق اچھا لگا، رو برو میں داور نقدا۔ دو رنگوں میں بھی خوب صورت ہیں لیکن آپ نے تو بہت ہی فن کار کو کوئی کریڈٹ نہیں۔ شمارے میں ابراہیم یوسف کا مقالہ اہم ہے۔

**دلیپ بادل** — ۵۲۴ چراغ دلی، نئی دہلی

شاعر کا مطالعہ گذشتہ کئی برسوں سے کر رہا ہوں۔ اپنے خیال میں شاعر کا مطالعہ نہ صرف ادبی شعور اور نکھارتا ہے بلکہ اقدار و تہذیب سے بھی دل و دماغ، اور اگر کوئی سر پھرا اس حقیقت سے انکار کرتا ہے اور تنگ نظری کو اس کی عقل کا دیوالیہ پن ہی کہا جائے، کیا خیال ہے؟ شاعر کے حالیہ شمارے خوب تر۔ آپ کو معلوم ہو کہ برادر اکبر اعجاز صاحب مرحوم ـ اور ادیب تھے بلکہ شاعر و ادیب گر اور رہنما بھی۔

**بشیر بدر** ـــــــــ ۱۲ ا، باغ پت گیٹ

شارق جمال صاحب نے شاعر میں شائع کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ سلسلہ مفید ہے۔ میں یہ ہی ایک گذارش ہے کہ ان شعراء کے متعدد اس طرح مختص ہو نا کافی ہے جو خود اپنی اکثر تخلیقات میں ریت کو کسی جستجو میں کرتے ہیں مثال کے اور ان کے کئی نقادوں نے واضح طور پر ان کے اس لیے کہ وہ غزل کے اسلوب، آہنگ اور کسی حد تک ہندی کے گیتوں کے اسالیب کو غزل بنانا چاہتے ہیں۔ بالکل گنجائش ہے کہ ان کا یہ اختراعی رویہ دکھتا ہے ایسی رائیگاں ثابت ہوگا۔ میں ذاتی طور کو دیکھ کر عروضی نکات کو کچھ ضرورت سے زیادہ اور نہیں سے اختراع و ایجاد کے نام پر انحراف کا۔

**م اختر** ۔ پانا خانہ ہاؤس، سول لائنز، کوٹہ (راجستھان)

... شاعر آفسیٹ پر چھپنے لگا ہے۔ رسالے میں بڑی خوش گوار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بساط فن، منکر امروز، باریافت، وادی ادراک، لفظ لفظ جیسے سلسلے اچھے ہیں ان سے حرکت پیدا ہوا ہے۔ بساط فن کے تحت آپ نے جدید شعراء کو پیش کیا ہے یہ ایک مستحسن اقدام ہے لیکن یہ شعراء اس حد تک نہیں ہونے ہیں۔ میں آپ کی وضع داری اور وسیع المشربی کا معترف رہا ہوں۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ آپ اپنے پر کوئی لیبل لگانا پسند نہیں کرتے حالانکہ واضح ہو کہ اس نے ایک حالیہ مکتوب میں ترقی پسندوں کے کیمپ میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی کہ آپ ذہنی طور پر جدیدیت کے زیادہ قریب ہیں اور اب جبکہ ادب جدید و قدیم کی بحث تو دیکھ کر حال کی شاعر میں منظومات اور افسانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے مضامین کی تعداد کم اور زیادہ تر مضامین عصری ادب سے متعلق ہوتے ہیں اگر آپ کلاسیکل ادب سے متعلق مضامین بھی شائع کریں تو طلباء اور طالبات کو اس سے استفادہ کا موقع ملے گا اور اس طرح شاعر کی افادیت میں اضافہ ہو گا۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اب نئے لکھنے والوں کو بھی اپنے رسالے میں جگہ دی ہے لیکن جیسا کہ تازہ شمارے میں اکرام الحق مشتی نے اپنے مکتوب میں اشارہ کیا ہے نئے اور پرانے لکھنے والوں کے درمیان توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ آج کل نئے لکھنے والوں کے شعری اور افسانوی مجموعے حشرات الارض کی طرح شائع ہو رہے ہیں۔ اس وجہ اپنا مجموعہ جلد شائع کروانے کی خواہش، اردو اکیڈمیوں کی امداد، چھپائی کی سہولت اور مالی آسودگی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس طرح شاعری کی بھیڑ میں اچھی شاعری کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔

بہرکیف اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی ادارت میں شاعر کی ایک نئی پہچان اور اعلیٰ معیار قائم ہوا ہے۔ خدا آپ کو حیات خضر عطا کرے تاکہ علامہ سیماب مرحوم اور اعجاز صدیقی مرحوم کی یہ روایت قائم رہے اور شاعر آپ کی زیر ادارت و نگرانی پھلتا پھولتا رہے۔ آج جبکہ اچھے اور معیاری رسائل کا کال ہے شاعر کا دم غنیمت ہے۔

**ابراہیم یوسف** ۔۔ ۱۹۔ جیم روڈ، امانی گیٹ، بھوپال

شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے میرا طویل مضمون شائع فرمایا۔ شکریہ۔ اس میں کاتب صاحب نے غیر ضروری اصلاحیں فرما دی ہیں کیونکہ مضمون کی کاربن کاپی میرے پاس موجود ہے اس لیے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا اسلوب نہیں ہے۔

صفحہ ۴ سطر نمبر ۱۱ میں ماتھو مرد لکھا گیا تھا جسے نامرد کر دیا گیا
صفحہ ۴۴ سطر ۱۱ میں "جاپان کا نوہ ڈراما" لکھا گیا تھا جسے "جاپان" کا نعرہ ڈراما" کر دیا گیا۔
صفحہ ۴۱ سطر نمبر ۱۳ میں گروہ کے انتشار لکھا گیا تھا جسے گروہ کے انتظار کر دیا۔ یہ غلطی اسی جگہ چار بار کی گئی۔ براہ کرم اس تصحیح کو شائع فرما دیجیے۔

**اسرار اکبرآبادی** ۔۔ ۲/۶۰ مشورہ، آگرہ (یوپی)

نیا شمارہ شاعر کی روایت، شاعر کے نئے مزاج کے امتزاج کا آئینہ دار اور معیاری ہے۔ اداریے ارتقائی سفر کے ہو سلسلہ [illegible]۔ تخلیق نظم و نثر معیاری، دل و دماغ کے مرتب [illegible] اور دعوت فکر و عمل سے لبریز ہے۔ فکر امروز [illegible] ایک [illegible] ہے۔ اور احساس کمتری و احساس برتری جیسی نئی بیماری کے علاج کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اس شمارے کی تخلیق جیسے کوئی چاہ رہا ہے لیکن خوالت کا خوف [illegible] صرف اتفاق ہی اتفاق میں تم نے مذہبی جنونیوں کی اصطلاح استعمال کی ہے اس بارے میں ضرور کچھ کہنا چاہتا ہوں [illegible] معاشرے میں [illegible] پیدا ہوتی ہے اور [illegible] زندگی [illegible] تہذیب [illegible] ہے۔ آج معاشرے میں [illegible] علماء کا [illegible] لوگوں کا ذہنی انتشار، ظلم و تشدد، خود غرضی، تکبر اور فساد اسی [illegible] پھیلتا جا رہا ہے۔ [illegible] اس اصطلاح کا استعمال [illegible] والے لوگوں کے لیے کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسے لوگوں کو مذہبی جنونی کہہ سکتے ہیں؟ اور کیا اصل [illegible] تعلیم دیتا ہے؟ لہٰذا اصل میں [illegible] اصل کی نقل [illegible] قدیم زمانے سے دنیا میں رواج چلا آ رہا ہے اور مذہب [illegible] نقل کے [illegible] اثرات سے [illegible] بڑے بڑے دانشور حقیق کی رحمت گوارا کیے [illegible] اصل سے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ اور یقین تو یہ ہے کہ اگر لوگ [illegible] مذہبی جنونی ہو جائیں تو وہ نیک خواہ، وسیع القلب، اعلیٰ کردار، اولیاء اور صوفیا ہو جائیں اور مجنوں کی طرح انہیں ہر طرف اور ہر شے میں اپنی لیلیٰ ہی لیلیٰ کے علاوہ نظر آنے لگے اور وہ دل گداز عاشق صادق کی طرح سراپا خیر ہی خیر بن جائیں۔ کہ فسادی اور تخریب کار۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی مذہب [illegible] ان کے درمیان کوئی فتنہ پیدا نہ کرے جس طرح تہذیب نفس کے لیے اچھے شعر کی حاجت ہے اسی طرح تہذیب و اخلاق کے لیے مذہب کی ضرورت ہے۔ تم اگر "مذہبی جنونیوں" کے بجائے "بے مذہبی جنونیوں" تحریر کرتے تو مطلب صاف ظاہر ہو جاتا۔

**دلیپ سنگھ** ۔۔ ۴/۵۹ ۔ راجندر نگر، دہلی ۶۰

شاعر کا تازہ شمارہ مجھے بہت پسند آیا۔ شہریار میرے محبوب شاعر ہیں اس شمارے میں انکی کئی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ شعری حصہ مجموعی طور پر بہت اچھا تھا۔ فضا ابن فیضی اور راحت [illegible] صاحب کی رباعیاں بہت خوبصورت تھیں۔ افسانے سارے پڑھے جانے والے تھے۔ ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے سمجھنے کے لیے کسی ماہر کی ضرورت محسوس ہو۔

ہاں ایک اعتراض ہے مجھے اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ آپ تین تنقیدی مضامین ہمارے شاعر کے ذہن پر بھاری پڑتے ہیں۔ میں نے پرائیویٹ طور پر سروے کیا جس میں ان لوگوں کی رائے لی جو شاعر میں لکھتے ہیں۔ مجھے یہ پتہ چلا کہ بہت سے قاری یہ مضامین سرے سے پڑھتے ہی نہیں۔ ہاں سب کا خیال تھا کہ یہ مضامین اردو زبان و ادب کے پی ایچ ڈی کے طالب علم کافی دلچسپی سے پڑھتے ہوں گے۔ اگر آپ کے قارئین کی بیشتر تعداد طالب علموں کی ہے تو پھر میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں۔ لیکن اگر یہ مضامین ہم جیسے لوگوں کے لیے ہیں تو آپ ہمیں شہریار وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں ہی سنوائیے۔ ان کا شعری سفر ہم خود طے کر لیں گے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں عصری صاحب نے اپنے مضمون پر بہت محنت کی ہے۔

میرا ڈرامے سے ذاتی طور پر گہرا تعلق رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اردو ڈرامہ کتنے پانی میں ہے۔ زیادہ تفصیل میں جائے بغیر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ اردو ڈرامہ [یا شاید] کے لحاظ سے اردو ڈرامہ] اتنے بڑے مضمون کا حقدار نہیں ہے جو ابراہیم یوسف صاحب نے اس قدر محنت سے لکھا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات تو میری مان سکتے ہیں کیونکہ مجھے شاعر سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو ہے۔ کیوں نہ شاعر کے قارئین سے پوچھا جائے کہ زیادہ چاہیں گے کہ رسالے میں ہر بار اسی طرح تین تنقیدی مضامین شامل ہونے چاہئیں۔؟

جمہوریت کے دور میں آپ کو اس پر تو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ لیجئے میں اپنے ذاتی ووٹ کو ابھی ڈالے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں ایک تنقیدی مضمون ہونا چاہئے بس۔

**رفیق اعظم** ۔۔ اردو گلی، پھلواری، پٹنہ ۴ ... ۸۰

میرے خیال میں شاعر کی سب سے بڑی طاقت اس کی FLEXIBILITY ہے۔ جس طرح ادب کسی خاص نقطہ نظر کا پابند نہیں اسی طرح اس کا یہ عکاس بھی کسی ایک خاص نظریے سے وابستہ نہیں۔ ادب میں کئی تحریکات ابھرتی رہتی ہیں، بہت سے رجحانات جنم لیتے رہتے ہیں، ان سب کی تشفی بخش اور بروقت عکاسی کرتے رہنا شاعر کے زندہ اور [illegible] ہونے کا ثبوت ہے۔ اس سے تنقیدی عمل بھی پورا ہوتا ہے یعنی قاری کے درمیان ذوق بحال کرنا۔ شاعر کا معیار دیگر ادبی رسائل کے لیے نشان راہ بھی ہے۔ ان تمام خصوصیات کا سہرا اس کے مدیر یعنی آپ کو جاتا ہے۔

**مسلم شہزاد** ۔ ریم کہکشاں شیوگنج، ترکپاگنج (مہاراشٹر)

شاعر خوب سے خوب تر کی سمت گامزن ہے۔ بساط سخن اور اب بساط فن جدید، باریافت، چہرہ چہرہ پہچان، اور لفظ لفظ کا سلسلہ تو رسالے کے معیار کو نکھار رہا ہے۔ تازہ شمارے میں جریدات کے تحت احتجاج ہی احتجاج نے بہت متاثر کیا۔ شعری حصے میں فضا ابن فیضی کی رباعیاں، شہریار کی نظمیں غزلیں۔ افسانے

باب میں ستیش بترا کا "سلگتی آگ" اور نسیم محمد جان کا "کیا کھونا کیا پایا" پسند آئے۔ ابراہیم یوسف کا مقالہ "اردو ڈراما ۱۹۷۰ء کے بعد" مجھ جیسے کم علموں کے لیے کافی معلوماتی ہے۔ مکتوبات میں تارا چرن رستوگی اور شارق جمال کے خطوط خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

**ایوب جوہر** ۔ ۲۶۰ دال چند مقیم لین (رتھ کھولا) ڈھاکہ۔۱

تازہ شمارے میں پڑھنے کے لیے کئی قابلِ قدر تخلیقات ملیں، خصوصی طور پر آپ کا اداریہ "احتجاج ہی احتجاج"۔ یہ صرف احتجاج ہے بلکہ دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ کاش اس کی آواز وہاں تک بھی پہنچے جہاں ضمیروں کا سودا بے حساب ہوتا ہے اور انسانیت ماتم کناں ہوتی ہے۔

افسانوں میں صدیق عالم کا "تمثی گردش" نسیم محمد جان کا "کیا پایا کیا کھونا" اور شرد جوشی کا ہندی افسانہ "گھر کہاں ہے" (ترجمہ جاوید اقبال) پسند آئے۔ غزلیں کم ہیں پھر بھی معیاری ہیں۔ مقالات میں، شارب ردولوی اور نقی حسین جعفری کی کاوشیں بہتر ہیں۔

**شکیل احمد** ۔ قاضی سرائے، دوس پورہ، مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱

شاعر کا شمارہ سرِ میرے سامنے ہے۔ "خرعات (احتجاج ہی احتجاج)" کا بھرپور عکس سرورق پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ایک کو دیکھتا ہوں دوسرے کو پڑھتا ہوں شاعر کے مدیر کو مبارکباد دیتا ہوں۔ صدیق عالم کا "تمثی گردش" اپنے خاص موضوع پر اس دہائی کا اچھا افسانہ تسلیم کیا جائے گا۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا "خواب" بہتر پیشکش ہے۔ موضوع اگرچہ گھسا اور عام ہے لیکن افسانہ نگار نے اسے آہستہ روانی سے لیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندر کا کردار پوری طرح متحرک ہوتے ہوئے بھی تصنع سے پاک صاف رہا اور یہی اس افسانے کی اصل خوبی ہے

دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجمے پسند آتے ہیں۔ یہ رجحان بہت اچھا ہے۔ گذشتہ سال "سارکا" ہندی सारिका والوں نے پورے سال اہم موضوعات پر تمام اہم بین الاقوامی زبانوں کے افسانوں پر مشتمل خصوصی شمارے شائع کیے تھے۔ آپ ان میں سے بھی شاعر کے لیے کچھ اچھے افسانوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

ابراہیم یوسف صاحب ڈرامے پر بہت اچھی تنقید لے کر حاضر ہوئے۔ آٹھویں اور نویں دہائی کے ڈراموں کا تعارف بھی ہے اور تنقید بھی۔ بہت ہی جامع، مثبت اور سلجھی ہوئی تنقید پڑھنے کو ملی دلی مبارکباد لیجیے۔

جدید غزل میں علامت نگاری شائع کر کے آپ نے حسبِ روایت بہت ہی یادگار مقالہ پڑھنے کو دیا۔

تمام مستقل عنوانات اپنا رنگ و آہنگ نکھارنے کے ہی حامل ہیں۔

**پروین اختر** ۔ ہدا امام باڑہ، للہ قاضی سرائے، جہاں آباد پور

شمارہ نمبر۲ موصول ہوا۔ کئی دنوں سے انتظار بھی تھا۔ ادب کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ادب روح کی غذا ہے۔ ظاہر ہے جیسی غذا ویسی صحت۔ وہ ادب جسے پڑھ کر روحانی لذت اور تسکین حاصل نہ ہو روح کی صحت کا ضامن نہیں ہے۔
[illegible]

پڑھ کر روح جھنجھنا اٹھی۔ ذہن جو آج کا عطیہ ہے کچھ اور تیز ہو گیا۔ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟ ہماری منزل کیا ہوگی؟ "گھر کہاں ہے" اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ مصنف اور مترجم دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ "خواب" "دو" "کیا پایا کیا کھونا" "تمثی گردش" اچھی کہانیاں ہیں لیکن "گھر کہاں ہے" جیسی کہانیاں اردو میں کیوں نہیں لکھی جا رہی ہیں؟؟۔

"سلگتی آگ" آج کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ٹھیک ہے اچھی بھی ہوتی ہے۔ ستیش بترہ صاحب نے سفر سے لوٹنے کے بعد شاید ہندوستانی ماحول کی کوئی کہانی نہیں لکھی ہے؟ بکھرتے ٹوٹتے رشتوں پر دیویندر چوادی کی کہانی بڑی کرب انگیز ہے ویسے ہی ہیں ان سے اس سے زیادہ کی امید تھی۔ تکنیک کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔

اس بار مضامین تینوں ہی شاندار ہیں۔ مبارکباد سب کو۔ منظوم حصہ تو ظاہر ہے آپ کا انتخاب ہے۔ ساقی کی "تجدید" اپنی مثال آپ ہے۔ حیثیت پرمار بھی کمال کی چیز ہیں۔ "خرعات" پڑھ کر لگا کر آپ بھی بہت جھنجھلائے ہوئے ہیں۔ "آثار بعد لفظ تاریات" "چہرہ چہرہ یادیں"، "زمستان" سب کچھ بہت عمدہ ہیں شاعر کے مکتوبات بھی تخلیقات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس شمارے میں ہمارے عہد کا ایک نمائندہ شعر بھی ملا ہے

مجھ کو گرنے سے سمندر سے جا کے ملنا ہے
ابھی میں رک نہیں سکتا ابھی ڈھلان میں ہوں

## کچھ گذشتہ شماروں کے متعلق

**عتیق احمد** ۔ آر ۱۹۵ بلاک ۱۵، دستگیر سوسائٹی، کراچی (پاکستان)

آپ کے تازہ چار شماروں کو دیکھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ آپ جس ہمت اور جانفشانی سے زبان و ادب کا یہ تخلیقی مشن جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ اس دور کا اور آپ کے ماحول کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ بازیافت، چہرہ چہرہ یادیں، اور آثار بعد لفظ، قارئینِ ادب کے لیے بیش بہا خزانے ہیں۔ آپ نے بڑی امنگ سے کام لیا ہے شاعر کا ہر شمارہ دلکش اور فکر انگیز مواد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے افسانے انیس رفیع کا "او لطف" رام لعل کے توسط سے حاصل کیے گئے افسانے، اہمیت کے حامل ہیں۔ تنقید کا حصہ بھی اکثر فکر انگیز مضامین کا حامل ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے شمارہ اول میں سلیم شہزاد صاحب کا مضمون "قصہ جدید افسانے کا" بہت متوازن اور فکر انگیز مضمون ہے۔ جدید افسانے کے بارے میں موثر گو یہ مضمون ضرور پڑھ لیا جانا چاہیے۔ شاعر کی مالی مشکلات پر افسوس اور بے چارگی کے جذبات کے علاوہ اور کیا اظہار کیا جائے؟ پاکستان میں بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اردو کے علاوہ یہاں بھی مواد آرائی آپ کے وہاں سے کسی نوع کم نہیں۔ پھر بھی آپ کے یہاں اکادمیوں کی تہمات تو ہے۔ یہاں تو اتنا بھی سہارا نہیں ہے۔ خلیل جعفری صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ آپ کی اکادمیوں کو تھوڑا بہت تو امداد کرنے کی سبیل نکالنی چاہیے۔ ہندوستان کے تمام ادیبوں کو اس پاس میں باقاعدہ مہم چلانے پر آمادہ کیا جائے تو ضرور اچھے نتائج نکلیں گے مگر یہ کام ادیبوں کا ہی ہے

اردو ہرانند کے مدیر و کی نہیں ہے۔ وہ تو بیچارہ کر سکتے ہیں۔

**سلیمان اطہر جاوید** ۔ ایس، وی، یونیورسٹی

شاعر کے گذشتہ شمارے اہم تھے یہ شمارہ ۳ میں غالب پر تینوں مضامین اہم تھے۔ افسانوی اور شعری حصہ حسبِ معمول معیاری۔ محترم خواجہ احمد نے سید اعجاز صدیقی مرحوم پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر اختصار کے ساتھ اور ایسے موثر انداز میں کا حق ادا کر دیا گیا۔ تمہارا اعجاز صاحب سے شخصی طور ملنے کی سعادت مجھے حاصل نہیں لیکن خط و کتابت رہی ہے کہ میری تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں انہوں نے شوق کے ساتھ میرے مضامین شاعر میں شائع کیے۔ لکھنے کے بارے میں گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

**نامی انصاری** ۔ ۱۰/۹۲ پہیڈی ۲۰

شاعر کا تازہ شمارہ ۲-۳ موصول ہوا۔ خواجہ احمد کا لکھنے کا اسٹائل بے حد پسندیدہ ہے۔ مگر اعجاز صدیقی کا یہ مضمون بہت مختصر تھا۔ کاش موصوف ذرا اور لکھتے تو یہ پڑھنے اور محفوظ کرنے کے لائق تھا۔ حامد گنجیار رضا کا مضمون غالب اور بیدل بھی خاصے کی چیز ہے۔ رضا صاحب موضوع زیر بحث کی ساری جزئیات کو لے آتے ہیں اور کسی معمولی سے معمولی پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑتے یہ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور یہی مجھے تحقیق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی پہلو کو تشنہ نہ چھوڑا جائے بھی اگر دو ایک بحث طلب آ جائیں تو ان کو بھی قلم ان کے اس مضمون میں اور دیگر مضامین میں بھی یہ خوبی موجود ہیں۔

غالب کی وفات پر میر امیں کی رباعی مادۂ تاریخ ہم سب کو جناب اکبر حیدری کشمیری کا شکر گزار ہونا رباعی نہایت نفیس تو ہے ہی، اس کا املا بھی عجیب و غریب اس زمانے میں یہی املا رائج تھا مگر آج "ہے" کو "گو" کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

**عالم خورشید** ۔ معرفت ڈائرکٹر آف اکاؤنٹس (ا
رو

آپ کا اداریہ توجہ کا طالب ہے۔ آپ نے بڑے اچھے روشنی ڈالی ہے اور بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ سرکاروں کو ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

شاعر کا ہر شمارہ کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے انفرادی ہوتا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ آپ کی ذات کے اندر اضطراب اور صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شاعر اس نقطۂ نظر سے انفرادیت رکھتا ہے کہ اس شمارے جدیدیہ کے تحت آپ نے نئے شاعروں پر خاکہ، ان کی منتخب غزلیں پر مضمون کی اشاعت کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ امید ہے آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

## چاک

[شعری مجموعہ]

### زیبؔ غوری

(الف)

وحشتِ جنوں بے آب دگیاہ
تھکی تھکی سی اک آواز
آخر تو نے بھلا ہی دیا
مٹ ہی گئی چتری لکیر

دل گئے ہیں زمانے کے ساتھ دل بھی زیبؔ
چلے کا اہلِ محبت کا کاروبار کہاں

(ب)

تونے خبر ہے تو کیا حال دلِ شاداں تجھے
جو زخم تونے لگائے ہیں کیا دکھاؤں تجھے

تھی موج لپکتی ہوئی میرے ہی لہو کی
جو پھول چنا میں نے وہ گلشن میں نہیں تھا

میں سمندر ہوں کبھی ساحل پہ اکتا یہ کبھی
کون ہوں کیا ہوں مری پہچان ہے کھوئی ہوئی

حصہ الف میں زیبؔ غوری کے ابتدائی دور کے اشعار ہیں اور حصہ ب میں دورِ آخر کے۔۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کے بیچ ان کا ایک مجموعہ "زرد زرخیز" بھی شائع ہوا تھا۔ اس غزلوں کا لب ولہجہ "چاک" میں شامل نئی اور پرانی غزلوں کے لہجے سے کافی حد تک مختلف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس وسیلہ دور میں اپنی آواز کی تلاش میں مصروف تھا اور ابتدائی دور کے تقلیدی انداز کو رد کر کے دورِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور طرزِ اظہار کو اپنانے میں کوشاں تھا۔ "زرد زرخیز" کی قاموسی زبان اور اکثر اوقات ژولیدہ بیانی یہ احساس تو دلاتی ہے کہ شاعر کوئی نئی بات اپنے انداز میں کہنا چاہ رہا ہے لیکن موضوع پر پوری طرح حاوی نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس کا احساس خود زیبؔ غوری کو بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ چاک کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"زرد زرخیز" کے بعد زبان کے بارے میں میرے شعری رویے میں بڑی تبدیلی آئی"۔

یہ تبدیلی زیبؔ کے حق میں زیادہ بہتر اور معنی خیز ثابت ہوئی اب ان کے الفاظ موضوع کے ساتھ نہ صرف پورے طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اپنے کئی معنوی امکانات کا اشارہ بھی بن جاتے ہیں۔

زیبؔ غوری کی غزلوں میں فطری مناظر کے ساتھ شاعر کی ہم آہنگی، منظر کشی اور معاملات ہی کی مثال نہیں بنتی بلکہ اکثر اوقات اس سے آگے بڑھ کر علامتیت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ اور معنویت کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ پہلے زیبؔ غوری احساس کیفیت کے لیے پیچیدہ تراکیب اور نامانوس الفاظ کا سہارا لیتے تھے جس کے نتیجے کے طور پر شعر بوجھل اور لفظوں کا پشتارہ بن جاتا تھا لیکن حالیہ غزلوں میں وہ اس مسئلہ پر قابو پا چکے تھے اور علامتوں اور استعاروں کو اپنے طور پر برتنے کا گُر جان گئے تھے۔ اسی طرح ان کی شعری زبان سے وہ شگفتگی، روانی اور تہہ داری آ چلی تھی جس سے ان کی انفرادی شاعری متعین ہوتا ہے ؎

دیکھنے والے مجھے دور سے الگ کر کے دیکھ
یہ حباب تو ہے جس میں جا کے مٹ کر، اور میں ؟

اس موج تند سے بھی جانے کئی کہیں
مجھ کو تو کیا تھا کنارے پہ لوٹا سا

میں بھی شجر تھا جدا ہوں دیواروں سے بہت
ڈھونڈ رہے ہو ان میں کوئی در و دریچہ

مجھ کو سورج سے بچا کر یہ سنبھالا کیسا
اڑتی چڑیوں کے پروں پر ہے اجالا کیسا

چاک۔ صرف زیبؔ غوری کے شعری مزاج کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ آج کی جدید شاعری کی سادگی و پرکاری مزاج کا بھی عکاس ہے کہ آج کے اچھے شعراء، بے ضروری ابہام اور شعوری طور پر پیدا کردہ پیچیدگی کی منزل سے گزر کر سادگی میں پراسراریت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

○ ضخامت۔ ۲۰۰ صفحات ○ قیمت: ۵ روپیہ
○ مطبوعہ ۱۹۸۵ء ○ بیت الرشیدہ، اطراف، کانپور

[دستر خواز]

## سورج مکھی

[افسانوی مجموعہ]

### شام بارکپوری

شام بارکپوری بنگلہ دیش کے ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ سورج مکھی ان کا نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے "پدما کی موجیں"، "میگھنا کی لہریں"، "جمنا کے دھارے" اور ایک ناول "کرشنا چوڑا کے سائے میں" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

شام بارکپوری نے ابتدا میں روایتی افسانے لکھے پھر رفتہ رفتہ ان کا قلم علامتی کہانیوں کو جنم دینے لگا۔ ان کی کہانیاں ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ شام پیشے کے اعتبار سے تاجر ہیں اور دنیا کے مختلف ممالک کی سیر بھی کر چکے ہیں۔

"سورج مکھی" میں کل اٹھارہ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی پر کسی نہ کسی معتبر شخصیت کا تجزیہ بھی تحریر ہے۔ یہ شام بارکپوری کا نیا انداز ہے۔ اس سے ایک طرف جہاں کہانی کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے، وہیں اس کے مختلف جہات کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ اور قاری کہانی میں شامل ہوئے بغیر ایک طے شدہ سمت ہی پر اکتفا کر لیتا ہے۔ علامتی کہانیاں شاعری کی طرح مختلف الجہات ہوتی ہیں۔

شام بارکپوری کی کہانیوں کے موضوعات میں تنوع اور شاعرانہ کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ علامتیں بہت زیادہ الجھی ہوئی نہیں ہیں۔ تشبیہات اور استعارے کہانی کی تہہ داری کو خوب صورتی عطا کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری انہیں بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے اور ایک کے بعد دوسری کہانی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہے۔

شام کے افسانوں کا کینوس وسیع ہے۔ ان کی نظریں، علاقائی حد بندیوں سے بلند ہو کر عالمی سطح پر بھی بہت کچھ دیکھتی ہیں۔ وہ جہاں ماحول کی گھٹن اور کرب کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ وہیں قدرت کی عظیم طاقتوں کے معترف بھی ہیں۔ مثلاً کبھی وہ فطرت کی معصومیت میں زندگی کا نیا سراغ پاتے ہیں۔ تو کبھی ماحول کی یک رنگی میں بھی کو الف منگا دیکھتے ہیں۔ کہیں قدروں کے تصادم پر انگشت بدنداں ہیں تو کہیں دنیا کی پچھڑی ہوئی قومیں خواہ وہ بنگلہ دیش کا مزدور طبقہ ہو، امریکہ کے نیگرو ہوں یا پھر کسی ملک کے غیر ترقی یافتہ افراد۔ شام ان کی جدوجہد اور ان کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جس میں کوئی تعصب نہ ہو۔ کوئی نسلی امتیاز نہ ہو۔ رنگ اور فرقے کی قید نہ ہو۔

کبھی وہ بڑی عالمی طاقتوں کے کھیل میں تیسری دنیا کو محض مہروں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ مغربی تہذیب کے ہاتھوں مشرقیت کا خون ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں تو کبھی انہیں عرفان ہوتا ہے کہ صدیوں سے ایک ہی انداز اور ایک ہی موضوع پر کہانیاں جنم لے رہی ہیں بس ان کے لکھنے والے ان کے کردار بدل رہے ہیں

"راوی۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی کہانی میں کوئی نیاپن نہیں ہے۔ پہلے ہندو مسلم فسادات پر کہانیاں لکھی جاتی رہی تھیں، اب بہاری، بنگالی کے موضوع پر لکھی جا رہی ہیں پہلے مذہب کی بنیاد پر تخلیق کی گئی تھیں اب زبان کی بنیاد پر! ان دنوں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان وہی پہلے جیسا سیاسی دنیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ کہانی وہی ہے، صرف کردار بدل گئے ہیں"۔ [ادھوری کہانی المیہ]

"تم پیچھے سے قبل روبوٹوں نے حکومت کی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔ اب انتظامیہ کا قلمدان ان کے ہاتھوں میں تھا"۔ [روبوٹ]

"دونوں مرغ لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے تھے۔ ایک ادھ موا ہو کر زمین پر لوٹ رہا تھا۔ دوسرے کی گردن لٹکی ہوئی تھی اور بار بار ٹانگیں زمین پر مار رہا تھا۔ تماش بین داد و تحسین کے پھول برسا

[باقی صفحہ ۴۴۴ پر دیکھیے]

# رفتار

## کہ آنکھیں بند ہوں.....

### آلِ عبا آوارہ

۱۸۹۰ء ——— ۱۹۸۷ء

مشہور طنز و مزاح اور ڈراما نگار سید آلِ عبا قادری آوارہ کا ۲۳ جولائی کو ان کے آبائی وطن مارہرہ شریف میں انتقال ہوگیا وطنِ مالوف سیتاپور (یوپی) تھا۔ ایم۔اے۔ اوکالج علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ زندگی کا بڑا حصہ آل انڈیا ریڈیو کی خدمت میں گذرا۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشنوں پر مامور ہو خانوادۂ برکاتیہ سے تعلق تھا۔ حضرت آوارہ اپنے مزاحیہ اور طنزیہ خاکوں اور ڈراموں کی وجہ سے خاصے مقبول تھے۔ ان کی تصانیف میں اپنی موج میں ۱۹۵۴ء۔ بے پر کی ۱۹۸۰ء۔ میرا قصر ملا ہوا ۱۹۸۷ء قابلِ ذکر ہیں۔

### ولی شاہجہاں پوری

۱۹۱۱ء ——— ۱۹۸۷ء

اردو زبان و ادب کے بے لوث اور خاموش خدمت گزار سید احمد ولی شاہجہاں پوری کا ۲ مئی ۱۹۸۷ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم مکتبہ جامعہ سے وابستہ تھے اور بچوں کا رسالہ پیام تعلیم اور کتاب نما کی ادارت ان کے ذمے تھی۔ یہ دونوں رسالے اپنے مزاج و معیار کے اعتبار سے آج ہند و پاک میں بے حد مقبول ہیں۔ مرحوم نے گویا اپنے آپ کو ان رسائل کے لیے وقف کر دیا۔ ابتدا ہی سے انھیں صحافت سے تعلق ہوگیا تھا، روزناموں میں کام کرتے رہے۔ الٰہ آباد سے ایک رسالہ اصار جاری کیا۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد اپنے شوق اور تجربوں کو مکتبہ جامعہ کے ذریعہ اجاگر ناشروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ بے حد نفیس، وضع دار اور پرانی اقدار کے پروردہ تھے۔

### قمر مراد آبادی

۱۹۱۰ء ——— ۱۹۸۷ء

کلاسیکی اردو شاعری کے رمز آشنا حضرت قمر مراد آبادی کا ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء کو ان کے وطنِ مالوف مراد آباد میں انتقال ہوگیا قمر صاحب کی ولادت ۸ اگست ۱۹۱۰ء کو ... میں پیدا ہوئے

ان کے والد جناب ضیاء الحق وا سپرد اسٹیٹ میں سب انسپکٹر پولیس تھے اور دادا جناب فہیم الحق ایک جید عالم اور طبیب تھے۔ مراد آباد کی ابتدائی تعلیم گھر اور پھر اسکول میں حاصل کی لیکن ۱۹۲۷ء میں والد کے انتقال سے تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور قمر صاحب کا اوائل عمری میں فکرِ معاش نے گھیر لیا۔ موسیقی کا شوق انھیں اپنے بڑے بھائی جناب شرافت علی سے ملا اور یہی شوق شاعری کا سبب بھی ہوا۔ ابتدا میں اپنے کلام پر امداد احمد قیصر مراد آبادی سے اصلاح لی (تلمیذ ذوق دہلوی) اس کے بعد شہاب الدین اثر مراد آبادی سے اصلاح لی۔ قمر صاحب کی تصانیف میں درج ذیل پانچ شعری مجموعے اور نثر کی تین کتابیں شامل ہیں۔

ماہِ تمام (شعری مجموعہ ۱۹۶۲ء) تنویرِ قمر (شعری مجموعہ ۱۹۷۱ء) کلیاتِ قمر (شعری مجموعہ ۱۹۷۳ء) معراجِ داغ (داغ دہلوی کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۷۶ء) روحِ اصغر (اصغر گونڈوی کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۷۷ء) شاخِ گل (شعری مجموعہ ۱۹۸۳ء) آئینۂ سکندر (جگر مراد آبادی کی حیات اور شاعری پر مکمل صحیفہ ۱۹۷۹ء) گلستانِ غزل (شعری مجموعہ ۱۹۸۵ء)

### قیصر زیدی

۱۹۱۳ء ——— ۱۹۸۷ء

بزرگ ادیب و استاد جناب ابوالکاظم قیصر زیدی کا ۳ جون ۱۹۸۷ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔

مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے تمام عمر علمی و ادبی اور تدریسی کام انجام دیتے رہے۔ بے حد دیانت دار اور قابل شخص تھے۔ تہہ دار سنجیدہ شخصیت کے مالک قیصر زیدی کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرحوم پر کام کیا جائے۔ یونانی ڈراما اڈیپس کا اردو ترجمہ کیا جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ پس ماندگان میں اہلیہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔

### مبشر علی صدیقی

۱۹۱۳ء ——— ۱۹۸۷ء

اردو کے خاموش خدمت گزار ادیب، نقاد اور معلم جناب مبشر علی صدیقی کا ۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو بدایوں میں انتقال ہوگیا مبشر علی صدیقی کے والد کا نام مولوی مظاہر علی تھا۔ ابتدائی تعلیم پاتھری اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ جلیسر ہائی اسکول کا بور سے ۱۹۳۱ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ کالج اجمیر سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۳۸ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔اے کیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں بی۔ٹی اور ایم اے کیا۔ ۱۹۴۷ء میں اسی یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا حصول کے بعد جہانسی کے گورنمنٹ نارمل اسکول میں استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مختلف مقامات کے اسکول، انٹرمیڈیٹ کالج اور پوسٹ گریجویٹ کالج میں خدمات انجام دیتے رہے اس طرح ۱۹۷۱ء میں بریلی گورنمنٹ کالج سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے سالوں تک بدایوں ہی میں تعلیمی و تدریسی مشاغل

ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء سے ہوا۔ ابتدا لکھا۔ پھر تنقیدی و تحقیقی اور تدریسی مضامین لکھے کیا۔ کتب و رسائل پر تبصرے، خطوط نگاری، درس و تدریس کے تجربے اور مشاہدے اور ذاتی مراسلات نگاری کے ذریعہ مبشر صاحب نے اپنی اور سنجیدہ شخصیت کا بھرپور اظہار کیا۔ تعلیمی مسائل پر لکھا ہے اور اس کا عملی اظہار اردو میڈیم ماڈل اسکول کے ذریعہ کیا۔ یہ اسکول آج بھی کامیابی کے ساتھ جاری ہے طرح ۱۹۷۷ء میں سلیم مبشر اردو سوسائٹی قائم کی کار میں اسکول کا نظم و ضبط۔ اردو زبان کی ترویج لائبریری کا قیام، تعلیم بالغاں، ادبی کتب کی اشاعت شامل ہیں۔ ہمہ وقت مصروف رہے اور تعمیری ادیب اور مثالی معلم کو وہ قدر و منزلت حاصل مبشر صاحب مستحق تھے۔ درج ذیل کتابیں ان کی ادبی اور تدریسی کارناموں کا وہ اثاثہ ہیں جن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

ادبی مقالات ۱۹۴۳ء تعلیم کے نئے اصول پگڈنڈیاں ۱۹۴۹ء۔ تنقیدی آئینے ۱۹۵۳ء۔ ادبی صحیفہ بشارت ۱۹۶۳ء۔ اردو تاریخ کیسے پڑھائیں ایک معلم کی سرگزشت ۱۹۶۴ء، طبع دوم ۱۹۸۴ء۔ نگارشاتِ نو ۱۹۶۷ء۔ بدایوں کے ۱۹۶۷ء۔ بکھرے موتی ۱۹۷۷ء مضامین بچوں کی نظمیں، بچوں کی کہانیاں ۱۹۷۹ء۔ معاصر ۱۹۷۹ء۔ نامہ ہائے دوست ۱۹۸۰ء۔ اقلیم ادب ۱۹۸۱ء۔ ایک معلم کے خطوط ۱۹۸۵ء۔ ایک ۱۹۸۶ء۔ اعتراف ۱۹۸۵ء (شمس بدایونی کی) مبشر علی صدیقی۔ شخصیت و فن ۱۹۸۳ء۔ مبشر علی صدیقی نمبر ۱۹۸۵ء۔

## کتب و رسائل

○ **بارش سنگ** ۔ اردو ادب کی دنیا میں ایک بالکل نیا ناول ... جیلانی بانو کا ایک نیا ناول۔ ہندوستان ... پر لکھا ہوا ... [illegible]

ہو چکا ہے۔ قیمت:۔ چالیس روپے۔

— پتہ:۔ اردو مرکز، ۱۰۰۸، معظم پورہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

○ **پچھلے موسم کا پھول** ۔ مظہر امام کی تازہ غزلوں کا مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ قیمت:۔ تیس روپے۔

— پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

○ **دیدۂ تر** ۔ حضرت ... کے حوالے سے غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ۔ پاکستان کے مشہور شاعر اختر لکھنوی کا خوب صورت آئینہ ہے۔

— پتہ:۔ بزمِ اربابِ سخن پاکستان، ۲۹ ولی ہاؤس، اورنگی۔ ۱۰ کراچی۔ ۳۱ (پاکستان)

○ **شمس الضحیٰ** ۔ پاکستان کے معروف قمر وارثی کا نعتیہ مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔

پتہ:۔ بزم احباب سخن پاکستان ۹۹ ورن ڈی، دولت
ں اور بگی ۔۱، کراچی ۔ ۳۴، [ پاکستان ]

○ **مکتوب** ۔ حیدر آباد سے بہت جلد ایک علمی، ادبی
سلامی ماہنامہ کا اجراء عمل میں آرہا ہے جس میں دین واخلاق
ذہب، علم وادب، طب وصحت، صنعت وحرفت
علاوہ گراں قدر سائنسی اور معلوماتی مضامین۔ طنز ومزاح
وسائل اور دیگر گوناگوں دلچسپیوں سے بھی آراستہ ہوگا
ارو دوست واحباب سے گزارش ہے کہ وہ مکتوب کی
خواہ پذیرائی فرمائیں اور قلم کار حضرات اپنی تازہ اور غیر مطبوعہ
شات سے نوازیں۔ مدیر:۔ حکیم محمد صبیح الدین صدیقی۔
۔ پتہ:۔ ماہنامہ مکتوب ۳/۳ ۱۱۹۹ ۔ ۴۔ ۲۰ ۔ لاڈ بازار،
درآباد ۔ ۲ [ آندھرا پردیش ]

○ **میرا جسم کہ ریزہ ریزہ** ۔ منفرد انداز تحریر،
زندگی کی سچی تصویر کشی کرنے والے اردو ادب کے معروف
انہ نگار ڈاکٹر عزیزی کے تیس سالہ مشاہدات کا تخلیقی اظہار۔
قابل مطالعہ افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر ۔ مرکز تخلیق ادب
ڈاکٹر الحق روڈ، سید پور (نلفاماری) بنگلہ دیش۔

○ **لمحے لمحے** ۔ ہم عصر شاہیر قلم کاروں پر خصوصی اشاعتوں
سلسلے کی ایک اور پیش کش جگن ناتھ آزاد نمبر۔ توقیت، شاعری
شخصیت، نثر نگاری، اقبالیات، بچوں کا ادب اور دیگر عنوا
اردو دنیا کے ممتاز اہل قلم حضرات کے مضامین۔ ضخامت
صفحات۔ قیمت:۔ ۲۵ روپیہ۔
۔ رابطہ ۔ حبیب سوز، ایڈیٹر لمحے لمحے امام باڑہ، اعلیٰ پور
رن (یوپی)

○ **کلیات جلال** ۔ معروف شاعر اور نقاد ذکا الدین
یاں نے جلال الدین جلال [ ۱۸۳۱ء ۔ ۱۹۰۴ء ] کے کلیات
رتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ یہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہے
مت:۔ بیس روپیہ۔
۔ پتہ:۔ فاروقی پبلی کیشنز، ڈھکیا ہاؤس روا ولڈ بستی
ٹ آفس بچھرایا، پیل بھیت (یوپی)

○ **انتخاب ۵** ۔ بنگلہ دیش کی سرزمین سے مستقل شائع
نے والا اردو کتابی۔ پانچواں شمارہ جلد شائع ہو رہا ہے۔
یر:۔ ڈاکٹر عزیزی ۔ ایم۔ نعیم۔
۔ رابطہ:۔ مرکز تخلیق ادب، ڈاکٹر ذکر الحق روڈ، سید پور،
لفاماری، بنگلہ دیش۔

○ **یادوں کی پرچھائیاں** ۔ معروف شاعر رحمت
دہوی کی تازہ تالیف [ اضافہ شدہ شعری مجموعہ ] جس میں
رآباد [ گجرات ] کی ادبی شعری زندگی کے بارے میں انہوں نے
یادداشتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ یہ کتاب تاریخی، سوانحی
ادبی اور تہذیبی مرقع بن گئی ہے۔ ماضی کے ۲۰ مشاہیر قلم
دن کے خاکے، گجرات کے ادباء وشعراء کی فہرست مطبوعات
رکتاب کے آخر میں اشاریہ شامل ہے۔ ۲۵ یادگار تصاویر
لوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، جاوید اقبال اور احمد ندیم

قاسمی کے چار خطوط کے عکس دیئے گئے ہیں۔ ضخامت:۔ ۱۰۰ صفحات
قیمت چالیس روپیہ۔
—— ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔

○ **اسلامی قانونِ وراثت** ۔ اسلام کے قانونِ وراثت
کی دفعہ وار ترتیب وتدوین۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے مستند حوالوں
کے ساتھ ایک اہم ترین موضوع پر گراں قدر کتاب جسے مفتی پنجاب
مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی [ رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا
بورڈ ] نے تالیف کیا ہے۔ ضخامت:۔ ۹۲ صفحات۔
—— پتہ:۔ مفتی ہاؤس ۲۲۲ ۔ دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ (پنجاب)

○ **بمبئی کی بزم آرائیاں** ۔ مشہور شاعر، ادیب، انشا
نگار رفعت سروش کی خود نوشت داستان جو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء
تک کے واقعات وکوائف کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک دل
چسپ کتاب جو شعر وادب، شخصیات اور بہت سے تاریخی
واقعات پیش کرتی ہے۔ ضخامت ۔ ۱۹۰ صفحات ۔ قیمت ۔
پچاس روپے۔
—— پتہ ۔ ادارہ فکر جدید، ۹۲۲ ۔ کوچہ روہیلا خاں،
دریا گنج، نئی دہلی ۲ ...۱۱

○ **سرائے میں شام** ۔ ہندوپاک کے معروف اور معتبر
شاعر رفعت القاسمی کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہوگیا ہے [ میرے
ہونے کی آگ اور دستک ] ایک اہم اور قابل مطالعہ شعری مجموعہ
جس میں تخلیقی اظہار، لفظیات، علامتیں، پیکر اور استعارے
محسوسات کی نئی لذتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ ضخامت:۔ ۱۲۶ صفحات
قیمت:۔ تیس روپے۔
—— پتہ:۔ نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)

○ **تقویم** ۔ پاکستان کے معروف شاعر صمد انصاری کا شعری
مجموعہ۔ اس شعری مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل
ایک سو ایک غزلوں کا ہر شعر قرآنی آیات کے ساتھ ربط رکھتا ہے
اور قرآنی حوالے استخراج کی صورت میں آیت، سورۃ اور حروف
کلید کے ساتھ فراہم کر دیے گئے ہیں۔
تقویم قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ قرآن کی آفاقیت کی
طرف جمالیاتی انداز میں ایک دعوتِ فکر ہے۔ اپنی نوعیت کا
ایک منفرد شعری مجموعہ جس میں معیاری غزل کے تخلیقی جوہر نمایاں
ہیں۔ ضخامت:۔ ۲۲ صفحات۔ قیمت:۔ چالیس روپیہ۔
—— پتہ:۔ ادم پبلی کیشنز، قصر قمر، بارہ دری مراد آباد

○ **شاہین** ۔ ملی آداب اور تہذیبی اقدار سے مرتب
ادارہ شاہین (جل گاؤں) کے زیر اہتمام شائع ہونے والا
سالانہ مجلہ شاہین کا معیاری اشاریہ شائع ہوگیا ہے۔ ۸۸
رانداسانے، ۲۰ تبصرے اور اقتباسات۔ چار رنگوں کا دیدہ زیب
سرورق، عمدہ کتابت وطباعت۔ ضخامت:۔ ۲۶۴ صفحات۔
قیمت ۲۵ روپے۔
—— پتہ:۔ ادارہ شاہین لائبریری، شاہو نگر، جل گاؤں

○ **جانورستان** ۔ مارچ اورویل کے مشہور ومعروف
طنزیہ ناول اینمل فارم کا نہایت ہی دل چسپ ترجمہ ناصر حسین
جعفری نے کیا ہے۔ یہ وہ شاہکار طنزیہ ناول ہے جس نے دنیا
بھر کے حکمراں طبقے کے چہرے سے نقاب اتار دیا ہے۔ جمہوریت
کا دعویٰ کرنے والے، قوم کی خدمت، ملک وملت کی حفاظت
اور عوام کے حقوق کی نیابت کرنے والے صرف اپنے اور اپنے
خاندان کے ذاتی معاملات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عوام کو نشانۂ
ہوس بنا کر مجبور ومحصور بنا دیتے ہیں اور خود دلچسپی دیتے ہیں۔
اس ناول کو پڑھ کر آپ سوچنے لگیں گے کہ شاید یہ ناول ہماری
قوم اور ہمارے قائدین ہی کے لیے لکھا گیا ہے۔ صفحات:۔ ۱۱۲
—— پتہ ۔ ناصر حسین جعفری۔ 164, GOLDHAWK ROAD, LONDON W 12 8 HJ

○ **سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ** ۔ اردو شاعری
کا ایک تخلیقی رجحان۔ حضرت امام حسینؑ کی ذات اور ان کی بے مثال
شہادت اسلامی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جو اردو
شاعری کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہوا —— صدیوں کا
رثائی ادب اس کا شاہد ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے
کہ عہد حاضر میں یہ اظہاریہ رثائی سے بالکل ہٹ کر عام شاعری میں
یعنی جدید غزل اور نظم میں نئی معنیاتی شان کے ساتھ نمایاں
ہو رہا ہے۔ لیکن اردو تنقید نے اب تک اس پر توجہ نہیں کی تھی۔
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی اس گراں قدر کتاب میں اس نئے
شعری رجحان کے آثار وارتقاء کی نشاندہی کی ہے۔ منفرد موضوع
غیر معمولی کارنامہ۔ عمدہ کتابت وطباعت۔ ضخامت:۔ ۱۲۲ صفحات
قیمت ۲۵ روپے۔
—— پتہ:۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، گلی عزیز الدین
وکیل —— کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶ ...۱۱۔

**بقیہ: نقد ونظر صفحہ ۱۱۱**

رہے تھے۔ لوگوں نے شہر میں مرغ اڑوں کو تلاش
کرنے کی کوشش کی تو دونوں غائب ہو چکے تھے"
[ آواز کا ماتم ]
میرے وجود سے ٹکرا لینے سے پہلے سوچ لو کہ شیش محل کے
سے چھوٹے بھی ٹوٹ جاتے ہیں" [ گنگا کی چیخ ]
شام بارک پوری کے علامتی افسانوں میں بھی کہانی پن برقرار ہے
وہ کہانی اور قاری دونوں کو بھٹکنے نہیں دیتے بلکہ ان پر مکمل گرفت
رکھتے ہیں۔ شام کی کہانیوں میں زندگی کا صحت مند تصور ملتا ہے،
ان کی کہانیوں میں تخلیقی جوہر نمایاں ہے اور کہیں بیانیہ مقصدیت نہیں
ہے سوائے "سورج مکھی" کے جس پر مقصدیت پوری طرح غالب ہے
شام بارک پوری کی ان اٹھارہ کہانیوں میں "زد بوٹ" "نقطہ کا
سفر" "گنگا کی چیخ" "شکتی کی پہچان" "آواز کا ماتم" اور "ناگ کی بیان"
وہ کہانیاں ہیں جو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں
اور شام بارک پوری کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔
○ ضخامت:۔ ۱۲۸ صفحات ○ قیمت بیس روپے ——
○ مطبوعہ:۔ ۱۹۸۶ء ○ پتہ:۔ کلچرل اکادمی [ مرکز ]
۲/۱۱ اقبال روڈ، محمد پور، ڈھاکہ [ بنگلہ دیش ]۔
[ نور الحسنین ]

# علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

## امیر خسرو پر بین الاقوامی کانفرنس

امیر خسرو سوسائٹی امریکہ کے زیر اہتمام شکاگو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ۲۹ مئی سے ۲ جون ۱۹۸۵ء تک منعقد کی گئی۔ اس میں ۹ ممالک کے مندوبین اور محققین نے شرکت کی۔ کانفرنس کا افتتاح ہارورڈ یونیورسٹی کی مشہور جرمن مستشرق پروفیسر انماری شمل نے کیا جنھوں نے امیر خسرو کی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات کو انسانیت کی آواز بتایا۔ کانفرنس کے کل دس اجلاس ہوئے۔ ان جلسوں میں امیر خسرو کی تخلیقی شخصیت کے مختلف جہات زیر بحث آئے۔ جہات یہ تھے: برصغیر ہند میں فارسی ادب کی روایت۔ تہذیب و ثقافت پر امیر خسرو کے اثرات۔ ایرانی شعری روایت سے تقابلی مطالعہ۔ اردو اور ہندی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ۔ صوفی روایت اور امیر خسرو۔ امیر خسرو پر تحقیق کے نئے امکانات۔ ہندستانی موسیقی پر امیر خسرو کے اثرات۔ جمالیاتی اور موسیقی کی روایت پر اثر۔ ایک پینل مباحثہ "اعجاز خسروی" اور اس کے انگریزی ترجمے سے متعلق مسائل پر بھی ہوا۔

یہ تاریخی کانفرنس شکاگو یونیورسٹی اور نارتھ ایسٹرن ریلی نائے یونیورسٹی کے تعاون سے منعقد ہوئی اور اس کے اجلاس اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اور انٹرنیشنل ہاؤس شکاگو یونیورسٹی میں ہوئے۔ ۲ جون کو ایک تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ کتاب "امیر خسرو کا ہندوی کلام بمع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر" اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی ہندی کتاب "امیر خسرو کی ہندی شاعری" کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ یہ دونوں کتابیں امریکہ کی امیر خسرو سوسائٹی نے شائع کی ہیں۔

اس یادگار تقریب میں ممتاز محققین کو ایوارڈ بھی دیے گئے۔ پروفیسر انماری شمل کو سرپرستی اور تعاون کے لیے "ستارۂ خسرو ایوارڈ" دیا گیا۔ پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر شہاب سرمدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کو "نذر خسرو" ایوارڈ پیش کیے گئے۔ شیو کمار شرما کو موسیقی کی ممتاز خدمات کے لیے "نذر خسرو ایوارڈ" سنتور کے لیے اور ذاکر حسین کو طبلے کے لیے دیے گئے۔

اس موقع پر پروفیسر وان ینگے نے امیر خسرو کے مزار کے متعلق معلومات افزا سلائیڈ شو پیش کیا۔ ڈاکٹر احمد زمانی نے فارسی امیر خسرو کی تولیس پیش کی۔ موسیقی پر دو اجلاس ہوئے اور امیر خسرو سے منسوب مقالات اور پہیلیوں کے ضمن میں "اعجاز خسروی" کے منتخب ابواب کا انگریزی ترجمہ بھی زیر بحث آیا۔ ذاتی طور کی مدد سے علمی حیثیت و تجربے کے وہ مسائل جو امیر خسرو کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتے ہیں ان پر بھی پہلی بار غور کیا گیا۔ مزید تحقیق کے بارے میں طے پایا کہ سوسائٹی "اعجاز خسروی" کی پانچوں جلدوں کو بہ تصحیح و حاشیہ شائع کرے گی نیز یہ کہ مندرجات کی تلخیص اور اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی مرتب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ فارسی دواوین اور "خمسۂ خسرو" کو بھی نیا شکل دے کر دوبارہ شائع کیا جائے گا کیونکہ یہ مجموعے اب نایاب ہیں۔

## صحافیوں کے لیے بارہویں ایوارڈ

جناب سبط ڈاکٹر (چیرمین، تنظیم برائے مفاہمت اور دوستی) نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ۱۹۸۵ء-۱۹۸۶ء ایوارڈ کے لیے مندرجہ ذیل صحافیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

برائے ۱۹۸۵ء ہندی۔ راجندر ماتھر (ایڈیٹر نو بھارت ٹائمز)
انگریزی۔ شام لال (سابق ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا)
اردو۔ عابد علی خاں (ایڈیٹر سیاست حیدرآباد)
بنگالی۔ ساگر مو گھوش (ایڈیٹر دیش کلکتہ)

برائے ۱۹۸۶ء ہندی۔ رام سرن جوشی (روزنامہ دیا)
انگریزی۔ خوشونت سنگھ
اردو۔ مسعود الرحمٰن (ایڈیٹر پریس ایشیا انٹرنیشنل)
تمل۔ جان ولیم (تمل صحافی و مصنف)

سبط ڈاکٹر نے کہا کہ یہ تنظیم ۱۹ جولائی ۱۹۷۰ء میں قائم کی گئی تھی جس کا مقصد لوگوں میں مفاہمت اور باہمی اعتماد کو فروغ دینا ہے۔

## جامعہ دارالسلام کا قیام
## مالیر کوٹلہ کا نیا تعلیمی سفر

مفتیٔ اعظم پنجاب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے مالیرکوٹلہ میں جامعہ دارالسلام قائم کرکے مالیرکوٹلہ کے ایک نئے تعلیمی سفر کا آغاز کیا ہے۔ دارالسلام نے فی الحال عربی اور فارسی کے ڈگری اور ڈپلومہ کورس، فاضل اسلامیات اور ائمہ مساجد کے لیے خصوصی کورس قابل امامت جاری کیے ہیں۔ امتحانات گھر بیٹھے اپنے شہر کے امتحانی سینٹروں کے ذریعے دیے جا سکیں گے اور باقاعدہ سند حاصل کی جا سکے گی۔ مالیرکوٹلہ کے لوگ اس بات پر ناز کرتے رہے ہیں کہ آزادی کے وقت فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کے شعلے یہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ ریاست مالیرکوٹلہ میں مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ جامعہ دارالسلام نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔

امتحانات کے بارے میں مکمل تفصیلات اور امتحانی سینٹر قائم کرنے کے لیے جامعہ دارالسلام، دہلی گیٹ، مالیرکوٹلہ ۱۴۸۰۲۳ پنجاب سے رابطہ قائم کریں۔

## ۸۷ء کی کانگریس کے بہترین مقالوں پر انعامات کا اعلان

پٹنہ ———— ادارہ تحقیقات اردو کی مجلس عاملہ کے جلسے میں اردو ریسرچ کانگریس میں پیش کردہ مقالات کے بارے میں اعلان شدہ انعام کے سلسلے میں غور کیا گیا۔ چونکہ اس میں سینئر اسکالر اور مشہور نقاد و محقق بھی شریک تھے اس لیے اس نے ان کی اپنی خواہش پر اس مقابلے سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ منتخب مقالہ نگاروں کو ان کے مقالات کے سلسلے میں پانچ پانچ سو روپے کا انعام نقد کیا جائے۔ ساتھ ہی گذشتہ جلسے کے اعلان کے مطابق انھیں بہار کے اہم علمی مراکز (خدا بخش لائبریری، نالندہ، راجگیر، گیا، منیر شریف، بہار شریف وغیرہ) کو دیکھنے کی دعوت اور اگر ان کی خواہش ہو تو وہاں بیٹھ کر کام کرنے کی بھی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل محققوں کو ان کے ان مقالات جو انھوں نے اردو ریسرچ کانگریس میں جنوری کے آخر میں پیش کیے، سیمینار کے تمام شرکا سے وصول شدہ رائے میں بہترین قرار دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ڈاکٹر محمد احمد اللہ | علی گڑھ مسلم یونیورسٹی |
| ڈاکٹر نذیر ملک | کشمیر یونیورسٹی |
| ڈاکٹر ذکیہ جیلانی | علی گڑھ مسلم یونیورسٹی |
| ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی | علی گڑھ مسلم یونیورسٹی |

یہ مقالے ریسرچ کانگریس کی روداد کے ساتھ شائع ہوں گے۔ امید ہے یہ روداد اکتوبر تک سامنے آ جائے گی۔ اردو ریسرچ کانگریس کا اگلا اجلاس حسب معمول جنوری کے اواخر میں ہوگا اور اس سال ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۶ء کے کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

● حالیہ عصر کے رہنما جگ پال کے ایچ ایس حالی کی معروف کتاب گرو گرنتھ صاحب کا اردو میں ترجمہ...

● انجمن ترقی اردو کراچی کے زیر اہتمام مشہور افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی۔ جسٹس جگن ناتھ آزاد نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

● ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے ابوالقاسم لاہوتی پر تحقیق پر حکومت پاکستان کے نقوش ادبی ایوارڈ برائے تحقیق کے لیے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جس کی رقم ساڑھے سات ہزار روپے ہے۔

● جامعہ اردو (علی گڑھ) کے امتحان معلم اردو کو ایڈمنسٹریشن نے بی ایڈ کے مساوی تسلیم کر لیا ہے۔ حکومت ہند (مرکزی) اور حکومت اتر پردیش نے معلم شدہ کو ہائر سکنڈری درجات تک اردو پڑھانے کے تقرر کا مجاز قرار دیا ہے۔

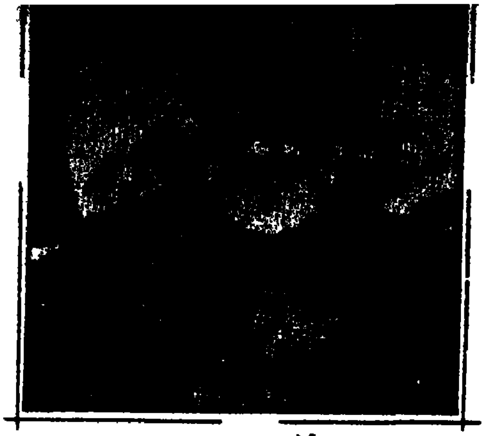
● مشہور ادیب رام لعل نابھوی کو دوردرشن کے پروگرام ایڈوائزری بورڈ کا ممبر نامزد کیا گیا۔

● پنجابی یوتھ فورم (احمد آباد) کی جانب سے ... کی کتاب "یادوں کی پرچھائیاں" کی رسم اجرا ملک کی مشہور شخصیت کنور مہندر سنگھ بیدی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔

● ادبی انجمن القاضی کے تحت کانپور میں زیب ... کی یاد میں ان کی برسی کے موقع پر اکتوبر میں کل ہند ... اور مشاعرے کے انعقاد کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔

● راجستھان کے تمام سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔ ریاست کے وزیر تعلیم نے ... (illegible) ... طلبا مزید ...

SHAIR (Monthly) Bombay 400 008.
8 Years of Publication ISSUE No— 6 — 1987 Telephone No. 35 99 04
(Publishing Date 27-28)
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57



# قمر بدایونی

● یکم مارچ ۱۸۷۶ء ● یکم جولائی ۱۹۴۱ء

تحقیق و تدوین: افتخار امام صدیقی

تملیق: اعجاز صدیقی مرحوم

ترے کلام نے جادو نہیں کیا کس پر
نہ پوچھ مجھ سے تو اپنی غزل کا جذب و اثر
رہی تجھ میں سادگیٔ میر و لذّتِ مومن
تو علم و فن میں بھی رکھتا تھا اک عمیق نظر

نام قمر الحسن، تخلص قمر، خاندانِ توحید میں جو خانوادۂ صدیقی کی ایک شاخ ہے۔ مقام بدایوں قاضی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ خاندان ملک حمید الدین گنوری کے نام نامی سے منسوب ہے۔ یہ بزرگ حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کے بھائی تھے۔ ان کے صاحب زادے قاضی صدر الدین ۷۷۶ھ میں عہدِ غیاث الدین بلبن، بدایوں آکر قاضی شہر مقرر ہوئے اور پھر یہیں سے یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ قمر بدایونی حضرت عبد القدیر سے بیعت تھے۔ ۱۸۸۰ء میں تعلیم شروع ہوا۔ کلام پاک اور اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد بدایوں کے مشہور اساتذہ شیخ فدا حسین خلیل، سید فرمان علی، مولوی التفات حسین، مولوی عبد... اور مولوی اعتقاد اللہ فاروقی مرحومین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور عربی زبان کا علم حاصل کیا۔ پھر گورنمنٹ اسکول بدایوں میں داخل ہوئے اور ۱۹... تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں انٹرنس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا، تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن کتب بینی جاری رہا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حافظ عبد الرحمٰن راسخ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

معاشی سلسلوں میں ۱۹۰۷ء میں "انڈین نیچ" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۹ء تک نظامی پریس بدایوں سے منسلک رہے۔ نظامی پریس کے رسالہ "ہمدرد" کے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک ادبی صلاح کار رہے۔ باکمال شاعر، ادیب، زباں داں، محقق، مورخ اور ناقد قمر بدایونی اپنے دور کے تمام رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ علمی و فنی مباحث میں اور بطورِ خاص فنِ عروض پر رسائل پر بہت کچھ لکھا جو ادبی رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔

مولانا قمر کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد ہند و پاک میں پھیلی ہوئی ہے۔

قمر بدایونی مرحوم نے شاعری کے علاوہ افسانے، ناول، تاریخ، تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھی لکھے۔ ان کی بیشتر تصانیف کمیاب ہیں اور بعض غیر مطبوعہ کہ ذیل ہیں:

## تصانیف قمر بدایونی

دلہنوں کی مجلس [مطبوعہ نظامی پریس، سن اشاعت درج نہیں] ... [ناول، ... ] ... [افسانہ] ... [ناول غیر مطبوعہ] ... [illegible]

# فکرِ امروز



آج ہر وہ شخص جو شعر موزوں کر سکتا ہے، اپنی ہستی کو شعر وادب کا عظیم ترین ماہر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ غلط فہمی عام ہے، مگر کسی قدر مہلک ہے، کسی قدر قابلِ اصلاح ہے اور کسی قدر قابلِ غور وفکر ہے۔

ایسے لاکھوں شاعر صفحۂ ہند سے اُٹھ گئے، جن کی تمام عمر فکرِ سخن میں گذر گئی مگر آج ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ حقیقی شاعر نہ تھے۔ دنیائے شعر وادب میں ان کی حیثیت مسلّم نہ ہو سکی اور اس طرح گویا ان لوگوں نے اپنا تمام قیمتی وقت ایک کوشش ناکام اور ایک سعیِ لاحاصل میں ضائع کر دیا۔

ان کی تقلید میں جو لوگ آج بھی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں انھیں ہوشیار ہو جانا چاہیئے اور انہیں عقل و ہوش اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیئے کہ وہ بھی ایک دن اپنا سرمایۂ حیات ختم کر کے لاحاصلی کا شکار ہوں گے۔ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی قیمت سمجھیں اور صرف ان کاموں کے انصرام کی کوششیں کریں جن کے لیے خدا نے انہیں پیدا کیا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اس طلسم زارِ ہستی میں صحیح راہِ عمل کامل فکر و غور کے بعد معین ہو سکتی ہے ورنہ ہر قدم پہ گمراہی اور بے راہ روی کی حقیقت پوش ظلمتیں موجود ہیں۔ جن لوگوں کو ذوقِ شعر وادب ہے انھیں فکر وغور کے بعد فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ جس راستے پر وہ گامزن ہیں کیا وہ ان کے لیے حقیقی جادۂ عمل ہے؟ اور کیا وہ اسی راستے سے اپنی زندگی کے نصب العین اور اپنی منزلِ حقیقی تک پہنچ سکتے ہیں۔

اگر ان کا ضمیر، ان کا ذہن و دماغ تمام تر غور وفکر کے بعد انہیں جادۂ عمل کے صحیح ہونے کا یقین دلا دے تو پھر انہیں سوچنا چاہیئے کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کے آداب کیا ہیں؟ اس راستے پر چلنے والے قافلوں میں انھیں کس قافلے کا ساتھ دینا چاہیئے اور کسے اپنا خضرِ راہ بنانا چاہیئے۔

[خطبۂ صدارت سے اقتباس مطبوعہ شاعر (آگرہ) اکتوبر ۱۹۳۲ء]

**سیماب اکبرآبادی**


**شاعر**

اشاعت کے ۵۸واں سال

جلد — ۵۸

شمارہ — ۷

[illegible] ۲۰۰۳

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

[illegible] شاعر ... پوسٹ بکس نمبر ... ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴

آنکھ دم شمارہ

# اقبال

پر شائع ہونے والی بے شمار کتابوں اور رسائل کے
خصوصی نمبروں کی بھیڑ میں **شاعر** کا فقید المثال
نذرانۂ عقیدت

## اقبال
کی ایک
نایاب کتاب
## اکبری اقبال
[عکسی]
نصف صدی کے بعد
شاعر کے صفحات پر
پہلی بار پیش کی
جا رہی ہے

# اقبال ایڈیشن
جلد شائع ہو رہا ہے

## خصوصی شمارے
کی ایک نا تمام جھلک

- مشاہیر قلم کاروں کے غیر مطبوعہ مضامین
- خطوطِ اقبال کے عکس
- اقبال کے متعلقین کے خطوط
- اقبال کی کتابوں کے اولین نسخوں کا عکس
- اقبال کے شاگرد لمعہ حیدرآبادی پر اہم مواد
- اقبال پر اہم ماخذات، تصاویر، کتابیں، تحریریں وغیرہ

اس علمی و ادبی دستاویز میں ملاحظہ کیجئے
تازہ ترین معیاری کہانیاں ❁ نئی منظومات ❁ شاعر کے تمام مستقل عنوانات
دیدہ زیب سرورق ❁ منفرد اندازِ پیشکش
تقریباً ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۰ روپے
اپنے شہر کے کتب فروش کے یہاں اپنی کاپی محفوظ کیجئے یا ہم سے طلب کیجئے
ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد ارسال فرمائیں، بعد میں مایوسی ہوگی

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## بہ یادِ فکر تونسوی



## بساطِ سخن



## جرعات



## آثارِ لفظ لفظ



## بازیافت



## چہرہ چہرہ یادیں



## مکتوبات



## رفتار



*

سرپرست

قومی کمک چھتی

مدیر

صادق

********

شمارہ نمبر ۷ ● ۱۹۸۷ء

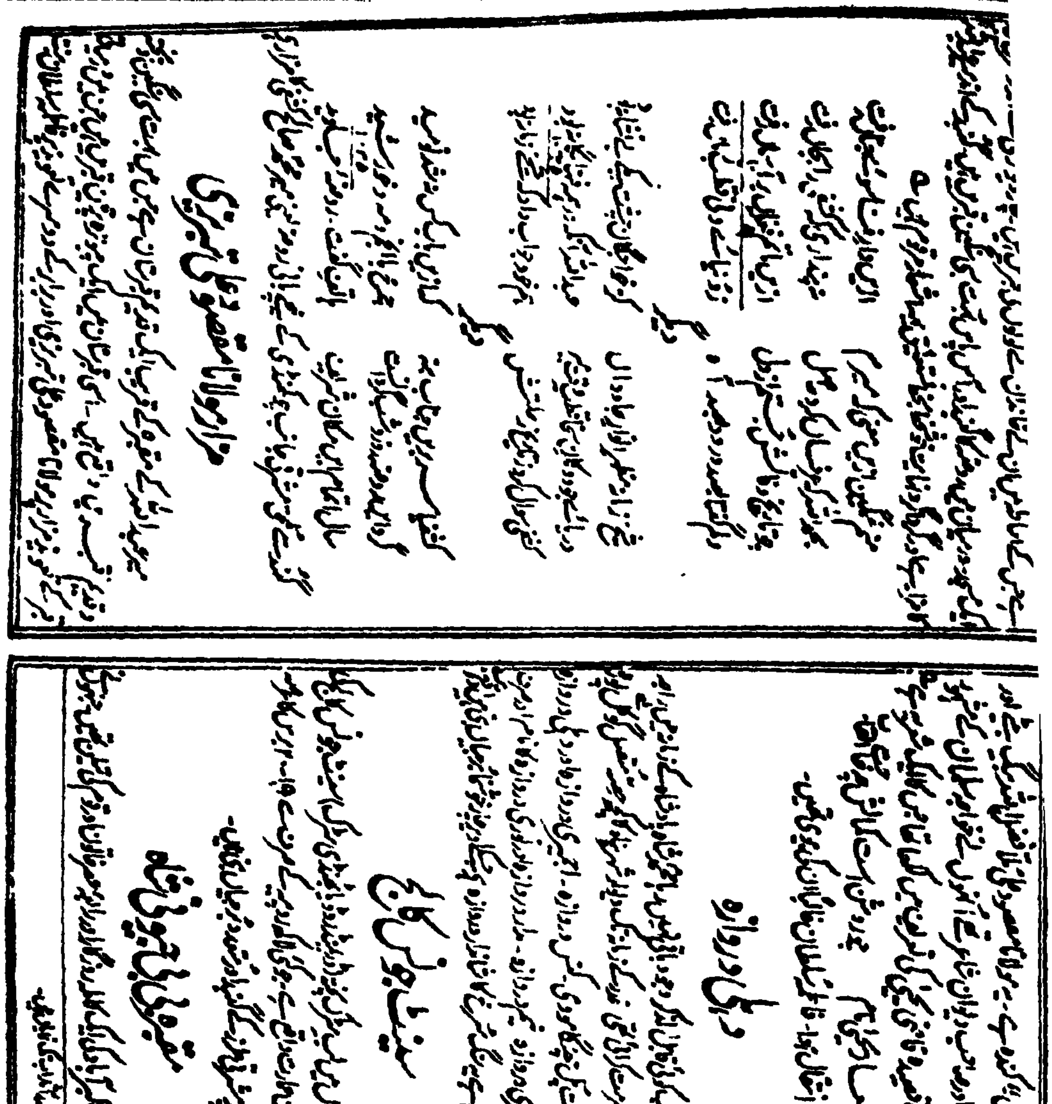
# تاریخِ ادب اُردو ۲

آنے والی نسلوں کو ہمیں کیا دینا ہے ؟ اپنی زبان، اس کا عصری تخلیقی ادب اور سب سے اہم اپنا رسم الخط۔ اردو زبان و ادب کے آج کے آثار تو کچھ اور ہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زبانیں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جاتیں لیکن سنسکرت زبان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے یا ان زبانوں کے بارے میں کیا کہیں گے جو اپنی اپنی تہذیبوں کے ساتھ ختم ہو گئیں ؟۔ زبان کا اپنا ایک کلچر ہوتا ہے، آج یہ کلچر سرحدوں، قوموں، مذہبوں اور جغرافیائی فرق پر حاوی ہے، کم از کم ہندوستان میں تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اُردو زبان کے خلاف جو محاذ آرائیاں اس میں رسم الخط کی تبدیلی یعنی اس کے خاتمے کا اہتمام اور کام زیادہ ہو رہے ہیں۔ روح کے بغیر جسم کا تصوّر کیا ہے یہ سب پر واضح ہے۔ ان تمام حقائق کے تناظر میں یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جو وقت میسّر ہے اس میں ہم کچھ کام کر جائیں۔

بات تاریخِ ادبِ اردو کی ہو رہی ہے جسے کمپیوٹر میں FEED کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے پھر یہ کہ جب پرنٹنگ پروسیس کمپیوٹر کے ذریعے ممکن ہو رہا ہے اور نوری نستعلیق سے بھی بہت آگے کے تجربے اردو کمپیوٹر کی تیاری لیے ہو رہے ہیں تو ہماری پیش رفت کیا ہونی چاہیئے ؟ ۱۸ ویں صدی، ۱۹ ویں صدی کی سائنس ۲۱ ویں صدی میں کام نہیں آئیں گی۔ کمپیوٹر میں بھی اب سوپر کمپیوٹر اور سوپر کنڈکٹر کے مراحل سے دنیا گذر رہی ہے کہ ایک منٹ میں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کی ایک ہزار جلدوں میں سے مطلوبہ سوال کا جواب یا مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ منٹ کو سیکنڈ میں بدلنے کا فاصلہ کتنا رہ گیا ہے ؟؟

تاریخِ ادب اُردو کی تدوین کا پروجکٹ دو، چار محققین کا کام نہیں، اس کے لیے کئی ادارے مل کر ہند و پاک کے کئی اہم محققین کے ذریعہ یہ کام کروا سکتے ہیں۔ پانچ سال کے پروجکٹ میں اعلیٰ ترین ذہنیت کے عالمِ ادب یقینی طور پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ اندازہ ہے کہ مختلف ادارے ایک ایک "دو" دو لوگوں سے اس طرح کام کروا رہے ہیں لیکن ٹیکنالوجی کے اس جدید ترین دور میں بھی یہ کام ایک دو لوگوں سے ممکن نہیں پھر تحقیق کا معاملہ ہی ایسا ہے کہ قدم قدم پر گتھیاں سلجھانے اور کمیوں کا احتمال رہتا ہے۔ ہندوستان میں خدا بخش لائبریری جیسے ادارے اور پاکستان میں کئی بڑے ادارے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل کی تاریخ تو مل کر مرتّب کی ہی جا سکتی ہے کہ آزادی کے بعد دونوں ملکوں کی ادبی تاریخ کے تناظر بدل گئے ہیں۔ ہندوستان اردو کے نام پر حاصل ہونے والی بڑی بڑی رقومات جن فضولیات پر خرچ ہو رہی ہیں ان کو تعمیری کاموں میں صرف کرنے کا راستہ نکالنا ہی چاہیئے ورنہ جس طرح ہم صوبوں اور زبانوں کے حصار میں سمٹ رہے ہیں اردو کے نام پر محض اپنے ذاتی مفادات و مراعات کی صوبوں میں پھر چند افراد ہی تک محدود ہو جائیں گے اور یقین کیجئے کہ ایسا ہو بھی رہا ہے۔

حرف و صدائیں فاصلے بڑھنے لگے ہیں اب صدیوں کا سلسلہ کہیں لمحوں سے کٹ نہ جائے



مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ [تاریخی نام: گنجینۂ تاریخ] مؤلفہ سعید احمد مارہروی۔ مطبوعہ ۱۳۴۹ھ - ۱۹۳۱ء مطبع الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ ـــــ صفحات: ۲۳۴

اس کتاب میں شہر آگرہ اور ضلع آگرہ کی مفصل تاریخ اور جملہ عمارات شاہی اور دیگر آثار قدیمہ وغیرہ کا بیان ہے۔ مؤلف کی تصویر کے علاوہ عمارتوں کی ۱۹ تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔



روزنامہ اجمل [ جو بہت پہلے بند ہو چکا ] کے مدیر، صحافی، افسانہ نگار، مبصر، اور مترجم تصدیق سہاردی کے انتقال پر ۱۶ مارچ ۸۳ء کو برہانی کالج (بمبئی) میں منعقدہ ایک تعزیتی جلسے میں
[ دائیں سے بائیں ] پروفیسر فضیل جعفری، مولانا شہاب مالیرکوٹلوی مرحوم، راجندر سنگھ بیدی مرحوم، علی سردار جعفری اور ظ انصاری۔

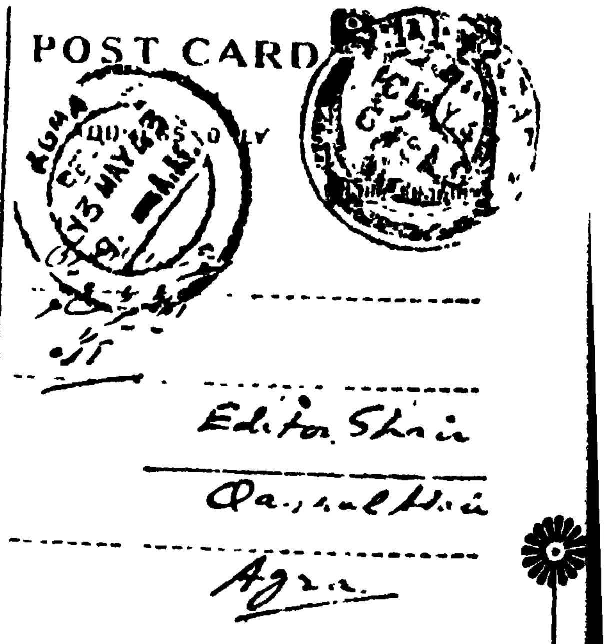
٩ مئي سنه ٤٣ء

رفعت منزل خیرت اباد

محب محترم - کرم نامه مورخه ٢٨ اپریل کا جواب دیر سے دے رہا هون
اس لیے که مین اوٹي گیا هوا تها - اور ابهي بمبئي کا سفر درپیش هے - اپکي
نظم مین نے دیکهي تهي اور اسي وقت سے تماشا اپ کے کمال سخن گستری
و ذوق تنقید کي داد دی تهي - اس وقت وه پیش نظر نهین هے تاهم میرا خیال
هے که اس کو ضرور کتابي صورت مین شایع کرنا چاهئیے - اس نظم مین مجهے
خاص بات یه نظر ائي که اپ نے حفظ مراتب کا بڑا خیال رکها هے اور
جانبداری سے اس حد تک کام نه لیا که حضرت سیماب کي نسبت جیسا
چاهئیے ویسا نه لکها - اس سے بڑه کر اپ کے صحیح تنقیدی ذوق

اور غیر جانب داری کا اور کیا ثبوت
هو سکتا هے - اپ بلا پس و پیش
اس کو شائع فرمائیے البته حاشیه
مین هر شاعر کے کچه مختصر حالات،
خصوصیات اور تاریخین بهي درج
فرما دیجیئے -

مخلص
محی الدین




سید محی الدین قادری زور (پ ٢٥ دسمبر ١٩٠٥ء - م : مارچ ١٩٦٢ء) بنام اعجاز صدیقی - اس خط میں جس نظم کا ذکر ہے اس کا عنوان "بساطِ سخن" ہے - اس نظم میں ٧٨ قطعات ہیں جو امیر خسرو سے اعجاز صدیقی تک کے مشاہیر کے کلام کی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں - شاعر میں ہر ماہ اسی نظم سے ایک قطعہ شائع کیا جا رہا ہے -

# عکسِ تحریرِ حضرتِ قمر بدایونی

گلشن میں فغاں بر لب کیوں بلبلِ زار آئی * ہنگامِ خزاں لیکر کیا فصلِ بہار آئی

جب عہدِ جوانی میں تھا نشہ جوانی کا / یا نیند جب آئی تھی یا زیرِ مزار آئی

فطرت گل و بلبل کی جو تھی وہی اب بھی ہے / سو بار خزاں آئی سو بار بہار آئی !

تم سے غمِ فرقت میں امیدِ کرم کب تھی / ہاں موت کو آنا تھا وہ آخرِ کار آئی

شورِ جرسِ نالہ تا صبح رکھا برپا / فرقت میں جو رات آئی شورش بکنار آئی

میں نے تو نہ گل دیکھے اب تک نہ چمن دیکھا / کہتے ہیں بہار آئی سنتا ہوں بہار آئی

ہشیار کی بیداری تا زیست نہیں جاتی / منصور کو نیند آئی لیکن سرِ دار آئی

کٹ جائینگے دن لیکن یہ بات نہ بھولیگی / ہم قیدِ قفس میں تھے جب فصلِ بہار آئی

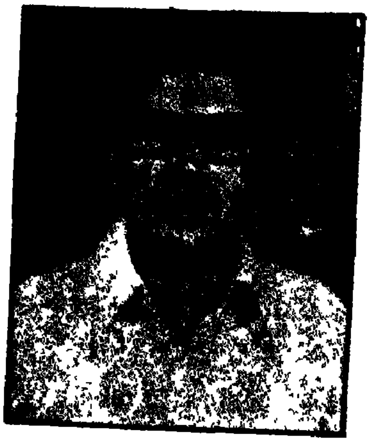
بھیگی ہوئی راتوں میں رونے کو قمر ہم تھے

برسات یہاں آئی گلشن میں بہار آئی

خاکسار قمر بدایونی

۱۴ نومبر ۱۹۳۵ء

* عکسِ تحریرِ حضرت قمر بدایونی مطبوعہ شاعر (آگرہ) مئی ۱۹۳۶ء



## صادق

کیا اس کے سوا گنبد افلاک میں دیکھا
جب آنکھ کھلی اپنے تئیں چاک میں دیکھا

ناقابل بُطلان تھا دیباچہ فنا کا
خوابوں کو بھی جلتے خس و خاشاک میں دیکھا

یہ کیا ہُوا ناگاہ نظر پھیر لی تم نے
خود کو نہ مرے دیدۂ نمناک میں دیکھا

تابندہ نہاں خانۂ دل جس سے تھا ہردم
خوابیدہ وہ مہتاب بدن خاک میں دیکھا

جب چشم گزرگاہِ لہو بن گئی صادق
اِک نقش مکمل دلِ صد چاک میں دیکھا

تا ابد گم ہوگئی منزل سفر سے کیا گلہ؟
اب نہیں تلوؤں میں خارش بحر و بر سے کیا گلہ

دِل کی مرگِ ناگہاں کا سانحہ کچھ کم نہیں
یورشِ کرب و بلا میں چشمِ تر سے کیا گلہ؟

ہوگئیں ساری نمازیں اور دعائیں دربدر
آسماں سے کیا شکایت چارہ گر سے کیا گلہ؟

جب دمِ رُخصت وہ آئے ڈبڈبائی آنکھ میں
روک لیتیں تیلیاں دیوار و در سے کیا گلہ؟

مُنتظر تھے نہ سپہر سب وسعتیں بھی باز تھیں
شوقِ پژمردہ نے مارا بال و پر سے کیا گلہ؟

جو میں نے کون و مکاں میں تجھے پسند کیا،
خدا نے دے کے غمِ عشق ارجمند کیا،

وہ لوٹ کر نہیں آئے گا جب یہ روشن ہے
تو کس اُمید پہ دستِ دعا بلند کیا

شکستہ شیشۂ دِل کیوں نہ ہو عزیز مجھے
کہ نقشِ یار کو اُس نے ہزار چند کیا

وہ آبدیدہ ہُوا اُن کے سرگذشت مری
مگر جو باب تھا رحمت کا مجھ پہ بند کیا

ہوا تھی تیغ بکف، ظلمتیں بھی گھات میں تھیں
چراغ تھے، سو جلے، ہم نے سر بلند کیا

اے جی - ۱ ، ۷۴ سی ، وکاس پوری ، نئی دہلی -



شمس الحق عثمانی

۱۸۶، بلیماران دہلی ۱۱۰۰۰۶

# یہ مضمون نہیں ہے ...

فرقہ وارانہ فسادات کے تجربے کا اظہار، اردو ادب کا ایک تاسف انگیز سرمایہ ہے ۔ اس تجربے کو خواہ افسانہ "موذیل" (از سعادت حسن منٹو) کی فنی شکل حاصل ہوئی ہو یا نظم "خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں" (از عادل منصوری) کا فنی پیرایہ، لیکن یہ ۔ یا ان جیسے دیگر فن پارے پڑھتے وقت دل کی پکار یہی ہوتی ہے کہ کاش! منٹو اور عادل منصوری ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ کو یہ تجربہ حاصل نہ ہوا ہوتا اور کاش! ہمارا ادب ان خون آلود اضافوں سے محروم ہی رہا ہوتا ۔ مگر افسوس کہ اضافے ہوئے اور خوب ہوئے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک ہو ہی چلے آرہے ہیں :

سبھی کوہ و صحرا سمندر جلے — فسادات میں کتنے منظر جلے
شوالے کہیں نذر آتش ہوئے — کہیں طاق و محراب و منبر جلے
مسلسل کئی روز آندھی چلی — مسلسل کئی روز تک گھر جلے
فضاؤں میں وہ آگ تھی اس برس — کہ اڑتے پرندوں کے بھی پر جلے

● والی آسی

[ فساد کے دنوں کی ایک غزل مطبوعہ ۶ جون ۱۹۸۷ء ]

ان اضافوں کے اسباب کبھی جبل پور میں پیدا ہوئے تو کبھی احمد آباد اور وارانسی میں، کبھی فیروز آباد، بھیونڈی، مراد آباد، تیلی چری، جلگاؤں، میرٹھ، لکھنؤ، الہ آباد، رانچی، رو ڑکیلا، علیگڈھ، پونہ، بریلی میں ۔ تو کبھی سنبھل اور بڑودہ ۔ اور اب ملیانہ، میرٹھ اور دہلی میں ۔

سڑکوں پہ لہو جب بہتا ہے
یہ شہر یہ بے حس شہر مرا
گھایل روحوں کی آوازیں
سنتا ہے مگر چپ رہتا ہے

○

سڑکوں پہ لہو جب بہتا ہے
بے نام و نشاں، بے گور و کفن
انبار، سلگتی لاشوں کا
تیرے میرے دکھ سہتا ہے
یہ شہر مگر چپ رہتا ہے

○

سڑکوں پہ لہو جب بہتا ہے

امروز کا قاتل سناٹا
اک نغمہ بہ لب، اک شعلہ بہ جاں
فردا کی کہانی کہتا ہے
یہ شہر مگر چپ رہتا ہے
سڑکوں پہ لہو جب بہتا ہے

● محمود سعیدی

لیکن سڑکوں پہ بہتے انسانی لہو نے افراد کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ اپنے گھر میں سکون و اطمینان کی گھڑیاں گذارتے ہوئے نہ جانے کتنے اچانک فساد کے خوف میں گھر کر سرد ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی افراد، راستوں سے گذرتے وقت آس پاس چلتے لوگوں پہ شک و شبہے کی نظر ڈالنے لگتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ راتوں کو سوتے سوتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں کہ دور سے آتی شور کی آوازیں کہیں فساد میں گھر جانے والوں کی تو نہیں؟

آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اگتے ہیں فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے

● کیفی اعظمی

یہ خوف ہی کا تو نتیجہ ہے کہ:

زبان و صوبہ و مذہب بنائے تفرقہ ٹھہرے
جنونِ فتنہ ساماں نے لگائے عقل پہ پہرے
چڑھے ہیں آگ کے دریا، اگی ہیں خون کی فصلیں
فضا میں بے گناہوں کی کراہیں، سسکیاں، چیخیں
تشدد، قتل و غارت، بربریت اور ریاکاری
زمیں پر نسلِ آدم کے لیے یہ رات ہے بھاری

● رفعت سروش

تشدد، قتل و غارت، بربریت اور ریاکاری کے اندھیروں کو محسوس کرنے والے، یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ خون کی لہروں میں تڑپتے بریدہ جسم صرف اپنی اہانت ہی کا منظر پیش نہیں کرتے بلکہ ثابت و سالم، اور بہ ظاہر محفوظ، جسموں کو ایک ایسے عدمِ تحفظ کی جانب لیے جا رہے ہیں جہاں پیروں تلے کی زمین بھی پناہ گاہ نہیں بن سکے گی:

یہ بریدہ جسم جو زنجیرِ موجِ خون ہیں
کل تلک آباد تھے
کھیتوں، گھروندوں، ساحلوں کی ریت پر
یہ بریدہ جسم
میرے دست و پا
میرے عزیز!

میرے بچے، میرے بھائی
میرے جلتے آنگنوں کے زرد پھول
یہ برہنہ جسم رسوائی کے پیراہن سے بھی آزاد ہیں
کون سا رشتہ ہے ان میں اور مجھ میں
موت ان کی ہے یا میری ؟
کون زندہ ہے سلگتے بادلوں کے درمیاں ؟
ہم تماشائی ہیں کل کی آہٹوں سے بے خبر
مرگِ ہمسایہ کی لذت کے اسیر
ساحلوں کو کاٹتی ہے موجِ خوں
اب ہمارے پاؤں کی محفوظ ریت
خواب کی مہمان ہے

لمحۂ موجود خنجر کی طرح
مجبورِ کار
چارسو مصروفِ کار

بلراج کومل

لہو رنگ ہیڈن ندی میں بہتی اور آگ کے شعلوں میں اکڑتی چیختی لاشیں۔ کیا پانی میں بہہ گئیں تو فنا ہو گئیں ؟ یا کسی ایسے سمندر سطح بلند کرنے کا سبب بن گئیں جو بلند ہو کر کناروں کو توڑتا ہوا، ہماری ان بستیوں کو بھی آئے گا جہاں پھول کھلے ہیں اور کچھ لبوں نغمے رقص کر رہے ہیں!

سمندر کا نوحہ سنو ــــ اور سوچو
سمندر کو یوں کس نے نالہ بہ لب کر دیا ہے
سمندر کے پُرشور سنگیت میں کس نے غم بھر دیا ہے
خروشاں سمندر کی موجوں کو کیا دکھ ہے ؟
یہ کس لیے اس الم ناک انداز میں چیختی ہیں ؟
سسکتی سی آواز میں چیختی ہیں

سمندر کا نوحہ سنو ــ اور سوچو
سمندر کا پانی لہو رنگ کیوں ہے
سمندر کا سینہ
چمکتی ہوئی خوش نما سیپوں، بے بہا موتیوں کا خزینہ
سمندر کے سینے پہ کس نے یہ خونی سفینے اتارے
سمندر کی دولت
سمندر کی گہری تہوں سے نکال ـ کناروں پہ ڈالی

لٹیرے جہاں صف بہ صف ہاتھ اپنے پسارے کھڑے تھے
سمندر کی شہ رگ میں جن کی ہوس ناک نظروں کے خنجر گڑے تھے
سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
سمندر کی شہ رگ سے بہتا ہوا قطرہ قطرہ — نہیں۔
قطرہ قطرہ نہیں، شعلہ شعلہ
سمندر میں پھیلا
کناروں کی جانب بڑھا آگ اور خون کا ریلا
تو کس سے رُکے گا
کوئی ہے جو طوفاں کے بڑھتے قدم روک لے گا؟
سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
یہ پھولوں بھری بستیاں۔
جو تمہارے لیے نغمہ زارِ ارم ہیں
یہ آتش بہ جاں نوحہ بہ لب سمندر کی سیّال سرحد سے اب کے قدم ہیں! ● مخمور سعیدی

وقت کی بے بہا دولت اور گنجائش کو غیر انسانی اعمال پر صرف کرنے والی آبادیاں، تادیر آباد نہیں رہتیں کیوں کہ کبھی نہ کبھی وہ دن رو در آتا ہے جب عمل کا ردعمل پیدا ہوتا ہے۔

مگر یہ سوچ لو! ہے ہر عمل کا ردعمل — جو ظلم ہوگا تو پھر ظلم بڑھتا جائے گا
نصاب فرقہ پرستی جواب بھی دو گے تم — سبق پھر امن واخوت کا کس سے آئے گا
جو آگ دو گے تبدلے میں آگ آئے گی — یونہی یہ آگ کا سیلاب بڑھتا جائے گا ● ظفر مراد آبادی

گویا آگ اور خون کی بوچھار سہنے والی ایک آبادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اپنی تاراجی کے بعد مقتول آبادیاں ختم ہی ہو جاتی ہیں مقتول کا خون قاتل کی آنکھوں میں آجاتا ہے۔ تو وہ ہزار طور سے اپنا اثر دکھاتا ہے۔ بیوی یا معصوم بیٹے کو سرزنش کرتے کرتے، لات، گھونسے، تھپڑ اور ربیت اور لوہے کی سلاح۔ اور پھر خون کا وہی منظر جو قتل کے وقت بھلے ہی کسی نے نہ دیکھا ہو مگر قاتل کی آنکھ تو دیکھنے پر مجبور تھی۔

اور دوسری جانب۔ اچانک قتل ہو جانے والے، کسی نہ کسی اسلوب میں زندہ لوگوں کے ذہنوں میں سانس لیتے رہتے ہیں، ذہنوں میں زندہ رہ کر ذہنوں کو زندہ رکھتے ہیں۔

سماں سہانا تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے
بدن کو تازگی ملتی تھی، روح میں جیسے
اضافہ ہوتا سا محسوس ہو رہا تھا مجھے
فضا میں اڑتے ہوئے مست ابر کے ٹکڑے
یہ لگ رہا تھا بہاروں کے ہیں فرستادے
خیال آیا کہ موسم کا لطف لیں سب دوست
مرے تو جاتے ہیں جینے کو آج کھل کے جئیں
عظیم شہر کی آلودہ اس فضا سے پرے

کہیں مل کے بھی چلیں، ساتھ بیٹھیں کھائیں پئیں
مرا پڑوسی بڑا پیارا آدمی تھا اسے
گلی میں آن کے آواز دی "غلام رسول"!
معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
اب اس جہاں میں نہیں بن چکا ہے وقت کی دھول
جو پچھلے سال اچانک بھڑک اٹھے تھے یہاں
وہ فرقہ واری فسادات کھا گئے اس کو!

● اختر الا

اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ ان قوتوں کو۔ اس جذبے کو۔ اس تخیل کو۔ اور اس فکر کو، جھلس دیتی ہے جو لوگوں کی کو انسان بناتی ہے:

کہاں کھو گئے؟ کہاں گم ہوئے؟ کہاں چل دیے
وہ شاداب سرگرم بھرے اور لپکتے ہوئے شعر
بہکتے، مہکتے، چہکتے، دل وجاں کی گہرائیوں میں اترنے کی خاطر
مرے کان پر دستکیں دے کے ٹھہرے
مرے لب پہ آکے رُکے
دل وجاں کی گہرائیوں سے فضاؤں میں ابھرنے کی خاطر
مگر چیختے اور ابلتے ہوئے خون کے شور میں کھو گئے
انھیں اجگرِ دورِ شعلہ نفس کھا گیا
دہکتی ہوئی آگ میں
سسکتی ہوئی راکھ میں
اسی آتش و خون کے طوفاں میں ڈوبے
کہ جس نے مجھے دونوں آنکھوں کے ساحل پہ لاکر کھڑا کر دیا
مساوات کے سب ترانے، اخوت کے نغمے گلوں ہی میں اٹکے ہوئے رہ گئے
نگاہوں کی وسعت کتابوں کے اوراق کی حد سے آگے نہ نکلی
کتابوں کے اوراق کو نفرتوں کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اک سیہ حاشیہ دے دیا
بہر سمت شیطان کا قہقہہ گونج اٹھا
جو شاداب سرگرم بھرے اور لپکتے ہوئے میرے اشعار کو کھا گیا

● عمیق حنفی

آتش و خوں کے طوفان میں صرف جذبہ، تخیل اور فکر ہی نہیں بلکہ محبتوں اور محنتوں کے وہ ثمر بھی خاک ہو سکتے ہیں۔ اور ہوتے بھی ہیں۔ جو ظاہر ہو چکے ہیں۔

یہ مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح بچے
یہ لہلہاتے ہوئے کھیت، جھومتی فصلیں
یہ کارخانوں کے دل کی حیات بخش پکار
یہ صنعتیں کہ ہے جن سے ہنروروں کا وقار

یہ علم و فکر کے معبد، یہ فن کے بت خانے
یہ زندگی کا اجنتا یہ دل کا تاج محل
یہ ڈالتے ہوئے سیاروں پر کمند انساں
زمیں نے پالا ہے ان کو بڑے جتن کے ساتھ
یہ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا زمیں نے ہمیں
جتن سے پالا ہے اس واسطے کہ قتل ہوں ہم"
زمین کے درد کی رکھنی ہے آج لاج ہمیں
کہ نفرتوں نے محبت پہ بڑھ کے وار کیا
ستم نے تنگ پھر اپنا یہ حصار کیا
اندھیرے جمع ہیں صبحوں کے قتل کرنے کو
تعصبات کے شعلوں سے اٹھ رہا ہے دھواں
توہمات کی لَو ظلمتوں میں جلتی ہے
جہالتوں کے دیئے نفرتیں اگلتے ہیں
ہوس کے سینوں میں پھنکارتا ہے رات کا ناگ
یہ ناگ نور کی نہروں کا خون پی لے گا

زمیں زخموں کے ہونٹوں سے دے رہی ہے پیام
کہ تیغ چھین لو قاتل سے، اور اس سے کہو
کہ احترام کرے درد خاک و انساں کا

● وحید اختر

مساوات کے ترانوں اور اخوت کے نغموں کے گھٹ کر رہ جانے اور تعصب و توہم کی لَو بلند تر ہونے کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ انسانی وقار کے ان خوابوں کو فراموش اور فنا کر دیا جائے جو خلاق اور مفکر ذہنوں کا سرمایہ رہے ہیں۔

میں نے اس سال کوئی خواب نہیں دیکھا ہے　　لٹ چکی سال گذشتہ ہی متاعِ تعبیر
زندگی کے لیے لازم تو نہیں ہے تقویم　　اک کلنڈر سے بدل تو نہیں سکتی تقدیر

○

اپنے کمرے سے گئے سال کے پارینہ ورق　　میں نے کس طرح اتارے ہیں بتاؤں کیسے
ایک دو زخم بدن ہوں تو چھپا بھی لوں میں　　خون آلودہ لباسوں کو چھپاؤں کیسے

○

ہر کلنڈر سے جھلکی ہوئی تصویر مٹی　　پیرہن چاک ہوئے نوکِ سناں ٹوٹ گئی
کہیں ٹیگور کی تصویر گری لہرا کر　　کہیں اقبال کی تخیلِ گراں ٹوٹ گئی

○

بدھ کی تصویر شکستہ تھی کئی جگہوں سے　　رام کے چہرے پہ لہریں تھیں پشیمانی کی
میں نے طاقوں میں سجائے تھے جو مرمر کے صنم　　ان کا انجام نہ سوچا بڑی نادانی کی

غالب و میر کی آنکھوں سے رواں تھے آنسو — سور و تلسی کی جگہ خالی تھی دیواروں پر
نانک و چشتی نے منہ پھیر لیا تھا آخر — بجلیاں کوندرہی تھیں کہیں تلواروں پر

○

کرشن کے ہاتھ سے بنسی گری، رادھا لرزی — گوپیاں روتی ہوئی لوٹ گئیں جمنا سے
ڈر کے شنکر سے ہم آغوش ہوئی پاروتی — خون کی دھار جو لہرا کے چلی گنگا سے

○

مسجدیں ٹوٹیں تو کاشی کے کلس کانپ گئے — لکھنؤ خون میں ڈوبا تو اودھ بھی رونی
میں نے دیکھا، جو لرزنے لگا سنگم کا ورق — کیسی نسبت تھی کہ کشمیر کی ممتا رونی

○

اتفاقاً جو نظر اٹھ گئی گاندھی کی طرف — خون میں ڈوبا ہوا پیکرِ معصوم ملا
ہاتھ سے روتے ہوئے خون کے فوارے کو — اس زمانے کا مسیحا مجھے مظلوم ملا

○

گر پڑا نہرو کی تصویر سے قدموں میں گلاب — پتیاں کھلیں تو دل ٹوٹ گئے سینوں میں
نیزہ برداروں کے قدموں کو کہاں یہ احساس — دھرتی لٹتی ہے تو خاک اڑتی ہے آئینوں میں

○

میں نئے سال کی تصویر سجا بھی دوں اگر — زخم یہ کاغذی پیکر سے نہیں چھپ سکتے
ایک دو خون کے دھبے تو چھپا سکتا ہوں — اتنے داغ ایک کلنڈر سے نہیں چھپ سکتے

● فصیح اکمل قادری

آگ اور خون کے مسلسل منظر، صرف ٹیگور، اقبال، غالب و میر، سور و تلسی، نانک و چشتی اور کرشن و رادھا کے وجود اور فکر ہی کو نہیں بلکہ ان سب کو خلاق ذہن دینے والے خالق کو بھی غیر موجود سا بنا دیتے ہیں:

نہ مسجدوں میں نہ مندروں میں — خدا کہاں ہے کدھر گیا ہے
چلو میرے ساتھ میں بتاؤں — مگر سے اب گذر گیا ہے
جلائے ہیں تم نے جو ان گھروں میں — خدا بھی جل بجھ کے مر گیا ہے

● محمد علوی

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک جاری سلسلہ کا برہنہ سبب: خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں۔

خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں
شعلوں کی روشنی میں وحشی آنکھوں کا ہجوم
رات کی گہرائیوں میں موج زن
اجنبی بڑھتے ہوئے سایوں کا شور
نیم مردہ سا یہ چاند
کوئی دوشیزہ کا جیسے ادھ کٹا پستان
اور اس پر خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں
میں جواب ٹوٹا ہوا آئینہ ہوں
ایک سے دو، پانچ، پندرہ، دس ہزار

میری ان لاشوں کو کفنائے گا کون
نعرۂ تکبیر فرالبوں سے دور
میری ان لاشوں کو دفنائے گا کون
چشم شب بیدار کے خوابوں سے دور
دور شعلے
اور شعلوں میں چمکتا اک مکاں
اور شعلے
اور ان میں خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں
ہڈیوں سے سر اٹھاتا یہ دھواں
دھواں جو اجنبی سا لگ رہا
بُو تیرے اجداد کی
بُو میرے اجداد کی
پھیلا گیا
تیرگی میں جگنوؤں سی جگمگاتی نوک ہر سنگین کی
آسماں پر ٹکٹکی باندھے ہوئے
روشنی کی منتظر آنکھیں اُداس
اور اداسی کے پردوں کے درمیاں
خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں

● عادل منصوری

روشنی کی منتظر آنکھیں ۔ زندگی اور ادب میں ان خون آلود افسانوں سے اداس ہو کر ۔ خاموشی اور لفاظی کو عمل کے کسی پیرائے میں ڈھالنے خواہاں ہیں :

کیوں سب چپ سادھے بیٹھے ہو کچھ بولو کچھ بات کرو
اک "ہنگائی" سے موضوع پر ایک جذباتی نظم لکھو
نام سے کچھ خوں خوار درندوں کے اس کا آغاز کرو
ایسے لکھو اک اک حرف سے گولی کی آواز کرو
اس کے زندہ لفظوں سے تازہ زخموں کی بو آئے
صوت و صدا سے چیختے اور جلتے بچوں کی بو آئے
نظم کے ہر نکتے میں کوئی دلہن بیوہ ہوتی ہو
نظم کے ہر گوشے میں کوئی ماں بیٹے کو روتی ہو
نظم کی بندش ایسی ہو بستی بستی ویران لگے
چیخوں سے بچوں بوڑھوں کی آبادی گنجان لگے
کچھ ایسی تصویر ہو جس کو دیکھ کے ڈائر بھی ڈر جائے
جلیاں والا باغ میں جو بیتا تھا وہ سب یاد آجائے

[باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے]

شین کاف نظام



## اکیسویں اُنگلی

مجھے معلوم ہے،
تمہارا دُکھ
دوسروں کے مقابلے زیادہ ہے۔

سبھی کے بدن پہ
بیس انگلیاں ہیں
تمہارے اکیس
جو تمہارے دُکھ کا کارن ہے
مگر اس کی خطا؟

جاننے کے باوجود
تمہیں حق ہے کہ
مجھ کو کاٹ پھینکو۔

## امن کا مُعاہدہ

مخالف ملکوں کے نمائندے ملے،
مصافحہ کیا،
معانقہ ہُوا اور
دونوں نے کردیئے دستخط
مُعاہدہ پر۔
تبدیل ہوئے
کاغذات
مگر، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ
دستخط کرتے وقت
دونوں نمائندوں کے ناخن
نہایت نفاست سے تراشے ہوئے تھے۔

◆

مکانوں کے تھے یا زمانوں کے تھے
عجب فاصلے درمیانوں کے تھے

سفر یوں تو سب آسمانوں کے تھے
قرینے مگر قید خانوں کے تھے

کھلی آنکھ تو سامنے کچھ نہ تھا
وہ منظر تو سارے اُڑانوں کے تھے

مُسافر کی نظریں بلندی پہ تھیں
مگر راستے سب ڈھلانوں کے تھے

پکڑنا انھیں کچھ ضروری نہ تھا
پرندے سبھی آشیانوں کے تھے

اُفق زیرِ پا تھا، فلک سرنگوں
طلسمات کیسے مکانوں کے تھے

انھیں ڈھونڈنے تم کہاں چل دیئے
وہ کردار تو داستانوں کے تھے

● کاوانز اسٹریٹ، جودھپور (راجستھان)



اوم کرشن راحت

۵۔ ایل ۱۵۲ فرید آباد ٹاؤن شپ ۱۲۱۰۰۱ (ہریانہ)

# قبرستان میں ایک رات

وہ شام کو سات بجے آکر اس قبر پر لیٹ گیا جسے اس نے آج دوپہر کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر لیا تھا۔ دن بھر وہ قبرستان سے ملحقہ زمین کی جھاڑیاں صاف کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ یوں بھی وہ کئی راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ پولس والوں کی چھڑکیاں ہر رات ایک فٹ پاتھ سے دوسرے فٹ پاتھ تک اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں اور اسی آنکھ مچولی میں صبح ہو جاتی۔ اس قبر کو چاروں طرف سے نیم کے پیڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جلد ہی نیند اس پر غالب آگئی۔

آدھی رات کے بعد جب اس نے کروٹ بدلی تو پاس والی دو قبروں سے دھواں اٹھتا دیکھ کر اس کا دم ہی نکل گیا۔ پورے چاند کی رات۔ نیم کے پیڑوں کا گھنا چھتنار اور قبروں سے نکلتا دھواں۔ اس طلسمی فضا میں اسے اپنا دل زور زور سے دھڑکتا محسوس ہوا۔ ڈر کے مارے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ دھواں دو الگ الگ ہیئتیں اختیار کر چکا تھا اور ان میں سے ایک روح نے دوسری روح سے کہا "مجھے کہیں سے انسانی جسم کی بو آرہی ہے۔"

"کوئی مُردہ دفن ہوا ہوگا۔"

"نہیں بھئی! آج تو کوئی قبر کھدی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ ۔ وہ دیکھ ۔ ادھر دائیں طرف۔ کوئی لیٹا ہوا ہے قبر پر۔۔۔"

روحوں میں سے ایک نے کہا۔ اس کی سانس رک گئی۔ لیکن جلد ہی اس کے کانوں میں آواز آئی "ڈرو نہیں بھائی ہم بھی کبھی تمہاری طرح ۔۔" اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ دونوں روحیں اس کے پاس آ بیٹھی ہوں اور ان میں سے ایک نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں ۔ میں ایک انسان ہوں" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

یہ سُن کر وہ دونوں روحیں زور سے ہنس دیں اور ان میں سے ایک نے کہا "تو ہندو ہے یا مسلمان۔"

"میں نے کہا نا کہ میں انسان ہوں؟" اس شخص نے پھر ہمّت بٹورتے ہوئے کہا فضا میں پھر قہقہوں کی آواز گونج اٹھی اور ایک روح نے کہا "کیا اپنے آپ کو انسان کہنے کا رواج ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہمارے وقتوں میں کچھ سرپھرے اپنے آپ کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے بعد میں ان میں سے کچھ ہندو نکلے اور کچھ مسلمان۔"

"بھئی اگر ہم تھوڑی دیر تم سے باتیں کریں۔ تمہیں اعتراض تو نہیں" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"مگر تم ہو کون" اس آدمی نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہم روحیں ہیں۔ لیکن ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم انسانی جسموں میں بھی رہتے ہوئے بے ضرر تھے اور آج بھی بے ضرر ہیں۔ ہمیں انسانی قالب چھوڑے پچاس سال سے زائد ہونے کو آئے ہیں۔ جب ہم انسان تھے تو میرا نام آس محمد تھا اور اس کا امید علی۔ ہم بڑے آرام سے اپنی اپنی قبروں میں حشر کے دن کے انتظار میں سوئے ہوئے تھے کہ ایک رات ایک سرپھرا ادھر قبرستان میں آنکلا۔ اس نے شاید کہیں سے کوئی جادو ٹونا سیکھ لیا تھا۔ اس نے ہماری قبروں پہ وہ افسون پڑھا تو ہم جی اٹھے اور وہ ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ ہم اسی دن سے رات کو مقررہ وقت پہ اپنی قبروں سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج نمودار ہونے سے پہلے پھر اپنی قبروں میں گھس جاتے ہیں۔ ہم تب سے کسی ایسے آدمی کے انتظار میں ہیں جو آئے اور ہمیں پھر سے قبروں میں سُلا دے یا اپنے افسون سے مکمل بیداری

عطا کر دے۔ ہم سے اس سونے اور نہ سونے کے بیچ کا عالم برداشت نہیں ہوتا۔"

اس شخص کو ایسا محسوس ہوا جیسے روحوں کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی ہو۔ اس نے بات کا رُخ بدلنے کے لیے کہا "آؤ ہم باتیں کریں" "وہ تو ہم کریں گے ہی۔ ہمیں تو رات کاٹنا ہے۔ مگر تم بہت تھکے تھکے سے لگتے ہو۔ دیکھو ہماری بات کا برا نہ ماننا۔ تم شراب تو پی لیتے ہو نا؟" ان میں سے ایک نے کہا "تم تو انسانوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔" اس شخص نے شراب کا نام سُن کر اب کے دل جمعی سے کہا "ہے کوئی انتظام؟"

"بھئی ہم نے تو زندگی میں اس کافر کو منہ نہیں لگایا اور اب پینے کے قابل ہی نہیں رہے۔ ہم اب روحیں ہیں جسم نہیں۔ ہاں اگر تمہیں طلب محسوس ہو رہی ہے تو۔۔۔ وہ جو قبر ہے نا۔ سفید سی۔ جس پر ببول کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس دیکھو۔ وہاں ایک مٹکے میں شراب ضرور ملے گی۔ اس قبرستان کے متولی کا بھانجا ہے بدرالدین۔ وہاں بھٹی لگاتا ہے۔ جس رات وہ بھٹی کھولتا ہے بڑی سڑاند آتی ہے۔ بڑے زوروں سے کاروبار چل رہا ہے اس کا۔ پرسوں رات ہی کھولی تھی بھٹی۔ ساری نہیں بیچتا۔ ایک آدھ مٹکا بچا کے رکھتا ہے۔ اپنے دوستوں اور پولیس والوں کے لیے۔ جاؤ دیکھو کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گی۔ ہاں ادھر پانی وغیرہ نہیں ملے گا۔ گلاس بھی ادھر کوئی نہیں۔ بس اوک سے پی لینا۔ تمہاری تھکن دور ہو جائے گی اور گفتگو کرنے میں لطف آجائے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا، ان کی بتائی ہوئی قبر کے پاس پہنچا تو واقعی مست کن خوشبو نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے مٹکا ٹیڑھا کر کے اوک میں لے کر تھوڑی سی چکھی تو واقعی مزا آگیا۔ اچھی تھی۔ مدتوں کی پیاس بجھا کر وہ لڑکھڑاتا ہوا ان کے پاس لوٹ آیا اور اعتماد بھرے لہجے میں بولا "آؤ اب باتیں کریں۔" اور یہ اسے محسوس ہوا کہ وہ دونوں ہنس رہے ہیں وہ قدرے ناراضگی سے بولا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں پی آؤں۔ اور۔۔۔ اور تم نے ہی کہا تھا کہ کچھ باتیں کریں گے۔ چلو چھوڑو۔ تم جب زندہ تھے۔ تمہارا نام کیا تھا۔

"میرا نام محمد اور میں تھا امید علی" ان میں سے ایک روح نے کہا۔

ان میں سے دوسری روح نے کہا "کیا تم پڑھے لکھے ہو؟"

"ہاں بی اے پاس ہوں۔ پتہ ہے بی۔ اے کیا ہوتا ہے۔ چودہ۔ چودہ۔ چودہ جماعتیں۔ پوری چودہ۔"

"مجھے پتہ ہے۔ ہمارے محلے میں تھا ایک وقار احمد بی اے۔ وہ سارے شہر میں اسی نام سے مشہور تھا۔ انگریزوں نے اسے جج بنا دیا تھا" ایک روح نے کہا "اور تم کیا کام کرتے ہو"۔

"میں مزدوری کرتا ہوں۔ یہ جو سامنے زمین ہے۔ اس میں ایک بہت اونچی بلڈنگ بننے والی ہے۔ میں وہیں جھاڑیاں صاف کرنے کا کام کرتا ہوں۔" اس شخص نے قبرستان سے ملحقہ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس زمین میں تو قبرستان تھا۔" ایک روح نے کہا۔

"مگر سیٹھ کہتا ہے۔ وہاں کوئی قبرستان نہیں تھا۔ وہ تو عدالت سے مقدمہ بھی جیت گیا ہے۔"

"بھئی تمہارے قانون میں تو ہمارا کوئی دخل ہے نہیں۔ ویسے یہ زمین بھی قبرستان ہی تھی۔ اس کی بنیادیں کھدیں گی تو دیکھ لینا۔ سنا ہے بہت بڑا اسپتال تعمیر ہو گا وہاں؟"

"تم سے کس نے کہا" وہ شخص بات کاٹ کر بولا۔

"بدرالدین اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے نشے میں کہہ رہا ہو۔ چلو قبرستان سے تو اسپتال اچھا ہے۔ غریبوں کا علاج تو ہو گا۔ میرا ایک بھائی تھا محمود بے چارہ بغیر دوا، دارو کے مر گیا تھا۔ اس کے پاس علاج کروانے کے لیے پیسے ہی نہیں تھے۔"

"اسپتال نہیں۔ بڑا عالیشان ہوٹل بننے جا رہا ہے" وہ شخص پھر بات کاٹ کر بولا۔

"آہستہ بات کرو، متولی نے کہیں سُن لیا تو مار بھگائے گا تمہیں۔ یا پھر یہیں دفن کر دے گا۔ بڑے تیز کان ہیں اس کے۔ ویسے متولی اب قبرستان میں نہیں رہتا۔ سُنا ہے کہ اس نے بہت عالی شان کوٹھی بنوالی ہے۔ لیکن اس نے کئی آدمی چھوڑ رکھے ہیں ادھر۔ اس لیے ذرا آہستہ بات کرو۔ ذرا آہستہ۔"

"تم قبر پر کیوں سوتے ہو۔ کیا تمہارا کوئی گھر نہیں؟" روح نے پوچھا۔

"نہیں ہے میرا گھر" اس شخص نے چیختے ہوئے کہا۔

"بھئی۔ مجھے یاد ہے کہ جنگ آزادی کے دنوں میں ہمارے لیڈر گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا کرتے تھے "روٹی، کپڑا اور مکان" سب کے لیے ضروری ہے۔ تو پھر تمہیں مکان کیوں نہیں ملا؟ ملک آزاد ہوئے تو کئی سال ہو گئے۔ مجھے یاد ہے ہمیں یہاں آئے بھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ بھئی انہیں دنوں کی بات ہے جب پاکستان، پاکستان بہت سننے میں آتا تھا۔ جب مسلمانوں کا کیمپ قبرستان کے پاس لگا تھا تو لوگ اپنا گھر بار چھوڑتے ہوئے کس قدر آہ و بکا بھی کر رہے تھے۔ بوڑھے لوگ کیسے اپنی دھرتی کی مٹی لے کر ماتھے پر لگاتے تھے۔ کیسے بار بار ان گلی محلوں کا ذکر کرتے تھے جہاں ان کا بچپن گذرا تھا۔ جوانی گذری تھی"۔ ایک روح نے دوسری روح سے کہا۔

"اب تو خیریت ہوگی۔ ہندو مسلمان اب تو فساد نہیں کرتے ہوں گے؟ انگریز تو دفعان ہو چکے یہاں سے" دوسری روح نے اس شخص سے پوچھا۔

شاید اس شخص کو نشہ زیادہ ہو گیا تھا یا اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"بھئی تم ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔ جو لال جھنڈے لیے مٹھیاں بھینچ کر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے بازاروں میں گھوما کرتے تھے اور مزدوروں کسانوں کا دم بھرتے تھے"۔ ایک نے کہا۔

"شاید تو ان آدمیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے جو آزادی ملنے کے کچھ سال بعد یہاں آکر چھپے تھے اور رات کو مٹی کا دیا جلا کر قبر کی اوٹ میں بیٹھ کر کچھ لکھا پڑھا کرتے تھے اور جن کو بعد میں پولیس والوں نے آکر گرفتار کر لیا تھا" دوسرے نے کہا۔

وہ شخص ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر مشرق کے افق کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ہر روز وہی زرد زرد سورج نئے نئے دکھ لے کر نمودار ہوتا ہے۔

"تو نے کبھی وہ بھی دیکھا ہے جو رات کو طوفان کی گھن گرج کے ساتھ ادھر سے گذرتا ہے" ایک روح نے پوچھا۔

"اچھا تو تو ہوائی جہاز کی بات کر رہا ہے، بھئی وہ تو ہمارے ہوتے ہوئے بھی تھے لیکن قدرے چھوٹے۔ ہم اسے آسمان میں دیکھ کر اچھل اٹھتے تھے اور گلی محلوں میں نکل کر اور گردن اٹھا اٹھا کر اسے سلام کیا کرتے تھے۔ بھئی تم تو ضرور بیٹھے ہوں گے اس میں" دوسری روح نے اس شخص سے پوچھا۔

"میرے پاس نہیں ہے تمہاری باتوں کا جواب۔ یہاں روٹی کے لالے پڑے ہیں اور تم ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی بات کرتے ہو۔ ہوائی جہاز تمہارے وقتوں میں بھی امیر آدمیوں کے لیے تھے۔ اب بھی امیر آدمیوں کے لیے ہیں" وہ شخص چڑ کر بولا۔

"تو پھر انگریز کی حکومت اور اپنی حکومت میں کیا فرق ہوا"

"مجھے معلوم نہیں۔ مجھے پریشان مت کرو۔ ویسے ایک بات ہے۔ تمہارے وقتوں میں بھی امیر آدمیوں کا راج تھا، اب بھی امیر آدمیوں کی حکومت ہے" وہ شخص غصے سے بولا۔

"یار ہم تو تمہاری باتیں سن کر حیران ہو رہے ہیں۔ ادھر کی کچھ اور بتاؤ، ہم تو سوچتے تھے کہ اب لوگوں کے دکھ درد سب ختم ہو گئے ہوں گے۔ سب بھائی بھائی کی طرح رہتے ہوں گے۔ امیر، غریب کے بیچ کی خلیج کم ہو گئی ہوگی۔۔۔"

"مجھے لگتا ہے تم پرانی قسم کے لوگ ہو۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ ابھی ملک کو آزاد ہوئے آدھی صدی بھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو۔۔۔"

وہ تینوں ایک نئی آواز کو سن کر چونکے اور بیک وقت بولے "کون ہو تم"؟

"بھئی میں بھی ایک انسان ہوں۔ قطع کلامی معاف۔ میں تو ادھر سے اپنی کار میں گذر رہا تھا کہ کار اچانک خراب ہو گئی۔ میں نے سوچا شاید بدرالدین یہاں مل جائے۔ میں اس کا دوست ہوں۔ کئی بار ادھر آیا ہوں لیکن بدرالدین تو یہاں ہے نہیں۔ میں خواہ مخواہ آپ کی باتوں میں مخل ہوا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔

"یہ کون تھا" اس کے چلے جانے کے بعد ایک روح نے پوچھا

"میں اسے جانتا تو نہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ اوہ۔ آیا یاد آیا۔ یہی تو وہ لیڈر ہے جس نے کل یہاں اس ہوٹل کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس ہوٹل میں سب سے زیادہ شیئرز تو اسی کے ہیں۔ وہ شخص بولا۔

"اچھا اچھا۔ اب ہم سمجھ گئے۔ دیکھا ہے اسے ادھر کئی بار بدرالدین کے ساتھ، پی کر بہت خرمستیاں کیا کرتا ہے۔ ایک رات ایک بہت خوب صورت سی چھوٹی سی لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ بہت چیخی چلائی تھی بے چاری۔ پھر۔ پھر شاید وہ مر گئی تھی۔

بدرالدین اور اس لیڈر نے اسے یہیں کہیں دفنا دیا تھا"

"اور تم منہ دیکھتے رہے؟" وہ شخص غصے سے بولا۔

"بھئی ہم تو مُردے ہیں۔ ہم کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن تم زندہ لوگ بھی کیا کرتے ہو۔ بدرالدین تو زندہ تھا۔ میرا خیال ہے تم زندہ لوگ بھی ہم مُردوں ہی کی طرح بس تماشا بین ہو۔ ہے نا؟" وہ دونوں روحیں قہقہہ لگا کر بولیں۔

"بھئی آہستہ ہنسو آہستہ۔ کوئی سُن لے گا۔ ادھر متولی نے کئی آدمی چھوڑ رکھے ہیں۔ تمہارے ڈھانچوں کو تمہاری قبروں سے اکھاڑ کر باہر پھینک دے گا۔" وہ شخص بولا۔

"ارے تم تو ہماری باتیں دہرانے لگے۔ بڑے سیانے ہو گئے۔۔۔ ہمیں ذرا قبرستان کے مغربی کونے والی قبروں کے کتبے پڑھ کر سُنا دو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ان میں کون دفن ہے۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو ہمیں ان قبروں کے مُردوں کے بارے میں بتا دو۔ سُنا ہے سرکار نے بڑا روپیہ خرچ کر کے بنوائی ہیں وہ قبریں، اور سنتے ہیں تو یہ بھی آیا ہے کہ ان میں دھرے تابوتوں کی لکڑی باہر سے منگوائی گئی ہے۔ جسے گھن بھی نہیں لگتا۔ چاندی اور سونے کی میخیں استعمال ہوئی ہیں ان تابوتوں میں۔ شاید یہ بات ابھی دنیا والوں کو پتہ نہیں چلی۔ متولی کو بھی معلوم نہیں۔ تم پہلے شخص ہو جسے ہم یہ سب کچھ بتلا رہے ہیں، ان قبروں کو دیکھنے کے لیے یہاں بہت سے سیاح آتے ہیں۔ ہم تو اس وقت اپنی اپنی قبروں میں گھسے ہوتے ہیں۔ سنتے ہیں تو یہ بھی آیا ہے کئیوں کو تو ان قبروں میں زندہ گاڑ دیا گیا ہے۔ تم بس ہمیں ان کتبوں کو پڑھ کر یہ بتا دو کہ ان قبروں میں کون کون دفن ہے۔ رات کو جب ہم اٹھ بیٹھتے ہیں اور ہماری نظریں ادھر اُٹھ جاتی ہیں تو ہمیں چین نہیں آتا۔۔۔ تم لوگ اپنے خدا یا پرماتما سے روح یا آتما کی شانتی کے لیے دعا مانگتے ہو، پرارتھنا کرتے ہو۔ تو بھیا ہم دونوں روحوں کے آرام کی خاطر ان کتبوں کو پڑھ دو اور ہمیں بتا دو ان میں کون دفن ہے۔"

"بھئی چاند کی روشنی میں تو کتبے پڑھے نہیں جائیں گے اور تمہارے پاس چراغ بھی تو نہیں۔" وہ شخص بولا

"یہ تو ٹھیک ہے" وہ دونوں روحیں بیک زبان بولیں

"ہاں یار۔ یاد آیا۔ ایک بیوہ آتی تو ہے قبرستان میں، ہر رات اپنے بیٹے کی قبر پر چراغ جلانے۔ سُنا تھا کہ پچھلے دنوں کسی ہندو مسلم فساد میں اس کا لڑکا مارا گیا تھا۔" ایک روح نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بھیا دیکھو وہ مسجد کی داہنی طرف۔ ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اٹھا لے آؤ۔ یہ تمہاری بڑی عنایت ہوگی۔ یہ جو روز روز ایک کانٹا سا ہمارے ذہن میں کھٹکتا رہتا ہے اس سے تو نجات ملے گی۔ خدا انہیں برکت دے جاؤ لے آؤ اٹھا کے وہ چراغ۔"

وہ شخص ڈرتا ڈرتا قبر سے چراغ اٹھا لایا اور وہ دونوں روحیں اس کے پیچھے پیچھے سائے کی طرح چلنے لگیں۔ ان عالیشان قبروں کے نزدیک پہنچ کر اس شخص نے ایک قبر کا کتبہ پڑھا اور پھر دوسری کا پھر تیسری کا، اسی طرح خاموشی سے وہ تمام قبروں کے کتبوں کو پڑھتا چلا گیا۔

"ارے بھائی! تم کچھ بتاتے ہی نہیں خاموشی سے پڑھے چلے جا رہے ہو۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

مگر وہ شخص اپنی دھن میں کتبوں کو پڑھتا گیا اور آخر تھک ہار کے آخری قبر کے پاس چراغ ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں روحیں بھی اس کے پاس آ بیٹھیں اور ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیوں بھائی تم چپ کیوں ہو ان کے بارے میں کچھ تو بتاؤ؟"

"تم ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔ میں اس ٹھیکے میں تھوڑی سی شراب اور پی آؤں۔ میرا تو سب نشہ ہرن ہو گیا ہے۔ اگر ان کتبوں پر لکھے ہوئے تمام لوگ مر چکے ہیں تو پھر ملک میں یہ لوگ دندناتے کیوں پھر رہے ہیں؟

"میرا تو سر چکرا رہا ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" اس نے قبر سے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ وہیں نیم کے پیڑ کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ ہمیں بھی صبح ہونے سے پہلے اپنی اپنی قبروں میں جانا۔" دونوں روحوں نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے ٹھیکے میں سے کئی چلو بھر کر پیئے تو اس کی جان میں جان آئی۔

"ہاں بھئی! اب بتاؤ تم نے تو ہمیں شش و پنج میں ڈال دیا" ایک روح نے کہا۔

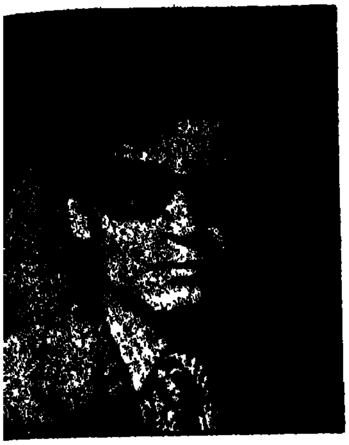
"شراب اچھی ہے۔ ذرا سی بھی ملاوٹ نہیں۔ بہت دنوں بعد

ایسی اچھی شراب پینے کو ملی ہے۔
"یہ بہک گیا ہے۔ اب کچھ نہیں بتائے گا۔ ہمیں کسی اور پڑھے
لکھے آدمی کا انتظار کرنا پڑے گا" ایک روح نے کہا۔
"ارے بیٹھو۔ بتاتا ہوں۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔ دراصل
وہاں کوئی مردہ دفن نہیں۔ وہ پہلی قبر ہے نا!" اس نے سرگوشی
میں کہنا شروع کیا۔
"وہ غلامی کی ہے۔ دوسری فرقہ پرستی کی۔ تیسری جھوٹ
کی۔ چوتھی بے ایمانی کی۔ پانچویں ظلم واستبداد کی۔ چھٹی استحصال
کی۔ ساتویں بے کاری کی۔ مگر یار یہ شراب بہت اچھی ہے۔
بدرالدین بہت ایمان دار آدمی لگتا ہے۔ مگر میرے لیے حیرانی کی
بات تو یہ ہے کہ یہ سب خرابیاں جو ان قبروں میں دفن کی جاچکی
ہیں اوران کی قبریں ہیں بھی بہت مضبوط۔ اور تمہارے کہنے کے
مطابق ان کے تابوت بھی درآمد شدہ لکڑی سے بنے ہیں تو پھر
یہ کیا ماجرا ہے کہ ان سب سے میری ملاقات روز ہوتی ہے۔
یہ سب کی سب تو زندہ ہیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میرا خیال
ہے ان قبروں کے نیچے کہیں سرنگیں ضرور ہیں۔ کسی کاریگر نے
بہت اچھا ڈیزائن بنایا ہے ان قبروں کا۔ یار۔ دیکھو وہ کون
قبرستان کی دیوار پھاند کر اندر گھس آیا ہے ارے یہ تو کئی آدمی ہیں۔۔
ان کے ہاتھوں میں تو ہتھیار بھی ہیں۔ بھئی مجھے کہیں چھپادو۔ وہ
ضرور مجھے ہی پکڑنے آئے ہیں۔ وہ مجھے گولی ماردیں گے۔ تمہارا
تو کچھ نہیں بگڑنے کا۔ تم تو اپنی اپنی قبروں میں گھس جاؤ گے۔۔۔
میں نے دیکھا تھا ان عالیشان قبروں کی قطار میں ایک قبر ابھی بھی
خالی پڑی ہے" اس شخص نے چراغ بجھاتے ہوئے کہا۔
"یہ سچ مچ مجھے ہی گاڑدیں گے اس قبر میں۔ یہ بڑے جابر لوگ
ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں ان عوام میں سے ایک ہوں"
"سالا ہوگا یہیں کہیں" ایک بندوق والے نے کہا۔
"نیتا جی خود دیکھ کر گئے ہیں اسے" دوسرا بولا۔
"ایک ایک قبر کے پیچھے ڈھونڈو۔ وہ اگر بھاگ گیا تو یاد
رکھنا تم سب کی نوکری چلی جائے گی" شاید پستول والا بندوق والے
آدمیوں کا افسر تھا کیونکہ اس کی آواز میں کرختگی کے ساتھ ساتھ
دبدبہ بھی تھا۔
"بھائی تم گھس جاؤ میری والی قبر میں۔ میں تو نیم کی اوٹ میں
بیٹھا رہوں گا۔ مجھے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا" ایک روح نے کہا
"ہمیں تمہاری بہت ضرورت ہے کیوں کہ ابھی تو اور کئی قبریں
کھدنی ہیں اور ان پر کتبے بھی لگنا ہیں۔ اگر تمہیں گولی ماردی
گئی تو ہمیں ان نئی قبروں کے کتبوں کی عبارت کون پڑھ کر بتائے
گا۔

بقیہ صفحہ ۱۷، یہ مضمون نہیں ہے

نظم بچوڑیں پڑھنے والے خون کی دھارا بہ نکلے
اس کو چھو لینے سے ہر دل کا انگارہ بہ نکلے
کیوں سب چپ سادھے بیٹھے ہو کچھ بولو کچھ بات کرو
اک "مہنگائی" سے موضوع پر اک جذباتی نظم لکھو
"تیلی آنا" از: قمر رئیس

روشنی کی منتظر آنکھیں۔ غالباً اس لیے عمل کی خواہاں ہیں کہ اگر ہمارے ادب میں اور تاریخ میں ایسے ہی تاسف انگیز اضافے
ہوتے رہے تو ہوتے ہوتے اک ایسا مجہولیت بھرا عہد ہمیں آن دبوچے جس میں ہم۔ (اکیسویں صدی قبل مسیح کے استقبال میں)"
"دیناساں یاترا" کا بشاش ناچ۔ ناچتے دکھائی دیں گے۔
کاش! ہماری زمین اس رقص کے زخم نہ کھائے۔ کاش! وہ وقت آئے کہ کوئی ادیب، اردو شاعری کے اک تاسف انگیز
سرمایہ کا کچھ حصہ ترتیب دے کر مضمون لکھنے کا دعوی دار نہ ہوسکے۔



## عرفان صدیقی

لیے چلی گئی عمرِ رواں چلے گئے ہم
یہ رنج کیا کہ بہت رائیگاں چلے گئے ہم

غبارِ راہ گذر کی بساط ہی کیا ہے
ہوا چلی تو یہاں سے وہاں چلے گئے ہم

ابھی ابھی تو یہیں اپنے پاس بیٹھے تھے
اور اس کے بعد نہ جانے کہاں چلے گئے ہم

وہی تو رمزِ پسِ داستاں سمجھتا ہے
وہ آگیا تو پسِ داستاں چلے گئے ہم

خراج کچھ نہ دیا دستِ شہریاراں کو
بہت ہوا تو لئے نذرِ جاں چلے گئے ہم

کسے خیال تھا سورج وہاں سے نکلے گا
کہ جس طرف سرِ نوکِ سناں چلے گئے ہم

یہ رَاہ و رسمِ حریفانہ کم نہیں ہوگی
اگر زمیں سے بھی اے آسماں چلے گئے ہم

دیارِ ہجر میں ہیں گردِ رہ گزر ہم بھی
ہوا چلے تو چلے جائیں اپنے گھر ہم بھی

ہماری خلوتِ جاں کا شریک وہ بھی نہیں
کہ خود سے رہتے ہیں باہر زیادہ تر ہم بھی

عجب نہیں کسی گردش سے رونما ہو جائیں
چھپے ہوئے ہیں پسِ دستِ کوزہ گر ہم بھی

اسی زمین سے آتی ہے اپنے خوں کی مہک
پھر آ گئے ہیں یہیں چل کے رات بھر ہم بھی

کبھی اگر کہیں پھر مل گئے تو درویشو
تمہیں سنائیں گے اک قصۂ سفر ہم بھی

ابھی سے کیا درِ دولت کا مُجرئی ہونا
ابھی تو زندہ ہیں اک نانِ خشک پر ہم بھی

سخت ہے مرحلۂ رزق بھی، ہم جانتے ہیں
پر اسے معرکۂ عشق سے کم جانتے ہیں

آج تک اُن کی خدائی سے ہے انکار مجھے
میں تو اک عمر سے کافر ہوں صنم جانتے ہیں

اِن کمندوں میں گرفتار نہ ہوں گے کہ غزال
زخم خوردہ ہیں مگر شیوۂ رم جانتے ہیں

یہی اک دھوپ کا ٹکڑا یہی اک کوزۂ خاک
ہم اسے دولتِ اسکندر و جم جانتے ہیں

جانتے سب ہیں کہ ہم رکھتے ہیں خم طرفِ کُلاہ
اور کیوں رکھتے ہیں، یہ اہلِ ستم جانتے ہیں

● ۱۳۴۴/سیکٹر ۱۲، آر کے پورم، نئی دہلی




شاہد مسیح الزماں

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ-۳


# سوئیاں

ایسا درد جس کا تصور ذہن کو ماؤف کرنے لگا۔ کمر کی بائیں طرف ذرا نیچے کو، ایک ہلکی کھٹک کے ساتھ شروع ہوا، ایک نقطے پر بوجھ سا اور چند لمحوں میں جلتی سوئی سی پیوست ہوتی چلی گئی، جو ہر پل موٹی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دہکتی سرخ سلاخ سی دھنسی محسوس ہو رہی ہے۔ اب وہ کھولن پھیل رہی ہے۔ اب یہ پھیل کر پسلیوں کے بیچوں بیچ پہنچ چکی ہے تھوڑا سستانے کے بعد وہ اوپر اٹھنے لگی ہے۔ ہونٹ بھینچے، دانت پر دانت جمائے وہ منتظر ہے درد کی تکمیل کا۔ ابھی جب یہ کھولتا لوہا اس کے سینے کو جکڑے گا، اس کا سارا جسم پسینے سے تر ہو جائے گا۔ ٹھنڈا پسینہ۔ جو اندر کی کھولن سے زیادہ تکلیف دے گا اس ٹھنڈے پسینے کی وجہ سے اندر کی کھولن باہر نہیں آ پا رہی ہے یہ کم بخت دل کیوں دھڑکے جا رہا ہے اس کی دھڑکن سے سینہ ہلا جا رہا ہے۔ یہ تھک کیوں نہیں جاتا، تھک کر رک کیوں نہیں جاتا۔ شاید ڈرتا ہے کہ اگر رک گیا تو پھر دوبارہ چل نہیں پائے گا۔ اس کے رکنے سے ایک پیچیدہ نظام ہے جو گڑبڑ ہو جائے گا۔ ایک اس کی بات ہوتی تو رک بھی جاتا دم بھر کو، پر یہ پیچیدہ نظام اسے دم بھر کی مہلت نہیں دے رہا ہے رگوں کا سلسلہ ہے چاروں طرف پھیلا ہوا۔ ہر رگ پیاسی، ہر رگ کو زندہ رہنے کے لیے خون چاہیے۔ سرخ، گرم جاندار خون۔ اس خون کی روانی میں فرق نہیں آنا چاہیے اور اپنے آرام سے بے پروا اپنی تکان سے بے نیاز، دھڑک رہا ہے سینہ درد سے تنگ ہوتا جا رہا ہے بہت سے خود غرض دل رک گئے۔ بہت سے پیچیدہ نظام ایک دم سے منتشر ہو گئے۔ تم کم سن ہو تمہارے حوصلے جوان ہو رہے ہیں۔ تمہاری امنگیں جوان ہو رہی ہیں۔ ابھی تمہارے ہونٹ پر ادھ کھلے پھولوں کی تازگی ہے اوس میں ڈوبی پچھلے پہر کی بوجھل نمی ہے تمہاری سانسیں کتنی جلدی تیز ہو جاتی ہیں تمہارا نرم و نازک بدن کتنی جلدی پسینے سے تر ہونے لگتا ہے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتیں۔ تم اپنی منزل کی طرف گامزن ہو اور ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ تم ایک انجانے مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہو، ہم اپنے مستقبل ہی میں جی رہے ہیں تم نئے حوصلوں کے ساتھ زندگی کی طرف بڑھ رہی ہو۔ ہم ہر پل زندگی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب سب ٹھیک ہو جائے گا، یہ انگارے اب پوری طرح سینے کے اندر دہک چکے ہیں۔ اس کے پپڑائے ہونٹوں پر کرب کے ساتھ ایک ہلکی مسکراہٹ آئی اور وہ بیہوش ہو گیا۔ بس ایک بے پناہ تھکن رہ گئی جیسے صدیوں سے گرم ریگستان میں چل کر کسی سراب کے کنارے آنکھ کھلی ہو اب چار پانچ گھنٹے تک سکون رہے گا۔ پھر اب تو منزل بھی قریب ہی ہے مگر اس میں تو اب ہاتھ اٹھا کر بھیک مانگنے کی بھی سکت نہیں بچی تھی اور بغیر گڑگڑائے کون بھیک دیتا ہے۔ مگر اس کے ہونٹ تو اب اپنی مرضی سے ہلتے تھے، کپکپاتے تھے، اس کے چاہنے سے کچھ نہ بولتے تھے۔ ہماری امنگیں ہمارے حوصلے سب ہیچ ہو چکے ان باسی ہونٹوں سے، ان کڑوی ادھ مری آنکھوں سے تم کیا توقع کرتی ہو۔ ہماری دلچسپی تم میں نہیں، اپنے وجود میں گم ہو گئی ہے امنگیں مردہ ہو چکی ہیں، جی تو چاہتا ہے ایک بار پھر جوان ہو جائیں، تمہارے جوان ساتھ کے لئے۔ مگر یہ رگوں کے پیچیدہ سلسلے جن کو سرخ، تازہ، جاندار خون چاہیے اور وہ خون سلانے کا مہیا کرنے کا نظام ہمارے ہاتھ میں ہے اس نظام میں ہم کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتے۔

آخری بار پیٹ بھر کر کب کھایا تھا، یہ تو یاد نہیں، یاد کرنے کی دماغ میں سکت کہاں۔ یہ درد کا سلسلہ کتنا پرانا ہے، یہ بھی یاد نہیں، احساس ہوتا ہے کہ یہ درد، یہ تڑپ اس کے وجود سے بہت پہلے سے ہے شاید قدرت کے کسی غلط تجربہ کے نتیجہ میں اچانک درد وجود میں آ گیا اور پھر اس درد کی تنہائی اور بے چارگی دیکھ کر، اس کی لاچاری پر ترس کھا کر مشیت ایزدی نے ایک مکان دے دیا ہے اور تب سے اس درد نے اس مکان پر اس لیے

دردی سے قبضہ جمایا کہ آج وہ ناقابلِ یقین حد تک کمزور اور لاغر جسم نہ معلوم کس طرح کتنی بار بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آیا اور بغیر کسی خاص سفارش کے ہسپتال کے بڑے پھاٹک کے بائیں کنارے پر ہزاروں مکھیوں کی آرام گاہ بنا ہوا تھا۔ بھن بھن کرتی مکھیاں جنہیں بھگانے کی طاقت اس میں نہیں تھی اور شاید ہوتی بھی تو وہ نہ بھگاتا۔ اور کون آئے گا اس کے پاس۔

پتہ نہیں کب کہاں اس نے رتھوں کی دوڑ دیکھی تھی، شاید کسی فلم کے پردے پر، چاندی، سونے کی ڈیزائنوں سے سجا بڑا سا خوبصورت رتھ۔ جس میں جوش سے پیر پٹختے بے چین گھوڑے، بڑے طاقتور گھوڑے بالکل سفید، یا بالکل کالے۔ سب کے سروں پر کلغیاں چمکتی ہوئی اور اس نے کہا تھا۔ "ابا میں بڑا ہو کر ایسا ہی رتھ چلاؤں گا" اور باپ مسکرا دیا اسے لگا کہ شاید کوئی ناممکن بات کہہ رہا ہے۔ آخر یہ رتھ چلانے والے بھی تو آدمی ہی ہیں۔ تھوڑے بڑے ہیں بس، تو وہ بھی بڑا ہو جائے گا۔ پر وہ بڑا نہ ہو سکا۔ کب کب، کون کون، کہاں کہاں چلا گیا، اسے پتہ ہی نہ چلا۔ بس آج وہ اکیلا تھا۔

کیا سوچنے لگیں تم، سوچو مت۔ یہ فاصلے میلوں کے نہیں جنہیں موٹر کار یا ہوائی جہاز یا راکٹ سے طے کیا جا سکے، یہ وقت کے فاصلے ہیں، مہینوں، سالوں، صدیوں کے۔ انہیں کون پار کر سکا ہے۔ وقت کے قیدی ان لمحوں کی جکڑن کو ہم نہیں توڑ سکیں گے۔ تم ہماری بات کیوں نہیں سمجھتیں، کیا چاہتی ہو تم آخر۔ چتا سے آگ کی لپٹیں اٹھتی ہیں، بھیانک، اونچی اونچی اور دھواں اور تپش اور پیچھے میں ہر طرف سرد ہوتی ہوئی گرم تپتی راکھ اور وقت انہیں جلتی چتاؤں کی گرمی سے زندگی پاتا ہے۔

مگر وہ اکیلا کہاں ہے؟

چاروں طرف اتنا شور۔ موٹریں، گاڑیاں، دو پہیوں کی، تین پہیوں کی، چار پہیوں کی۔ اتنے لوگ طرح طرح کے کپڑوں میں ڈھکے۔ جوان لوگ تندرست لوگ، جو تیز تیز چل سکتے تھے۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر پانی پی سکتے تھے جن کے ہونٹوں پر پپڑیاں نہیں جمی تھیں۔ سفید شفاف کپڑوں میں ملبوس جوان لڑکیاں، جوان مرد۔ سفید کوٹ پہنے گلے میں آلے لٹکائے قریب ہی موسمی کے جوس کی گاڑی کے پاس کھڑے تھکان دور کر رہے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ بس اتنی ہی طاقت بچی تھی کہ آنکھیں کھل سکے۔ ماتھے پر مکھیاں گھبرا کر اڑ گئیں اور اس نے کیچڑ بھری آنکھوں کے بیچ دھندلے دھندلے سائے دیکھے یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں ڈاکٹر کہا جاتا ہے، نرس کہا جاتا ہے، یہ تو وہ لوگ ہیں جو جسموں کو دردوں سے آزاد کرتے ہیں۔ اس کو کمر کی بائیں طرف ذرا نیچے کو ایک ہلکی کھٹک کا احساس ہوا۔ ایک نقطہ پر بوجھ سا۔ مگر اب اسے فکر نہیں ہے ابھی یہ لوگ جنہوں نے انسانیت کے دکھ درد کو دور کرنے کی بے لوث ذمہ داری کی قسمیں کھائی ہیں، پلٹیں گے اور اس کا درد اس پیوستہ جلتی سوئی سے آگے نہ بڑھ پائے گا۔ ابھی سامنے کی دکان سے سگریٹ لے کر اور یہ گرم سرخ دہکتی ہوئی سلاخ یہیں پھینک جائے گی۔ شاید وہ بند کنارے پر ہے تبھی تو وہ لوگ اسے بنا دیکھے نکل گئے۔ سارے ارادے جمع کر کے اس نے اپنے کو اور سامنے گھسیٹ کر پہنچایا۔ نہیں یہ تو موٹر پر بیٹھے ڈاکٹر ہیں۔ اتنی اونچی موٹر سے نیچے پڑے بیمار کو کیا دیکھ پائیں گے اگر وہ کھڑا ہو سکتا تو شاید۔ مگر یہ تصور تو رتھوں کی دوڑ سے بھی ناممکن لگا۔ یہ دو ڈاکٹر ہی تو ہیں جو اسکوٹر سے اسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ "بیمار یہ گیٹ کے سامنے سالے مرنے کو آ جاتے ہیں۔ ابھی کسی موٹر کے نیچے آ جائے گا سالا۔" اور وہ اس موٹر کا انتظار کرنے لگا جو پسلیوں کے بیچوں بیچ پہنچ کھولی کو روک سکے تین، چار، پانچ، بیسیوں سفید کوٹ والے مسیحا گزر گئے۔ اس نے ایک بار پھر تمام حوصلہ جمع کر کے اپنے کھوکھلے سینے کو مردہ ہاتھوں سے دبانے کی کوشش کر کے اپنے پورے وجود کی قوت اکٹھا کر کے چیخنا چاہا "ڈاکٹر میں اب اس درد کے لائق نہیں رہا۔ ڈاکٹر تم تو اپنی زندگی دردوں ہی کو دور کرنے کے لیے وقف کر چکے ہو۔ اچھے ڈاکٹر خدا تمہارا بھلا کرے۔ ایک عرصہ سے یہی درد میرا ساتھی ہے۔ اس درد کے سوا دنیا میں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے مگر اب میرے بدن میں اتنی طاقت نہیں کہ اسے اور سنبھال سکوں۔ تم ڈاکٹر ہو تمہیں انہیں دردوں کی بدولت زندگی گزارنا ہے۔ اسے اس کمزور لاغر پنجرے سے آزاد کر دو۔ اس درد کو آزادی دلا دو۔ میں اب اسے پال نہ پاؤں گا ___"

ہاؤس جاب کر کے ڈاکٹر مرتیش کو اپنی بائیں طرف سے ایک غیر انسانی خرخراہٹ کی آواز نے متوجہ کیا۔ پتلی پتلی دو ٹانگیں کسی چیل کے پنجوں کی طرح گوشت سے عاری انگلیاں پسلیوں کے ڈھانچے سے چپکے میلے بوسیدہ کپڑے کو جکڑے ہوئے، دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں، جسم میں خون کی کمی سوکھتا جگر، وٹامنس کی ہر طرح کی کمی dehydration [illegible] اور اپنی سالوں کی تعلیم کے نتیجے میں ڈاکٹر مرتیش کی مستعد آنکھوں نے چند سیکنڈ میں ہی سیکڑوں کمیوں کو بھانپ لیا۔ ڈاکٹری ذہن بالکل فطری طور پر اسٹینڈ پر رکھی ہوئی گلوکوز اور خون کی بوتل کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا لیکن پھر چونک کر گھڑی پر نظر ڈالی، بجھتی سگریٹ کے دو قیمتی کش لے کر اسے زندہ کیا اور جیب سے ایک سکہ نکال کر زندگی کے آخری آغاز اور پیچھے ہوتی ہوئی آنکھیں

باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے



## فاروق شفق

یہ ڈھلتی دھوپ چھاؤں کیا ہے جو مسرور ہو جائیں
ملے دو پل کی شہرت اور ہم مغرور ہو جائیں

نہیں اب تک چھوا جن کو ہمارے پاک ہاتھوں نے
ہمارے سامنے وہ پھل گریں اور چور ہو جائیں

دعا ہے ایسا کوئی حادثہ ہم پر نہیں گذرے
اُجالا گھر میں ہو آنکھیں مگر بے نور ہو جائیں

بہت سی مشکلیں بھی شام اپنے ساتھ لاتی ہے
کہیں ایسا نہ ہو ہم گھر سے اپنے دور ہو جائیں

یہ رنگا رنگ منظر خوبصورت تتلیوں جیسے
نہ اتنا پاس جاؤ آنکھ سے یہ دور ہو جائیں

جہاں ہوں نیچے گھر اونچا مکاں اچھا نہیں ہوتا
بہت معمولی باتیں بھی جہاں مشہور ہو جائیں

غزل کی سلطنت میں آج تک سورج نہیں ڈوبا
شفق آساں نہیں ہے آپ یوں مشہور ہو جائیں

رات کے موتی، اوس کے دانے کس کو ملیں گے دل کیا جانے
صبح ہماری کیسی ہوگی رات کا پچھلا تارا جانے

دھوپ کی پتی دھانی دھانی، شبنم شبنم میری خواہش
چھم چھم کرتی سونا جیسی ریت کو بہتا دریا جانے

کاغذ کے رنگین پھولوں پر تتلی کو دیکھا ہے کس نے
پل دو پل کی خوشیوں کو بھی دل اپنا اک سپنا جانے

ہم ہیں چلتے پھرتے راہی رات پڑے گی سو جائیں گے
شام کا لیکن تنہا پنچھی اپنا ایک ٹھکانہ جانے

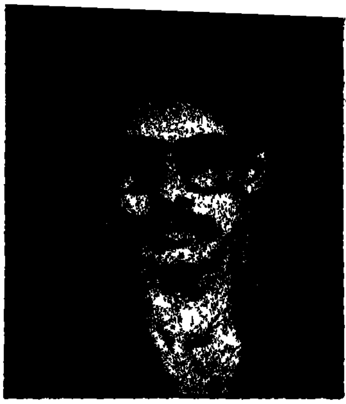
اپنے ہی گھر کی دیواریں جب خود اپنی دشمن ٹھہریں،
کس سے کوئی رشتہ جوڑے کس کو کوئی اپنا جانے

بھیگی لکڑی اندر اندر سلگے کوئی جان نہ پائے
شعلہ لپکے گھر روشن ہو، سارا قصہ دنیا جانے

چابک کھا کر بھی جیتے ہیں شبنم پی کے کھل اٹھتے ہیں
پھول کا جینا دل کیا جانے دل دن رات دھڑکنا جانے

پرندہ چپکے سے یہ کہہ گیا ہے — ابھی کچھ روز موسم رہ گیا ہے
اسی اک پھول سے روداد سن لو — جو شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے
چھپائے تشنگی اب تک کہاں تھے — یہاں دریا کا دریا بہہ گیا ہے
وہ بھیگی ریت پر کچھ لکھتے لکھتے — ہمارا نام لکھ کر رہ گیا ہے
دیا کرے گا وہ اپنے بجھا کر — اندھیرے گھر میں تنہا رہ گیا ہے
ہوا دن، شام گذری، رات آئی
شفق اس کے سوا کیا رہ گیا ہے

جی - ۱۸۵،
دھان کھیتی گارڈن ریچ،
کلکتہ ۲۴




**ارشد مسعود ہاشمی**

کرہ محلہ، چندوارہ، مظفرپور (بہار)


# لوہ سوں کی نظمیں

لوہ سوں جدید چینی ادب کا باوا آدم اور آباد کار کہلاتا ہے۔ چین کی شعری اور ادبی تاریخ میں وہ ایک عظیم مصنف، مفکر اور انقلابی دانشور کی حیثیت سے معروف ہے۔ اس کی پیدائش چین کے "زیچیانگ" صوبہ کے شاؤ زنگ قصبہ میں ۲۵ ستمبر ۱۸۸۱ء کو ہوئی تھی ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو طویل جدوجہد آزادی کے بعد لوہ سوں اپنے عقب میں چین کی تاریخ میں ایک مشعل راہ چھوڑ کر وفات پا گیا۔

لوہ سوں نے اپنی ادبی تحریکوں کے ذریعہ اس قدیم آدم خور نظریاتی نظام کی بنیاد ڈھادی جس نے چین کو کئی ہزار برسوں سے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ عوام کو اس نے ایک نئی نظریاتی بنیاد اور تہذیب سے روشناس کرایا۔ قدیم چین کے تاریک دور میں لوہ سوں اپنے عقب میں موجود عوام کو زندگی کی نئی روشنی سے آگاہ کراتے ہوئے نئے نظریاتی نظام سے متعلق مشعل کو لے کر آگے بڑھا۔ آدمی کی نجات اور آزادی اس کی منزل مقصود تھی۔

لوہ سوں نے اپنی اور اپنی قوم کی بقا کی جدوجہد کے لیے مختصر کہانیوں، مضامین اور شاعری کا سہارا لیا۔ اس کی اور جدید چینی ادب کی پہلی مکمل مختصر کہانی "ایک پاگل شخص کی ڈائری" کی ۱۹۱۸ء میں اشاعت سے قبل اس کی دس منظوم کاوشیں منظر عام پر آ چکی تھیں حالانکہ اس کی نظموں کی تعداد محدود ہے مگر یہ فنی اعتبار سے نہایت ہی جامع اور کشش انگیز ہیں۔ اس کی مختلف نظموں کا مطالعہ چین کے مختلف ادوار کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ دستاویزی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور ان میں شعری اصول کو بھی برتا گیا ہے۔ "اپنے عکس پر" میں اس کی حب الوطنی عوام الناس سے اس کا گہرا پیار اور چین کی آزادی کے لیے خود کو وقف کر دینے کے فیصلہ کے احساسات بے حد نمایاں ہیں۔ "فان آئینانگ کی یاد میں تین نظمیں" کا مطالعہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد کے سیاسی حالات کو ایک خاص انداز میں واضح کرتا ہے۔

نظم "خود تمسخر" اس کی انقلابی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ خوف و دہشت کے دور میں لوہ سوں نے اپنی ہنسی اڑانے کے فن کو اپنے غیر متزلزل عزم اور انقلاب یقینی کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے اس جذبہ کی پر خلوص گہرائی "محبت کا پرچم" اور "نفرت کی یادگار" میں پوری طرح موجود ہے۔

۱۹۱۸ء میں اکتوبر انقلاب سے متاثر ہو کر چین میں خانہ جنگی کے خلاف ایک انقلابی ادبی تحریک شروع ہوئی جس میں مصنفوں سے مستند اور کلاسیکی چینی کی جگہ مقامی زبان میں طبع آزمائی کی فرمائش کی گئی۔

لوہ سوں نے نہ صرف یہ کہانیاں اور مضامین لکھ کر بلکہ عوامی اور عمومی زبان میں نظمیں لکھ کر بھی اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ "جی وائی جی" کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے "کیونکہ مستند شاعری کا فہم لوگ زیادہ نہیں رکھتے اس لیے ہم نے حقیقت نگاری کو اپنا نقارہ بنا لیا"۔

لوہ سوں کے احباب نے دوسری دہائی تک کی اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظموں اور مضامین کو یکجا کر کے "پرجوش اور ساکن منکرشے" کے نام سے شائع کروایا۔ جب کہ ایم ٹی کے محتسبوں نے اس مجموعہ کا مطالعہ کیا، جس میں کچھ کلاسیکی نظمیں بھی تھیں،

انہوں نے اس کے دس مضامین پر پابندی عائد کر دی۔ لوہ سوں اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے۔ "پرجوش اور حاکن ٹکرٹے" سے صرف سں مضامین کو کاٹا گیا ہے لیکن ایک بھی کلاسیکی نظم کو نہیں، ہر چند کہ وہ سب واضح ہیں۔ لوہ سوں جانتا تھا کہ ان کے اندر معیاری تعلیم کی کمی ہے اس لیے وہ ان نظموں کو نہیں سمجھ سکے اور انہیں یونہی پاس کر دیا۔ اس لیے اس نے ایمائی انداز میں لکھا: "آج کل کے کُود کے کیے اور ان کے مالک تھوڑی بھی ذہانت نہیں رکھتے۔"

چینی زبان کی مستند شاعری، جس میں لوہ سوں نے طبع آزمائی کی، خصوصًا دو طرح کی ہیں۔ لوشی اور یوتجو۔ لوشی میں آٹھ سطریں اور سات کردار ہوتے ہیں جبکہ جو یتجو چار سطروں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان میں چار سے پانچ کردار ہوتے ہیں۔ لوہ سوں نے پہلی مرتبہ اپنے احساسات کو غیر محسوس پیرائے میں بیان کرنے کے لیے مختصر نظموں کے فارم میں طبع آزمائی کی۔ اس سے قبل کے کلاسیکی گانے اور آلعا کافی طویل اور نثری انداز میں پیش ہوتے تھے۔

جو یتجو اسلوب کے اعتبار سے بے ضابطہ ہوتی ہیں اور متضاد کے استعمال کا اصول "لوشی" کی نسبتًا سخت نہیں ہے۔ چار سطروں کی وجہ سے نظم کافی جامع ہو جاتی ہے اور گہرا اثر رکھتی ہے۔ پہلا شعر متفق ہو یا نہ ہو مگر تیسری سطر میں ایک مضبوط اور مؤثر انجام کے لیے کوئی گہرا مفہوم ہوتا ہے۔ موزوں تلمیح و کنایہ کا استعمال نظم کو زیادہ مستحکم اور دل چسپ بنا دیتا ہے لوہ سوں نے بھی عمومًا کنایہ کا استعمال کیا ہے۔ لوشی میں متضاد کے بیان کی سختی ہے اس کے باوجود ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر تلمیح و کنایہ زیادہ ہیں اور دور از کار ہیں تب ان سے مفہوم بدل بھی سکتا ہے۔

لوہ سوں پر تانگ شاعری کا گہرا اثر تھا۔ تانگ سلسلۂ سلاطین میں جو یتجو اور لوشی بہت عام تھے۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے "میں سوچتا ہوں کہ جتنی بھی اچھی نظمیں ہیں وہ تانگ کے آخری ادوار میں منظر عام پر آئیں۔ ان کے یہاں تلمیحات کا استعمال موزوں ہے — لی شانگیان بھی اچھا شاعر ہے لیکن اس کے یہاں تلمیحات کا وافر استعمال مجھے پسند نہیں۔" لی شانگیان تانگ سلسلہ کے آخری دور کا ایک شاعر تا جسکی "لوشی" کافی مقبول ہوا کرتی تھی۔ مگر اس کے یہاں تلمیحات اس قدر ہوتی تھیں کہ صحیح معنیٰ اخذ نہیں ہو پاتے تھے۔ "گوؤ مارود" کہتا ہے کہ اس کی نظمیں تانگ شاعری کی یاد تازہ کرتی ہیں، صرف اس لیے نہیں کہ وہ کلاسیکی عروض کی تعمیل کرتی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے خیالات طبع زاد اور وسیع تھے۔ اس کی زبان صاف و شستہ تھی اور اس کے اندر وسیع محسوسات پوری طرح سے قلم بند ہوتے تھے۔ اور یہ سبھی پہلو لوہ سوں کی شاعری میں ملتے ہیں۔ کچھ ناقدوں نے اس کے یہاں عامیانہ زبان اور حریت پسندی کے استعمال کو اصول شاعری سے بعید گردانا ہے۔ حالانکہ یہ یک طرفہ تنقید ہے، کیونکہ ایسا صرف ہجویہ نظموں میں ہے، مثلاً "ادچیلا کے نام" اور "سال نو ۱۹۳۳ء" جس میں عامیانہ زبان اور غنائی انداز ہجویہ اثر کو برقرار رکھنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ایک شعر کی دو سطروں کے درمیان آواز کا اتار چڑھاؤ اور بیان کی شدت قوی ہو جاتی تھی۔

لوہ سوں نے اسے زیادہ بااثر طریقے سے جذباتی طور پر پیش کیا۔ اس کی عمدہ مثالیں "کانٹوں سے بھرے میدان" اور "شب خزاں کا عکس" ہیں۔ لوہ سوں نے انقلابی جد و جہد کے لیے واضح باتیں نہ کہہ کر موزوں جذباتی تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ "زیانگ ندی کی دیوی کا گیت" اور "اودار نچے اور جنوبی آسمان کے تلے" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

لوہ سوں کی پاس انگیز نظموں میں عہد قدیم کی مرثیہ نما نظم "لی ساؤ" جیسی زبان و بیان پایا جاتا ہے۔ یہ نظم قویوآن سے منسوب ہے جس کی پیدائش "وارنگ اسٹیٹ پریڈ" (۳۰۴ تا ۲۲۱ ق م) کے دوران ۳۰۴ ق م میں ہوئی تھی۔ "لی ساؤ" کی مختلف ناقدوں نے مختلف قسم سے وضاحت کی ہے۔ بعض اسے "رنج سے مڈبھیڑ" اور "انحراف کا رنج" کہتے ہیں اور بعض جدید ناقد اسے کشیدگی کا رنج گردانتے ہیں۔ یہ طویل غنائی نظم ایک مضطرب روح کی تلاش اور ازالۂ سحر کو واضح کرتی ہے؛ جو سانپوں اور خطرناک جانوروں پر چڑھ کر ارض دہشت کا چکر لگاتی ہے۔ آسمان میں غوطے لگا کر جنت کے دروازے پر جاتی ہے پھر کائنات کی چھت پر چڑھ کر ادھر اُدھر بھٹکتی ہے مگر اسے کہیں سکون نصیب نہیں ہوتا اور تنگ آکر خود اپنی جان لے لیتی ہے۔ شاعر نظم کے آخر میں کہتا ہے۔ "یہاں تک کہ جنت میں بھی اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

لوہ سوں کی ۲۳ نثری نظموں کا مجموعہ "جنگلی گھاس" کافی مقبول ہوا۔ اس میں تشبیہات و استعارات کا کافی استعمال ہوا ہے۔ جُدا

ہوتی ہوئی پرچھائیں"، "کتبہ"، "گم شدہ خوب صورت جہنم"، "خزاں کے زرد دھبوں کے درمیان"، "اظہارِ خیال" وغیرہ اس مجموعے کی عمدہ نظمیں ہیں، جن میں لوہ سون نے جدید چینی شعری روایات کو سلیقے سے برتا ہے۔

لوہ سون کا شعری اسلوب ایک ایسے مزاج و آہنگ کا حامل ہے جس میں عصری زندگی کی گہری بصیرت بھی ہے، مشاہدات کی گہرائی باریکی اور تخیلی رومانیت کی بے پناہ حیات آفرینی کشش بھی اس کے اظہارِ بیان کے طریقے خواہ نحو ہوں یا، جو یا پھر تلمیحات پر مشتمل ہو اس کی سبھی تخلیقات اپنے موضوع کو واضح کر دیتی ہیں۔

"ماؤ کے مطابق لوہ سون جس راہ پر گامزن تھا وہ چین کی قدیم تہذیب اور ادب کے لیے ایک نئی اور انوکھی راہ تھی۔ اس کی نظمیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔"

لوہ سون کی چند نظموں کے ترجمے درج ذیل ہیں۔

①

خالق اب ببول ہو چکا ہے
وہ جلانا چاہتا ہے
ارض و بہشت کو خفیہ طور پر
لیکن جرأت نہیں اس میں
اس دنیا کو برباد کرنے کی
وہ زندہ مخلوق کو
ملنا چاہتا ہے، خفیہ طور پر
لیکن جرأت نہیں اس میں
مردہ اجسام کو منجمد رکھنے کی
وہ پھیلانا چاہتا ہے
نوعِ انسانی پر خون کے بادل خفیہ طور پر
لیکن جرأت نہیں اس میں
خزاں کے دھبوں کو واضح رکھنے کی
وہ دینا چاہتا ہے
ابدی اذیت نوعِ انسانی کو، خفیہ طور پر
لیکن جرأت نہیں اس میں
اسے ہمیشہ یاد رکھنے دینے کی
دعا کی قسم کھائی ہے
ریگستانی کھنڈر اور
ویران مقبروں میں
عالیشان محل کھڑا کرنے والا
حقیقت ارض کے دھبوں کو مٹانے میں
وقت کا استعمال کرنے والا
دوبارہ بھی میٹھی، کڑوی شراب پلا کر
لاابالیانہ رحم بخشی ظاہر کرنے والا
یہ وہ نوعِ انسانی کو دیتا ہے
بکھر وہ جائے بھی
رو بھی سکیں، ہنس بھی سکیں
مرنے کے بعد ماکریں، جہنم کی خواہش بھی رکھیں
[خزاں کے زرد دھبوں کے درمیان]

②

جہنم کے کنارے اک بیاباں میں پڑا تھا میں
ایک عظیم شخص، وجیہہ اور مہرباں
پُرنور جسم بدمست،
میرے سامنے تھا
معلوم یہ ہوا کہ ابلیس ہے
"یہ بہشت کی حد ہے، ہر ایک شے کی حد
بدبخت روح نے
اپنے جسم کو گم کر دیا"
وہ رنج و الم اور حقارت سے بولا
"یہ تب کا واقعہ ہے جب
ارض و سما شہد کے رنگ جیسے تھے
بارگاہ خدا میں خود سر ابلیس آیا
مختارِ کل سے کہا گیا
وہ برواس کے ارض و بہشت و جہنم ہوئے
وہ جہنم میں وارد ہوا
وسط میں بیٹھا اور چمکیلی روشنی
تمام بداروّاح پر اس نے منعکس کی
جہنم جو تھا فصلتوں کا شکار
کانٹوں کے درختوں کا جاہ و جلال
ماند پڑ چکا تھا
زمانہ گزرا
ابلتے ہوئے تیل کو جوش دیتے ہوئے
سڑی ہوئی پیپ کو غذا دیتے ہوئے
آگ کے لپکتے شعلے دھواں بن چکے تھے۔
اور بہت عذاب بھی
کچھ مردم گیاہ کے پھول کھلتے ہیں
بہت چھوٹے زرد اور بے رنگ
لیکن اس میں حیرت کی بات نہیں
کہ زمین خاکستر ہوئی، زنجیریں مفقود
سرد آگ اور منجمد تیل کے درمیان
ابلیس کے جسم کی گردشیں ہیں
بداروّاح نے دیکھا
جہنم کے زرد اور بدرنگ پھولوں کو
اور سحر زدہ ہو گئے
انہیں وحشت یاد آئی
انسانوں کی دنیا
اور انسان کو مخاطب کر، وہ
جہنم کی مذمت کرنے لگے
انسان نے جواب دیا
اٹھ کھڑا ہوا، حق کو سہارا دیا
ابلیس کے خلاف جنگ چھڑی
گرج سے زیادہ زوردار جنگ کی چل پہل
تینوں حصے لرز گئے
بالآخر فریب اور عیاری سے ورغلا کر
اس نے ابلیس کو جہنم سے نکال دیا
فیصلہ کن فتح کے بعد
جہنم کے دروازے پر
انسانیت کا پرچم لہرایا
بداروّاح اب بھی خوش تھے
جب انسانوں کا ہجوم
جہنم کو سنوارنے آیا
انسان جہنم کے درمیان پہنچا
ابلیسوں کا حکمراں ہوا
جہنم کے حاشیے پر بداروّاح نے دوسری چیخ ماری
اور پھر سب انسان کے خلاف باغی ہوئے
اس جرم کی پاداش میں
وہ ابدی لعنت کے مستحق قرار پائے
اور مصروف رہنے
کانٹوں کے درختوں کے درمیان
تب انسان نے اختیارِ کامل سے
جہنم پر حکمرانی کی
اس نے احکامات جاری کیے
شعلوں کا ایندھن فراہم کیا
جہنم کے نقشے کو تبدیل کر دیا
مردم گیاہ کے پھول دھتکارے
اور تیل اُبلتا رہا
تلوار کی دھار، شعلوں کی لپک تیز
بداروّاح پہلے ہی کی مانند
تکلیف سے کراہتے رہے
اس وقت تک کہ
ان میں سے کچھ نے
حسین جہنم کے کھو جانے کا افسوس
یہ آدمی کی کامرانی تھی، ابلیسوں کی
ہاں، دوست، ہماری بدبختی!
[گم شدہ خوبصورت جہنم]

③

میں نے سپنا دیکھا۔
خود کو مقبرے کے سامنے پایا
اس کا کتبہ پڑھتے ہوئے
کتبے کا پتھر سیاہ تھا
نشان پڑے تھے کائی جمی تھی
میں نے کتبہ پڑھا۔
بہشت میں عالمِ اسفل دیکھا
سبھی آنکھیں پژمردہ تھیں
ناامیدی میں نجات کی جھلک تھی
زہریلے سانپ کی شکل میں
ایک روح بھٹکتی تھی
دوسروں کو ڈسنے کی جگہ
خود کو ڈستی تھی
اور اس طرح فنا ہو گئی
"وہ جو ... !"
قبل کہ میں قبر کے پیچھے جاتا
تیرگی و تاریکی سے ڈھکی ایک قبر دیکھی
جس پہلو سے نہیں بچے تھے
جو مسمار ہو چکی تھی

نشان کے ذریعہ میں نے اندر دیکھا
ایک سڑی ہوئی لاش
شکم پھٹا تھا، آنتیں باہر تھیں
دل اور جگر غائب تھے
جب کہ اس کا چہرہ رنج و مسرت سے عاری تھا
لیکن فہم و ادراک کی تہہ جمی تھی
اس سے مل کر میں دہشت زدہ تھا
میری نظر اس کے کتبے پر پڑی
شـ.... میں نے نوچ ڈالا اپنے دل کو
کھانے کے لیے، ذائقہ حاصل کرنے کے لیے
لیکن تکلیف اس قدر تھی
میں ذائقہ کیسے کہتا
جب درد دوا ہوا
میں نے دل کا ذائقہ لیا، آہستہ آہستہ
مگر تب تک یہ بے مزہ ہو چکا تھا
میں ذائقہ کیسے کہتا
مجھے جواب دو تو یا
"دور ہو.....!"
میں دور ہونے کو ہی تھا کہ
لاش اٹھ بیٹھی قبر میں
خالق کٹ لی کیے اس نے کہا
تب میں راکھ ہو جاؤں گی
تم مجھے مسکراتا دیکھو گے

[کتبہ]

④

وقت کے نقش پا کو کھو کر جب تم سو چکو گے
تمہاری پرچھائیں جدا ہو سکتی ہے، یہ کہتے ہوئے
کچھ بہشت میں جو مجھے ناپسند ہے
میں وہاں جانا نہیں چاہتی
ایسا کچھ ہے دوزخ میں جو مجھے پسند نہیں
میں وہاں جانا نہیں چاہتی
ایسا ہی کچھ ہے تمہارے سنہرے مستقبل کی دنیا میں
میں وہاں جانا نہیں چاہتی
یہ تم ہو اس لیے مجھے ناپسند ہو
دوست میں تمہارا ساتھ ہمیشہ نہیں دے سکتی
میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی، نہیں چاہتی
میں معدومیت میں آوارہ پھروں گی
صرف ایک پرچھائیں ہوں
تمہیں چھوڑ تیرگی میں سما جاؤں گی
اندھیرا مجھے نگل لے گا، روشنی شانے کی وجہ سے بھی
میں بھٹکنا نہیں چاہتی روشنی اور سائے کے درمیان
خواہ سپیدۂ سحر ہو یا دھندلی شام
صرف راکھ جیسے لفظوں کی شناسائی ہوں

گر شعلہ سا پیالہ خالی کرتا ہو
میں اکیلے ہی بہت دور چلی جاؤں گی
آہ! اگر شام کا دھندلا پن چھایا
کالی رات مجھے نگل لے گی
طلوع صبح ہوئی تو
دن کی روشنی میں کھو دی جاؤں گی
میں تاریکی میں داخل ہوئے کو ہوں
معدومیت میں بھٹکنے کے لیے
اب تک تم توقع رکھتے ہو مجھ سے کسی تحفے کی
کیا ہے میرے پاس، کیا اصرار کرو گے
وہی تیرگی اور معدومیت فقط
تمہارے لیے میں تاریکی پسند کروں گی
جو غائب ہو سکے دن کے اجالوں میں
میں معدومیت پسند کروں گی
جس پہ تمہارا دل کبھی قابض نہ ہو

-----------

تیری دوست میں چاہوں گا
تاریکی میں دور تک چلا جانا
دوسرے جس سے تم خارج ہو گی، کہ
دوسری پرچھائیاں تھی
صرف میں ہوں گا اکیلا، پوری دنیا میری ہوگی!

[جدا ہوتی ہوئی پرچھائیں]

⑤

ماحصہ سے چلتی باد مخالف جنگلوں کو پُراسرار بناتی ہے
تاریک آسمان کے نیچے سبھی پھول مرجھا جاتے ہیں
کیا تم کر سکتے ہو تخلیق من کی ایک ہی قسم کی
موسم بہار کے پہاڑوں کو سرخ رنگ دے کر

⑥

میداں کانٹوں سے بھرے ہیں آسمانوں میں جنگ کے بادل گھرے ہیں
کچھ بہار کا مزہ لوٹتے ہیں، بہت ساری آوازیں خاموش ہیں
طوفان نے جس کو رد کر دیا صداؤں کی دو مار گشت ڈھونڈتے ہیں

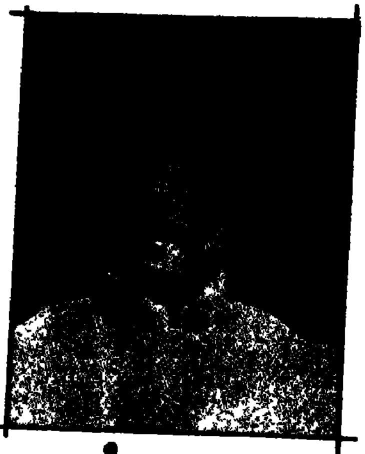
⑦

دیو پیکر دریا بہتا ہوا شب و روز مشرق کی طرف
سبھی جاں باز رواں ہو چکے اک نئے سفر کی طرف
اب خواب ہو چکی بیتے لمحوں کی آب و تاب
پتھر کے شہر کے اوپر لو چکنے لگا ہے ماہتاب

⑧

شمع کی چاروں طرف عظیم حیات کے درمیان
نوشس پوش کی حسینائیں پتھروں کے سائے میں
راکھ میں بکھرے اپنے پیاروں کی یاد میں
جرائیوں کو دیکھتی ہیں اشک چھپانے کے لیے





血沃中原肥勁艸
寒凝大地發春華
英雄多故謀夫病
淚灑崇陵噪暮鴉
高良先生教正
魯迅

لوہسوں کی تحریر

نظم "کثیر گھانس میداں میں اُگے اور لہو سے پرورش پائے"

## 無題

一枝清采妥湘靈，
九畹貞風慰獨醒。
無奈終輸蕭艾密，
却成遷客播芳馨。

一九三三年

## 贈畫師

風生白下千林暗，
霧塞蒼天百卉殫。
願乞畫家新意匠，
只研朱墨作春山。

一九三三年

### بلا عنوان

کلیوں کی پھوار ...
حلب مصری سے بھری ہوا ...
پھر گلا گھونٹ ڈالیں گے زندگی تلخ کرنے والے

### ایک رنگ ساز کے نام

عاصمہ سے چلتی باد مخالف
کیا تم کر سکتے ہو تخلیق

## 題三義塔

并序及跋

三義塔者，中國上海閘北三義里遺鳩埋骨之塔也，在日本，農人共建之。

奔霆飛熛殲人子，
敗井頹垣剩餓鳩。
偶值大心離火宅，
終遺高塔念瀛洲。
精禽夢覺仍銜石，
鬥士誠堅共抗流。
度盡劫波兄弟在，
相逢一笑泯恩仇。

西村博士於上海戰後得喪家之鳩，持歸養之。初亦相安，而終化去。建塔以藏，且徵題詠。率成一律，聊答遐情云爾。

一九三三年六月二十一日

魯迅并記。

## 無題

大野多鉤棘，
長天列戰雲。
幾家春裊裊，
萬籟靜愔愔。
下土惟秦醉，
中流輟越吟。
風波一浩蕩，
花樹乃蕭森。

一九三一年

### بلا عنوان

میداں کانٹوں سے بھرے ہیں
فلک پہ جنگ کے بادل گھرے ہیں

شنگھائی میں جنگ کے بعد جاپانی وفد کے ڈاکٹر نی شی مورا کو سڑک کے کنارے ایک زخمی کبوتر پڑا ملا ۔ وہ اسے اپنے ساتھ لیتا گیا ۔ علاج سے اس کے زخم مندمل ہو گئے مگر وہ مر گیا ۔ اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے ڈاکٹر نے ایک استوپ بنایا اور مجھ سے ایک کتبہ تحریر کرنے کی فرمائش کی ۔ (لو سون ۔ ۲۱ جون ۱۹۳۳ء)



## علقمہ شبلی

یہ کیا کہ چہرہ نقاب اندر نقاب رکھو
یہی ہے کافی بچا کے آنکھوں کی آب رکھو

بھٹک نہ جائے کوئی مسافر رہِ طلب میں
ہر ایک نقشِ قدم میں تم آفتاب رکھو

رہ تمنا میں جن سے رقصاں ہوں ماہ و انجم
تم اپنی آنکھوں میں روشنی کے وہ خواب رکھو

افق افق آفتاب تازہ کی ضوفشانی
یہ آرزو ہے نظر نظر انقلاب رکھو

مرا تعارف ہے نام میرا، کلام میرا
تمہیں مبارک، تم اپنے سارے خطاب رکھو

● ۸۹/۵ وپ اسٹریٹ (پہلی منزل) کلکتہ — ۶۔



## رحمت امروہوی

بھٹکتے دربدر دیکھے گئے ہیں
حضورِ اہلِ ہنر دیکھے گئے ہیں

یہ مژدہ قافلے والوں کو دیدو
کہ آثارِ سحر دیکھے گئے ہیں

گذرتی ہے وہاں سے راہ منزل
جہاں سولی پہ سر دیکھے گئے ہیں

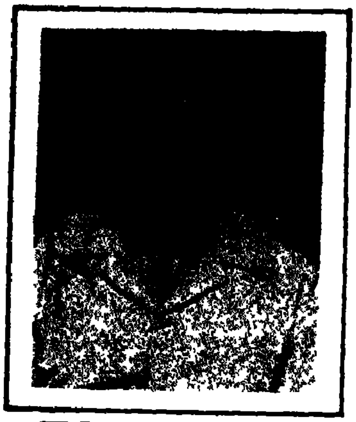
کوئی تازہ مصیبت آئے گی پھر
ہمارے بام و در دیکھے گئے ہیں

وہ جن کو بے خبر سمجھا گیا تھا
وہی کچھ باخبر دیکھے گئے ہیں

الٰہی خیر اہلِ آشیاں کی
چمن میں بال و پر دیکھے گئے ہیں

وہ جن کا گھر ہے لیکن گھر نہیں ہے
یہاں ایسے بھی گھر دیکھے گئے ہیں

● مرزاپور موٹرکاس واڑا، نزد اولڈ ادرہ ہاؤس، احمد آباد،



## ساحر شیوی

ہماری بے تکی رفتار ہو خدا نہ کرے
چلیں تو زندگی دشوار ہو خدا نہ کرے

ملے تو سب کو ملے ایک وقت کی روٹی
کوئی بھی شہر میں بیکار ہو خدا نہ کرے

یہ روز روز کے جھگڑے بھی کیا ضروری ہیں:
ذرا سی بات پہ تکرار ہو خدا نہ کرے

جلال و شان سے جس کی ہوں لوگ خوفزدہ
ہمارے سر پہ وہ دستار ہو خدا نہ کرے

جو آئینے کی طرح ٹوٹ کر بکھرتا ہو
وہ خودکشی کا طلبگار ہو خدا نہ کرے

ہنسی خوشی سے بسر ہو یہ زندگی ساحرؔ
کبھی حیات شرربار ہو خدا نہ کرے

● پوسٹ بکس نمبر ۵۱۱ ۶، نیروبی، کینیا (مشرقی افریقہ)



ولی محمد چودھری
دانش منداں روڈ، امروہہ ۲۴۴۲۲۱ (یوپی)

# بکھری ہوئی کہانی

نئے شکاری کی چھاگل پانی سے لبالب بھری تھی۔ اس کا گھوڑا قیمتی ساز سے سجا ہوا تازہ دم اور تندرست تھا۔ پرانے تجربہ کار شکاری اپنے اپنے ریشم کے جالوں کے ساتھ اس کے پیچھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلسکوپک رائفل تھی۔ رائفل کی نال اس خرگوش کی جانب اٹھی ہوئی تھی، جو کچھ دیر پہلے جنگل سے نکل کر تپتے ہوئے ریگستان میں داخل ہوا تھا اور اب کہیں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں گم ہو گیا تھا۔

خرگوش کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تپتے ہوئے لق و دق صحرا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ریگستان کے اس پار بہہ رہے شیریں چشموں تک پہنچ جائے گا۔ جبکہ شکاریوں کا خیال تھا کہ وہ جس طرح جنگل کا محاصرہ کر کے خرگوش کو تپتے ہوئے ریگستان میں لے آئے ہیں اسی طرح وہ ریگستان میں خرگوش کا گھراؤ کر کے یا تو اسے مار دیں گے یا تپتی ہوئی ریت پر تڑپ تڑپ کر مرنے پر مجبور کر دیں گے پھر ان کو فکر بھی کسی بات کی نہ تھی کیونکہ ان کی چھاگلیں پانی سے لبالب بھری تھیں اور ان کی سروں پر رنگ برنگے شاندار کپڑوں کی بڑی بڑی چھتریاں تھیں جن کو چاروں سمتوں سے ان کے غلام اٹھائے ہوئے تھے۔

چھتریوں کا کپڑا اتنا دبیز اور چمک دار تھا کہ سورج کی تیز شعاعیں اس کو پار کر کے ان کے سفاک بھیجوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

خرگوش تپتے ہوئے ریگستان میں قلانچیں بھر رہا تھا کہ شیریں چشمے اس کی منزل تھے اور نئے شکاری کی ٹیلسکوپک رائفل اس کو اپنی زد میں لینے کے لیے بے چین تھی۔

کہانی ایک بار پھر شکاری، خرگوش اور ریگستان میں پہنچ کر ٹھہر گئی۔ مندرجہ بالا سطروں کو وہ کئی مہینوں سے لکھ رہا تھا۔ لکھتا اور پھاڑ دیتا۔ لکھتا اور پھاڑ دیتا۔ وہ بے چین تھا، پریشان تھا۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ تھا، لیکن یہاں تک آتے آتے سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا۔ اس کی سوچ کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہ رہ پاتی، وہ ایک کہانی لکھنا چاہتا تھا جو لکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ ایک شاہکار بنانا چاہتا تھا جو بن نہیں پا رہا تھا۔

مہینوں سے وہ جھنجھلایا ہوا تھا، بے چین تھا۔ گھر میں، گھر سے باہر دوست واحباب میں، حتیٰ کہ کتابوں تک میں کہیں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اندر ہی اندر ایک آگ تھی جو رات بھر اسے سونے نہیں دیتی تھی۔ وہ کائنات کی ساری ہولناکی اور جملہ نیرنگیوں کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن خرگوش کے ریگستان میں داخل ہوتے ہی اس کے دماغ میں تمام گتھیاں الجھ جاتیں۔ اسے کہانی کے سارے سرے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کوئی نکتہ واضح اور روشن نہ رہ پاتا۔ سارا مواد اس کے ذہن سے دھواں بن کے بھک سے اڑ جاتا۔ کوئی کہانی، کوئی تصویر، کوئی شاہکار کچھ بھی اس کے اندر نہ رہ پاتا۔

وہ پریشان، بے چین اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا اور سوچتا رہتا کہ شاید اس کے پاس کوئی کہانی نہیں ہے۔ شاید وہ کچھ لکھنا بھی نہیں چاہتا، وہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا، شاید کہیں کچھ ہے بھی۔ ہر شئے کھوکھلی ہے خالی خالی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید کچھ .... شاید ....

وہ پھر سوچتا کہ وہ ایک کہانی لکھے گا۔ بہت شاندار شاہکار، جس میں کائنات اور انسان کے بیچ کے تمام راز سربستہ اجاگر کر دے گا۔

آج بھی وہ صبح سے بیٹھا کاغذ کالے کر رہا تھا۔ لکھتا تھا اور پھاڑ دیتا تھا۔ خرگوش بس ریگستان ہی میں قلانچیں بھر رہا تھا۔ ان سطروں کو لکھتے لکھتے رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔

بیور ہوکر اس نے اپنا قلم رکھ دیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ موسم بے حد خراب تھا۔ تیز بارش، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہوا بھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا قلم اٹھایا، چند سطریں لکھیں اور رک گیا۔ وہ سوچنے لگا، اور ساری سوچ کو ایک نقطہ پر لانے لگا۔ وہ سوچتا رہا، وقت گذرتا رہا، موسم کی خوفناکی سے بے خبر اس نے اپنے جسم کی تمام حسیات کو سمیٹ کر اپنے دماغ کو ایک باریک نوک پر جمع کیا اور اپنے اندر اترتا چلا گیا۔ اندر بہت اندر۔ شاید بہت گہرائی ۔۔۔ میں۔

کچھ دیر کے بعد اسے ایک سرسراہٹ کا احساس ہوا، یہ سرسراہٹ آہستہ آہستہ اس کے کمرے میں گونجنے لگی پھر بالکل صاف اور واضح آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔۔۔

میں ۔۔۔ں ۔۔۔ میں ۔۔۔ کہانی ۔۔۔ ہوں ۔۔۔۔ ں۔ میں کہانی ہوں۔ اس نے صاف سنا۔

"تم میری ہی تلاش میں سرگرداں ہو۔ تم شاید مجھے ایران عراق کی جنگ میں ڈھونڈ رہے ہو، جہاں اب اسکولوں کے بچوں کو محاذ پر بھیجا جا رہا ہے۔"

"تم شاید مجھے افغان مجاہدین میں تلاش کر رہے ہو جہاں مساوات کا علم بردار ملک تباہی اور بربادی مچا رہا ہے اور سیدھے سادے افغانیوں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔"

"تم شاید مجھے پنجاب کے انتہاپسندوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جنھوں نے ٹرینوں میں، بسوں میں اور راہ چلتے کتنے ہی بے گناہوں کو قتل کیا ہے ۔۔۔۔ شاید تم مجھے سکھوں کی مقدس عبادت گاہوں پر ملٹری ایکشن میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جہاں آرمی نے سیکڑوں لوگوں کو مشین گنوں سے بھون ڈالا۔"

"تم شاید مجھے دہلی کے ہندو سکھ فساد میں ڈھونڈ رہے ہو، جہاں اتنی تیزی سے آگ کے شعلے بھڑکے کہ جب تک لوگ کچھ سوچتے سمجھتے تب تک سیکڑوں بے گناہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے اور انتظامیہ کے اعلیٰ حکام بہت بلندی سے اس پورے منظر کو دیکھ رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔"

"تم شاید مجھے ناریل کے درختوں کے درمیان بیٹھی اس اداس نازک اندام حسینہ کی آنکھوں میں تلاش کر رہے ہو، جو کئی برس پہلے اپنے محبوب کو گاؤں کے اسٹیشن پر سعودی عرب جانے کے لیے الوداع کہہ کر آئی تھی اور اب اس کو خوش آمدید کہنے کو ترس گئی ہے۔"

تم شاید لوگوں کی آنکھوں میں کسی تازہ فساد کو بھول جانے کی بے حسی میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔ تم شاید اعوانوں میں چلی دوغلی سیاست میں مجھے تلاش کر رہے ہو۔ شاید تم مجھے نیلسن منڈیلا کی جدوجہد میں تلاش کر رہے ہو۔ شاید سندربن کے مزدوروں کی سوکھی ٹانگوں میں میری تلاش میں سرگرداں ہو۔ شاید پیپل کی چھاؤں میں کھیلتے ننگے بچے کے الجھے بالوں میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔"

موسم بتدریج خراب ہوتا جا رہا تھا۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں کسی طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے کمرے میں آواز بدستور گونج رہی تھی۔ میں کہانی ہوں ۔۔۔ کہانی ہوں ۔۔۔ ہوں ۔۔۔ں ۔۔۔

"تم مجھے شکاری اور خرگوش کے مابین ہی کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟ میں تو تمہارے بالکل پاس میں موجود ہوں۔ تم لکھو کر ۔۔۔ لکھو کر ۔۔۔ میں تمہارے محلہ کی ڈھلتی عمر والی کنواریوں میں موجود ہوں، میں تمہاری گلی کے ان بچوں میں موجود ہوں جو صبح کو اسکول جانے کے بجائے بیڑی کے کارخانوں میں جاتے ہیں۔ میں کہانی ہوں۔۔ کہانی ہوں ۔۔۔ تم لکھو کر ۔۔۔ میں تمہاری بیوی کے بوسیدہ لباس اور حسرت و یاس سے تم کو تکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں موجود ہوں۔ میں تمہارے گھر کے آٹے، دال کے خالی کنستروں اور ڈبوں میں موجود ہوں ۔۔۔ میں کہانی ہوں اور تمہارے اندر تمہارے چاروں طرف موجود ہوں۔ تم کبھی مجھے بلبل کے نغموں اور کوئل کی کوک میں ڈھونڈنے کی کوشش کرو، تم کبھی درختوں پر اچھلتی کودتی اور امرود کترتی گلہریوں میں مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ کبھی بھادوں کی رات میں بانسری بجاتے گاؤں کے گوالے کی جھونپڑی میں مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ میں کہانی ہوں ۔۔۔ کہانی ہو ۔۔۔ں ۔۔۔ تم لکھو کر ۔۔۔ میں کہا ۔۔۔

پاس ہی کہیں آسمان سے کڑکڑاتی ہوئی بجلی گری اور سارے ماحول میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس کے کمرے میں بھی سناٹا چھا گیا، بس ایک تھرتھراہٹ تھی جو باقی رہ گئی۔



## اسرار اکبرآبادی

رنگ راہوں کے نظاروں کا بدلتا کس طرح
تم نہیں چلتے تو موسم ساتھ چلتا کس طرح

یہ ہزاروں رنگ یہ پُرکیف خوشیوں کی پھوار
غم نہیں ہوتا تو اپنا دل سنبھلتا کس طرح

چاہنے والے سحر کے رات کے شیدا ملے
دن سہانا شب کے پردے سے نکلتا کس طرح

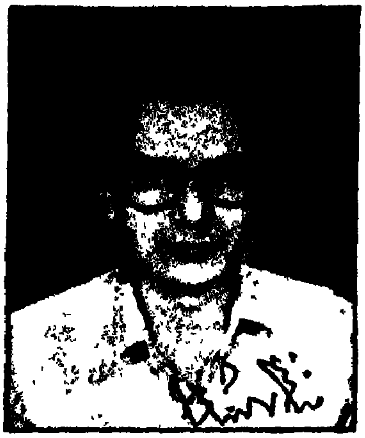
آسماں کے چاند ہی سے راستہ روشن رہا
اِن ہواؤں میں کسی کا دیپ جلتا کس طرح

جنگجو حالات، خدشے، اس صدی کے المیے
پتھروں کو توڑ کر چشمہ اُبلتا کس طرح

کچھ دلوں میں پیار ہے کچھ جستجو ہے خیر کی
سمتِ مغرب سے ابھی سورج نکلتا کس طرح

رات کا لمبا سفر اسرار یہ جنگل کا خوف
ہمسفر ہم تم نہ ہوتے دل بہلتا کس طرح

● ۲۰/۳، ۱۸ تولا۔ آگرہ ۲۸۲۰۰۳



## مناظر عاشق ہرگانوی

# آزاد غزل

اب کے ساون ایسا آیا پنچھی گانا بھول گئے
پریم ترانہ بھول گئے

پانی برسا صحرا صحرا اُگے ببول گلابوں میں
نفرت کی ہم آگ بجھانا بھول گئے

میگھ ملہاروں کی دھرتی پر
بارودوں کے پیڑ کو ڈھانا بھول گئے

ساتھ سفر میں تم نے فن کا دکھ نہ جانا
دھند بھری راتوں میں میرا ساتھ نبھانا بھول گئے

بچے ہی سے رس کی ماں تک پہنچے تھے
بچے ہی کو گود اٹھانا بھول گئے

● کوہسار، برہ پورہ،
بھاگلپور (بہار)



## اشہر ہاشمی

میری آنکھوں میں کوئی خواب اکیلا حیراں
جھیل میں جیسے ہو مہتاب اکیلا حیراں

موجِ آوارہ کی سفینے کی طرفدار ہوئی
دیکھتا رہ گیا گرداب اکیلا حیراں

غیر مانوس رویوں کا امیں آج بھی ہے
دل جو پہلو میں ہے بیتاب اکیلا حیراں

درد کے اور بھی افسانے ہیں تشہیر طلب
پر ترے نام کا اِک باب اکیلا، حیراں

رونقِ بزم تھا، تہہ دار خموشی سے اُٹھا
چھوڑ کر حلقۂ احباب اکیلا، حیراں

لوٹ آئیں مری بیزار نگاہیں اشہر
رہ گیا منظرِ شاداب اکیلا، حیراں

● ۳۱۱- روشن گلزار لین،
بھدرک ۷۵۶۱۰۰



فردوس حیدر

ڈی/۶ فرسٹ فلور، ڈیفنس کمرشل ایریا - اے کورنگی روڈ کراچی ۴۶ پاکستان.

# پُل سراط

عبادت کو معمول بنا کر اترانے والیاں فکرمند تھیں کہ لڑکی پاگل ہو جائے گی ماں کی دانست میں پاگل ہونا بہت بڑا عذاب تھا اور اس عذاب سے بچنے کے لئے لڑکی کا رونا لازمی تھا

لڑکی تیری ماں مر گئی ہے. کہنے والی نے لڑکی کے سر پہ شفقت سے ہاتھ رکھا اور دوپٹے کے پلوسے اپنی نم آنکھیں صاف کیں رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے، کئی عورتوں نے سسکنا شروع کیا، موت بڑی ظالم ہے: اپنے پیاروں کو یاد کر کے آبدیدہ ہونے والیاں لڑکی کی سیاہ بختی پر رنجیدہ تھیں. اور چاہتی تھیں کہ لڑکی ان کی سسکیوں کے ساتھ سسکیاں ملا کے روئے .. شش. لڑکی نے انگشت شہادت سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا.

دیکھو، ماں کچھ کہہ رہی ہے، لڑکی نے میت کی جانب دیکھا، ماں کی ہونٹ ہل رہے ہیں.

گاؤں کی عورتیں دھاڑیں مارنے لگیں. انہیں یقین ہو گیا کہ لڑکی ماں کی اچانک موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی. اور اب پاگل پن کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں.

- آہ . . . بے چاری لاوارث بچی. گاؤں کی عورتیں ایک ایک کر کے اس کے گرد جمع ہونے لگیں. یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ منہ اندھیرے ایک عورت اپنی بیٹی کے ساتھ کہیں سے آئی تھی اور آستانے پہ حاضری دیتے ہی پھڑک کے مر گئی.

پابندی سے آستانے پہ حاضری دینے والیاں پریشان تھیں کہ اگر لڑکی پاگل نہ ہوئی تو اس کو کتنے بڑے عذاب سے دوچار ہونا ہوگا. زندگی کے لق و دق چٹیل میدان میں اکلاپے کا عذاب. اور دوسرا اللہ کے نام پہ خیرات دینے والوں کے احسان کا عذاب، اور خیرات قبول کرنے سے انکار کی صورت میں تشدد کا عذاب،

ماں کہتی ہے. لڑکی بار بار ہی ہے. آسمان دیکھتے ہوئے بولی. مجھ میں سلام جیسا دونوں کی سیری اور راحت کی کثرت نہ تھی. میں نے ہمیشہ محتاج کی دستگیری اور مکروہات سے دور بھاگی. پھر بھی مجھ پر ملامتوں کے تیر برسے اور مجھ پر اسیری کے شب و روز طویل ہوئے.

عورتوں نے حیرت سے دیکھا. لڑکی کے پاگل ہونے میں شبہ نہ رہا تھا. وہ میت کے سرہانے بیٹھی سب کو باور کرانا چاہتی تھی کہ ماں کے ہونٹ ہل رہے ہیں جبکہ وہ اپنی ماں کے الفاظ دہرا رہی تھی.

- سنو ماں کہتی ہے. لڑکی بولتی رہی "مجھ پہ اسیری کے شب و روز طویل ہوئے اور ان ہی دنوں میں سے کسی ایک دن میں نے ایک بچی کو جنم دیا اور کوئی بھی اس کی ناف کاٹنے. اسے غسل دینے اور کپڑوں میں لپٹنے کے لئے تیار نہ ہوا.

عورتوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا. پھر آسمان کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے.

"یا اللہ اس بچی کو اپنی امان میں رکھ" دوپٹوں کے پلو پھیلا کے دعائیں ہوئیں. لڑکی کو رلانے کے جتن تمام ہونے اور اب ڈور خدا کے ہاتھ میں دے دی گئی.

کڑوانائی حویلی کے آنگن میں واویلا کرتی ہوئی عورتوں سے دور بیٹھا پورے سین کا جائزہ لے رہا تھا. لڑکی کی باتیں بے معنی نہیں، یہ راز صرف وہی جانتا تھا. اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا. جب بادشاہ نے فضل دین کو پناہ دی تھی

اور پھر چند دنوں میں اپنی چرب زبانی سے باباشاہ کا منظور نظر ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فضل دین جرائم پیشہ ہے اور پولس کو مطلوب ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا زہرہ بائی کے ہاں فضل دین کا ٹھیہ ہے اور وہاں اسمگلنگ کے پروگرام بنائے جاتے ہیں لیکن وہ کھل کے باباشاہ کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اشاروں کی باتیں شاید وہ سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

صبح جب زہرہ بائی اپنی جوان بیٹی کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئی تو وہ سمجھ گیا تھا کہ موت کا فرشتہ اسے یہاں لے آیا ہے۔ چلتے چلتے ہی زہرہ بائی کا اپنی بیٹی کی جانب دوڑنا اور کچھ کہنے سے پہلے پھڑک کے مر جانا سب کچھ واضح تھا۔ چائے بنا کر لانے اور برتن اٹھا کر لے جانے کے وقفے میں جو کچھ بھی ہوا ہو گا وہ جانتا تھا۔ ٹوٹے جوڑ کے کہانی بنانا اس کے لئے آسان تھا لیکن اس کہانی پہ یقین کون کرے گا۔ اس کے اندر کا وعدہ معاف گواہ تڑپنے لگا۔ بے بس پرندے کے مانند مجھے پولس کو اطلاع دینی چاہیے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"بیٹا موت کا ایک وقت مقرر ہے" باباشاہ نے مرتے وقت کہا تھا اس دن بھی وہ اسی طرح پگلا تھا۔ پولس کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔ اسے فضل دین پہ شک تھا۔ بلکہ یقین تھا کہ اس نے باباشاہ کو کچھ کھلا دیا ہے۔ لیکن باباشاہ نے مرتے وقت بھی خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ "سزا اور جزا کا اختیار صرف خدا کو ہے" انسان کو نہیں" وہ خاموش ہو گیا۔ باباشاہ کا اشارہ اس کے لئے حکم تھا۔ لیکن اب باباشاہ نہیں اب اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پولس کو سب کچھ بتا دے گا۔ فضل شاہ کے چہرے کا نقاب تار تار کر دے گا۔

"بے بے بلا رہی ہے" اس کی بیٹی صغرا نے اسے مخاطب کیا۔

"شاید باباشاہ ٹھیک کہتے تھے" اس نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ سزا اور جزا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کی۔ صغرا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بھرپور جوانی سمیٹ۔

فضل دین اب گدی نشین شاہ جی ہے۔ پولس بھی اسی کی ہے اس کے اندر کا وعدہ معاف گواہ کمزور پڑ گیا۔

"برسوں سے جو کچھ ہو رہا ہے ہوتا رہے۔ مجھے کیا۔ خدا دیکھ رہا ہے" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"ابا زردے کا رنگ لا دے ماں انتظار کر رہی ہے" ماں کا پیغام دیا اور چلی گئی۔ وہ بیٹی کو حویلی سے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

میری بیٹی جوان ہو گئی ہے اس نے سوچا۔ جانتا تھا کمیوں کی بیٹیوں کو کپڑے استری کرنے اور فرش مانجھنے کو بار بار حجرے میں کیوں بلایا جاتا ہے۔ میری ذرا سی چوک جیل کی دیواروں میں دفن کر سکتی ہے۔ اور میری بیٹی کو تحفظ دینے کے بہانے . . . . . وہ مزید کچھ نہ سوچ سکا۔

صغرا" وہ کانپ گیا۔

صغرا باپ کی آواز پہ چونکی۔ اور بھاگتی ہوئی واپس باپ قریب آ گئی۔

ابا کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ موت کی دہشت سارے میں پھیل گئی۔

کیا ہوا؟ کئی چہرے اس کی جانب مڑے۔

"کچھ نہیں" اس نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "تو کیا کہنے آئی تھی" "زردے کا رنگ" صغرا نے باپ کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"ابا تو نے مجھے ڈرا دیا تھا"

"میری بیٹی" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اپنے خوف کا سبب بتانا چاہتا تھا۔ لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

لڑکی کہہ رہی تھی

"سنو ماں کہتی ہے" مجھ پہ عطر چھڑکنے والا۔ مجھے زرد وزلباس پہنانے والا اور مجھے بیش قیمت زیورات سے آراستہ کر کے دوسروں کے حوالے کرنے والا میرا اپنا تھا۔ وہ میرا اپنا تھا کہ میں نے اسے اپنا خاوند مانا۔ اور اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا تھا۔

کرمو کو اچھی طرح یاد تھا فضل دین باباشاہ کی پناہ میں آنے کے باوجود اور اپنے گناہوں سے تائب ہونے کا اعلان کرنے کے باوجود بھی زہرہ بائی کے پاس جاتا تھا۔ اور اپنے بزنس پارٹنرز کے لئے خصوصی محفل کا اہتمام کرتا تھا۔ زہرہ بائی فضل دین کی خوشنودی کے لئے اس کے اشاروں پہ ناچتی تھی۔ وہ اس زمانے میں فضل دین کا مقرب خاص تھا۔ شہر کی رونق دیکھنے کے شوق میں اس نے فضل دین کی چاکری قبول کی تھی لیکن پھر چاہتے ہوئے بھی چھٹکارا ممکن نہ ہوا کہ فضل دین اپنے رازداں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔

"صغرا کے ابا زردے کا رنگ لینے جاؤ گے تو چینی بھی لا دینا۔ کم پڑ گئی ہے" وہ بیوی کی آواز پر چونکا۔

"بیگماں؟" اس نے بیوی کو اپنے قریب بلایا تو کہاں تھی۔ "بیٹھ میرے پاس"۔

"صغرا کے ابا . . . کام پڑا ہے زردے کی دیگ پکے گی۔"

بیگماں نے غور سے شوہر کے چہرے کو دیکھا۔ "تو پیلا کیوں پڑ گیا ہے؟"

ایک بار پھر کمی چہرے اس کی جانب مڑے۔ "کیا ہوا؟"

"میرے اندر کا دعدہ معاف گواہ پیلا پڑ گیا ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔ مارے خوف کے اس نے ایک بار پھر میت کی جانب دیکھا۔ موت کی دہشت سب کے چہرے پر تھی۔

حویلی کے عقبی دروازے سے سبز چوغے میں ملبوس فضل دین آنگن میں داخل ہوا۔ عورتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ شاہ جی آ گئے ایک نے دوسری کو ٹھوکا دیا اور سب اپنی اپنی بکلیں درست کرنے لگیں۔ شاہ جی کی سرمہ لگی آنکھیں عورتوں کے جھرمٹ پہ جمی ہوئی انہیں آنک رہی تھیں۔ کرمو نے غصے سے زمین پر پاؤں پٹخا اور دل ہی دل میں فضل دین کو ماں بہن کی گالیاں دے کر تسکین حاصل کر لی۔ تھڑے پر مرغیوں کے ٹوکرے کو اس نے ٹھوکر مار کر الٹ دیا اور بہت سی مرغیاں آزاد ہو کے ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ مرغے نے اذان دینے کے لئے پر پھڑپھڑائے۔ اور آذان دیتے ہی مرغیوں کے تعاقب میں بھاگا۔ شاہ جی نے روتی کرلاتی عورتوں کی جانب دیکھا اور پیار سے اپنی انگلیوں سے داڑھی کے بال سنوارے۔

تمہارے پاس مرغیاں زیادہ ہو گئی ہیں کیا؟ بظاہر کرمو کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا گیا۔ کرمو دونوں ہاتھ بغلوں میں دابے خاموش کھڑا رہا۔

"ہمارا مرغا بہت تگڑا ہے جی" صغرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سب مرغیاں انڈے دیتی ہیں"

"اچھا" شاہ جی نے بغور صغرا کو دیکھا۔ "تو بڑی سیانی ہو گئی ہے"

"ہی۔ ہی۔ ہی . . ."

کرمو کو سب کا ہنسنا بہت برا لگا۔ "میت رکھی ہے" اس نے بیوی کو ڈانٹا۔

"ہاں . . . ہاں . . . ہائے ختم شریف کے لئے زردے کی دیگ پکنی ہے۔" بیگماں چونکی۔

"چل صغرا میرے نال۔ میں خود بازار سے زردے کا رنگ اور چینی لے آؤں گی۔" لڑکی کہہ رہی تھی۔

"سنو ماں کہتی ہے میرے ہاتھ وہ ہاتھ نہیں جو دوسروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ میری زبان وہ زبان نہیں جو جھوٹ بولتی ہے اور دوسروں کو دکھ دیتی ہے۔ پھر بھی مجھے گدھوں کے حوالے کر دیا گیا۔"

کرمو کو یاد آیا زہرہ بائی کے ہاں جانے والے۔ دھوتیں اڑانے والے فضل دین کے خاص لوگ تھے اور ان ہی خاص لوگوں میں ہر کسی ایک کے قتل کا پلان فضل دین نے بنایا اور زہرہ بائی کو اس میں ملوث کر دیا۔ فضل دین نے خود بتایا تھا کہ وہ زہرہ بائی سے ادب گیا ہے اور شاہ جی شاہ کی بیٹی سے شادی کر کے صاف ستھری زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت کرموں کا جی چاہا تھا کہ فضل دین سے پوچھے زہرہ بائی کو دلدل میں پھینک کر تم صاف ستھری زندگی کیسے بسر کرو گے؟ تمہارا ضمیر کیسے گوارا کرے گا؟ لیکن وہ خاموش رہا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت بیگماں جوان تھی، اور فضل دین کی زد میں تھی، اور اب . . . اب صغرا جوان ہے۔ اس نے اپنے اندر کے وعدہ معاف گواہ کو سلا دیا۔

"ملکہ۔" شاہ جی نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "لڑکی کا سر دوپٹے سے ڈھانپ دو۔ اور سب مراقبے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

تمام عورتوں نے ایک بار پھر اپنی اپنی بکلیں درست کیں، اور سر جھکا کے بیٹھ گئیں۔

ملکہ کو یوں محسوس ہوا جیسے حویلی کی دیواریں لرز رہی ہیں۔ اور موت کی سرد لہر سارے میں پھیل گئی ہے۔ وہ مرنے والی سے واقف نہ تھی۔ گاؤں بھر میں کوئی بھی اسے نہ جانتا تھا، اور جو جان سکتا تھا وہ شاہ جی کا آدمی تھا۔ ملکہ نے بغور کرمو کی جانب دیکھا۔ وہ آنگن کے ایک کونے میں بیٹھا مرغیوں کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر پورے سین سے بے نیاز اور مرنے والی کے پس منظر سے لاعلم۔

"کرمو . . ." اس نے آواز دی۔

"جی ملکہ بی بی" کرمو نے وہیں کونے میں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اور ایک نظر شاہ جی پر ڈالی۔ ملکہ نے دیکھا دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا سنا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں۔ یہ بات نئی نہ تھی، ایسا اکثر ہوتا

رہا تھا۔ جب بھی ملکہ نے کسی حادثے کے بارے میں تفصیل چاہی کرمو کو شاہ جی کی اجازت نہ ملی۔ وہ جانتی تھی باباشاہ کی موت ایک حادثہ تھی لیکن ثابت کرنا ممکن نہ تھا۔

کرمو فضل دین کا آدمی تھا — ہے — اور رہے گا —

اس نے سوچا۔

۔ نمک حرام۔ وہ بڑبڑائی۔

کرمو نے چونک کر ملکہ کی جانب دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بے بسی کا احساس دلایا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

ملکہ نے میت کی طرف دیکھا اسے یوں محسوس ہوا نیلے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ مردہ بدن اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مرنے والی کے ہاتھوں کی انگلیاں اشارہ کرنا چاہ رہی ہیں۔ وہ دہشت زدہ کانپنے لگی بالکل اس طرح جیسے بچپن میں ایک مرتبہ بھائی کے ساتھ موت کا کنواں دیکھنے گئی تھی اور اندر جھانکتے ہی لکڑی کی تھرتھراتی دیوار پر ایک نوجوان کو موٹر سائیکل چلاتے ہوئے دیکھ کے پریشان ہوگئی تھی۔

اگر سوار کا ہاتھ چھوٹ جائے تو کیا ہوگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بھائی سے پوچھا تھا۔

اصل مسئلہ توازن برقرار رکھنا ہے۔ بھائی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔

۔ دوسری صورت میں موت ہے۔

سوار نے ہاتھ چھوڑ کر موٹر سائیکل چلائی اور موت کے کنویں میں اوپر نیچے کئی چکر لگائے۔ لکڑی کی دیواریں ہلتی رہیں اور اس کی نظروں کے سامنے موت ناچتی رہی۔ اس نے مضبوطی سے بھائی کا بازو تھام لیا لیکن موت کا خوف بدستور رہا۔

اس رات اسے بخار آگیا۔ وہ رات بھر دہشتِ موت سے کانپتی رہی۔ اور نیم بے ہوشی کے عالم میں سوار کو موت کے کنویں سے بچانے کے جتن کرتی رہی۔ اگلے دن اس کا بھائی گھر سے باہر نکلا اور سڑک پار کرتے ہوئے ٹرک کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا تو اس پر انکشاف ہوا موت کا کنواں ہر جگہ موجود ہے

ملکہ نے بے بسی سے آسمان کی جانب دیکھا، حدِ نظر تک چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ کسی نے چھت پر صدقے کا گوشت پھینکا ہوگا۔ اس نے سوچا صدقہ تو ہم ہیں۔ زندہ رہیں تو روزانہ آور کے کام آئیں مر جائیں تو کیڑے مکوڑوں کے۔ خدا نے عجیب قانون بنایا ہے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جائے۔ کیا چھوٹی مچھلی کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟

اس کی نگاہ آنگن کے اس کونے پر جا ٹھہری جہاں لکڑی کا تختہ ہنسک کا نور۔ بالٹی میں گرم پانی اور کفن کا سفید کپڑا رکھا تھا۔ میت کو نہلانے دفنانے کی تیاری مکمل تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا وہ خود ایک لاش ہے اور یہ سب تیاری اس کے لئے ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اسے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اسے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے زندگی کے ساتھ۔

اس نے سوچا۔

" جب بھائی صاحب فوت ہوئے تھے میری دنیا تاریک ہوگئی تھی۔ میں نے موت کو اس قدر قریب سے دیکھ لیا تھا کہ دہشتِ موت کا احساس تک نہ رہا تھا۔ میرا خیال تھا میں بھی مر جاؤں گی لیکن زندہ رہی۔ پھر باباشاہ فوت ہوئے اچانک . . . . . نہ ٹریفک کا حادثہ پیش آیا۔ بیمار ہوئے — اس مرتبہ مرنا میرے لئے یقینی تھا۔ کس کے لئے زندہ رہتی۔ سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا لیکن میں زندہ رہی۔ فضل دین نے آستانہ سنبھال لیا اور گاؤں والوں نے مجھے سنتِ رسول پہ مجبور کر دیا۔ میری پسند اور ناپسند کا کسی کو خیال نہ آیا۔ ہمارے اختیار میں نہ زندگی ہے اور نہ موت . . . "

کرمو نے دیکھا ملکہ کی آنکھوں میں مایوسی اور بے بسی کے سیاہ سائے منڈلا رہے ہیں۔ باباشاہ کی موت پہ اور فضل دین کے ساتھ نکاح کے وقت اس کی آنکھوں میں ایسی ہی مایوسی اور بے بسی تھی اسے یقین ہوگیا کہ اب ملکہ کی دلدوز چیخیں پورے گاؤں میں پھیل جائیں گی۔ اور گاؤں کے در و دیوار ہلنے لگیں گے — وہ ملکہ کے قریب جا کے بیٹھ گیا — وہ جانتا تھا اگر اس مرتبہ ملکہ روئی تو وہ ڈھ جائے گا

" سزا اور جزا کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ باباشاہ نے مرتے وقت مجھے نصیحت کی تھی۔ ملکہ نے چونک کے کرمو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی اور بے بسی کے سائے منڈلا رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا وہ تنہا نہیں ہے۔

" ہم ٹریفک سے بچتے ہوئے سڑک پار کرنے کی سعی میں عمر گزار دیتے ہیں " اس نے اپنے آپ کو سمجھایا — بھائی صاحب سڑک پار نہ کر سکے اور مر گئے "

تمہارے اختیار میں کچھ نہیں۔ سڑک پار کرنا ہے عمر گزارنا۔

رمو نے ایک بار پھر بادشاہ کے انداز میں کہا۔
"ہوں . . . ملکہ نے خود کو شانت کرنا چاہا۔ "مجبوری اور بے بسی کو دوسرے لفظوں میں صبر کہا جاتا ہے۔"

"صبر . . . "بالکہ مو کو سہارے کے لئے ڈور کا سرا مل گیا۔ "صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔"

"کب ؟" ملکہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔
کرمو کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔
لڑکی کہہ رہی تھی۔
"سنو ! ماں کہتی ہے میری بچی کا جنم جیل کی سلاخوں میں اس لئے ہوا کہ میں نے کم ظرف کو خدا مانا۔"
ملکہ نے شوہر کی جانب دیکھا۔ وہ اطمینان سے مسند پہ بیٹھا اپنی انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔
"لڑکی کی ماں کون تھی۔ اور وہ کیسے مر گئی؟" ملکہ نے شوہر کو مخاطب کیا۔

حویلی میں مکمل سناٹا چھا گیا، مسند پہ بیٹھنے والے سے کبھی کچھ پوچھا نہیں جاتا۔ شاہ جی کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ پھر سرخ ہوا اور فضا میں ایک نعرہ بلند ہوا۔ "اللہ ہو"۔ سب نے نظریں جھکا لیں۔
"پہلے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھو۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنے اپنے مرشد کا تصور کرو۔ جس کا کوئی مرشد نہیں وہ فی سبیل اللہ میرا تصور کرے۔" شاہ جی نے ہدایت دی۔
عورتوں نے ایک بار پھر اپنی بکلیں درست کیں اور درود شریف پڑھتے ہوئے انگلیوں کی پوروں پہ گنتی کرنے لگیں۔
"لڑکی کی ماں کی موت کا سبب کچھ بھی ہو۔" ملکہ نے سوچا۔ "لڑکی بے سہارا رہ گئی ہے۔" اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔
شام دھیرے دھیرے آنگن میں اتر رہی تھی۔ مرغیاں خود بخود واپس آ کے اپنے ڈربے پہ بیٹھ گئیں بند ہونے کے لئے۔ کرمو نے اٹھ کر ان پر بید کا ٹوکرا الٹ دیا۔ سب کی سب خاموشی اپنی مرضی سے قید ہو گئیں۔ ملکہ نے سوچا۔ "انہیں احساس بھی نہیں ہوا ہو گا کہ اب وہ چاہیں بھی تو اس ٹوکرے سے باہر نہیں نکل سکتیں آزادی سے ادھر ادھر نہیں گھوم سکتیں۔"
عورتیں گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ چکیں تو سورہ اخلاص پڑھنے کا حکم ہوا۔

"لڑکی تیری ماں کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔" شاہ جی کی جلالی آواز سارے میں پھیل گئی۔
ملکہ کو ایک بار پھر حویلی کی دیواریں ملتی ہوئی محسوس ہوئیں موت کے کنوئیں کی مانند۔
"سانپ . . . ؟" کرمو کے اندر کے وعدہ معاف گواہ نے پھر سر اٹھایا۔ "زہرہ بائی کو کس سانپ نے ڈسا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ سب کچھ۔ . . ؟"
"بی بی بلا رہی ہے۔" صغرا کی آواز آئی۔ "زردے کی دیگ تیار ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے لئے پرات میں چاول نکال لاؤ۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر صغرا کے ساتھ حویلی سے باہر نکل آیا۔ بیگماں چولہے کے قریب اپنے سامنے خالی پرات رکھے اس کا انتظار کر رہی تھی۔
"اللہ ہو۔" "اللہ ہو۔" عورتوں کی آوازوں کے ساتھ اب مردوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ درود ختم ہوا۔ فاتحہ پڑھی گئی مرنے والی کے لئے دعائے مغفرت ہوئی۔
"جنازہ تیار ہے۔" اطلاع ملی۔ عورتوں نے ایک مرتبہ پھر بلک بلک کر رونا شروع کیا
کلمہ شہادت کی صدا بلند ہوئی۔ جنازہ اٹھا۔ اور پھر کلمہ شہادت کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔
عورتیں ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں، حویلی میں مکمل سناٹا چھا گیا، ملکہ نے لڑکی کی جانب دیکھا۔ لڑکی کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے لیکن آواز نہ تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی یا کہنا چاہ رہی تھی فیصلہ کرنا دشوار تھا۔
"اصل مسئلہ توازن برقرار رکھنا ہے،" ملکہ کو یوں محسوس ہوا۔ "بھائی صاحب ہدایت دے رہے ہیں۔ وہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلا رہی ہے، اور لکڑی کی دیواریں تھر تھر کانپ رہی ہیں۔"
اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور لڑکی کی جانب بڑھی "میری بچی آ میرے قریب آ۔" لڑکی نے حیرت سے ملکہ کو دیکھا، تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھے بیٹھی رہی اور پھر بے اختیار ملکہ کے گلے سے لگ گئی۔ اور دونوں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ ❁



حفیظ آتش

# دھند

دن طلوع ہوتا ہے
سورج کے پگھل جانے پر
گفتگو ہوتی ہے
پھر شیشوں کے ایوانوں کی
آبدیدہ ہے کوئی جذبے کی ویرانی پر
تلملا اٹھتا ہے اخبار کی سرخی پہ کوئی
اور کوئی وقت کی دیوار سے سر ٹکرا کر
ٹوٹ جاتا
بکھر جاتا ہے
قہقہوں میں کوئی اشکوں کو چھپا لیتا ہے
گرنے والے کو کوئی بڑھ کر اٹھا لیتا ہے
لڑکھڑاتے ہوئے
ہر شب سے گذر جائیں گے
دھند سے نکلے تو یہ لوگ سمٹ جائیں گے

# سوال

خدا
میں تجھ سے شکوہ بلب نہیں ہوں
مگر
میں یہ سوچتا ہوں آخر
قدیم ذہنوں میں
کس نے تیری شبیہ بنائی
عذاب کے اس تصوراتی
کھنڈر کی تعمیر کس نے کی ہے
ثواب کے خوشنما محل میں
عبادتوں کے پرانے پتھر
لگے ہوئے ہیں
ہزاروں سالوں سے
ستھری روحوں
کی سانسیں لیکن رکی ہوئی ہیں
میں تجھ سے شکوہ طلب نہیں ہوں۔

● [illegible] ماہنامہ نقش [illegible] امروہہ (یو پی)

عصمت مظفر

# سچ اور جھوٹ

وہاں تک صرف سچ ہے
تم جہاں تک دیکھ سکتے ہو
اور اس کے بعد جو کچھ ہے
سراسر جھوٹ ہے

مگر تم یہ بھی سوچو
تم کہاں تک دیکھ سکتے ہو ؟
مکاں جیسا ہو جتنا ہی بڑا ہو اک مکاں ہے،
جو درونِ لامکاں ہے

یہ سچ اور جھوٹ میں تبلاؤ کیا ہیں !

کسی کی ذہنی عیاشی کے پھل ہیں
یہ کورو اور پانڈو کے محل ہیں۔

● مکان نمبر ۲۳ ۔۔۔ ۱۳۰۰ [illegible]
[illegible]



**کالی داس گپتا رضا**

۱۰۱ - اے جل درشن - ۲۲۰ اے چوتھا منزل نیپئین سی روڈ ممبئی - ۶

# غالب کا نام

جناب ممتاز حسین نے اپنی کتاب "غالب ایک مطالعہ" میرے مطالعے کے لیے بھجوائی۔ میں نے کتاب پڑھی اور اس سے مستفید ہوا۔ اور باتوں کے علاوہ، جواب میں میں نے یہ بھی لکھا کہ آپ نے جو ص ۲۳ غالب کا نام "مرزا محمد اسد اللہ خاں" لکھا ہے اور حاشیے صراحت کی ہے کہ پورا نام یہی تھا یہ درست نہیں۔ پورے نام میں بیگ بھی شامل تھا اور محمد کا نام جزو نہیں تھا۔ یعنی محض "اسد اللہ خاں" ہونا چاہیے۔ ممتاز حسین صاحب نے جواب میں فرمایا

"اس وقت زبانی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ایک بات لکھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے کہ نام محمد پر جان نثار۔ لیکن اس کے بعد کا جملہ یاد نہیں۔ مفہوم یہی ہے کہ میں نے اسے DROPPED کر دیا۔ بہرحال آپ نے جو لکھا ہے اس پر غور کروں گا ...." [۵ رجولائی ۱۹۸۳ء]

خط پڑھ کر فوراً یاد آ گیا کہ کچھ ایسی بات ہے تو سہی۔ چنانچہ کھوج شروع ہوئی غالب کی تحریریں اور مُہریں دیکھی گئیں پہلے غالب کی تیسری مہر س کی شاہد نکلی۔ ملاحظہ کیجیے۔

| |
|---|
| محمد اسد اللہ خان |
| ۱۲۳۸ھ |

جو مطابق ہے ۲۳-۱۸۲۲ء کے۔ اس وقت غالب ۲۵-۲۶ برس کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلّی کے علماء بہت بڑے مذہبی مباحثے میں الجھے ہوئے تھے۔ اور جس میں انھیں مولوی فضل حق خیرآبادی کے موقف کے مطابق ایک مثنوی بھی کہنی پڑی تھی اس سے شاید انھیں مذہبی امور سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جناب مالک رام [فسانۂ غالب ص ۸۴] کے نزدیک "اس میں دو محرّک کارفرما" ہوئے۔ اوّل نواب الٰہی بخش خاں کی عزیزداری جو خود صوفی اور تصوّف کے حلقوں میں خاصے معروف تھے .... دوسرا اثر مولوی فضل حق خیرآبادی کا تھا ... (چنانچہ) اس سے پہلے ان کی مُہر پر کندہ تھا۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اب محمد اسد اللہ خاں۔ کیا ان کی قلبی ماہیت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے؟" گویا محمد اسد اللہ خاں، ایک عارضی مذہبی جوش کے تحت تھا۔ اور یہ غالب کا اصلی نام نہ تھا۔ لیکن غالب نے پنشن کے اضافے کے لیے جو درخواست ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء [فسانۂ غالب ص ۱۱۴] کو کلکتہ میں گورنر جنرل کے نام دی تھی۔ اس میں درج ہے

"میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں [مرحوم کی بہن کے علاوہ] یوسف علی خاں میرا بھائی ہے، جو مرحوم کا بھتیجا ہے ... (اور) آپ کا یہ درخواست گذار ہے۔ میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے اور عرف مرزا نوشہ ......"

گویا قانونی طور پر اقرار کرتے ہیں کہ ان کا نام اسد اللہ خاں نہیں، بلکہ محمد اسد اللہ خاں ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ "محمّد"

واقعی ان کے نام کا حصہ تھا اور وقتی طور پر مذہبی دلچسپی کے زیر اثر بعد میں اضافہ نہیں کر لیا گیا تھا۔ یہ نکتہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ غالبؔ کی یہ مُہر (۱۲۳۸ھ) تقریباً ۳۰ سال تک استعمال میں رہی۔ تاہم ۱۲۶۷ھ [۵۱ - ۱۸۵۰ء] والی مُہر میں محض "اسد اللہ خاں" ہے اور پھر "یا اسد اللہ الغالب" [۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳ - ۱۸۵۲ء] اور "غالب" [۱۲۷۸ھ مطابق ۶۲ - ۱۸۶۱ء] لیکن غالبؔ اس تبدیلی کا سبب اپنے ایک خط بنام تفتہ [مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء] میں مکمل کر بیان کرتے ہیں

"سُنو صاحب۔ لفظِ مبارک میم، حا، میم، دال۔ اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکّام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔

رہا میرزا و مولانا و نواب، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو کہو۔۔۔"

لیکن خود غالبؔ نے اپنے لکھے پر کلّی طور پر عمل نہیں کیا چنانچہ "ازالہ حیثیت عرفی" کی نالش کی درخواست پر جو انھوں نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو داخلِ عدالت کی [احوالِ غالب ص ۱۴۰] پہلے اپنا نام "اسد اللہ خاں غالب" لکھا پھر "اسد اللہ خاں" اور وکالت نامے پر جو [تیسرا] دسمبر ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا اور جس کے دیبی پرشاد اور منشی وزیر علی گواہ ہیں، دستخط "محمد اسد اللہ خاں" ثبت کیے۔

اس مقدمے کی ایک اور درخواست مورخہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء پر غالبؔ پھر اپنا نام اسد اللہ خاں غالب لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ان کے وکیل عزیز الدین نے خود کو "وکیل اسد اللہ خاں پنشن دار سرکاری عرف مرزا نوشہ" لکھا ہے۔

یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ پورا نام "اسد اللہ بیگ خاں" تھا مگر غالبؔ نے اپنے دادا، والد اور چچا کے برعکس بیگ کو اپنے نام کا جزو شاید ایک سے زیادہ بار نہیں بنایا[۱]۔ حتّٰی کہ پنشن کی درخواست میں اپنے سگے بھائی کا نام بھی صرف "یوسف علی خاں" لکھا۔

حیرت کی بات ہے کہ قانونی درخواستوں میں بھی غالبؔ نے اپنا نام بیان کرنے میں احتیاط نہیں برتی۔ بہر حال مرزا کا صحیح نام "محمد اسد اللہ بیگ خاں" ہی تھا[۲]

---

[۱] اردوے معلّٰی طبع اوّل ص ۳۱۳۔ خط بنام انوار الدولہ شفق۔ لفظ ارنی کے تلفّظ کی وضاحت کرتے ہوئے بیدلؔ کے شعر کے بعد، غالبؔ اپنا ایک فارسی شعر درج کرنے سے پہلے شاعر کا یعنی اپنا نام یوں لکھتے ہیں "اسد اللہ بیگ غالب"۔ یہاں پورے نام سے دو لفظ غائب ہیں۔ شروع کا "محمد" اور آخر کا "خاں"۔

[۲] اردو دیوان کے دیباچے میں غالبؔ نے اپنے نام کی سند یوں دی ہے "این نقش بغیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم بہ مرزا نوشہ معروف بہ غالب تخلص است۔۔۔"

【بقیہ صفحہ ۲۶ سوئیاں】

سے ڈھکی پسلیاں پر چیک کر پرائیوٹ وارڈ نمبر دو بٹاسات میں بھرتی ہائی بلڈ پریشر سے پریشان ایک اہم مریض کا بلڈ پریشر ناپنے بڑھ گیا۔

آج ٹھنڈا پسینہ بھی اتنی تکلیف نہیں دے رہا ہے اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انگارے اب پوری طرح سے اس کے سینے میں دہک چکے ہیں مگر اسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی ہے آج اس درد کے ختم ہونے سے اسے عجیب بے چینی کا احساس ہو رہا ہے اس کا یہ آخری ساتھی، کتنا پرانا اس کے وجود سے پرانا ساتھی اسے چھوڑنے والا ہے۔ اب وہ بالکل ہی اکیلا رہ جائے گا۔

## ○ زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جولائی ۱۹۸۷ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لیے مبلغ ۵۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔



رام لعل ندیم

ری خاطر سب سُنا لیکن کہا کچھ بھی نہیں
رہبر تو نے مگر مجھ کو دیا کچھ بھی نہیں

نک اشکوں کی مہک بھی اُڑ گئی خوابوں کے ساتھ
ب مری ویران آنکھوں میں بچا کچھ بھی نہیں

سبز تحریروں کو یہ آنکھیں ترستی رہ گئیں
اب کے موسم نے درختوں پر لکھا کچھ بھی نہیں

یں تھا اپنے آپ میں گم کچھ خبر اپنی نہ تھی
یں نے آوازوں کے جنگل میں سنا کچھ بھی نہیں

میرے خوں کے رنگ سے روشن ہتھیلی کر کبھی
سامنے اس رنگ کے رنگِ حنا کچھ بھی نہیں

چڑھتے دریا کا بہاؤ تیز تھا لیکن ندیم
لے کے ساحل سے گئی موجِ بلا کچھ بھی نہیں

کھلا جو ابر تو کیسا سماں دکھائی دیا
ہر اک مکان سے اُٹھتا دھواں دکھائی دیا

نظر کی آخری حد پہ عجیب منظر تھا
زمیں پہ دور جھکا آسماں دکھائی دیا

تمام عمر تعاقب میں روشنی کے رہے
وہ جگمگاتا بدن پھر کہاں دکھائی دیا

سوادِ شوق میں خود کو سمیٹنا کیسا
بکھر گیا ہوں وہ منظر جہاں دکھائی دیا

کسی بھی سر پہ نہ تھا دھوپ میں کوئی سایہ
ہر ایک شخص یہاں بے اماں دکھائی دیا

سورج کی سختیوں سے بچا لے گئی مجھے
سائے میں اپنے شام چھپا لے گئی مجھے

کھڑکی سے دیکھتا رہا پھیلا ہوا غبار
کمرہ سے میں جو نکلا ہوا لے گئی مجھے

پیاسا پڑا ہوا تھا میں ساحل کی ریت پر
دریا چڑھا تو موج بہا لے گئی مجھے

وہ بستیاں ہی راس نہ آئیں مگر ندیم
سنسان جنگلوں میں ہوا لے گئی مجھے

میونسپل کاؤنسل اجمیر (راجستھان)

سہیل کاکوروی

۲۲ قندھاری لین، لال باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

# چٹان

زنخا اپنی بدہیبت محبوبہ کے ساتھ پھر آگیا۔

س نے گھور گھور کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ بدہیبت عورت ہرے پر ناگواری اُبھر آئی اور اُس نے اپنی نظروں کو زنخے اور ے بیچ حائل کر دیا کسی شاطر جادوگرنی کی طرح اسے حصار قید کر لیا۔

چُپ چاپ بیٹھے" زنخے کو اٹھتے دیکھ کر شعلہ برساتی آنکھوں ، اُسے دیکھا وہ چائے بنانے چلی تھی اور زنخا اس کے پیچھے لگ نے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

"پانی پی آؤں" اس نے نسوانی آواز میں کہا۔ زنخے کی نظریں ے تالو تھیں۔

"پانی یہیں مل جائے گا۔ سیاہ چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ گئی" ہ بے چین ہو کر کرسی پر بیٹھا رہا۔ روندی ہوئی اس عورت کے جسم ی سڑاند سے وہ اس لیے سمجھوتہ کیے ہوئے تھا کہ خوشبوؤں کی نگری یں اس کا گذر اسی کارن ہو پاتا تھا کہ یہ سڑاند اگر زندگی سے نکال دی جاتی تو وہ خوشبوؤں کے تعاقب میں پاگل ہو جاتا اس کے اپنے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھتے کیوں کہ وہ اس روندے ہوئے وجود سے روز اپنے جسم کو مس کرتا تھا۔

شفاف پانی کا جھرنا گرتا رہتا اور گر کر چٹان کے قدموں کا بوسہ لیتا۔ چٹان پانی کی ٹھنڈک سے سورج کی تمازت کا مقابلہ کرتی رہتی۔ جھرنے کا پانی گر کر سبک ندیوں کو راہ دیتا اور ہریالی کا پیغام دیتا۔ بہتا ہوا پانی نہ سڑتا تھا نہ بدبو دیتا تھا۔

اور اس کی قسمت میں نالے کا پانی تھا جس میں آلائش بھری ہوئی تھی وہ چٹان کو پار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ جھرنے کی موسیقی ریز آواز اس کو اپنی طرف گھسیٹتی اور وہ ہمت کر کے اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا لیکن اس کے اندر کا زنانہ پن چٹان کی بلندی کو دیکھ کر کانپ جاتا۔ وہ نالے کے پانی میں تھوک دیتا پھر تھوک کر چاٹ لیتا۔ اپنی عورت سے جان بچا کر وہ اکیلا چٹان کی طرف جاتا اور چٹان سے چمٹ جاتا لیکن چٹان اس کے منہ پر طمانچہ مارتی ہوئی اٹل کھڑی رہتی۔ جھرنے کے پانی کو آلائشوں سے بچانے کے لیے چٹان کو زمین کی گود سے ابھارا گیا تھا۔ زنخا دل ہی دل میں چٹان کو کوستا اور اس کے ٹوٹ جانے کی تمنا کرتا۔

"تجھے اسی لیے اپنے ساتھ رکھا ہے کہ تو دوسروں کے پیچھے بھاگے لگے گا۔ کتا۔" بدہیبت عورت نے اس کے بالوں کو پکڑ کر اسے دھکا دیا اور اس پر سوار ہو گئی۔ زنخے کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ آج پھر جھرنے کے آس پاس چکر لگا کر لوٹا تھا اور عورت نے اس کے جسم کو لہولہان کر دیا تھا۔ اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے اس کی کھال چھیل ڈالی تھی۔ پھر نالے کے گندے پانی سے اس کے زخموں پر چھڑکاؤ کیا اور نالے کا گندا پانی اس کے جسم میں اتار دیا۔ جب اسے پیاس لگی تو یہی پانی وہ پیتا چلا گیا۔ آلائش، آلائش سے ملتی رہی۔ زنخا اب بھی سوچ رہا تھا کہ کس طرح وہ پھر وہاں پہونچے لیکن نچے ہوئے جسم کا ہر زخم چیخ رہا تھا۔ عورت کے بھیانک چہرے پر لالی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ زنخے کو دیکھ کر ٹھٹھکی۔ تعفن سے اس کا دم گھٹ گیا۔ وہ عطر کی بستی کی مسافر تھی۔ زنخا اس کے قریب آگیا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اسے بہت دور سے دیکھا تھا۔

"رُک جاؤ۔ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ تمہارے پاس سے کیسی بھینی بھینی مہک آ رہی ہے۔ اس میں مجھے بھی سانس لینے دو۔" زنخے نے بھیک مانگی۔

وہ نہیں رکی۔ یہ تعفن۔ سڑتے ہوئے گوشت سے ملتی جلتی بدبو اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بدہیبت عورت موجود نہ ہوتے ہوئے بھی موجود تھی۔ وہ ڈر گئی۔ اسے چٹان کی چوٹی نظر آرہی تھی۔ جھرنے کی گود اس کی زندگی تھی۔ چٹان اس کی محافظ تھی۔ کمل کے پھول اس کے ساتھی تھے۔

اس دن زنخے نے اپنی محبوبہ کو کسی ترکیب سے گہری نیند سلا دیا۔ سُلانے سے پہلے وہ بہت دیر تک مختلف طریقوں سے اسے مطمئن کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرتا رہا۔ اس کے پیاسے جسم کی پیاس بجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ پیاس نہ بجھ سکی لیکن تھکن نیند بن کر زہریلی آنکھوں میں سما گئی۔ پیاس کیا آگ تھی۔ یہ آگ کس نے لگائی تھی؟۔ یہ آگ جتنی بجھائی جاتی اتنی ہی اور بھڑکتی تھی۔ دہکتی ہوئی آگ نے جلا جلا کر سیاہی کو جنم دیا تھا۔ زنخے نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا۔ اسے جب مکمل اطمینان ہو گیا کہ وہ سو گئی ہے اور نیند بہت گہری ہے تو وقت ضائع نہ کرتے ہوئے اسے چھوڑ کر وہ ایک بار پھر چٹان کی طرف چلا گیا۔ چٹان کے جسم کے کچھ حصے ایسے نکلے ہوئے تھے کہ جن کے سہارے اس کی لمبائی کو عبور کرنے کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ وہ چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر چٹان اس کی اس حماقت پر مسکرا رہی تھی زنخے کی کہنیاں چھلنے لگیں لیکن جھرنے کی گنگناہٹ اسے تازہ دم کئے ہوئے تھی۔ اس موسیقی میں بدہیبت عورت کا تصور بھی معدوم ہو گیا تھا۔ چٹان سے باہر اینٹیں اس طرح نکلی ہوئی تھیں کہ ایک اینٹ پر پیر اور جست لگا کر دوسری پر ہاتھ کی گرفت آجانے سے وہ اوپر کی طرف چڑھنے لگا۔ جوش و خروش میں زنخا مرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسری طرف بدہیبت عورت نے کروٹ بدلی۔ آج نہ جانے کیسے اسے نیند آگئی تھی اور وہ بھی اتنی گہری۔ ورنہ وہ تو صرف اس احساس سے جاگتی رہتی تھی کہ زنخا کہیں مرد نہ بن جائے۔ زنخے کا مرد بن جانا اس کی موت تھی۔ مردوں ہی نے تو اسے زنخے تک پہنچایا تھا۔ اب وہ بھی اگر نہ رہے تو وہ یہ بھیانک صورت لے کر کہاں جائے گی۔

اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے پھر کروٹ بدلی تھی کہ بازو پر ایک چیونٹے نے زور سے کاٹ لیا۔ وہ جاگ پڑی اور دو پتھروں کو ٹکرا کر آگ نکالی ــــ اور اس کی روشنی میں دیکھا۔ چاروں طرف چیونٹے ہی چیونٹے تھے اور ان کے پر نکل آئے تھے۔ خطرناک چیونٹے پھیلے ہوئے تھے اور زنخا غائب تھا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ ضرور وہ آج پھر چٹان سے سر پھوڑنے گیا ہے۔ اس کی لال لال پتلیوں میں سارے جہاں کی خباثت ابھر آئی۔ وہ اٹھی اور ایک چابک اور ایک زنجیر تلاش کر لی۔ لمبی سی زنجیر اور لچک دار چابک۔ جو زنخے کو وہ جھرنے سے کتنا بچا کر رکھتی تھی جھرنے کے پانی کے اثر سے وہ خوب واقف تھی۔ وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ زنخا ساری زندگی جھرنے کے پانی کے ایک گھونٹ کی لالچ میں اس کے ساتھ لگا رہے۔ کیوں کہ چٹان کو پار کرنے کی جو ترکیب اسے معلوم تھی وہ زنخے سے پوشیدہ تھی۔ وہ مر کر بھی یہ نہیں ہونے دے گی کہ زنخا پانی پی لے۔ وہ چٹان کو پار کرنے کی کوشش کرے اور مرد بن جائے۔

سامنے کا منظر بڑا دل ہلا دینے والا تھا۔ زنخا کافی اوپر جا چکا تھا۔ اس کے ماتھے اور چہرے پر خون ہی خون تھا۔ اس کے ہاتھ کی کئی انگلیاں کٹ کر زمین پر گر گئی تھیں مگر وہ بے دم نہیں تھا۔ سانس اب بھی چل رہی تھی۔ ہاتھ اب بھی اوپر تھے۔ وہ ایک اینٹ سے لٹکا ہوا تھا۔ جیسے کسی مجرم کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہو۔

خوفناک عورت نے اس کی چلتی ہوئی سانس سے اس کی زندگی کا اندازہ لگایا اور زنجیر کا پھندا بنا کر اسے اس طرح اچھالا کہ اس پھندے نے گلے کو جکڑ لیا اور گھٹنوں کی کوشش مٹی میں مل گئی اور زنخا زمین پر آگرا۔

خوفناک عورت نے وحشیانہ پن سے اس کے جسم پر چابک سے وار کرنا شروع کر دیے اور اس کی کھال پرانے کاغذ کی طرح جگہ جگہ پھٹ گئی۔ عورت نے ڈائن بن کر تازہ تازہ خون پینا شروع کر دیا اور اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر ہوا میں اچھال دیں۔ بھیانک قہقہے لگا کر ناچتی رہی اور پھر اس کے ڈھانچے پر تیورا کر گر پڑی۔

خوف سے پھٹی دو آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں ....
چٹان مسکراتی رہی۔ جھرنا شان سے گرتا رہا ... اور ...
کومل ندیوں کے دامن پر پھول کھلتے رہے۔



## زاھد کمال

◆

چاہوں تو دونوں ہاتھوں سے دنیا سمیٹ لوں
کوزے میں زندگی ترے دریا سمیٹ لوں

ہر لمحہ سرد ہونے لگی ہے یہ کائنات
اس مختصر سے عرصہ میں کیا کیا سمیٹ لوں

پہلے نہال کرتا رہا اپنے درد سے
اب کہہ رہا ہے دستِ تمنا سمیٹ لوں

یا چن لوں اپنے جیب و گریباں کی دھجیاں
یا آبلوں میں تلووں کے صحرا سمیٹ لوں

تاریکیاں نچوڑتے گزری ہے اپنی عمر
حصے کا اپنے کیوں نہ اُجالا سمیٹ لوں

◆

سلگتی آہوں کو مدھم نہ کر دھواں نہ بنا
زمیں کے سر پہ کوئی اور آسماں نہ بنا

بدن کی سلوٹیں لرزاں ہیں شب کی چادر پر
یوں انتظار کے لمحوں کو بیکراں نہ بنا

ہوا کی ایک ہی ٹھوکر سے ٹوٹ پھوٹ گیا
میں تجھ سے کہتا رہا ریت کا مکاں نہ بنا

میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں تو ڈھونڈ لینے دے
تو میرے شوق تجسس کو امتحاں نہ بنا

لپک لپک کے ہر اک حادثہ قدم چومے
یوں اپنے آپ کو زاہد تو سخت جاں نہ بنا

◆

نیند کے خونچکاں پیروں سے تو زنجیر اتار
خواب کے جسم سے پیراہن تعبیر اتار

کب تلک ڈھونڈتی پھرے گی مجھے شہر بہ شہر
اب کسی گوشۂ تنہائی میں تقدیر اتار

حاجتیں وہ تو ہوں پوری کہ جو بنیادی ہیں
کون کہتا ہے ہمارے لئے جاگیر اتار

کس لئے کی گئی تخلیق یہ دُنیا یا رب
ذہن میں اس کے بھوش کی کوئی تصویر اتار

کب تلک درد سے خالی نظر آئے گی غزل
اب تو اے آسماں دھرتی پہ کوئی "میر" اتار

● احمدی اپارٹمنٹ ، ۷۰۰ ، گرودار پیٹھ ، پونہ - ۲

## انتخاب امام

# چند اداس سطریں

۷ راکتوبر ۱۹۱۸ء ——— ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء

نکر تونسوی کے انتقال کی خبر سے دلی صدمہ ہوا، ابھی تو ان سے میری مراسلت ہو رہی تھی۔ وہ علیل تھے اس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوں میں بھی کیا تھا لیکن شاید میں ذہنی طور پر اس اطلاع کے لیے تیار نہیں تھا۔ شخصیت کوئی بھی ہو جب ہمارے محسوسات سے بندھ جاتی ہے، جب ہمارے روابط میں آجاتی ہے تو اس کا بچھڑنا عجیب سا لگتا ہے پھر وہ قلم کار جو اہم ہوتے ہیں، جو اپنی تخلیقات سے ایک نسل کو متاثر کرتے ہیں، اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں، ان کا بچھڑنا تو اور بھی عذاب لگتا ہے۔ ابھی ہم خواجہ احمد عباس کے بارے میں سوچ رہے تھے ان کی موت کے غم کی شدت ابھی باقی تھی، میں سوچ ہی رہا تھا کہ شاعر کا نذرانۂ عقیدت ایک بڑے ادیب، صحافی اور افسانہ نگار کے لیے کیا ہو کہ نکر تونسوی صاحب ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔

میں نے نکر تونسوی صاحب کو شاعر کے ایک زیر ترتیب ضخیم خاص نمبر کے لیے خط لکھا تھا۔ میں گاہے بگاہے انھیں خط لکھتا رہا ہوں اور وہ بھی خطوں کا جواب، تاخیر ہی سے سہی دیتے رہے تھے۔ وہ شاعر میں بہت کم شائع ہوئے۔ اس بار میں نے اپنے ۲۷ جولائی ۱۹۸۷ء کے خط میں خاص نمبر کے لیے مضمون کی درخواست کے ساتھ برسبیل تذکرہ لکھ دیا تھا کہ شاعر کے لیے بھی لکھا کیجیے۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ!

نئی دہلی - 17 - اگست 87

امام صاحب! آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں [illegible] گذشتہ سال ڈیڑھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مخلصانہ [illegible]

نکر تونسوی

ان کے اس خط سے ان کی علالت کی تفصیل معلوم ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ ایک تخلیق کار جو مسلسل لکھتا رہا ہے اب کس بے بسی کے عالم میں ہے۔ واقعی میں ان کی نارمل تندرستی کے لیے سوائے دعا کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ فکر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور ان کی ایک ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی اس کا ذکر انہوں نے محترم صہبا لکھنوی کو لکھے گئے ۲۴ راگست کے ایک خط میں کیا تھا۔ یہ خط افکار (کراچی) نومبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ابھی میں ان کے خط کا جواب دینے ہی والا تھا کہ ان کا ایک خط اور موصول ہوا، لکھا تھا

گلی نمبر ۱، بنگلہ نئی دہلی ۴۹
۲۵ اگست ۸۷

[illegible]

آپ کے خط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ جسمانی مجبوری میرے مضمون لکھنے میں [illegible] رہی ہے۔ اب دیکھیے، خیالات میں بھی کمی آ جاتی ہے

پچھلے خط میں لکھا تھا۔ کہ میری نئی کتاب [illegible] ہو گئی ہے۔ اور [illegible] صاحب اس پر ریویو لکھ کر آپ کو بھیجیں گے۔ [illegible] صاحب کا [illegible] دلیپ سنگھ ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ بہتر ہوگا کہ آپ [illegible] [illegible] کر لیجیے۔

[illegible] کرتا رہیے۔ کہ میرا [illegible] آپ نے مضمون لکھا [illegible]
۔ [illegible]

مگر ان کے اس خط سے قبل ہی میں نے ان کی صحت یابی کے لیے ایک دعائیہ خط لکھ دیا تھا۔ اسی دوران ان کی آپ بیتی "میں" اور "میری بیوی" کی جلدیں اور دلیپ سنگھ جی کا ان کتابوں پر تبصرہ موصول ہو گیا۔ خیال تھا کہ فکر تونسوی صاحب کو "بساطِ سخن جدید" کے ذریعہ پیش کیا جائے۔ ۱۹۷۰ء سے شاعر میں قلم کاروں پر گوشوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا مگر اس سے بھی قبل فکر صاحب پر شاعر میں گوشہ شائع ہو چکا تھا۔ ابھی میں اپنی مصروفیات اور شاعر کے خاص نمبر اور عام شماروں میں الجھا ہوا تھا کہ فکر صاحب کا ایک خط موصول ہوا، ساتھ ہی ایک مختصر سا مضمون "شاعر اور نقاد" تصویر اور مکمل سوانحی اشاریہ "من کہ ۔۔۔" !

ڈی ۱۰/۳ ۔ گلی نمبر ۱، ک ۔ نئی دہلی ۔ ۴۹
پہلی ستمبر ۸۶

محترم صدیقی صاحب!

خط ملا ۔ آداب تسلیمات شکریہ!

میرے شاعر میں ایک [illegible] کہ قسمت سے میرا ایک نمبر، اگر [illegible]

نمبر ۔ سے بڑی بات آپ اسے خوش قسمتی سمجھئے کیونکہ یہ نمبر [illegible] موضوع

[illegible] (طنز کے لیے اختصار ضروری ہے)

[illegible] آپ اپنی ضرورت

کے مطابق استعمال کر سکتے [illegible]

دیجیے گا۔ کیونکہ میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے۔

ایک فوٹو بھی نذرِ خدمت ہے۔ [illegible]

کیونکہ میرے پاس اس کا نیگیٹو گم ہو گیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فکر تونسوی

ابھی میں انھیں شکریے کا خط لکھنے ہی والا تھا کہ اخبارات سے ان کے ہسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع ملی، پھر اور تفصیلات ملیں اد ۱۲؍ستمبر کو طنز و مزاح کا یہ چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

فکر تونسوی نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے شروع شروع میں شاعری کو وسیلہ بنایا تھا اور ان کا ایک شعری مجموعہ "ہیولے" ۱۹۴۷ء میں شا بھی ہوا تھا لیکن جلد ہی انہیں اس امر کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ شاعری ان کے بس کی بات نہیں اور وہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان کی نثر اور وہ بھی طنزیہ نثر باوجود بسیار نویسی، ایجاز و اختصار ہی سے مملو ہی جو شاعری کا وصف ہے۔ عوامی سطح پر لکھی گئی تحریروں [ ماہنامہ بیسویں صدی، دہلی اور روزنامہ ملاپ دہلی ] میں بھی شاعری کا سا اسلوب ملتا ہے۔ وہ خلاقانہ ذہن کے مالک تھے اور تخلیقی نثر لکھتے تھے۔ طنز و مزاح نگار عموماً بات سے بات پیدا کرنے ہی کو طنزیہ و مزاحیہ نثر کی معراج سمجھ لیتے ہیں لیکن فکر تونسوی جیسے فن کار اپنی تحریروں میں تہہ داری اور معنیاتی جہتوں کو ابھارنے کا عمل جانتے ہیں۔ اچھی اور معیاری شاعری کی طرح طنزیہ و مزاحیہ نثر کے لیے بھی لفظوں کا انتخاب اور اس سے معنی کے نئے جہان آباد کرنا بہت مشکل کام ہے، معمولی قلم کاروں کے لیے تو یہ اور بھی مشکل کام ہے۔ طنزیہ جملے اور فقرے لکھنا تو خود پل صراط سے گزرنا ہے۔ طنزیہ لہجہ اور لہجے کی ادائیگی کے لیے الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ساخت، یہ سب کچھ سامع یا قاری پر کیا ردعمل مرتب کریں گے یہ ایک غیر طے شدہ بات ہے اور یہی کسی تخلیق کا حاصل بھی ہے۔ ایک اچھا طنز و مزاح نگار ہر طرح کے ردعمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کرتا ہے۔ فکر تونسوی مرحوم کو یہ کمال حاصل تھا۔ مجھے فکر صاحب کی اس رائے سے سو فی صد اتفاق ہے کہ "طنز کے لیے اختصار ضروری ہے"۔ دراصل بات وہی ہے کہ شاعری ہو یا نثر نگاری، اختصار دونوں کے لیے ضرو

شاعر کے ضخیم خاص نمبر کی اشاعت میں ابھی وقت ہے لہٰذا فکر تونسوی صاحب کا مضمون مرحوم کو خراج عقیدت کے طور پر یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ساتھ ہی معاصر ادبی رسالہ آج کل کے شکریے کے ساتھ فکر صاحب کا مکمل سوانحی اشاریہ بھی کہ یہ ان کی حیات ہی میں شا ہوا ہے اور آئندہ کے لیے مستند حوالے کا کام دے گا۔

فکر صاحب نے اپنی تصویر اور سوانحی اشاریے کی کاپی واپس طلب کی تھی۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دونوں امانتیں کیسے واپس کر

# میں کہ ... فکر تونسوی

والدین کا عطیہ: نارائن
خود ساختہ: فکر تونسوی
پیدائش: ۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء (پہلی جنگ عظیم میں)
وفات: تیسری جنگ عظیم میں
جائے پیدائش: شجاع آباد ضلع ملتان (غیر آبادی گاؤں)
آبائی گاؤں: تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان (حالیہ پاکستان)
والد کا نام: دھنپت رائے
والد کا پیشہ: کوہ سلیمان کے بلوچ قبائل میں تجارت اور طبابت
والد کی وفات: جوئے بازی کی خصلت نے عالم غربت افلاس کی حد تک پہنچا دیا۔ بزعم خود طرح طرح سے ہزار روپے واجب الوصول تھے لہٰذا ایک دن خستہ حالی ہی کھاتے دیکھتے دیکھتے انتقال فرما گئے — سن ۱۹۳۵ء میں

ابتدائی تعلیم: گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ شریف — میٹرک پاس جماعت میں فرسٹ۔

۲۔ والد صاحب بلوچ قبائل والی دکانوں پر تجارت کی طرف راغب کر کے لے گئے، مگر ایک سال میں ہی تجارت سے دل اچاٹ ہو گیا

۳۔ ایمرسن کالج، ملتان میں ایک سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجبوراً ترک تعلیم کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ گھر والوں نے اپنے مالی وسائل کی کم ظرفی کے باعث مزید تعلیم کے اخراجات ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بے بسی کا سن ۱۹۳۶ء تھا۔ بے بسی اور بغاوت کا۔

پہلی شکست پر: —

اقتصادی بے سروسامانی کا سارا بوجھ چھ برس تک اپنی پشت پر اٹھائے اٹھائے کئی پیشے اختیار کیے۔ منشی گیری، خوش نویسی، تاجر ولی کی ایجنسی، گمنامی اور سستے اشتہاروں کی ایڈیٹری وغیرہ۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک۔

## ادبی زندگی کا آغاز: —

۱۔ یوں تو آغاز اسکول میں تعلیم کے دوران پیدا ہو گیا تھا جب میں نظم بند کرتا رہا جو بچوں کے میگزینوں اور ماہناموں میں شائع ہوتی رہیں۔

۲۔ مگر صحیح آغاز ۱۹۴۲ء میں اس وقت ہوا جب میری ایک نظم "تنہائی" مولانا صلاح الدین احمد کے موقر میگزین "ادبی دنیا" میں شائع کر دی گئی۔ اور لاہور کے مشہور ادبی حلقہ "حلقہ ارباب ذوق" نے اسے سال کی بہترین نظم ڈکلیئر کر دیا۔

۳۔ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں ترقی پسند ادبی تحریک کے نمائندہ ترجمان پبلشر مکتبہ اردو لاہور اور ادب لطیف سے وابستگی اختیار کی

۴۔ اور پھر معروف ادبی رسائل "ادب لطیف" "ہمایوں" "ادبی دنیا" میں میری نظموں کی پے بہ پے اشاعت شروع ہو گئی

۵۔ ۱۹۴۵ء میں ممتاز مفتی اور میری مشترکہ ادارت میں ایک سلسلہ وار ادبی دو ماہی میگزین "سویرا" شائع ہوا جس نے بڑے بڑے ادبی رسائل کو چونکا دیا۔

۶۔ ۱۹۴۶ء میں یکسر تنہا ماہنامہ "ادب لطیف" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی جو ۱۹۴۷ء کے خونی فسادات کے باعث آگے نہ چل سکی اور مجھے بطور رفیوجی ہندوستان میں آنا پڑا۔

## پہلی تصنیف: —

۱۔ ۱۹۴۷ء میں ہی میری نظموں کا پہلا مجموعہ "ہیولے" کے نام سے مکتبہ اردو نے ہی شائع کیا مگر فسادات کے سبب زیادہ پبلسٹی حاصل نہ کر سکا۔ فسادات کی نذر ہو گیا۔

۲۔ فسادات کے بعد شاعری ترک کر دی کیونکہ عام شعور کو چھوتے ہوئے مختصر شاعری تھی اور آزادی کے بعد میرا ابلاغ عوام کے مسائل سے وابستہ ہو گیا۔ اس لیے طنز و مزاح میں نثر تحریر کرنا شروع کر دی جو عوام کو بہت ہی پسند آئی۔

## دوسری تصانیف: —

۱۔ سب سے پہلی نثری تصنیف "چھٹا دریا" تحریک آزادی و فسادات پر ایک دردناک ڈائری کے فارم میں تھی — ۱۹۴۹ء

۲۔ بہ سلسلہ فسادات ایک کتاب "مقتول شاعر" تحریر کی۔ ۱۹۵۱ء۔ جس کے بعد تصانیف کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس کا دریچہ (اظہار) صرف طنز و مزاح تھا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۰ء تک مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں جو طنز و مزاح کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

۱۔ تیر نیم کش (۱۹۵۲ء) ۲۔ پروفیسر بدھو (۱۹۵۴ء) ۳۔ ماڈرن الہ دین (۱۹۵۵ء) ۴۔ خدوخال (۱۹۵۵ء) ۵۔ ساتواں شاستر (۱۹۵۶ء) ۶۔ ہم ہندوستانی (ہندی) (۱۹۵۷ء) ۷۔ فکر نامہ (۱۹۵۰ء) ۸۔ آدھا آدمی (۱۹۵۹ء) ۹۔ آخری کتاب (۱۹۶۱ء) ۱۰۔ [illegible] (۱۹۶۶ء) ۱۱۔ پیاز کے چھلکے (۱۹۶۲ء) ۱۲۔ چھلکے ہی چھلکے (۱۹۶۳ء) ۱۳۔ [illegible] (۱۹۸۲ء) ۱۴۔ گھر میں چور (۱۹۸۳ء) ۱۵۔ میں (آپ بیتی حصہ اول) (۱۹۸۶ء) ۱۶۔ مسرد ہوں گی (آپ بیتی دوسرا حصہ) ([illegible])

## دیگر ادبی اور علمی سرگرمیاں

۱۔ کالم نگاری کے علاوہ ۱۹۸۵ء میں ایک سو سالہ کالم نگاری پر رسالہ "چنگاری" کا ایک ضخیم نمبر مرتب کیا۔

۲۔ دہلی میں دو بہت بڑے تین ایکٹ کے دو اسٹیج ڈرامے تحریر کیے جو دہلی کے ایک تھیٹر پر بہت مقبول ہوئے۔
۱۔ ریہرسل ۲۔ کالیداس شامل رہے (پورا اسٹیج ڈرامہ تھا)

۳۔ دہلی کے مشہور ادبی رسالہ "شاہراہ" کی دو سال تک ادارت کی ۵۷-۱۹۵۶ء

۴۔ ریڈیو اسٹیشن آل انڈیا ریڈیو، دہلی پر سینکڑوں ڈرامے، فیچر اور تقریریں کیں۔

۵۔ ٹیلی ویژن پر پانچ ڈرامے پیش کیے پسند کیے گئے۔

۶۔ میرا ایک ریڈیائی ڈرامہ "آج کا دن" ہندوستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن نے براڈکاسٹ کیا۔

۷۔ ایک ادبی میگزین "رفتار" کے نام سے جالندھر سے جاری کیا جو مالی زبوں حالی کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

## میری کالم نگاری: —

۱۔ ۱۹۴۸ء سے کمیونسٹ پارٹی کے پنجاب کے ہفت روزہ "نیا زمانہ" (جالندھر) میں پہلا مزاحیہ کالم "آج کی خبر" کے نام سے شروع کیا۔ جو خاصا مقبول ہوا۔

۲۔ "نیا زمانہ" بند ہوا اور میں نے ۱۹۵۵ء میں دہلی کے روزنامہ "ملاپ" میں "پیاز کے چھلکے" کے نام سے روزانہ تحریر کرنا شروع کیا اور ۲۵ برس تک لکھتا رہا جو ہندوستان کے قریب کسی بھی مزاح نگار کو آج تک نصیب نہیں ہوا۔

## سیاست: —

۱۹۴۳ء سے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ بائیں بازو کے رجحان کے باعث کمیونسٹ پارٹی میں آہستہ آہستہ آیا اور پارٹی کا ممبر بھی بن گیا مگر تین چار سال سے آگے نہ بڑھ سکی اگرچہ مارکسزم ابھی تک میرے قلم اور سوچ پر مسلط ہے۔

## انعامات و اعزازات: —

۱۔ پنجاب سرکار کی طرف سے اعزازی عطیہ — ایک ہزار روپیہ — ۱۹۵۶ء

۲۔ یوپی اردو اکیڈمی — میری تصنیف "بدنام کتاب" پر ایوارڈ — ۱۹۸۱ء

۳۔ یوپی اردو اکیڈمی میری تصنیف "فکر نامہ" پر ایوارڈ — ۱۹۶۹ء

۴۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ میری ادبی خدمات پر ایوارڈ — ۱۹۶۹ء

۵۔ میر اکادمی ایوارڈ — ۱۹۸۳ء

۶۔ بنگال اردو اکادمی میری کتاب "مسکراہٹیں" پر ایوارڈ — ۱۹۸۵ء

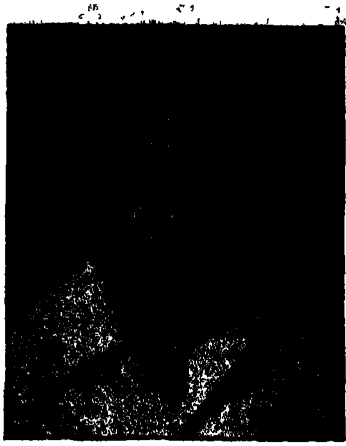
۷۔ دلی ہندی ساہتیہ سروور ادبی ایوارڈ برائے سال ۱۹۸۵ء

۸۔ بھاشا وبھاگ پنجاب — ادبی ایوارڈ برائے سال ۱۹۸۶ء

۹۔ غالب ایوارڈ، دہلی طنز ایوارڈ ۱۹۸۶ء

[بشکریہ ماہنامہ آجکل دہلی مئی ۱۹۸۸ء]

بہ یادِ فکر تونسوی



**یوسف ناظم**

۱۹ - نیو دیپ - پلاٹ نمبر ۱۳، باندرہ ریکلیمیشن۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۰

# فکر تونسوی کو الوداعی سلام

فکر تونسوی کے معاملے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری ان سے دوستی نہیں آشنائی تھی، معاشقے سے ملتی جلتی کوئی شئے تھی۔ دوستی اور خیر سگالی تو سیاست والوں اور سربراہان مملک میں ہوتی ہے۔

۲۵ ؍جولائی کو یعنی ان کے انتقال سے صرف ڈیڑھ ماہ پہلے ان کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی۔ اچھے خاصے تھے یعنی کم سے کم یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کے آخری دن آ گئے ہیں۔ بے حد خوش تھے۔ اسی وقت ان کی کتاب "میری بیوی" چھپ کر آئی تھی۔ ایک کتاب مجھے دی اور لکھا یوسف ناظم کے لیے جو بزعم خود فکر تونسوی سے بہتر لکھتا ہے۔ اس کے بعد فکر کے ۳ خط بھی آئے۔ تیسرا خط مجھ پر قرض رہ گیا۔ فکر سے میری باضابطہ خط و کتابت تھی یعنی سال میں دو تین خط ضرور ہو جایا کرتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو صرف پوسٹ کارڈ لکھتے تھے ان میں سطریں کم اور بین السطور زیادہ ہوتے تھے۔ فکر کے سارے خط میں تلاش کر رہا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دل کے لخت لخت کو جمع کرنا۔ فکر بے حد مخلص آدمی تھے۔ بے ریا۔ اپنی زندگی میں شاید ہی کسی سے لڑے ہوں۔ دل ہی دل میں گھول لیتے ہوں گے، لیکن نبرد آزمائی ان کا شیوہ نہ تھا۔ فکر کا آخری خط ۴ ؍اگست ۸۰ء کا ہے۔ ۱۲ ستمبر کو تو انکا انتقال ہی ہو گیا۔ اس آخری خط میں مجھے 'بھائی' کے القاب سے مخاطب کیا ورنہ ہمیشہ یار لکھتے تھے یا پیارے۔ لکھا تھا بھائی یوسف ناظم سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خط کیوں لکھ رہا ہوں لیکن اگر کچھ باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو زیادہ پرکشش لگتی ہیں۔ ہاں شاید تمہارے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے خط لکھ رہا ہوں اگرچہ استواری کو تم کچھ زیادہ حسین نہیں سمجھتے۔ تم نے ریویو لکھ دیا۔ شکریہ۔ راز صاحب تک کتاب پہنچ گئی۔ اس نے ریویو چھاپ دیا تو اس کا بھی شکریہ ادا کر دوں گا۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کراتی۔ کیا صابردت نے تمہیں کچھ کتابیں مہیا کیں تاکہ اس کا بھی شکریہ ادا کر سکوں۔ فکر تونسوی۔

صابردت کا قصہ یہ ہے کہ صابردت نے فکر تونسوی سے کئی سال پہلے کہہ دیا تھا کہ فن و شخصیت کا فکر نمبر شائع ہوگا۔ مضامین بھی تعداد میں کافی جمع ہو گئے بلکہ اِدھر اُدھر چھپ بھی گئے لیکن نمبر ابھی منصوبہ ہی ہے۔ صابردت نے شاید فکر کے مضامین کے انتخاب کے لیے کسی سے کہا بھی تھا۔ بات بنی نہیں۔ میں نے حامی بھری لیکن کتابوں کی فراہمی کی شرط کے ساتھ۔ مجبوراً میں نے فکر ہی سے کہا کہ اب تم ہی اپنے منتخب مضامین کی فہرست بناؤ اور آپ کو حیرت ہوگی کہ فکر نے یہ کام کر دیا۔ اپنے ۴ ؍جون ۸۰ء کے خط میں مجھے فکر نے لکھا کہ "یار یوسف ناظم۔ صابردت کا کہنا ہے [آج کل صابردت کے کہنے میں اکثر غلطیاں پیدا ہونے لگی ہیں] آپ نے میری طنزیلوں کا انتخاب کرنا منظور کر لیا ہے۔ اگر یہ غلطی نہیں ہے تو اس کے لیے میری کتابیں چاہئیں۔ تمہارے پاس میری کتنی کتابیں ہیں مئی ۸۰ء کے آج کل میں میری سولہ کتابوں کی فہرست شائع ہوئی ہے۔ جو کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں صابردت سے کہیئے وہ چاہے حلوائی کی بھٹی میں سے ڈھونڈ کر آپ کو مہیا کرے کیونکہ وہاں میرے قارئین کثرت سے رہتے ہیں۔"

۲۵ ؍جولائی کی ملاقات کے بعد فکر نے اپنے منتخب مضامین کی فہرست بھیج دی اور مجھے لکھا کہ تم نے مجھے خواہ مخواہ متحرک کر دیا۔ اب آدھے سے زیادہ کام تو خود فکر نے کر دیا۔ یہ نمبر بہت پہلے شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن مدیر فن و شخصیت شاید یہ نہیں چاہتے تھے

کوئی یہ کہے کہ جس کا نمبر بھی چھاپتے ہیں ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ فکر تونسوی نے انھیں اس الزام سے بچا لیا۔ فکر بنیادی طور پر شریف آدمی تھے۔ فکر تونسوی نے صرف ۱۶ کتابیں ہی نہیں لکھیں۔ اخبار ملاپ کے ہزاروں صفحے بھی لکھے۔ کچھ لوگ تو ایک زمانے میں یہ تک کہنے لگے تھے کہ ملاپ چھپتا ہی فکر کے کالم کے لیے ہے۔ ہندوستان میں پیاز کی سب سے زیادہ پیداوار ملاپ اخبار کے آفس ہی میں ہوئی۔ فکر تونسوی نے اس عمارت کو گرین بیلٹ بنا دیا تھا۔ روزانہ ایک مزاحیہ کالم صرف فکر تونسوی ہی سے ممکن تھا۔ وہ بے حد زود قلم تھے۔ بیمار بھی بہت رہے اور اس عالم میں انھوں نے اپنے ذہن و دماغ کو سرسبز و شاداب رکھا۔ کھٹے میٹھے، تلخ اور کبھی کبھی زیادہ تلخ پھل بانٹنا ان کا وطیرہ تھا۔ ان کی تحریر میں سماج سدھار کچھ اس طرح رس بس گیا تھا کہ آخر آخر میں تو فکر مصلح اور مشفق ناصح بن گئے تھے۔ طنز کی کاٹ شدید ہو گئی تھی اور یہ عمل شاید قصداً تھا۔ فکر مزاح جیسی لطیف شئے کو کثافت آلودہ معاملات میں ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

فکر کھلے دل کے آدمی تھے۔ ان کی دوستی سبھی سے تھی۔ الف کا دشمن ب، ب کا مخالف ج اور ج کا حریف الف لیکن فکر کے آگے کسی کی دال نہیں گلتی تھی۔ سب ان کے دوست تھے اور ان کی سنتے تھے۔ دلّی میں گل مُہر کالونی کے مکان نمبر ۵۰ ڈی میں بیٹھے بیٹھے فکر ان غیر مزاحیہ مناقشات کو پھولوں میں بدل دیتے اور ان پر اپنی کشادہ دلی کی مہر لگا دیتے تھے۔ ۲۵ جولائی کو تو اتنی گرم جوشی سے ملے کہ دلی کی ۴۰ درجے کی حرارت میں مزید ۵ درجوں کا اضافہ ہو گیا۔

فکر نے فالج کے دو حملے تو سہہ لیے لیکن یہ تیسرا حملہ جان لیوا تھا۔ دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی۔ سُنتا ہوں آخر وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے رہے۔ وہی طنز، ہنسی، اور استہزا کی باتیں۔ شاید یہ بھی کہا تھا کہ میں نے زندگی کا مزا تو چکھ لیا اب موت کا مزا چکھوں گا۔ دلیر آدمی تھا صرف دلیر ہی نہیں دل بر بھی۔ محبت کی سوغات بانٹتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ تہی دست ہو کر بھی کسی کو کچھ دیا ہی لیا نہیں۔ یہ ستمبر کا مہینہ بڑے ستم کا مہینہ تھا۔ اکثر لوگ تو اسے کہتے ہی ستمگر ہیں۔

فکر اور احمد جمال دونوں نے سرور و نشاط کی دو کانیں کھولی تھیں اور دونوں ہی ایک ساتھ اپنی دو کانیں بڑھا گئے۔ دونوں سادہ دل آدمی تھے۔ یہ سازش انہوں نے کیسے کر لی۔ احمد جمال پاشا تو ہم مزاح نگاروں میں شاید تنہا آدمی تھے جو کسی کو حج کا ثواب نذر کر سکتے تھے ورنہ کہہ تو غالب نے بھی دیا تھا کہ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی۔ غالب نے البتہ یہ بات اچھی کہی تھی کہ غم اتنے دینے تھے تو دل بھی یارب کئی دیے ہوتے۔

[ نوٹ، یہ میرے مضمون "احمد جمال پاشا اور فکر تونسوی کو وداعی سلام" کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ شائع ہو چکا ]



## بقیہ صفحہ ۵۷ دو کتابیں۔ ایک تبصرہ

کارندوں کی بھی ہے جو اس لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی بھی ہے جن کے دلوں میں پیدا ہونے والے عشق کے جراثیم کو سماج کی قدروں پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ فکر تونسوی کی آڑ میں یہ کتابیں ایک پورٹریٹ ہے اس پورے معاشرے کی۔ اس معاشرے میں پل کر جاس نرائنے کے پاس فکر تونسوی بننے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اور فکر تونسوی بننے کے بعد اس کے پاس چارا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کہانی کو باقی معاشرے سے الگ کر سکے۔




دلیپ سنگھ

۴/۵۹ - راجندر نگر - نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰


# دو کتابیں ___ ایک تبصرہ

میرے ایک ڈرامے کا کردار ہے جو بالکل سیدھا سادھا اور بھولا بھالا سا شخص ہے - ایسا شخص جس سے لڑکیاں عشق کرنے سے کتراتی ہیں لیکن شادی کے لیے فورًا ہاں کر دیتی ہیں - اس کردار کی بیوی کسی بات سے ناراض ہو کر اس پر طلاق کا مقدمہ دائر کر دیتی ہے - وکیل کے اکسانے پر وہ عورت اپنے خاوند پر الزام لگاتی ہے کہ وہ ایک خوب صورت ماڈرن عورت کے عشق میں گرفتار ہے - جب یہ الزام بھری عدالت میں لگایا جاتا ہے تو خاوند سمجھتا ہے کہ اس سے بہتر موقعہ اور کیا ہو سکتا ہے دنیا پر رعب جمانے کا کہ مجھ سے بھی خوب صورت ماڈرن عورتیں عشق کرتی ہیں - چنانچہ وہ یہ الزام بخوشی اپنے سر لیتا ہے - وہ سوچتا ہے طلاق سے تو پھر نپٹ لیں گے دنیا پر رعب جمانے کا یہ موقعہ کیوں کھوئیں -

میں اس طویل لمبی تمہید کے لیے معافی چاہوں گا لیکن اس کا فکر کی کتاب کے ریویو سے گہرا سنبندھ ہے - ہمارے ادیب جب اپنی آپ بیتی لکھنے پر اتر آتے ہیں تو ان کا مقصد قریب قریب یہی ہوتا ہے - وہ اپنے قارئین پر رعب جمانا چاہتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ ہم نے اپنی زندگی میں صرف شاعری یا افسانہ نگاری کی ہے - ہم پر سینکڑوں لڑکیاں اور لڑکے مرتے بھی رہے ہیں - اس سلسلے میں دو بڑے ادیبوں کی مثال دے سکتا ہوں - جوش ملیح آبادی اور امرتا پریتم - جوش نے اپنی آپ بیتی میں لڑکیوں اور لڑکوں کا فراخدلی سے ذکر کیا ہے - جن سے ان کے تعلقات رہے ہیں - امرتا جی نے اپنی آپ بیتی میں اپنے دونوں معاشقوں کو مناسب پبلسٹی دی ہے -

قاری تو ان معاشقوں کی داستانوں کو لطف اور رضائی لے کر پڑھتا ہے - لیکن ادیب کو اپنی بیوی یا خاوند سے تو ڈر رہتا ہی ہے کہیں وہ برا مان گئے تو میرا کیا ہوگا - اس لیے ادیب عام طور پر عمر کی اس منزل پر پہنچ کر آپ بیتی لکھتا ہے - جب اس کی بیوی [ یا خاوند ] بڑی لاپرواہی سے کہہ سکتی ہے - کہ مٹی پڑے [ یا پڑی ] کیوں جھوٹ بولتے ہو اور اگر سچ بھی بول رہے ہو تو میری بلا سے -

آپ بیتی لکھنے کا دوسرا مقصد "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگانا ہوتا ہے - یا پھر یہ کہ میں پیدائشی شاعر تھا - اپنی پیدائش کے چند دن بعد ہی میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا -

فکر تونسوی نے بھی اپنی آپ بیتی عمر کے اسی حصّے میں پہنچ کر لکھی ہے - اور جب میں نے یہ آپ بیتی پڑھنی شروع کی یہ سوچ ہی کی کہ دیکھیں فکر اپنے معاشقوں کا ذکر کرنے کے لیے کن خیالی عورتوں کا سہارا لیتا ہے - اور اپنے آپ کو پیدائشی طنز نگار ثابت کرنے کے لیے کن کن جملوں پر تکیہ کرتا ہے جو ماں کا دودھ پیتے ہوئے اس کے منہ سے نکل گئے -

فکر تونسوی بھی اور ادیبوں کی طرح اپنے معاشقوں کا ذکر کرنے سے باز نہیں آیا - آئیے اس کے ایک معاشقے کی جھلک دیکھیں فکر کی معشوقہ کا نام کرشنا ہے - کرشنا فکر کے استاد سوامی جی کی بیوی تھی جس سے اس نے خوش نویسی سیکھی - خوش نویسی فکر ان پاپڑوں میں سے ایک تھا جو اس نے زندگی میں بیلے

میں کرشنا پر جان چھڑکتا تھا - اس کے ہلکے سے اشارے پر ہر کام تیزی سے کر دیتا - اس لیے وہ مجھ پر جان چھڑکتی تھی - وہ رسیلی اور سانولی عورت مجھے کبھی اپنی ماں - کبھی بہن ، کبھی گوڈ اور کبھی محبوبہ لگتی تھی ___ بڑا

کنیفوژن تھا۔ وہ بیچ کیا مجھتا تھی؟ بیٹا یا بھائی یا عاشق۔ بڑا کنیفیوژن تھا۔ بیک وقت بہت سی کوالٹیاں بہت سے روپ ایک شخصیت میں جمع ہو جائیں تو سوائے صدق وصفا کے اور اس کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔
میں جانتا تھا کہ کرشنا اور سوانی جی کی شادی کو دس برس ہو گئے تھے۔ مگر وہ ایک ننھے سے بچے کی آواز سے محروم تھے اور یہ محرومی ایک پیاس کی شکل میں ڈھل گئی تھی۔ ایک لمبی پیاس، جسے بجھانے کے لیے وہ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔"

ت تیرے کی کیا عشق کیا۔ لیکن فکر بھی کیا کرے وہ ایک ایسے گاؤں میں پیدا ہوا۔

جس کی مٹی میں سالی کوئی ایسی تاثیر ہی نہ تھی" اس کا گاؤں "ہیروں سے محروم ایک گاؤں تھا۔ سیدھا سادھا دوایتی، امن پسند۔ یہاں ہیرو اور لیڈر جنم نہیں لیتے تھے۔ صرف نارمل انسان جنم لیتے تھے، اس گاؤں کی لڑکیاں بھی ہیروئین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ پل کا سا عشق کا کنکر۔ اور پھر عروسی لباس پہن لیتیں اور بچے پیدا کرنے میں مصروف ہو جاتیں، ریاضی کے کسی انجانے فارمولے کے تحت"

مجھے غصہ تو بہت آیا کہ اگر آپ بیتی لکھنے کا اتنا ہی شوق تھا تو پھر تو وہاں کیوں پیدا نہیں ہوا جہاں جوش یا امرتا پریتم پیدا ہوئے تھے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر معاف کر دیا کہ سارے ہندستان میں دو ایک ہی گاؤں ایسے ہیں جہاں ہیریں اور رانجھے پیدا ہوتے ہیں۔ باقیوں کی حالت تو وہی ہے جو فکر کے گاؤں کی تھی۔ میں جانتا ہوں کیوں کہ میرے اپنے گاؤں کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

عشق کی داستانوں سے مایوس ہو کر میں کتاب کے اس حصے پر پہنچا جہاں فکر کو احساس ہوا کہ وہ شاعری کر سکتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"میرے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ میں حقے کا تمباکو اس نفاست اور خوب صورتی سے گوندھتا ہوں اور اس پر جلتے ہوئے انگارے اس ترتیب اور توازن سے سجاتا ہوں کہ حقے کے کش میں جنت کا مزہ آجاتا ہے۔
آج میں اپنی اس کوالٹی کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں کہ میرے اندر ایک شاعر چھپا بیٹھا تھا۔
جو ہر بات میں نفاست، حسن اور توازن پیدا کر دیتا تھا۔ جیسے میں تمباکو نہیں گوندھتا تھا ایک شعر کہہ دیتا تھا۔ تمباکو میں آہنگ پیدا کر دیتا تھا۔ انگاروں میں جنت کے نظارے دکھا دیتا تھا۔"

گویا فکر کو اپنے شاعر ہونے کا احساس شعر کہہ کر نہیں ہوا بلکہ حقے میں تمباکو بھر کر ہوا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ فکر کی آپ بیتی میں ایسا کچھ نہیں جسے "چٹخارہ" لے کر پڑھا جائے۔ ایسا آدمی لکھے گا بھی کیا جو نہ صرف اپنی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ بلکہ اپنی آپ بیتی کے آدھے حصے کا نام بھی "میری بیوی" رکھ دیا ہے۔ ہاں البتہ کتاب میں ایسا بہت کچھ ہے جسے پڑھ کر زندگی کا لطف آتا ہے۔ کتاب میں سے چند ایک جملے ملاحظہ ہوں۔

"انسان کو اس ذلیل حد تک صابر و شاکر بھی نہیں ہونا چاہیے"
"سکول میں پہلا سبق مجھے یہ ملا کہ ہر جمہوریت کی پشت پر ایک ڈنڈا ضرور چاہیے۔"
"کرسی پر بیٹھتے ہی والد صاحب نے گردن اکڑالی۔ عزت مل جائے تو اکڑفوں خواہ مخواہ ابھر آتی ہے۔"
"یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ دنیا میں ہر ماں باپ کو بچوں کے مستقبل کا خیال کیوں رہتا ہے، حال کی بدحالی کا کیوں نہیں رہتا۔"

کتاب کو دوبارہ پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قارئین کو یہ نئی طرح کی آپ بیتی لگے گی۔ ان آپ بیتیوں کی طرح نہیں جو انھوں نے آج تک پڑھی ہیں۔ بلکہ ایسی جیسی ایک آپ بیتی کو ہونا چاہیے۔ "میں" اور "میری بیوی" کی آڑ میں یہ آپ بیتی ایک پورے معاشرے کی کہانی ہے۔ یہ کہانی اُن سادہ لوح کسانوں کی بھی ہے جنہیں زمین دار لوٹتے ہیں اور وہ خوشی سے لٹ جاتے ہیں۔ زمین دار کے ان

[باقی صفحہ ۵۵ پر دیکھیے]



فکر تونسوی

# شاعر اور نقاد

ہندوستان میں اگر آپ کی ملاقات کسی نقاد سے ہو جائے۔ تو آپ بے تکلف ان سے سوال کر سکتے ہیں۔ "حضور! کیا آپ نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا؟"

"ہاں، مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"کیونکہ سُنا ہے، جو شخص شاعری میں ناکام ہو جائے وہ نقاد بن جاتا ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے آپ ایک شاعر کی غزلوں میں کیڑے نکال رہے تھے۔ اور نقاد کی پہچان ہی یہی ہے۔ کہ وہ دوسروں کی شاعری میں کیڑے نکالے۔"

وہ کہے گا۔ "جی ہاں، کیڑے نکالنا بھی تخلیقی تنقید ہے۔ اور تحقیقی تنقید میں ہمارا خون نچڑ جاتا ہے۔ کیوں کہ ؎

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
جب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

عمدہ شعر ہے۔ کیا یہ آپ کا ہے؟"

"نہیں بلکہ ہاں بلکہ نہیں، مگر اب کچھ اہلِ ذوق مجھے کہہ رہے ہیں۔ کہ آپ اتنے اچھے نقاد نہیں ہیں، جتنے اچھے شاعر تھے۔ مثلاً عرض کیا ہے....؟"

اور اگر آپ میں بچ نکلنے کی طاقت نہیں۔ تو وہ آپ کو اپنی وہ غزلیں اور نظمیں سُنا دے گا۔ جن کی فرومایگی نے اُسے نقاد بنا دیا۔

"دُنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی شاعر پیدا ہوتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ اگر دوسرے ملک میں دو شاعر پیدا ہوئے تو ہندوستان میں بیس شاعر پیدا ہو گئے۔ ایک شاعر نے مجھے بتایا۔ کہ ہندوستان کا ہر تیسرا آدمی پان فروش ہے تو ہر چوتھا آدمی شاعر ہے۔ بلکہ اکثر تو یوں بھی ہوا ہے کہ جو ناکام شاعر نقاد نہیں بن پاتا۔ وہ پان فروش بن جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو پان فروش، نقاد سے بہتر پوزیشن میں ہے۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ پان فروش شاعر ہوتا ہے۔"

"ابھی دو منٹ پہلے اس سے نجات پا کر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے پان طلب کیا۔ تو اس نے پان پر چونا کتھا لگاتے لگاتے مجھے اپنی پوری غزل سُنا دی۔ میں نے انتقاماً اُسے اپنا دو غزلہ سنا دیا۔ تو جواب میں اس نے اپنا سہ غزلہ میرے پان میں لپیٹ دیا۔ میں نے خلاصی کے لیے احتیاطاً مکرر نہیں کہا۔ تو وہ بولا کیا جناب پان میں مغلئی تمباکو ڈال دوں؟"

میں نے کہا ایک شرط پر کہ تمباکو ڈالتے وقت آپ اپنا چوہتر لہ ہیں سُنائیں گے"۔

"اور میری بھی ایک شرط ہے کہ پان کھانے کا شوق ہمیشہ میری دکان پہ لوٹا کیا کیجیے، ابھی مجھ تو زمانے کی بوقلمونی نے مارا۔ ورنہ میں ہندوستان کا غالب کہلاتا۔ اب دیکھیے، عہدِ حاضر کا غالب' پان بیچ رہا ہے۔ اور ایک بات اور سنیئے، میرا یہ تمباکو کھانے سے آپ کی شاعری دو آتشہ ہو جائے گی۔ تشریف لایا کیجیے، آپ کے لیے تمباکو فری۔"

اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ہندوستان میں شاعر اکثریت میں ہیں اور سامعین اقلیت میں۔ ہر شاعر شکایت کرتا ہے کہ اُسے سامع نہیں ملتا اور چوں کہ سامع نایاب ہے اس لیے ایک شاعر دوسرے شاعر کو ہی پکڑ کر اُسے شعر سُنا دیتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک ادبی محفل میں شمولیت کا موقع ملا۔ تو کیا دیکھا۔ بان تیس پینتیس شاعر موجود تھے۔ اور تیس پینتیس شاعروں کو سامعین سمجھ کر اپنی غزلیں اور نظمیں سُنا رہے تھے۔ صاحب خانہ نے جو صاحب صدر بھی بنے ہوئے تھے، سبھی شاعروں سے اپنی تین غزلیں زیادہ سنا دیں کیوں کہ شعرا سے کرا پر چائے پانی کا پُر تکلف خرچ اپنی جیب سے اور کیا تھا۔"

اس لیے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں یہ الہامی احتیاط مشہور ہے۔ کہ شہر کے کسی بھی راستے پر اگر کوئی اینٹ پڑی ہو تو اسے ہاتھ لگا کر مت اٹھاؤ، ورنہ اینٹ کے نیچے سے ایک نہ ایک شاعر نکل آئے گا۔ جو سر تسلیم خم کر کے کہے گا۔ "آداب بجا لاتا ہوں۔ سنئے، ایک بالکل تازہ غزل ہو گئی ہے، عرض کیا ہے ۔۔۔"

اسی احتیاط کے توڑ کے لیے کئی ہندوستانی شعراء، سامعین کی تلاش میں دوسرے ملکوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ لندن، واشنگٹن، کینیڈا، عرب، امریکہ اور روس وغیرہ۔ اور جب لوٹتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے سامعین تو بہت ترقی کر چکے ہیں۔ بلکہ کئی ایک لوٹتے ہیں تو شاعر لگتے ہی نہیں، سیاح لگتے ہیں۔ چند شعراء کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ شاعری وہیں چھوڑ آئے، سونا اور ٹیپ ریکارڈنگ مشین سمگل کر کے لے آئے۔ البتہ ایک شاعر کو میں نے بڑی یاسیت کے عالم میں دیکھا۔ تو پوچھا "آپ لندن میں ہی رہ جاتے۔ لوٹ کیوں آئے" وہ بولے "اس لیے کہ مجھ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے"

میں نے پوچھا۔ "اس دیش بھگتی کا مطلب؟"

وہ بولے، "یہاں ہندوستان میں کسی اینٹ کے نیچے بیٹھ جاؤ تو گھر کی آدھی باہر کی ساری سے بہتر ہے۔ کبھی نہ کبھی اتفاقاً، حادثاً، کوئی نہ کوئی سامع تو ۔۔۔"

چنانچہ اس سامعین نایابی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہندوستان میں مشاعروں کو رائج کیا گیا ہے۔ سامعین کو مشاعرے کی طرف کھینچنے کے لیے پہلے فلمی ریکارڈ لگائے جاتے ہیں۔ جنہیں سننے کے لیے بچے بچے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بچوں کی تلاش میں ان کے ماں باپ پہنچ جاتے ہیں۔ اور پھر کسی نہ کسی وزیر کو چیف گیسٹ کے طور پر اسٹیج پر لایا جاتا ہے۔ اور ہر وزیر کے پاس خوشامدیوں کی ایک فوج ہوتی ہے۔ اور یوں جب مشاعرے کا ہال بھر جاتا ہے۔ تو اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ ہال کے تمام گیٹ بند کر دیے گئے ہیں۔ شاعروں کو سنے بغیر کسی کو ہال سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔

چنانچہ دوسرے دن اخباروں میں مشاعرے کی روداد میں تحریر کیا جاتا ہے کہ مشاعرہ کل رات صبح کی اذان کے وقت تک چلتا رہا۔ ہوٹنگ اور مکرّر دونوں اپنی اپنی انتہاؤں سے کئی گنا آگے بڑھ گئے تھے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ آدھے سامعین بے ہوش ہو کر نشستوں سے گر پڑے تھے۔ ان سب کو صحت یابی کے لیے اسپتال پہنچا دیا گیا۔

شعراء حضرات (تعداد ایک سو بیس) بے ہوش نہیں ہوئے اس لیے انہیں اسپتال میں نہیں پہنچایا گیا۔ بلکہ ان کی خاندانی رہائش گاہ یعنی اینٹوں تک خوش و خرم پہنچا دیا گیا۔

## نقّاد

میں نے ایک ہندوستانی نقاد سے کہا "ہندوستان میں اچھے اور بُرے دونوں قسم کے شاعر موجود ہیں اور دونوں اقسام بڑی نیچرل ہیں"۔

اس نے ناک چڑھائی۔ ناک لمبائی میں چھوٹی تھی، اس لیے وہ ناک چڑھا کر ہی انہیں لمبا کرتا تھا۔ بولا "نہیں جناب! شاعر اچھے یا بُرے نہیں ہوتے۔ وہ صرف شاعر ہوتے ہیں یا شاعر نہیں ہوتے"۔

مگر اس کے مقابلے پر میں نے ایک وزیر زراعت سے پوچھا۔ کہ "ہندوستان میں اچھے شاعر زیادہ ہیں یا بُرے"۔

وہ بولے "دونوں ایک دوسرے سے زیادہ ہیں"۔

میں نے پوچھا "لیکن جناب! دونوں ایک دوسرے سے زیادہ ہیں تو کیوں ہیں۔ میرا مطلب ہے ہندوستان میں شاعر اتنی زیادہ تعداد میں کیوں پیدا ہوتے ہیں"۔

وزیر زراعت نے مجھے بتایا "اگر اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ملک کی سرزمین بہت زرخیز ہے"۔ چنانچہ انہوں نے مجھے سرکاری اعداد و شمار کے ساتھ اس انداز میں بتایا (جیسے وہ پارلیمنٹ میں کسی سوال کا جواب دے رہے ہوں) کہ ملک میں سالانہ اناج کتنا پیدا ہوتا ہے اور سالانہ شاعر کتنے؟

میں نے اعداد و شمار کی داد دی تو وزیر زراعت نے بڑے احترام سے اپنی گردن جھکائی، آداب کہا اور بولے "مثلاً ملاحظہ فرمائیے خاکسار کا ایک شعر، عرض کیا ہے ؎

آنکھ سے دل تک آنسو بہتے رہتے ہیں
آنسو بہتے رہتے ہیں مرے دل سے آنکھ تک

گویا وزیر زراعت بھی شاعر نکلا۔ پہلے شاعر تھا۔ بعد میں جب پچھتایا، تو وزیر بن گیا۔

لیکن ایک اور صاحب نے شاعروں کی بڑھتی تعداد کی ایک اور وجہ بتائی۔ جو زیادہ معقول تھی۔ کیوں کہ وہ صاحب خود شاعر نہیں تھے کہنے لگے۔ "صاحب! بات یہ ہے کہ فیملی پلاننگ کے تحت آپ بچوں کی تعداد تو روک سکتے ہیں۔ شاعروں کی پیدائش کو نہیں روک سکتے"۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔

وہ بولے "اس میں حیرت کیسی؟ مثلاً سرکار ہر گھر کے لیے دو بچوں کا کوٹہ رکھتی ہے۔ تو ان میں سے ایک بچہ ضرور شاعر بن جائے گا"۔

"اور دوسرا بچہ کیا سامع بنے گا؟"

"جی سامع کی گنجائش یہاں کہاں ہے۔ دوسرا بچہ بنے گا، روزی کمانے کا ذریعہ۔ کیوں کہ شاعر تو کمائے گا نہیں۔ مثلاً ایک شاعر سے کسی نے پوچھا، آپ کیا کام کرتے ہیں۔ وہ بولا میں شاعری کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا، ارے شاعری تو کرتے ہو۔ مگر کام کیا کرتے ہو۔ نہ کرتے "۔ مگر ایک شاعر کی زبانی اتفاقاً معلوم ہوا، کہ اب شاعر بھی روزی کمانے لگے ہیں۔ مثلاً فیملی پلاننگ کے حق میں، میں نے ڈھائی سو نظمیں لکھیں تو ایک وزیر نے مجھے سرکار سے ڈھائی ہزار روپے انعام دلوایا حالانکہ اس وزیر کے خود چھ بچے تھے۔ لیکن پھر بھی مجھے نہ صرف ڈھائی ہزار روپے دلوائے، بلکہ پدم شری کا خطاب بھی دلوا دیا۔ (ہندوستان میں پدم شری کا خطاب، پیتل کی اس ٹوٹی کڑاہی کے برابر ہوتا ہے۔ جس کے دام نئی کڑاہی سے ڈیوڑھے ملتے ہیں۔)

اور پھر مجھے "بتا کر" ششدر کر دیا گیا۔ کہ ہندوستان میں کبھی کبھی کوئی بہت بڑا شاعر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی ٹریجڈی یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ جب تک زندہ رہتا ہے۔ کسی بھی متوسط شاعر کو ابھرنے نہیں دیتا ٹریجڈی در ٹریجڈی یہ ہوتی ہے۔ کہ بڑے شاعر کی حیات میں ہی متوسط شاعروں کا ایک بہت بڑا قافلہ جنم لیتا ہے۔ اور اس قافلے کی پوری زندگی اس خام موہے کی آڑ میں اکارت جاتی ہے کہ شاعری جزئیست از پیغمبری یعنی ہم شاعر ہیں اس لیے ہم پیغمبر ضرور ہیں۔ مگر انہیں پیغمبر کوئی نہیں مانتا بلکہ لوگ اس بڑے شاعر کو ہی پیغمبر مانے جاتے ہیں۔ اور ٹریجڈی در ٹریجڈی در ٹریجڈی یہ کہ بالآخر وہ متوسط شاعروں کا قافلہ بھی اس بڑے شاعر کو ہی پیغمبر ماننے لگتا ہے۔ جب کہ بڑے شاعر کی موت کے بعد جلوس، جلسے، سمینار، یادگاریں، مجسمے، اس کی شاعری کی تعریف اور تشریح میں کتابوں کے انبار شائع کیے جاتے ہیں۔ بڑے شاعر کی صدیاں منائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ بڑا شاعر ایک صدی تک خود انتقال نہیں کرتا۔ اور آنے والی صدیاں اس کی تحسین و توصیف میں گذر جاتی ہیں۔ اور ...

اور پھر اس سے پہلے کہ کسی متوسط شاعر کو پیغمبری کا نادر موقع ملے۔ ایک اور بڑا شاعر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہندوستان کی باقی شاعری کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

ان بڑے شاعروں میں غالب نام کا ایک شخص تھا۔ جس کے اندر اتنی پیغمبری طاقت تھی کہ میں نے ایک تانگے بان کو بھی غالب کا شعر پڑھتے دیکھا اور ایک وزیر کو بھی۔ تانگے بان جب غالب کا شعر پڑھتا ہے تو اسے سن کر تانگے کے گھوڑے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وزیر شعر پڑھتا ہے تو اسے سن کر قوم کی رفتار تیز نہیں ہوتی۔ بلکہ رک جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ جب وہ غالب کا شعر پڑھتا ہے، تو شعر کے وزن اور بحر کو خارج کر کے پڑھتا ہے، اور اس لیے پڑھتا ہے کہ اس کی وزارت خود وزن اور بحر سے خارج ہوتی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ وزیر کے بہی خواہ اسے داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "جناب! آپ تو غالب سے بھی زیادہ بہتر شعر کی تخلیق کرتے ہیں"۔

# مکتوب

**احمد رضا ردولوی** ـــــ دہلی یونیورسٹی روڈ، دہلی

میں نے اعجاز صدیقی مرحوم پر جو مضمون لکھا تھا اس کی ذیلی سرخی تھی ایک ستارہ شکن جنبش لب۔ میں نے لکھی ہے، عنوان نہیں کیا کر یہ اصل مضمون ہے یا ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا یا ان کی تمام تخلیقات کا مبسوط جائزہ ہے۔ ان پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک چھوٹا سا مضمون بھی سپرد قلم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس خراج عقیدت میں ایک خاص ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے ہے کہ اعجاز صدیقی بھلانے کی چیز نہیں ہیں، رہا میرا معاملہ وہ یہ ہے کہ میں تفصیل سے زیادہ اختصار و اجمال کا قائل ہوں۔ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ایک لطیفہ سے کرنا چاہتا ہوں جسے ملا واحدی مرحوم نے بیان کیا ہے۔

"علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کے ہاں برابر برابر کمروں میں مقیم تھے۔ میں ملا واحدی اور خواجہ صاحب حضرت خواجہ حسن نظامی علامہ شبلی سے ملنے گئے۔ نظام المشائخ کا پہلا خاص نمبر (شہید نمبر) تازہ تازہ نکلا تھا۔ اس میں سرمد شہید پر مولانا ابوالکلام آزاد کا مضمون چھپا تھا۔ علامہ شبلی نے فرمایا سرمد کے حالات اتنے ہی ملتے ہیں جتنے ابوالکلام نے لکھ دیے ہیں لیکن حالات کو پھیلایا بہت ہے۔ اکٹھے بیس صفحے لکھ ڈالے۔ میں لکھتا تو دو صفحوں سے زیادہ نہ لکھتا۔ مواد صرف دو صفحوں کا ہے۔ باقی ابوالکلام کی ادبیت ہے۔"

مجھے یقین ہے اعجاز مرحوم پر شاعر کا خاص نمبر شائع ہوگا اور جلد شائع ہوگا۔ ان کی رحلت پر کافی وقت گزر چکا ہے اور اس میں مجھ سے بہتر لکھنے والے تفصیلی مضامین بھیجیں گے اور وہ اردو کی معاصر تاریخ کی اہم دستاویز ثابت ہوگا۔

**جمیل جالبی** ـــــ وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی، کراچی (پاکستان)

ہندوستان سے شائع ہونے والے پرچوں میں آپ کا رسالہ اس لیے ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں آپ اچھا اور معیاری ادب شائع کرتے ہیں۔

**علی جواد زیدی** ـــــ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ

آپ نے شاعر کو چیزے دیگر بنا دیا ہے۔ اس وقت یہ ہندوستان کا بہترین جریدہ ہے۔ جو ادبی تخلیقات کو نہایت خوش سلیقگی اور خوش مذاقی کے ساتھ ایک وسیع حلقے تک پہنچا رہا ہے۔ نئے لکھنے والے ابھر کر سامنے آ رہے ہیں اور معتبر اور مستند شعراء و ادباء بھی آپ سے تعاون کر رہے ہیں، اس طرح ہماری حرکت ادبی کی ایک متوازن تصویر پیش کرنے میں آپ یقیناً کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہر شمارے میں آپ کی جدت طرازی اور معیار پسندی کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے برابر نکھرتا جا رہا ہے۔

مبارکباد قبول کیجیے۔

**رام لعل** ـــ شانتی نکیتن، ڈی۔ ۲۲۹، اندرا نگر، لکھنؤ

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہو گیا۔ سرورق کی تبدیلی پسند آئی۔ ساتھ ساتھ اس شمارے کے ایک مضمون "نئی کہانیاں ـــ ایک بازدید" ڈاکٹر خورشید سمیع، قمر مطاہر، مجیب جمال، خورشید ملک، خورشید حیات، عبدالرحمٰن شاداب اور ایم متوجہ کی نئی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔

خورشید سمیع نے جس زاویۂ نگاہ سے گزشتہ تیس چالیس برس کے افسانوی ادب کو دیکھا اور پرکھا ہے اسے دیکھ کر اردو کے ان نقادوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو گروہ بندی اور جانب داری کو تنقید کے لیے ایک زہر تصور کرتے تھے۔ آزادی کے بعد گروہ بند تنقید کا پہلا الزام ترقی پسند نقادوں پر ان لوگوں نے لگایا جو بعد میں خود اسی رجحان کا شکار ہو گئے۔ اس سے افسانوی ادب کو کیا نقصان یا فائدہ پہنچا اس کو بھی تنقیدی میزان پر پرکھنے کی ضرورت ہے اور یہ کام بھی کوئی غیر جانب دار نقاد ہی کر سکے گا۔

خورشید سمیع نے جس بازدید کا بیڑا اٹھایا ہے اس کی مثال جدید عہد میں مہدی جعفر اور انور سدید پہلے ہی قائم کر چکے ہیں۔ پرانے نقادوں میں اس کی واضح مثالیں سید احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور کے یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

خورشید سمیع نے اپنے مضمون کی بنیاد دو باتوں پر خاص طور پر رکھی ہے۔ تصنیف مصنف کی شخصیت کی غمازی ضرور کرتی ہے۔ اس کا اسلوب اس کے شخصی رویوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور کہانی کے اندر کہانی پن کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہی قاری کے لیے بات دلچسپی بنتا ہے۔ باقی باتیں ان کے اپنے الفاظ میں۔ "عصری حسیت، نئی علامتیں، نئے تلازمے، نئی لفظیات، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کہ مزاج میں وسعت، فکر میں گہرائی، تہہ در تہہ معنویت اور خیالات میں بالیدگی... ہو۔"

ہمارے نئے نقاد عام طور پر کہانی کے کو نظر انداز کر کے اس کے بعض جملوں یا پیراگرافوں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی قسم کے جملے بہت ہی فکر انگیز ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت پورے افسانے میں ہمیشہ کلیدی ہرگز نہیں ہوتی۔ اور یہ جملے قاری کو اس وقت بے حد مرعوب کرتے ہیں جب کوئی تنقید کی مسند پر بیٹھا ہوا شخص اپنے تنقیدی کلیہ کا محور بنا لیتا ہے۔

خورشید سمیع صاحب نے بھی بیشتر جگہ افسانوں کے اقتباسات کو اپنے تنقیدی بیان کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو ان کے تنقیدی شعور کی وضاحت میں معاون بن جاتے ہیں لیکن انہوں نے جوگندر پال کی ایک بہت ہی کمزور کہانی کے اقتباس کا سہارا لے کر ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ جوگندر پال کا "میم بازیافت" اور اس قسم کی کچھ اور اچھی کہانیوں کو بنایا ہے جن پر خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ان کے برعکس ان کی بلند بانگ کہانیوں کو زیادہ بحث میں لایا گیا ہے جن کی ادبیت میری نظر میں مشتبہ ہے۔

اس مضمون کو پڑھ کر اس بات کی خوشی ہوئی کہ [illegible] کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں سلام بن رزاق، انور قمر، انور خان، شفق، عبدالعزیز اور سید محمد اشرف کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ کچھ اور بھی نئے نام اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر [illegible] ظفر اوگانوی، انیس رفیع، شوکت حیات، کنور سین، [illegible] رضوان احمد، سید احمد قادری، انیس صدیقی، حسین الحق، [illegible] فراغ روہوی، احمد یوسف، ساجد رشید وغیرہ۔

سرکیف شاعر نے اب تک چند مضامین افسانوی ادب کے بارے میں چھاپے ہیں ان میں خورشید سمیع کا مضمون ایک اچھا اضافہ ہے۔ اور بحث کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔

شعری حصے میں اختر سعید خاں کی غزل کا یہ شعر دل میں بے اختیار اتر گیا۔

پھر بھلا اس کا بدل دے دیجئے
چھوڑیئے جان کی قیمت کیا ہے

**مہدی جعفر** ـــ زیڈ۔ ۲۲، سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

اس بار آپ نے شاعر میں اچھے مضامین شائع کئے ہیں۔ "نئی کہانیاں ـ ایک بازدید" ہم پر خوش گوار اثر ڈال گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر خورشید سمیع نے افسانوں کی تفہیم کا ثبوت دیا ہے۔ آج کل یہ چیز کمیاب ہے۔ جس انداز سے انہوں نے [illegible] جو سمجھے اور سمجھائے، دونوں مشکل راہوں سے گزرتے ہیں۔ نام گنوانے، دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ [illegible] ڈاکٹر خورشید سمیع نے اقتباسات دیئے ہیں اور ان کی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اگر کمی تھی تو اس بات کی کہ مضمون [illegible] اور تشنہ رہا۔ نئے افسانہ نگار کم DISCUSS ہوئے اور کم نئے افسانے زیر بحث آئے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور انور سجاد بھی اپنی حساسیتوں کے اعتبار سے نئے [illegible]

ناصر بغدادی کا مضمون "ادبی تعصبات کا مسئلہ" اچھا ہو سکتا ہے، مگر ناکام رہی۔ صرف اور بعض چند جملے لکھ کر تاثر دیا کہ ادبی تعصب کے گروہ میں شامل ہیں وہ بھی پیچھے سے کہ جن کی صورتیں نہیں دیکھ سکے۔ وہ یہ بات ثابت بھی نہیں کر سکے کہ کوئی بھی ناقد کس طرح سے ذاتی طور پر ادبی تعصب کا شکار ہے۔ جزوی نزاعی باتوں کے اور بیرون ملک کے [illegible] سے بیان کا کوئی بھی ادیب تعصب کی ذیل میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ خدا کرے وہ تحقیق تفتیش جلد پیدا ہو کر ہمارے سامنے آ جائے جس سے ثابت ہو جائے کہ ہمارا ادب اجتماعی سوچ کا عکاس نہیں ہے وغیرہ۔ ویسے میں ناصر بغدادی کی تحریریں پسند کرتا رہا ہوں، مگر یہ مضمون بہت ہلکا لگا۔

"ادب کی بدلتی قدریں" عنوان بہت اچھا ہے، مگر مضمون ادھورا معلوم ہوتا ہے۔ نام گنائے ہیں اور مواد FUTURE SHOCK جیسا ہے۔ آج کل جہاں چاہے پڑھ لیجئے۔ تشنگی کا احساس رہا۔ تابش انصاری صاحب کو چاہیے کہ کتاب کی گرفت سے نکلیں اور ایک اور مضمون لکھ ڈالیں جو گہرا ہو۔

ہماری نئی قدروں کا حامل ہو۔ ادب کی نئی قدروں اور زندگی کی نئی قدروں میں کیا فرق ہے؟ اور ہمارے یہاں جو ادب لکھا جا رہا ہے، خصوصاً نئی نسل کا ادب، اس کی کون سی نئی قدریں ہیں، قدریں کس طرح متصادم اور متفرق ہیں؟

**مرزا حامد بیگ** ۔ شعبۂ اردو، گورنمنٹ گورڈن کالج، راولپنڈی (پاکستان)

شمارہ ۲۵ کے گوشۂ مکتوبات میں نظام صدیقی نام کے کسی صاحب (جن کے نام اور کام سے یہ حقیر آشنا نہیں) کا خط پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آئی۔ موصوف کو غالباً ہمارے محترم دوست ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے نام سے چڑ ہے کہ جہاں حامد دیکھا لگے عفونت بکھیرنے۔ وہ برا بھلا تو حامدی کاشمیری صاحب کو کہہ رہے تھے اور حوالے میرے مضمون سے دیے جاتے تھے۔ یہاں سے ان کی بصیرت کا احوال کھلا۔ مار دن گھٹنا پھوٹے آنکھ کا معاملہ ہے۔ اگر فرانسیسی علامت نگار ۱۹ویں صدی کے پروردہ تھے تب بھی میری بات کہاں رد ہوئی؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے موصوف کی عمر کا اندازہ نہیں لیکن وہ یقیناً اپنے عنفوان شباب میں پڑھے ہوئے مضامین میں سے ترجمے کی عالمی روایت پر اردو میں لکھا ہوا کوئی ایک مضمون بھی نکال کر نہیں دکھا سکیں گے۔ جس کا دعویٰ انہوں نے کیا ہے۔ ترجمے کے مسائل سے متعلق البتہ مندرجہ ذیل تحریریں اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک تحریر بھی ترجمے کی عالمی روایت سے متعلق نہیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مقدمہ، تاریخ یونان ۔ ۱۹۱۹ء)، نیاز فتح پوری (ترجمے کے متعلق چند اصولی باتیں، مطبوعہ نگار، جولائی ۱۹۲۴ء)، قاضی احمد مختری (اردو تراجم، مطبوعہ اردو، اکتوبر ۱۹۲۹ء)، پنڈت برہما موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (اردو کی موجودہ ضروریات۔ مطبوعہ، ہمایوں ۱۹۳۳ء)، عبدالقادر سروری (مقدمہ: مغربی تصانیف کے اردو تراجم ۔ ۱۹۳۹ء)، میر حسن (مغربی تصانیف کے اردو تراجم ۔ ۱۹۳۹ء)، عزیز احمد (دیباچہ، رومیو جولیٹ ۔ ۱۹۴۱ء)، سید باقر حسین (ترجمے کے اصول ۔ مطبوعہ: ماہِ نو ۱۹۵۰ء)، سید ہاشمی فرید آبادی، مولانا عبدالمجید سالک، رفیق خاور، پروفیسر ممتاز حسین (مذاکرہ ترجمے کے چند پہلو۔ مطبوعہ: ماہِ نو، مارچ ۱۹۵۲ء)، ڈاکٹر ظ انصاری (ترجمے کے بنیادی مسائل، مطبوعہ، ادبِ لطیف، اگست ۱۹۵۳ء)، محمد حسن عسکری (ترجمے سے فائدہ اٹھانے والے ۔ مطبوعہ ماہِ نو، فروری ۱۹۵۴ء)، ضمیر اظہر (اردو تراجم کا جائزہ ۔ مقالہ ایم۔ اے (اردو)، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۵۵ء)، ڈاکٹر جمیل جالبی (ترجمے کے مسائل ۔ مطبوعہ نیا دور، ۱۹۶۰ء)، پروفیسر آل احمد سرور (تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل)، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (اردو میں ترجموں کی نوعیت و اہمیت، مطبوعہ، نگار، جنوری ۱۹۶۳ء)، پروفیسر جیلانی کامران (ترجمے کی ضرورت)، میرزا ادیب (کچھ ترجمے کے بارے میں۔ مطبوعہ نوائے وقت راولپنڈی، ۱۰ مئی ۱۹۷۸ء)، امین نالی (ترجمے کی ضرورت ۔ ۱۹۷۸ء) اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں (ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اعادہ کے فن ۔ مطبوعہ، کتاب، جون ۱۹۸۲ء)۔

نظام صدیقی صاحب سے صرف اتنی گزارش ہے کہ انہیں بے شک نہ پڑھیں لیکن دیکھ ضرور لیں۔ "شاعر" میں "تیسرا پڑاؤ" "حسن" کا سلسلہ پسند آیا۔ شمارہ ۲۶ اور ۲۷ کے حصۂ مقالات میں کالی داس گپتا رضا، شمس الرحمٰن فاروقی اور ابراہیم یوسف کے مضامین محققانہ اور ناقدانہ بصیرت کے نمونے ہیں۔

**کنور سین** ـــ ای ۔ ۴۷، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی

جناب خورشید سمیع صاحب کا مقالہ "نئی کہانیاں، ایک بازدید"، پڑھ کر عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے اردو زبان اور اردو ادب کے حق میں دعا پڑھی۔

ایسا بے معنی، بے بضاعت، موضوع سے بے ربط، منطق سے مبرا اور استدلال سے عاری اور بے اوقات اور سطحی مقالہ آج تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس پر طرۂ مقالہ نگار کے لہجے کی فرعونیت۔ فلاں افسانہ نگار کا معاملہ یہ ہے ۔ فلاں کا وہ ہے۔

رنج ہوا کہ شاعر جیسے معتبر اور جلیل القدر جریدے میں ایک باہوش، باشعور اور باریک بیں مدیر کی ادارت میں ایسا زبان کے لحاظ سے ناقص اور بیان کے لحاظ سے مفلس مقالہ انتہائی اہم مقام حاصل کر گیا۔

میں یہ مانتا ہوں کہ تنقید کا ایک وصف حیا بھی ہے۔

حضور خورشید سمیع صاحب کا مضمون اس بات کا ثبوت ہے کہ جناب کو آج کے افسانے کی اس وسعت کا علم ہی نہیں ہے جو اسے علامتی، استعارتی، اور رمزیاتی اندازِ بیان نے عطا کی ہے۔ حضور تو بس قلم لے کر بیٹھ گئے اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی طرح فتوے صادر فرمانے لگے۔

یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ جہالت اکثر اسے داغدار کرنے کی کوشش میں رہتی ہے۔

اسی شمارے میں دو اور مقالات ہیں ۔ ادب کی مذہبی قدریں (مالی انصاری) ۔ ادبی تعصبات کا مسئلہ۔ ناصر بغدادی، دونوں مقالے سنجیدگی اور ذمہ داری سے تحریر کیے گئے ہیں۔ ادبی تعصبات کا مسئلہ، تو ایک طرح سے جناب خورشید سمیع صاحب کے مقالے پر طنز کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اختر سعید صاحب کی کلاسک غزل کا یہ شعر ـــ

ہم ہیں اور داستانِ ماضی کا عذاب
عہدِ نو تیری بشارت کیا ہے

اور اس کے ساتھ ہی قبلہ سیماب اکبر آبادی کے افکار زریں۔

**تارا چرن رستوگی** ـــ بیرو باڑی، گوہاٹی ۱۱۰۰۰

شاعر، شمارہ ۵ / ۵۰ سیماب مرحوم کی تصنیف دستور الاصلاح سے ایک اقتباس جو خاصا اہم ہے شروع ہوتا ہے۔ دستور الاصلاح بڑے خاص رموز و عوامل شعری کی نشان دہی کرتی ہے مگر احسن گنوری مرحوم جو رام پور سے "احسن" نامی پرچہ نکالتے تھے دستور الاصلاح کے خلاف تھے اور حسرت نے ایک پوری کتاب ہی لکھ ڈالی تھی۔

رباعیات عمر خیام، اب دستیاب نہیں ہیں، اچھا کیا اگر رباعیوں کے عکس بازیافت کے تحت دے دیے، دو کے رباعیاں فراہم کر دیں۔

ڈاکٹر خورشید سمیع صاحب نے معیاری مضمون "نئی کہانیاں ایک بازدید" دیا ہے فی الواقع خورشید صاحب کا مضمون نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر خورشید ملک کا افسانہ "عالم تمام" قابلِ لحاظ ہے، افسانوی ادب اور افسانہ نگاری پر موصوف کو عبور حاصل ہے۔

اردو شاعری، غالباً عبوری دور سے گذر رہی ہے۔ پوجا کی روایت سماجیاتی نقطۂ نظر سے وہ نہیں ہے جو کرشن صاحب نے بیان کی ہے، کاش ان کو پتہ ہوتا وہ ایک ملا کو ملامت کر بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند نے دیوانِ غالب عکسی مرتبہ کالی داس گپتا پر بہت اہم تبصرہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ موصوف کے ہاں لفاظی نہیں ہوتی، معنویت ہوتی ہے۔ تبصرہ محققانہ ہے۔

ادبی تعصبات کا مسئلہ، وہی خلفشار سے عبارت ہے، جو کسی اعتبار سے معیاری نہیں کہا جا سکتا۔

اختر سعید خان صاحب بہت اچھا کہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں، ناراض نہ ہوں ان کی توجہ اس شعر کی جانب مبذول کراتے ہوئے کچھ عرض کرنا ہے۔

کفِ قاتل سے لہو پوچھتا ہے
مجھ سے لوگوں کو عداوت کیا ہے

تقطیع کے اعتبار سے درست ہے مگر "پوچھتا ہے" "پوچھتے" صاف پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی جگہ الف کا قتل مجھے پسند آیا۔ شعر اچھا ہے۔

آثار لفظ لفظ کے ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کا خط ہے جو عبدالودود صاحب کا ہے۔ خط کو دیکھ کر پٹنہ اکیڈمی کے جامی صاحب یاد آگئے۔ جامی صاحب نے بتایا کہ عبدالودود مرحوم میرے مضامین کو پسند فرماتے تھے وہ منتظر رہتے تھے۔ افسوس کہ میں مرحوم سے کبھی نہ مل سکا۔ بہرکیف شاعر ہوشمندانہ ادارت سے بہار آفریں بڑھ رہا ہے اور بڑھتا رہے گا۔

**سری نواس لاہوٹی** ـــ اردو ہال، حمایت نگر

شاعر کے تازہ شمارے میں اور دوسری تخلیقات کے علاوہ ایم منوچہر اور حمید جمال کے افسانے بہت پسند آئے۔

ایم مسعود نے اپنے افسانے "نجم مردہ" میں روز مرہ کے مسائل المصور کا احاطہ کر کے افسانے کا جو تانا بانا تیار کیا ہے بہت خوب ہے۔ بہت دنوں کے بعد اتنا اچھا افسانہ پڑھنے کو ملا، ایسی چیزیں اور بھی شائع کیجئے گا۔

حمید جمال نے کٹی پھٹی تصویریں میں فساد آلود کر جس فنی نکتہ سے افسانہ لکھا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں ایسے نئے نگاروں کو جو وقتی مسائل کے ساتھ ساتھ نئی تکنیک کو ملحوظ رکھ کر تخلیقات پیش کرتے ہیں انہیں شاعر میں بار بار جگہ ملنی چاہیے۔

# نقد و نظر

## سنگ گزیدہ
[افسانے]

### شفق

سنگ گزیدہ، شفق کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شفق علامتی اور علامتی انداز بیان کے قائل ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ علامتوں کو اس طرح برتتے ہیں کہ وہ اپنی اولیں سطح پر بھی معنویت کی حامل ہوتی ہیں اور بین السطور میں مختلف معنوی جہتوں کی نشاندہی بھی کرتی ہیں، اس لیے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ شفق کے افسانے اپنے سیاسی سماجی سیاق و سباق سے الگ نہیں ہوتے اور ان حالات کے شخصی ردعمل کے مظہر بن جاتے ہیں۔

"سنگ گزیدہ" کے سبھی افسانے خوف و ہراس اور تشدد کی فضا میں ایک حساس ذہن کے کرب کی داستان ہیں۔ یہ فضا خارجی سطح پر ہونے والے تشدد، ناانصافی کے ساتھ ساتھ داخلی سطح پر پیدا ہونے والے انتشار و بے چینی کی آئینہ داری کرتی ہے۔

پہلے افسانے "سنگ گزیدہ" کا واحد متکلم اوسط طبقے کا ایک ایسا انسان ہے جس کا احساس رفتہ رفتہ کند ہوتا چلا جا رہا ہے وہ اپنے آس پاس اور خود اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا احساس کھو رہا ہے اگر کبھی احساس ہو بھی جائے تو اظہار سے خوف زدہ ہے۔ زیادتیاں بڑھتے بڑھتے بھیانک روپ دھار لیتی ہیں، سب اپنے اپنے طور پر، چوہوں، سانپوں (سماجی برائیوں، تشدد، ظلم، ناانصافی) سے لڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سبھی پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہے اور کبھی آنے والی صبح سے خوف زدہ ہیں، یہ خوف آج کے معاشرے کا خوف ہے جس کے عوامل سیاسی بھی ہیں سماجی بھی معاشی بھی اور نفسیاتی بھی۔

شفق آج کے انسانی معاشرے کی صورت حال کے بے لاگ مبصر کی حیثیت سے اپنے افسانوں کے واحد متکلم بن جاتے ہیں، کہیں وہ اس کیفیت کے ذمہ داروں کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں وہ ان کی طرف معنی خیز اشارے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ (شہر دیا، مار گزیدہ) کہیں انہیں کربلا اور آج کی زندگی میں مماثلت نظر آتی ہے کہیں وہ اس بات سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسانی حقوق کے لیے انسانی خون کا طالب ہے۔

ممکن ہے ان افسانوں کے محرکات میں آئے دن کے فسادات، ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا تشدد اور بے بسی کا احساس بھی شامل ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسی کے ساتھ ساتھ آج کے انسان کے باطنی کرب اور خود اس کے اندر پیدا ہونے والی قیامتوں کا منظر نامہ بھی ان افسانوں کا موضوع ہے اور یہی تہہ داری ان افسانوں کی ایسی خصوصیت ہے جو اس کے خالق کو آج کے اہم لکھنے والوں میں شامل کرتی ہے۔

ضخامت ۱۰۰ صفحات ○ قیمت ۳۰ روپے۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء ○ پتہ: کیر گنج، سہسرام (بہار)

❁ [ بشر نواز ]

## نقش برآب
[افسانے]

### فیروز عابد

آفسیٹ پر چھپا ہوا اور نہایت دیدہ زیب سرورق سے مزین فیروز عابد کے گیارہ مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ عصری حسیت کے اظہار کا ایک اسلوب ہے جس میں کبھی شوخ اور کبھی مدھم رنگوں میں آج کے دور کی مشینی زندگی کی پیچیدگیوں اور اس سے پیدا ہونے والی کرب آمیز بے حسیوں کی عکاسی بہت نمایاں ہے۔

فیروز عابد کے پہلے افسانوی مجموعے "آدھی گلی میں صبح" مطبوعہ ۱۹۸۱ء کے مقابلے میں "نقش برآب" کے افسانوں میں اختصار اور فنکاری کی کارفرمائی زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ افسانے انتخاب معلوم ہوتے ہیں۔ فیروز عابد کلکتہ کے رہنے والے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے زیادہ گنجان آبادی والا اور غلاظت زدہ مخلوق کا شہر ہے جہاں زندگی کی بے معنی اور لایعنیت کا احساس کچھ زیادہ ہی ابھرے لگتا ہے۔

فیروز عابد نے اس زندگی اور اس کی بے معنی اور لایعنیت کو شدت سے محسوس کیا ہے اور انہیں موضوعات کو اپنے افسانوں کے لیے چنا ہے جس سے ان کی تمام انسانی ایک طویل سلسلۂ عمل کی گرہوں میں مست ہے۔ اس طرح ان کے افسانوں میں دردمندی انسان دوستی بھی رچ بس گئی ہے جس کے بغیر ادبی تخلیق کا سارا عمل نقش باطل بن جاتا ہے اور وہ نئی چابک دستی بھی ہے جو اظہار کے جدید اسلوب کی آئینہ دار ہے۔

اکثر جدید افسانہ نگاروں کی طرح فیروز عابد کے بعض افسانوں پر بیانیہ کا رنگ غالب ہے مثلاً صلیب پر لٹکانے والے ہاتھ "نابینا، نابینا"۔ قطرہ قطرہ صبح" میں کہانی پن کم ہے اور واحد متکلم کے احساسات کا مجرد اظہار زیادہ۔ اسی اعتبار سے فیروز عابد نے چھوٹے چھوٹے مگر معنی خیز فقروں سے افسانوں کی جو بنت کی ہے اس سے ارتکاز اور وحدت تاثر کی خوبیاں نمایاں ہو گئی ہیں جو یقیناً ان کی اہم کامیابی ہے۔ اس مجموعے کے بہترین افسانے میرے خیال میں "نقش برآب"، "بیداری"، "روشن راہوں کا شہید" اور "بصیرت" ہیں۔

اس کتاب میں فیروز عابد نے اپنی کہانی بھی لکھی ہے اور استارنامہ سے بعض تبصرہ نگاروں کی تیکھی و شیریں آرا کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ "آدھی گلی میں صبح" کے کسی تبصرہ نگار کے اس فقرے پر کہ "فیروز عابد کی کہانیوں میں منفی رجحان ملتا ہے" جو نکتہ چینی کی گئی ہے وہ میرے خیال میں غیر مناسب ہے۔ کوئی کتاب شائع ہونے کے بعد عوام کی ملکیت بن جاتی ہے اور عوام کو حق (جن میں دانشور بھی شامل ہیں) ہے کہ تنقید کریں، اور ہمیں بھی اس کا احترام لازم ہے۔ تخلیق کار کو نکتہ چینی سے قطع کلام نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ فیروز عابد کا یہ نیا افسانوی مجموعہ مقبول ہوگا اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

○ صفحات ۹۲ ○ قیمت۔ بیس روپے ○ پتہ۔ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۲۵ رابندر سرانی کلکتہ ۷۳

❁ [ نامی انصاری ]

## کتب و رسائل

● **سبب** ۔ مظفر حنفی [ ۱۹۸۵ء ] کے بعد ۱۹۸۹ء کی غزلوں اور آزاد غزلوں کا انتخاب۔ ہندوپاک کے ۶۹ ادبی رسائل و جرائد سے ۲۳۸ شعرا کی ۲۱۸ غزلیں اور ۲۰ آزاد غزلیں اس انتخاب میں شامل کی گئی ہیں۔ مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی اور پرتپال سنگھ بیتاب۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ پتہ: مکتبہ کوہسار، سرائے پورہ، بھاگل پور۔ (بہار)

● **صحرا کی دھوپ** ۔ نیم شگفتہ [ ۱۹۸۰ء ] اور دشت کا سورج [ ۱۹۸۳ء ] کے بعد تیسرا شعری مجموعہ ... اردو شعر و ادب کے خاموش خدمت گزار ساحر شیوی کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس میں ۹۲ غزلیں، ۵۰ نظمیں، ۸ رباعیات اور ۳۱ قطعات شامل ہیں۔

"پیش لفظ" مظفر حنفی نے تحریر کیا ہے۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت اور خوبصورت سرورق۔ ضخامت: ۲۰۶ صفحات قیمت: چالیس روپے۔

پتہ: ۱۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریاگنج نئی دہلی
۲۔ ساحر شیوی۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۱۱۶۔ نیروبی (کینیا)

● **تخلیقی تجربہ** ۔ نوجوان نقاد شاعر اور ادیب ابوالکلام قاسمی کی نئی تنقیدی کتاب شائع ہو گئی ہے۔ اس میں "شاعری اور شاعری کا طریق کار" کے تحت سات مضامین "فکشن اور فکشن کا تجزیہ" میں ۹ مضامین اور "اردو تنقید کا سیاق و سباق" کے ذریعہ تین مقالے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۸ء تک ایک مخصوص عہد کے حوالے سے اردو شعر و ادب کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ ضخامت: ۲۰۸ صفحات۔ قیمت: پچاس روپے۔

پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ - ۱۱۰۰ ۔ ابوالکلام قاسمی
۲۔ عبدالقادر مارکیٹ، علی گڑھ (یوپی)

● **تزکیہ** ۔ تسدیس اور تجدید کا امتزاج ۔ سلیم شہزاد کی ایک اور نئی کتاب۔ صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: چالیس روپے۔ رابطہ: ۳۲۳ سکالر وارڈ مالیگاؤں ۔ ۲۹۶، ایم۔ ایچ۔ بی کالونی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳۔

[illegible]

## ہرگوپال تفتہ ایوارڈ

سکندرآباد۔ ہرگوپال تفتہ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر سال ہندوستان کے کسی ایک ممتاز اہل قلم کو تفتہ ایوارڈ پیش کیا جائے گا۔ [illegible]

## اردو ملن کا انعقاد

[illegible]

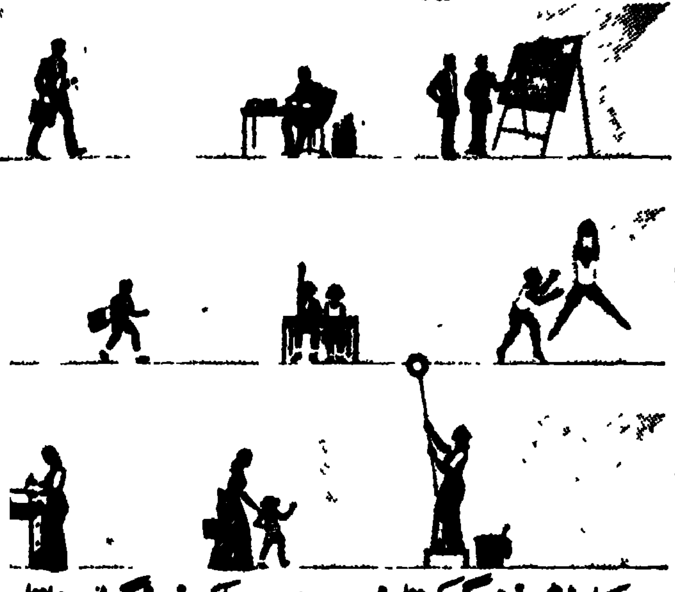
## جہانگیر کی آپ بیتی کا نسخہ

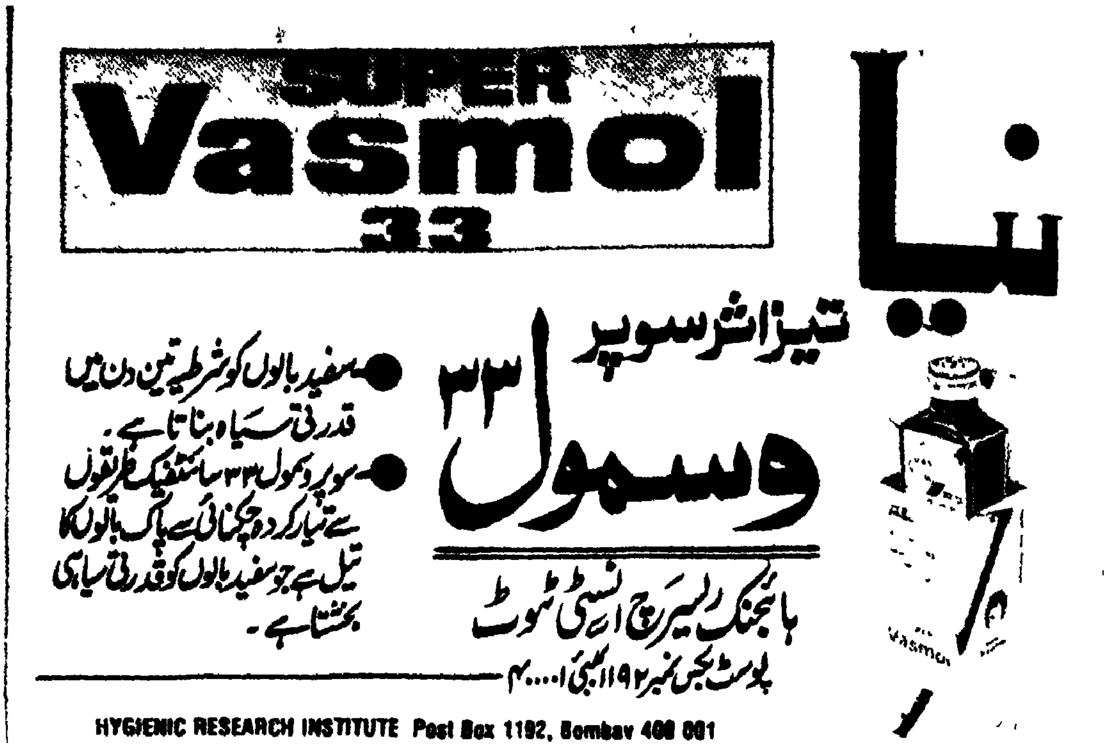
پٹنہ ——— گزشتہ [illegible]

[illegible]

## اردو خود نوشت سوانح عمریاں کے سماجی مطالعے کی اہمیت

[illegible]




SUPER
Vasmol
33
نیا
تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳
سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔
ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001


IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
NO 253
EXCELLENT
PLAYING CARDS
T.M.R.No.176412
METRO PLAYING CARD CO.
Metro Estate, Bombay-400 029. • TEL : 531687

Regd. No. MH-B.Y.W. 28 — شاعر — Price : Rs. 5

**The "SHAIR" (Monthly) Bombay 400 008.**

58 Years of Publication — ISSUE No:— 7 — 1987 — Telephone No. 35 99 0..

(Publishing Date 27-28)

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57

## اس شمارے کے قلمکار

راغب مرادآبادی   رئیس امروہوی   [illegible]   وزیر آغا

کمال احمد صدیقی   باقر مہدی   بشیر بدر   [illegible]   [illegible]

ادا جعفری   افتخار عارف   [illegible]   بشر نواز   حمید الماس

لطف [illegible]   [illegible] ہاشمی   حقیر [illegible]   [illegible]   [illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہر اقبال [illegible]

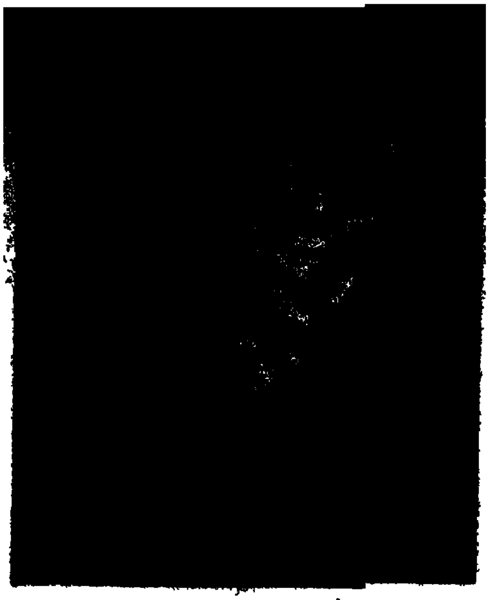
[illegible]

### شاعر کے مستقل عنوانات

بساط سخن   جرعات   آثار لفظ لفظ   [illegible]   [illegible]

چہرہ چہرہ یادیں   [illegible]

قیمت
پانچ روپے



# اکبر الٰہ آبادی

۱۸۴۶ء — ستمبر ۱۹۲۱ء

تو رازِ پستیٔ تہذیب کھولنے والا
تو قومِ مردہ کی نبضیں ٹٹولنے والا
قصائدِ شعر میں اصلاح بالمزاح کیساتھ
نبات و قند کو کانوں میں گھولنے والا

سید اکبر حسین رضوی، تخلص اکبر، خطاب: لسان العصر، وطن: بارہ ضلع الٰہ آباد۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد تفضل حسین [illegible] عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم دلوائی، پندرہ سولہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی مگر اسی عمر میں [illegible] ۱۸۶۳ء میں ایک پل کی تعمیر میں عارضی ملازمت کی۔ ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ [illegible] منصف مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں صدر القضاۃ، ۱۸۹۲ء میں عدالت خفیفہ کے جج، ۱۸۹۴ء میں سشن جج ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ہائی کورٹ کی ججی کے لیے نام منتخب ہوا تھا لیکن ضعفِ بصارت کے سبب قبل از وقت ۱۹۰۳ء میں پنشن لے لی۔

[illegible] آبادی کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ اپنے دور میں شاعری میں ایک علاحدہ رنگِ سخن اختیار کیا۔ [illegible] شاعری میں خوب نام کمایا۔ ابتدائی شاعری پر غلام حسین وحید الٰہ آبادی (تلمیذ آتش لکھنوی) سے اصلاح لی لیکن بعد میں کسی [illegible] شاعری کا تتبع نہیں کیا اور اپنی الگ راہ نکالی۔

[illegible] آبادی کے کلام کی اشاعت ان کی زندگی ہی میں تین بار شائع ہوا تھا لیکن اکبر کے ناقدین و محققین نے [illegible] حصہ بھی شائع ہوا۔ اکبر کے انتقال کے بعد بھی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ [illegible] کتاب "تمدن آف اسلام" کا ترجمہ سید احمد [illegible]
[illegible]

# فکر امروز



## اصلاحِ خیال

شاعر کے خیالات میں بھی اس کی سیرت کی طرح پاکیزگی، بلندی اور گہرائی کی ضرورت ہے۔ اس کا مشاہدہ صرف ان مناظر و مظاہر تک صرف ہونا چاہیئے جن سے تحقیق و ادراک کا حصول یقینی ہو۔ اس کا مطالعہ صرف ان کتابوں کا محدود ہونا چاہیئے جو بلند پایہ مصنفین کی رہینِ قلم ہوں۔

ایسی کتابیں اس کے مطالعہ کی میز پر نہ ہوں جنھیں عوام پسند کرتے ہیں اور جن میں فواحشات و مکروہات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مبتدی شعراء کا کلام سننے اور دیکھنے سے ذہنی ترقیاں نہیں ہوتیں اس لیے ہمیشہ اپنے سے بہتر کہنے والوں کا کلام دیکھنا اور سننا چاہیئے۔ یہ باتیں خیالات میں سمٹراؤ اور ذہن میں آمد پیدا کر دیتی ہیں۔

شاعر اگر مفکر نہیں تو میں اسے شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ فکر سے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور بغیر فکر جو اشعار کہے جاتے ہیں وہ مفکر شعرائے قدیم و جدید کے افکار کا سرقہ یا عکس ہوتے ہیں۔ ان میں ذاتی سرمایۂ فکر کچھ نہیں ہوتا۔ ایسے اشعار کو شاعر کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ ایک مفکر شاعر کے کلام میں سرقہ، توارد یا نقل کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی قوتِ فکر خود ہی بے بہا اچھوتے موتی طبیعت کے سمندر سے نکال لاتی ہے۔

سخن وری کی یہ معراج اصلاحِ خیال سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک حقیقی شاعر کا فرض ہے کہ وہ عام سطح سے اپنے خیالات کو بلند رکھے۔ اس کے خیالات محدود نہ ہوں بلکہ عالم گیر ہوں۔ "شاہد و شراب" تک اس کے خیالات کی رسائی مرتکز نہ ہو بلکہ تی کل وادی تھیمون" سوالجی نظریہ اس کی ہمہ گیری سے اس پر منطبق ہوتا ہو۔ جب خیالات عام سطح سے بلند ہوں گے تو ظاہر ہے کہ شعر بھی ضرور بلند ہوگا اور جب شعر بلند ہوگا تو شاعر کا رتبہ بھی ضرور بلند مانا جائے گا۔

[ دستور الاصلاح مطبوعہ جولائی ۱۹۴۰ء صفحہ نمبر ۱۷ تا ۱۸ ]

سیماب اکبرآبادی

# شاعر

اشاعت کے ۵۸واں سال

جلد — ۵۸
شمارہ — ۸

۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر … پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

## اس شمارے میں



شمارہ نمبر ۸ * ۱۹۸۷

# ایک گونج ہے، آواز کی وہ شکل نہیں ہے

یہ شمارہ حسب توقع اقبال خصوصی ایڈیشن ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ عام شمارہ ہی ہے۔ یقیناً آپ کو اقبال خصوصی ایڈیشن کا انتظار ہوگا۔ اقبال نمبر ترتیبی مراحل میں ہے، اس شمارے کا تمام تر مواد اقبال نمبر ہی کے لیے تھا لیکن ضخامت بڑھ جانے کے سبب ایک عام شمارہ اور شائع کرنا ناگزیر ہوگیا۔ جو مواد ہم دینا چاہتے ہیں مقررہ حجم میں اس کی سمائی ممکن نہیں ہو رہی تھی، پھر یہ کہ جیسا مواد ہم دینا چاہتے ہیں وہ اپنی ترتیب و تہذیب میں بہت زیادہ مختلف اور وقیع ہوگیا ہے۔ اس شمارے کے بعد "اقبال خصوصی ایڈیشن" ہی شائع ہوگا جسے آپ پسند کریں گے کہ یہ شاعر کی پیش کش ہوگا۔

اس کے علاوہ ایک شمارہ "نئی شاعری نئے نام۔۲" بھی زیر ترتیب ہے، ساتھ ہی ایک ضخیم خاص نمبر اور، جس کی تیاریاں گذشتہ کئی ماہ سے جاری ہیں ۸۸۹۱ء کی خوب صورت ترین ادبی دستاویز ہوگا جس کی خوب صورتی بھی اپنی مثال آپ ہوگی۔

ہم ان کلیتوں کو پیش کرنا نہیں چاہتے جن کی فرسودگی کا احساس خود ہمیں ہو چلا ہے۔ شکایتوں کے تمام توسطے اور رشتے ہمیں ماند پڑ چکی ہیں۔ لوگ بہت کچھ سمجھ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں لیکن عمل کی صورت میں وہ نہیں جن کی توقع تھی، خواہش تھی۔ کسی تاریخی روایت کے لیے کیا ہونا چاہیئے شاید موجودہ حالات میں اردو والوں کے ذہن سے نکل گیا ہے، سب کچھ طے شدہ، میکانیکی اور بہت کچھ بے مصرف۔

شاعر ایک استعارہ ضرور بنا ہے، گذشتہ دس برسوں میں مواد و ہیئت کی جو تبدیلیاں شاعر میں ہوئی ہیں، جو تجربے ہوئے ہیں وہ پوری اردو دنیا کے سامنے ہیں۔ ابھی بہت کچھ کرنے کی خواہش ہے لیکن کیسے؟ شاعر کسی صوبے، علاقے یا شخصیت کا نام نہیں ہے۔ شاعر تو اردو کا قدیم و تاریخی ادبی رسالہ ہے اردو جو پورے ہندستان کی زبان ہے، ہندستان سے باہر پاکستان اور تمام عالم کی زبان ہے۔ جہاں اردو ہے وہاں شاعر ہے۔

آپ شاعر کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ ابھی بے شمار اردو والے ایسے ہیں جن تک ادبی رسائل کی خوشبو ہی نہیں پہنچی۔ ابھی بہت سے اردو والے ایسے ہیں جنھوں نے ادبی رسائل کے صرف نام ہی سنے ہیں لیکن ان ہزاروں شعراء و ادباء کے متعلق کیا کیا جائے جو شعر و ادب کی تخلیق کا دعوٰی کرتے ہیں لیکن شاعر جیسے ادبی رسائل سے یا تو واقف نہیں یا پھر مطالعہ ہی نہیں کرتے۔

شاعر کو ایک تحریک کے طور پر پورے ہندستان میں پھیلانے میں آپ کا کیا کردار ہوگا؟

شاعر کے لیے اشتہارات کی فراہمی کے متعلق آپ کیا عملی تعاون دے سکتے ہیں؟ اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں شاعر کی ایجنسیاں قائم کرنے کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟ اپنے تمام تر وسائل کا استعمال کرتے ہوئے شاعر کو سنوارئیے، نکھارئیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا زر سالانہ باقی تو نہیں؟ آپ پر شاعر کے واجبات تو نہیں؟ شاعر کے متعلق آپ کی کوئی الجھن ہو، کوئی مسئلہ ہو تو ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ہم تک پہنچائیے۔ شاعر آپ کا اپنا رسالہ ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی کہ شاعر قدرے تاخیر کے ساتھ آپ تک مزید پہنچ رہا ہے لیکن اگر کوئی پابندی نہیں ہو پا رہی ہے تو اس کی کئی وجوہ ہیں [illegible] شمارے میں آپ جو تبدیلیاں دیکھتے ہیں یا تجربے ملاحظہ کرتے ہیں وہ تاخیر کا سبب بنتے ہیں، ہم جب تک مطمئن [illegible] کوئی شمارہ [illegible] کو نہیں دے پاتے۔ آپ محسوس تو کرتے ہوں گے؟ چاہے شمارہ نمبر کم ہو جائیں لیکن صفحات کسی طرح کم نہیں [illegible] کیا کسی معیاری ادبی رسالے میں آپ وہ سب دیکھتے ہیں جو شاعر آپ کو دے رہا ہے؟ [illegible] جب ہر طرف شاعر کی گونج ہے تو یہ گونج بے آواز کیوں نہیں ہو سکتی؟

[ادارہ]

۸

رباعی

دریا کو صدف میں آبرو دیتا ہے
بندے کو عجیب جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق گل کو بو سنگ کو لعل
جو کچھ دیتا ہے جس کو تو دیتا ہے

۹

رباعی

[illegible] ادھر ادھر دیکھیں نہیں
حیران ہے نظر کدھر کدھر دیکھیں نہیں
دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو فلک ہو کہ زمیں
تو ہی تو ہے جدھر جدھر دیکھیں نہیں

## رباعیاتِ انیس

میر انیس (پ: ۱۸۰۱ء — م: ۱۸۷۴ء) کی رباعیات کا یہ مجموعہ سید محمد حسن بلگرامی نے مرتب کیا اور ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۴۵ رباعیاں شامل ہیں۔ بہ قول مرتب "جس قدر رباعیات علاوہ ان کے جو کتب مراثی کے ساتھ طبع ہوئی ہیں، فراہم ہو سکیں میں نے ان میں سے عام مذاق کے لحاظ سے انتخاب کر لیں۔"

# اکبر الہ آبادیؒ کا ایک پُر لطف خط

"چند روز ہوئے ہمیں الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ خان بہادر سید اکبر حسین کے عشرت کدے پر نشست تھی۔ تعلیم نسواں کی بحث کے ضمن میں ہم نے شکایتاً عرض کیا کہ آپ نے اکثر ظرافت کے لطیف پیرایہ میں مخالفت کی ہے۔ فرمایا کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف نہیں۔ اسی بنا پر ہم نے پچھلے دنوں ان سے الناظر کیلئے کچھ تازہ کلام مرحمت فرمانے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا کہ اب اگر آپ تعلیم نسواں کی حمایت میں نظمیں تحریر فرمایا کریں تو ہماری بھی مسرت کا باعث ہوگا۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے وہ اس قدر پُر لطف ہے کہ ہم اس کی حلاوت سے دوسروں کو لذت آشنا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہو ہذا۔" (ایڈیٹر)

"مکرمی۔ عنایت نامے کا شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کے سفر کو کامیاب کرے میں نہایت معذور ہو رہا ہوں۔ سات برس سے نہیں معلوم دنیا کہاں سے کدھر جا رہی ہے۔ اگر میری کچھ وقعت ہے تو تبرکاً میرے دو شعر لکھا کافی ہیں۔

احباب کا تقاضا شدت سے ہے کیا کروں۔ اپنے مسودات خود نہیں پڑھ سکتا کاتب کو ہدایت کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ کاتب صاحب ذی استعداد ایسے ہیں کہ "کونسلوں میں سیٹ" کو "گھونسلوں میں بیٹ" لکھ دیتے ہیں۔ دعا فرمایئے۔ دسمبر میں آپریشن کامیابی کے ساتھ ہو۔

تعلیم نسواں کا مخالف میں کیونکر ہو سکتا ہوں۔ بغیر تعلیم کے معشوقانہ انداز ممکن نہیں۔ میں تو شاعر آدمی ہوں۔ اس قدر تعلیم چاہتا ہوں کہ شعر گوئی کا سلیقہ پیدا ہو جائے۔ سبز پری اگر ایسا مطلع نہ کہہ سکتی۔

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں  دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

تو گلفام کی کیا کم بختی تھی کہ اس پر مرتا اور راجہ اندر کی سختیاں اٹھاتا جو عاشقانہ طبیعت کے نہ ہوں ان کو بھی تعلیم یافتہ بی بی ضرور ہے گھر کا حساب کتاب لکھ سکے۔ لڑکوں کی ابتدائی تعلیم کی نگراں ہو لیکن مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اگر میاں سے آزاد تر ہوئی تو صرف عاشقانہ مد میں کھپ سکتی ہے اور اس مد میں بہت حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ ایشیا والے خیالات میں ترقی کر گئے ہیں مگر ان کا خون بہت دنوں میں ترقی کرے گا۔ لہٰذا اگر کوئی صورت ناگوار پیش آئی تو بہ نسبت یورپ کے ان کو زیادہ تکلیف محسوس ہوگی۔

لیکن سب سے بڑی ضرورت اور قومی دلیل حمایت تعلیم نسواں کی یہ ہے کہ جب ہم لڑکوں کو مغربی تعلیم دے کر نئے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ تو اشد ضرورت ہے کہ ایک سیٹ لڑکیوں کا بھی ان کے لئے تیار ہو ورنہ شریف زادیاں بیٹھی رہ جائیں گی۔ اور مس بدھو اور مس رمضانی اسکولوں سے نکل کر دلوں کو لبھالیں گی اور پھر کھٹوں پر قابض ہو جائیں گی۔

میں شاعر آدمی ہوں کبھی اوروں کی فیلنگس کو بھی موزوں کر دیتا ہوں اس کا اعتبار نہیں۔ صرف بے پردگی کا میں مخالف رہا وہ بھی اس وجہ سے کہ ہنوز طبائع اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بتدریج وہ وقت بھی آ جائے گا رسم پردہ ایک ایسی چیز ہے جس سے مرد بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہیں کوئی دوست خواہ مخواہ لا اذن نہیں آ سکتا۔ یہ حق قانون نے تسلیم کر رکھا ہے اس حق کے شکست کا افسوس ہے۔ لیکن اسی قدر جس قدر کہ سلطنت جانے کا افسوس ہے۔ بہر حال پردہ نہ توڑنا چاہئے۔ لیکن آئندہ قائم نہ رکھنا سہل ہوگا۔

میں تو موجودہ حالت سے اس قدر پریشان ہوں کہ آمادہ یا عیسائی ہونے کو موجود ہوں۔ لیکن آپ ہی کو عذر ہے اور ہم یہاں رہ کر آپ کا ساتھ کس طرح چھوڑیں۔

مگر عزیز من میں چراغ سحری ہوں۔ بر شما خوش باد ایں غم خانہ نا ماندنی      اکبر حسین

---

سلہ "الناظر" (لکھنؤ)، نمبر ۱، یکم جنوری ۱۹۱۰ء۔ مدیران: وصی الحسن علوی اور ظفر الملک علوی۔ "الناظر" کے ایڈیٹر ظفر الملک صاحب نومبر ۱۹۰۹ء میں اکبر سے ملنے گئے تھے۔ مولانا ظفر الملک علوی کو کون نہیں جانتا۔ رسالہ الناظر لکھنؤ کے قابل قدر مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں کافی روشناس ہیں۔ ان کا نام اسحٰق علی تھا۔ کاکوری کے رہنے والے تھے، انگریزی قابلیت نہایت اعلیٰ تھی۔ تصوف کی جانب میلان زیادہ تھا۔ نہایت منکسر المزاج اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور ہر وقت انہی خیالات میں مستغرق رہتے تھے۔ کئی دفعہ الٰہ آباد آئے۔ اکثر بزرگوں سے ان کے تعلقات تھے۔ وہ

دش قومی اور مذہبی رہنما بھی تھے۔ لکھنؤ کی اکثر تحریکوں میں ان کا نام سنا جاتا رہا ہے۔ تحریر و تقریر میں شمشیر بے نیام تھے۔ وہ کتابیں ان کی یادگار ہیں "الاشرار"
، انہوں نے ملک کے خود غرض لیڈروں کا کچا چٹھا بیان کیا ہے اور سیاسی رہنماؤں کے کارنامے میں سیاسی خود غرض رہنماؤں کے پوست کندہ حالات شائع کئے ہیں۔
بار "شیر بہار چمن" بھی آپ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔ (نقوش مکاتیب نمبر ص۲۹۰ محمد عبداللہ قریشی) راقم الحروف نے ان اخبار کے بہت سے شمارے دیکھے
ہیں۔ یہ شمارے ندوۃ العلماء [لکھنؤ] اور اردو اکادمی [لکھنؤ] کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ [اکبر حیدری کاشمیری]

---

جناب کلیم
۲ / ۱۲

برادر مکرم

آپ کا خط جواب طلب نہ تھا
اس وقت یہ شعر سنئے۔ غالباً پسند آئے

حضرت گاندھی پہ ہے جب تشنہ پر نور سے
یاد آتی دل لگی موسیٰ کی کوہ طور سے
اس خبر کو مشتہر فرما دیں اخباروں میں آپ
اور ہندوؤں کو بھی حاصل ہو یہ الہام عروج

دعا گو

اکبر الہ آبادی بنام کلیم برہم ص۱

مکرمی

مسٹر مسرت علی کو آپ نے اور مرزا یار جنگ نے باہم لیکچر کیا
الحمد للہ تمام ہو گیا — [illegible] یہ ہے [illegible]
[illegible] کہ [illegible] — [illegible] آپ بھی ذکر فرما رہے —
[illegible] ایک [illegible] تو [illegible] ارادہ [illegible]
الحمد للہ [illegible] — [illegible]

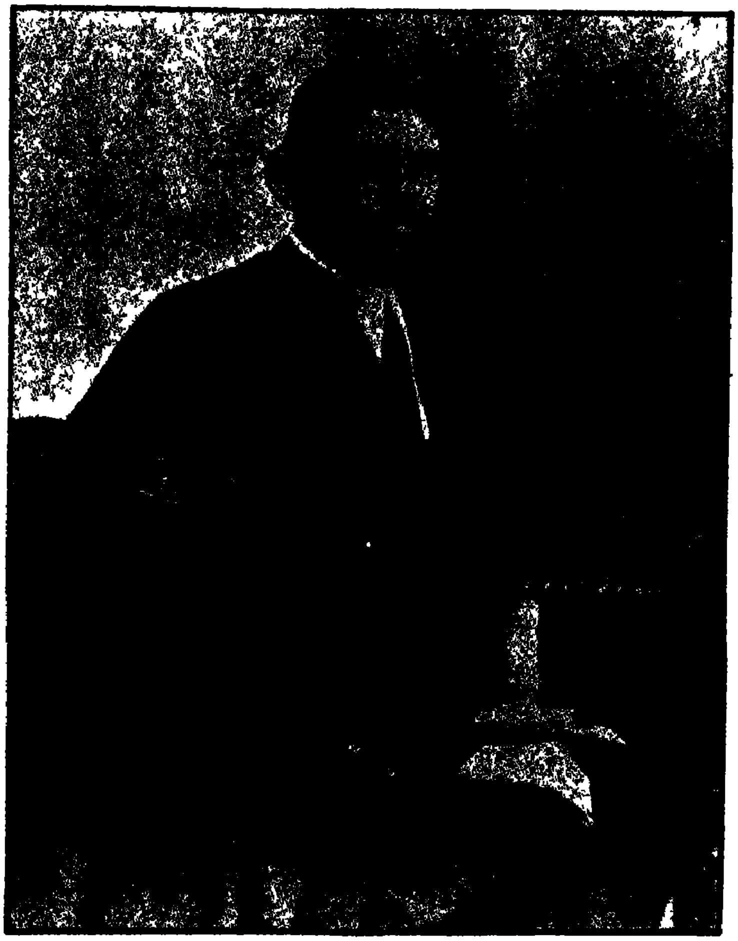
اکبر [illegible]

اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی

ص۱ برہم کا نام عبدالکریم تھا۔ امیر مینائی کے ممتاز شاگرد۔ ریاض، جلیل، شرر، سرفراز اور ممتاز علی ان کے ہم عصر تھے۔ اخبار مشرق کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ اکبر سے دوستانہ مراسم تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور حکیم اور شاعر تھے۔ ناول کرشن کنول کے بھی مصنف تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کی سوجھ بوجھ اور بے لاگ ادبی تنقیدوں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ کہا تھا۔ ع

سلجھا ہوا کوئی نہیں برہم سے زیادہ

[اکبر حیدری کشمیری]



اکبر الہ آبادی کی یہ تصویر نادر و نایاب ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس کی کوئی دوسری کاپی موجود نہیں یہ ۱۸۹۴ء سے قبل کی تصویر
ہے جب اکبر الہ آبادی سشن جج کے عہدے [۱۸۸۸ء، ۱۸۹۴ء] پر فائز تھے اس اعتبار سے یہ تصویر تقریباً سو سال پرانی ہے۔
[بہ شکریہ اکبر حیدری کشمیری]

## راغب مرادآبادی

ذرِ تحصیلِ فن، جوانی کی ہے
ہر بارِ بہارِ زندگانی کی ہے
راغبؔ نظروں میں ہے انصابِ خدوخال
ہم نے اک عمر، چہرہ خوانی کی ہے

[redacted]

یہ خندہ بلب، یہ گنگناتے چہرے
یہ نغمۂ زندگی سناتے چہرے
کیا جانیئے کیوں غروب ہو جاتے ہیں
ظلماتِ عدم میں، جگمگاتے چہرے

[redacted]

فطرت کی نگاہ میں ہیں بونے ہم لوگ
بک جائیں گے اک دن اَدنے پونے ہم لوگ
جز مرگ، کوئی جن کا خریدار نہیں
اے ہم نفسو! ہیں وہ کھلونے ہم لوگ

دل میں ارماں مچل رہے ہیں آجا،
غم کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں آجا
تاروں کے چراغ بجھ چکے ہیں، لیکن
اشکوں کے چراغ جل رہے ہیں آجا

[redacted]

کھلتے ہیں جو پھول وہ بکھرتے کیوں ہیں
نظروں سے مشیت کی اترتے کیوں ہیں
پیدا ہوتے ہیں اس جہاں میں جو لوگ
کھلتا ہی نہیں یہ راز، مرتے کیوں ہیں

[redacted]

ماضی کی طرف، نگاہ جاتی کیوں ہے
دل میں طوفانِ درد اٹھاتی کیوں ہے
اے بارِالہٰ! یہ کرم ہے کہ ستم
جو مر گئے، اُن کی یاد آتی کیوں ہے

● نمبر ۱۱۰۱/۱۶ - آر - فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

## واثق جونپوری

یہ وقت زہر خوب زیرِ آب یاد رہے
ہے خود ہی تشنگی - خود ہی شراب یاد رہے

تھا سینہ خون، جبیں خون، تھا پاؤں میں کیل
تمام خوں سے عبارت یہ خواب یاد رہے

ہر اک لہو میں نہیں انقلاب کی تاثیر
ہر اک چمن میں نہیں شہرِ گلاب یاد رہے

اس آفتاب کو دیکھ زمیں کی گردش
اِدھر سے گذرا تھا اک آفتاب یاد رہے

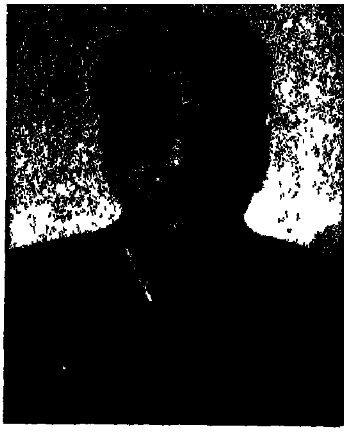
ہماری تلخ نوائی ہے وقت کی آواز
ہیں قبلِ وقت یہ چنگ و رباب یاد رہے

ابھی تو کثرتِ زر کا ہے بھوت سر پہ سوار
کبھی چکاؤں گا اگلا حساب یاد رہے

تمہاری باتوں کا اس طرح دیں گے تم کو جواب
کہ ساری عمر ہمارا جواب یاد رہے

یہ قتل گاہِ سخن بن رہی ہے جس کے لئے
وہ ہم ہیں واثق خانہ خراب یاد رہے

● لال کوٹھی، پوسٹ آفس کاجگاؤں۔ ضلع جونپور (یو پی)



دیوندر اسّر
۳/۱۵۳ بی مکھ پوری نئی دہلی ۔ ۵۸

# جیسلمیر

مجھے محسوس ہوا کہ میں ریت کے بستر پر پڑا ہوں۔ میں نے کروٹ بدلی۔ پھر وہی ریت کی چبھن۔ میں نے پیٹھ کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ ریت کے ذرّے۔ میری مٹھی ریت سے بھر گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھولیں۔ یا خدا میں کہاں آ گیا ہوں! میرے سامنے دُور دُور تک ریت پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر جانب ریت ہی ریت تھی۔ یہاں کوئی راستہ نہیں، کوئی سڑک نہیں۔ کوئی پگڈنڈی نہیں۔ کوئی پُل نہیں۔ کوئی نقشہ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ بس ریت ہی ریت، پیلی ریت، لال ریت، بھوری ریت، گرم ریت، چبھتی ریت، جھلستی ریت، ریت کے ٹیلے۔ ریت ہی دھوپ تھی۔ ریت ہی سایہ تھی۔ نہ آغاز، نہ انجام، بس ایک بے کراں ریگستان —— جس طرف نگاہ جاتی تھی، ریت۔ حدِ نظر تک ریت۔ نہ پانی، نہ ہریالی۔ بس ریت تھی خالی۔ ریت ہی افق تھی، ریت ہی شفق۔ یہاں کوئی نہیں آیا، یہاں سے کوئی نہیں گذرا۔ میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟ مجھے کون یہاں پھینک گیا؟ میرا سامان؟ اور میرے کپڑے؟ میرے تن پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ننگا۔ الف ننگا۔ آکڑے کے پودے کی طرح۔ تھوڑے فاصلے پر میرے کپڑے پڑے تھے۔ کرتا، پائجامہ، بنیان، انڈرویر۔ ہلکی ہلکی ہوا سے ریت اڑنے لگی، میرے کپڑے اُڑ رہے تھے۔

•••

اُس کے کپڑے اُڑ رہے تھے۔ پنکھے کی تیز ہوا میں ساڑی، انگیا، بلاؤز، پینٹی، کپڑے فرش پر اُڑ رہے تھے۔ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی! ڈبل فوم کے بیڈ پر پڑی وہ سوچ رہی تھی۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے اُسے۔ اس کے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا۔ وہ ریت کے بستر پر پڑی ہے۔ اس نے کروٹ بدلی۔ پھر وہی ریت کی چبھن۔ اس نے پیٹھ کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ ریت کے ذرّے۔ اس کی مٹھی جیسے ریت سے بھر گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں کھولیں۔ وہ یہاں کیسے آ گئی۔ اس کے کمرے میں بجلی کی نرم نرم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں خوشبو تھی۔ پھر بھی اسے دائیں بائیں، آگے پیچھے ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ نہ راستہ نہ منزل، نہ پگڈنڈی، نہ پُل، نہ نقشہ، نہ سڑک۔ نہ پانی نہ ہریالی، پیلی ریت، لال ریت، گرم ریت، چبھتی ریت، جھلستی ریت، ایک بے کراں ریگستان، جسم تھا کہ ریت کا ٹیلہ، حدِ نظر تک ریت، اسے یہاں کون پھینک گیا؟ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں، ننگا، الف ننگا۔ ریگستان کے درخت کی طرح۔ اس کا نازک کومل بدن ریت کی چبھن سے چُور ہو رہا تھا۔ جیسے پورے جسم کو ہزاروں چیونٹیوں نے ایک بارگی کاٹ لیا ہو۔ اور پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم گرم ہو رہا ہے۔ اس نے کپڑے اتار دیے تھے۔ اور پرے پھینک دیے تھے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اسے برف کی سِل پر رکھ دیا گیا ہو۔ ریت کا ٹیلا، برف کی سِل جسم کیا سے کیا بن گیا تھا۔ وہ بستر سے تڑپ کر اٹھی اور کپڑوں کو پکڑنے کے لیے بھاگنے لگی۔ وہ کپڑوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

•••

میں کپڑوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ہوا اور تیز ہو گئی۔ ریت اور زیادہ تیزی سے اڑنے لگی۔ کپڑے اور تیز رفتار سے اڑنے لگے۔ میں اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ میں بھاگ رہا تھا اور میرے پیچھے ریت کے رنگ کا مٹیالا سانپ بھاگ رہا تھا۔ ریت اور سانپ میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ نہ رنگ میں، نہ چمک میں، نہ رفتار میں۔ سانپ ریت کے ایک بِل میں داخل ہوتا اور بہت

دور کسی دوسرے ٹیلے سے نکل آتا۔ ریت میں میرے پاؤں دھنسنے لگے۔ میں ننگ دھڑنگ دوڑ رہا تھا۔ تیز اور تیز۔ کپڑے اڑ رہے تھے، تیز اور تیز۔ میری رفتار مدھم پڑنے لگی۔ کپڑوں کے اڑنے کی رفتار بڑھنے لگی۔ میرے اور کپڑوں کے درمیان کا فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ میں اب کپڑے کبھی نہ پا سکوں گا۔ اور اس لق ودق صحرا میں میری لاوارث لاش ہی ملے گی۔ میری آنکھوں میں ریت داخل ہونے لگی۔ آنکھیں مُندی مُندی رہی تھیں۔ میں نے ایک بار آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ کپڑے، کپڑے نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اور میں قریب قریب اندھا۔ لیکن میں پھر بھی دوڑ رہا تھا۔ کپڑوں کے پیچھے۔ سورج کی چمک زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ ریت کے ذرّے جگمگا رہے تھے۔ دھوپ کی گرمی تیز ہو رہی تھی۔ اور اچانک میں نے ریت کے ذرّوں کو چیرتی ہوئی سورج کی کرنوں میں دیکھا۔ میرے کپڑے ایکیکٹس کے کانٹوں میں الجھ گئے تھے۔ کیکٹس اپنا کانٹوں بھرا جسم لیے تنہا کھڑا تھا۔ بالکل تنہا اس وسیع صحرا میں۔

•••

وہ اپنا کانٹوں بھرا جسم لیے تنہا کھڑی تھی۔ اس لمبے چوڑے وسیع بیڈروم میں۔ اس نے ٹیوب لائٹ آن کی۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے پورے جسم کو غور سے دیکھا۔ جسم میں اب بھی ریت کے ذرّوں میں کانٹوں کی چبھن تھی۔ اس کے بدن پر ریت کے رنگ کا مٹیالہ سانپ رینگ رہا تھا۔ وہ جسم کے ایک انگ میں داخل ہوتا اور دوسرے انگ سے نکل آتا۔ جسم اور سانپ میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ نہ رنگ میں نہ چمک میں۔ نہ رفتار میں۔ کیا اس کے جسم کو سانپ نے نگل لیا تھا۔ یا سانپ نے اس کے جسم کو۔ اس کے جسم پر پھر سے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے اپنے جسم پہ ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرا۔ سہلایا۔ پستانوں کو اپنے ہاتھ کی گولائی میں اٹھایا۔ شیشے میں دیکھا۔ اور جوش کا مصرعہ۔ جیسے گدرا انار، جیسے ترکوں کی فوج۔ اور اچانک اس کے دل میں خواہش جاگی۔ کہ ترکوں کی فوج اس کے جسم کو رینگتی ہوئی نکل جائے۔ ریت اور زیادہ چبھنے لگی تھی۔ کانٹوں کی نوک اور زیادہ زہر بھری ہو گئی تھی۔ سانپ کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ چیونٹیوں کے کاٹنے سے درد اور بڑھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ریگستان میں کوئی کنواں کھودا جا رہا ہے۔ گہرا اور گہرا۔ اور جیسے یکلخت پانی کا سرچشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ حرکت دھیرے ہوتے ہوتے تھم گئی۔ اور وہ بے دم ہو کر فوم کے نرم بستر پہ آ گری۔

•••

میں بے دم ہو کر ریت کے گرم بستر پہ آ گرا۔ میرے پاؤں کی حرکت دھیرے دھیمی ہوتے ہوتے رک گئے۔ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ میں رینگتا رینگتا کیکٹس کے قریب پہنچ گیا۔ ہاتھ بڑھایا۔ کیکٹس ابھی بھی چند ہاتھ اور دور تھا۔ میں اور رینگا۔ میرے ہاتھ کیکٹس سے الجھی قمیض کے دامن پر پڑے۔ میں نے اسے جھپٹ لیا۔ کانٹوں سے دامن الجھ کر رہ گیا۔ قمیض پھٹ گئی۔ میری انگلیوں سے کانٹے چبھنے سے خون کی بوندیں رسنے لگیں۔ خون کی بوندیں ریت کے ذرّوں پر بھری ریت کو رنگ رہی تھیں۔ میں نے دھیرے دھیرے سارے کپڑے ہاتھ میں لیے اور پہن لیے۔

•••

اس نے دھیرے دھیرے سارے کپڑے ہاتھ میں لیے اور پہن لیے۔ بالوں کو سنوارا، آئینے میں دیکھا کیکٹس کہاں ہے منزل تیری اے لالۂ صحرائی۔ اس کے ہونٹ خشک تھے، پانی کے بغیر اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ اس کی پیاس بڑھتی گئی۔

•••

پانی کے بغیر میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ میری پیاس بڑھتی گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ صحرا کی ساری ریت میرے حلق میں آ گئی ہے۔ شریانوں اور رگوں میں خون کے بجائے ریت بہہ رہی ہے۔ دور مجھے کچھ سبزہ سا دکھائی دیا۔ شاید وہاں پانی ہو۔ ریت کے ٹیلے بھی تو پانی کی لہروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میں دوڑنے لگا۔ تیز اور تیز۔ میرے ساتھ ایک ہرنی بھی دوڑ رہی تھی۔ کیا وہ پانی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ دوڑ رہی تھی۔ یا اپنے اندر چھپی کستوری کی تلاش میں۔ کیا میں پانی کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔ یا۔۔۔ لیکن میرے اندر کیا ہے؟ اگر کچھ ہے تو اس کا شعور نہیں۔ کیا کچھ باہر ہے۔ کیا مجھے کچھ بھرم ہو رہا ہے۔ لیکن ہم دوڑ رہے تھے۔ ریت ہمارے پیروں کے نیچے پھسل رہی ہے۔ دوڑتے دوڑتے ہمارا سانس پھولنے لگا۔ ہم ہانپنے لگے۔ دم لوٹنے لگا۔ اور بے دم سے ہو کر اس سبزے سے دو چار گز کے فاصلے پر گر پڑے۔ میں چاروں طرف سے ریت کی آندھی میں گھر گیا تھا۔ آندھی بگولا بن کر اٹھی اور مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر ریت کے

ٹیلے پر پھینک دیا۔ ہم ہانپ رہے تھے اور بے دم پڑے تھے۔

• • •

وہ ہانپ رہے تھے اور بے دم پڑے تھے۔ وہ مسلسل دوڑ رہے تھے وہ نیم اندھیری گلی کے شام کے جھٹپٹے میں دبے پاؤں نکلی تھی اور دبے پاؤں قدم بڑھاتے۔ گھر سے گلی میں اور گلی سے سڑک پر اور سڑک سے شاہراہ پر آگئے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سبز باغوں کی بہاریں تھیں۔ سیلز گرل سے ماڈل گرل۔ ماڈل گرل سے فلم اسٹار اور فلم اسٹار سے۔ وہ اوپر ہی اوپر اڑی جا رہی تھی۔ اوپر اور اوپر۔ اس کے پیروں کو پنکھ لگ گئے تھے۔ اس کے سامنے سارا آکاش تھا۔ ایک ہوائی جہاز سے دوسرے ہوائی جہاز تک۔ ہانگ کانگ، ٹوکیو، سنگاپور، بنکاک، جیٹ سیٹ جیٹ لیگ اکثر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل کی لفٹ میں۔ کبھی کسی کمرے کے بستر پر۔ دوڑتے دوڑتے ان کا سانس پھولنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر گر پڑے تھے۔ وہ ہانپ رہے تھے۔ اور بے دم پڑے تھے۔ کسی آندھی نے بگولا بن کر انھیں اپنی لپیٹ میں لے کر مخملی بستر پر پھینک دیا تھا۔ دن دُنا۔ دن۔ دن دنا۔ دن۔

• • •

دن، دنا۔ دن۔ دن۔ گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ یہ مجھ پر وار کون کر رہا ہے؟ بورڈر سیکوریٹی فورس کے جوان کہ میں اسمگلر، پاکستانی جاسوس، ڈاکو، دہشت پسند ہوں۔ یا اسمگلر پاکستانی جاسوس، ڈاکو، دہشت پسند کہ میں بورڈر سیکوریٹی فورس کا جوان ہوں۔ کون کیا ہے؟ معلوم نہیں۔ کون کس پر گولی چلا رہا ہے؟ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں، وہ کون ہیں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ وہ کہاں سے آئے ہیں؟ میں کدھر جا رہا ہوں؟ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ سب کچھ ریت میں دفن ہو چکا تھا۔ ریت میرے خون سے سیراب ہو چکی تھی۔ لیکن میرے ساتھ دوڑتی ہوئی ہرنی۔ کچھ پتہ نہیں۔ میں زخمی پڑا تھا۔

صبح جب ایک قافلہ ادھر سے گزرا تو انھیں ایک لاش ملی۔ ریت میں ستھری ہوئی۔ خون میں ڈوبی ہوئی۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے کرتے کی جیب سے دلی سے اودے پور کا ریل ٹکٹ نکلا۔

ایک خبر۔ کراؤن ہوٹل کی تیسری منزل کے ایک کمرے سے جس عورت کی لاش ملی اس کے پرس سے دلی سے اودے پور کا ریل ٹکٹ نکلا۔ ⚫

## 【بقیہ صفحہ ۲۱ کا م دھینو】

انہیں کیسے سمجھائے۔ کیسے منع کرے کیوں کہ وہ تو اس کی سُن ہی نہیں رہے تھے صرف اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

پھر پتہ نہیں کب اور کیسے ایک لوٹا منگوا لیا گیا۔ اور مادھو نے دیکھا کہ بابو رھوا اس کی گائے کے پیروں کے پاس بیٹھا اُسے پچکار رہا ہے۔ مادھو لوگوں کے ریلے میں گھرا ایک عجیب سی بے بسی کے ساتھ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گائے بے چینی سے پچھلے پاؤں جھٹک رہی تھی۔ بار بار دُم ہلا رہی تھی۔ دائیں بائیں سینگ چلا رہی تھی۔ مگر بابو راؤ بھی کافی ضدی تھا۔ اُس نے کسی طرح اُس کے تھوڑا سا دودھ نچوڑ ہی لیا۔ بابو راؤ کے جھوکرے ایک بڑا سا دائرہ بنا کر "گو بید آلا رے آلا" گانے لگے۔ مادھو آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر جاتے بابو راؤ نے اسے دصنیہ واد کہا۔ کب وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مادھو کو کچھ بھی یاد نہیں۔ جب اُس کے حواس ذرا درست ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ جا چکے ہیں اور پچھم کی طرف سورج چندر زاویہ جھک گیا ہے اور پہاڑی کے پیچھے جیسے کسی نے بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا ہے۔ پھر اس نے اپنی گائے پر نگاہ ڈالی اور ایک دم سے چونک گیا۔ گائے اب زمین پر بیٹھ چکی تھی بلکہ لیٹ چکی تھی اُس کا جُگالی کرنا بھی بند تھا اور اس کی سفید سفید شیشہ آنکھوں کے ڈھیلے کالی پھیل گئے تھے۔ اُس نے اُس کی تھنوں کی طرف دیکھا تھن سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے اور رنگ بھی گہرا گلابی ہو گیا تھا۔ اُسے لگا اگر انہیں کسی نے ذرا سا بھی چھیڑا تو بجائے دودھ کے خون کے سُرخ سُرخ قطرے ٹپکنے لگیں گے۔ وہ گائے کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اُس کا ماتھا سہلانے لگا۔ پھر قریب پڑی خشک گھاس کے چند تنکے اُس کی طرف بڑھائے گائے گھاس کھانے کے بجائے اُس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ مادھو کا دل بھر آیا۔ اور دُکھ سے پچ ــــ پچ ــــ پچ ــــ کی آواز نکالتا ہوا اُسے پچکارنے لگا ــــ جانے وہ کتنی دیر تک گائے کے پاس بیٹھا اسے پچکارتا اور چُمکارتا رہا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ آسمان پر بگلوں کی ایک ڈار اُڑتی ہوا کسی طرف کو جا رہی تھی۔ پہاڑ اور جنگل سے ڈھور لوٹ رہے تھے۔ گذرے جھوکروں کی ایہہ، ایہہ ہڑ، ہڑ، ہُڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مادھو کھنکھار کے پاس سے اُٹھ کر دوبارہ اپنی دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی خوف زدہ نظریں گاؤں کی سڑک پر جمی ہوئی تھیں ــــ اگرچہ سڑک پر دور دور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ⚫

## جراحتِ تخلیق

○

وجود و عدم نہ غیب و حضور
وقت میں بہہ رہی ہے موجِ شعور

وقت آسودۂ دوام و بقا
وقت آزردۂ سنین و شہور

لاکھ ہوں بے حجاب شمس و قمر
وقت اپنے حجاب میں مستور

وقت معیارِ غم، عیارِ حیات
وقت میزانِ کیف و وزنِ سرور

وقت آئینِ غیب و مستوری
وقت آئینۂ جمال و ظہور

وقت ہے رازدانِ خلوتِ روح
وقت ہے ترجمانِ جلوتِ نور

ذات ہے ذات کی طرف مائل
واپسی کا سفر ہے منزل دور

آج تک ہے جراحتِ تخلیق
سینۂ کائنات کا ناسور

منزلیں اپنی راہ میں جولاں
قافلے اپنی گرد میں مستور

## توہّم

○

نہ لہریں ہیں نہ گرداب و تلاطم
یہ دریا اپنی گہرائی میں ہے گم

تمہاری جستجو سے فائدہ کیا؟
کہ خود میری طرح معدوم ہو تم

تو پھر کس کے لئے کس کے لئے ہے
یہ میری روح میں برپا تلاطم

نگاہیں اور کس کو ڈھونڈتی ہیں
یہ آخر ماورائے ماہ و انجم

نہ جانے کس کی ذاتِ خاص سے ہیں
یہ بے لفظ و بیاں گرمِ تکلم

نہ جانے کس کی بزمِ راز میں ہوں
یہ بے ساز و نوا محوِ ترنم

مجھی سے شورشِ ہستی عبارت
میں خود ہی شورشِ ہستی میں ہوں گم

یہاں سارے توہم ہیں تفکر
یہاں سارے تفکر ہیں توہم

## فردِ حساب

○

کھل رہی ہے غمِ جہاں کی کتاب
پڑھ رہا ہوں خود اپنی زیست کا باب

ایک ایسی زباں میں لکھی ہے
کاتبِ غیب نے یہ فردِ حساب

جس کے خط و حروف و معنی کی
ابتدا اور انتہا نایاب

اس خط میں لکھے گئے ہوں گے
زندگی کے نوشتہ ہائے عذاب

یہ زباں قبلِ آفرینش کی
کہ جس میں ہے نہ کُن کا خطاب

نہ تکلم نہ تکلمہ نہ کلام
نہ کتابت نہ مکتبہ نہ کتاب

یہ زباں حرف و لفظ میں نادر
یہ زباں شرح و نطق میں کمیاب

ہاں ایسی اجنبی زباں میں کیے
دلِ بیدار نے یہ عالمِ خواب

ابدیت سے کہہ سلام و پیام
احدیت سے کہہ سوال و جواب

## تقدیر

○

ہر ذرۂ تیرگی و تنویر
زندانیٔ کائناتِ تقدیر

انجم ہیں خلا میں پا بجولاں
سورج ہے زمیں سے پا بہ زنجیر

رقصاں ہیں شعاعِ مہر کے ساتھ
ذراتِ زمیں بہ نوکِ شمشیر

ذرات پہ رقص کر رہی ہے
سورج کی کرن بہ جبرِ تنویر

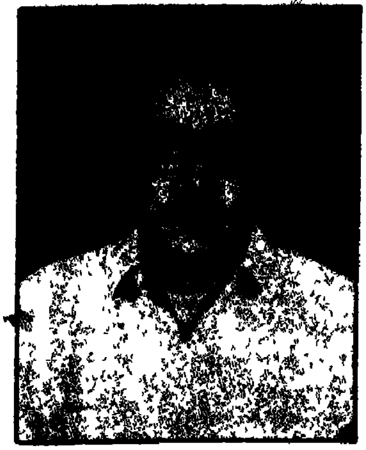
منظور ہے کاہ کی کشش سے
افلاک پہ کہکشاں کی تسخیر

یہ معرکۂ نشو و ارتقا کا
شاخیں ہیں کمان تو پھول ہیں تیر

اے میرے وجود کے تصور!
میں تیرے ظہور کی ہوں تصویر

با ایں ہمہ جذب و شوق ایدوست!
کیا قرب و وصال کی ہو تدبیر!

تو روح کا جلوۂ جہاں تاب
میں جسم کا سایۂ زمیں گیر



باقر مہدی

# ایک ملاقات
# ایک کالی نظم

اپنے اپنے دائروں سے نکل کر جب ہم تم ملے
——تو دیر تک چپ رہے!
کیا تم بھی میری طرح ایک باغی ہو؟
میں نے یہ نہیں پوچھا
جانتا ہوں کہ تمہاری بغاوت شادی کے ناقص ادارے سے تھی
—— اور میں — میں جنم جنم کی بغاوت کا سودا لئے
ظلم کو ہر طرف پھیلتا دیکھتا ہوں!
میری چیخ مدت ہوئی قید خانے میں زخمی پڑی ہے
میرے الفاظ—— قطرہ قطرہ لہو دے کے نیم جاں ہیں!
——اور میری آنکھیں انسومینا میں جلتی
خوابوں کی حدت لئے جاگتی ہیں!

میں تم سے کیا کہتا ؟
کبھی تم نے سوچا ہے یوں ہی ملنے کا حاصل بھی کیا ہے؟
نیم طوفانی جذبوں میں چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی نہیں ہے!
ہم جانتے ہیں کہ عارضی وصل کے بعد بوسوں کی تلخ شیرینی
ریت بن کے ہوا میں بکھر جائے گی!
قہقہے تازگی کھو کے ہونٹوں پہ نمناک تبسم لئے رہ جائیں گے!
ہر نئی ملاقات بچھڑے رفیقوں کے مندمل زخموں کو کرید—— کرید کر
ہرا کرتی رہتی ہے

یہی سوچ کر ہم تم دیر تک مگر چپ رہے
——اور پھر جدا ہو گئے!

کمار پاشی

# خوشی آگے ہے

خوشی آگے ہے
رات سے بھی
پربھات سے بھی

خوشی آگے ہے
دریا سے بھی
پہاڑ سے بھی
جیت سے بھی
ہار سے بھی
خوشی آگے ہے

کیوں رک گئے ہو تم؟
خوشی نہیں رکتی

چلو
آگے چلو

کہو:
کہاں تک پہونچ پاؤگے؟
خوشی اس سے بھی آگے ہے
تم جس رستے سے جہاں تک
جہاں تک جاؤگے

۲۳۷۱، دہلی گیٹ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲




سلام بن رزاق

سی۔ آئی۔ ایل۔ ۹/۱۱۔ دینو بھا بھاولے نگر کرلا (ویسٹ) ممبئی ۷۰


# کام دھینو

وہ مارچ کی ایک صاف و شفاف صبح تھی اور سورج پہاڑی کے پیچھے سے یوں طلوع ہو رہا تھا جیسے کوئی نٹ کھٹ بالک کسی نئی شرارت کی فکر میں دیوار کی اوٹ سے جھانک رہا ہو۔ صبح کی ہوا کے لطیف اور خوش گوار جھونکے جوار کی پکی فصل کو ہولے ہولے چھیڑتے گزر رہے تھے۔ جیسے ماں اپنے بچے کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی ہو۔ فضا میں جوار کی مہک بسی ہوئی تھی اور درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ بھرت پور کی اکلوتی بڑی سڑک اور گلیاں تقریباً سنسان تھیں۔ البتہ گھروں کے آنگنوں سے بیلوں کے ڈکرانے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی گھر سے ایک آدہ بچے کی چیخ کر رونے کی آواز بھی آجاتی۔ ایک بنیا اپنی دکان کا ایک پٹ کھولے دکان کی چوکھٹ پر بیٹھا داتون کر رہا تھا۔ دو گوالے سروں پر دودھ کی کین رکھے لپ جھپ جھپ گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک گوالا سائیکل پر سوار چلا آرہا تھا اس کی سائیکل کے ہینڈل سے دودھ کی خالی کینیں لٹکی ہوئی تھیں جو سائیکل کے مڈگارڈوں سے ٹکرا ٹکرا کر کھڑ پڑ کھڑ پڑ کر رہی تھیں۔

تبھی بھرت پور میں ایک جیپ گاڑی داخل ہوئی۔ جیپ گاڑی کی باڈی پر چاروں طرف سے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے جن پر جلی حرفوں میں مختلف نعرے لکھے تھے اور ہر بینر پر سورج کا نشان بنا ہوا تھا۔ جیپ گاڑی کے دائیں بائیں پارٹی کے جھنڈے فرفرا رہے تھے۔ پیچھے دو بڑے سے بھونپو نٹ تھے۔ جیپ گاڑی میں چار پانچ نوجوان بیٹھے تھے۔ جیپ گاڑی دھول اڑاتی سڑک پر آگئی اور اسی وقت بھونپو سے آواز آئی۔

بھرت پور کے باسیو! جاگو، غفلت سے جاگو ــــ ابھی نہیں جاگے تو کبھی نہیں جاگو گے۔ دیکھو رات بیت گئی۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ ناانصافی، مارا ماری، بھوک اور بے کاری کا اندھیرا ــــ نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ یاد رکھو سورج صرف اونچی عمارتوں اور محل دو محلوں کو روشن نہیں کرتا۔ وہ جھونپڑوں، جھگیوں میں بھی اپنا نور بکھیرتا ہے۔ یہ سورج تمہاری خوش حالی اور مسرتوں کا ضامن ہے۔ یاد رکھو سورج کا نشان ــــ جاگ اٹھا ہندوستان ــــ جاگو تم بھی جاگو اور اپنے محبوب لیڈر الحاج جناب مرزا تراب علی کو ووٹ دو۔"

پھر ایک نعرہ لگا

"مرزا تراب علی ــــ زندہ باد ــــ"

بھونپو کی آواز سے سب سے پہلے تو بوڑھے اپنی اپنی اونگھ سے جاگے، پھر جوان آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ بلکہ بعض کو ان کی بیویوں، ماؤں اور بہنوں نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا۔ سب اپنے اپنے بستروں سے اٹھ بیٹھے، دروازے وا ہونے لگے، لوگ دروازے کھول کھول کر وانڈوں، چبوتروں، گیلریوں اور سیڑھیوں پر آ آکر کھڑے ہو گئے۔ کھڑکیوں کے پٹ کھلے اور عورتیں گردنیں نکال نکال کر جھانکنے لگیں۔ بچے ماؤں کے کاندھوں کے اوپر سے اور باپوں کے ٹانگوں کے بیچ بیچ سے نکل نکل کر اپنی کیچ بھری آنکھوں کو ملتے، بہتی ناکوں کو الٹی ہتھیلیوں سے پونچھتے کچھ تجسس، کچھ استعجاب، کچھ خوف، کچھ اضطراب کی کیفیت میں ادھر ادھر تاکنے لگے۔ بوڑھے آنکھوں پر اپنی لرزتی ہتھیلیوں کا چھجا بنائے، اور نوجوان پیشانیوں پر بل ڈالے اس طرف تاکنے لگے جدھر سے بھونپو کی آواز آرہی تھی۔ جیپ گاڑی بھرت پور کی بڑی سڑک پر دھول اڑاتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ جیپ کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ جیپ کے بھونپو سے اعلان نشر ہو رہا تھا۔

"صاحبو! آیئے، گرام پنچایت کے میدان میں بابائے قوم الحاج مرزا تراب علی بہ نفس نفیس آپ سے خطاب کرنے تشریف لا رہے ہیں۔"

ایک بوڑھے نے اپنی کیچ بھری آنکھیں پچپچاتے دوسرے بوڑھے سے پوچھا۔

"یہ مرزا تراب علی کون صاحب ہیں۔"

"کوئی نیتا لگت ہیں" دوسرے کا جواب

"نیتا؟ ہمرے جمانے میں تو گاندھی بپا، جواہر لال، مولانا آجاد جیسے لوگ نیتا ہوتے تھے۔ یہ کیسے نیتا ہیں؟"

"یہ نئے جمانے کے نیتا ہیں چاچا!" ایک نوجوان ——

"کتاب کرنے آرہے ہیں۔ کیا مطلب؟"

"کتاب نہیں —— خطاب"

بھرت پور کے اکلوتے کالج، کبیر تی مہاودیالے کے لیکچرار جو کالج میں اُردو پڑھاتے تھے۔

"ہاں —— ہاں وہی کھتاب کرنے آرہے ہیں۔ مطلب کیا کرنے آرہے ہیں؟"

"بھاشن دینے آرہے ہیں"

"آچھا —— بھاشن دینے —— ہم سمجھے —— کھتاب مانے کوئی پاٹھ وا ٹھ کرنے آرہے ہیں"

"پاٹھ تو پنڈت لوگ کرتے ہیں کاکا —— نیتا لوگ بھاشن دیتے ہیں"

"ہاں —— ہاں مالوم ہے ——" کاکا کو نوجوان لیکچرار کی علمیت ناگوار لگی . . .

گرام پنچایت کے اکلوتے میدان میں ایک بڑا سا چوکور سرکاری چبوترا بنا ہوا تھا جس پر ایک چھت بھی پڑی ہوئی تھی۔ اکثر رام لیلا کے ناٹک اور نوٹنکیاں وغیرہ اس چبوترے پر کھیلے جاتے۔ ہولی کے موقع پر میدان میں بڑا سا گڑھا کھود کر اس میں آگ روشن کی جاتی اور ہولیکا کو جلایا جاتا۔ گنیتی کے موقع پر یہاں ایک بہت بڑی گنپتی بھی بٹھائی جاتی۔ محرم میں اسی چبوترے سے تعزیے بھی اٹھتے اور انھیں یہیں لاکر ٹھنڈا کیا جاتا۔ عید میلاد کا جلوس بھی اسی میدان سے نکلتا —— اور اگر کوئی چھوٹا موٹا منتری یا نیتا اس گاؤں سے گزرتا تو اس کے اعزاز میں اسی میدان میں جلسہ منعقد ہوتا اور وہ منتری یا نیتا اسی چبوترے سے گاؤں والوں کو خطاب کرتا۔ بھرت پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں ہندو مسلم کی ملی جلی آبادی تھی۔ مگر آبادی میں پیشے کے اعتبار سے اکثریت گوالوں کی تھی جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دس پندرہ کرسچنوں کے بھی گھر تھے اور ان کا ایک مختصر سا چرچ بھی تھا جہاں وہ اپنی اتوار کی عبادت کر لیا کرتے تھے۔

بھرت پور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہاں آج تک کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ ملک میں آئے دن ہونے والے فسادات کی خبریں یہاں بھی پہونچتیں۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں مگر بھرت پور کے لوگوں پر ان فسادات کی خبروں کا کوئی خاص ردّ عمل نہ ہوتا، بیچارے اپنے مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں ایسے منہمک رہتے کہ انھیں ان خرافات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ایسا نہیں تھا کہ بھرت پور میں جھگڑے فساد نہیں ہوتے تھے۔ یہ جھگڑے زیادہ تر روزمرہ کی معمولی باتوں پر ہوتے اور بڑے بزرگوں کے بیچ بچاؤ یا پنچوں کے کہنے پر فوراً ختم بھی ہو جاتے۔ ان میں مذہبی فسادات کی بربریت اور شدت پسندی نہ ہوتی۔ دو ایک دفعہ مذہبی معاملوں پر بھی گرماگرمی ہو گئی تھی مگر گاؤں والوں نے خود ہی مل ملا کر اسے طے کر لیا تھا۔

سورج آسمان پر اب گزا ڈیڑھ آچکا تھا۔ لوگ ایک ایک دو دو کر کے گرام پنچایت کے میدان میں جمع ہونے لگے۔ میدان کے چبوترے کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور پتاکوں سے سجا دیا گیا تھا۔ چبوترے پر چار پانچ کرسیاں اور ایک میز بھی رکھ دی گئی تھی۔ میز پر غلاف بچھا تھا اور اس پر ایک گلاس رکھا تھا۔ لوگ میدان میں آ آ کر چبوترے کے سامنے بیٹھتے جا رہے تھے جس میں بوڑھے اور جوان سبھی شامل تھے۔ کچھ نوعمر لڑکے میدان میں ادھر سے اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک طرف بوڑھوں کے درمیان چلم بھی چل رہی تھی۔ نوجوان ایک دوسرے کو کہنیوں سے ٹھوکے دیتے کسی مذاق پر رہ رہ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ تبھی میدان میں ایک طرف وہی بھونپو والی جیپ آکر کھڑی ہو گئی جو بھونپو پر بار بار تراب علی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ جیپ کے پیچھے تین چار کاریں بھی تھیں۔ کاروں کے دروازے کھلے اور چند کرتے پائجامے پہنے موٹے تازے لوگ باہر نکلے جو لباس کے اعتبار سے سفید پوش تھے مگر جانے کیوں اُن کے کرخت چہرے اُن کے لباس سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ سب خراماں خراماں چبوترے کی طرف بڑھے۔ سب سے آگے آگے مرزا تراب علی چل رہے تھے جو کالی شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھے اور جن کے سر پر فر کی بھوری ٹوپی تھی۔ چبوترے پر کھڑے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انھیں چبوترے پر بچھی کرسیوں پر بٹھایا۔ تراب علی کی کرسی سب سے اونچی تھی۔ ایک نوجوان نے مختصر طور پر مہمانوں کا تعارف کرایا۔ جلسے کی غرض و غایت بتائی۔ دو ایک چھوٹی موٹی تقریریں ہوئیں پھر تراب علی کے نام کا اعلان ہوا۔

تراب علی اپنی شیروانی کا دامن سنبھالتے مائک پر آئے۔ میدان میں خاموشی چھا گئی ادھر اُدھر اُچھلتے کودتے بچوں کو چند لوگوں نے ڈپٹ کر چپ کرایا۔ تراب علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔

بھرت پور کے باسیو! ہمارا نام تراب علی ہے۔ ہم اس گاؤں کے نہیں ہیں۔ اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی ہم اس گاؤں میں آئے۔ ممکن ہے آپ نے پہلے

کبھار ہمارا نام بھی سُنا ہو۔ مگر یقین جانیے ہم نے خواب میں بار ہا اس گاؤں کو دیکھا ہے آپ کے چہرے دیکھتے ہوئے ہمیں محسوس ہو رہا ہے ہم ایک یک چہرے سے آشنا ہیں۔ ہم نے جب بھرت پور آنے کا قصد کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ بھرت پور کے باسیوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ صرف اُسی اُمیدوار کو ووٹ دیں گے جو گوالا برادری سے تعلق رکھتا ہوگا۔ بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ اس معاملے میں ہم بھی آپ کے حامی ہیں۔ مگر ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس حلقے سے چار امیدوار کھڑے ہیں اور ان میں ایک بھی گوالا یعنی آپ کی برادری سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں بھی گوالا نہیں ہوں مگر میں جو بات کہنے والا ہوں اُسے غور سے سُنیے۔ میں ایک سچا ہندوستانی ہوں ساتھ ہی ایک پکا مسلمان بھی ہوں۔ ایک طرف مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میرے اجداد نے اس سرزمین سے اتنا پیار کیا ہے کہ اسے فردوس بریں بنا دیا۔ تو دوسری طرف مجھے فخر ہے کہ میں اُس رسول کا کلمہ پڑھتا ہوں جس نے دائی حلیمہ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دائی حلیمہ کون تھیں؟ ایک گوالن ہی تو تھیں۔ میرا رسولؐ، میرا آقا دکھنے والا گوالا نہیں تھا مگر اُس نے دائی حلیمہ کی بکریاں چرائی ہیں، اپنے مقدس ہاتھوں سے بکریوں کا دودھ دوہا ہے، اُن کی مینگنیاں صاف کی ہیں۔ اُنہیں دُلارا اور پُچکارا ہے۔ بے شک وہ گوالا نہیں تھا مگر اس نے گوالے کے سارے کام انجام دیئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے جب میرے نبیؐ دو جہان کے سردار نے دودھ دوہا ہے اور بکریوں کے گلّے کی نگہبانی کی ہے تو پھر ان کی اُمّت کا ایک گنہ گار خادم بھلا اس کام سے اپنے آپ کو علاحدہ کیوں کر سمجھ سکتا ہے؟"

چبوترے کے آس پاس کھڑے چند نوجوانوں نے مرزا تُراب علی زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

تراب علی نے ایک لمحہ توقف کیا پھر آگے اُسی جوش سے بولے۔

"آج اس بھرت پور میں گوالوں کی اس چھوٹی مگر قدیم بستی میں میں اپنے آقائے نامدار سرکار دوعالم حضرت محمدؐ کی خاکِ پا کے صدقے میں اپنے آپ کو 'گوالا' برادری میں شامل کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میں گوالا نہیں ہوں مگر گوالوں سے الگ بھی نہیں ہوں۔"

ایک بار پھر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے میدان گونج اٹھا۔ تراب علی کہہ رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مبارک کام کے لئے بیسیوں حضرات اپنی اپنی گائیں بھینسیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مرحلے میں بھی میرا نبیؐ میری رہنمائی کرے گا۔ یاد کیجئے خدا کے رسول جب مکّے سے ہجرت کر کے مدینے پہنچے تھے تب مدینے کا ہر شخص انہیں اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا مگر آپ نے اعلان کیا تھا کہ —

"ہماری اونٹنی جس مکان کے سامنے ٹھہرے گی ہم اس کے گھر مہمان ہوں گے۔"

"اور آپ کی اونٹنی شہر کے آخر میں ایک غریب انصاری کے گھر کے سامنے رُکی تھی اور آپؐ اس صحابی کے مہمان ہوئے تھے ہم بھی حضورؐ کے نقش قدم پر چلیں گے اور گاؤں کے آخر میں جس گوالے کا گھر پڑے گا اسی کے آنگن میں دودھ دوہ کر خود کو آپ کی برادری کا ایک رُکن بنا لیں گے۔"

ایک بار پھر مرزا تُراب علی زندہ باد کا نعرہ لگا۔

تُراب علی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

جلسہ ختم ہوا۔ تراب علی چبوترے سے نیچے اُترے۔ پارٹی کے رضاکاروں نے اُنھیں گھیر لیا۔ اُن کے گلے میں اُن کی ناک تک پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ تُراب علی دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کرتے اور سب کے نمسکار قبولتے ایک طرف چلنے لگے۔ لوگ باگ بھی ایک جلوس کی شکل میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ہر دس بارہ قدم پہ پارٹی کے رضاکار "تُراب علی زندہ" کے نعرے لگا رہے تھے جلوس گاؤں کی اکلوتی بڑی سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے متجسس نگاہوں سے جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں اور نیم وا دروازوں کے پیچھے کھڑی حیرت اور دلچسپی سے جلوس کا نظارا کر رہی تھیں۔ تُراب علی آگے آگے دونوں ہاتھ جوڑے سراپا انکسار بنے چلے جا رہے تھے۔ سب کو یہی فکر تھی کہ دیکھیں تُراب علی کس کے گھر چل کر دودھ دوہتے ہیں۔

آخر جلوس گاؤں سے باہر آگیا۔ گاؤں کے باہر ہریجنوں کی بستی تھی۔ اب جلوس ہریجن واڑے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دُور چل کر ہریجن واڑہ بھی ختم ہو گیا اور تُراب علی ایک بے حد شکستہ اور معمولی مکان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ مادھو گوالے کا مکان تھا جس کی دیواریں کچی مٹی کی تھیں اور جس کی چھت ناریل اور تاڑ کے پتوں سے چھائی ہوئی تھی۔ باہر اپنے مکان کے کچے چبوترے پر بیٹھا مادھو بیڑی پی رہا تھا۔ اس کی بیوی دیوار پر گوبر کے اُپلے تھوپ رہی تھی۔ اور پاس ہی دروازے کے سامنے کھونٹے سے ایک جھبکبری گائے بندھی ہوئی تھی۔ اُس کی سیاہ پیشانی پر دو سینگوں کے بیچ میں سفید ہلال کا سا نشان بنا ہوا تھا۔ تراب علی نے مادھو کو پرنام کیا۔ مادھو بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیوی نے بھی گھبرا کر اُس ہجوم کو دیکھا اور اپنے گوبر سنے ہاتھوں ہی سے آنچل درست کرتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ تُراب علی مادھو کے قریب آئے۔ اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پلٹ کر گائے کو عقیدت اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ساتھیو! ہم اسی گیّاں کا دودھ دوہیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں یہی گاؤں کا آخری مکان ہے۔"

ادھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔

"ہاں یہی ہے ـــ یہی ہے۔"

مادھو اُن سب کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک رضاکار نے آگے بڑھ کر مادھو کو حقیقت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اگر تراب علی نے اُس کی گائے کا دودھ دوہ دیا تو اس کی یعنی مادھو کی قسمت ہی سنور جائے گی۔

مادھو مٹی کا مادھو بنا منہ کھولے آنکھیں پھاڑے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ پوری بات تو اُس کی سمجھ میں نہیں آئی مگر وہ اتنا سمجھ گیا کہ اس کی گائے کا دودھ دوہنے کی بات ہو رہی ہے۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی صبح ہی اُس نے گائے کا دودھ دوہا تھا۔ اُس نے منع کرنے کے لئے 'نہیں' میں گردن ہلانی چاہی مگر اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی 'ہاں' میں گردن ہلا دی۔ جو گردن پشتہا پشت سے 'ہاں' میں ہلنے کی عادی ہو وہ یکلخت 'نا' میں کیوں کر ہل سکتی تھی۔

رضاکاروں نے ایک دم سے جو ہلا کیا کہیں سے چم چم کرتی پیتل کی ایک کلسی آ گئی۔ کوئی ایک بالٹی میں پانی لے آیا۔ تراب علی نے اپنی شیروانی کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور مادھو کی گائے کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ ہجوم نے انہیں اور گائے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ رضاکاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر ایک حلقہ سا بنایا اور ہجوم کو آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے کے کاندھوں پر سے اچھل اچھل کر تراب علی کو دودھ دوہتا دیکھ رہے تھے۔ بعض لڑکے آس پاس کے درختوں پر چڑھ کر نظارا کرنے لگے۔ تراب علی نے لوٹے میں پانی لیا پہلے اپنے ہاتھ دھوئے، پھر گائے کے تھنوں پر پانی ٹپکایا۔ گائے ذرا سا کسمسائی۔ مگر تراب علی نے پچکار کر اُسے شانت کیا۔ پیتل کی کلسی کو اُس کی ٹانگوں کے نیچے رکھا اور کسی مشتاق گوالے کی طرح دونوں ہاتھوں سے اُس کے تھن سہلانے لگے۔ لوگ سانسیں روکے کھڑے تھے۔ سہلاتے سہلاتے تراب علی نے دفعتاً دونوں مٹھیاں کس کر جو زور سے کھینچا تو 'چر' کی آواز کے ساتھ سانپ کی زبان کی طرح پتلی مگر چمکیلی ہوئی چاندی جیسی سفید دودھ کی دھار پیتل کی کلسی میں گری۔ کئی لوگوں کی زبان سے بے ساختہ 'واہ' نکلی۔ مجمع میں جیسے حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تراب علی چر چر ـــ چر چر ـــ" دودھ دوہ رہے تھے اور چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مادھو یہ سب دیکھ رہا تھا وہ کہنا چاہتا تھا۔

"بس کرو بھائی، میری گیاں ابھی بیائی ہے بچھڑے کے لئے بھی تو کچھ دودھ رہنے دو۔" مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ کھڑا حیران آنکھوں سے تراب علی کو دودھ دوہتا دیکھتا رہا۔ جب کلسی ایک تہائی بھر گئی تب تراب علی اپنے ہاتھ دھوتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک رضاکار نے آگے بڑھ کر تولیہ پیش کیا۔ تراب علی تولیے سے ہاتھ خشک کرتے مادھو کی طرف مڑے۔

"بھائی مادھو! ہم تمھارے بہت شکرگزار ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی گیاں کا دودھ دوہنے کا موقع فراہم کیا۔ تمہاری اس کشادہ دلی کا ذکر ہم ودھان سبھا میں بھی کریں گے اور تمہیں زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

پھر وہ مجمع کی جانب مڑ کر گویا ہوئے۔

"بھائیو! اب تو آپ لوگوں کو یقین ہو گیا نا کہ تراب علی آپ کا اپنا بندہ ہے۔"

بیشتر لوگ تو چپ رہے مگر پارٹی کے رضاکار جی ہاں جی ہاں کہتے ہوئے گردنیں ہلانے لگے۔

رضاکاروں نے مجمع کو ہٹا کر تراب علی کے لئے راستہ بنایا اور تراب علی تیز تیز چلتے ہوئے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ پارٹی کے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ اور کاروں کا یہ قافلہ تراب علی زندہ باد کے نعروں کی گونج میں دھول اُڑاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے بچے شور مچاتے تھوڑی دور تک کاروں کے پیچھے بھاگے مگر کاریں جلد ہی دور نکل گئیں۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ مادھو اپنی گائے کے پاس کھڑا اُس غبار کی جانب دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے تراب علی اور اُن کی کاروں کا قافلہ روپوش ہو گیا تھا۔ گائے اپنی دُم سے مکھیاں اُڑاتی، کنوتیاں ہلاتی دھیرے دھیرے جگالی کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی لاتعلقی تھی اور اس کے پیروں کے پاس وہ پیتل کی کلسی لڑھکی پڑی تھی جس میں ابھی ابھی تراب علی نے دودھ دوہا تھا۔ کلسی کا دودھ فرش پر بہہ کر مٹی میں جذب ہو چکا تھا اور آس پاس مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مادھو دھیرے دھیرے چلتا ہوا گائے کے پاس آیا۔ پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ گائے نے ایک جھرجھری سی لی۔ مادھو دوبارہ اپنے چبوترے پر آکر بیٹھ گیا۔ مادھو کی گھر والی جو ابھی تک دروازے کی اوٹ سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اُس کی گود میں اُن کا تین سال کا کالا کلوٹا مریل سا بچہ تھا۔ جس کے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے مگر پیٹ ڈھول پر مڑھے چمڑے کی مانند تنا ہوا تھا۔ بچہ متواتر ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ بیوی نے مادھو سے پوچھا۔

"کون تھے یہ لوگ؟"

"مالوم نہیں ـــ" مادھو نے جیب سے بیڑی نکالی۔

"انہوں نے اپنی گیاں کا دودھ کیوں دوہا ـــ؟"

"مالوم نہیں ـــ" مادھو نے بیڑی ہونٹوں میں دبالی۔

"تم نے پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تھا — مگر انہوں نے جو کچھ بتایا میری سمجھ میں نہیں آیا —"

مادھو نے بیڑی سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔

"اسے انہوں نے جبردستی اپنی گئیاں کا دودھ نکالا اور تم بنے ہو بہرے کو مادھو نہیں۔ اور اس پر ظلم یہ کہ بنا کھائے پئے پیدا دودھ گرا دیا اور چلے گئے۔"

مادھو کچھ نہیں بولا، وہ دور خلاؤں میں دیکھتا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ اس کی بیوی تھوڑی دیر تک بک بک جھک جھک کرتی رہی جب دیکھا کہ مادھو ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے تو اپنے ریں ریں کرتے بچے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی اور پیر پٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ابھی سورج نصف النہار پر نہیں آیا تھا۔ بھرت پور کے چھوٹے سے بازار کی ساری دکانیں کھل گئی تھیں۔ جن کی کل تعداد چار چھ سے زیادہ نہیں تھی۔ روزانہ صبح سڑک کے کنارے سبزی بیچنے والی عورتیں اپنی ٹوکریاں ختم کر کے خالی کر چکی تھیں بلکہ دو ایک نون تیل اور بچوں کے لیے چنا سبنگ خرید کر اپنے گھروں کو سدھار بھی چکی تھیں۔ کاشی رام کے 'سدانند ہندو ہوٹل' میں تھامس ایڈیسن کے زمانے کا پرانا گراموفون بج رہا تھا۔ "آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا" کاشی رام کرسی پر بیٹھا کاؤنٹر ٹیبل پر اپنی انگلیوں سے بے آواز تال دے رہا تھا۔ ہوٹل میں چار پانچ میلی کچیلی میزیں رکھی تھیں جن پر ڈھیر ساری مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ صرف داہنے کونے کی ایک میز پر بنڈی دھوتی پہنے دو ڈنک میٹھی چائے پی رہے تھے۔ ہوٹل کا اکلوتا ویٹر صدری بنیان پہنے، داہنے کاندھے پر میلا سا تولیہ ڈالے ایک کونے میں پیر پر پیر رکھے تھمرا اگلنے کی دھن پر اپنا گھٹنا ہلا رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے جمنا داس پات والے کی پان بیڑی کی دکان تھی۔ دکان میں ٹرانزسٹر پر کسی نئی فلم کا کوئی انتہائی شور انگیز گیت بج رہا تھا۔ سڑک کے کنارے املی کے درخت کے نیچے شمسو تانگے والا اپنے تانگے میں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا اور اس کے تانگے میں جتی کنگال گھوڑی کنوتیاں بھٹ بھٹاتی، اپنی دُم سے بار بار مکھیاں اُڑا رہی تھی۔ پاس ہی تین چار لونڈے ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے صبح تراب علی کے دودھ والے واقعہ کو لے کر ہنسی ٹھٹھا کر رہے تھے۔

یکایک کہیں سے شنکھ پھونکے کی آواز آئی — شنکھ پھونکے کے ذرا بعد ڈم ڈم ڈھول بجنے لگا۔ لونڈے چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ شمسو ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ جمنا داس نے ٹرانزسٹر کا کان اینٹھا۔ کاشی رام نے بھی گراموفون بند کر دیا۔ اتنے میں سامنے سے بیل گاڑیوں کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے جو بیل گاڑی تھی اس پر ایک شخص کھڑا بھونپو منہ سے لگائے چیخ رہا تھا۔

"بھرت پور کے باسیو! کبھی کبھی ایک صحیح فیصلہ اتہاس کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اور اب سمے آ گیا ہے کہ آپ پنڈت اونکار ناتھ کو ووٹ دے کر ایک نئے اتہاس کی شروعات کریں۔ پنڈت جی بھرت پور والوں کے لیے نئے نہیں ہیں۔ پنڈت جی کے پتا شری پنڈت ہزاری پرساد کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ وہ ہزاری پرساد ہیں جنھوں نے آنند پور میں مہالکشمی کا بھویہ مندر بنایا ہے اور جس کی سالانہ جاترا میں آپ لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ پتا شری تو دھرم کی سیوا کر رہے ہیں مگر پنڈت اونکار ناتھ لوک سیوا میں وشواس رکھتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی آواز ودھان سبھا تک پہنچے تو پنڈت اونکار ناتھ ہی کو ووٹ دیجیے کیونکہ پنڈت اونکار ناتھ کی آواز آپ کی آواز ہے۔ پنڈت جی کا نشان ہے 'رتھ' رتھ جو ہمارے دھرم ہماری سنسکرتی اور ہمارے راشٹر کا پرتیک ہے۔ 'پنڈت اونکار زندہ باد'

اس بیل گاڑی کے پیچھے تقریباً بیس پچیس بیل گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ ہر گاڑی میں دس دس بارہ بارہ نوجوان نعرے چیخ چلا رہے تھے، ناچ رہے تھے، اودھم مچا رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی پر ایک بہت بڑے رتھ کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ اس رتھ میں پنڈت اونکار ناتھ سفید دھوتی کرتا پہنے ماتھے پر تلک لگائے گلے میں پھولوں کی مالا ڈالے ہونٹوں پر ایک عدد دلآویز مسکان چپکائے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ اور جھک جھک کر سڑک کے دونوں طرف کھڑے لوگوں کو پرنام کر رہے تھے۔

گاؤں کے بیکار نوجوان اور آوارہ گرد چھوکرے گاڑیوں کے آس پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بار پھر گھروں کی کھڑکیوں دریچوں اور مکانوں کے چھجوں کے نیچے انسانی سروں کا جنگل اُگ آیا۔

ڈم ڈم ڈھول بج رہا تھا — شنکھ پھونکے جا رہے تھے اور بار بار پنڈت اونکار ناتھ کی جے جے کار ہو رہی تھی۔ یکایک پنڈت جی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ دفعتاً ڈھول اور شنکھ خاموش ہو گئے، نعرے رک گئے۔ اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ایک نوجوان نے لپک کر بھونپو پنڈت جی کے سامنے کر دیا اور پنڈت جی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔

"بھرت پور کے باسیو! ہمارا آپ کا سمبندھ بہت پرانا ہے۔ میرا پریچے تو ابھی دیا جا چکا ہے۔ میں اپنے بارے میں زیادہ باتیں کرنا یا سننا پسند نہیں کرتا۔ میں اپنا اصل پریچے تو آپ لوگوں کو اسی وقت دے سکوں گا جب آپ مجھے چن کر ودھان سبھا میں بھیجیں گے۔ میں جانتا ہوں بھرت پور والے بڑے کام کاجی لوگ ہیں وہ فالتو راج نیتی میں اپنا سمے نشٹ

نہیں کرتے مگر یہ بھی سچ ہے کہ راج نیتی کے بنا اس دیش کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ ایک صاف ستھری حکومت بنانے کے لئے آپ جیسے بے غرض لوگوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ دو گھنٹے پہلے جو مہاشے یہاں بھاشن دینے آئے تھے اُن کا بھرت پور سے دور دور تک کوئی سمبندھ نہیں۔ میں کہتا ہوں صرف دودھ دوہنے سے کوئی جاتی برادری والا نہیں ہو جاتا۔ انہوں نے محمد پیغمبر کی مثال دی کہ وہ بکریاں چراتے تھے اور دودھ دوہتے تھے اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں ان مثالوں کے لئے آخر سمندر پار جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پرانوں میں سب سے بڑی مثال ماکھن چور نند لال ہری گوپال کی ہے۔ مجھے بتائیے شری کرشن سے بڑا گوالا اس دھرتی پر پیدا ہوا ہے۔ نہیں نا ــــ تو پھر سن لیجئے ہمارا یعنی پنڈت اونکار ناتھ کا رشتہ کرشن گوپال ہی سے جڑتا ہے۔"

پنڈت اونکار ناتھ کی جے، کے نعرے سے پورا میدان گونج اٹھا۔ پنڈت جی لمحہ بھر کو رکے پھر بولے "ہم اسی وقت چل کر اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر بتائیں گے۔ اور اُسی گئو ماتا کا دودھ دوہیں گے جس کا اس سے پہلے دوہا گیا۔ ارے پرائے آکر ہماری ماتا کا دودھ دوہ لیں اور ہم جو اُس کی سنتان ہیں اپنی ماتا کے کشیر امرت سے محروم رہ جائیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا ــــ"

ایک بار پھر بیل گاڑیوں کا جلوس مادھو کے گھر کی طرف بڑھا۔ چھوکرے بالے گاڑیوں کے پیچھے ہو لئے کچھ اور لوگ بھی جو مفت کی تفریح کے دلدادہ تھے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مادھو کے گھر کی طرف چلے۔ ڈھول بجاتا شنکھ پھونکتا اور نعرے لگاتا ہوا جلوس مادھو کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ مادھو جلوس کو دیکھ کر ایک بار پھر سٹپٹا گیا۔ سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت اونکار ناتھ دھوتی کا چھور سنبھالتے اپنی رتھ گاڑی سے اترے۔ مادھو کے پاس آئے۔ مادھو منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پنڈت جی سفید براق لباس میں آسمانی دیوتا معلوم ہو رہے تھے۔ اُن کی چوڑی روشن پیشانی پر سرخ تلک اُن کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بنا رہا تھا۔ پنڈت جی مادھو کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"مادھو! ہم تم سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی گیّاں کا دودھ دوہنے کی اجازت دو۔ ہم اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ [illegible] ہم ہیں۔"

[illegible] سے پہلے کہ مادھو ہاں یا ناں کہتا [illegible]

[illegible] نکال اور اُسے گنگا جل میں ڈبو دیا۔ پھر خود زیرِ لب کوئی منتر پڑھتے ہوئے گائے پر گنگا جل کے چھینٹے دینے لگے۔ تھوڑا سا گنگا جل گائے کی پونچھ پر لگایا۔ اور دودھ دوہنے بیٹھ گئے۔ صبح سے دو دفعہ دودھ دوہا جا چکا تھا۔ تھنوں میں ہاتھ لگاتے ہی گائے نے پچھلا پاؤں جھٹکا اور بھانڈا لڑھک کر دور جا پڑا۔ پنڈت اونکار ناتھ منتر بدبداتے ہوئے اٹھے گائے کے پٹھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چمکارا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر گائے کو پرنام کیا۔ ایک رضاکار نے بھانڈا لاکر پھر گائے کے تھنوں کے پاس رکھ دیا اور پنڈت جی دوبارہ دودھ دوہنے بیٹھ گئے۔ گائے کو پچکارتے پچکارتے تھنوں کو تھام لیا۔ گائے نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ تھوڑی دیر تک اس کے تھنوں کو سہلا کر انہوں نے جو کھینچا تو پتلی سفید دودھ کی دھار سیدھی بھانڈے میں گری۔ "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سے پورا بھرت پور گونج اٹھا۔ تقریباً پاؤ بھانڈا دودھ دوہنے کے بعد پنڈت جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ گائے کے تھنوں میں اب دودھ کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے۔ اُدھر گائے بھی دوبارہ پاؤں جھٹکنے لگی تھی۔

کچھ لوگوں نے بڑھ کر پنڈت جی کے گلے میں پھول مالائیں ڈالیں۔ پنڈت جی نے وہ ساری پھول مالائیں گائے کے گلے میں ڈال دیں۔ ایک بار پھر پنڈت جی کی جے جے کار ہوئی۔ پنڈت جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مادھو کہاں ہے؟"

"وہ اُدھر کھڑا ہے۔" کسی نے اشارہ کیا۔

مادھو اپنے شکستہ مکان کے دروازے میں حیران پریشان کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر اس قدر سختی سے جمے ہوئے تھے، لگتا تھا اب وہ قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ پنڈت جی بڑی اپنائیت سے آگے بڑھے اور مادھو کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولے۔

"دھنیہ ہو مادھو! ــــ تم اور تمہاری گائے آج پورے راشٹر کی آستھا کا پرتیک بن گئے ہیں۔"

مادھو کچھ نہ بولا۔ وہ بولتا بھی کیا۔ پوری صورت حال اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ پنڈت اونکار ناتھ اپنی رتھ گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ بیل گاڑیوں کا قافلہ نعروں کی گونج میں ڈھول اُڑاتا، شنکھ پھونکتا، ڈھول بجاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ بیل گاڑیوں کے ساتھ آئے ہوئے گاؤں والے اور چھوکرے بالے بھی واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

[illegible]

نیچے بیٹھے بیڑی اور چلم پیتے اور تمباکو چونا کھاتے ہوئے آج کے جلسوں
اور نیتا لوگوں کے دودھ دوہنے کی باتوں کو سنا کر اپنی اپنی سوجھ بوجھ
مطابق خیال آرائیاں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ مرزا تراب علی کی جھنجھلاہٹ
اور سادگی کی تعریف کر رہے تھے اور کچھ پنڈت اونکار ناتھ کے علی گڑھ
ران کی قومی اسپرٹ کے گن گا رہے تھے۔ اُدھر مادھو اپنے گھر کے دروازے
سامنے فکرمند سا بیٹھا تھا۔ آج اُس نے دوپہر کی روٹی بھی ٹھیک سے نہیں
کھائی تھی۔ بیوی نے جوار کی دو موٹی روٹیوں کے ساتھ بینگن کا ساگ پروسا
تھا۔ آدھی پیاز کی ڈلی بھی رکھی تھی مگر وہ بڑی مشکل سے صرف ایک روٹی
اور تھوڑا سا ساگ حلق سے اتار سکا۔ پھر غٹ غٹ آدھا لوٹا پانی پی کر
دھوتی سے منہ پونچھتا دہلیز میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے بندھی گائے کو غور
سے دیکھا گائے اپنے آگے پڑی خشک گھاس کی پتیوں کو دھیرے دھیرے
چبا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی بھاؤ نہیں تھا۔ مادھو کی نگاہ اُس
کے تھنوں پر پڑی۔ اُسے لگا آج اس کے تھن معمول سے زیادہ ڈھلکے ہوئے ہیں
مادھو نے اسے تشویش سے دیکھا۔ بیڑی کے دو تین کش لیے اور گھٹنوں میں سر
ڈال کر بیٹھ گیا۔ بیوی نے روٹی کھائی، بچے کو روٹی کھلائی۔ برتن سمیٹ
کر ایک طرف رکھے اور کونے میں بوریا ڈال کر بچے کو پہلو میں لیے لیٹ گئی۔
اُس نے مادھو سے اُس کی چنتا کا سبب بھی نہیں پوچھا۔ پوچھنا بھی فضول تھا۔
مادھو ایک ہی جواب دیتا "مالوم نہیں"

مادھو دروازے میں بیٹھے اپنے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے اونگھ گیا ـــ

ـــ اتنے میں چاروں طرف سے تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ جیسے زبردست
آندھی آ رہی ہو۔ مادھو کا شکستہ مکان خشک ٹہنی کی طرح کانپنے لگا۔ تھوڑی
ہی دیر میں اُس نے دیکھا کہ بے شمار مویشی جن میں گائیں، بیل، بھینسیں اور سانڈ
سبھی شامل تھے دندناتے چلے آ رہے ہیں۔ تب اُسے پتا چلا کہ دراصل وہ آندھی
نہیں تھی بلکہ اُن جانوروں کے دوڑنے کی دھمک سے زمین کانپ رہی ہے۔ مگر
یہ کیا؟ اُن جانوروں میں سب سے آگے اس کی گائے تھی۔ اُس کی آنکھیں اُبلی ہوئی
تھیں، نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے، اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ وہ سر کو جھکائے
دونوں سینگیں آگے کیے سیدھے اُسی کی طرف دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ گویا صرف
ایک ہی ٹکر میں اُسے دھرتی کے دوسرے سرے پر اُچھال دے گی۔ وہ گھبرا
کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا مگر
گائے کی رفتار میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ گائے قریب آتی جا رہی تھی
قریب اور قریب ـــ مارے خوف کے اُس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ
نکل گئی۔ اچانک اسے جھٹکا لگا اور اس نے کھانستے ہوئے آنکھیں کھول
دیں۔ سامنے گائے اسی طرح کھونٹی سے بندھی، دُم سے مکھیاں اڑاتی آہستہ آہستہ
منہ چلا رہی تھی۔ مادھو نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھ
کر انگلیوں کی جھری میں سے منہ میں بھر آئے لعاب کو 'پچ' سے تھوکا۔

اچانک اسے ایک بار پھر لوگوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے
کسی متوحش جانور کی طرح ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ نعروں کی آواز قریب آتی جا رہی
تھی۔ تبھی اُس نے دیکھا کہ گاؤں کی اُس اکلوتی سڑک پر ایک اور جلوس چلا آ رہا ہے۔
آگے آگے کوئی شخص دھوتی کرتا پہنے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالے چل رہا تھا اور
اُس کے پیچھے کچھ لوگ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہے تھے۔ چند لمبے بالوں اور
دُبلے جسموں والے نوجوان کسی چالو فلم کی دُھن پر ناچ بھی رہے تھے۔

مادھو ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ جلوس والے اُس کے گھر کے سامنے آکر رُک
گئے۔ دھوتی کرتے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مادھو کو پرنام کیا اور اپنے زردی
مائل دانتوں کی نمائش کرتا خواہ مخواہ ہی ہی کرنے لگا۔ پھر بولا۔

" مادھو بھائی! میرا نام بابو راؤ ہے۔ گریب لوگوں کی سیوا کے واسطے الیکشن
میں کھڑا ہوں۔ میں بھی پہلے تمہارے مافک گریب تھا۔ ابھی اپنے کو بھگوان نے
دو پیسہ دیا ہے۔ پن میں گریبی کو نہیں بھولا ـــ گریب ہی گریب کے کام آتا ہے
یہ پیسے والے ایک نمبر کے حرامی ہوتے ہیں۔ گریب کا لہو چوستے ہیں۔ سالے جونک
ہوتے ہیں جونک ـــ میں نے سنا ہے میرے سے پہلے ادھر دو نیتا لوگ آکر گئے!
تمہاری گائے کا دودھ بھی نکالا۔ دونوں پاکھنڈی تھے۔ کھالی دودھ نکالنے سے
کوئی بھلا نہیں ہو جاتا۔ ارے میں تو بچپن سے گئو ماتا کی سیوا کرتا آیا ہوں۔ اُس کا
گوبر اٹھانا، اُسے نہلانا، اس کا دودھ نکالنا اپنی گھٹی میں پڑا ہے ـــ یہ ہی
اپنا کام ہے۔ دودھ کیسے نکالا جاتا ہے میرے سے پوچھو۔ مادھو بھائی میرے کو
اپنی گائے کا تھوڑا دودھ نکالنے دو ـــ"

مادھو نے ترنت بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بھگوان کے لیے ـــ اب اور نہیں ـــ گائے کے تھن میں
اب ایک بوند بھی دودھ نہیں ہے۔ میں اب اُسے ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔"

" مادھو بھائی! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے تمہاری گائے
کا دودھ نہیں نکالا تو بڑی بے اجتی ہوگی کیوں کہ وہ لوگ دونے تمہاری گائے
کا دودھ نکالا ہے۔ میں تھوڑا سا نکالوں گا جیادا نہیں ـــ مادھو بھائی!
گریب کی اجت گریب کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" مادھو نے بہت منع کیا مگر بابو راؤ
ہاتھ جوڑ جوڑ کر ایک ہی بات دہراتا رہا۔ "گریب کی اجت گریب کے ہاتھ میں ہے۔"
بابو راؤ کے ساتھیوں نے بھی مادھو کو سمجھایا۔ دو چار اُسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ہر
کوئی اُسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بار بار منع کر رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا،

[باقی صفحہ ۱۲ پر دیکھیے]



## بشیر بدر

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو
ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دوسرا بھی ہو

تو جانتا نہیں مری چاہت عجیب ہے
مجھ کو منا رہا ہے کبھی خود خفا بھی ہو

اس کے لئے تو میں نے یہاں تک دعائیں کی
میری طرح کوئی اسے چاہتا بھی ہو

تو بے وفا نہیں ہے مگر بے وفائی کر
اس کی نظر میں رہنے کا کچھ سلسلہ بھی ہو

پت جھڑ کے ٹوٹتے ہوئے پتوں کے ساتھ ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا یہ آسرا بھی ہو

اتنی اندھیری رات میں کس کو صدائیں دوں
ایسا چراغ دے جو کبھی بولتا بھی ہو

چپ چاپ اس کو بیٹھ کے دیکھوں تمام رات
جاگا ہوا بھی ہو کوئی سویا ہوا بھی ہو

◆

عظمتیں سب تری خدائی کی
حیثیت کیا مری اکائی کی

میرے ہونٹوں کے پھول سوکھ گئے
تم نے کیا مجھ سے بے وفائی کی

سب مرے ہاتھ پاؤں لفظوں کے
اور آنکھیں بھی روشنائی کی

اک برس زندگی کا بیت گیا
تہہ جمی ایک اور کائی کی

میری پلکوں کو سی دیا اس نے
یہ برائی نہیں، بھلائی کی

... میرٹھ، یوپی

## محمد علوی

◆

کیوں نہ مہکیں گلاب آنکھوں میں
ہم نے رکھے ہیں خواب آنکھوں میں

رات آئی تو چاند سا چہرہ!
لے کے آیا شراب آنکھوں میں

دیکھو ہم اک سوال کرتے ہیں
لکھ کے رکھنا جواب آنکھوں میں

اس میں خطرہ ہے ڈوب جانے کا
جھانکیے مت جناب آنکھوں میں

کبھی آنکھیں کتاب میں گم ہیں
کبھی گم ہے کتاب آنکھوں میں

کوئی رہتا تھا رات دن علوی
انہی خانہ خراب آنکھوں میں

● ۹ سمیر سوسائٹی، سرکھیج، احمد آباد (گجرات)

### "جنم دن"

سال میں اک بار آتا ہے
آتے ہی مجھ سے کہتا ہے
"کیسے ہو
اچھے تو ہو
لاؤ اس بات پر کیک کھلاؤ
رات کے کھانے میں کیا ہے
اور کہو کیا چلتا ہے"
پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا ہے
پھر گھڑی دیکھ کے کہتا ہے
"اچھا تو میں جاتا ہوں

پیارے اب میں
ایک سال کے بعد آؤں گا!
کیک بنائے رکھنا
ساتھ میں مچھلی بھی کھاؤں گا"!

اور چلا جاتا ہے!
اُس سے مل کے
تھوڑی دیر مزا آتا ہے!
لیکن پھر میں سوچتا ہوں
خاص مزا تو تب آئے گا
جب وہ آکر
مجھ کو ڈھونڈتا رہ جائے گا!!



ہرچرن چاولہ

MOLIEFARET-50 A, 0750, OSLO-7. (NORWAY)

# آؤ ادیب بنیں

دلی سے میرے ایک دوست نے لکھا ہے "میرے اندر ایک فنکار کے پھریرے کلبلانے لگے ہیں۔ مجھے صلاح دو کہ میں آرٹ کی کون سی لائن اختیار کروں" اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ مجھے ناچ، گانے یا اداکاری وغیرہ اور اُن سے ہونے والی آمدنی یا مشکلات کا کوئی اندازہ یا تجربہ نہیں۔ ہاں تھوڑا سا پینٹنگ کا تجربہ ضرور ہے۔ دراصل یہ تجربہ جیسا کسی اور پر اور دیکھا بھالا خود میرا اپنا ہے۔

آج سے دس سال پہلے جرمنی میں میرے ایک دوست پینٹر تھے۔ نام تھا گنگو۔ مگر اس سے پہلے کہ لفظ "تھے" کو سن کر آپ انہیں مرحوم قرار دے دیں۔ ایک واقعہ سن لیجئے۔ پچھلے دنوں یہاں ناروے سے انڈیا جاتے ہوئے میں نے راستے میں فرینکفرٹ اسٹاپ اوور لیا تھا۔ وہاں میرے ایک دوست مسٹر خان کی ایجنسی ہے۔ ان کے ہاں اکثر میری اور گنگو کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ وہاں جو رکا تو پرانی یادیں ذہن کی سطح پر ابھر آئیں اور میرے قدم مسٹر خان کے دفتر کی طرف اٹھ گئے۔ وہاں ان سے گنگو کا اتہ پتہ دریافت کیا تو کہنے لگے: "وہ تو گزر گئے۔"

اس سے پہلے کہ یہ المناک خبر میرا چہرہ بگاڑ دیتی۔ میں نے خان صاحب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ تاڑ لی۔ سنبھل کر دوبارہ پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

بولے: "ایک بڈھی میم سے پھنس گئے تھے۔ وہ انہیں امریکہ لے گئی ہے۔ اس لئے کہا تھا کہ انتقال فرما گئے۔"

میری سانس میں سانس واپس آئی۔ دراصل جرمنی چھوڑنے اور ناروے منتقل ہونے کے بعد مجھے اُن کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ یہ سن کر کہ اُن کی روٹی روزی کا وسیلہ بن گیا۔ میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

جرمنی میں گنگو نے اپنی پینٹنگس کی کئی نمائشیں کی تھیں اور خوب واہ واہ سمیٹی تھی مگر روپے پیسے کا کوئی بھی پیسہ کبھی بھی ان کے قریب تک سے نہیں گزرا تھا۔ بس نقلی زیورات کی فروخت سے بڑی مشکل سے رنگوں کی قیمت جٹا پاتے تھے۔ اور روٹیاں میرے ہاں چرتے تھے۔ آدمی غیرت مند تھے۔ حق نمک ادا کرنے کو ایک دن بولے۔ چاولہ صاحب۔ آپ کا پورٹریٹ بناؤں گا۔ مجھے پتہ تھا۔ وہ میرا پورٹریٹ نہیں، مرغا بنائیں گے مگر مجھے اُن کا دل رکھنا مطلوب تھا ورنہ غائب ہو جاتے تو دو تین دن بھوکے مرتے پھرتے اور مجھے ہی انہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لانا پڑتا کہ کہیں ونسنٹ خان گوگو وقت سے پہلے دنیا نہ چھوڑ جائے۔ شاید یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیدرلینڈ کا عظیم پینٹر خان گوگ اپنی ساری زندگی میں اپنے فن سے ایک پیسہ تک نہ کما سکا اور اپنے بھائی تھیو (THEO) کی مالی مدد سے زندگی کی گاڑی گھسیٹتا رہا۔

طوعاً کرہاً مجھے تین دن گنگو صاحب کے رُو برو بیٹھنا پڑا تھا اور میری جو تصویر انہوں نے بنائی تھی وہ راجستھان گھرانہ کا کوئی سات آٹھ سو سال پرانا شاہکار تو معلوم ہوتی تھی مگر ہرچرن چاولہ ہرگز نہیں لگتی تھی۔

میری رائے کے خواہشمند میرے دلی والے دوست نچلے متوسط طبقہ کے عام سے آدمی ہیں۔ اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں غلط راہ نہ پڑ جائیں کیونکہ وہ باز آنے والے شخص نہیں ہیں۔ اس لئے بہتر ہے میں خود ہی انہیں آسان راستے پر ڈال دوں۔ چل پڑے تو چل نکلیں گے۔ رہ گئے تو لگے گا جیسے وہیں کھڑے تھے۔ وقت ہی اُن کے قدموں تلے سے سرکتا جا رہا تھا۔ کم از کم دوسری لائنوں کے دھکوں اور فضول خرچیوں سے بچیں گے۔ جو رائے میں انہیں دینے جا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں اس سے بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے جو بیوی بچوں، رشتہ داروں اور مخلص دوستوں کے ہزار سمجھانے کے باوجود آرٹ کی کسی لائن میں کودنا ہی چاہتے ہیں تو کیوں نہ میں ہی ایک صلاحِ عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے، قسم کا ایک مضمون ہی لکھ دوں۔

تو پھر اٹھائیے ایک کاغذ۔ کاغذ کوئی سا بھی ہو سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی ٹائپ کرنی پرزہ تھا۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ گاندھی جی ڈاک سے آئے لفافوں کو پھاڑ کر ان کی پچھلی طرف کورا کاغذ استعمال کرتے تھے۔ کسی اخبار کا کوئی حاشیہ کونہ یا گھر میں آئے سامانِ خوردونوش کا خاکی لفافہ بھی اس کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر جیب اجازت دے تو کوئی رف سی سستی کاپی بھی آپ خرید سکتے ہیں۔ دوسری چیز بس ایک

آپ کو درکار ہو گا۔ لیجئے! آپ پلک جھپکتے ادیب، شاعر یا رائٹر بن گئے۔

کیسے بن گئے؟ آپ میرا منہ چڑاتے ہیں۔ قلم نہیں چلتا۔ ذہن سوچ سوچ کے مردم تمام ہم پیار پیار کر کہہ رہا ہے۔ کاغذ قلم پھینکو اور آج کل دواتیں قلم کے اندر ہی ہوتی ہیں، اور جو کچھ جی سے چاہتے ہو، کر ڈالو۔ آج تک ناگوں نے کبھی آپ کو پانی کے ریک نہیں پھٹکنے دیا مگر آج آپ کا جسم آپ کو قلم دوات (نہیں معاف کرنا قلم کا مدا) کی قید سے آزاد کرانے کو تیغ بستہ پاؤں کے فوارے تلے بھی کھڑا ہونے کو تیار ہے۔ آپ کہتے ہیں کوئی موضوع ہی نہیں ہاتھ لگ رہا ہے۔ آپ میری مانیئے، گھبرایئے نہیں۔ یہی آپ کے امتحان کے چند لمحات ہیں اگر آپ ان کی تلوار کی دھار سے ایک بار گزر کر نکل گئے تو آگے ہیرے جواہرات رنگ برنگے گلزار آپ کے خیر مقدم کو آپ کے منتظر کھڑے ہیں۔

موضوع۔ لائیے اس سلسلے میں میں آپ کی انگلی پکڑتا ہوں۔ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ، اپنے پڑوسی، رشتہ دار یا دوست کی زندگی کی کوئی واردات۔ ایک کو لکھیے، دو کو لکھیے یا سب کو گڈمڈ کر کے ایک ہی کردار میں مدغم کر دیجئے۔ کوئی سر پیر ہاتھ نہیں لگتا تو گھبرایئے مت۔ بس لکھتے جایئے۔ جیسے تیسے خود پر جبر کر کے چار پانچ صفحے گھسیٹ جایئے۔ کچھ نہیں پلے پڑتا کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔ پھر بھی یقین کیجئے، آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔ اس کاغذات اٹھایئے کوئی بدرنگ پرانے کپڑے پڑے ہوں تو پہن لیجئے اور بال بکھرا کر، گریباں چاک کر کے کسی ایسے سستے سے ریسٹورنٹ یا ٹی ہاؤس میں جہاں کچھ ادبی قسم کے لوگ اکٹھے ہوتے ہوں، کے ساتھ جا بیٹھئے۔ پہلے دن، صرف پہلے دن ان کی چائے یا کافی کے پیسے خود ادا کر دیجئے۔ اور بدلے میں ان کے کانوں میں اپنی تخلیق کا گرم گرم سیسہ انڈیلئے۔ آپ کی چائے یا کافی ضرور رنگ لائے گی۔ وہ تعریف کریں یا نہ کریں مگر خاموش ضرور رہیں گے۔

اپنی دوسری تخلیق یا کہانی، جو کچھ بھی وہ ہے۔ پر انہیں چائے پلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنا پیالہ اٹھایئے اور بلا اجازت اس کی ٹیبل پر جا دھمکئے۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ کی پہلے دن کی چائے آپ کو ان کے ساتھ بیٹھنے کا لائسنس دلوا چکی ہے۔ اب کوئی قسمت کا مارا آپ سے پوچھ بیٹھے کہ آپ نے اور کیا لکھا ہے تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ فوراً دوسری تخلیق نذر کیا ہے، کہہ کر شروع ہو جایئے۔ اول تو آپ کی اسی دوسری نظم یا نثر پر تنقید شروع ہو جائے گی ورنہ تیسری کا پیچ نکلنا تو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ آپ کی چیز کو اگر وہ محض ایک فضول سی چیز قرار دے رہے ہوں تو آپ ہونٹوں پہ مسکراتے رہیئے۔ تنقید کرنے والوں میں اگر کوئی آپ کو آپ سے کمزور نظر آئے تو اسے نشانہ بنا لیجئے۔ اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لئے اپنی بات میں ہونٹوں میں اس کے لئے ایک آدھ گالی بھی شامل کر لیجئے۔ مثلاً اسے کہئے۔ آپ کا دماغ تو گدھے کا سا ہے یا آپ کے ذہن میں تو بھُس بھرا ہے۔ خیال رہے کہ آپ کی منتخب گالی کھانے والے کے معاملے میں بالکل پرفیکٹ ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دے مارے اور آپ کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

یہ سچ ہے کہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ میں بہت دیر بعد اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پہلے کہتا تو آپ دل ہار کر بیٹھ جاتے۔ اس سے دماغ کی چولیں ہل کر رہ جاتی ہیں۔ اب آپ اپنی دماغی چولیں بھی سلامت رکھنا چاہتے ہیں اور نام و نمود کے بھی خواہاں ہیں تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑا لکھ کر بھی شور بہت مچایئے جیسے آپ کے قلم سے کوئی ماسٹر پیس چیز تخلیق ہو گئی ہے جو عنقریب آپ کو نوبل پرائز نہیں تو گیان پیٹھ ضرور دلوانے والی ہے۔ کچھ دن پہلے اپنے سے کمزور جس شخص کو آپ نے گالی دی تھی سب کے سامنے اسے یہ بھی ذہن نشین کرا دیجئے کہ آپ کی تحریر اتنی جدید ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے اگلے جنم تک انتظار کرنا پڑے گا۔ خبردار۔ آپ اپنی تخلیق کو سمجھانے یا تشریح کرنے مت بیٹھ جایئے۔ بس یہی رٹ لگانے جایئے کہ غالب کی شاعری کی طرح آپ کو سمجھنے والا قاری اگلی صدی میں جنم لے گا یعنی کہ آپ نے ایک صدی آگے کی بات کہہ دی ہے۔ معترض اگر عمر رسیدہ بزرگ ہو تو لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے اگلے وقتوں کے لوگ، کہہ کر ایک طرف ڈال دیجئے۔ کہئے کہ یہ آپ سے بہت آگے کی چیز ہے اور آپ کی ٹانگیں اتنی کمزور ہیں کہ بقایا تمام زندگی بھی اگر آپ بھاگتے رہیں تو بھی اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔

جیب اجازت دے تو ایک آدھ چمچہ بھی خرید کر ساتھ رکھئے جو آپ کی ہاں میں ہاں ملائے اور آپ کی ہر بات پر واہ واہ کرے، مسکرائے اور کبھی کبھی زور زور سے ٹھاہ ٹھاہ ہنسے اور تالیاں بجائے۔ موقعہ دیکھ کر بغلیں بھی بجا سکتا ہے۔ ایک پتے کی بات اور بھی بتاتا ہوں، ہمت ہو تو کسی ایسے بڑے نقاد کی گردن سب کے سامنے ناپ ڈالیے۔ اب آپ کی محفل میں اس کی بولتی بند رہے گی اور لوگ سمجھیں گے جب اتنا بڑا نقاد آپ کے سامنے دم نہیں مار سکتا تو وہ کس باغ کی مولی ہیں اور یہ چیز آپ کے حق میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ بہت بڑے ادیب تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرا کار آمد گر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے کسی بڑے نقاد کی پندرہ بیس آدمیوں کے سامنے پگڑی اچھال دیجئے اور اکیلے یا اپنے چمچے کے ساتھ اس کے گھر یا کسی اور اکیلی جگہ اس کے قدموں میں اپنی پگڑی ڈال کر معافی مانگ لیجئے۔

آپ کی یہ ادا ان کے ساتھ آپ کی ساری زیادتیاں معاف کر دے گی۔ اور وہ آپ سے خوف زدہ بھی رہیں گے۔ اور ہو سکتا ہے آپ کی تحریر کے حق میں یہ بیان بھی دے دیں کہ "میں حیران ہوں، ایسی لاجواب تخلیق کو ساہتیہ اکیڈمی نے اب تک کیوں نظر انداز کر رکھا ہے"

اگر آپ کے والد بزرگوار کافی پیسہ چھوڑ کر تازہ تازہ پرلوک سدھارے ہیں تو پھر آپ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو خرید بھی سکتے ہیں دنیا کے بازار میں ہر چیز قابل فروخت ہے۔ بس ذرا قیمت جُدا جُدا ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ بکنے والے کا منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں یا چچا سام کی طرح تیل بیچنے والے ملکوں کے تیل کی قیمت خود مقرر کرتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست BEST SELLER ناول نگار تھے۔ فلموں کے لئے بھی کہانیاں لکھتے تھے۔ اُن کی کسی فلمی کہانی پر ایک چھوٹے سے غریب افسانہ نگار نے مقدمہ دائر کر دیا کہ ان کی کہانی ان کے فلاں افسانے کا چربہ تھی۔ ہمارے دوست معروف ترین ناول نگار نے ایک دو پیشیاں تو کسی نہ کسی طرح بھگت لیں مگر پھر روز روز کی کچہریوں کی دوڑ دھوپ سے تنگ آ گئے۔ ایک دن ایک پیپر بیک انگریزی ناولٹ ساتھ لے گئے اور مجسٹریٹ سے کہا۔ صاحب یہ کتاب میں نے بمبئی کے ایک فٹ پاتھ سے آٹھ آنے میں خریدی تھی۔ اس کا پہلا صفحہ پھٹا ہوا ہے۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ اس کا مصنف کون ہے مگر میں نے اپنی کہانی اِس ناولٹ سے اخذ کی ہے۔ اب آپ ان صاحب سے پوچھئے کہ ان کا افسانہ کہاں سے چُرایا ہوا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ مقدمہ جیت گئے۔ امید ہے آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔

ایک اور موضوع پر بھی آپ طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ تاریخ ایسی چیز ہے کہ اس کے جسم پر جہاں بھی چھری پھیریئے۔ اُف تک نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے کوئی فلم ساز آپ کی کاوش پر فریفتہ ہو جائے اور آپ کا نام سکرین پر بھی جلوہ افروز ہو جائے۔ لوگ مغلِ اعظم اکبر کو کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں۔ کوئی تاریخ دان اُس کے خلاف بولتا بھی ہے تو واہ واہ کے شور میں اُس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔

آپ اپنی زندگی کے حالات پر بھی قلم اُٹھا سکتے ہیں۔ آخر کار یہ حالات تو سب کے ساتھ ہوتے ہی ہیں۔ عنوان ایسا چبھتا ہوا ہونا چاہئے کہ پڑھنے والے کی واہ نکل جائے (پنجابی میں واہ نکلنا کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں) یوں بھی نکل سکتی ہے یہ آپ کے اندازِ تحریر اور لب و لہجہ پر منحصر ہے۔

لکھنے کی ایک اور صنف، جو بہت آسان ہے۔ وہ ہے سفر نامہ۔ سفر کیجئے! ویسے بھی سیانوں نے کہا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ عجیب و غریب جگہوں کو دیکھئے۔ اُن کے متعلق اکثر خود آپ کے اپنے ملک میں وہاں کی ایجنسیوں اور ٹورسٹ سنٹروں سے بہت سے بک لیٹ مل جاتے ہیں۔ انہیں جمع کرتے جائیے۔ ٹرین، بس، جہاز، ہر جگہ لوگوں سے باتیں کیجئے۔ اگر چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر ساتھ رکھ سکیں تو سب کی باتیں ریکارڈ کر لی جائیں پھر انہیں کاغذ پر منتقل کر لیجئے۔ آپ کی باتیں تبا [illegible]

اور جب ان کا بٹن آن ہو جائے تو ان کی ٹاک کو نوٹ کرتے جائیے۔ بعد میں اپنے خاص خاص لفظوں کے گرم مسالے کی دُھونی دے کر کاغذ پر اتار لیجئے۔

آپ کے کسی مدّاح کے دل میں آپ کے لئے کوئی کمزور پہلو ہو تو اُسے پکڑ لیجئے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ آپ کے سفر کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لے۔ اور اگر وہ کہیں فارن میں رہتا ہو تو سمجھئے کہ آپ کی چاروں گھی میں ہیں (اور سر کڑاہی میں)۔ اپنے صفر قسم کے خراب خراب سفر کو، جو آپ نے ایسے میزبان، بے زبان کے لئے دردِ سر رہا ہو اور جس نے آپ کے تمام سفر میں ساتھ ساتھ سفر (انگریزی SUFFER) کیا ہو 'خاک خاک سفر' کا عنوان دے دیجئے۔ انشاء اللہ آپ کا بہت فائدہ ہو گا۔ میزبان کے کندھے کے بعد اگر کوئی اگلا مضبوط اور کارآمد کندھا نظر آ جائے تو میزبان کو گولی ماریئے۔ اُس کے کندھے پر پاؤں رکھ کر اگلے کندھے پر کود جائیے۔ میرا اعتبار کیجئے۔ کندھے بدلتے رہنا آپ کے لئے بہت مفید ثابت ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کوئی اگلا مضبوط کندھا آپ کے لئے 'نانک نام جہاز ہے' بن کر آپ کو ادب ساگر سے کنٹھوں سے پہلے اتار دے۔

کندھے بدلنے سے پہلے میری ایک اور نصیحت پلے باندھ لیجئے اگر اگلا کندھا آپ کو کافی مضبوط اور کارآمد نظر آتا ہو اور اس کے مالک کی ناک طوطے کی چونچ جیسی یا قطب مینار جیسی ہو تو خدارا 'اپنے ہی بھلے کے لئے اپنی حسِ مزاح کو کنٹرول کیجئے' اور کہیں اُن سے یہ نہ کہہ دیجئے۔ صاحب آپ کب تک یہاں تشریف رکھیں گے دراصل مجھے کھونٹی کی ضرورت تھی۔ سوچا تھا آپ کی ناک شریف پر اپنا کوٹ ٹانگ کر ذرا اُدھر شاپنگ کر آؤں بلکہ اُس کی ناک کی وہ وہ تعریف کیجئے کہ بڑے بڑے فلمی ایکٹروں اور سیاسی لیڈروں کی ناکیں ان کی ناک کے آگے پانی بھرتی محسوس ہونے لگیں۔

میں مانتا ہوں اور آپ بھی ضرور مانتے ہوں گے کہ انگریزی کا ادیب بننے کے لئے انگریز یا کرسچن ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح دوسری زبانیں بھی کسی خاص مذہب سے نہیں جوڑی جا سکتیں مگر کچھ لوگ مانتے ہیں۔ اگر آپ کی غرض اِن لوگوں سے وابستہ ہو گئی ہے تو اُن کا مذہب زبانی زبانی آدھا یا پورا اپنا لیجئے اور ان کے پسندیدہ ہیرو، چاہے وہ فلمی ہو یا سیاسی کو ابا جان تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ان سے کہئے کہ میں تو صبح سویرے مالا بھی اُسی کے نام کی جپتا ہوں کیونکہ میں بھگوان سے زیادہ اس کے بھگتوں میں یقین رکھتا ہوں اس لئے آپ پر بھی دل و جان سے فدا ہو گیا ہوں کیونکہ آپ بھی تو اُن کے متوالے ہیں۔ شخص پسند کرنے کو اگر کسی بے پروا چیز سے خوشبو محسوس ہوتی ہو تو آپ اس چیز کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے [illegible]

دیا کرتی تھی۔

سفرنامے میں خود کو ہیرو دِکھائیے۔ آپ اگر گنجے ہیں تو دنیا بھر کے تمام بڑے بڑے گنجے لوگوں کا اپنے سفرنامے میں جگہ جگہ حوالے دیجئے اور ثابت کر دیجئے کہ دنیا گنجوں کے سہارے ہی چل رہی ہے کیونکہ دونوں کی گولائیوں کو ایک دوسرے سے قریبی نسبت ہے۔ اگر آپ ٹھگنے ہیں تو دنیا کی تاریخ بدلنے والوں میں سینکڑوں آپ کو ٹھگنے بھی مل جائیں گے مثلاً نپولین بوناپارٹ کا نام اس سلسلے میں سرِ فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی ایک ٹانگ میں تھوڑا سا لنگ ہے تو تیمور لنگ سے رشتہ جوڑ کر خود کو کسی دوسری طرف سے (دانش وری کی طرف) بہت بڑی ہستی ثابت کر سکتے ہیں۔ لکھیے کہ خدا ایک کمی دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی کسی نہ کسی طرح پورتی بھی ضرور کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ سفر میں اپنے جیسے نقص والے بڑے لوگوں سے ضرور ملئے۔ ہو سکے تو سفرنامے میں اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی سکینڈل بھی ضرور جوڑ لیجئے۔ ویسے کوئی جھوٹا افسانہ بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ کون سات سمندر پار آپ کی بات کی تفتیش کرنے جا رہا ہے۔ گپ ہانکیے کہ ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی حسینہ آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی رہتی ہے۔ اپنی کتاب میں وہاں کی قابلِ دید عمارتوں خوبصورت نظاروں اور حسین لڑکیوں کی تصویریں، جو آپ جگہ جگہ اپنے، یا اپنے میزبان کے کیمرے سے لیتے رہے ہوں، ضرور شامل کیجئے۔ اگر آپ خود بھی جوان اور خوبصورت ہیں تو پھر اپنی تصویریں بھی اور خاص طور پر ایسی نازنینوں کے ساتھ اپنی کتاب میں ضرور شامل کیجئے۔ اور اگر آپ بڈھے کھوسٹ، گنجے، ٹھگنے، بدصورت اور دو دو ٹھوڑیوں والے ہیں تو اپنی جوانی کی کوئی اچھی سی تصویر کتاب میں کسی دوسری جگہ چھاپ سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ آپ کی بڑھاپے کی تصویر کسی حسینہ کے ساتھ آپ کی کتاب میں نہ چھپ جائے ورنہ آپ کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹنے کا میں ذمہ دار نہیں ہوں گا کیونکہ اپنے طرزِ بیان میں آپ اس قدر جوانی لاتے رہے ہیں کہ پڑھنے والوں نے آپ کو جوان گبرو سمجھ لیا ہے (ان میں پڑھنے والیاں بھی ہو سکتی ہیں) ویسے بھی قارئین کی نظر میں ہر ادیب و شاعر جوان اور خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ وہ بھگوان کی طرح نظر نہیں آتا اور اسے حتی الامکان نظر آنا بھی نہیں چاہئے، بلکہ اپنے مظاہر میں جلوہ افروز رہتا ہے۔

سفرنامہ جب مکمل ہو جائے تو پہلا کام یہ کیجئے کہ اپنی کتاب اُسی مُرغے کے نام انتساب کر دیجئے وہ آپ کی مٹی کو نگونا نہ کہے اور نہ کھلوائے تو جو را جو ر کی وہ میری۔ ہو سکتا ہے آپ کی کتاب کے افتتاح پر نہ صرف ہزار روپئے خرچ کر دے بلکہ آپ کو رسم کا دولہا بھی بنا ڈالے۔

لیجئے۔ پہلا میدان تو سر ہوا۔ اب دوسرا یوں کیجئے کہ جس نقاد کے کبھی آپ قدم لیتے رہے تھے۔ اب ان کے پاؤں پکڑ لیجئے اور کہیے کہ نجانے کس پیر کی دعا سے آپ کے قلم سے کوئی ایسی چیز تخلیق ہو گئی ہے کہ جو گیان پیٹھ نہیں تو کم از کم ساہتیہ اکیڈمی کی تو ضرور حقدار ہے۔ اگر نقاد آپ کی کتاب کی تعریف لکھ لکھ کر آپ کو انعام دلوائے تو زہے نصیب اور اگر ذرا رُخ پھرتا نظر آئے تو پھر اپنی لائن پہ آ جائیے اور اُسے ایسے لتاڑئیے، ایسے لتاڑیے کہ اس کی چیں بول جائے۔ جگہ جگہ، ہر محفل، ہر دوست اور ٹی ہاؤس یا ریسٹورنٹ میں چلائیے اور مہم چلائیے کہ آپ اُس نقاد جلاد کو کیا سمجھتے ہیں: کہئے کہ ان لوگوں نے کس کو بخشا ہے جو مجھے چھوڑتے۔ ثبوت کے لئے ادب کی تاریخ میں آپ کو ایسی کئی سچی مثالیں مل جائیں گی۔ بس ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنے کا آپ کو گُر آنا چاہئے۔ اس طرح آپ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو رہیں گے۔ یعنی انعام ملتا ہے تو ٹھیک نہیں ملتا تو بھی آپ کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ کئی دفعہ انعام پانے سے، انعام ٹھکرانے سے بھی کافی شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔

اپنے سفرنامے سے ایک فائدہ آپ اور بھی اٹھا سکتے ہیں جو ان چیلنج ایبل ہے۔ آپ خود کو اپنے دیش میں اس ملک پر اسپیشلسٹ قرار دے سکتے ہیں اور جگہ جگہ محفلوں اور رسالوں میں اس ملک کی کتابوں یا ٹورسٹ پمفلٹوں سے اخذ کر کے مضامین لکھ سکتے ہیں۔ چاہے وہاں آپ ہوٹل یا میزبان کے گھر سے گلی کے نکڑ والی دکان تک کا راستہ بھی ہر روز بھول جاتے رہے ہوں۔

ادیب بننے کی ایک آسان شق فلم لائن میں ڈائیلاگ یا کہانی لکھنے کی بھی ہے مگر میرے ایک دوست اپنا ہر سال فری ریلوے پاس بمبئی کا چکر لگانے میں استعمال کرتے تھے۔ وہ بہت اچھا لکھ لیتے تھے کم از کم پہلے فلم لائن میں چلے ہوئے لوگوں سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ سالوں ہر فلمی مکالمہ نگار اور کہانی کار کی چاپلوسی کرنے کے باوجود فلمی درخت کی کسی بھی ٹہنی پر پاؤں نہ ٹکا سکے۔ کاش وہ جانتے کہ بمبئی کی فلم لائن میں گھس بیٹھ کے لئے ہاتھ جوڑنے نہیں، ہاتھ مروڑنے پڑتے ہیں۔

اگر چہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ تخلیقی کام آپ کے بس کا نہیں تو مترجم بن جائیے۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر فرق صرف یہ ہے کہ یہ کام تھوڑی بہت محنت سے کوئی بھی شخص کر سکتا ہے جب کہ شاعر یا ادیب بننا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں کیونکہ یہ ایک خداداد وصف ہے۔

اگر خوش قسمتی سے کوئی دو زبانیں آپ کو گزارے موافق آتی ہیں مگر ان دونوں زبانوں کے بولنے والے ایک ندی کے دو کناروں سے ملنے سے مجبور ہی کی طرح ہیں تو آپ کے پو بارہ ہیں۔ کون موازنہ کرنے جا رہا ہے۔ گورمکھی سے ملیالم، تامل سے بنگالی، فرنچ سے آسامی، کسی ایسی زبان سے ویسی زبان میں ترجمہ کریں گے تو کوئی بھی آپ کے

کام میں کیڑے نکالنے والا دُوردُور تک کہیں نظر نہیں آئے گا اور جس ادیب کی کہانی آپ ترجمہ کریں گے وہ آپ سے اتنا خوش اور احسان مند ہوگا کہ اپنا معاوضہ بھی آپ کے نام لکھ دے گا۔ ترجمہ کے لئے کسی بھی ادیب کی کوئی بھی چیز چُن لیجئے۔ کوئی بھی ادیب ناراض نہیں ہوگا یا منع نہیں کرے گا بلکہ چھپنے کے بعد ایک اندھے کی طرح اپنے نام پر انگلیاں پھیر پھیر کر خوش ہوتا اور آپ کو دُعائیں دیتا رہے گا۔ اب آپ کے اندر واقعی اگر کوئی ادبی کیڑوں نے جنم لیا ہے تو وہ ترجمے کی حوراک سے جوان ہو کر ادب کی کسی صنف کا چسکہ ضرور لگا دیں گے۔

تخلیق اور ترجمہ بھی اگر آپ کے اپنے بس کا روگ نہ لگے تو اپنے نام کو جلی حروف میں چھپا ہوا دیکھنے کے دو طریقے اور بھی ہیں۔

طریقہ نمبر ایک: — ایسا کیجئے کہ کوئی رسالہ نکال لیجئے۔ اس کے لئے آپ کو جمع کرنے کا گُن آنا چاہئے یعنی آپ کو مُرتّب اچھا ہونا چاہئے۔ اس کے لئے کچھ اچھے رسالوں کی نقل کر لینی چاہئے مگر نقل میں بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے اگر آپ اس گُن سے بھی محروم ہیں تو ہر کوئی تو نہیں، کسی سستے، مگر اچھے مددگار کو تلاش کر لینا چاہئے۔ اس کام کے لئے آپ کو زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کئی کم پڑھے لکھے کامیاب ایڈیٹر ہوتے، ہم نے دیکھے ہیں۔ اگر آپ کا ایڈیٹوریل کسی کے پلے نہیں پڑتا تو وہی ہمارا مندرجہ بالا فارمولا آزمائیے اور کہئے کہ آپ کا ایڈیٹوریل بہت زیادہ عالم فاضل اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تحریر کیا گیا ہے۔ آپ کا یہ جواب ہر شخص احمق کہ اپنے سے دس گُن زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار شخص کے لئے بھی ہونا چاہئے۔ ہوگا یہ کہ وہ آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دے گا اور یہی آپ کی کامیابی ہوگی۔ اپنے سے کم تر اور قابل تر دونوں پر آپ کا رعب رہے گا۔ اگر آپ سرے سے ایڈیٹوریل لکھنا جانتے ہی نہیں تو اس کے لئے کئی لکھنے والے قلم گھسیٹ کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور اُس کے نام کی بجائے ادارہ یا ایڈیٹوریل سیکشن کا لفظ لکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اپنا نام بھی دے ڈالیں تو بکا ہوا شخص کیا اعتراض کر سکتا ہے۔ آپ کا رسالہ اگر سال ڈیڑھ تک آرام سے نکل جاتا ہے تو باہر کے کچھ ممالک کی حکومتیں سالانہ مالی مدد بھی فراہم کرتی ہیں جو پھر باقاعدگی سے ہر سال ملتی رہتی ہے مگر خبردار، ہوشیار۔ مدد ملتے ہی کبھی شور مچانا مت شروع کر دیجئے گا کہ آپ کا رسالہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے بلکہ ہمیشہ گھاٹا ہی دکھائیے۔ کاغذ، کتابت، چھپائی، پوسٹیج، مہمان نوازی، سیر سپاٹے، ٹیلی فون، حتیٰ کہ گھر کا آدھا کرایہ سب اخبار کے کھاتے میں ڈالئے مگر خبردار لکھنے والوں کو ایک پائی بھی بھول کر مت دیجئے۔ ہاں بھائی بندوں کی بات اور ہے۔ وہاں تو آپ کو لحاظ کرنا ہی ہوگا۔ اگر کوئی اچھا ادیب چھپنے کے بعد معاوضہ لینے کی ضد پر آ ہی جائے تو ایسے پوز کیجئے جیسے اُس کا معاوضہ گھاٹے میں چلنے والے رسالے سے نہیں اپنے پلے سے ادا کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں سینئر سے سینئر ادیب بھی آپ کو چندہ اپنا تعاون دے گا اور دوسرے ساتھی ادیبوں کو خدمت ادب کا درس دیتا ہوا آپ کے لئے بلا معاوضہ لکھنے کا سبق پڑھاتا رہے گا۔ ہاں اس کے معاملے میں آپ کو تھوڑا سا نرم رویہ اپنانا ہوگا۔ اگر آپ کے ادیب کو دئے گئے معاوضے کی بات آؤٹ ہو جائے تو اس کے معاوضے کی پتے سے ادائیگی کا مجموعہ ڈھنڈورہ آپ کو خوب پیٹنا ہوگا۔ چاہیں تو آپ ادیبوں کے روکے ہوئے معاوضے کی رقم سے اپنی بیوی کی کلائی میں طلائی چوڑیوں کی تعداد بھی بڑھا سکتے ہیں اور زندگی بھر بچہ پیدا نہ کر سکنے کا شوشہ چھوڑنے کے باوجود اُس کی گود میں بھی ایک بچہ یعنی ایک رسالہ ڈال کر اُس کی چھاتی پر بھی مدیرہ کا لیبل لگا سکتے ہیں (چاہے اس کی سات پشتوں میں بھی یہ کام کسی نے نہ کیا ہو) اور اسے بھی سالانہ مالی امداد دلا سکتے ہیں۔

طریقہ نمبر دو: کچھ لوگوں کے مضامین یا افسانے جمع کر کے ان کی ایک کتاب ترتیب دے کر، اپنے دیباچہ، یہی کہ آپ کو ایسی کتاب شائع کرنے کا کیسے خیال آیا (کہیں نام چھپا دیکھنے کے شوق کا اظہار نہ کر دیجئے گا) اور آپ کو اس کے لئے کن کن مشکلات و مراحل سے گزرنا پڑا، کے ساتھ اپنا نام بطور مرتب چھپا ہوا دیکھنے کی خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس سے ہونے والے تمام فوائد سے مستفید بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے مضامین، نظمیں، اشعار، غزلیں اور افسانے وغیرہ حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی کانفرنسیں اور سیمینار بھی منعقد کر والیتے ہیں جن کے لئے کئی ادارے، اُمرا اور اشتہار بازی کی بھوکی کمپنیاں، بینک وغیرہ کافی بڑی مالی مدد بھی فراہم کر دیتی ہیں۔

آپ بالکل ہی اللہ میاں کی گائے ہیں اور اوپر کا کوئی بھی نسخہ آپ کے بس کا نہیں کیونکہ ہر ایک میں کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت خرچہ یا محنت درکار ہے تو چلیے آخری سستا اور گھریلو نسخہ بھی آزما دیکھیے کم از کم میرا تو یہ اپنا آزمودہ میں ایک ادبی محفل میں اپنے افسانے سنایا کرتا تھا اور چونکہ افسانہ نظم سے کہیں زیادہ طویل ہوتا ہے۔ اس لئے سننے والے آرام سے سو جاتے تھے اور جب جب جہاں جہاں جس کی آنکھ کھلتی تھی۔ افسانہ ختم ہونے پر اُس حصے کی رگ پر انگلی رکھ کر بحث کرنے لگتا تھا جیسے پانچ اندھے ہاتھی دیکھنے گئے تھے جس کے ہاتھ میں دُم آئی تھی اُس نے اُسے رسّی بتایا تھا جس کے ہاتھ میں سونڈ آئی تھی اُس نے اسے کنواں اور جس کے ہاتھ میں ٹانگ، اُس نے اُسے کھمبا قرار دیا تھا۔ اسی طرح میرے افسانوں پر بحث ہوتی تھی۔ وہ رسّی یا کھمبا تو بن جاتا مگر ہاتھی ہرگز نہ رہتا تھا اور نظمیں لکھنے والے جمعدی شاعر خوب خوب داد سمیٹ لے جاتے تھے۔ وہ آزاد نظمیں لکھتے تھے جس کے لئے انہیں نہ کسی اُستاد کی شاگردی کرنے کی ضرورت تھی نہ اوزان یا خوبصورت لفظوں کے پیچھے تتلیاں پکڑنے والے جنگلی بچے کی طرح دوڑنا پڑتا تھا جب پانی سر سے گزر گیا اور برداشت کی حد ہی ختم ہو گئی تو آپ کا یہ خادم بھی ایک نظم لکھ کر لے گیا۔ اور یقین

جیسے کہ وہ وہ دادو ملی کہ اس کے سامنے زندگی بھر کے تمام افسانے ہیچ نظر آنے لگے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"میں اپنے باپ کی مونچھ کا وہ بال ہوں
جسے وہ اپنی غیرت کی نشانی سمجھتا ہے۔
مگر وہ نہیں جانتا کہ میں ہی اس کا بگڑے ہوئے زکام کا کارندہ ہوں
کیونکہ میں تیز ہوا ہو کر اندر اوپر کی طرف اٹھ کر
اس کی ناک کی پتلی جھلی میں گدگدی کرتا ہوں جس سے اسے چھینکیں آتی ہیں
اور اس کی ناک ایک برساتی ندی کی طرح بہنے لگتی ہے
اس کا یہی زکام بن کر
میں اس کے بالوں، آنکھوں اور دانتوں پر گرتا ہوں
تو آہستہ آہستہ اس کے بال سفید ہونے شروع ہو جاتے ہیں
آنکھوں کی دید مدھم پڑنے لگتی ہے اور دانت جھڑنے لگتے ہیں۔
وہ سمجھتا ہے وقت کا تیز رفتار پہیہ اسے بڑھاپے کی وادیوں کی طرف لئے جاتا ہے
مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ وقت نہیں

میں ہی ہوں
جو اس کی ٹہنی کی جڑ سے نکل کر اس کی جڑیں کمزور کر رہا ہے
یہ غلط ہے کہ آدمی کو زمانے کی ہوائیں اور موسم گرم و سرد مارتے ہیں

میرا خیال ہے
آدمی آدمی کو مارتا ہے اور نزدیک سے مارتا ہے۔ کمر در جگہ پر مارتا ہے۔"

آپ بھی ایسی نظمیں لکھ لکھ کر واہ وا کی ڈگریاں سمیٹ سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے ڈگری کی بروزن کوئی چھوکری بھی آپ پر فریفتہ ہو جائے ورنہ بھاگتے چور کی لنگوٹی تو کہیں نہیں گئی۔

اب آپ ہمت کیجئے اور لیکھن کی لائن میں کود جائیے۔ میرا سبق تو محض ELEMENTARY ہے۔ پانی میں گھسیئے گا تو تیرنا بھی آ جائے گا اور شاید انگلش چینل پار کر کے آپ تیرنا سکھانے والے اپنے گرو کو بھی میلوں پیچھے چھوڑ جائیں۔ آپ سمجھ گئے نا میرا مطلب یا.....

ان چند مندرجہ بالا اسباق کے باوجود اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو آدل اشادمیں نوبل انعام یافتہ نارویجین ادیب ہورن اسٹینے میورنس کے گھر پر پڑی اس کی THINKING CAP جو وہ وقت تخلیق پہن لیا کرتے تھے، پہن کر بھی آپ قلم کار نہیں بن سکتے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

(بقیہ صفحہ ۳۴۴ رشتے بے نام)

ترکش نشانے ہوئے۔

"سمیتا! میں تمہیں زبردستی نہیں روک سکتا..... لیکن یہ کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ تمہارے چلے جانے پر گھر کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

یہ سن کر اس کے چہرے کا رنگ یوں بدل گیا ہے گویا میں نے اُسے زندہ دفن کر ڈالا ہو۔ کچھ دیر میں سنبھل کر طنزاً بولی۔ "یوں کہو کہ تم اپنی غرض، اپنے سکھ کے لئے مجھے روکنا چاہتے ہو۔"

"میرے سکھ میں تمہارا سکھ بھی شامل ہے۔ ہمارا مستقبل بھی اسی میں اٹکا ہوا ہے۔ ورنہ ہمیں جذباتی نقصان کافی اٹھانا پڑے گا۔"

"ایسا تم سوچ رہے ہو، میں نہیں ـــ اس دیش میں ہزاروں جوڑے ایسے موجود ہیں، جہاں شوہر کام کی وجہ سے ایک شہر میں رہتا ہے تو بیوی کام دوسرے شہر میں، لیکن ان کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا اور شہر اعتبار سے خوش ہیں۔"

"لیکن بیوی کا مقام اس کے شوہر کے ساتھ اس کا گھر ہوتا ہے ـــ دوسرا شہر نہیں۔"

میرے ترکش سے نکلا ہوا تیر اس کے آر پار گزر گیا تھا۔ سمیتا اُٹھی۔

"تمہاری روائتی سوچ نے تمہیں ہمیشہ وقت کی رفتار سے پیچھے رکھا ہے۔ یہ تمہاری ٹریجڈی ہے۔"

"اور تمہاری ٹریجڈی جو شروع ہونے والی ہے ـ اس کا تمہیں کوئی احساس نہیں؟"

"میں بے وقوف نہیں ہوں ـ سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہی ہو۔ میری بہتری اسی میں ہے کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دوں۔"

"چاہے تمہاری شادی شدہ زندگی ختم ہو جائے؟"

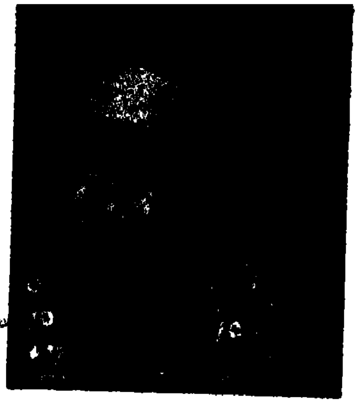
"اگر تم نے اس حد تک سوچ لیا ہے، تو ٹھیک ہے ـــ تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"

"یہ کام تم بھی کر سکتی ہو؟"

میرے لہجے کی تلخی، اس کی شدت اور اس کی کاٹ وہ برداشت نہ کر پائی تھی۔ فوراً اُٹھی، غضب ناک نظروں سے مجھے دیکھا اور پاؤں پٹکتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔ اگلے پل دروازہ بند کرنے پر اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ میرے کان بھی سن ہو کر رہ گئے۔

اور اب میں کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ بات کہاں سے نکل کر کہاں پہنچ گئی ہے اور کون جانے کہاں جا کر ختم ہوگی؟

# دوہے



## ندا فاضلی

(گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈالے کیس)

تو کاغذ میں کلپنا، تجھ میں میں سا کار
اپنی ہی تصویر کو پوجے رچنا کار

---

برکھا سب کو دان دے جتنی جس کی پیاس
موتی سی یہ سیپ میں ماٹی میں یہ گھاس

---

تو دریا کا راستہ میں رستے کی پیاس
میں ہوں تیری کھوج میں تو ہے میرے پاس

---

سا[1] سے سا تک سات سُر، سات سُروں میں راگ
اتنا ہی سنگیت ہے جتنی تجھ میں آگ

---

پنچھی بادل پھول بن، الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی، سارے رشتے دار

---

سیتا راون رام کا، کریں وبھاجن[2] لوگ
ایک ہی تن میں دیکھیئے تینوں کا سنجوگ

---

ندیا سے بادل بنے، بادل سے برسات
تو چاہے جو رُوپ لے میں ہوں تیرے سات

---

[illegible][3] [illegible]
[illegible]

---

بچہ جُھکے گود میں، کر ٹھہری شور
بادل گرجے بعد میں، پہلے ناچے مور

---

چڑیوں کو چہکار دے، گیتوں کو دے بول
سورج بن آکاش ہے، گوری گھونگھٹ کھول

---

ہر چہرہ بے شکل سا، سارے درپن راکھ
جب بھی دیکھا دھیان سے اندھی ہو گئی آنکھ

---

ساتوں دن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر

---

جتنا بھیگے باوری، اتنی سُلگے پیاس
ساون برسے ساٹھ دن، نینا بارہ ماس

---

ندیا سینچے کھیت کو، تو تا کترے آم
سورج ٹھیکے دار سا، سب کو بانٹے کام

---

سورج سے دھرتی تپے، بچا یا ڈھونڈے کاگ
تن کے اندر من جلے، دھواں دکھے نہ آگ

---

آنکھیں چمکیں باگھ کی، [illegible] بھیڑ
[illegible] سو گئے سارے [illegible]

سب کی پوجا ایک ہی، الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی، کوئل چھیڑے گیت

---

یگ یگ سے ہر باغ کا، یہ ہی ایک اصول
جس کو ہنسنا آگیا، وہ ہی مٹی پھول

---

سپنا جھرنا نیند کا، جاگی آنکھیں پیاس
پانا، کھونا، کھوجنا، جیون کا اتہاس

---

بن ساجن سب ایک سا، دھوپ ملے یا چھاؤں
جب تک تھا وہ گاؤں میں، تب تک ہی تھا گاؤں

---

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

---

بہنیں چڑیاں دھوپ کی، دور گگن سے آئیں،
ہر آنگن مہمان سی، پکڑو تو اڑ جائیں

---

آنگن آنگن بیٹیاں، چھانٹی بانٹی جائیں
جیسے بالیں گیہوں کی، پکے تو کاٹی جائیں

---

چاقو کاٹے بانس کو، بنسی کھولے بھید
اتنے ہی سُر جانیئے، جتنے اس میں چھید

---

بگیا مہکے رات دن، آئیں جائیں پھول
پرسوں نرسوں آج کل، میری تیری بھول

---

دُکھ کی نگری کون سی، آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے، سب کے چھوٹے ہاتھ

---

اچھی سنگت بیٹھ کر، سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہوگئی دھوپ

---

میں کیا جانوں تو بتا، تو ہے میرا کون
میرے من کی بات کو، بولے تیرا مون[1]

---

ڈالی پر تصویر تھی، تتلی میں تھا پھول
سورج نکلا ڈھونڈنے، ہاتھ آئی بس دھول

---

تتلی بیٹھی پھول پر، شاعر کرے وچار
دو ملکوں کے بیچ میں، سرحد کی دیوار

---

مچھلی میں دریا بہے، دریا میں تالاب
بنیا گن گن آنکڑے، سوچے ہانی[2] لابھ

---

تو تھا اپنے بھت میں، میں تھا گنگا دھام
میری تیری بھول کا، راجہ پڑ گیا نام

---

ساگر سے ندیا ملے، ندیا ساگر ہوئے
کس میں کتنا کون ہے، جانے ناہیں کوئے

---

راجہ سیتا جوڑ کے، گھوما چاروں دھام
دو گز کے اک ڈھیر سے، آگے بڑھا نہ نام

---

نگری نگری گھوم کر، لکھیئے دوہے گیت
اپنے من میں کھوجیئے، اپنے من کا میت

۱۔ خاموشی ۲۔ نقصان فائدہ

۱۰۳ - امر اپارٹمنٹ، ڈانڈ پاڑہ ۱۰،
کھار (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۲



**شفق**

کسیر گنج - سہسرام - ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

# سائرن

ساری کاروائی اس رات کے اندھیرے میں عمل میں آئی تھی۔

جب جنگلی جانور آزادی سے سڑکوں پر گھوم رہے تھے شکار کر رہے تھے، تباہی پھیلا رہے تھے غرّا رہے تھے چیخ رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے، دھواں تھا آگ تھی خوف تھا، سہمی ہوئی آنکھیں جائے پناہ ڈھونڈ رہی تھیں اور خوف کا پرندہ کریہہ آواز میں چیختا ہوا بہت نیچی اُڑانیں بھر رہا تھا، دروازے بند تھے۔ مگر آوازوں کا شور، چیخوں کراہوں کا شور، سکاریوں کا شور اور دل کی دھڑکنوں کا شور۔

اور اس اندھیری اور پُر ہول رات میں وہ اس چٹان تک پہنچے تھے یا شاید بہت پہلے پہنچ چکے تھے صرف وقت کا انتظار تھا، اُسے ظہور میں لانے کی ساری ابتدائی کاروائیاں مکمل ہو چکی تھیں، صرف ایک ٹکر کی ضرورت تھی مگر اس کا وقت نہیں آیا تھا، ان کی بے چین نظریں گھڑی کی سوئیوں پر مرکوز تھیں جو بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔

کبھی کبھی وہ نظریں پھیر کر شہر کی طرف دیکھ لیتے، شور و غل کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں، آگ کی لپٹیں آسمان کو چھو رہی تھیں، اُن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

سب کچھ ٹھیک وقت پر ہو رہا ہے، ایک نے دوسرے سے کہا، گھروں کے دروازے بند ہیں اور وہ آزاد، سارے جال ٹوٹ چکے ہیں، ساری رکاوٹیں مسمار کی جا چکی ہیں، اس سے پہلے کہ نیا جال تیار ہو ہم.....

وہ ناتجربہ کار اور بھولا بھالا ادھم.....؟ اُس نے اپنے چاندی سے چمکتے سر پر ہاتھ پھیرا، آج کی رات صرف آج کی رات گزر جائے اور پھر.....

پھر گھڑی کی سوئیاں ایک دوسرے پر چڑھ گئیں اور اُن کے سینوں میں رُکا ہوا سانس ایک چیخ کے ساتھ باہر آ گیا۔ انہوں نے ایک نظر شہر کو دیکھا پھر اس قسمت والے کو جو بڑی تیزی سے چٹان کی طرف دوڑا جا رہا تھا، وہ اسی رفتار سے دوڑتا ہوا چٹان سے ٹکرایا، ایک چیخ فضا میں گونجی، خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ [illegible]

یکایک گڑگڑاہٹ کی آواز ہوئی، جیسے چٹان پھٹ رہی ہو، آواز بڑھ گئی اُن کے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگیں اور پھر چٹان شق ہوئی اور ایک چیخ کے ساتھ وہ باہر آ گیا۔

بے ڈول چہرہ، بڑی بڑی وحشی آنکھیں، سامنے نکلے ہوئے پیلے پیلے دانت موٹے موٹے لٹکے ہوئے ہونٹ، کان کے قریب تک پھٹا ہوا استادہانہ، چھوٹی سی گردن، کیلے کے پتوں جیسے کان، لمبے لمبے بازو، بڑے بڑے ناخنوں والی اُنگلیاں تنگ سینہ اور ٹخنوں کے پاس سے مڑے ہوئے پاؤں۔

وہ اُسے دیکھ کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑے اور قسمت والا دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

ہمیں بچاؤ کہ ہمیں ختم کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں، پگڑی والے دشمن بن گئے، داڑھی والے سرکشی پر آمادہ ہیں، ہمیں گھر سے بے گھر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہماری سُرکھشا کرو ہمیں اپنے شرن میں لے لو کہ ہم اس کے سر پر تاج مُکٹ رکھنے جا رہے ہیں۔

اس کی ویران ویران آنکھوں میں چمک جاگی، ہونٹ بھینچ گئے اور زبان لپ لپ کرنے لگی اُس نے جلتے ہوئے شہر کی طرف دیکھا ایک چیخ ماری پھر دوڑنے لگا۔

شہر سو رہا تھا شہر جاگ رہا تھا آگ جل رہی تھی دھواں اٹھ رہا تھا دہشت پھیل رہی تھی جانور گھوم رہے تھے اور دروازے بند تھے.....مگر بند دروازوں میں چھپے ہوئے لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے، خدا کرے رات گزر جائے، جانور تو جانور ٹھہرے کیا پتہ کب ان کا رُخ بدل جائے کہ اکثر جانوروں نے اُن کو محلوں کو روندا ہے۔

گہری سیاہ رات اپنے دامن میں نہ جانے کتنی کاروائیاں سمیٹ کر گزر گئی سورج نکلا تو انہوں نے اپنے دروازے کھولے، جلی ہوئی دکانیں اور جلتی عمارتوں سے اُٹھتا ہوا دھواں اور پڑی ہوئی سڑکوں پر گھوڑی رکاوٹیں

اینٹ اور پتھر کا ڈھیر، رستے سسکتے جائے پناہ ڈھونڈتے ہوئے لوگ، یہ سب کچھ ان کے لئے نیا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی تباہیوں کا جائزہ لیتے تھے آج کھنڈر کا لون کا تھا جو ان کے ہمدم و دمساز تھے۔ مگر ان کے دل دکھ سہ چکے تھے، خون پھر خون ہے۔

وہ راج محل پہنچے چوراہے پر کھڑا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا اور مٹھی بھر لوگ اس کے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔

وہ اسے پہچانتے تھے، وہ ہمیشہ سفید بے داغ کپڑوں میں نظر آیا تھا مگر اس کا جیل کی کوٹھری میں .....

ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، اپنے دروازوں پر واپس آکر انہوں نے زباں کھولی، ملک نے آخری دنوں میں جو راہ اختیار کی تھی اس میں ہماری کہیں گنجائش نہ تھی اور وہ اپنے اسی راستے کی بھینٹ چڑھ گئی اب یہ ...

مگر اس کے نام کا نعرہ وہی لگا رہے ہیں جو ملک کے ساتھ ہو گئے تھے۔

اس پر وہ سب فکرمند ہو گئے، سیلاب آتا ہے تو خس و خاشاک بھی سیلاب کا جزو معلوم ہوتا ہے، ایک نے پُرتفکر انداز میں زبان کھولی، وقت گزرنے پر خس و خاشاک بیٹھ جاتے ہیں اور اصل سیلاب سامنے آتا ہے میرا مطلب یہ ہے..... وہ چپ ہو گیا۔

کسی نے مطلب جاننے کے لئے کچھ نہیں پوچھا۔ یہ باتیں تو اپنے کپڑوں جیسی ہی کر رہا ہے۔ دوسرے نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا، امید صرف اس لئے ہوتی ہے کہ ..... وہ اب چپ ہو گیا۔

فکر کے راستے مسدود تھے خیال گھوڑے دوڑتے دوڑتے ٹھٹھک جاتے اور وہ اسے مہمیز کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے، آگے نہ جانے کیا ہو۔ کہیں بعد میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

دور کہیں بہت دور خطرے کا سائرن بج رہا تھا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہم فکرمند کیوں ہیں، ایک نوجوان نے لاپرواہی سے کہا، جو ہو گا اس سے برا نہ ہو گا جتنا برا ہو چکا ہے، جب ہم نے جنگل اور پہاڑوں سے گھر کر اس جگہ کو اپنا مسکن بنایا ہے تو یہاں جنگلی جانور بھی ہوں گے ہم دوب ہیں دب دب کر نکلتے رہے ہیں، نکلتے رہیں گے۔

وہ اپنے گھروں میں گئے کہ فرد رتوں کا دیو منہ کھولے کھڑا تھا اور بار ارادوں کا کوئی بھروسہ نہیں، بے اعتمادی اپنے پنجے اتنی گہرائی تک گاڑ چکی ہے کہ ذرا سی آہٹ اور پرچھائیں آنکھوں کا رنگ بدل دیتی ہے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں اس لئے جو خرید سکو خرید لو جو بیچ سکو بیچ دو کل کو کس نے دیکھا ہے۔

وہ جہاں بھی گئے خطرے کا سائرن سنائی دیتا رہا یکساں دوری اور حجم سے، دن چڑھا دوپہر ہوئی دن ڈھلا اور شام کے سائے اترنے لگے تو چائے پی کر وہ پھر دروازوں پر جمع ہوئے۔

اب جب کہ نیا جال بچھا دیا گیا اور بظاہر خطرہ ٹلا ہوا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا ہے، آخر خطرے کا سائرن کہاں بج رہا ہے۔

ہم دور تک گئے اور دیر تک باہر رہے مگر نہ آواز کم و بیش ہوئی نہ وہ جگہ ہی معلوم ہو سکی جہاں سے خطرے کا سائرن بج رہا ہے، فی الحال یہ سائرن ہمارا مسئلہ نہیں پھر ہم ہی کیوں سن رہے ہیں۔

اس کے تمام دن کے عمل سے ثابت ہو گیا کہ اس کے قول و عمل میں تضاد نہیں، کتنا جلد چوروں کا سامان سڑکوں پر واپس آگیا۔

کاش! ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں۔

تعداد کی بات نہ کیجئے کہ دس مُردوں سے ایک زندہ بہرحال بہتر ہے۔

کیا ہم زندہ نہیں ہیں ؟ انہوں نے حیرت سے سوچا۔

اگر یہ زندگی ہے تو مُردہ کسے کہتے ہیں ؟ نہ جانے کون بولا تھا، وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھتے رہے، شاید کوئی نہیں بولا تھا، یا سب بولے تھے یا کوئی نہیں بولا تھا مگر سنا سب نے تھا اور سٹپٹا کر چپ ہو گئے تھے۔

رات ہوئی تو سائرن کی آواز تیز ہو گئی۔ انہوں نے دیر تک کان دبا کر سونے کی کوشش کی تھک کر وہ اپنی سوئی ہوئی بیویوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اونہہ سونے دیجئے..... بہت نیند آرہی ہے.... انہوں نے کروٹ بدلنا چاہا مگر.....

وہ پھیل رہے تھے پھیلتے جا رہے تھے وہ سمٹ رہی تھیں سمٹتی جا رہی تھیں پھر دفعتاً ان کے پاؤں اکھڑ گئے، وہ گرنے لگے گرتے گرتے نقطہ بنے پھر فضا میں تحلیل ہو گئے مگر اب ان کے پھیلنے کی باری تھی۔

مجھے جگا کر خود سوئے جا رہے ہیں۔

تم سائرن کی آواز سن رہی ہو ؟

کہیں ریڈیو چل رہا ہوگا، ابھی تو صرف دل کی دھڑکنیں سن رہی ہوں، وہ سینے پر سر رکھے سو گئیں، مگر وہ آنکھیں بند کئے جاگتے رہے، تو نیند بلانے کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔

نہ جانے کتنی رات گزری، شاید نصف یا اس سے زیادہ، وہ کان تکیے میں دبائے ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے کرتے سو گئے صبح اٹھے تو ان کی آنکھیں سرخ اور سر بھاری ہو رہے تھے، بیوی نے رات کی کچھ بات یاد دلانی چاہی تو وہ ان سنی کر گئے، چائے خانوں میں اخبار آ گئے تھے سرخیاں چاٹی جا رہی تھیں۔

کوئی اندیشے کی بات نہیں — سفید کپڑوں والا مسکرا رہا تھا کتنی معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ ہے، روشن آنکھیں دل کی غماز ہیں پھر خطرے کا سائرن کیوں بج رہا ہے؟

ذہنوں میں سوالوں کا ہجوم تھا جواب کسی کے پاس نہ تھا خیالی گھوڑے دوڑتے دوڑتے پھر وہیں واپس آجاتے۔

مگر ایک دن جب سورج آگ برسا رہا تھا اور لوگ پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے، ایک برقع پوش خاتون کسی ضرورت سے باہر نکلی تھیں اچانک ایک موڑ پر وہ عفریت نمودار ہوا اور خاتون کو ایک عمارت میں گھسیٹ لے گیا۔ وہ ہپناٹزم کے زیر اثر بیان دے رہی تھی، شکایت کر رہی تھی۔

اس کی شکایت پر فوراً کاروائی عمل میں آئی اور داڑھی مونڈنے کے حکم پر دستخط ہو گئے۔

تو ہم داڑھیاں منڈوالیں؟ — اُن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، یہ مداخلت ہے ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے، وہ گھر سے باہر نکل آئے، گلیوں اور سڑکوں کے نکڑ پر جمع ہوئے، ہمارے لئے وہ دستورالعمل مشعل راہ ہے جس پر ہم صدیوں سے گامزن ہیں اور جس میں اب تک کسی نے مداخلت نہیں کی تھی پھر یہ ہماری نجی زندگی میں مداخلت کیوں، ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔

پھر وہ کالی پٹیاں باندھ کر راج محل کی طرف بڑھنے لگے مگر وہ آہنی دیوار بنے ہوئے تھے۔

لوٹ جاؤ کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے، آگے موت ہے، رُک جاؤ لوٹ جاؤ کہ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔

لاٹھیاں چلیں گولیاں چلیں اور انہیں منتشر کر دیا گیا۔

ابھی وہ اپنے زخم چاٹ ہی رہے تھے کہ دوسرا دھماکہ ہوا۔

ایک رات جب مسٹر راشد نائٹ شو فلم دیکھ کر لوٹ رہے تھے انہوں نے اس عفریت کو دیکھا جس کے مڑے ہوئے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے باچھوں سے رال بہہ رہی تھی اور آنکھیں الاؤ کی طرح دہک رہی تھیں، اُس کے پیچھے بہت سے لوگ جھانجھ مجیرے بجاتے اور گاتے آ رہے تھے۔ راشد ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئے۔

عفریت عبادت گاہ کے دروازے پر رُکا، اُس کے لمبے ناخنوں والی انگلیوں نے قفل کو حقیر تنکے کی طرح توڑ کر پھینک دیا، پینتیس برسوں بعد عبادت گاہ کا دروازہ چرچرا کر کھُلا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

ڈھول مجیرے کی آواز تیز ہو گئی، نعروں کی آواز تیز ہو گئی، انہوں نے عبادت گاہ کے درکی مٹی ماتھے پر لگائی زمین کو بوسہ دیا پھر سب اندر داخل ہو گئے۔

ہوائیں بوجھل ہو گئیں۔ ٹوٹ گیا قفل ٹوٹ گیا، سنسناتا ہوا تیر کانوں کو چھیدتا ہوا دل میں اُتر گیا تھا، وہ داخل ہو گئے اندر داخل ہو گئے ڈھول مجیرے بج رہے ہیں، گیت گائے جا رہے ہیں۔ دیکھ لو خود ٹیلی ویژن پر دیکھ لو۔

* یہ ظلم ہے زیادتی ہے، وہ اپنی داڑھیوں کو مٹھی میں جکڑ رہے تھے۔ یہ عبادت گاہ کی بے حرمتی ہے جسے ہم برداشت نہیں کریں گے، تمائندے سڑکوں پر چیخ رہے تھے، انہوں نے احتجاجی جلوس نکالنا چاہا مگر امن و سلامتی کے خطرے کے پیش نظر انہیں روک دیا گیا کہ دفعات کا نفاذ ہو چکا تھا۔

مگر عبادت گاہ سے اعلان ہو رہا تھا۔ وہ مہان پرس طویل بن باس کے بعد اپنی جنم بھومی پر پدھارے ہیں، اب وہ سارے دیش کی یاترا کرکے دیش واسیوں کو درشن دیں گے۔

خطرے کا سائرن — تیز ہو گیا، سفید کپڑا کھلا نظر آنے لگا، ذہنوں میں وہم کی کائی جمنے لگی، کیا صرف یہی ایک مسئلہ تھا جس پر بھرپور توجہ دی گئی۔ اور وہ مسائل جو پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں ان کی طرف دھیان نہیں؟ ہونٹوں پر اکیسویں صدی کے خواب کی باتیں اور نظروں کے سامنے جنگل کا قانون، براڈکاسٹ ہونے والے اتحادی ترانے اور....

پھر یاترا شروع ہوئی پھولوں سے سجے ہوئے سونے کے رتھ میں براجمان وہ عفریت دروازے اور کھڑکیوں پر کھڑے ہوئے سہمے ہوئے لوگوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کے سامنے کے دانت ڈراکیولا کی طرح لپ لپ کر رہے تھے اور لمبے ناخنوں والی اُنگلیاں تشنجی انداز میں کھل بند ہو رہی تھیں۔

پھر خبریں آنے لگیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ سے تیسری جگہ سے، دھواں اٹھ رہا تھا شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے دوڑ رہے تھے خون بہہ رہا تھا سیکڑوں بار کی دہرائی ہوئی کہانی پھر بیان ہو رہی تھی وہ قہقہے لگا رہا تھا اور خوف کا پرندہ سروں پر منڈلا رہا تھا لوگ افراد و تفریط کے عالم میں بھاگتے ہوئے جائے پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ گھروں میں مقید آنکھیں روزنوں سے سڑکوں اور گلیوں کی نگراں تھیں۔

وہ آرہا ہے۔ وہ آرہا ہے۔

وہ دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے مغربی تعلیم و تربیت بھی رائیگاں گئی اندھیرا اور بڑھ گیا مسائل اور پیچیدہ ہو گئے، چہرے پر پڑا ہوا معصومیت کا نقاب اُتر گیا، بے ڈول چہرہ پھٹی ہوئی آنکھیں کان تک پھٹا ہوا منہ کا دہانہ لپ لپ کرتے ہوئے دانت۔

[باقی صفحہ ۵۶ پر دیکھئے]

وزیر آغا

# اِک ڈری ہوئی آواز!

رات کو جب تاروں کی آنکھیں گھورنے لگتیں
اور شب کے ناراض پرندے
تیز کٹیلے، خنجر ایسے، پنجے لے کر
ہر سو اُڑتے
گہرے جنگل کے اندر سے
لال انگارہ بھوکی نظریں
باڑے پر مرکوز دکھائی دینے لگتیں
میں — اپنے بستر میں دبکا
آنکھیں میچے
اک بھاری چادر میں لپٹا
آنے والی سبز رتوں کے منظر تکتا
اپنی آنکھ کے ٹھہرے موسم میں خوش رہتا
پر شب کی زہریلی، خونی، گھورتی آنکھیں
گھنی گمبھیری باڑ کو تنکا تنکا کرکے
ٹھہری آنکھ کے باڑے کے اندر آجاتیں
ممیاتی خوشبوں کو ہانک کے لے جاتیں!
جنگل کے گہرے سایوں میں
آوازوں کے قتل کا منظر لو دیتا
پھر بُجھ جاتا
پھر سناٹا
پھر باڑے میں اک ڈری ہوئی آواز
اکیلی — ممیاتی آواز!!

خوش دیکھ کر مجھے وہ پریشان ہوگیا
رنجور بے سبب ہی وہ نادان ہوگیا

پلکوں سے بوند بوند گری روشنی تمام
دِل کا غبار آنکھ کا طوفان ہوگیا

اُس موجۂ لباس کی خوشبو سے سارا شہر
گل ریز ہوکے اور بھی گنجان ہوگیا

در پردہ سیل تند تھی وہ نظرِ التفات
میں اُس نظر پہ ایسے ہی قربان ہوگیا

کیسے کہوں وہ میری نظر میرا مان تھا
سب جانتے ہوئے بھی وہ انجان ہوگیا

اُس بے وفا سے قطع تعلق کی دیر تھی
جینا بھی اور مرنا بھی آسان ہوگیا

کچھ دُور تک میں خود ہی رہا اپنا ہم سفر
پھر اس کے بعد راستہ سنسان ہوگیا

بلراج کومل

# تخلیقی دریافت اور کامرانی

ہائیکو جاپانی شاعری کی مقبول عام صنف سخن ہے۔ ہائیکو میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں صورت حال کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرے میں تخلیقی پرواز اور تیسرے میں طلوع یا نقش یا حیرت و استعجاب کا اظہار۔ ہائیکو کے مضامین، موسم کے رنگوں، آس پاس کی عام زندگی کے تجربوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ طریق اظہار اور پیکر شائستہ اور الفاظ روز مرہ بول چال کے الفاظ ہوتے ہیں۔

ہائیکو کا آخری مصرع بالعموم کسی نہ کسی اسم NOUN پر ختم ہوتا ہے۔ ہائیکو سے ملتی جلتی ایک اور جاپانی صنف سخن بھی ہے سن رائی یو SENRYU سن رائی یو میں مصرعوں کی تعداد تو ہائیکو کی طرح تین ہی ہوتی ہے لیکن ہائیکو کے برعکس سن رائی یو میں طنز، تضحیک، تمسخر کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ سن رائی یو کے آخری مصرع میں آخری لفظ کے طور پر اسم NOUN کی صورت میں لانے کی قید سے بھی آزاد ہے اور ہیئتوں کے تعلق سے بھی ہائیکو اور سن رائی یو میں پہلا مصرع پانچ سیلبز SYLLABUS پر مشتمل ہوتا ہے دوسرا سات پر اور تیسرا پھر پانچ پر۔ پچھلے کچھ برسوں میں بہت سے اردو شاعروں نے ہائیکو لکھنے کا تجربہ کیا ہے۔ حمید الماس ان میں سے ایک ہیں لیکن اتفاق ایسا ہے کہ اردو شاعروں کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے مختصر نظم، ہائیکو اور سن رائی یو کی ہیئتی اور ساختی حدود گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ اردو ہائیکو کے متیز ہائیکو لفظ بیان کی سطح پر ہیں۔ شاعری کی سادگی اور صوتی تجسیم کاری کے حسن سے بھی عاری ہیں۔

بعض اوقات ایک جملے یا مصرعے کے تین ٹکڑے ہیں اور آخری مصرعے میں طلوع یا نقش کے حسن حیرت و استعجاب اور آخری لفظ کے طور پر نام یا اسم NOUN کی موجودگی سے عاری ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی دونوں اصناف ہائیکو اور سن رائی یو (سن رائی یو) کے حد امتیاز کا کوئی احترام نہیں کیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان میں لکھے جانے والے اکثر ہائیکو۔ ہائیکو سے زیادہ سن رائی یو کے ذیل میں آتے ہیں اور ہمارے دو شاعری کے زیر اثر نوعیت کے اعتبار سے غزل کے شعر، قطعے یا رباعی یا پھر مختصر نظم کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

حمید الماس کے ہائیکو (یا مختصر نظمیں) پڑھتے ہوئے ان کی دل آویز کیفیات سے متاثر ہونے کے باوجود میں عجیب و غریب تذبذب کے عالم سے گزرا ہوں۔ میں ان کو ہائیکو کہوں سن رائی یو کہوں یا صرف مختصر نظمیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

زخم کرتی ہیں نئی نسلیں ہمیشہ
ان سے پہلے
کس سے تسخیر جہاں نو ہوئی

---

لولو

جلد بدلتی جا رہی ہیں ساری قدریں

مضطرب ہے آرزو

---

کس لیے وہ لکھ رہا ہے
بے سروپا تون کی تشریحیں
بہت

تین مثالوں میں اظہار محض بیان کی سطح پر نقش گری REN-DERING کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ تیسری مثال میں بظاہر تو مصرعے تعداد میں تین ہی لیکن درحقیقت ایک ہی مصرع کو تین ٹکڑوں میں لکھ دیا گیا ہے۔ پہلی مثال میں آتو ال صورت حال جوں کی توں صرف بیان کی سطح پر رہ گیا ہے اس لیے میں اسے نظم یا مختصر نظم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ دوسری مثال بھی اگرچہ کم و بیش بیان کی سطح پر ہے لیکن پہلے مصرع میں لکھنے کی موجودگی اور تیسرے مصرع میں آرزو کے اضطراب نے ایک ڈرامائی کیفیت کو جنم دیا ہے۔ دوسری مثال میری نظر میں اس اعتبار سے مختصر نظم کے قریب و جوار میں پہنچ گئی ہے۔ تیسری مثال صرف سوال ہے۔ صرف ایک جملہ اور وہ بھی محض تین ٹکڑوں میں کاٹ کر لکھا ہوا جملہ۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔

صبح سے نکلا ہوا میرا پرندہ
شام تک لوٹا نہیں
دور جنگل میں کہیں کوئی ضیافت تو نہیں

مندرجہ بالا مثال میں IRONY کا پہلو بھی ہے اور مزاح کی ہلکی سی چاشنی بھی۔ حیرت و استعجاب کا پہلو بھی ابھرا ہے اور صوت منظر بھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ مثال سن رائی یو کے قریب چلی گئی ہے۔ حمید الماس کے ہائیکو (مختصر نظمیں) ساختی اور معنوی اعتبار سے اکثر و بیشتر یا تو مختصر نظموں کے منتشر روپ ہیں یا پھر مختصر نظمیں!! بعض اوقات خوب صورت اور کامیاب ہائیکو اور کبھی کبھی سن رائی یو (سن رائی یو)

وہ اکیلا جا رہا تھا
فکر میں کھویا ہوا
رہنمائی کر رہے تھے راستے کے سب شجر

---

ذہن آلودہ میں
شائستہ حیالوں کی صدا
طفل معصوم کی کلکاریاں

---

چوستی ہے آخری بوند کو جب
ڈوبتے سورج کی آزردہ کرن
تھرتھراتا ہے شجر

لامکاں اجلے پرندوں کے تعاقب میں
اڑ رہی ہیں جھوم کر دور تک
اڑتی ہوئی پرچھائیاں

---

صاف ستھرے آئینے میں
کوئی سایہ تک نہیں
خوبصورت سا خالی مکاں

تین مصرعوں پر مشتمل مندرجہ ذیل تحریروں میں اگرچہ ہائیکو کے ہیئتی مطالبات کا احترام نہیں کیا گیا لیکن یہ تحریریں بہر حال کسی کی فضا میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، لہٰذا میں انہیں ہائیکو ہی کی صف میں شمار کروں گا۔

بادلوں میں پھنس گئے
تنہا پرندے
گھونسلے ہیں منتظر

---

میں نے دیکھا
رو رہی تھیں چیونٹیاں
آگ جب روشن ہوئی

بہ طور ایک مخصوص ہیئت ہائیکو کی ساختی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اس میں موضوع یا نفس مضمون کا طلوع یا انکشاف طویل بیانیہ کے انداز میں ممکن نہیں ہے۔ ہائیکو میں نقش گری کے طلسمات کی کارگری بھی ہے اور غزل کی رمزیہ کیفیات کی رنگارنگی بھی۔ حمید الماس مزاجاً زندگی کے قریب جانے والے تجربات کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی کی تمازت سے سرشار ہوتے ہیں اور ان ہی کے تاریک سایوں کی پرورش میں اداس ہو جاتے ہیں۔ حمید الماس کی شاعری بہ حال وہ ہر مقام سے ملائمت اور نفاست سے گزر جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک ملائم افسردگی ان کے پورے کلام میں موجود ہے لیکن ہائیکو اور مختصر نظموں میں حمید الماس کی مخصوص پہچان کی صورت میں ابھری ہے۔

میں حمید الماس کو برسوں قریب سے جانتا ہوں۔ میں ان کے تخلیقی ولولے اور جذبے کی داد دیتا ہوں وہ اگرچہ کسی حد تک میری طرح زوال عمر کے سائے میں ہیں لیکن بہر حال حسن و رعنائی سے سرشار ہیں، اس کا ثبوت ان کی مسلسل تازہ کار اور توانا تخلیقی مسلسل ہے۔ یہ ہائیکو (اور سن رائی یو) اور مختصر نظمیں ان کی تخلیقی دریافت اور تخلیقی کامرانی کا تازہ ترین ثبوت ہیں۔



حمید الماس

# ہائیکو

گھاٹ سے اترا تو
حیرانی ہوئی
پشت پر دریا نہ تھا

---

جب پرندہ اُس سے ٹکرا کر گرا
جھک گیا سورج کا سر
لمحہ بھر کے واسطے

---

بہتے بہتے
تیز رو دنیا کے پانی میں
فنا ہو گئے سارے درخت

---

اُڑ گئے سارے پرندے
اب اکیلے نقشِ پا ہیں
رہ گزارِ باد پر

---

فکر کے اجلے پرندے
بو رہے ہیں ہر طرف
خوابوں کے بیج

---

ڈوبتے لمحوں کو اُس نے
بڑھ کے روکا تو سہی
ہو گیا مغلوب کیوں

---

عہد و پیماں
دیکھتے ہی دیکھتے جل جائیں گے
خشک ٹہنی کی طرح

---

میں نے سمجھا تھا کہ
تابندہ رہے گی ساعتِ امروز بھی
روئے فردا کی طرح

---

اپسرائیں
پھر کسی کی جستجو میں ہیں رواں
بند ہیں سارے مکاں

---

بولتے جنگل میں
آوازوں کا شور
زندگی

---

چلو
اُلجھے ہوئے بادل کو سمجھائیں
کہاں ان کو برسنا ہے

---

گھر گیا ہوں آج کے طوفان میں
رو رہا ہے میرا ماضی
روبرو

---

وہ مری ہر بات کو
محفوظ رکھتی ہے
دعاؤں کی طرح

---

اُس نے کل مجھ کو دیا تھا
حرفِ شیریں تحفتاً
بڑھتی جاتی ہے تصرف سے چمک

---

اُس کے قدموں کے تلے ہیں
صف بہ صف روشن ستارے
قیدیوں کی شکل میں

---

کیوں
مجھے کمتر سمجھ کر
رو رہی ہو صبح سے

---

میرے ہاتھوں سے رقم لیتے ہوئے
دستِ آلودہ میں
لرزش سی ہوئی

---

اُگ رہے ہیں
اجنبی دھرتی پر
خوابوں کے درخت

---

اُگ رہی ہے بڑھ رہی ہے
دن بہ دن
ڈر نہیں ہے ہاتھیوں کا گھاس کو

---

برگِ آوارہ کو
ملتی ہے پناہ
خانقاہوں کی مقدس گودیں

# چند عمدہ کتابیں

## علم و ادب

| | | |
|---|---|---|
| لندن اولندن | ڈاکٹر سید محمد عقیل | ۵۰ روپے |
| مثنوی سحر البیان | مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری | ۵۰ روپے |
| محمد شاہی عہد کی ایک نایاب مثنوی | مرتبہ ڈاکٹر عبدالرؤف | ۱۵ روپے |
| ادب کی تلاش | بلراج کومل | ۳۰ روپے |
| شعلے کی شناخت | عمیق حنفی | ۳۰ روپے |
| شرر بہ حیثیت ناول نگار | ڈاکٹر علی احمد فاطمی | ۶۵ روپے |
| فراق فن اور شخصیت | ڈاکٹر علی احمد فاطمی | ۳۰ روپے |
| تنقیدی مطالعے | ڈاکٹر شارب ردولوی | ۲۰ روپے |
| ساحل اور سمندر | احتشام حسین | ۳۰ روپے |
| اردو افسانے کے افق | مہدی جعفر | ۲۵ روپے |
| تلاش و تعارف | ڈاکٹر حنیف نقوی | ۴۰ روپے |
| مثنوی قطب مشتری ایک مطالعہ | ڈاکٹر ابوالبرکات | ۳۰ روپے |
| اردو افسانہ | ڈاکٹر عزیز فاطمہ | ۷ روپے |
| افکار و اظہار | حامی انصاری | ۳۰ روپے |
| مارکسی جمالیات | اصغر علی انجینئر | ۲۵ روپے |
| مغربی تنقید کے اصول | ڈاکٹر انور سجاد | ۳۵ روپے |
| تاریخ ادب کی تدوین | علی جواد زیدی | ۱۲ روپے |
| مجاز حیات اور شاعری | منظر سلیم | ۳۰ روپے |
| تحقیقات حیدری | ڈاکٹر اکبر حیدری | ۴۵ روپے |
| اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء | ڈاکٹر اکبر حیدری | ۱۰۰ روپے |
| شرح دیوان غالب | علامہ بیخود موہانی | ۶۰ روپے |
| عرض ہنر | ڈاکٹر محمد حسن | ۲۰ روپے |
| غالب ایک مطالعہ | پروفیسر ممتاز حسین | ۳۰ روپے |
| کوچے کی سرگذشت | محمد علی صدیقی | ۱۲ روپے |
| متعلقات انشاء | ڈاکٹر عابد پشاوری | ۵۰ روپے |
| فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات | ڈاکٹر عبیدہ بیگم | ۶۰ روپے |
| اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی | ڈاکٹر شکیل احمد | ۵۰ روپے |
| اردو افسانہ، سماجی ثقافتی پس منظر | ڈاکٹر عزیز فاطمہ | ۴۰ روپے |
| مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی | ڈاکٹر سکندر آغا | ۶۵ روپے |
| اردو میں خود نوشت سوانح حیات | ڈاکٹر صبیحہ انور | ۶۰ روپے |

## ناول

| | | |
|---|---|---|
| معصوم | عصمت چغتائی | ۳۰ روپے |
| ندی | عبداللہ حسین | ۹ روپے |
| ضبط کی دیوار | سلیم اختر | ۹ روپے |
| آدھا راستہ | کرشن چندر | ۲۰ روپے |
| اظہار شب | قاضی عبدالستار | ۳۰ روپے |
| چار چہرے | سہیل عظیم آبادی | ۱۵ روپے |
| بے جڑ کے پودے | سہیل عظیم آبادی | ۱۴ روپے |
| بے گانہ | البیر کامو | ۲۰ روپے |

## افسانے

| | | |
|---|---|---|
| ایک حلفیہ بیان | اقبال مجید | ۲۰ روپے |
| دوسرا مجبور خاں | نور پرکار | ۱۸ روپے |
| خالی پٹاریوں کا مداری | اقبال متین | ۳۰ روپے |
| نچا ہوا البم | اقبال متین | ۳۰ روپے |
| آخری سلام | شکیلہ اختر | ۳۰ روپے |
| دربدری | رتن سنگھ | ۱۵ روپے |
| بیس نئی کہانیاں | علی احمد فاطمی | ۲۰ روپے |
| سیمیا | نیر مسعود | ۲۰ روپے |

## شعر و شاعری

| | | |
|---|---|---|
| آتش و نم | کشور واحدی | ۳۰ روپے |
| چراغ نیم شب | سلیم احمد | ۲۵ روپے |
| سرائے میں شام | نشتر خانقاہی | ۳۰ روپے |
| چاند چہرہ ستارہ آنکھیں | عبیداللہ علیم | ۳۰ روپے |
| کاغذ کا شہر | ساغر اعظمی | ۳۰ روپے |
| سیل وجد | ساجدہ زیدی | ۳۰ روپے |
| جانان جاناں | احمد فراز | ۲۰ روپے |

- سو روپوں سے زائد قیمت کی کتابیں طلب کرنے پر ڈاک خرچ ادارہ برداشت کریگا
- دو سو روپے سے زائد قیمت کی کتابیں طلب کرنے پر دس فیصد کی رعایت
- فرمائش کے ساتھ ۲۵ فی صد رقم عنایت فرمائیے۔

**نصرت پبلشرز**

امین آباد — لکھنؤ — ۲۲۶۰۱۸ —




## جیتندر بلو

1. ALFRED ROAD ACTON LONDON-W3-6LH
(ENGLAND)


# رشتے بے نام

گھر میں کچھ اس قسم کا تناؤ پیدا ہو چکا ہے کہ گھر کی دیواریں بھی اس تناؤ کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ چھوٹا سا گھر ہے اور چھوٹا سا پریوار — میں اور میری بیوی، جنہوں نے شادی کے وقت رجسٹرار کے دفتر میں صدقِ دل سے یہ ''بول'' کئے تھے کہ ہم امیری غریبی میں، ''دکھ سکھ میں'' اور ہر اونچ نیچ میں ایک دوجے کے ساتھ رہیں گے اور آخری دم تک ساتھ نبھائیں گے۔ اب اپنے اپنے کمروں میں دروازہ بند کئے یوں بیٹھے ہیں، گویا ہم میاں بیوی نہ ہوں، بلکہ مکان کرائے دار ہوں، جن کا آپس میں کوئی سمبندھ، کوئی رشتہ نہیں ہوتا — یہ صورتِ حال ایسی ہے جو میرے تن من پر گراں گزر رہی ہے۔ لیکن میں بے بس ہوں کہ گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ جائے یا بگڑ جائے تو گاڑی مزید چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔

"اگر تم نے اس حد تک سوچ لیا ہے تو ٹھیک ہے — تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"

"سیما، تم بھی تو کر سکتی ہو —؟"

میرے لہجے کی تلخی اور اس کی شدت اور اس کی کاٹ، وہ برداشت نہ کر پائی تھی۔ فوراً اٹھی، غضب ناک نظروں سے مجھے دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔ اگلے پل دروازہ بند کرنے پر اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ میرے کان بھی سن ہو کر رہ گئے۔

اچھی بھلی مجرد زندگی گزر رہی تھی۔ کسی قسم کا فکر فاقہ نہ تھا۔ چند ایک اچھے برے یار دوستوں کے توسط سے زندگی کی ہر ضرورت گاہے بگاہے پوری ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن میری ماں جو مجھ سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی میری سانسوں میں شامل تھی، اس کا بے حد اصرار تھا کہ میں اپنے دیش میں آ کر اپنی ہی برادری میں بیاہ رچاؤں۔ اسے ڈر تھا کہ پردیس میں کسی غیر ذات سے شادی کرنے پر میرے رنگدار بچے پیدا ہوں گے اور وہ یہاں کی روایات، اقدار اور طرزِ زندگی میں اس قدر رچ بس جائیں گے کہ وہ بذاتِ خود نہ تو ان سے اپنی زبان میں بات کر پائے گی اور نہ ہی انہیں وہ پیار دے پائے گی، جن کے وہ فطری حقدار ہوں گے — میں اکثر ماں کی ممتا، اس کے بھولپن اور اس کی روایتی سوچ پر ہنس دیا کرتا تھا۔ لیکن بعض دفعہ اکیلے میں جب میں اس کے غیر شعوری خوف، اس کی جذباتیت اور اس کی دور اندیشی پر غور کیا کرتا تھا، تو وہ مجھے بڑی ودوان لگا کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ان پڑھ ہونے کے باوجود مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ شاید یہ مادری جبلت تھی جو میرے تحفظ کے ساتھ میری بہتری کی بھی خواہشمند تھی۔ کافی غور و فکر کرنے پر میں نے اس کی مانگ کا احترام تو کیا لیکن آدھا — میں نے شادی اپنی برادری میں کی — لیکن پردیس میں۔

سمنتھا، جس کا گھریلو نام سمن ہو چکا تھا اور جس کے گھر والے مشرقی افریقہ سے ہجرت کر کے لندن میں آ بسے تھے، وہ رجسٹرار کے دفتر میں ایک ہی دستخط سے سمن ورما بن گئی تھی۔ میرے ہاں قدم رکھتے ہی اس نے گھر کی فضا ہی بدل ڈالی تھی۔ مکان کا ہر حصہ، کونہ، ہر شے مجھے یہ احساس دلا کر ترسایا کرتے تھے کہ میں نے کنوارے پن میں ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ لیکن سمنتھا کے آتے ہی ان کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔ بات بھی صحیح تھی۔ قدرت، رکھ رکھاؤ کے معاملے میں صنفِ نازک پر ازل سے مہربان رہی ہے اور عورت ذات کے ہاتھ لگتے ہی ہر شے کا حسن نکھر آتا ہے۔ لیکن میں اپنی جگہ بے حد خوش تھا کہ زندگی کے معنی یکسر میری نظر میں بدل گئے تھے۔ اکیلا پن، جو پردیس میں اس قدر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ کبھی کبھار آدمی خود سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایکاکی میرے اندر سے غائب ہو گیا تھا۔ بلکہ ہر پل مجھے یہ احساس رہنے لگا تھا کہ اس بھری پری دنیا میں کوئی اور بھی ہے، جو میرے لئے زندہ ہے اور میں اس کے لئے۔ دفتر سے فارغ ہونے پر مجھے گھر پہنچنے کی اس قدر جلدی ہوا کرتی تھی کہ میں موٹر وے پر اسّی نوّے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلانے سے بھی گریز نہیں کیا کرتا تھا، محض سمنتھا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چھولے پیٹھے کے لالچ میں۔

گھر کی دہلیز، جس کا آدمی کے جیون کے ساتھ اتنا گہرا سمبندھ ہے کہ

اُسے پیار کرتے ہی اُس کی شخصیت بدل جاتی ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا کرتا تھا
اُسے پیار کرتے ہی اور سمنتھا کا شاداب چہرہ دیکھتے ہی دن بھر کی تھکاوٹ چٹکیوں میں دُور ہو جایا کرتی تھی۔ ہم دونوں برسرِ روزگار تھے اور دونوں کی آمدنی بھی قریب قریب یکساں تھی۔ چائے کے دوران ہم اکثر نجی معاملات، گھریلو بجٹ، افزائشِ نسل اور مالی حالات کے متعلق تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ جب کوئی مسئلہ درپیش آتا تھا، تو ایک دوسرے کے صلاح مشورے سے کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیا کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر حل تلاش کرنے میں اُسی کا ہاتھ ہوا کرتا تھا اور میں اُس کی سمجھ بوجھ پر رشک کئے بنا نہ رہ سکتا تھا کہ اُس نے یہیں تعلیم حاصل کی تھی، یہیں اپنی جڑیں بنا کر شعوری آنکھ کھولی تھی اور وہ اس معاشرے کے ہر پہلو، ہر تضاد، ہر اختلاف کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتی تھی۔

ہمارے دوستوں کا حلقہ، جو میرے اور سمنتھا کے چند گنے چنے شادی شدہ جوڑوں پر مشتمل تھا، اُن کی نظر میں ہماری حیثیت ایک مثالی جوڑے کی تھی، وہ سمنتھا کی سوچ، شخصیت اور خیالات سے اس حد تک مرعوب تھے کہ مجھے خوش قسمت قرار دیا کرتے تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ میں خود کو واقعی خوش قسمت تصور کیا کرتا تھا۔ لیکن سمنتھا کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا بھی تھا، جو میرے نزدیک خاصا تکلیف دہ تھا۔ وہ ہر معاملے میں ذاتی مفاد کا دامن ہرگز نہ چھوڑا کرتی تھی۔ اِس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پسند کرتی تھی، جہاں اُسے فائدہ دکھائی دیا کرتا تھا۔ بلکہ اُس کی کوشش یہی رہا کرتی تھی کہ وہ رتّی بھر بھی قربانی دیئے بغیر زندگی کا ہر مزا لوٹ لے۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ اِس قدر محتاط تھی کہ اپنے حصّے کے علاوہ ایک پیسہ بھی زائد خرچ کرنا اپنے اصول کے خلاف سمجھتی تھی۔ اِس کا احساس مجھے شادی سے پہلے کچھ کچھ ضرور ہو گیا تھا ـــ اُن دنوں ہماری COURTSHIP چل رہی تھی اور ایک شام جب ہم ہیمپسٹڈ کی ایک پب میں بیٹھے FINANCIAL ARRANGEMENTS کے متعلق ہر شئے طے کر رہے تھے، تو اُس نے کہا تھا۔

"گھر میں چلاؤں گی۔ ہر ہفتے جو بھی خرچہ ہو گا ہم آدھا آدھا بانٹ لیا کریں گے۔"

"لیکن گھر کی مورگیج اور دوسرے اخراجات کا کیا ہو گا؟"

"وہ بھی ہم آدھا آدھا ادا کریں گے۔"

"تمہاری پیش کش بڑی معقول ہے اور PRACTICAL بھی۔ لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" اُس کے چہرے کا ہر حصّہ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ سوچتی ہوئی نظروں سے وہ مجھے تکتی رہی۔ میں نے اس کا ریشم زدہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔ "سنو سمنتھا ـــ تم میری جیون ساتھی بننے والی ہو ـــ شادی کے بعد جو بھی میرے پاس ہو گا، وہ صرف میرا نہیں، تمہارا بھی ہو گا ـــ میں سمجھتا ہوں تمہیں بھی اِسی طرح سوچنا چاہیئے!" ردِ عمل گھبرا ہوا تھا ـــ لیکن اُس نے اپنے موقف کو برقرار رکھا۔ بولی۔ "یہ تبھی ممکن ہے، جب دونوں کے ہاں ایک دوسرے کے لئے مکمل بھروسہ ہو اور یہ بھروسہ شادی کے کامیاب ہونے پر ہی پیدا ہوتا ہے۔" میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کی پرورش ایک ایسے ماحول، ایک ایسے SET UP میں ہوئی تھی، جہاں ہر شخص خود کو ایک مکمل یونٹ تصور کرتا ہے اور اُسی کے مطابق محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ لیکن میری سائیکی میں بڑی دور تک یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ اس کے رویئے میں تبدیلی لانا اس پر نہیں خود پر کرم کرنا ہو گا۔

جیون کے نئے سفر میں دن رات ایک مہربان دوست کی طرح ہمارے درمیان تال میل پیدا کرتے چلے جا رہے تھے اور ہم خوش تھے کہ ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہوئے قریب آ رہے ہیں، لیکن ہمارا مالی بند و بست وہی تھا، جو شادی سے پہلے ہوا تھا ـــ ہر ہفتے یا دوسرے ہفتے جب سمنتھا پورا حساب کتاب کر کے میرا حصّہ ادا کرنے کے لئے کہا کرتی تھی تو مجھے سخت کوفت ہوتی ـــ کئی مرتبہ احساس ہوتا کہ وہ میری بیوی نہیں بلکہ ایک ایسی عورت ہے جو میرے ساتھ کاروبار میں برابر کی شریک ہے، ہم مل کر اس گھر کو کاروبار کی صورت میں چلا رہے ہیں اور یہ کاروبار بلا کسی رکاوٹ کے چلے جا رہا ہے ـــ بار بار یہ خیال بھی مجھے تنگ کرتا کہ یہ برابر کی ادائیگی، برابر کی حصّے داری آخر یہ سب کیا ہے ـــ؟ ہم ایک دوسرے کے بدن تو خوشی خوشی SHARE کر لیتے ہیں اور اُس کے دونوں بدن اپنی مخصوص زبان میں بات کرتے ہوئے ایک ہونے کی آرزو میں تڑپتے ہیں، فریاد کرتے ہیں ـــ لیکن پیسوں کے معاملے میں ہم اس طرح اجنبی بن جاتے ہیں، گویا ہمارا آپس میں کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

میرے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ جس دھرتی سے میرا خمیر اُٹھا تھا، وہاں کی بو باس بڑی مختلف تھی۔ جن روایات کے سہارے میری نشو و نما ہوئی تھی، وہ مجھے اس حد تک عزیز تھیں کہ میں انہی کے مطابق جینے کا عادی تھا اور جینا چاہتا تھا۔ لہٰذا ایک روز میں نے دل کڑا کر کے فیصلہ کیا کہ "تیرے میرے" تصور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے میں اپنے ہی ڈھنگ سے جیوں گا۔ چاہے دُنیا اِدھر سے اُدھر کیوں نہ ہو جائے۔

وقتاً فوقتاً کسی شاپنگ آرکیڈ میں گھومتے پھرتے کوئی شئے پسند آ جاتی تو میں عادتاً دفعتاً اُسے خرید کر گھر لے آتا تھا۔ نئی شئے دیکھ کر سمنتھا کے چہرے پر مارے خوشی کے خون دوڑ جاتا اور وہ بڑھ چڑھ کر میرے انتخاب کی داد دیا کرتی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد جب میں اُس شئے کے دام زیرِ لب بتایا

کرتا تھا تو وہ بھی خاموشی اختیار کر کے یوں گم ہو جاتی، گویا گھر پر موجود ہی نہ ہو۔ شاید اُسے معلوم تھا کہ کہیں اُسے آدھی رقم نہ ادا کرنی پڑے۔ تقریباً ہر ویک اینڈ پر کسی شاندار ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا ہمارا معمول بن چکا تھا۔ کبھی کبھار ہم کوئی ڈرامہ دیکھنے بھی چلے جاتے۔ گھر کے بعض چھوٹے موٹے بل میں خود ہی چکا دیا کرتا تھا۔ لیکن سمنتھا معمولی عورت نہ تھی۔ بامعنی نظروں سے مجھے تکتی رہتی تھی۔ جانتی تھی کہ میں پیسے لُٹا کر اُس کے ارد گرد جال تنا جا رہا ہوں اور اُسے شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طور الجھا رہا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک روز اُس نے شکایتاً کہا تھا۔ "تمہیں پیسے کی ذرا بھی قدر نہیں۔"

"مجھے ۔۔؟" میں نے صریحاً انجان بن کر کہا۔

"ہاں تمہیں۔ تم جانتے ہو کہ ان ملکوں میں پیسہ کمانا کتنا مشکل کام ہے اور لوگ پیسے کو کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ لیکن تم جو کماتے ہو خرچ کر ڈالتے ہو۔"

"تو کیا ہُوا ۔۔ میں خرچ کسی غیر پر تو نہیں کرتا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ تمہیں آگے کی بھی سوچنا چاہیئے۔"

"ڈارلنگ۔ آنے والا وقت کس نے دیکھا ہے۔ جو میں اُس کی فکر کروں۔"

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم اپنی ساری کمائی مجھ پر اور گھر پر خرچ دیا کرو۔"

اُس کی ناراضگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے کچھ پریشان، کچھ فکرمند پا کر میں انتہائی خوش تھا کہ اُس نے میرے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں لے لیا اور اُس کے ماتھے پر ہونٹ رکھ کر کہا۔ "سمنتھا مجھے گھر کی خوشی بڑی عزیز ہے اور سچ پوچھو تو میرے نزدیک گھر کی خوشی پہلے آتی ہے اپنی بعد میں۔" وہ عجیب نظروں سے مجھے تکتی جا رہی تھی، گویا اُسے میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔ لیکن جب میں نے سچے من سے گردن ہلا کر ایمانداری کا ثبوت پیش کیا، تو وہ بے تحاشا مجھ سے لپٹ گئی تھی اور مجھے اتنے زور سے بھینچا تھا کہ یکبارگی میرا روم روم جاگ کر مجھے احساس دلانے لگا تھا کہ وہ مجھ میں سما جانا چاہتی ہے۔

اس رات ہماری آتماؤں نے سرگوشیاں کی تھیں، پیار کے گیت گائے تھے اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ہنی مون کی رات تھی۔

دُھند کے چھٹتے ہی دُور دُور تک سرسبز زمین دکھائی دینے لگی تھی۔ میرے رہن سہن، میری فراخدلی اور میرے رویّوں نے سمنتھا پر کچھ ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پگھلنے لگی تھی اور عورت جب کسی مرد کے لئے پگھلنے لگتی ہے تو وہ جلد ہی اُس کی نظروں سے دنیا کو دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ لیکن جہاں تک میری پہلی اور آخری بیوی کا سوال تھا تو وہ تمام جذباتی دیواروں کو توڑ کر میرے قریب ضرور آ گئی تھی۔ لیکن مالی دیواریں جوں کی توں کھڑی تھیں۔ اُنہیں گرانا یا پھلانگنا غالباً اُسے منظور نہ تھا ۔۔ اور ایک روز تو انتہا ہو گئی۔ بات معمولی تھی لیکن کبھی کبھار معمولی بات غیر معمولی بن کے دلوں کے فاصلے بڑھا دیتی ہے اور آدمی یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ جہاں سے چلا تھا اب بھی وہیں کھڑا ہے۔

میں اچھا بھلا لاؤنج میں بیٹھا ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا۔ پروگرام افریقہ کی WILD LIFE سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب سمنتھا کچن سے فارغ ہو کر میرے قریب آن بیٹھی ہے۔ اچانک اُسے اپنے قریب بیٹھا ہوا پا کر مجھے تھوڑا بڑا اچنبھا ہوا لیکن وہ ڈاکیومینٹری میں ذرا بھی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ اُس کی اکتاہٹ حد سے بڑھ کر جب اُس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تو اس نے ایک پل غضب ناک نظروں سے مجھے دیکھا، چپکے سے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور کھٹاک سے چینل بدل ڈالا۔ پروگرام کے بدلتے ہی میرا ذہنی سوئچ آف ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی صفائی میں یک لخت بول اُٹھی۔

"تم ہمیشہ اُلٹے سیدھے پروگرام دیکھتے رہتے ہو ۔۔۔ اور بھول جاتے ہو کہ اس گھر میں کوئی دوسرا بھی رہتا ہے؟"

اُسے اُکھڑا ہوا پا کر مجبوراً مجھے کہنا پڑا ۔۔ "شاید تم سوچتی ہو کہ میں خود غرض ہوں ۔۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر تم وہ پروگرام کیوں نہیں لگاتے جنہیں میں بھی پسند کرتی ہوں۔"

"ضروری نہیں ہے کہ تمہاری پسند میری پسند بھی ہو؟"

"اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے ۔۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ یہ ٹیلی ویژن صرف تمہارا نہیں، میرا بھی ہے۔ میں نے بھی برابر کے پیسے ادا کئے ہیں۔"

یکبارگی "تیرے میرے" کا تصوّر اُبھر آیا تھا، جس سے میں اکثر پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے بات کو ٹالنے کی غرض سے مذاقاً کہا۔

"تم چاہو تو ٹیلی ویژن کو دو حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔ ایک حصہ تم رکھ لو، دوسرا میں۔ پھر اپنی اپنی پسند کا پروگرام دیکھا کریں گے۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

اُسے لال پیلا پا کر میں بھی کچھ کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر سارا معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

"بات چھوٹی سی تھی ۔۔ تم نے مجھ سے کہا ہوتا یا اشارہ بھی کیا ہوتا تو میں خود ہی پروگرام بدل دیتا۔"

"کیا۔ ؟ میں تم سے کہتی ۔۔۔ ؟"

اُس کے لہجے کی حیرانگی، تندی اور بدلتے ہوئے تیور سے واضح تھا کہ اُسے میرا رویہ قطعاً پسند نہیں آیا۔ بلکہ میرا ادا کردہ جملہ اُس کی انا کو اتنی شدت سے چھو گیا ہے کہ وہ اندر ہی اندر تڑپ اُٹھی ہے اور اب بہت جلد طوفان آنے والا ہے ۔۔۔ واقعی وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح بپھر اُٹھی تھی۔

"تم میرے شوہر ضرور ہو۔ لیکن میرے مالک نہیں کہ میں ہر بات کے لئے تم سے کہتی پھروں، پوچھتی پھروں۔

۔۔۔ میری اپنی بھی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟"

"اس سے کون انکار کرتا ہے۔"

"تو پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے کہوں گی ۔۔۔؟ تمہیں خود احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اِس گھر میں کوئی دوسرا بھی رہتا ہے۔"

خاموش رہ کر میں نے ایک چپ سو سکھ کی ترکیب استعمال کرنا چاہی۔ لیکن طوفان کو بہر حال آنا تھا۔ آیا اور بربادی کے آثار چھوڑ کر چلا گیا۔

"کیوں بھول لیتے ہو کہ اِس گھر کی ہر چیز پر میرا برابر کا حق ہے ۔۔۔ میں برابر کا خرچہ ادا کرتی ہوں اور میں کسی بھی طرح تم سے کم نہیں۔"

"میں جانتا ہوں ۔۔۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ خوبصورت گھر، جیسے ہم نے مل کر بنایا ہے۔ ہمارا ہے اور ہم دو نہیں، ایک ہیں ۔۔۔ ایک۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ۔۔۔ اگر کل ہم میں سے ایک خرچہ دینا بند کر دے تو جانتے ہو انجام کیا ہوگا۔۔؟

خاموش رہنا ہی میرے لئے مناسب تھا۔ لہٰذا خاموش رہا۔

"نہ تو یہ گھر چلے گا اور نہ ہی زندگی کی گاڑی آگے بڑھے گی۔"

یکبارگی مجھے احساس ہوا کہ جن دیواروں کو سمنتھا گرا کر میرے قریب آئی تھی، وہ دیواریں پھر سے کھڑی ہو گئیں ہیں۔ اُن کا قد پہلے سے بھی اونچا ہو گیا ہے اور میں کوشش کے باوجود اُنہیں گرانے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ میں ہکا بکا بھٹی بھٹی نظروں سے اُسے دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک بھیانک خوف خیال کی صورت میں میری سوچ میں اُبھرا اور میں نے فوراً اُس کی توثیق کرنا چاہی۔

"فرض کر دو کل میں بیمار پڑ جاتا ہوں یا اپاہج ہو جاتا ہوں۔ یا یوں سمجھو کہ میری نوکری چھوٹ جاتی ہے اور میں گھر کا خرچ دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اُس صورت میں تم کیا کرو گی۔۔؟

میرے سوال نے اُسے دیوار کے سامنے لا کھڑا کر دیا تھا لیکن وہ معمولی عورت نہ تھی۔ جانتی تھی کہ اُسے کیا جواب دینا ہے۔ گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ سوچ کر گویا ہوئی۔

"میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے درمیان زندگی تلخ ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ پیسہ ہے تو زندگی ہے۔ ورنہ آدمی اپنی قدر کھو بیٹھتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور کھٹاک سے چینل بدل کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وائلڈ لائف کا پروگرام پھر سے شروع ہو گیا۔ میری آنکھیں دوڑتے بھاگتے اُچھلتے کودتے جانوروں کو ضرور دیکھ رہی تھیں۔ لیکن میرا ذہن کہیں اور ہی کھویا ہوا سوچ رہا تھا کہ شادی تو آتماؤں کا سنگم ہوتی ہے۔ پیسہ تو آنی جانی اضافی شئے ہے۔ لیکن وقت کے کروٹ لینے پر وہ اتنی زبردست قوت بن گیا ہے پیار، محبت، ایثار سب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ایک شام میں تھکا ماندہ گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ میں نے سمنتھا کو اس قدر خوش پایا کہ وہ مجھے بالکل ہی الگ عورت نظر آئی۔ خوشی و منع گردن فخر سے چھت کو چھو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اُس نے ساری کائنات کو فتح کر کے جیب میں ڈال رکھا ہے۔ آگے بڑھ کر وہ مجھ سے دیوانہ وار لپٹ گئی اور چھوٹتے ہی بولی۔

"چائے کو بھول جاؤ۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ایک خوشخبری ہے ریسٹورنٹ میں چل کر سناؤں گی۔"

میں دم بخود اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

"گھبراؤ مت ۔۔۔ آج میں تمہیں TREAT کروں گی۔"

اُس کے رویئے میں ناقابل یقین تبدیلی پا کر میں اس قدر گھبرا گیا ہو بیٹھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی پیشکش کو قبول کروں یا ٹھکرا دوں ۔۔۔ لیکن زندگی ایک نیا موڑ لیتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ جہاں رفاقت تھی۔ اُمید تھی، روشنی تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ اُس کے لئے میرا اندرون شادی کے روز سے تڑپ رہا تھا۔

انڈین ریسٹورنٹ کے بنگلہ دیشی ویٹر نے ہماری مانگ کے مطابق جو ٹیبل ہمیں دی، وہ گوشہ واقعی خاموش تھا۔ وہاں ایک مغل پینٹنگ بھی آویزاں تھی۔ جہاں اکبر بادشاہ اپنے عہد کے نورتنوں سے مخاطب تھا۔ سمنتھا نے وائن اور کھانے کا آرڈر دے کر وینٹی بیگ میں سے ایک خط نکالا اور میری طرف بڑھا کر کہا۔

"لو۔ پڑھو اِسے۔ اچھی خبر اِسی میں موجود ہے۔"

خط اِس کی ملازمت سے تعلق رکھتا تھا۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے اس کی قابلیت کو سراہتے ہوئے اُسے اونچے عہدے پر فائز کر دیا تھا اور اس کی تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن اس شرط پر کہ اس کا تبادلہ لندن سے مانچسٹر میں کیا جائے گا اور سات دنوں میں

اُسے ہاں یا نہ میں اپنا فیصلہ سنانا ہوگا۔

اُس سے آنکھ ملائے بنا میں نے خط کو تہوں میں لپیٹا لفافے میں ڈالا اور اُسے میز کے وسط میں رکھ کر ایک نظر نیم تاریک گلاس میں سمنتھا کے آر پار دیکھا

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے ؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گی ۔ لیکن تمہارے چہرے سے میں نے پڑھ لیا ہے کہ تمہیں خط پڑھ کر خوشی نہیں ہوئی ۔"

خاموش رہنا ہی میرے لئے مناسب تھا۔ لہٰذا میں خاموش رہا۔

"جانے کیوں اس دُنیا کا ہر مرد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی نے بڑا رتبہ حاصل کر لیا ہے اور وہ پیسے بھی زیادہ کمانے لگی ہے ..... وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی عمر بھر اُس کے انگوٹھے تلے دبی رہے ۔"

"ایسا مت کہو۔" میں نے قدرے اکھڑ کر کہا۔ "عورت ذات کے متعلق تم میرے خیالات جانتی ہو ۔ میں نے اُسے ہمیشہ برابر کا درجہ دیا ہے ۔ کئی معاملوں میں وہ مرد سے بھی آگے ہے ۔ زندگی کا دُکھ درد جو وہ سہتی ہے ، مرد نہیں سہہ سکتا ۔"

"تو پھر میری ترقی جان کر تم خوش کیوں نہیں ہوئے ؟"

"مجھے خوشی ہوئی ہے اور نہیں بھی ۔"

ویٹر سرخ وائن کی بوتل لے کر چلا آیا تھا اور ہمارے گلاس قریب قریب بھر کر چلا گیا۔ سمنتھا نے سر جھکا کر لفافے کو اُٹھایا اور بے چینی سے لفافے کو الٹنے پلٹنے لگی ۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ لیکن ہچکچا رہی تھی ۔ کچھ دیر تک اُس کی مخروطی انگلیاں لفافے سے کھیلتی رہیں۔ پھر سر اُٹھائے بنا ہی وہ اچانک بول اُٹھی ۔

"ایسا موقع شاید ہی میری زندگی میں پھر آئے ۔ عہدہ بھی اچھا ہے اور پیسہ بھی ۔۔ کیا خیال ہے تمہارا ۔ ؟"

"فیصلہ تمہیں کرنا ہے ۔ مجھے نہیں ۔ میں تو صرف مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔"

"لیکن مجھے تمہارے مشورے کے علاوہ تمہارا فیصلہ بھی چاہیئے ۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔ لہٰذا میں نے بے باک ہو کر کہا ۔ "میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم مانچسٹر چلی گئیں تو میں لندن میں بالکل ، تنہا ہو جاؤں گا ۔"

اُس نے کرسی آگے کھسکائی اور میرا ہاتھ تھام کر یقین دلاتے ہوئے کہا "میں ہر ویک اینڈ تمہارے ساتھ لندن میں گزارا کروں گی ۔۔ یہ میرا وعدہ"

میں نے ایک پل اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سچ ہی سچ تھا اور ساتھ ہی ایسا، جو دوسرے کو یقین دلاتے ہوئے 'ہاں' کہلوانے پر مجبور کر دے

"مانچسٹر کون سا دُور ہے .... ذرا سوچو تو ... صرف دو گھنٹوں کا تو راستہ ہے ۔ پھر تمہارا دل جب چاہے تم میرے پاس آ سکتے ہو ۔"

میری روح کی گہرائیوں تک یہ احساس اترنے لگا تھا کہ اُس نے خود کو تیاگنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے اور اب ہماری زندگیاں مختلف دھارا پر بہہ کر الگ الگ سمتوں میں سفر کریں گی ۔ ہم میاں بیوی تو ضرور رہیں گے ۔ لیکن شہروں کے فاصلے، ایک دوسرے کی عدم موجودگی، شخصی آزادی اور خود مختاری ہمیں روز بروز دور کرتی چلی جائے گی ۔ اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ ہم برائے نام میاں بیوی قرار دئے جائیں گے ۔

"سمنتھا ! یہ معاملہ بڑا الجھا ہوا ہے ۔ ہماری زندگیاں بھی اس میں الجھ کر رہ جائیں گی ۔"

"اگر ہم ہر پہلو، ہر نکتے کو سوچ سمجھ کر طے کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری زندگی پر حرف بھی آئے ۔ اور کوئی غلط فہمی پیدا ہو ۔"

"جلد بازی مت کرو ۔ ابھی وقت ہے ۔ مجھے بھی سوچنے دو ۔"

"ٹھیک ہے ۔ لیکن یاد رہے کہ میرے انکار کرنے پر مجھے اس عہدے سے ہمیشہ کے لئے محروم رکھا جائے گا ۔" "کیوں ؟"

"اس وقت کمپنی میں کوئی بھی سینئر آدمی ایسا موجود نہیں ہے ، جسے یہ عہدہ پیش کیا جا سکے ۔"

نو آبادیات کی دین نسلی امتیاز اور رنگوں کے بھید بھاؤ میں میرا ذہن اُلجھ کر رہ گیا ۔

میری زندگی ایسے مقام پر آن کھڑی ہوئی تھی ، جہاں ہر گزرتا ہوا لمحہ مجھے یہ احساس دلا کر گزر رہا تھا کہ جس زمین پر کھڑا ہوں وہاں پھسلن ہی پھسلن ہے ۔ یہ خیال ہی میرے لئے دیمک بن گیا تھا کہ سمنتھا کا تبادلہ ہماری ازدواجی زندگی کو رفتہ رفتہ ختم کر ڈالے گا اور میرے شریک کار وہ انگ جس کی مدد سے میں سانس لے رہا ہوں ، بجھ کر خاک ہو جائے گا ۔ دوسری طرف اس کی ترقی تھی ، مستقبل تھا ۔ دلی خواہش تھی ، اگر انہیں سراہا نہ گیا تو اور نہ ہی ان کا احترام کیا گیا تو وہ یقیناً مجھے خود غرض ، کم ظرف ، اور مکار ٹھہرائے گی ۔ سوچ سوچ کر میرے بالوں کی تہیں سفید ہوتی جا رہی تھیں ۔ اور میں اندر ہی اندر بوڑھا ہوا جا رہا تھا ۔ ساتھ میں یہ احساس بھی تنگ کئے جا رہا تھا کہ سماجی وقار رتبہ اور پیسہ اس قدر اہم بن گئے ہیں کہ انہیں پانے کے لئے آدمی سبھی رشتے ناطے توڑنے پر آمادہ ہو بیٹھا ہے ۔

آخر وہ دن ، وہ گھڑی ، وہ لمحہ آن پہنچا ، جب مجھے اپنے فیصلے کا اعلان کرنا تھا ۔ اُس سمے میں نے خود کو میدانِ کارزار میں کھڑا ہوا پایا ۔ زرہ بکتر پہنے اور

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھیے]

## افتخار عارف

## ادا جعفری

◆

گئے ہوئے تھے قدم ، انحراف کیا ہوتا
گناہ طرزِ نگہ تھا ، معاف کیا ہوتا

جھکی ہوئی مری آنکھیں سِلے ہوئے مرے لب
اب اس سے بڑھ کے ترا اعتراف کیا ہوتا

خود اپنی وحشتِ جاں سے وفا نہ کی ہم نے
زمانہ اور ہمارے خلاف کیا ہوتا

دیئے تو اب بھی دیئے ہیں وہ بزم ہو کہ حرم
بجھے ہوئے دل و جاں سے طواف کیا ہوتا

ستارہ تھا بھی تو آنسو کا استعارہ تھا
کسی فلک کا یہاں انکشاف کیا ہوتا

لپکتے شعلوں کو بارش بجھا گئی ، لیکن
دھواں جو لکھتا رہا ہے وہ صاف کیا ہوتا

وہی غبارِ تمنا ، وہی شمیمِ دعا
تو روز و شب میں مرے اختلاف کیا ہوتا

بی/۸ / ۳۳۳، بلاک ۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی
کراچی ۲۹، پاکستان ،

◆

حریمِ شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
درونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے

کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے

کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اِسی پہ بِنائے عذاب رکھتا ہے

کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی پہ گواہ
کبھی اُسی پہ دلیلِ حجاب رکھتا ہے

کبھی فغاں کی طرح رائیگاں اثاثۂ حرف
کبھی دعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے

کبھی برستے ہوئے بادلوں میں پیاس ہی پیاس
کبھی سراب میں تاثیرِ آب رکھتا ہے

میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

■

غبارِ دشتِ طلب زیادہ ہے تو جنوں میں زیادہ ہو جا
مہارِ ناقہ کو پشتِ ناقہ پہ ڈال دے پا پیادہ ہو جا

بس ایک ہی راستہ ہے دنیا کو زیر کرنے کا، ہیچ ہو جا
یہ جتنی پُرپیچ ہوتی جائے اسی قدر تو بھی سادہ ہو جا

یہ مرتبہ کہ خود تری منزلیں تعاقب کریں گی تیرا
بس ایک محمل کو دیکھ اور بے نیازِ ہر دشت و جادہ ہو جا

وہ جس کے ادنیٰ سے اک اشارے پہ مہر و مہتاب چل رہے ہیں
اسی کے قدموں پہ اپنی مرضی کو ڈال دے بے ارادہ ہو جا

اور اس سے پہلے کہ چشمِ بینا سے تابِ نظارہ چھین لی جائے
قریب کے منظروں میں زنجیرِ ذہن کچھ تو کشادہ ہو جا

URDU MARKAZ, 28 - SACKVILLE STREET,
PICCADILLY, LONDON, W1X 1DA

## کمال احمد صدیقی

وہ ماتیوں میں نہاں تھا وہی تو حال میں ہے
اک انقلاب کہ جو عالمِ مثال میں ہے

وہ آرزو کا جہاں بھی تو ہے کہیں نہ کہیں
کہیں نہیں، تو کم از کم مرے خیال میں ہے

جوازِ جبرِ مسلسل کا ہے جواز ترا
مرے سوال کا مقصد مرے سوال میں ہے

یہ ٹھیک ہے تم نے بنایا کُدال کا نقشہ
، بازوؤں کا مرے زور جو کدال میں ہے

وہ خود کو جہل کا پتلا ہمیشہ کہتا تھا،
اِک فکر و نظر حلقۂ کمال میں ہے

وہ حرفِ حق، جو زبانوں میں ہے، کتاب میں ہے
شعورِ عہد بنا ہے تو انقلاب میں ہے

یہ کیا کیا کہ مرا جام بھر دیا ساقی
کہ میری تشنہ لبی منزلِ سراب میں ہے

یہ قتلِ عام یہ فسطائیت کا جشنِ عظیم
اور اس کا خرچ بھی جمہور کے حساب میں ہے

سجا ہے جس طرح سے نظامِ قزاقی
وہ سرغنہ ہے پریزاد کے نقاب میں ہے

اگر بچا تو یہ تصویر بھی بناؤں گا
کمال! منظرِ شاداب جو سراب میں ہے

۲۰۷ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲ ۰ ۰ ۱۱

## حقیر آستانوی

خواب کی طرح زندگی گذرے
عالمِ خوف و بے بسی گذرے

جو اَنا کا، خودی کا، مسکن ہو
اس کی چوکھٹ سے بے خودی گذرے

لمحہ لمحہ حیات تو پھوٹے
ہر نفس موت کی کمی گذرے

آنے دیجیے مصیبتوں کو ادھر
ایک گذری ہے، دوسری گذرے

زندگی زندگی نہیں جن کی
جانے وہ لوگ کیسے جی گذرے

دھوپ میں دیکھتے ہیں کیا ہو گا
اب تو جیسے بھی چاندنی گذرے

تیری قربت میں تیری صحبت میں
باقیماندہ رہی سہی گذرے

ہوگی سنوائی جب کبھی ہو گی!
پہلے سجدوں سے بندگی گذرے

پالیا منزلوں کو راہوں میں
یہ کہاں سے حقیر بھی گذرے

۲۰۷۔ گولڈ کراؤن۔ جے پی روڈ۔
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸



حسین الحق
ریڈر، پوسٹ گریجویٹ، شعبۂ اُردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

# رام نگر کب آئے گا

اچانک بارش شروع ہو گئی اور بکریاں کسی چھت کی تلاش میں ہرن کی مانند بھاگنے لگیں۔

حالانکہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں اس کا امکان تو رہتا ہی ہے لیکن یاد کسی کو بھی نہیں رہتا، شاید اسی لئے امکانی حادثہ بھی غیر متوقع محسوس ہوتا ہے..... اُن سب کے لئے بھی یہ غیر متوقع تھا لہٰذا سبھی پریشان تھے۔

وہ سب ایک شہر یا آس پاس کی بستیوں کے رہنے والے تھے، اس لئے یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوتیں تو سبھی کا پروگرام ایک ساتھ بنتا...... یونیورسٹی اسٹیشن سے یہاں تک ایک ٹرین اور پھر یہاں سے دوسری ٹرین پکڑ کر گھر۔

یہ روز کا معمول تھا!

آج بھی سب ایک ساتھ چلے اور ایک ساتھ مصیبت میں گرفتار ہوئے۔

سب یونیورسٹی کے طالب علم، من چلے، طاقت کے زعم میں گرفتار، اور یہ اطمینان کہ گھر جا رہے ہیں، نہ لحاف نہ کمبل نہ فاضل گرم کپڑے، بس ہاف سوئٹر اور کوٹ بدن پر ڈالا اور روانہ ہو گئے کہ آٹھ بجے دن میں چلے تھے اور امید تھی کہ شام ہوتے ہوتے گھر پہنچ جائیں گے..... یہ کیسے پتہ تھا کہ جس راستے سے انہیں گھر جانا تھا اُس راستے پر دو مال گاڑیوں کی ایسی ٹکر ہو جائے گی کہ لائن صاف ہوتے ہوتے رات گزر جائے گی۔

مگر جو انہوں نے سوچا نہیں وہ ہو چکا تھا

ٹرین کینسل..... دسمبر کی ٹھنڈی رات سر پر...... اور اب یہ بارش

... سب سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔

اِس ناگہاں آفت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے نا؟" ترسیم سنگھ تھو تھو کرتے ہوئے بولا

"ناگہانی ہو یا ہاں گہانی.... آفت تو آفت ہے جانی" فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو اپنے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے کہا

"میری منتا کون سنے ہے؟" راہل ورما جھلا کر کہنے لگا..." میں تو بس جو کہتا ہوں اس کی کاٹ فرور ی ہے... میں نے کتنا کہا" بند ھو گرم چادر اور کمبل رکھ لو... مت مانو میری بات..... اب بھگتو!"

"بول لو راجہ بول لو۔ بہار ابھی سیجئے آئے گا۔" فضل الرحمٰن ہنسا

"یار راہل! زورآور سنگھ نے فضل الرحمٰن کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا وہ اب بھی ترسیم سنگھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت تو تم بھی وہ ڈائیلاگ بول سکتے ہو شالو چپاشنالو۔ بہار ابھی شیشے آئے گا"

"پر یار! کچھ الٹا ہو رہا ہے" لوکیش دت ہنسا

"کیا؟" زورآور نے لوکیش کو دیکھا

"ترسیم سنگھ کا رول اس وقت فضل الرحمٰن ادا کر رہا ہے"

"آجا پیارے"۔ زورآور ہنس کر لوکیش کی طرف باہیں پھیلاتا ہوا بولا میں ترسیم سنگھ کا SUBSTITUTE بننے کو تیار ہوں"

ہے ہے..... یہ ہوا میرا فوٹو کیمرہ اس وقت" راہل ورما سینے پر ہاتھ مار کر بولا

"پھر غلط ڈائیلاگ ادا کر رہے ہو تم"۔ زورآور ہنسا..." کہو کہ ذرا میرا فوٹو کیمرہ تو لانا برو زن ذرا میری فرولی تو لانا!"

"اس کو تو قرولی، چاقو، تلوار.... ہر وقت یہی سب کچھ یاد رہتا ہے"۔ سہراب جو زردوالا ہنستے ہوئے بولا

"قومی ورثہ"! شاداب عنایت نے سہراب کے چھکے پر نہلا مارا۔

"بیٹے خان! اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" لوکیش نے شاداب کے نہلے کو دہلے سے دبایا

"حقیقت خرافات میں کھو گئی....." شاداب نے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپ لگائی...... اور سب ہنس دیئے۔

اچانک ترسیم سنگھ اٹھا تو سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں

"ذرا پتہ چلا آؤں یار! شاید کوئی راستہ نکل آیا ہو" وہ کہتا ہوا اکوائری

کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹ کے بعد لوٹا تو سب سے زیادہ استفہامیہ نظر زور آور سنگھ کی تھی

"کیا ہوا؟" فضل الرحمٰن نے پوچھا

"ڈھاک کے تین پات!" جھلائے لہجے میں جواب دیتے ہوئے ترسیم سنگھ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

ترسیم اپنی جگہ بیٹھ تو گیا مگر اس کا انداز بڑا عجیب سا تھا.... اکھڑا اکھڑا بھی.... اور گھبرایا گھبرایا بھی!

"یار تو تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہراس کرتا ہے.... اس سرد ترین رات میں لائن پر گراؤنڈ ہماری خاطر کون اٹھائے گا؟"

ترسیم سنگھ نے کچھ جواب نہ دیا، شاید اُس نے فضل الرحمٰن کی آواز سُنی ہی نہیں اُس کے خیال کی رو بھٹک گئی تھی...." بھاپا انتظار کر رہے ہوں گے، کل لڑکے والے ویراں والی کو دیکھنے آئیں گے، میرا پہنچنا ضروری ہے، ماں تو شام ہی سے بے چین ہو رہی ہو گی، بابا کچھ کہتے نہیں پھر پریشان تو وہ بھی ہوں گے، پچھلی ہی مرتبہ گھر سے آتے ہوئے انہوں نے کتنا سمجھایا تھا.... حالات بدل چکے ہیں، زیادہ رات تک ہوسٹل سے باہر نہیں رہنا چاہئے، اجنبی علاقوں میں گھومنے کی عادت اب چھوڑ دو، یہ آخری سال ہے کسی طرح گزار لو، تمہارے کینیڈا والے تایا سے بات ہو چکی ہے تعلیم مکمل کر کے وہاں چلے جانا، مگر میں کیسے جا سکوں گا؟ میں تو اس بُری طرح HOME SICKNESS کا شکار ہوں کہ دو تین مہینے ہوتے ہوتے طبیعت بے چین ہونے لگتی ہے اور اپنا گھر محلہ اور شہر یاد آنے لگتا ہے.. رام نگر تو میرے خواب میں بھی آتا رہتا ہے، میری تو شدید تمنا تھی ایم اے کر کے وہیں کے کسی کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا اور باقی زندگی گزار دوں گا..... اور بھاپا کہتے ہیں کہ کینیڈا چلے جاؤ.... ہمیشہ کے لئے.... مگر اب... اب تو لگتا ہے کہ جانا ہی پڑے گا....؟

"بادشاہو! کہاں ہو؟" شاداب نے اُس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلایا

"کہیں نہیں۔" زور آور ہنسا

"کہیں کیوں نہیں؟" ترسیم جھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا.... کیا میرا ہوم لینڈ نہیں ہے؟"

"کون سا ہوم لینڈ بیٹے؟" راہل ورما چونکا

"کون سا ہوم لینڈ؟" ترسیم کا لہجہ کڑواہٹ سے بھرا تھا۔ "کیا ہوم لینڈ بھی دس بیس ہوتے ہیں؟"

"سے خان! وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اُس ایک ہوم لینڈ کا نام کیا ہے؟

"اے شکی.... بدگمان.... میں اپنے رام نگر کی بات کر رہا ہوں۔

لو بھائی راہل ورما! تم پہاڑ کھود رہے تھے چوہیا نکل آئی۔"

مگر راہل ورما بھی کیا کرے! ترسیم سنگھ نے یہ غلط فہمی تو خود پھیلائی ہے.... رام نگر میں یہ پیدا ہوا.. بٹالہ میں اس کا ننھیال ہے.... اور اس کے باپ دادے لاہور میں رہتے تھے.... یہ تو وہ خود تین تیرہ ہو گیا ہے.... میرے نانا کے بٹالہ میں یہ ہے اور میرے دادا کے لاہور میں وہ تھا.... رام نگر، بٹالہ، اور لاہور.... اس کے لاشعور میں تو ہنگامہ بپا ہے.... ایسے میں راہل ورما کی کیا گرفت کی جائے؟

"یہاں سے رام نگر کوئی بس نہیں جاتی؟" ترسیم آپ ہی آپ بڑبڑایا

"نہیں پیارے" کسی نے جواب دیا

مگر فوراً ہی سب کی توجہ پاس والی بنچ پر بیٹھے افراد کے درمیان ہوتی گفتگو کی طرف منتقل ہو گئی۔

"مرکزی ساری کوششیں بیکار ہو رہی ہیں.... جس کا جہاں، جو جی چاہتا ہے کر گزرتا ہے"

"جب تک ان کے ساتھ پوری سختی نہیں ہو گی، یہ ہوش میں نہیں آئیں گے۔"

"خود تو پورے ملک میں قومی یک جہتی کا ترانہ گاتے ہیں اور وہاں۔"

"یہی تو ان کی مکاری ہے، پتہ نہیں کس گدھے نے ان کو بیوقوف مشہور کیا!

سبھی دوست اچانک چپ ہو گئے...... پاس والی بنچ پر گفتگو ہنوز جاری تھی

"تمہارا لوٹنے کا پروگرام کب ہے؟" لوکیش دت نے ترسیم سنگھ سے پوچھا

"پہلے گھر تو پہنچ جایا جائے" زور آور نے جواب دیا

"ارے بھائی! گھر تو پہنچ ہی جائیں گے" فضل الرحمٰن بیچ میں کودا۔

"یہ عادی ہو گیا ہے، تھیٹرا اور بے حیا تو شاید ایسے ہی لوگوں کو کہا جاتا ہے" ترسیم کو ہنسی آ گئی مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا.... کیا قومی معاملات میں بے حیائی کا لبادہ اوڑھنا ضروری ہے؟ اب اسی زور آور کو دیکھو کیسے اطمینان سے قہقہے لگا رہا ہے.... کہتا ہے جو گزرنی ہے اُسے کوئی روک نہیں سکتا.... یہ کون نہیں جانتا.... لیکن احتیاط برتنے کو بھی تو کہا

گیا ہے..... اتنی گہری اندھیری اور سرد رات.... اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم گھر پہنچ ہی جائیں گے.... گھر.... گھر بھی عجب چیز ہے.... نازک حالات میں زیادہ یاد آتا ہے... مگر یہاں کون سے نازک حالات ہیں؟ جو کچھ ہے .... ہو رہا ہے.... وہاں ہو رہا ہے.... اور وہ.... وہ تو ایک بحرانی لمحہ تھا جو گزر گیا... اس نے حرکت بھی تو اتنی ہی بھیانک کی تھی..... اس کا بھگتان تو بھگتنا ہے.... مگر فضل الرحمٰن کا سوال بھی اپنی جگہ لاجواب ہے کہ اگر وہ بھی گوڈسے ہی ہوتا تو.....؟؟

گویا معاملہ صرف نام کا ہے؟؟ مگر یہیں نام کا معاملہ معلوم نہیں ہوتا.... راہل.... شاداب.... زور آور.... سہراب.... یہ سب نام بھی تو علامتیں ہی ہیں.... پھر ان علامتوں کے درمیان ابہام کی پیچیدگی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ ایک دوسرے کا ابلاغ اتنی آسانی سے کیسے ہو جاتا ہے؟؟

ترسیم سنگھ سوالات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کود پڑا تھا اور جواب کا کنارہ ناپید تھا

"اٹنشن پلیز" لاؤڈ اسپیکر چیخا اور سبھی چونک پڑے

"ہوڑہ امرت سر میل اپنے نردھارت سمئے پر پلیٹ فارم نمبر چار پر آ رہی ہے" انکوائری اعلان ہو رہا تھا "لے بھائی پہلی مرتبہ امرت سر میل صحیح سمئے پر آ رہی ہے" راہل ورما کی زبان سے جملہ پھسل گیا۔

ترسیم اور زور آور دونوں کے چہروں پر ڈوبتے سورج کی چھوٹ پڑی

ایک بھلا منش کیلے کے چھلکے پر سے پھسل کر گر پڑا اور چوٹ کی پرواہ کئے بغیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور جھینپے جھینپے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا!

"راہل۔ تم اپنی زبان پر قابو نہیں پا سکتے؟" لوکیش کو واقعی غصہ آگیا تھا

"سوری ترسیم..... برا مت ماننا یار.... بس مذاق میں کہا ہے" راہل کے لہجے سے خجالت ٹپک رہی تھی

زور آور سہراب کی نئی گھڑی دیکھ رہا تھا اور گھڑی کے بارے میں باتیں کر رہا تھا

"بیچارہ زور آور" ترسیم کو بڑا ترس آیا... اپنے آپ کو نارمل پوز کرنے کی کتنی کوشش کرتا ہے مگر....."

اچانک اسٹیشن پر ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی۔

کچھ عجیب ادبدا اور اٹ پٹا سا..... مانو کچھ ایسا جیسا ہونا نہیں چاہئے..... یا پھر کچھ ایسا جس کے چاروں اور ایک دھندلی چھائی ہو... جھٹپٹے کی کیفیت..... کچھ ایسا جو پورا کھلا یا پورا چھپا نہ ہو... سبھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہے تھے.... یہ سب آخر اچانک کیوں ہو گئے؟؟

"اسٹیشن بھی کانسٹی چیونسی ہے کیا؟" سہراب تمسخر آمیز انداز میں بڑبڑایا۔

"ظاہر ہے کہ نہیں" لوکیش نے جواب دیتے ہوئے سامنے دیکھا "مگر ان کے موسم تو ہزار ہوتے ہیں"۔

ڈھیر سارے کھدر پوش ایسے نمودار ہوتے جا رہے تھے جیسے چیونٹیاں شکر کی تلاش میں بل سے نکلتی ہیں

"اچھا یہ بھی؟" فضل الرحمٰن چونکا

"یار تم لوگ پولیس والوں کو دیکھ کر چونک کیوں پڑتے ہو؟" سہراب نے چوٹ کی

"یہ ورسپاہی ہو میرے بھائی" راہل پھر بولا

"نہیں بھائی.... لاگ لگاؤ کا پرانا رشتہ یاد آجاتا ہے۔

سارے اسٹیشن پر ایک عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا جیسے بھونچال آگیا ہو، جوان ہر بنچ پر بیٹھے لوگوں کو گہری نظروں سے دیکھتے اور شاید ان کے اندر باہر کا جائزہ لیتے.... اپنے بھاری بوٹوں کے ساتھ کرچ کرچ.... اور ٹاپ ٹاپ کرتے ادھر سے ادھر آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔

فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو دیکھا.... اس نے ٹھنڈ سے بچنے کے لئے مفلر اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ چوہے دان میں پھنسا چوہا.... چوہے دان کے پاس بلی.... بلی کو چوہے دان کے ایک کونے میں دبکا..... کن انکھیوں سے دیکھتا.... چوہا۔"

فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو دیکھا..... چاہا کہ کچھ کہے... پھر جانے کیا سوچ کر چپ رہا۔

کئی بنچوں سے لوگ ہٹائے جا رہے تھے اور یہاں وہاں جوان پوزیشن سنبھالتے جا رہے تھے۔

کچھ جوان جب اس کی بنچ پر آئے تو لوکیش کھڑا ہوگیا۔

"کہئے.... کیا بات ہے؟ ہم لوگ بھی ہٹ جائیں کیا؟؟" لوکیش کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔

"نہیں نہیں" ان میں جو شاید آفیسر تھا اس نے نرمی سے کہا.... پھر زعد کی طرف دیکھا.... "یہ؟"

"ہمارا دوست ہے۔۔۔ ہم سب دہلی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ ہیں، اپنے گھر رام نگر جا رہے ہیں"۔ راہل پھر کھڑا ہو گیا

فضل الرحمٰن نے زور آور کی طرف دیکھا۔۔۔ زور آور اُس آفیسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا

کبوتر۔۔۔ جو قتل ہوتے وقت اپنے قاتل سے آنکھیں لڑاتا ہے۔۔۔

ترسیم کو نیند آگئی تھی!

آفیسر آگے بڑھ گیا

"اُس سے کہہ دو۔۔۔ چلا گیا!" زور آور نے ترسیم کی طرف دیکھتے ہوئے لوکیش سے کہا

"بک بک مت کرو۔ اسے سونے دو"۔ لوکیش نے آہستہ سے زور آور کو ڈانٹا

"مگر یار۔ تم لوگ اب واقعی عادی مجرم ہو گئے ہو"۔ سہراب نے شاداب پر چوٹ کی

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں"۔ شاداب آہستہ سے گنگنایا

اس سے زیادہ مناسب تو وہ ہوگا۔۔۔ زور آور بولا۔۔۔ "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"۔

"یہ تو تمہارے لئے موزوں ہے"۔ شاداب ہنسا

"اچھا تو چیونٹی کے پر نکل آئے؟" راہل نے ہوٹ کیا

"چیونٹی جب دبتی ہے تب جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟"

"ہاتھی کے پیر تلے آگئی تو؟"

"سونڈ میں گھس گئی تو؟"

"کیا قصہ ہے بھائی؟" راہل، شاداب کو جواب دینے کے بجائے آگے سے گزرتے کھدر پوش کی طرف مخاطب ہوا

"وزیر صاحب امرت سر میل سے جا رہے ہیں" کھدر پوش اک شانِ بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھا۔

"وزیر صاحب؟" ترسیم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں

امرت سر جا رہے ہیں"؟ زور آور بھی برداشت نہ کر سکا

"نہیں۔۔۔ دہلی"! کھدر پوش نے آگے بڑھتے ہی مڑ کر کہا

"تم بھی عجیب آدمی ہو یار"۔۔۔۔ فضل الرحمٰن ہنسا۔۔۔ صدر جمہوریہ دہلی میں، پارٹی صدر دہلی میں، وزیر اعظم دہلی میں۔۔۔ تو وہ امرت سر کیوں جائیں گے؟"

بتائیے بھلا۔۔۔۔ امرت سر کیوں جائیں گے؟ لوکیش دت حلق دبا کر منمنایا

"ہاں جی کیوں جائیں گے؟" شاداب نے زور آور کی پیٹھ پر تھاپ ماری اور جملہ سُر میں اٹھایا

"بھلا کیوں جائیں گے؟" فضل الرحمٰن نے تال میں گرایا۔۔۔ سب ہنس پڑے!

اسٹیشن پر بھی زندگی مسکرا رہی تھی۔۔۔۔ اسٹیشن کا عملہ کافی چاق و چوبند نظر آ رہا تھا، چاروں طرف کالے کوٹوں والوں کی بہار تھی کوئی ٹی ٹی شاید خاک روبوں کو پکڑ لایا اور جلدی جلدی سالا اسٹیشن صاف ہونے لگا، ہاکرس اپنا اپنا خوانچہ سنبھال کر ایک طرف سرک گئے۔۔۔ غریب دیہاتی مسافروں کی سمجھ میں پتہ نہیں کچھ آسکا یا نہیں مگر وہ بھی اپنا بستر کمبل سنبھال کر مین گیٹ کے سامنے اور آس پاس سے دور ہو گئے۔۔۔؟

پھر اچانک ایک آواز مگر بہت زور دار کھلبلی مچی

ہوڑہ امرت سر میل کی روشنی دکھائی دی۔۔۔۔ وزیر صاحب اپنے پرستاروں کے گھیرے میں اسٹیشن پر نمودار ہوئے۔۔۔۔ ۵ فوٹو گرافران کا ایک اسنیپ لینے کے لئے ان کے آگے آگے دوڑنے لگے۔۔۔۔ اور عام جنتا اچک اچک کر دوری سے اُن کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔۔ کچھ کھدر پوش وزیر صاحب سے ہاتھ ملانے اور اُن کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی نیت سے وزیر صاحب تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف۔

راہل دوڑ کر بغیر سوچے سمجھے بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا

زور آور نے پہلے تو آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر جوانوں اور کھدر پوشوں کی نظروں سے گھبرا کر واپس آگیا

لوکیش دت سیٹ پر بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔۔۔ "نان سنس۔۔۔ ایسے ہی تو میرے سامنے میرا کتا بھی کرتا ہے"

اور فضل الرحمٰن اُسے ہوٹ کر رہا تھا۔۔۔ بیٹے! ہمت ہے تو سامنے جا کر بولو!

اور ترسیم ایسے منہ پھلائے بیٹھا تھا جیسے عاشق معشوق میں پہلی مرتبہ جھگڑا ہوا ہو۔

اور پھر ٹرین آئی۔۔۔۔ وزیر صاحب چڑھے۔۔۔۔ اور زندہ باد کے نعروں کی گونج میں ٹرین روانہ ہو گئی۔

اور اسٹیشن۔۔۔۔ جیسا تھا۔۔۔۔ پھر ویسا ہی ہو گیا۔

بنچوں پر ایک دوسرے سے چپک چپک کر بیٹھے لوگ، جگہ جگہ پر ہاکرس

باقی صفحہ ۵۹ پر دیکھیے

## صدیق مجیبی

مسلسل دل لہو کرنا جبیں کو بے شکن رکھنا
بہت آساں نہیں سینے میں زخموں کا چمن رکھنا

بہت حساس ہونا اور جینا اک قیامت ہے
جو دل پتھر کا رکھنا ہو، تو شیشے کا بدن رکھنا

چھتیں آلام کی دیوار و در سب بے یقینی کے
ہمارے روز و شب کہتے ہیں شانوں پر وطن رکھنا

اکیلے پن کا غم اور اک ہجوم یاس کا عالم
سکھایا شہرِ ناپرساں نے دِل کو انجمن رکھنا

غریبِ شہر کہنا خود کو، یاروں کی ادا ٹھہری
بہت مشکل ہوا اب امتیازِ مکر و فن رکھنا

غزل تم کیوں کہو تم کو خدا محفوظِ غم رکھے
یہ وہ دشت بلا ہے لب پہ مشکل ہے سخن رکھنا

نہ ہم جی پائے جیسا چاہتے تھے اب تو مرنا ہے
لحد میں بھی مجیبی کو رفیقو بے کفن رکھنا

◆

شکستہ پر، طائرِ تخیل کو اتنی اونچی اڑان مت دو
فصیلِ غم پار کرنے والو فضول ہے اپنی جان مت دو

میں جانتا ہوں تمہاری سانسیں تمہارے زخموں کو چھیڑتی ہیں
ہر ایک لمحہ ہے حشر ساماں متاعِ جاں پر دھیان مت دو

تم ایک گونگا خیال بن کر ہمارے خوابوں میں بس رہے ہو
ہمارے دکھ مشترک ہیں آؤ ہمیں تم اپنا بیان مت دو

ہماری چیخوں کی شاخ اپنے ہی آنسوؤں سے ہری ہے اب تک
لہو کے رشتے ہیں سب ادھورے حساب دو دو زیان مت دو

تم اپنے زخموں میں آگ بھر کر ٹھٹھرتی راتیں قبول کر لو
سفر کی منزل قریب ہے، اب تھکن کو اپنی اَمان مت دو

تمہاری "مرحبا" نہ سیاست، یقین کا چہرہ جھلس چکی ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پہ امتیازی نشان مت دو

تمہاری تہذیب کے صحیفے تمہارے کلچر کے آئنے ہیں
یزید مانگے جو سر تو دے دو مگر تم اپنی زبان مت دو

وہ جن کے ذہنوں میں کوئی قوسِ قزح نہیں ہے انہیں بھی
تم اپنا دل چیر کر دکھا دو سلام تیر و کمان مت دو

## بشر نواز

یہ حادثات بھی تحریر ہوں کہانی میں
شرارے بجھتے رہے لہر کی روانی میں

بہا کے لے گئی اک تُند موج چہرہ بھی
وہ عکس دیکھنے آیا تھا بہتے پانی میں

جدھر بھی پاؤں بڑھاؤں زمین ہٹ جائے
گھرا ہوا ہوں عجب سحرِ ناگہانی میں

وہ کوئی برف کی چٹان تھی پگھلتی کیا
شل اپنے ہاتھ ہی کر لئے چھیڑ خانی میں

قریب آکے بھی تھا اس کا رکھ رکھاؤ وہی
کچھ احتیاط بھی شامل تھی مہربانی میں

شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی (بہار)

## لطف الرحمٰن

آنکھ میں موج تری، دل میں بھنور تیرا ہے
میں تو بس ایک مسافر ہوں، سفر تیرا ہے

اب ادھر دیکھ مرے جسم پہ روشن ہے شفق
آئینہ مرا سہی، عکسِ ہنر تیرا ہے

ہم جلاتے رہے ہر طاق میں اشکوں کے چراغ
دل خرابہ ہی سہی، دشت میں گھر تیرا ہے

کوئی سوغات تو کرنوں کی ادھر بھی آئے
اے مرے چاند! یہ راتوں کا کھنڈر تیرا ہے

ق

میں کہ منظر میں ہوں جس کے، وہ نظر ہے تیری
میں کہ سائے میں ہوں جس کے وہ شجر تیرا ہے

میری یادوں میں جو روشن ہے، وہ شب ہے تیری
میری پلکوں پہ جو لرزاں ہے، گہر تیرا ہے

میرے سر پہ جو رواں ہے، وہ گھٹا ہے تیری
میری مٹی میں جو برہم ہے شرر تیرا ہے

بجھا بھی موسمِ گل، شمعِ جستجو بھی گئی
اب اس سے رسم و تکلف کی گفتگو بھی گئی

وہی نگاہ جو حسن خانۂ نظر میں رہی
تری تلاش میں نکلی تو کو بہ کو بھی گئی

نہ جگنوؤں نے اجالے، نہ خوشبوؤں کے سفیر
وہ رت جگے بھی گئے دن کی ہاؤ ہو بھی گئی

عجیب وقت پڑا یہ بھی اک محبت پر
بچھڑ گئے ہیں تو ملنے کی آرزو بھی گئی

وہ اک چٹان کہ پیاسی ہے اب بھی ساحل پہ
وہ ایک موجِ رواں تھی کہ جو بہ جو بھی گئی

اب اس سے بڑھ کے بھی کوئی زوال کیا ہوگا
کہاں کے دوست کہ دل داریِ عدو بھی گئی

وہی ہوا کہ ٹپکنے لگا نظر سے لہو
نوائے شعر میں زخموں کی آبرو بھی گئی

● ریڈر، پی جی، شعبۂ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگل پور (بہار)

## کامل قریشی

زندگی بھر کے لئے موت کو آواز نہ دے
جان بھی دے دے مگر دل کا کبھی راز نہ دے

وجہِ رسوائی ہو ایسا کوئی اعزاز نہ دے
وہ جو ہر در پہ جھکے وہ سرافراز نہ دے

منجمد ہو کے کوئی کوہِ گراں ہو بھی تو کیا
حوصلہ دے مجھے چاہے پرِ پرواز نہ دے

ہو گا شیشہ وہ سکندر کے محل کا ورنہ
دل سا آئینہ شکستہ ہو اور آواز نہ دے

مصلحت کوش ہے اس دور کے انساں کا مزاج
نعرۂ حق دے مجھے یا کوئی آواز نہ دے

مل گئی منزلِ مقصد تو ہوا کیا حاصل
دے سفر مجھ کو مسلسل یا تگ و تاز نہ دے

دے جو شاہی بھی دو عالم کی تو اک ہم سا فقیر
دہر کو اپنے جنوں آفریں انداز نہ دے

جامِ دل وہ دے مجھے درد سے لبریز ہو جو
سوز جس میں نہ ہو کامل وہ مجھے ساز نہ دے

● ۲۶۶۲، گلی شیخ صاحب، قریش نگر، صدر بازار دہلی ۶



سلطان سبحانی
۹۳ - ایم ایچ بی کالونی - مالیگاؤں

# چنگاریوں کے جلوس میں مسحور گھوڑا

پارک میں اُس نے سب سے خوبصورت پھول کا انتخاب کیا اور اسے توڑ لیا۔

پھر ایک ایک کر کے اس کی تمام پنکھڑیاں نوچ نوچ کر پھینک دیں۔

گیٹ سے باہر ہوا تو قریب ہی ایک بچّہ پتنگ اڑا رہا تھا۔

اس نے لپک کر اس کی پتنگ کی ڈور توڑ دی۔

سامنے سے ایک لڑکی سائیکل پر چلی آ رہی تھی۔

اس نے دھکا مار کر اسے نیچے گرا دیا۔

اور جب آگے چلا تو اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

چوراہے پر پہنچ کر وہ ذرا دیر رُکا۔ ایک سمت سے ایک براؤن کار آ رہی تھی، وہ قریب آئی تو وہ اس کے سامنے نکل گیا۔ ایک پُرشور دھچکے کے ساتھ کار رک گئی۔ کچھ لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ ٹریفک کانسٹبل نے سیٹی بجائی لیکن اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

"ابھی مر جاتا" پیچھے سے آواز آئی

وہ ہنسا سامنے سے دو لڑکیاں آ رہی تھیں۔ وہ ان کے بیچ سے نکل گیا۔

"پاگل ہے کیا؟" ایک لڑکی نے دوسری لڑکی سے کہا۔

"نہیں! — اندھا ہے شاید"

وہ کھسیا گیا۔ آنکھوں میں برق سی چمک اٹھی۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دور تک ..... صف بہ صف چنگاریاں۔ اس نے آگے دیکھا۔ آگے بھی چنگاریاں ..... اس نے نیچے دیکھا ..... نیچے بھی چنگاریاں۔

"ارے! شہر کہاں چلا گیا" وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ابھی ابھی تو یہیں تھا۔ اچانک وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ سامنے دیکھا۔ دو خوبصورت آنکھیں تھیں۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔ آنکھیں مسکرائیں اور چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر ادھر ہی دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آس پاس دیکھا تو شہر موجود تھا۔

"لگتا ہے یہ شہر مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے" وہ غرّایا "میں ایک ذرہ ہوں اس طلسم خانہ کا۔ ایک دن اس شہر کو ساکت کر دوں گا۔

اس نے فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور اسے پوری قوت سے ایک طرف پھینکا۔ پتھر پولیس چوکی میں سب انسپکٹر کے ٹیبل پر گرا۔

انسپکٹر اچھل پڑا۔

لاٹھیاں حرکت میں آگئیں۔ آس پاس بھگدڑ مچ گئی۔ کئی لوگ گرفتار کر لئے گئے۔

وہ قریب کی ایک گلی میں گھس گیا اور تیز تیز چلتا ہوا ایک پُرشور چوراہے پر نکل آیا۔ سامنے ایک بارونق ریسٹورنٹ تھا۔ وہ اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا۔

چائے آئی — فوراً ختم ہو گئی۔ ایک چائے اور آئی، وہ بھی ختم ہو گئی۔

پھر وہ قریب بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص کی طرف دیکھنے لگا جو نہایت قیمتی سوٹ میں تھا۔

اٹھ کر اس کے قریب گیا۔

"آج کی شام کتنی سہانی ہے" اس نے آہستہ سے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شام! کیا مطلب؟" اس شخص نے حیرت سے کہا "ابھی تو دوپہر ہے"

"دوپہر ..... اچھا تو دوپہر ہی سہی" اس نے سنجیدگی سے کہا "آپ کا یہ سوٹ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے اسے پھاڑ ڈالوں"

"جی؟"

"جی ہاں! یہ میرے کپڑوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ میں اسے پھاڑ ڈالوں گا"

آواز سُن کر دو ویٹر قریب آئے اور .....

اُسے فٹ پاتھ پر اتار کر واپس ہو گئے۔

وہ کھسیا گیا۔ اس نے پتھر تلاش کیا مگر پتھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ پتھر کی تلاش میں بہت دور تک چلا گیا۔

"عجیب شہر ہے...... کہ وقت پڑنے تو پتھر بھی نہیں ملتے۔"

اُس نے آنکھیں اٹھا کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اوہ! میں اُن سمندری سبز آنکھوں سے کتنا قریب آگیا ہوں جن کی گہرائیوں میں طوفان قید ہیں۔"

وہ ایک ویران سی گلی میں ایک بند دروازے پر رک گیا۔ دستک دی ـــ دروازہ کھُلا۔

سمندری سبز آنکھیں سامنے تھیں۔

"اندر آجاؤ"

وہ اندر گیا دروازہ بند ہو گیا۔

سمندری سبز آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ وہ خاموش ان آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظر ہونٹوں پر گئی۔ ہونٹ بھی چمک رہے تھے۔

"بہت دنوں بعد یاد کیا۔ کہاں رہے اتنے دن؟"

اس کی نظر گریبان پر گئی۔ گریبان بھی چمک رہا تھا۔

"آج تم بہت چمک رہی ہو ـــ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ تو رہے ہو۔" سمندری سبز آنکھوں میں شفق سی اُتر آئی۔

"میں اس شفق کو اور گہری کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی شفق؟"

"سامنے تو ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ شفق پورے کمرے میں گردش کر رہی ہے۔

خیر چھوڑو..... آج کی دوپہر کتنی سہانی ہے۔"

"دوپہر؟" سمندری سبز آنکھیں حیرت سے چونک اٹھیں۔ "اب تو شام ہو رہی ہے۔"

"شام؟..... اچھا تو شام ہی سہی۔ میں ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ دنیا واقعی اجنبی ہے اور کیا میں یہاں قید ہوں۔ اگر میں اس کمرے کے سارے فرنیچر توڑ دوں تو کیا تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گی؟"

"تم نے کبھی مجھے خوش کرنے کے بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"میرے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ اگر میں ذرا دیر بھی سوچنے کے لئے بیٹھ جاؤں تو اس شہر کی ساری سرگرمیاں اور حرکت بند ہو جائے گی۔ پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

"لیکن ابھی تو تم اپنے آپ کو قیدی ظاہر کر رہے تھے۔ خیر....."

سمندری سبز آنکھیں اور قریب آکر مسکرائیں: "تم نے مجھ سے شادی کا جو وعدہ کیا تھا، بھول گئے؟"

"شادی؟ یہ تو کسی لیزا کی بلی کا نام ہے۔"

"تم ہوش میں ہو کہ نہیں۔"

"ہاں میں ہوش میں ہوں، دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اس حالت میں مجھے خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ تمہارا جسم ریشم کی طرح گرم ہوتا جا رہا ہے....."

"ریشم گرم نہیں ہوتا..... ہاں ایک بات یاد آئی۔ صوفیہ کہہ رہی تھی کہ پرسوں تم نے اُسے دھکا مار کر کیچڑ میں گرا دیا تھا۔ یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

"وہ بہت صاف کپڑوں میں تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیچڑ میں گر کر وہ کیسی لگتی ہے تو میں نے دیکھا جیسے کنول کا پھول۔"

اچانک کمرے میں پھولوں کی ایک باڑھ آگئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھولوں کے ڈھیر ہی ڈھیر اور اُن کے درمیان گھورتی ہوئی چنگاریاں۔

"اوہ، یہ چنگاریاں یہاں بھی آگئیں۔"

اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور سمندری سبز آنکھوں کا لباس تار تار ہو کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"شادی۔"

پھر اس نے قریب رکھا ہوا شیشے کا گلدان اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں لیکن اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

پُر شور چوراہے پر ایک اندھا فقیر ہاتھ میں کشکول لئے اور زبان کو سہرا باندھ کر صدائیں لگا رہا تھا۔

"اے صاحبِ آنکھ والو! اے صاحبِ ایمان والو..... مجھ در یتیم پر، مجھ دیدۂ نابینا پر ترس کھاؤ ـــ اللہ کے نام پر...... کاسہ میں ڈال دو......"

فقیر کے قریب رک کر اس نے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے چند پتھر اٹھا کر اس کے کاسے میں ڈال دئے۔ فقیر نے دعائیں دیں۔

"اللہ تمہیں ایک کا ستر دے۔"

اُس نے گھور کر فقیر کو دیکھا مگر وہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی صداؤں میں مست تھا۔ وہ کھسیا کر آگے بڑھ گیا۔ سامنے سے عورتوں کا

ایک احتجاجی جلوس نعرے لگاتا ہوا بڑے جوش میں چلا آرہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کھڑے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جلوس سامنے سے گزرنے لگا۔ وہ کچھ لمحے ادھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اچانک جلوس میں گھس گیا اور چند عورتوں کو دھکا دے کر اُس پار چلا گیا۔ عورتیں چلائیں، جلوس رک گیا۔ دور کھڑے سپاہیوں نے ڈنڈا ہوا میں لہرایا۔ اُس نے محسوس کیا کہ سب عورتیں اسے گھور رہی ہیں۔ وہ لپک کر ایک پتلی سی گلی میں گھس گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ کچھ دُور چل کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا گلی سنسان تھی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں آنکھیں اسے گھور رہی ہیں اور تمام آنکھیں خنجروں کی طرح چمکدار ہیں۔

اس نے غصّہ میں ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے اُدھر پھینکا۔ پتھر ایک بلڈنگ کی تیسرے منزلے کی کھڑکی کے پٹ ہٹا کر اندر چلا گیا۔

"کون ہے بے؟" ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سر سہلاتا ہوا کھڑکی میں سے جھانکا۔

"نیچے آ!" اسے دیکھ کر اس نے دوسرا پتھر اٹھایا۔

کھڑکی فوراً بند ہو گئی۔

وہ پتھر ایک طرف پھینک کر ذرا آگے چلا۔ آگے ایک درخت سے ایک حیران و پریشان گائے بندھی رسّی توڑنے کی دُھن میں تھی۔ اس نے گائے کی رسّی کھول دی۔ گائے خوشی میں ایک سمت بھاگی۔

"جا تو بھی جلوس میں شامل ہو جا" وہ زور سے چیخا۔

تیسرے منزلے کی کھڑکی پھر کھُلی —— وہی آدمی پھر نظر آیا۔ مگر نظریں چار ہوتے ہی کھڑکی دھڑ سے بند ہو گئی۔

وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے چلنے لگا۔ تھوڑے فاصلے پر پینٹر سیڑھی لگائے دیوار پینٹ کر رہا تھا۔ اُس نے چلتے چلتے سیڑھی کو ذرا ٹھوکر لگائی۔ پینٹر "ارے۔۔۔ ارے" کرتا ہوا سیڑھی سمیت نیچے آگرا۔ رنگ کا ڈبّہ اس کے اوپر الٹ گیا اور وہ خود پینٹ ہو گیا۔ لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔

وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلا تو اس کا چہرہ مسرّت سے کھِلا ہوا تھا۔

سورج سر پر تھا۔ پُل پر کھڑے ہو کر اس نے نیچے ندی کی طرف دیکھا۔ صاف شفّاف چمکتا ہوا پانی۔ ندی کے کنارے کافی شور تھا۔ بہت سارے بچے نہا رہے تھے۔ انہیں نہاتے اور ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پُل سے اُتر کر نیچے گیا۔ کچھ دیر ٹہل ٹہل کر بچوں کو دیکھتا رہا [illegible] اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکنے لگا۔ بچوں نے شور مچایا، پھر رونے لگے۔ انھیں روتا دیکھ کر وہ ہنستا ہوا وہاں سے چل پڑا۔

بازار قریب ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ریوڑی والے کا تھال اوندھا کر دیا۔ ایک جگہ کھڑی ہوئی بہت ڈھیر سائکلیں گرا دیں اور کئی پتھر اٹھا کر احتیاطاً جیب میں رکھ لئے۔ چلتے چلتے ایک سبزی ترکاری والے کی دوکان سے ایک کریلا اٹھا لیا۔

اچانک ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"اے صاحب آنکھ والو۔۔۔۔ اے صاحب ایمان والو۔۔۔ مجھ درِ یتیم پر ۔۔۔ مجھ دیدۂ نابینا پر ترس کھاؤ۔۔۔"

اس نے دیکھا ایک طرف وہی اندھا فقیر کھڑا صدائیں لگا رہا تھا وہ اس کے قریب گیا اور ہاتھ میں لیا ہوا کریلا اس کے کاسے میں ڈال دیا۔ فقیر کاسے میں ہاتھ ڈال کر کریلے کو ٹٹولا۔

کیا چیز ہے یہ؟ کھُردری سی۔ لگتا ہے کریلا ہے۔ چھی! جس چیز سے فقیر چڑتا ہے۔۔۔۔ ارے او صاحب خیرات دینے والے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔۔۔۔"

وہ غصّہ میں فقیر کو دیکھنے لگا۔ فقیر نے کاسے میں سے کریلا نکال کر نفرت سے پھینک دیا۔

"چھی چھی۔ اندھے سے مذاق کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی دینے کی چیز ہے۔ نہیں دیکھتے کہ مٹھائی کی دوکان کے پاس ہی کھڑا ہوں۔ ارے دینا تھا تو کچھ اور دیتے۔ خیر۔ اللہ تمہیں ایک کے بدلے میں ستّر دے۔"

غصّہ میں اس کی آنکھیں تن گئیں۔ چاروں طرف چنگاریاں لگیں اور جیب کا پتھر ہاتھ میں آگیا لیکن سامنے سے آتے ہوئے پولس کو دیکھ کر اس نے اپنا رُخ بدل دیا۔

ایک خوبصورت عمارت کے احاطے میں رنگین روشنیاں، موّ سلیقے سے آراستہ میز اور کُرسیاں، قیمتی لباس اور خوبصورت چہرے دیکھ کر اس کے قدم خود بخود اندر پہنچ گئے۔

"شاید یہاں کوئی پارٹی ہے۔"

تمام چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ایک میز کی طرف بڑھا ایک خوش پوش مرد ایک خوبصورت لڑکی اور خالی دو کُرسیاں۔۔ وہ نہایت باوقار انداز میں ایک کُرسی کھینچ کر ان کے درمیان جا چند لمحے سر گھما گھما کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا پھر اس نے مسکرا کر مردِ

"آج کی شام کتنی سہانی ہے۔"

شام؟" مرد نے اسے سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھا۔" اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔"

"اچھا میں سمجھا کہ شام ہے۔" پھر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "آج آپ بہت چمک رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" لڑکی کے چہرے پر غصہ بھر آیا۔

"مطلب یہ کہ اس لباس میں آپ بالکل بجلی لگ رہی ہیں اور آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کی وہ حسین شام یاد آ رہی ہے جب ہم اجنبی نہیں تھے۔"

"کیا بک رہے ہو؟" مرد نے غصہ میں اس کا گریبان پکڑ لیا۔

شور مچ گیا۔ لوگ جمع ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں اسے احاطے سے باہر کر دیا گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑنے لگیں۔ باہر آ کر اُس نے احاطے میں دو تین پتھر پھینکے اور چیخا۔

میرے ساتھ ایسا سلوک۔ جانتے نہیں یہ شہر میرے دم سے ہے یہاں ساری حرکت، توانائی اور سرگرمی مجھ ہی سے ہے۔"

چلتے چلتے اس نے ٹیوب لائٹ کو نشانہ بنایا اور دوسری ٹیوب لائٹ تلاش کرتے کافی آگے نکل گیا۔ ریلوے پلیٹ فارم تھوڑے فاصلے پر تھا۔ لوہے کے جنگلے سے کود کر وہ ریلوے لائن پار کرنے لگا۔ اچانک پلیٹ فارم کی طرف ایک شور بلند ہوا۔ اندھیروں اور اجالوں کی پرچھائیوں کے درمیان اس نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں کچھ لئے بھاگا آ رہا ہے اور پیچھے ایک دوسرا آدمی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

وہ اندھیرے میں ساکت کھڑا ہو گیا۔

"پکڑو پکڑو!" پیچھے والا آدمی چیخ رہا تھا۔ "یہ میرا سوٹ کیس لے کر بھاگ رہا ہے۔ چور چور"

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ادھر دیکھتا رہا۔

سوٹ کیس لے کر بھاگنے والا آدمی اس کے قریب سے نکل کر جنگلے پر چڑھنے لگا اور پیچھے والا آدمی جب نہایت تیزی سے قریب آیا تو اس نے اچھل کر اسے نہایت مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"ارے ارے مجھے چھوڑو۔ وہ میرا سوٹ کیس لے کر بھاگ رہا ہے۔"

لیکن اس نے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پہلا آدمی جنگلے سے کود کر فرار ہو گیا۔ پلیٹ فارم کی طرف سے کچھ لوگ اور دوڑتے ہوئے آئے اور پھر اس پر چاروں طرف سے گھونسے برس پڑے۔ ہوا میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔

کچھ دیر بعد وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ ڈھیر سارے پتھر اٹھا کر جیبوں میں بھر لئے اور کچھ پتھر ہاتھوں میں لے کر چلا۔ آگے پیچھے چنگاریوں کا جلوس بھی چلا۔

چنگاریوں کے جلوس میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ وہ ایک دراز قد سیاہ عربی گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے ہاتھ میں اصفہانی تلوار اور پشت پر مراقش کی ڈھال ہے۔ پیچھے دُور تک اس کا لشکر جرار ہے جہاں تلواروں کے جنگل میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔

اس نے اپنی بائیں سمت چلتے ہوئے سپہ سالار سے کہا۔

"آج اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا ہے۔"

سپہ سالار نے سر خم کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا اور خندق میں گر گیا۔

"ارے کہاں گئے، تم؟" اس نے آواز دی۔

"میں خندق میں ہوں۔ میری ٹانگ مگرمچھ نے پکڑ لی ہے۔"

اس نے جلدی سے پیچھے دیکھا۔ لشکر غائب تھا اور صرف چنگاریوں کا جلوس متحرک تھا۔ اس نے چنگاریوں سے کہا: "آؤ چنگاریو آؤ۔ میرے ساتھ چلو!"

ایک کشادہ روڈ پر اس نے پہلا پتھراؤ ایک پٹرول پمپ پر کیا۔ دوسرا پتھراؤ آس پاس کھڑی ہوئی کاروں پر۔ شور بلند ہوا تو وہ بھاگ کر اندھیری گلی میں گھس گیا اور اندر ہی اندر چلتا ہوا دوسرے روڈ پر نکل آیا۔ سامنے ایک جگمگ کرتا ہوٹل تھا اس نے غصہ میں اس پر بھی پتھراؤ کیا بہت سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بہت تیز، سیاہ عربی گھوڑے کی طرح بھاگا۔ سامنے سے ہارن دیتی ایک ٹیکسی آ رہی تھی۔ اس نے ایک پتھر ٹیکسی کی طرف بھی پھینکا۔ ٹیکسی فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک سُرمے والے کی دوکان سے ٹکرا گئی۔

"لگا لے تو بھی سُرمہ جانِ من!" اُس نے ٹیکسی سے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے سے آتے ہوئے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور شور میں بھی اضافہ ہو گیا تھا وہ اور تیز دوڑنے لگا۔ سامنے سے پولس جیپ سائرن بجاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسی کے لئے آ رہی ہے۔ ایک لمحہ رک کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک سمت گھوم کر ایک تاریک پارک میں گھس گیا۔ کچھ دیر وہیں چھپا رہا پھر احاطے سے کود کر ایک گلی میں آ گیا۔

"آج کی رات کتنی سہانی ہے۔" ایک ٹیوب لائٹ کے نیچے ٹھہر کر اس نے پھر ڈھیر سارے پتھر جمع کئے۔ پہلے تو ٹیوب لائٹ پر ایک پتھر پڑا، پھر آس پاس کے گھروں کی طرف کئی پتھر پھکے۔ گھروں میں روشنیاں ہونے لگیں اور

بہت سارے لوگ نکل کر اس کی طرف دوڑے۔

"پکڑو! پکڑو!!"

وہ پھر بھاگا اور کئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں لہراتا ہوا ایک سنسان چوراہے پر آ گیا۔ محسوس ہوا کہ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں کئی طرف سے آ رہی ہیں اور کئی طرف پولیس جیپ کے سائرن غرا رہے ہیں۔ سامنے ویران گلی تھی۔

"سمندری سبز آنکھیں" اس نے خوشی میں قہقہہ لگایا "اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا"

دروازے پر جا کر اس نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ وہ جلدی سے اندر ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" سمندری سبز آنکھوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا "اتنے ہانپ کیوں رہے ہو؟"

"میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ مجھے تم سے فوراً شادی کرنی ہے"

"شادی؟ —— اتنی رات میں؟"

"ہاں بہت ڈھیر سارے لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں"

"ضرور تم نے کوئی گڑبڑ کی ہوگی" سمندری سبز آنکھیں مسکرائیں۔

"ہاں، آج تو پورے شہر کو حرکت میں لے آیا۔ سب طرف ہلچل مچ گئی ہے۔

لوگ مجھے خزانے کی طرح تلاش کر رہے ہیں" وہ صوفے پر نیم دراز ہو کر سمندری سبز آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا "آج میں بہت تسکین محسوس کر رہا ہوں لگتا ہے کہ میں بالکل منتقل ہو کر سب طرف چھا گیا ہوں۔ سب مجھے ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ خود کھو جائیں گے۔

"آج کی رات..... کتنی سہانی ہے"

اچانک اس نے محسوس کیا کہ سمندری سبز آنکھیں آہستہ آہستہ چنگاریوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ وہ مکمل طور پر چنگاریوں کا ہیولا بن گئی ہیں۔ اس نے گھبرا کر اپنے آپ کو دیکھا لیکن دیکھ نہیں سکا۔

صوفے پر اس کی بجائے چنگاریوں کا ایک جلا ہوا نیم دراز تھا۔

## بقیہ صفحہ ۴۹ رام نگر کب آئے گا

بقیہ صفحہ ۴۹

اور خوانچے والے، دیہاتی اپنے بستر اور کمبل کے ساتھ براجمان، بندے جاپانی ٹی وی سیٹ، چرخی کی طرح گھومتی

انکوائری سے گلے گا ہے گاڑیوں کی آمد و رفت میں تاخیر کا اعلان کرتا لاؤڈ اسپیکر، کبھی کبھی کھڑکھڑاتے گزرتے مال گاڑی کے خالی ڈبے، کسی پسنجر یا ایکسپریس ٹرین کی آمد، لمحاتی ہنگامے پھر خاموش..."

اور رام نگر پہنچنے کی خواہش منہ کھولے......

"زور آور پھر قہقہے لگا رہا ہے اور ترسیم سنگھ سوچ رہا ہے..."

"بیچارہ زور آور... اپنے کو نارمل پوز کرنے کی کتنی کوشش کرتا ہے... کیسا زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے... کہتا ہے جو گزرنی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا... یہ کٹ نہیں جاتا... مگر جلد سے جلد گھر پہنچ جانا ہی مناسب ہے... اتنی گہری سرد اندھیری رات... اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ رات گزر ہی جائے گی... اور ہم گھر پہنچ جائیں گے..."

"کیا ہم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ یہ گہری سرد اندھیری رات کب گزرے گی؟... صبح کب آئے گی؟

ترسیم سنگھ اپنا گھر... اپنا ہوم لینڈ... اپنا رام نگر کب دیکھ سکے گا ؟؟؟!

## بقیہ صفحہ ۴۴ سائرن

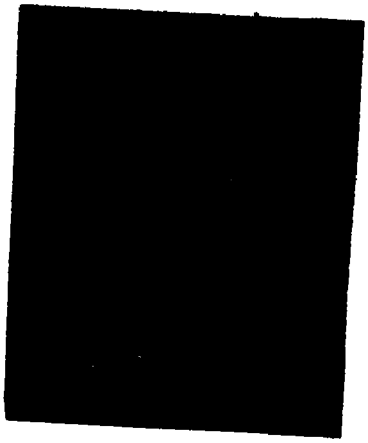
بقیہ صفحہ ۴۴

ریڈیو سے اتحاد کے نغمے نشر ہو رہے ہیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ اکیسویں صدی کا خوش آئند خواب دکھا رہے ہیں امرت ورشا ہو رہی ہے خطرے کا سائرن چیخ رہا ہے۔ چیخے جا رہا ہے۔

وہ آ رہا ہے۔

## زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اگست ۱۹۸۷ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لیے مبلغ ۵۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجیے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔



# رشید اعجاز

زندگانی کس قدر بوجھل لگے
کونپلیں پھوٹی نہ تھیں اور پھل لگے

تھی ہوا ایذا رساں ایسا نہ تھا
بارہا اپنے ہی پر کومل لگے

مرکزِ صد پارہ پوچھے بھی تو کیوں؟
دائرہ چلنے میں کتنے پل لگے

رات اور دن میں بہت کم فرق ہے
دھیان سے دروازے پہ سانگل لگے

پھر اُسی بے نام سناٹے کی جھلک
پھر وہی آہٹ، وہی پہچل لگے!

بزدلان آخری صف میں تھا میں
پہلی صف کے سورما پاگل لگے

آج بھی وہ خاکۂ بے رنگ ہوں
جس کو سب رنگوں کے بازو شل لگے

مرے گھر ہی نہیں پہرہ ہوا کا
زمانہ صید ہے عکس و صدا کا

نگاہیں صرف شعلہ تک رہی ہیں
تعاقب کون کرتا فاختہ کا

نظر آتے ہیں پھر سائے ہی سائے
ابھی ٹوٹا نہیں گھیرا بلا کا!

لکیریں دائروں سے اُگ رہی ہیں
عجبا کے سے بڑا ہوگا دھماکہ

مری پرچھائیاں طالب سکوں کی
مرا آئینہ لیکن ہے لڑاکا

توقع مجھ سے رنگوں کی نہ رکھیو
میں منظر ہوں مگر ہیر وشما کا

کئی شیشوں پہ پتھر کھینچ مارے
بکھرتا ہی نہیں ہمزادانا کا!

اُسی کے بال و پر میں کھو گیا ہوں
بنا تھا تم نے جو خاکہ ہما کا

تھام رکھے ہیں فقط دیوار و در ایسا نہیں
اپنے گرد و پیش سے میں بے خبر ایسا نہیں

دھوپ کھِلنے کا پتا دیتا نہیں آنگن مرا
ٹوٹ کر مہتاب اترے میرا گھر ایسا نہیں

ایک شب کے رت جگے میں اپنی آنکھیں پھوڑ لوں
چار تنوں کا صحیفہ مختصر ایسا نہیں

اور بھی اس شہر میں ہیں تیز اڑانوں کے شکار
میں نے ہی بکھرا دیئے ہیں بال و پر ایسا نہیں

جنگ جو مجھ میں چھڑی ہے فیصلے تک جائیگی
خود سے سمجھوتا کروں میں کم جگر ایسا نہیں

کچھ اُدھر کی برف باری بھی پہنچتی ہے یہاں!
رات دن شعلے برستے ہیں اِدھر ایسا نہیں

آنسوؤں کے بیچ ہوں اعجازؔ اگرچہ ان دنوں
جگنوؤں کے ساتھ ہو، میرا سفر ایسا نہیں

۹۸۳، بھوانی پیٹھ، پونا ۴۱۱۰۴۲ (مہاراشٹر)

# مَلکوتی! (رباعیوں کے فارم میں ایک پورٹریٹ)

عارض پہ عیاں صبحِ اَزل کے انوار
زلفوں میں نہاں شامِ اَبد کے اسرار
خوُد اپنی شعاعوں میں یہ کھویا ہوا رُوپ
یا بحرِ وجوُد اپنے اندر سرشار

---

زلفوں سے لطافت کی ضیا جاری ہے
آنکھوں میں جہاں تابِ ضیا باری ہے
چہرے پہ ترے۔ بیش حسین از شبِ ماہ
کیفیتِ ماحولِ سحر طاری ہے

---

زینوں پہ یہ اوپر کی طرف تیرا خرام
طالع افقِ فکر پر اظہار کا جام
یا پھیلے ہیر قلب زمیں سے اُٹھ کر
افلاک کو جاتا ہوا کوئی پیغام

---

سادہ سی نگاہوں میں صد اندازِ جنوں
تابانیٔ عارض میں عیاں سوزِ دروں
سکتے میں ہو کونین کی گردش گویا
شفاف سے ماتھے پہ ہے وہ کیف و سکوں

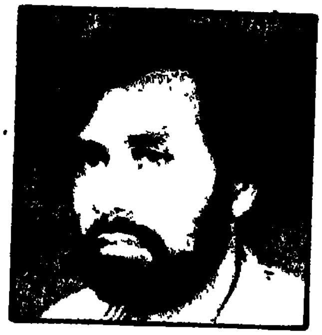
---

جس طرح سے ذائقے میں خوشبو کا گداز
خوشبو سے ہو گویا کہ عیاں لمس کا راز
جوں لمس سے روشنی کی پھوٹی ہو کرن
یا روشنی بن گئی ہو جیسے آواز

---

نغمہ کوئی تاروں سے لپٹ کر سو جائے
یا لفظ معانی کی تہوں میں کھو جائے
یہ حسن ہے ارتعاش کی وہ منزل ساز!
جب ذات میں کائنات مدغم ہو جائے

---



عبدالاحد ساز

---

اُسی نے میری شبوں کے حق میں یہ رُوح فرسائیاں لکھی ہیں
یہ جسم کیا ہے، یہ زاویوں کا طلسم کیا ہے۔ وہ اِسم کیا ہے؟
کنائے، پیرائے، استعارے، علامتیں، رمزیئے، اشارے
سوال کہنے کے ڈھنگ کا ہے، بس اک نئے آب و رنگ کا ہے
کہاں ہیں وہ آرزو کے چشمے، طلب کے وہ موجزن سمندر
مرے سخن کا یہ نرم دریا ڈھلے تو اک آبشار بھی ہے

مری نگاہوں پہ جس نے شام و سحر کی رعنائیاں لکھی ہیں
ـــ ادھوری فہائشوں میں جس کی یہ نصف گولائیاں لکھی ہیں
کرن سے پیکر کو زاویئے دے کے ہم نے پرچھائیاں لکھی ہیں
دگر نہ بابِ سخن وری میں ہزار دانائیاں لکھی ہیں
نظر نے اندھے کنویں بنائے ہیں، فکر نے کھائیاں لکھی ہیں
نشیبِ دل تک اُتر کے پڑھنا بڑی توانائیاں لکھی ہیں

یہ میرے نغموں کی دل رسی تیری جھیل آنکھوں کی شاعری ہے
جمال کی سطح دی ہے تو نے، تو میں نے گہرائیاں لکھی ہیں

# نقد و نظر

## کربلا بطور شعری استعارہ

[تبصرہ]

**پروفیسر گوپی چند نارنگ**

شہادتِ امام حسینؑ انسانی تاریخ کا عظیم سانحہ ہے جو
حق و باطل، نیکی و بدی، ظلم و مظلومیت، استقلال و استقامت
کے اس معرکے سے عبارت ہے جس میں حق کو فتح حاصل کرنے کا ایک ایسا
تابناک باب ہے جس کی مثال پوری انسانیت کی تاریخ میں نہیں
اس نے جہاں بتلانے والوں کو سرخرو کیا اور اسلام کے نوخیز پودے
کی جڑیں ہمیشہ کے لیے مضبوط کر دیں وہیں عام انسانیت کی تاریخ
پر اخلاقی اور انسانی اقدار کے ایسے انمٹ روشن نقوش
ثبت کیے جن سے دنیا بہتر ہو سکی، منصب و دولت، جبر کب تک
رہے۔ جہاں ایک طرف یہ الم ناک واقعہ ہمیشہ دل ہلا دینے والا ثابت
ہوا، وہ بعد میں آنے والی حق کی کوششوں کے لیے ایک سنگِ عزم
بن گیا اور ان کے ماننے والوں کو باطل کی نئی راہیں کھول دیں
عطا کر دی۔

ادب، جو انسانی اقدار و روایات کی ایک جذباتی و حسیاتی
ترجمانی کی حیثیت رکھتا ہے، تاریخِ انسانی کے اس ہمہ گیر اور کثیر
الجہات واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مشرقی ادبیات میں
بہت پہلے سے مختلف انداز میں اس سانحے کی گونج سنائی دیتی ہے۔
اردو ادب میں تو اس کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ مشرق کے
عالمی ادب کا ذخیرہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ اس سانحے
نے ذہنِ انسانی کو جتنا متاثر کیا اور جذبات و احساسات کو جتنا مہمیز
کیا ہے اتنا کسی اور واقعے نے نہیں کیا۔ اردو کا رثائی ادب بالخصوص
اس معاملے میں دوسری تمام زبانوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور وقیع ہے۔
علاوہ ازیں اس بات سے بھی مصنف نے ہمیں آگاہ کیا ہے جو اس سانحے کا براہِ راست
اظہار ہے، فنی و فکری، موضوعاتی و اسلوبیاتی اعتبار سے اردو
شاعری کو کن نئی جہات سے آشنا کیا، ان میں کمیت و کیفیت کے
اعتبار سے کیا کیا قدر اضافے کیے، مختلف اصنافِ سخن پر اس کے
کیا اثرات مرتب ہوئے اور اردو نظم کے ارتقا کو اس نے کس حد تک
آگے بڑھایا، یہ بات خاص طور پر بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ غیر رثائی
ادب میں سانحۂ کربلا کے بالواسطہ اظہار نے، جو کہیں تلمیح و تمثیل کی
شکل میں، کہیں رمز و ایما کے پیکر میں اور کہیں استعارہ و علامت
کے روپ میں سامنے آیا ہے، اردو شاعری کو کتنی نئی معنیاتی وسعتوں
اور امکانات سے روشناس کرایا ہے۔ اردو کے رثائی
ادب پر کافی حد تک لکھا جانے کے باوجود کافی لکھا جا چکا ہے، لیکن
غیر رثائی ادب میں سانحۂ کربلا کے اس تخلیقی اظہار کی طرف، جو جدید
شاعری تک آتے آتے ایک رجحان کی شکل اختیار کر گیا ہے،
توجہ نہیں کی گئی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے
اس اہم مگر اچھوتے موضوع پر قلم اٹھا کر اردو تنقید کو ایک نئی
راہ دکھائی ہے اور حسنِ اداکی اعجاز اور شستہ و دل نشین پیرایہ میں
موضوع کے مختلف ابعاد و جہات کو پیش کیا ہے، اس سے نہ صرف
موضوع کا حق ادا ہو گیا ہے بلکہ خود ان کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت
بھی فراہم ہو گیا ہے۔

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ نارنگ صاحب کا وہ طویل
مقالہ ہے جو انھوں نے انجمن سادات امروہہ کراچی کی فرمائش پر
اپریل ۱۹۸۴ء میں لکھا تھا، لیکن جس سمپوزیم کے لیے یہ مقالہ لکھا
گیا تھا وہ بوجوہ منعقد نہ ہو سکا۔ بعد میں یہ مقالہ برصغیر کے کئی
ادبی جلسوں کے علاوہ لندن اور کناڈا میں بھی پڑھا گیا۔ جیسی کہ نارنگ
صاحب نے وضاحت کی ہے، اس تمام مدت میں زیرِ نظر مقالہ ترمیم
و تنسیخ اور حذف و اضافہ کے عمل سے گزرتا رہا اور اب کتابی صورت
میں منظر عام پر آیا ہے حالاں کہ اس سے پہلے کم و بیش اسی موضوع
پر ۱۹۷۳ء میں ممتاز حسین جونپوری کی "خونِ شہیداں" شائع ہو چکی
تھی، جس میں بقول مصنف "مشرقی زندگی اور مشرقی ادب خصوصاً
غزل پر واقعۂ کربلا کا اثر" دکھایا گیا ہے، لیکن ایک تو اس کتاب سے
عام طور پر اہلِ اردو واقف نہیں ہیں اور نارنگ صاحب کی کتاب
کے ذریعہ ہی پہلی بار ہمیں اس کا علم ہوا ہے، دوسرے یہ کہ اس کتاب
میں بحث "واقعۂ کربلا کی تمثیل کی اہمیت" سے ہے، لیکن بقول پروفیسر
نارنگ "رمز و ایما یا تشبیہ و استعارہ کی معنیاتی توسیع یا تقلیب کے
بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔" نتیجتاً ممتاز حسین جونپوری اردو
شاعری کے ان اسلوبیاتی و معنیاتی پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈال سکے
جو سانحۂ کربلا کے حوالے سے وجود میں آئے ہیں اور جو نارنگ صاحب
کا موضوع ہیں۔ ایک اور فرق جو دونوں کتابوں میں ہے وہ یہ ہے
کہ ممتاز حسین نے کلاسیکی شاعری پر واقعۂ کربلا کے اثرات کی نشان
دہی کی ہے، جب کہ پروفیسر نارنگ نے اس حوالے کے لیے کلاسیکی شاعری
کو پس منظر کے طور پر پیش کر کے جدید اردو شاعری میں اس کے ایک
تخلیقی رجحان بن جانے کا ذکر کیا ہے۔ اپنے موضوع کی وضاحت کرتے
ہوئے وہ کہتے ہیں:

"راقم الحروف کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں نئے معنیاتی
تقاضوں کے تحت شہادتِ حسینؑ کا تاریخی حوالہ رسمی
رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش
پا رہا ہے اور پچھلی تین چار دہائیوں سے ایک نئے اظہار
اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے جو اپنی جگہ
بے حد اہمیت و معنویت کا حامل ہے۔"

مقالے کے اختتام پر بحث کو سمیٹتے ہوئے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"ہمارا اردو شاعری میں کردارِ حسینؑ و واقعۂ کربلا اور
اس کے تعلیقات ایک مسلسل موضوع کی حیثیت سے
موجودہ شعری روایتوں کا حصہ بن کر جاری و ساری رہا
ایسا غزل میں بھی ہوا ہے اور نظم میں بھی، اس موضوع کی
اتنی کیفیتیں، اتنی شکلیں اور اتنے ابعاد ہیں کہ سب کا
احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ
بھی ہے کہ یہ اظہار براہِ راست بھی ہوا ہے اور خالص
استعاراتی اور علامتی پیرایے میں بھی۔"

باوجود اس احساس کے کہ اردو شاعری میں سانحۂ کربلا کے تمام اظہاری
و معنیاتی ابعاد کا احاطہ تقریباً ناممکن ہے، پروفیسر نارنگ نے اس
موضوع کی تقریباً تمام جہات کو خاصی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش
کیا ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ اس تخلیقی رجحان کے آغاز و ارتقا کے
نقوش کو ابھارا ہے جیسی کہ انھوں نے خود وضاحت کی ہے، زیرِ نظر مقالے
میں انھوں نے استعارے کو وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے اور جس
استعاراتی تفاعل کی انھوں نے بات کی ہے اس میں بالواسطہ اظہار کے
تمام پہلو آ جاتے ہیں چنانچہ انھوں نے جو اشعار تجزیے یا شالوں کے طور
پر پیش کیے ہیں ان میں رمز، ایما، کنایہ، استعارہ اور علامت بھی
اس استعاراتی تفاعل کے تحت آتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے علامت
کی اصطلاح استعمال کرنے سے گریز کیا ہے، غالباً اس لیے کہ اب
علامت کا زوال ہو چکا ہے جب کہ استعارہ استعارۂ محض کی حیثیت
سے بھی اور استعاراتی اندازِ بیان کے روپ میں بھی آج بھی قائم و دائم ہے
اور خود نارنگ صاحب کے قول کے مطابق، اظہار کے ان گنت
وسائل میں جو مرکزیت استعارے کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے
پیرائے کو نہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں اردو شاعری میں سانحۂ کربلا
کے تاریخی حوالے کے سلسلے میں استعارے کی اسی مرکزیت کو نمایاں
کیا گیا ہے اور اس مرکزی نقطے سے جو خطوط پھیلتے اور بکھرتے
ہیں ان کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہند و پاک کے جن شعرا کے یہاں
اس تخلیقی رجحان کی کارفرمائی دکھائی گئی ہے ان سب کی انفرادیت
کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے، جس سے ہر ایک کی شناخت
خود بخود ہو جاتی ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا لیکن اس منزل
دشوار سے نارنگ صاحب بڑی خوبی اور سلامت روی کے ساتھ
گزر گئے ہیں جہاں تک شعری استعارے کے روپ میں سانحۂ کربلا
کے اظہار کے تخلیقی رجحان بننے کا تعلق ہے، تو اس کے آغاز و ارتقا
کا خلاصہ خود نارنگ صاحب کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا
سکتا ہے:

"زیرِ بحث تاریخی حوالہ اب بمنزلہ ایک رجحان کے اردو
شاعری میں راسخ ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ
ذہن و شعور اس سے آزادانہ فیضان حاصل کر رہا ہے
اور یہ موضوع ہمارے عہد کی تخلیقی شخصیت اور

شعری وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ علامہ اقبال اور ان کے عہد کے شعراء نے اس سلسلے میں بنیاد گزاری کا کام کیا۔ ترقی پسند شعراء نے ان بنیادوں کو اٹھایا اور بعد میں آنے والے نئے شاعروں نے اس سلسلے میں نئی اظہاراتی و معنیاتی جہات کو روشن کر کے اسے باقاعدہ شعری رجحان کی حیثیت دے دی۔"

حالانکہ نارنگ صاحب نے سانحۂ کربلا کے استعاراتی اظہار کی مختلف نوعیتوں اور شکلوں کو الگ الگ شقوں کے ذریعہ نہیں بیان کیا ہے' لیکن مباحث اور اشعار کے تجزیے اور مثالوں سے اس استعاراتی اظہار کی تین صورتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) کرداروں اور مقامات کے ناموں جیسے حسین، اصغر، سکینہ، یزید، شمر، کربلا، کوفہ، دمشق وغیرہ کا استعمال۔

(۲) سانحۂ کربلا کے تعلیقات جیسے شہادت، ظلم، ظالم، مظلوم، مظلومی، خون، لہو، پیاس، تشنگی، سفر، ہجرت، گردش، دربدری، بے گھری، بے زمینی، حق، باطل وغیرہ الفاظ کا استعمال۔

(۳) ایسے اشعار جن میں کوئی واضح لفظ یا اشارہ موجود نہیں ہے لیکن کوئی نہ کوئی قرینہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے ذہن اس سانحے کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔

اظہار کی یہ تیسری صورت سب سے زیادہ مشکل ہے اور رچے ہوئے شعری ذوق اور فن کارانہ مہارت کی متقاضی ہوتی ہے اس کی نشان دہی بھی کچھ کم مشکل نہیں۔ اس کے لیے تہہ رس اور ژرف بیں نگاہ کی ضرورت ہے۔ نارنگ صاحب میں یہ وصف موجود ہے اسی لیے وہ اپنی بات کو پوری قطعیت کے ساتھ مثالوں کے ذریعے واضح انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کچھ مثالوں میں ضرور ایسا ہے جیسے عام سمجھ رکھنے والے قاری کو بات دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال موضوع کی مختلف جہات کو جس بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ جیسا کہ میں نے ابتداء میں کہا، زیرِ نظر مقالہ پروفیسر نارنگ کی گہری تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔ تنقیدی بصیرت تنقیدی شعور سے بلند تر شے ہے۔ تنقیدی شعور عام ہوتے ہوئے بھی بہت سوں کو میسر آجاتا ہے' لیکن تنقیدی بصیرت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اس کے لیے صرف مطالعے کا وسیع ہونا ہی کافی نہیں۔ مذاقِ سلیم، ذہنِ رسا، چشمِ دروں بیں اور نگاہِ نکتہ رس کے بغیر یہ دولت حاصل نہیں ہوتی۔ میں نارنگ صاحب کا شمار ان معدودے چند ناقدین میں کرتا ہوں جو ان اوصاف کے حامل ہیں۔ یوں تو آج کل اردو میں تنقید کے نام پر بہت سی چیزیں لکھی جا رہی ہیں، اور غزل کے شاعروں کی طرح اس میدان میں بھی تہی دامنوں نے "حسن پرستی شعار کی" والا معاملہ نظر آتا ہے لیکن کچھ اہلِ نظر اب بھی ایسے ہیں جو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نارنگ صاحب بھی ایسے ہی اہلِ نظر ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ جس سے تنقید کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے، اس کا بیّن ثبوت ہے۔

○ ۱۲۲ صفحات ○ قیمت ۳۵ روپے ○ مطبوعہ ۱۹۸۶ء

○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۸۰۔۳۱، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶۔

[ڈاکٹر حنیف کیفی]

## کتب و رسائل

○ **تحقیقات و تاثرات** ۔ (خصوصی مطالعہ: اقبال، ٹیگور اور محمود حیدر آبادی) پروفیسر اکبر رحمانی کے تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی مقالات کا یہ مجموعہ اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ صفحات: ۱۹۰۔ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: مکتبہ آموزگار، ۲۷۔ جیوتی نگر، جل گاؤں ۴۲۵۰۰۱۔

○ **آنچل** ۔ لاہور (پاکستان) سے شائع ہونے والا خواتین کا معیاری منفرد دلچسپ ماہنامہ ہندوستان میں بھی دستیاب ہے۔ رسالہ حاصل کرنے اور تخلیقات بھجوانے کا پتہ: ترجمان، ۴۹۔ دھرم داس، نجیب آباد ۲۴۶۷۶۳ (یوپی)

○ **لندن او لندن** ۔ اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر محمد عقیل کا سفرنامہ "لندن اور پیرس" شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۵۰ روپے۔ رابطہ: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ۔

○ **بیدی نامہ** ۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن پر نہایت ہی جامع کتاب جسے نوجوان نقاد شمس الحق عثمانی نے عمیق مطالعے اور تجربے کو بڑی دیدہ وری کے ساتھ پیش کیا۔ بیدی پر لکھی گئی ایک معیاری تنقید جو بیدی پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگی۔ پرکشش گٹ اپ روشن کتابت و طباعت۔ ضخامت: ۲۹۲ صفحات۔ قیمت: ایک سو پچاس روپے۔ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔ شمس الحق عثمانی، ۱۱۸۹، حویلی حسام الدین حیدر، بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶



## جینتے پرمار

◆

سیپ کوڑی تتلیاں سائے شجر روشن ہوئے
معجزہ اس کا کہ شب کے بام و در روشن ہوئے

آج کیوں مٹی ہمارے خون کی پیاسی ہوئی
سارے رشتے بجھ گئے نیزوں پہ سر روشن ہوئے

زرد شاخوں پر ہوائیں مرثیہ گانے لگیں
خواب کی تاریک گلیوں میں کھنڈر روشن ہوئے

شام کو جب اس کی یادیں ڈھونڈ کر لائی ہمیں
میز پر کاغذ قلم سوچوں کے پَر روشن ہوئے

کان کو اچھی لگیں کچھ دیر کرتب بازیاں
تہہ بہ تہہ کھلتا گیا عیب و ہنر روشن ہوئے

◆

رات ان خیموں کے اندر دیکھنا
بانجھ تنہائی کا منظر دیکھنا

پھر سکوں کی بیل کو چڑھتے ہوئے
ہجر کے دیوار و در پر دیکھنا

مجھ سے پہلے راستہ گُم ہو گیا
دھند ہے منظر بہ منظر دیکھنا

سطحِ دریا کچھ نظر آتا نہیں
میری مشکل میرے اندر دیکھنا

میرے سواگت کے لئے ہر موڑ پر
دھوپ آئے گی سمٹ کر دیکھنا

میرے مالک میں سرائے کا دیا
اور ہواؤں کا ہے لشکر دیکھنا

◆

شام کا ٹوٹا ستارا دیکھنا
میرے دل کا استعارا دیکھنا

جان بوجھ کر پھر کہیں کھو جائے گا
بھیڑ میں سایہ ہمارا دیکھنا

پھر بہت سے پھول ہوں گے راہ میں
پھر کسی خوشبو کا خطرہ دیکھنا

دن کے دریا سے نہ نکلا جائے اور
رات خوابوں میں کنارا دیکھنا

دھوپ چڑیا چہچہا اٹھے گی پھر
پیکرِ شب پارہ پارہ دیکھنا

● اے/۳ اجالی فلیٹ، سرکی واڈ، شاہ پور، احمد آباد-۱



# حامد اقبال صدیقی

مجھے تسخیر کر لینے میں کوئی مسئلہ کب تھا
مرے مدمقابل میں مگر یہ حوصلہ کب تھا

تعلق مصلحت کی کھوکھلی بنیاد پر قائم
ہمارے درمیاں چاہت کا کوئی سلسلہ کب تھا

مری وسعت ہزاروں منزلیں اوران گنت رستے
مگر محدود راہوں کے مسافر کو پتہ کب تھا

کروں کوشش تمہارے ہاتھ آئیں پھول موسم سب
خدانے یوں بھی میرے حق میں یہ موسم لکھا کب تھا

کسی کی شخصیت سازی سے بچتے خود میں گم رہتے
مگر پہلے تمہیں اپنی انا سے سابقہ کب تھا

ہر ایک رنگ میں تیری ہی روشنی دیکھے
نگاہ جب بھی مناظر میں دل کشی دیکھے

تم اپنے خواب بچا کر رکھو کہ کل دنیا
تمہاری آنکھ میں جھانکے تو زندگی دیکھے

مشاہدات مراسم کو مصلحت جانیں
مرا مزاج تعلق میں سادگی دیکھے

یہ میری روح ابھی قید ہے اندھیروں میں
حصارِ جسم سے نکلے تو روشنی دیکھے

جو داستان بغاوت کے باب میں آئے
تو شاہزادہ ہر اک سمت بے بسی دیکھے

ریاضتوں کے سلسلے یہ تجربوں کی روشنی
نئے نرالے راستوں گذر رہی ہے شاعری

کھلا کہ وصل ساعتیں نہیں ہیں اختیار میں
وسیلے خرچ سب کئے یہ ہاتھ آئی بے بسی

مجھے مرے خدانے تو دھنک مزاج لکھ دیا
مگر مرے نصیب میں ہے ایک رنگ زندگی

کسی کی یاد بھی نہیں کسی کا انتظار کیا،
یہ نیند کیوں اچاٹ ہے وہ خواب دید کیا ہوئی

بلند و بالا فلسفے نشیب میں اُتر گئے
روایتوں کے طاق پر سجا ہوا ہے آدمی

ہیں مجھ پہ منکشف تمام اس جہاں کے پیچ و خم
بصارتیں عطا تری اے ربِ فہم و آگہی

۲۰۲ - ۳۸ - دیناناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ، روم نمبر ۱۲، ۶ کلینڈر روڈ - ممبئی ۴

# مکتوب

**اقبال کرشن** ۔ ۲۰ ۔ ڈی ، ست گرین ، کلکتہ ۔ ۴۳

شمارہ نمبر ۴ میں مکتوبات کے صفحات پر شاہد ہاشمی کے خطوط ... گئی ہے ۔ شاعر واقعی بہت بہتر نکل رہا ہے ۔ اس بار فراق گورکھپوری صاحب کا مضمون ان کی ذہنی الجھنوں کا مجموعہ ہے ۔ اگر ہم اسپنگ ... کے قدیم عروضیوں اور اکادمیوں کی تحریروں سے استفادہ کریں تو گاویہ ، گوریہ اور گوریہ مسرت کا دیہ کے امتیازی عناصر سے واقف ہو جائیں گے ۔ قدیم اکادمیوں نے جو سرمایہ فراہم کر دیا ہے اس کے ساتھ آل احمد سرور ، ہربرٹ لیڈ اور ماتھیو آرنلڈ پانی بھریں گے ۔ اگر میکلیش کی 'POETRY IS' والی بات کو ادب کا ایمان کہا نالیا جائے تو پھر اتنی ساری بحث کی کیا ضرورت ہے FICTION IS اور DRAMA IS کہہ کر گھر بیٹھ جائیے ۔ میکلیش ہوں یا یوریپیس ہوں یہ لوگ شعر کے معروضی تجزیہ سے عاجز ہیں ۔ فراق گورکھپوری ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ادب کا کام معلومات فراہم کرنا نہیں ہے اور دوسری طرف عبید اللہ کی نظم اور راجندر سنگھ بیدی کا جوق تسمیہ معلومات اور اطلاعات حاصل کرنے کے چکر میں ہیں ۔ شعر میں لفظی چھان بین تو بہت ضروری ہے ۔ اب یہی عبید اللہ کی نظم کو لیجئے ۔ بحر ہزج مقبوض میں ہے ۔ مفاعلن کی تکرار کے دوران پر ہے ۔ لہٰذا شاعر نے ایسے الفاظ کے انتخاب کا التزام کیا ہے جو سوال وزن ۔ ان کے وزن پر پورے ہوں یعنی گھماری ، وشت ستاپہ ، ڈھلکے ، جیسی ، ہیبت ، ہراس ، ہجوم ، بیاض ، کہاں وغیرہ ۔ زیر نظر بحر ہزج سالم میں ہوتی تو الفاظ بھی دوسرے لانے پڑتے ۔ فراق گورکھپوری کی نظم "آخری ملاقات" دائرہ تجلیک کے بحروں میں ہے یعنی ایک نصف بحر فعیل کے بعد تین متقارب سب خفیف ہیں مفاعلن ، فاعلات ، مستفعلن ۔ لفظی چیر پھاڑ ادبی تنقید کی ایک شاخ ہے ۔ اس پر فقرہ کسنے کی کیا ضرورت ہے ۔ ایک آدمی کے لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ کسی کی شاعری کا لسانیاتی ، لغویاتی ، صوتیاتی تجزیہ کرے ۔ کولرج جب استعارہ کو تخلیق کی بنیاد مانتے ہیں تو پھر الفاظ کی اہمیت سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں ۔ یعنی مطلب معانی کوئی داخل نہیں کرتا ہے ۔ یہ خود بخود داخل ہو جاتے ہیں ۔ اچھا شعر ہوتوں کی دوربین ہے ہر حسن پر نیا منظر ۔

**رحمت امروہوی** ۔ مرزا پور محمد کا س والڈہ ۔ احمد آباد

تذکرہ جادہ ندیقی الاکبر ہمارے ہاتھ کو تا دہ نایاب تحفہ تحریر کیا نایاب ملفوظ علامہ سیماب کے خطبات غزلوں پر اصلاح عروضی و لسانی بحث نقادوں کی تصدیق کے لیے اشعار کی سند اور اس طرح کی بہت سی چیزیں جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھیں ، آگرہ سے بمبئی منتقل ہوتے وقت نہایت بے سرو سامانی کے عالم میں کس طرح بچا کے زیادہ سنبھال کر بمبئی لائے یہ سرمایہ بوروں کی شکل میں تھا اور یہ شاعر کا سرمایہ تھا اور شاعر کو جان سے زیادہ عزیز تھا جبکہ بمبئی میں رہنے کو بھی کوئی مستقل انتظام نہیں تھا ذرا اس عالم کا تصور کیجئے کہ اعجاز صدیقی نے اس کی کس طرح حفاظت کی ہوگی ۔ انتظار انہیں بار بار ہو کر آج سے پانچ چھ سال قبل یا اس سے بھی کچھ

پہلے میں نے تم سے بہت سخت لہجے میں کہا تھا کہ تم کوئی ایسا سلسلہ شروع کرو کہ یہ سب نایاب چیزیں شاعر میں محفوظ ہو جائیں ۔ ... تم شاعر کو جس ڈھنگ سے چلا رہے ہو ٹھیک ہے لیکن ہمارے بزرگوں کا علمی و ادبی اثاثہ نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے اس کے بغیر ادبی سفر ادبی سفر اندھیرے کا سفر ہوگا ....

خدا کا شکر ہے کہ تم نے اس طرف توجہ دی اور خوب دی ۔ .. اب رسالہ شاعر بہ اعتبار ایک صاف ستھرا علمی و ادبی مجلہ ہے جس میں قدیم و جدید کا امتزاج اور روایت کی پاسداری ہے ۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کے خطبات بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ علامہ کی دوسری زبانوں کے ادب پر کتنی گہری نظر تھی اور یہ خوبی صرف علامہ کے یہاں تھی .... از یادنت ... چہرہ چہرہ یاد ہیں ... آثار لفظ لفظ دیکھ کر اور پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے ۔

نسا باد سخن کا سلسلہ بہت مفید اور کارآمد ہے اللہ پاک تم کو حوصلہ اور ہمت دے ۔ آمین ... جس طرح اعجاز صدیقی اور علامہ سیماب اکبرآبادی کی روایت اور اثاثہ کی قدر کی ہے وہ تمہارا ہی حصہ ہے آنے والی نسلیں تمہارے کام اور خدمت کی قدر کریں گے اور تمہارے بزرگوں کی روح کو سکون ملے گا ۔ انہوں نے جس درخت کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی اب وہ بلند آور نظر آ رہا ہے ۔

اس شمارے کی کہانیاں سب عمدہ ہیں ائل ٹھاکر کی کہانی اس شمارے کی ماسدہ کہانی ہے شمیم حنفی نے زبیر رضوی کی نظموں کا بہت خوب صورت تجزیہ کیا ہے ... غزلوں میں عطا دو کاشمیری زبیر رضوی عبدالرحیم نشتر اور ظفر اقبال کی غزلیں عمدہ ہیں ۔

خطوط والے صفحات پر بہت سے خط شامل ہو جاتے ہیں یہ اس اعتبار سے تو اچھا ہے لیکن اس طرح الفاظ بہت باریک ہو جاتے ہیں پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے ۔ ممکن ہو تو اس طرف توجہ دو ۔

**مصور سبزواری** ۔ پوسٹ آفس نوح ضلع گڑگاؤں ، ۱۲۲۱۰۷ ، ہریانہ

نسا باد سخن کے تحت آپ نے جو جدید شعراء کا سلسلہ شاعر میں شروع کیا ہے وہ بڑا مستحسن ہے ۔ امید ہے کہ ہم سب لوگ جلد اس عنوان کے تحت شاعر میں آ سکیں گے ۔ شاعر ایک بین الاقوامی اور معیاری جریدہ بن چکا ہے جس کے لیے علامہ سیماب اور اعجاز صدیقی اور آپ لوگ قابل ستائش ہیں ۔ اور یہ ستائش الفاظ کی ہرگز محتاج نہیں رہی ۔

**رئیس امروہوی** ۔ ۱۳۹ ۔ اے ، ماڈل جے ایس پی سٹی ہاؤسنگ کراچی سوسائٹی

ماہنامہ شاعر کے شمارے ملے ۔ بھائی ! جس محنت اور تندہی سے آپ اس اعلیٰ ، معیاری ادبی جریدے کو زندہ / تابندہ رکھے ہوئے ہیں اس کی داد کن الفاظ میں دی جائے ! میں آپ لوگوں کے لیے دعا گو ہوں ۔

**ڈاکٹر انور سجاد** ۔ نشیمن ، چونی منڈی ، لاہور

شمارہ نمبر ۵ میں ڈاکٹر خورشید سمیع کا مضمون "تکبا" بلاشبہ ایک بار دیدہ پڑھتا ہے ۔ خاصہ دلچسپ ہے لیکن خاصہ تشنہ ... اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود کہا ہے کہ تفصیل کی گنجائش نہیں تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کو بھر پور مضمون لکھنا چاہیے جو تعبیر خواب کی تاریخ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مضمون بہت اہم باتیں ہو سکتی ہیں ... کے ساتھ مکالمہ ہو سکتا ہے اگر وہ تفصیلی باتیں کریں تو .....

**سلیم اختر** ۔ ۵۲۹ ۔ iii ۔ سی جہانزیب بلاک اقبال ٹاؤن ۔ لاہور

شاعر کے شمارے ملے ، عنایت کے لیے ممنون ہوں ۔ آپ نے تحقیق و تنقید اور اس کے ساتھ جدید ذہن کے حامل تخلیق کاروں کی شمولیت سے شاعر میں فکر و نظر کی جو وسعت پیدا کر دی ہے اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی ۔ اس کے لیے آپ جتنی محنت کرتے ہیں اس کا اندازہ شاید قارئین نہ لگا سکیں لیکن ہم لوگوں کو اس کا اندازہ ہے ۔

**شفیقہ فرحت** ۔ ۲۳ پروفیسرز کالونی ، بھوپال (ایم پی)

شاعر ایک کوہ پیما کی طرح ایک ایک مستحکم اور پختہ اعتماد قدم رکھتا ہوا بلندیوں کی جانب رواں ہے ۔ ۔ ... کی وحدت اور نکھار اس کے پاس ہے وہ کمیاب ہے ۔ ہر نیا شمارہ اپنے پچھلے شمارے کی توسیع کرتا ہے ۔ مبارکباد قبول کیجئے ۔

**شارب ردولوی** ۔ ۸ ڈی ، ماڈل ٹاؤن دہلی ۔

شاعر کی تعریف کیا لکھوں ، اپنا مضمون پھر دیکھا ، پھر اس کے حوالے سے بعض خطوط بھی ملے جن میں مضمون کی تعریف بھی کی گئی تھی اور بعض امور میں وضاحت طلب کی گئی تھی ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر میں شائع ہونے والے مضامین سنجیدگی سے پڑھے جاتے ہیں اور قارئین رسالے سے الگ براہ راست بھی مصنف سے اس کے مسائل پر گفتگو کی کوشش کرتے ہیں ۔

**عبدالرحیم نشتر** ۔ تعلقہ اور پوسٹ آفس ابیٹ ۔ ۴۰۲۱۰۱ ۔ ضلع رائے گڑھ (ایم ایس)

شاعر کا شمارہ نمبر ۵ ملا ۔ ماشاء اللہ خوب تر نکلا ہے ۔ مولانا گرامی تو معتبر تھے ہی مگر آپ نے بھی خود کو منوا لیا ۔ اس بار آپ کے ساتھ زبیر رضوی سے مل کر بھی بڑی مسرت ہوئی ۔ وہی بلدہ برس پہلا ملاقات یاد آگئی جب زبیر میرے ساتھ ناگپور کی سڑکوں اور گلیوں تک گھوم رہے تھے ایک پیارے دوست اور پیارے شاعر سے تب وہ ملاقات بڑی لطف دے گئی ۔ محسن احسان ، آزاد گلاٹی بھی بہت ... ۔ حسن شرعابی ایک دعا جب سے مل کر اچھا لگا ۔

ترقی پسند ادب پر یلغار کرنے والی جدیدیت خود کس طرح کا شکار ہوئی اور اس کے نام گرامی پہ سالاروں کا جیسا حشر ہوا اس پہ اظہار خیال کی ضرورت ہے ۔ یہ ملک ، یہ ہندوستان جس طرح تفرقہ اور انتشار میں مبتلا ہے جیسے سنگین واقعات رونما ہو رہے ہیں کیا ان پر کچھ نہیں لکھا جانا چاہیے اور کیا واقعی کچھ لکھا بھی جا رہا ہے ؟ آخر ادب عصر ہوجانے سے آنکھیں پھیرے کب تک رہے گا ؟ قلم سو سماج میں رہ کر بھی سماج کے تقاضوں سے بیزار کیوں رہے ؟

**فیاض رفعت خان** ۔ آرمادرن ۔ ۲ ونگ ، کیٹ ... نمبر ۲۱۹ ۔ ... ٹاؤن شپ ...

شاعر کی قدآوری اور اس کے اعلیٰ مرتبے کا میں قائل ہوں

یک سماجی جبلہ ، تاریخی کا فنارہ ہے ۔ افتخار نے شاعر کا معیار
رنگ و نور بخشا ہے جس کے لیے وہ جائز ستائش کے مستحق ہیں۔
بساطِ سخن کے تحت زبیر کا تعارف بلکہ تجدید تعارف مزا دے
۔ افتخار اور جینت پرمار دونوں کو مبارکباد ۔
حصۂ نظم میں حامدی کاشمیری کی دونوں غزلیں مترنم ہیں اور
ن خوش کرتی ہیں ۔ زبیر کی غزل کا یہ شعر خوب ہے :

اس کو چھو لوں تو تسبیح اس کا قصیدہ لکھوں
اس سے پہلے مرے ہاتھوں کو قلم مت کرنا

**نصیر ناشاد** ۔ ۱۸ وارث تقی اسٹریٹ ، خضر پور ، کلکتہ ——
شاعر ماہنامہ مجھے ملا ہے اور ملتا ہے ۔ آپ بڑی محنت
ذوق و شوق کے ساتھ شاعر کا معیار بلند کرنے میں مصروف عمل
ہیں اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ برصغیر ہند و
پاک کے علمی و ادبی پرچوں میں شاعر ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔
آپ نے اپنے بزرگوں کی کلاسیکی روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے
شاعر کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش
کی ہے خاص کر جرعات کے کالم میں وقت کی آواز پر بڑی درد
مندی اور بے باکی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں نیز یہ کہ ہر شمارے
میں بساطِ سخن کے تحت کسی نہ کسی شاعر و ادیب کو روشناس کرنے
کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے لیکن مکتوبات اور نقد و نظر کی تحریر کچھ
ایسی ہے کہ بغیر خورد بین کی مدد کے پڑھنا مشکل ہے ۔ نکر امروز کا
سلسلہ بہت خوب ہے ۔ اسے جاری رکھیے ۔

**بدر نظیری** ———— یوسف گوڑ ، جگتیال [ بہار ]
شاعر کے زیر نظر شمارہ ۹۰۰ ، ۱۹۸ ء میں محسن احسان کی دونوں
غزلیں خوب ہیں اور قابلِ ستائش ہیں ۔ لیکن اب اس کو کتابت کی
غلطی کہوں یا شاعر کی ؟ کہ غزل نمبر ۲ کے مطلع کا پہلا مصرع
"چلا ہے آنکھ کے نذر کا رہ بن مہتاب"
میں لفظ "آنکھ" کا استعمال کیا گیا ہے جب کہ "اوشہ" مادہ جبل کے
کے ساتھ ہونا چاہیے تھا ۔ کیا یہ پنجابی زبان کا لفظ بول تو نہیں !
[illegible]

**رئیس الور** ———— کیپٹن باؤس جگل پور [ بہار ]
اس امر میں دو رائیں نہیں کہ آپ کی ادارت میں شاعر کی صوری
و معنوی حیثیت بڑی متنوع اور باوقار ہو گئی ہے ۔ ایک طرف صاف
ستھری کتابت و طباعت آپ کی خوش سلیقگی کی آئینہ دار ہے تو
دوسری طرف سرورق کی معنویت اور مشمولات میں بساطِ سخن ،
نکر امروز ، بازیافت ، چہرہ چہرہ یادیں اور آٹھوں لفظ جدت پسند
طبیعت کا اشاریہ ۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس میں جو شگوفے
کیے ہیں او ان اساروں سے تخلیق و تنقید کے ساتھ تحقیق کا بڑا خوب
خوب صورت اور متوازن امتزاج ہوا ہے ۔ نئی نسل کی تربیت اور
"حرفِ سے مضبوطی کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑنے کی یہ تعمیری
اور مثبت کوشش ہے ۔
زیر نظر شمارے میں سی کہانیاں ۔ ایک مازویت اور ادب
کی بدلتی قدریں " روایتی مقالات ہیں ۔ ادبی تعصبات کا مسئلہ میں
اہم سوال اٹھایا گیا ہے ۔ یقیناً اردو ادب کے پھلنے پھولنے اور پروان
چڑھنے کے لیے ادبی دیانت داری ، ذہنی وسعت اور بالغ نظری کی
اشد ضرورت ہے ۔
تخلیقی حصے میں اختر سعید خاں کی غزل بہت پسند آئی ۔ ان
کے ہاں اس دور کی گھری اور تلخ حقیقتیں غزل کی روایتی شان
کے ساتھ نمودار ہوئی ہیں ۔ کرشن موہن اور راجندر سروپ دت
نادان کی نظمیں بھی پُر فکر ہیں ۔ فیروز عابد ، وحید جبل ، اور خورشید
ملک کی کہانیاں اچھی ہیں ۔ پتا نہیں کیوں لے تین کالم کا موس اچھا نہ
لگا ۔ اس طرح گوشہ اخباروں کے لیے مخصوص ہے ، اس لیے رسالے
میں مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ ہاں اگر کم جگہ میں زیادہ مواد چھپا ہو تو
اور بات ہے ۔
مکتوبات کا حصہ بھی بڑا معلومات افزا ہے ۔ مجھے قمری پیکر
عبدالقوی دسنوی صاحب کی اس تجویز سے پورا اتفاق ہے کہ اردو
دنیا پر اعجاز صدیقی مرحوم کا قرض ہے ۔ ایک مبسوط اور معیاری نمبر
ضرور نکالیے

**شاہد وسیم** ————
شاعر کے دو شمارے موصول ہوئے ۔ شاعر ایک معیاری
رسالہ ہے ۔ [illegible]

تعجب کرتے ہیں کہ دل خوش خوش کیا گیا ہے ۔ ایک مشورہ
ضرور دینا چاہوں گا ، اگر ہر شمارے میں اردو کے کلاسیکی
اور افسانہ نگار جیسے پریم چند ، کرشن چندر ، ماجد
سکھ بیدی ، منٹو ، خواجہ احمد عباس ، قرۃ العین حیدر اور عصمت
چغتائی وغیرہم کی ایک ایک نمائندہ کہانی دی جائے کہ لکھنے والوں
کو پتہ چل سکے گا کہ ماضی قریب یا بعید میں کہانیوں کا مزاج کیا تھا
کہانی کیا ہوتی ہے ۔ کہانی کا ارتقائی سفر کیا رہا ہے ۔ کتاروں کا
اٹھنا ہوتی ہے کہ ہر کوئی تعریف سے رہا ۔ آپ نے ایک سال قبل
نئے شعراء پر مشتمل ایک خاص شمارہ نئی شاعری کے نام شائع
کیا تھا ۔ کیا ایسا ہی ایک شمارہ نئے افسانہ نگاروں پر مشتمل شائع
نہیں ہو سکتا ؟

---

شاعر کے لیے مستقبل کے خاکوں میں ایک سلسلہ یہ بھی ہے کہ
میں افسانہ اور شاعری دونوں ہی کو پیش کیا جائے گا ۔ نئی شاعری
نام کی دوسری قسط کی اشاعت کے بعد نئے منگرا ہم افسانہ
پر مشتمل شمارہ پیش کیے جا رہے ہیں ۔ [ ادارہ ]

**یعقوب شاغر** ۔ یرگ نادر ، ۵۰ داں منزلہ ، ایکسار روڈ ،
بوریولی [ ویسٹ ] بمبئی
شاعر کی سرورق کی ڈیزائن بے حد پسند آئی ۔ مگر مشین گن کی گولیاں
کا مطلب میری سمجھ سے باہر رہا ۔ سوکھے ہوئے پیڑ کی علامت ہمارے
اردو قارئین کے لیے ایک اچھی پیش کش ہے ۔
" فکر امروز " میں حضرت سیماب اکبر آبادی نے مشاعرے کے
تعلق سے جو خیال ظاہر کیا ہے میں اس سے متفق نہیں ہوں ۔ تخلیق
کار کوئی بھی ہو ، اس کا معیار جداگانہ ہو سکتا ہے ، مگر وہ پست اور
ذلیل ، اہل اور نااہل نہیں ہو سکتا ۔ ادب کے لیے یا زبان کے لیے یہ
چیزیں میری نظر میں بے معنی ہیں ۔
آپ نے ہر وقت اردو طبقہ کی مدہوشی کو ہوش میں لانے
کی بھرپور کوشش کی ہے ۔ اور نام اردو ادب کی تاریخ " اس عنوان
کے تحت تو آپ نے اپنے فکر کی جرأت کے ذریعہ ہمارے اعلا
اردو دو تبلیغ کرنے والوں کے سامنے سوالیہ نشان رکھ دیا ہے
[illegible]
کرتا ۔ ...

[illegible]

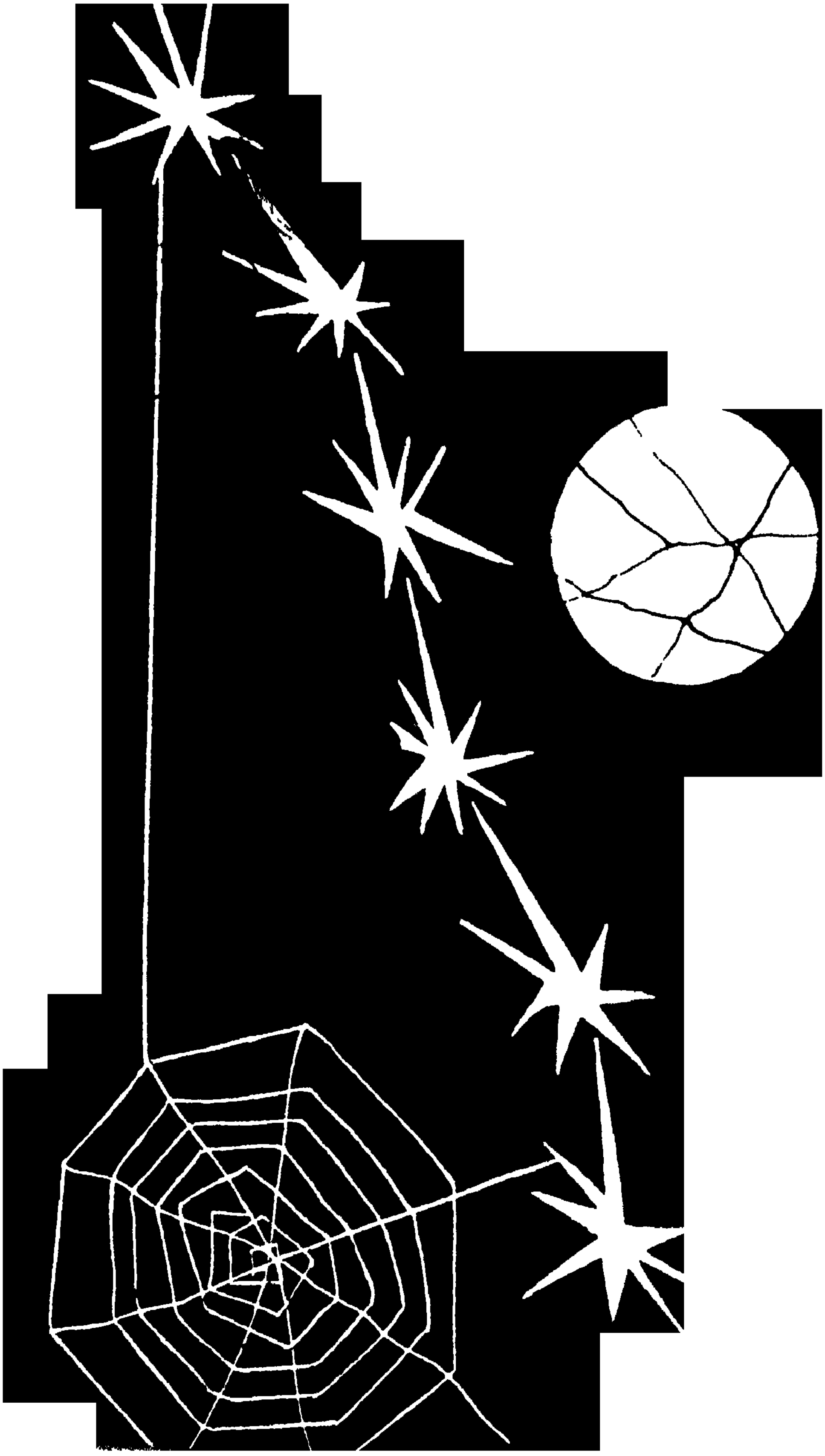
Regd. No. [illegible] B.Y.W. 28 — Price : Rs. 5

The "SHAIR" (Monthly) Bombay 400 008.

58 Years of Publication — ISSUE No:- 8 — 1987 — Telephone No. 35 99 04

(Publishing Date 27-28)

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57



اقبال خصوصی نمبروں کی سیریز [redacted] الشان

نذرانۂ عقیدت

# اقبال
## نمبر

۳

کتابیں

مظلوم اقبال

خدوخال اقبال

اور

اقبال۔ جہانِ دیگر

کے اہم مباحث

خطوط

اور اقتباسات

اقبال

کی ایک

نایاب کتاب

## اکبری اقبال

[عکسی]

نصف صدی کے بعد

شاعر کے صفحات پر

پہلی بار پیش

کی جا رہی ہے

## ایک ناتمام جھلک

- مشاہیر قلم کاروں کے تازہ و غیر مطبوعہ مضامین
- اقبال کی کتابوں کے اولین نسخوں کا عکس
- اقبال کے ممتاز شاگرد لمعہ حیدرآبادی پر خصوصی گوشہ
- خطوط اقبال کے عکس، متعلقین کے خطوط
- اقبال پر اہم ماخذات، تصاویر، نئی کتابیں، تحریریں
- عالمی شہرت یافتہ خطاط صادقین کی خطاطی کا کمال۔ اشعار اقبال

ان کے علاوہ بہت کچھ جو آپ کے لئے نیا ہوگا

دیدہ زیب سرورق ✻ منفرد انداز پیشکش

**۳۲۰ صفحات ■ قیمت ۲۰ روپئے**

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا براہ راست ... سے طلب کیجئے

ایجنٹ حضرات ... سالانہ خریدار ... مایوس ہوگے

[illegible]

# فکرِ امروز



اردو شاعری ہمیشہ زمانے کے ہم رنگ رہی ہے، جس زمانے میں جس قسم کے جذبات تھے انھیں جذبات کی ترجمانی اردو شاعری کرتی رہی ہے۔ اب جو حضرات اس دورِ علوم و فنون اور ارتقائے انسانیت کے عہدِ جدید میں بھی رنگِ قدیم اور تغزلِ دیرینہ کے معتقد ہیں انھیں خود فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہیں۔ جس زبان کا ادب اپنے موجودہ دور کی ضروریات و رجحانات کا نگراں نہیں ہوتا وہ زبان کبھی مکمل نہیں کی جا سکتی۔ آج اقبالؔ، فانیؔ، حسرتؔ کے عصرِ ارتقا میں ولیؔ اور نوریؔ دکنی کی سی شاعری ایک قسم کی رجعت قہقری ہے جسے کم از کم مہذب اور اہلِ علم طبقہ کسی طرح پسند نہیں کرتا۔ بے شک موضوعاتِ حیات نہیں بدل سکتے لیکن ترک ضرور کیے جا سکتے ہیں۔ زمانۂ جدید کے موضوعات بھی جدید ہیں۔ ضروریات، حسیات، جذبات اور رجحانات سب جدید ہیں۔ ولیؔ یا سوداؔ کے اشعار اگر ہمارے سامنے آج پڑھے جائیں تو ہم ان سے خفیف تو ہو سکتے ہیں مگر متاثر نہیں ہو سکتے۔ وہ زمانہ رخصت ہو گیا جب ہماری نشاطی شاعری ابنائے وطن میں حوصلۂ نشاط اور جذبۂ سرور پیدا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ایسی شاعری کی ضرورت تھی۔ مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آج زمانے کا مطالبہ کچھ اور ہے، آج ہمیں نشاطی شاعری کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ ہمارا نشاطِ خواب ایک پریشاں تعبیر کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ پھولوں کی سیجیں، محل کی مسندیں اور درِ نگار تکیے ہماری محفلِ حیات سے اٹھا لیے گئے ہیں۔ اب ہمارے سامنے اقتصادی مسائل ہیں، اب ہمارے پیشِ نظر سیاسی نظریات ہیں۔ اب ہمارے سامنے غریبوں کا دکھ اور مزدوروں کی مصیبت ہے۔ اب ہمارے سامنے آزادیٔ وطن کا اہم سوال ہے۔ کیا اس عالمِ کرب اور اس محشرِ امید و بیم میں خیالیاتی اور معاملاتی شاعری کسی طرح بھی مناسبِ حال کہی جا سکتی ہے؟

[۲۱ ستمبر ۱۹۳۶ء کو متھرا کے ایک ادبی اجلاس کے خطبۂ صدارت سے اقتباس].

**سیماب اکبرآبادی**

# شاعر

اشاعت کے ۵۸ واں سال

جلد ۔۔۔ ۵۸

شمارہ ۔۔۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲

۳۵۹۹۰۳

ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء

مُدیر

افتخار امام صدیقی

●

مُعاوِن

ناظر نعمان صدیقی

قیمت :۔ ۵ روپے

*

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸



# اقبال نمبر کے متعلق ایک اہم اعلان

قارئینِ کرام! آپ کو شاعر کے اقبال نمبر کا انتظار ہوگا اور آپ اس عام شمارے کو دیکھ کر تعجب کریں گے۔ اعلان کے مطابق مارچ کے آخر تک "اقبال خصوصی ایڈیشن" [اب ایک ضخیم اقبال نمبر میں تبدیل ہوگیا ہے] کو شائع ہونا تھا اور یہ کام ہو بھی جاتا اگر بات سو، سوا سو صفحات کی ہوتی، خیال بھی یہی تھا کہ اتنے صفحات میں مضامین اور دیگر مواد کی سالانہ کے بعد اسے شائع کردیا جائے لیکن جب اقبال پر کام شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک عظیم شاعر کی پھیلی ہوئی شخصیت اور اس کے ہمہ جہت کاموں کو ۱۹۸۷ء یا ۱۹۸۸ء میں کسی خاص نمبر کی صورت میں پیش کرنا آسان نہیں۔ پھر شاعر کی روایت عام شماروں اور خاص نمبروں کے لیے سنگ میل کی رہی ہے۔ ہندستان میں اقبال کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سے قطع نظر کسی ادبی رسالے کا کوئی ضخیم اور وقیع خاص نمبر شائع بھی نہیں ہوا۔ علامہ کی پچاسویں برسی کے موقع پر تفہیم اقبال کے لیے بعض نئے تناظرات کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ خاص نمبر میں نئی نئی چیزوں کے اضافے اور بعض نایاب و کم یاب ماخذات وغیرہ کی فراہمی میں وقت اور زرِ کثیر کا بوجھ، بڑھتی ہوئی ضخامت کہ پانچسو، چھ سو صفحات بھی ناکافی لگ رہے تھے۔ یہ اور بہت سی دوسری وجوہ اقبال نمبر کی تاخیر کا سبب بنی ہے۔ اقبال نمبر کے خیال اور اس کی تکمیل کی داستان تو اقبال نمبر ہی میں آپ ملاحظہ کریں گے لیکن ہم اتنا تو وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان میں اب تک شائع ہونے والی کتابوں اور رسائل کے اقبال نمبروں میں شاعر کا اقبال نمبر وقیع، متنوع، منفرد اور اقبال شناسی کے نئے زاویے قائم کرے گا اور شخصیات پر شائع ہونے والے نمبروں میں شاعر ہی کی روایت کی توسیع ہوگا، شخصیات پر ترتیب دیے جانے والے نمبروں کے لیے ایک نئی راہ بنائے گا۔

اقبال نمبر ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہوگا لیکن قیمت برائے نام ہی رکھی گئی ہے یعنی صرف ۲۰ روپئے۔

شاعر تاخیر سے شائع تو ہو ہی رہا تھا اقبال نمبر کی وجہ سے عام شمارے مزید تاخیر کا سبب بنے۔ ۱۹۸۷ء میں ۴ عام شمارے اور شائع ہونا تھے۔ اس تاخیر کو کم کرنے اور ۱۹۸۷ء کے مقررہ شماروں کی تکمیل کے لیے یہ شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ شمارہ شاعر کی چار اشاعتوں یعنی شمارہ نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ پر مشتمل ہے لیکن شاعر کے مستقل خریداروں کا نقصان ہمیں مقصود نہیں لہٰذا اس شمارے کو ایک ہی اشاعت سمجھا جائے اسی طرح ہر خریدار کی مدتِ خریداری میں تین ماہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جن خریداروں کی مدتِ خریداری درج ذیل مہینوں میں سے کسی ایک مہینے میں ختم ہو رہی ہے اس پر سرخ نشان لگا دیا گیا ہے۔

| ستمبر | اکتوبر | نومبر | دسمبر |
|---|---|---|---|

معزز خریدارانِ شاعر سے گذارش ہے کہ وہ اپنے زرِ سالانہ کی تجدید قبل از وقت کردیں۔ اقبال نمبر چوں کہ بے حد گراں قدر اور قیمتی ہے لہٰذا سادہ ڈاک سے ارسال نہ کرتے ہوئے رجسٹری یا ریکارڈڈ ڈلیوری [RD] سے پوسٹ کیا جائے گا اسی طرح اگر اقبال نمبر رجسٹری سے منگوانا ہو تو ۷ روپے اضافہ کرکے ۵۷ روپے منی آرڈر سے بھجوائیے۔ اگر آر ڈی سے منگوانا ہو تو ۳ روپے زائد یعنی ۵۳ روپے منی آرڈر سے بھجوائیں۔ جن خریداروں کی مدتِ خریداری ابھی ختم نہیں ہوئی ہے وہ صرف رجسٹری یا آر ڈی کی رقم بذریعہ منی آرڈر بھجوائیں بہ صورتِ دیگر اقبال نمبر انڈر پوسٹل سرٹی فیکٹ سے پوسٹ کیا جائے گا۔ ڈاک میں گم ہو جانے کی صورت میں ہم دوبارہ خاص نمبر بھیجنے سے قاصر رہیں گے اور ادارہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

اقبال نمبر ۱۹۸۸ء کی سب سے اہم علمی، ادبی اور تحقیقی دستاویز ہوگا۔ ایک محفوظ کیا جانے والا خاص نمبر جو آپ اور آپ کے احباب کے لیے ۱۹۸۸ء کا سب سے عظیم اور منفرد تحفہ ہوگا۔ شاعر کے خاص نمبر اپنی اشاعت کے فوراً بعد ہی ختم ہو جاتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ اور آپ کے احباب کو بعد میں مایوس ہونا پڑے۔ [ادارہ]

سہ ماہی

ماضی، حال، مستقبل

مدیر

سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۹ تا ۱۲ — ۱۹۸۷ء

# باغِ اردو

محسنِ اردو جان گلکرسٹ کے نام سے اردو زبان و ادب میں دلچسپی رکھنے والا ہر صاحبِ نظر واقف ہے۔ وہ چند برس میں اردو کی ایسی اور اتنی خدمات انجام دے گیا جو دوسرے اپنی تمام عمر میں نہیں انجام دے سکتے۔ اردو نثر پر خصوصیت سے اس کا احسان ہے اس نے سہل اور بامحاورہ اردو تصانیف و تراجم کے لیے ملک کے صاحبِ صلاحیت اہلِ قلم کو کلکتہ میں جمع کیا اور قلیل مدت میں متعدد کتب تیار کرا دیں۔ ان کی طباعت کے لیے اس نے ہندستانی چھاپہ خانہ کے نام سے ایک پریس قائم کیا جہاں سے یہ کتابیں طبع ہو کر نکلیں اور ملک کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ شاید پہلی بار اس نے اردو کے املا کی طرف بھی توجہ کی اور اس میدان میں بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ اس کے لیے اس نے قواعد و ضوابط مقرر کیے اور اپنے مطبع کے لیے جو ٹائپ تیار کرایا اس میں ان ضوابط کے استعمال کے لیے گنجائش نکالی۔ چنانچہ گلکرسٹ کے زیرِ اہتمام جو کتابیں طبع کی گئیں ان میں وہ تمام قاعدے برتے گئے تھے جن سے اس نے اپنے اردو رسالہ تالی کتاب میں بحث کی تھی۔
انھیں کتابوں میں سے ایک گلستانِ سعدی کا ترجمہ باغِ اردو بھی ہے جو گلکرسٹ کی فرمائش پر میر شیر علی افسوس نے کیا تھا اور ہندستانی چھاپہ خانہ سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کتاب کا یہ اولین ایڈیشن نایاب ہے البتہ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے جہاں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائبریری سے پہنچا ہوگا۔ چنانچہ سرورق باغِ اردو کے زیریں حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی لائبریری کی مہر دیکھی جا سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں اس ایڈیشن کے چند صفحات کا عکس میں نے لندن سے منگوایا۔ ان صفحات میں سے اولین دو صفحوں کے عکس پیش کیے جاتے ہیں۔ قارئین اس کے املا کو غور سے ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان میں یائے معروف و مجہول واؤ معروف و مجہول یا ماقبل مفتوح اور نون غنہ کا فرق کیا گیا ہے نیز ہائے مخلوط کا استعمال بھی ہوا ہے۔

آج ہمارے املا کی عمارت معمولی ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ گلکرسٹ ہی کے متعین کردہ اصولوں پر کھڑی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے باغِ اردو کے ان دو صفحات کا عکس قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کیوں کہ یہ اردو کی قدیم ترین مطبوعہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے اردو طباعت کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ عکس مفید مطلب ہوں گے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# باغ اردو

ترجمہ گلستان شیخ سعدی شیرازی کا واسطے زبدہ
نوئینان عالی شان منتخب خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان

مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر
دام اقبالہ کے

مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام ثروتہ کی فرمایش سے
کیا ہوا میر شیر علی افسوس کا

دعوی جسے ہی ہے شاعر کو شاعری کا
دیوان ہی ہمارا ایک جواہری کا

ہندوستانی چھاپہ خانہ
سنہ ۱۸۰۲ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۷
ہجری کے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا دیباچہ تعریف میں اردو صاحب کی اور
احوال مترجم کا اور بعضے عذر و نسبت کتاب کے

شہا لائق حمد پہلے اسی کی ہو تو
ہے ہر سبز جو زینت باغ اردو
ثنا پھر نعت کا لائق و نسبت پڑھا
کہ تا حشر رہے یہ باغ ہرا
پھر اسکے بعد خیال منقبت کو
گلزار و نق جو اسکی بہشتر ہو

باغِ اردو ۱۸۰۲ء کی چھپی کتاب کے دو صفحات کا عکس

# جگر مرادآبادی اور کشمیر کا یادگار مشاعرہ

بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں کشمیر کی حکومت کا دور دورہ تھا ہر سال وادی کے کونے کونے میں جشن منایا جاتا تھا۔ بخشی صاحب خود بھی صاحب ذوق تھے۔ شعراء اور اہل کمال کی قدردانی کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۵۹ء کے جشن کے سلسلے میں کشمیر سرکار کی دعوت پر جگر مرادآبادی بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے کئی اہم مقامات پر اہل ذوق حضرات کو محظوظ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ سری نگر کے ٹورسٹ سنٹر میں جو مشاعرہ ۳۰ ستمبر کی رات کو ہوا تھا وہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گا۔ اصل میں مشاعروں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جگر جو پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے انہیں سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ دور دراز جگہوں سے آئے تھے۔ مشاعرہ کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں ریاست کے وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کے رفقاء، معزز شہری اور فوجی حکام بھی موجود تھے۔ ہندوستان سے جو لوگ سیر و تفریح کی غرض سے اس زمانے میں وادی میں آئے تھے ان میں سے بھی اکثر مشاعرہ میں موجود تھے۔ جب جگر نے اپنا کلام ترنم سے پڑھنا شروع کیا تو مشاعرے کی چھتیں اڑنے لگیں۔

۲۹ ستمبر دن کے ۳ بجے کشمیر سرکار نے وزیر داخلہ آنجہانی پنڈت پنت کے اعزاز میں سری نگر کے امر سنگھ ایمپوریم میں چائے نوشی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں صدر ریاست جناب ڈاکٹر کرن سنگھ، بخشی غلام محمد وزیر اعظم، ان کی کابینہ کے رفقاء، اعلیٰ سرکاری حکام اور فوجی افسران کے علاوہ معزز شہری بھی موجود تھے۔ چائے نوشی کے بعد بخشی صاحب نے جگر سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام معزز مہمان پنڈت پنت صاحب کو سنائیں۔ جگر جب مائک کے سامنے آئے تو سامعین نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ ڈائس پر پنڈت پنت، صدر ریاست، بخشی غلام محمد [illegible] کے علاوہ کابینہ کے ممبران بھی تھے۔

جگر نے ذیل کی غزل سنائی تھی

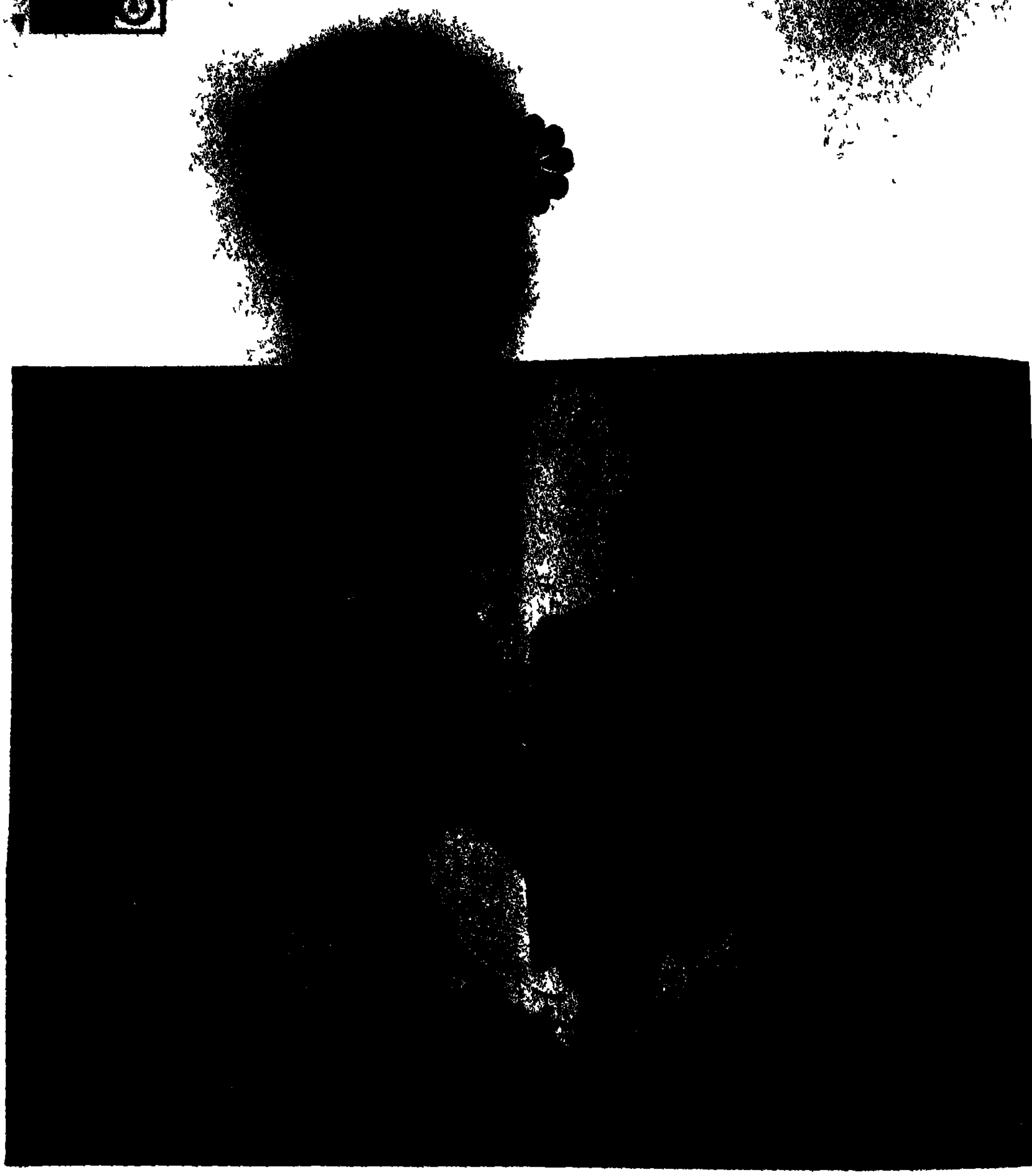
محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
طبیعت جس کی خود دار بھی ہے
ادھر نازک مزاج یار بھی ہے
یہ تنہا جن سے اک دنیا ہے نالاں
انہیں سے گرمی بازار بھی ہے
غنیمت ہے کہ اس دور ہوس میں
ترا اخلاص ہے دشوار بھی ہے
خبردار اے سبک ساران ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے
جو کوئی سن سکے تو نکہت گل
شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے

اس کے بعد معزز مہمان پنڈت پنت نے کشمیر میں اردو شعر و ادب کے دلکش مستقبل پر اپنی اور ایک مختصر سی تقریر کی۔ انہوں نے پُرزور الفاظ میں جگر کی غزل گوئی کو سراہا۔ جلسے کے اختتام پر بخشی صاحب نے اپنی طرف سے شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسہ تقریباً ۷ بجے شام کو برخاست ہوا۔ اس کے بعد جگر مرادآبادی مرحوم علی محمد کاظمی ناظم تعلیمات امر سنگھ کالج کے ساتھ گورنمنٹ امر سنگھ ڈگری کالج گئے۔ جوں ہی جگر صاحب احاطہ کالج میں داخل ہوئے تو کالج کے سیکڑوں طلباء نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ جشن کشمیر کے سلسلے میں صاحب زادہ محمد عمر پرنسپل کالج [illegible] کے والد گرامی [illegible] نے ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ اس میں جگر کے علاوہ ساغر نظامی، روشن صدیقی، سکندر علی وجد، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، [illegible] اختر، ساحر، خورشید [illegible] وغیرہ بھی شریک تھے۔ مشاعرے کی کارروائی جناب مرحوم کاظمی صاحب کی صدارت میں ۷ بجے شروع ہوئی تھی۔ مشاعرہ نہایت ہی کامیاب رہا۔ اس میں جگر صاحب نے ذیل کی غزل اپنے دلکش اور مخصوص ترنم سے سنائی تھی

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کامل رہبر قاتل رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن
عمریں بیتیں صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کار شیشہ و آہن
عشق و حوادث اللہ اللہ
مجبوری ہے شاخ نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن
جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں
اور وہ ظالم آئینہ دشمن
خیر مزاج حسن کی یارب
تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
تجھ سا حسین اور خون محبت
وہم ہے شاید سرخی دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے
ہجر کی رات اور اتنی روشن
کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی
سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہے شبنم [illegible]
عقل ہی تنہا عقل کی دشمن
ہستی شاعر اللہ اللہ
حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت سادہ طبیعت
فرش نشیں اور عرش نشیمن
[illegible] حق ہے آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

۳۰ ستمبر دن کے ۲ بجے پرنسپل صاحب نے جگر کو مدعو کیا۔ جگر کے ساتھ ساغر نظامی اور روشن صدیقی [illegible] قیام کرنے کے بعد جگر شام کے ۷ بجے [illegible] سری نگر تشریف لے گئے۔ [illegible] کشمیر میں ایک ہفتہ [illegible] بڑی تعداد میں ملنے آتے تھے۔ [illegible] جگر نے دوبارہ [illegible]

بشکریہ اکبر حیدری کشمیری



امرتسر کالج کے مشاعرہ سے [illegible] اپنا کلام [illegible]

[illegible] دنیا سے تعلق کوئی رشتہ نہیں ہے، فن کار کا وجود ایک درخت
[illegible] اپنی اٹھان اور پھیلاؤ کے باوجود آب و گل سے پیوستہ ہے۔ اس لیے اس کے فن کے حوالے



حامدی کاشمیری

مسعود منزل، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

# شاعری کی مقامی اور آفاقی معنویت

اس میں کوئی شک نہیں کہ فنکار شعوری طور پہ بیدار اور فعال ہوتا ہے، اور وہ گرد و پیش کے مقامی حالات اور واقعات سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مقامی حالات و کوائف ہی عہدِ طفولیت سے اس کے شعور و ذہن کی پرداخت اور تشکیل کرتے ہیں، اس لیے کسی فن کار کے تخلیقی ذہن سے اس کے مقامی آب و رنگ کو خارج نہیں کیا جا سکتا، مقامیت کی ذیل میں گھریلو، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور فکری زندگی کے مخصوص رجحانات، آداب و اطوار نفسیاتی و لسانی اور جمالیاتی عوامل آتے ہیں، وہ اکثر حالتوں میں کسی ملک، علاقے یا مقام کے ثقافتی تشخص کا باعث بنتے ہیں، ظاہر ہے مقامیت کا یہ عنصر ہر فن کار کے یہاں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایلیٹ، ٹالسٹائی، اقبال اور پریم چند کے یہاں آسانی سے اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

تاہم تمدنی تنقید کے موئیدین بعض اوقات فنی تخلیق مطالعے کے ضمن میں شاعر کے یہاں تاریخی اور مقامی حقائق کی نشان دہی کرنے کی دھن میں یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعر کے یہاں ان حقائق کے بجائے شخصی طور پر ان کے بارے میں تاثر یا ردعمل کی بازآفرینی ملتی ہے، جو بدیہی طور پر مقامی حقائق کی بنیادی تقلیب پر دلالت کرتی ہے۔

اصل میں تمدنی نقاد جس مفروضے پر انحصار کرتے ہیں، اور جو اکثر حالتوں میں ان کے تنقیدی طریقۂ کار کی بے ثمری کا باعث بنتا ہے اور یہ ہے کہ وہ فن کار کو ایک ایسے دانش مند اور ذمہ دار فرد سے تعبیر کرتے ہیں، جو بنیادی طور پر ان مقامی حالات کا ادراک کرتا ہے، جن سے اُسے دن اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی رو سے شاعر اپنے عہد کا بہترین دانشور اور مقامی تہذیب کا ترجمان قرار پاتا ہے۔ شاعر کو علم و دانش کے اس بلند مرتبے پر فائز کرنا اس کے تئیں خراجِ عقیدت تو پیش کرتا ہے، مگر اس کے فکر و نظر اور اس کے تخلیقی طریقۂ کار کو پس پشت ڈال دیتا ہے یہ سوچنا کہ شاعر گرد و پیش کی زندگی میں آئے دن ہونے والے واقعات کا چشم دید گواہ ہے اس لیے مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ لفظ و بیان کی مدد سے دوسروں تک منتقل کرے، شاعری کے تخلیقی کردار کی مکمل نفی کرتا ہے، کیونکہ یہ شاعری کو صحافت کی سطح پہ لے آنے کا عمل ہے، ورڈس ور کا یہ کہنا کہ شاعری عالم سکون میں جذبے کی بازیابی کا عمل ہے۔ یا ایلیٹ کا یہ قول کہ شاعر شخصیت کا نہیں، بلکہ میڈیم کا اظہار کرتا ہے، اس بات واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ شاعر کوئی ایسا خود کار ترسیلی آلہ نہیں ہے، جو مقامی حقائق کی معلومات کو لوگوں تک پہنچانے کا میکانکی ذریعہ ہو۔ THEODORE M GREESI نے کانٹ CRITIQUE OF JUDGEMENT پر ا

مقالے میں لکھا ہے:

> "اگرچہ فن کار کی ہر تخلیق اس کی فن کارانہ بصیرت کا اظہار ہوتی ہے تاہم وہ خود اس لمحے تک اس بات سے بے خبر ہوتا ہے
> کہ اُسے کیا کہنا ہے جب تک وہ تکمیل یافتہ فن پارے میں اسے کہہ لیتا ہے"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ارادی کوشش یا منصب کے تحت مقامی زندگی یا اس کے معاشرتی یا تہذیبی مظاہر و آثار کو پیش نہیں کرتا تو یہ ہے کہ وہ کسی خارجی محرک کا دست نگر ہوئے بغیر ایک نامعلوم اندرونی خواہش یا طلب کے تحت تخلیقی عمل میں داخلی سطح پر پیکروں میں ڈھلنے والے نادیدہ اور اجنبی تجربوں کو ایک موزوں و مترنم ہیئت میں ڈھالتا ہے، جو شعری تخلیق کی صورت اختیار کرتے ہیں، تخلیقی عمل

داخلی تجربے کی اصلیت اور تہہ داری پر شعری تخلیق کی اہمیت اور معنویت کا انحصار ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے، اور مقامی زندگی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

جیسا کہ کہا گیا شعری تجربہ زندگی کے ادراک کی پیچیدگی تہہ داری اور اسراریت سے متصف ہوتا ہے، اور تخلیقی شاعر کے حوالے سے ہی اس کی اصلیت اور معنویت واضح ہوتی ہے، کوئی غیر شاعر خواہ زندگی کے ہزار گونہ قیمتی اور اصلی تجربات کا مالک کیوں نہ ہو، شعری تجربے سے گذر نہیں سکتا، اگر وہ کسی مرحلے میں داخلی طور پر اس سے گذرے بھی، پھر بھی اس کا وجود و عدم مساوی رہے گا کیونکہ وہ اسے لسانی ہیئت میں دوسروں کے لیے قابل شناخت بنانے سے قاصر رہے گا شعری تجربے کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ یہ ایک غیر معمولی "ادراک"، حساس اور دیدہ ور شخص کے باطن داخل اور خارجی دنیا کے حقائق کے تصادم کے نتیجے میں صد درجہ شخصی تاثرات کی ایک لسانی وحدت میں ڈھلنے کا عمل ہے، یہ عمل صد درجہ شخصی ہونے کے ساتھ ساتھ تخیلی آزادانہ اور مقصود بالذات ہوتا ہے چوں کہ شعری عمل کسی منصوبہ بندی، شعوری کاوش، مقصدیت یا نظریاتی حد بندی کو قبول نہیں کرتا، اس لیے شعری اظہار دیگر سماجی یا معلوماتی اظہارات سے قطعی مختلف ہو جاتا ہے، یہ اپنی مرضی کا آپ مالک ہوتا ہے، اور اپنے مخصوص خلیق طریقہ کار کو تسلیم کرتا ہے، اور پھر اپنی تہہ داری اور نقاب پوش معنویت کو منوانے کے لیے اپنے قوانین خود وضع کرتا ہے، اس کی اپنی منطق ہوتی ہے، جو دیگر شعبہ ہائے فکر یا ذہنی مشاغل کی منطق کو مسترد کر کے استوار ہوتی ہے؟

اس لیے شعری تجربے سے یہ توقع کرنا کہ یہ شاعر کے عہد کی معاشرت، تاریخ یا تہذیب کے بارے میں اطلاعات فراہم کرے یا اس سے کسی راست حوالے کا کام کرے اس کی ماہیت سے اپنی لاعلمی کو ظاہر کرنے کے مترادف ہے، شاعر کی شخصیت ایک پیچیدہ مرکب شخصیت ہے شعوری طور پر یہ اپنے عہد کے جن حالات و حقائق کے اثرات قبول کرتی ہے، وہ اس کے لیے تاثر پذیری کے مرحلے سے گذرنے کے بعد بے معنی ہو جاتے ہیں، اس کی مثال شہد کی مکھی کی ہے، جو پھولوں سے رس چوس لیتی ہے پھر کشید و انجذاب کے عمل کے نتیجے میں شہد، جو پھولوں [ اور شہد کی مکھی سے بھی ] سے قطعی مختلف چیز ہے، کو معرض وجود میں لاتی ہے، تجربہ جب لسانی تکمیلیت کو پہنچتا ہے تو وہ خارجی زندگی سے تمام تر حوالوں کی تنسیخ کر کے ایک آزاد، ان دیکھے اور خود مختار وجود کو پالیتا ہے، خارجی معروض سے بقول بیل صرف اس حد تک رشتہ رہتا ہے کہ وہ محرک کا کام دے سکتا ہے، شاعری فی نفسہٖ معروض سے نہیں، بلکہ اس ذہنی کیفیت سے خلق ہوتی ہے، جس میں اسے یاد کیا جاتا ہے۔"

خارجی حقائق سے شاعر کا رشتہ اس لیے بھی ناپائیدار اور فرضی رہ جاتا ہے کیوں کہ وہ اپنے شعری تجربے کی تکمیل کے لیے عصری یا مقامی زندگی کے حقائق کے بجائے، ان کے بے چہرہ تاثرات سے واسطہ رکھتا ہے، اکثر حالتوں میں وہ تاثرات سے بھی زیادہ لاشعور کی زیریں تہوں میں خوابیدہ یا بیدار صدیوں کے انفرادی یا نسلی تجربات کے عکس و سایہ کی جانب رجوع ہوتا ہے، اور تخلیقیت کے انتہائی لمحوں میں شعور اور لاشعور کی حد فاصل پگھل جاتی ہے، اور شعوری تجربات لاشعوری پیکروں میں ضم ہو جاتے ہیں، نتیجتاً جو تخلیق معرض وجود میں آتی ہے، اس کی انفرادیت، ندرت اور عدیم النظیریت کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، ایسا تجربہ خارجی زندگی کے حقائق سے کون سا راست یا قابل شناخت رشتہ رکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اپنی حقیقت خود خلق کرتا ہے، اور اس کا وجود ہی اس کی حقیقت ہے، میر نے ایسی ہی تخلیقی حقیقت خلق کی ہے، اس لیے اس میں مقامی مظاہر مثلاً شہر و قریہ، کوچہ و بازار، دیوار و در، کوہ و بیاباں اور زمین و آسماں بھی قلب ماہیت سے گذرتے ہیں، چنانچہ خورشید و ماہ و گل دیکھنے کی صلاحیت سے متصف ہیں، خورشید کی تابانی روسیاہی میں بدل گئی ہے، ہوا کا رنگ متغیر ہے، اور آفاق کارگہ شیشہ گری ہے۔

خورشید و ماہ و گل بھی ادھر ہی ہیں دیکھ — اس چہرے کا اک آئینہ حیران ہی نہیں
شام شب وصال ہوئی یاں کہ اس طرف — ہونے لگا طلوع ہی خورشید روسیاہ
ہے آگ کا سا نالہ کا ہش فزا کا رنگ — کچھ اور صبح دم سے ہوا ہے ہوا کا رنگ
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

تاہم اس بحث سے یہ مراد نہیں لی جانی چاہیے کہ ادیب یا ادب پارے کا مقامی دنیا سے قطعی کوئی رشتہ نہیں ہے، فن کار کا وجود ایک درخت کے مانند ہے، جو آسمان کی کھلی فضا میں اپنی اٹھان اور پھیلاؤ کے باوجود آب و گل سے پیوستہ ہے۔ اس لیے اس کے فن کے حوالے

سے متعالی، تہذیبی اور معاشرتی قوتوں کے تشکیلی عناصر کے تجزیاتی عمل کو بے معنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) ۱۹۶۰ء کے بعد اردو شاعری موضوع، تجربے، ہیئت اور زبان کے اعتبار سے بعض بنیادی تبدیلیوں سے روشناس ہونے لگی، اور تبدیلیوں کا یہ عمل جاری ہے، ان تبدیلیوں کے نتیجے میں اردو شاعری بہت حد تک ایک نئے معنی خیز اور بارآور تخلیقی دور سے گذرنے لگی، گذشتہ بیس پچیس برسوں سے جو شعری نمونے سامنے آئے ہیں، وہ تاریخی، موضوعی اور لسانی لحاظ سے اردو شاعری کے ارتقاء اور وسعت پذیری کی نشاندہی کرتے ہیں پہلی خصوصیت، جو معاصر شاعری کو، ماقبل کے ادوار کی شاعری سے ممیّز اور ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ آج کے حساس اور بیدار دل انسان کے آشوبِ آگہی کی مصوری کرتی ہے، آج کا انسان عقیدوں، اصولوں اور قدروں کی تباہی کے نتیجے میں روحانی ذہنی اور نفسیاتی طور پر محرومی، الجھن، پسپائی، انتشار اور خوف کا شکار ہے، وہ نظریاتی وابستگیوں، شالیت پرستی اور اجتماعیت کی بے معنویت کا احساس کر کے اپنی ذات کی طرف مراجعت کرتا ہے، لیکن ذات کوئی پناہ گاہ ثابت نہیں ہوتی، یہاں وہ زیادہ گہرائی اور ادراک کے ساتھ انتشار، زوال اور تباہی سے متصادم ہوتا ہے، وہ معاشرتی مسائل ہوں یا مابعد الطبیعاتی، دونوں کی تفہیم و تشخیص کے لیے شخصی ادراک ہی پر تکیہ کرتا ہے، وہ مستعار نظریوں کے بجائے شخصی ادراک ہی سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے لیکن وہ حل نہیں ہوتے، لہٰذا ادراک کی حد بندی کے ادراک سے اس کی بے چارگی میں مزید اضافہ ہوتا ہے، یہ خود آگہی کی انتہا ہے — آگہی کی آگہی کا کرب، جس سے آج کا شاعر دوچار ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عہد ماضی میں بھی ایسے ادوار گذرے ہیں، جو شعراء کے آشوب آگہی پر دلالت کرتے ہیں، شیکسپیئر، میر، ورڈسورتھ اور غالب کے یہاں اس کے واضح نشانات ملتے ہیں، مگر نئے شعراء کے یہاں خود آگہی تمام تر مفروضوں اور عقیدوں کا ابطال کر کے کائناتی سطح پر وجود کی ناگزیر تباہی اور بے معنویت پر اصرار کرتی ہے مگر یہ سوچنا صحیح نہیں ہے کہ سب نئے شعراء کے یہاں یہی اور صرف یہی رویہ کارفرما ہے اگر ایسا ہوتا تو شاعری منصوبہ بندی کے ارادی اور میکانکی عمل کو ظاہر کرتی، اور شخصی ردّ عمل کی صحت اور تفریق مشکوک ہو جاتی، تاہم صورت حال ایسی نہیں ہے، اگر شہریار اور بلراج کومل کے یہاں عقیدے کا بحران ملتا ہے، تو عمیق حنفی اور کمار پاشی کے یہاں عقیدے کی بحالی کا رجحان نمایاں ہے شاعری میں طے شدہ اور منصوبہ بند خیالات کے اظہار پر زور ملتا ہے، وہاں شاعری نہیں، بلکہ کلام منظوم وجود میں آتا ہے، جو قابل اعتنا نہیں، اس نوع کی شاعری کی آج بھی کمی نہیں، جدیدیت کے نام پر کی جانے والی ایسی شاعری اجنبیت، تنہائی یا فریب شکستگی کے تجربے اسی طرح کلیشے میں بدل گئے ہیں، جس طرح ترقی پسند شاعری میں مزدور، کسان یا طبقاتی تفاوت کے موضوعات تکراری، سطحی اور نمائشی ہو کر رہ گئے تھے، تاہم چند شعراء ایسے بھی ہیں، جو انفرادی ردّ عمل کا تحفظ کرتے ہوئے تصورات کے مروّجہ سانچوں کی شکست کرتے ہیں، ایلیٹ نے تمام عمر اپنی شعری حسیّت کے فطری تقاضوں کا خیال رکھا جو جدید یورپی تہذیب کے کھوکھلے پن اور ویرانی کو محسوس کرنے کے بعد اس کا ذہنی اور روحانی سفر جاری رہا، وہ اعتقاد کی شکست کے بعد تجدید اعتقاد کی منزل تک آیا، اور رویے کی اس تبدیلی کے اظہار سے ہچکچایا نہیں، چنانچہ اس کے آخری دور کی نظمیں عیسائیت اور روحانیت میں اس کے ایقان کی مظہر ہیں، معاصر شعراء میں وزیر آغا کے یہاں فطرت کی جانب مراجعت کا رویہ ملتا ہے۔

آج کی شاعری موضوعیت سے انحراف کر کے بے نام داخلی تجربوں کی تجسیم کاری کو اہمیت دیتی ہے، اس طرح سے یہ اپنے گم کردہ تخلیقی تشخص کی بازیافت کر رہی ہے، میر اور غالب کے علی الرغم آزاد اور حالی نے موضوعی شاعری کو ترویج دینے کی منصوبہ بند کوششیں کیں، اور غزلیہ شاعری کے داخلی عمل کے مقابل نظم نگاری کے خارجی میکانکی عمل کو اہمیت دی، اس طرح سے غزل اور نظم دونوں کا حلیہ بگاڑ دیا، ترقی پسند شعراء چونکہ بالعموم تخلیق سے زیادہ تبلیغ کے قائل تھے، اس لیے طے شدہ سیاسی اور سماجی خیالات سے شاعری [illegible] غیر شعری رویہ مقبول ہوتا گیا، نتیجے میں شاعری توضیح، تکرار، مقصدیت اور خارجیت کے سرابوں میں بھٹکنے لگی، [illegible] کے خلاف ردّ عمل کا اظہار ہونے لگا، نئے شعراء نے شاعری میں ابہام، ایجاز، جمالیت، داخلیت کے مرکز [illegible] اقبال [illegible] کے بجائے میر اور غالب سے ذہنی مناسبت کو ظاہر کرتے ہیں اس کے تین اسباب

ہیں، اوّل نئے شعراء خارجی حقیقت سے برگشتہ ہو کر خالصتاً تخیلی سطح پر نمو پذیر اجنبی پیکروں کی شناخت میں دلچسپی رکھتے ہیں، دوم، وہ ذہنی اور فکری آشوب کو بلاواسطہ، راست اور سہل انداز میں پیش کرنے کے بجائے علامتی اسلوب کو روا رکھتے ہیں، سوئم، وہ مروجہ زبان کی محدود اظہاریت کے پیش نظر اس کی نئی تشکیلات پر زور دیتے ہیں۔

آج کی شاعری کا ابتدائی دور، جو پندرہ بیس برسوں تک رہا، عبوری نوعیت کا تھا، اس دور میں تجدد پسندی کے جوش میں شعری اقدار سے اغماض برتا گیا، روایت شکنی کی گئی، لسانی شکست و ریخت سے کام لیا گیا، اور بعض نئے خیالات کی تکرار فیشن بن گئی۔ سینکڑوں نئے شعراء ابھرے، جو بدقسمتی سے شخص ردعمل صرف نظر کرکے جدیدیت کی رو میں بہہ گئے، جدیدیت کے نام پر بعض رسائل کے صفحات پر کافی ہنگامہ رہا۔ یہ ضرور ہے کہ اب یہ غلغلہ آفرینی ماند پڑنے لگی ہے، اور سچے شعراء اور تشاعروں میں فرق کرنے کے لیے فضا سازگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کے بعد بانی اور شہریار کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے، روایت سے ایک ناقابل تردید تخلیقی رشتے کی اہمیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ شعراء جو جدت برائے جدت کے قائل تھے، اور کسی اندرونی اپج کے بجائے بقول شہریار عادتاً یا رسماً شعر کہتے تھے پس منظر میں ڈوب چکے ہیں، ان کے برعکس ایسے شعراء کی شناخت آسان ہو گئی ہے جو صحیح معنوں میں شعری صلاحیتوں سے متصف ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایسے شعراء کی تعداد بہت کم ہے۔ غالباً اسی لیے یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے شاعری کمیت کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کے لحاظ سے سکڑ رہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن نئے شعراء نے تجرباتی اور لسانی طور پر تازہ کاری کا احساس دلایا تھا، وہ کچھ ماند پڑ گئے ہیں، یہ بات بھی باعث تردد ہے کہ نوجوان شعراء پیش رو نسل کے شعراء کے حاوی اثرات کے تلے دبے ہوئے نظر آتے ہیں، موضوع اور لفظیات کے بر تاؤ میں کسی انحراف یا پیش رفت کا امکان نظر نہیں آتا، نوجوان شعراء میں کوئی ایسی آواز نہیں ابھری ہے، جو اپنی انفرادیت کا احساس دلاتی، سوال یہ ہے کہ کیا نئے شعراء بھی اپنے آباء کی طرح روایت پرستی کی اندھی گلیوں میں بھٹکنے پر رضامند ہیں؟ ❂

## بقیہ صفحہ ۲۴ شعر میر تفہیم کے مدرسے میں

واقفیت ہو (یعنی داغ کھانے یا گل کھانے کے رواج سے) تو کسی استدلال کی ضرورت ہی نہیں۔ "داغ اور دھبہ" کا فرق اور نرگس کا پھول سرخ ہوتا ہے کہ نہیں، یہ سب بحثیں غیر ضروری ہیں۔ ویسے جہاں تک مجھے معلوم ہے، نرگس کا پھول سرخ نہیں ہوتا۔ پانی سے دھل جانے والے دھبے کو بھی داغ کہتے ہیں۔ لیکن یہاں "داغ" سے مراد "داغِ دل" کیوں کر ہو سکتی ہے جب دوسرے مصرع میں ہاتھ کا ذکر ہے؟ اور "داغِ دل" آنکھوں کی وجہ سے کس طرح "کھل" یا "کھِل" سکتا ہے؟"

نقوی صاحب کے نزدیک "آنکھوں سے" کا مطلب "آنکھوں کی طرح" بھی ہو سکتا ہے اور "آنکھوں کے ذریعہ" بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شعر کا جو مفہوم انہوں نے بیان کیا ہے وہ نہ اول الذکر صورت حال کا متحمل ہو سکتا ہے نہ آخر الذکر کا۔ آخر الذکر صورت حال کے بارے میں فاروقی کی متذکرہ بالا عبارت سے رجوع کیا جا سکتا ہے اول الذکر صورت حال میں "داغوں" کو "خون آلود آنسوؤں کے داغ" فرض کرنا پڑے گا جس کی نہ لغت سے تصدیق ہوتی ہے نہ

اساتذہ کے کلام سے۔

میر کے یہاں لسانی دروبست کی جو صفات موجود ہیں اور جن کے لیے نقوی صاحب نے "قرینے" کی اصطلاح استعمال کی ہے ان سے اپنی ادنیٰ واقفیت کے پیش نظر میں تو یہی عرض کر سکتا ہوں کہ "آنکھوں سے" کے معنی "آنکھوں کی وجہ سے" یا "آنکھوں کے ذریعے" کا کوئی محل اس شعر میں نہیں۔ یہ شعر داغ کھانے یا گل کھانے کے مضمون پر مبنی ہے اور "آنکھوں سے" سے مراد "آنکھوں کی طرح" ہے۔ ❂



ڈاکٹر اسلم حنیف
گنور، ضلع بدایوں ۲۴۳۵۲۲ (یوپی)

# کچھ سہرا کے بارے میں

ڈاکٹر سیفی پریمی کے الفاظ میں

"سہرانا ہندی فعل ہے اس کا مفہوم ہے کسی مقدس چیز کو دریا میں بہانا۔ اس کا تعلق عقیدت اور نیک شگون سے ہے اس سے دلی تسکین یا مراد کا پورا ہونا بھی سمجھا جا سکتا ہے، میرے نزدیک اسی ہندی فعل سے لفظ سہرا بنا ہے جس کو اسم اور فعل دونوں صورتوں میں اردو زبان میں جگہ مل گئی۔ اردو میں سہرانا کی جگہ سرانا مستعمل ہے"۔

لغت میں بالکسر، مذکر ہندی لفظ قرار دیا گیا ہے جس کے معنیٰ وہ پھولوں کی لڑیاں جو دولہا یا دولہن کے سر پر سے منہ پر لٹکائی جائیں اور وہ منظوم کلام جو شادی کے موقع پر تعریف میں کہا جائے۔

چوں کہ سہرا CHAPLET ایک علامت ہے دو زندگیوں کے ملن کی، ایک ان دیکھے راستے کے سفر کے آغاز کی، ازدواجی بندھنوں کی ابتدا، اور زن و شوہر کے علاوہ دو خاندانوں، دو آدرشوں کے باہمی ارتباط و انسلاک کی، نیز ان کے سینوں میں پلنے والی ہزارہا خواہشوں کی تکمیل کی۔ نئی زندگی کے آغاز کا یہ پہلا اقدام مستقبل کی زبردست ذمہ داریوں کا ایک ایسا اشارہ ہے جو ہمہ وقت تحرک و بیداری کا متقاضی ہوتا ہے اس لیے میری نگاہ میں سہرا عربی لفظ سہر [بفتحتین] کا ماخذ معلوم ہوتا ہے۔ [طبی اصطلاح میں افراط بے خوابی کے لیے بھی یہی لفظ سَہَر INSOMNIA مستعمل ہے]۔

تاریخی حیثیت سے دیکھئے تو شادی بیاہ کے موقع پر عرب دنیا میں سہرا باندھنے کی رسم کا دور تک پتہ نہیں چلتا البتہ ہندستان میں سر پر مکٹ یا پگڑی باندھنا قدیم دور سے رائج ہے لیکن اس رسم کا درباری حدود میں فقدان رہا ہے کیونکہ راجا مہاراجاؤں میں سوئمبر کی روایت عام تھی۔ بھاگوت[1] کے اردو ترجمہ میں بھی ہمیں اس کا کوئی جواز ہاتھ نہیں آتا البتہ مہادیو جی کے بیاہ کے سلسلہ میں نظیر اکبرآبادی نے سہرے کا تذکرہ کیا ہے جس پر آگے بحث کی جائے گی۔

مکٹ یا تاج میں لڑیوں[2] کا اضافہ ہندوستانی مسلمانوں کی اختراع ہے جس طرح بہت سی غیر اسلامی رسمیں یہاں کے مسلمانوں نے اپنا کر ان میں کچھ امتیازی نشانات بھی پیدا کر لیے اسی طرح سہرے کے بارے میں بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے اور اسی حقیقت کے پیش نظر ہم "سہرے" کو ہند مسلم اشتراک کی دین سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

بادشاہ اور نوشاہ، تاج اور سہرا، قصیدہ اور سہرا یا شہانہ وغیرہ الفاظ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ثانی الذکر الفاظ در بارے اول الذکر لفظوں کی حرص میں اختراع کیے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں جو باہمی ربط پایا جاتا ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں البتہ سہرا باندھنے کی رسم کے نفسیاتی تجزیے کو ضروری سمجھتا ہوں۔

ہندستان قدیم دور سے دیومالائی تصورات اور توہمات پرستی کا مرکز رہا ہے۔ زندگی سے موت تک کوئی بھی ایسا گوشہ نہیں دکھائی

---

[1] ص ۔۔۔۔ مترجم اقبال خورشتر ولد منالال لکھنوی۔ [2] تاج نما میں لڑیوں کا اضافہ بیجاپور میں بھی عام ہے۔

یا جہاں نیک اور بدشگونی کے پیرے موجود نہ ہوں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں کے بہت سے سماجی حالات اثر انداز ہوئے۔ اختلاط باہمی و اشتراک کا ایک ردعمل یہاں کے نومسلموں کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ انہوں نے تبدیلیٔ مذہب کے ساتھ اپنی قدیم روایات کو قدرے تبدیل کرکے جوں کا توں رہنے دیا، زندگی کے بیشتر حصوں میں اس کی تلاش آج بھی کی جاسکتی ہے۔ وقت گذرتا رہا اور بہت سی رسمیں مسلم معاشرے کا جزو بن کر رہ گئیں[1] اور ایسا کیوں نہ ہوتا آخر اجتماعی لاشعور کا مسلسل دباؤ نسلی روایات سے یکسر بغاوت کو کیسے برداشت کرتا؟؟

سہرا CHAPLET میں لڑیوں کا وجود ہمارے ذہن کو کئی جانب منتقل کرتا ہے چنانچہ اس کی پہلی وجہ تو یہ معلوم ہوئی کہ نوشاہ اجنبی مقام پر جارہا ہے اس کا چہرہ اس لیے ڈھک دیا گیا ہے کہ زندگی نے زندگی کی قربت کے چہرے کے خدوخال غیر ضروری ہیں یا انسانی فطرت کے اس خاصے سے کہ وہ ہر چیز میں تمقیصی نشانات کو مرکز بنالیتا ہے، بچانے کے لیے بھی یہ رسم جاری ہوئی ہوگی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ عروس و نوشاہ عام لوگوں سے تمیز کیے جاسکیں۔ تیسری وجہ توہم پرستی کی جانب لے جاتی ہے۔ بچے بے بادشاہ نما دولہا کو کسی کی نظر لگنے کے خوف سے نجات کے لیے لڑیوں کا سہارا ڈھونڈا گیا ہے۔ لڑیوں کے ساتھ عام واہمہ یہ بھی ہے کہ اس کا ٹوٹنا بدشگونی کی علامت ہے جیسا کہ ریختی کے استاذ حضرت جانؔ نے اشارہ کیا ہے ؎

ہو خیر دلہن دولہا کی ماتھا مرا ٹھنکا　　اچھا نہیں ٹوٹنا ہی سہرے کی لڑی کا

اسلام میں اس کی حیثیت معدوم ہے اور اسی لیے حفیظ جالندھری نے اپنے شاہنامہ میں حضرت علی رضؓ کے نکاح کے سلسلے میں تحریر کیا ہے کہ ؎

نہ زرنگار رنگ پوشاکیں نہ کنگن تھا نہ سہرا تھا　　وہی تھے شاہِ مرداں اور وہی مردانہ چہرا تھا

بہرحال اس کی مذہبی نوعیت تو کچھ بھی نہیں البتہ جہاں تک سہروں [شہانوں] کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے ہم اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے لیکن اس سے قبل "سہرا" لفظ کے مختلف استعمال پر بھی ایک نظر ضروری ہے۔

(۱) وہ پھولوں کی لڑیاں جو دولہا دولہن کے سر پہ سے منہ پر لٹکائی جاتی ہیں [عروس کے سونے کا سہرا بھی باندھا جاتا ہے]
گوندھنے کے ساتھ استعمال ؎

حور و غلماں کا اگر بزم طرب میں ہو گذر　　سہرا دولہا کا یہ گوندھیں وہ دولہن کا سہرا
[راسخ]

(۲) وہ نظم جو سہرا باندھنے کی تقریب میں کہی جائے۔
کہنا، لکھنا اور گانا، کے ساتھ مستعمل ؎

دھوم مچ جائے بزم نوشہ میں　　شور اٹھے خوب ہی کہا سہرا　　[ریاضؔ]
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر　　دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے　　[غالبؔ]
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی　　گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا　　[ذوقؔ]

(۳) وہ پھولوں کے ہار جو مزار کے طاقچوں پر لٹکا دیتے ہیں ؎
جنوں میں موت آئی ہے مجھے پھولوں سے کیا مطلب　　مری تربت پہ سہرا ہو مرے تارِ گریباں کا　　[راسخؔ]

(۴) سہرا باندھنا، سہرا سر پہ رکھنا، دولہا بننا ؎
رات گذری ہیں دولہا کی طرح فرقت میں　　صبح کو آنسوؤں کے تار نے سہرا باندھا　　[بحرؔ]

---

[1] ادھر ہندو میں اسلامی اثرات کی وجہ سے بقول تاراچند "بھگتی تحریک" نے جنم لیا۔ اس تحریک کے بانی شنکر آچاریہ تھے جہاں شنکر آچاریہ پیدا ہوئے تھے وہاں کا حاکم مسلمان ہو چکا تھا [دیکھیے "آبِ کوثر"]

(۵) سہرا بننا۔ موتیوں یا پھولوں کی ایسی مسلسل لڑیاں پرونا کہ سہرے کی صورت اختیار کرلے ؎

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا | واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا [ذوق]

(۶) سہرا بندھائی۔ مؤنث۔ سہرا باندھنے کا نیگ جو بہنوئی کو ملتا ہے۔

(۷) سہرا باندھنا۔ (فعلِ لازم)

(۸) سہرا چڑھانا۔ لوحِ مزار پر سہرا لٹکانا، فوج کے نشان یا تعزیوں کے علم پر سہرا لٹکانا ؎

نالے کیا خاک منہ سے نکالیں گے تہیدل | فوجِ الم چڑھائے گی سہرا نشاں پر [صبا]

(۹) سہرا دکھانا۔ شادی دیکھنے کا موقع نصیب ہونا۔

(۱۰) سہرا دیکھنا۔ سہرا دیکھنا (عورتوں کی زبان) بیاہ دیکھنا، بیاہ رچانا۔

(۱۱) سہرا سر ہونا۔ (عام محاورہ ہے)

(۱۲) سہرا گوندھنا۔ سہرا بنانا

تابنے اور کنجی میں رہے اخلاص بہم | گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا [ذوق]

(۱۳) سہرے جلوے کی (بیاہتا بیوی) ؎

کیوں سوت کی میں آگ سے جل جل کے مروں گی | ہوں سہرے نہ جلوے کی جو بھرنا میں بھروں گی [جان صاحب]

(۱۴) سہرے کے پھول کھلنا۔ (کنایۃً بیاہ کا وقت آنا) ؎

دونوں دولہا دلہن خوشی سے ملیں | کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں [منیر]

آج جب ہم سہرے کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ ایک مخصوص صنفِ سخن کی حیثیت سے ابھر آتا ہے اس کے باوجود اسے ادب میں کوئی مستقل حیثیت نہیں مل پائی اور نہ ہی ہمارے ناقدین نے اس کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کیا۔

سہرے کو دوسری اصنافِ سخن میں سب سے قریبی نسبت قصیدے سے ہے جہاں دونوں میں بعض خصوصیات مشترک ہیں اور بعض بالکل جدا۔ اجمالی خاکہ موازنے کے لیے اس طرح تیار کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جس طرح قصائد ہجو اور مدح دونوں ضرورتوں کے لیے مستعمل رہے ہیں اسی طرح سہروں میں بھی دونوں طرح کی گنجائش ہے

(۲) قصائد ENCOMIUMS بادشاہوں، سلاطین اور امراء کی تعریف اور چاپلوسی کے لیے مخصوص ہیں جب کہ سہرے معاشرے کے کسی بھی فرد کے بیاہ پر شاعر کے آزادانہ جوشِ مسرت و جذبات کے آئینہ دار۔ اسی لیے قصائد محدود اور سہرے عام۔

(۳) قصیدوں کے پیچھے صلہ و انعام لازمی جزو ہے اور سہروں کی تخلیق دلی خلوص کا نتیجہ [ فی زمانہ سہروں کے بھی پڑھے جانے پر انعام دینے کی رسم عام ہو گئی ہے مگر جس طرح قصیدے کی تاریخ میں صلہ لینے والا پہلا شخص نابغہ ذبیانی تھا سہروں کے سلسلے میں لینے یا انعام دینے یا انعام دینے والے موجد کا پتہ نہیں چل پایا ہے ]۔

(۴) قصائد فنی اعتبار سے تشبیب، گریز، مدح وغیرہ ارکان کے پابند ہوتے ہیں جب کہ سہروں میں مدح کے علاوہ بقیہ ارکان کی قید نہیں

(۵) قصیدوں میں ممدوح کی براہِ راست تعریف کی جاتی ہے اور سہروں میں بالواسطہ صورت میں۔

یہی کچھ فرق ہیں جو قصیدے اور سہرے کے مابین تمیز کیے جا سکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے فارسی کی تاریخ کے سلسلے میں ذیل کی عبارت تحریر کی ہے۔

"انقلابِ زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کر دیے پھر بھی خوش حالی یا بدحالی میں قوم قائم تھی ٹوٹے پھوٹے شعر گیتوں کی آواز، شادی کے سہاگ یا بچوں کی لوریوں میں زبانی یہ زبان چلے آئے ہوں گے"

اردو ادب کے ساتھ بھی یہی ہوا مثال دور نہیں۔ شادی بیاہ کے سہاگ آج تک ستم ظریفی کا شکار ہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر عورتیں کس شان بان سے ڈھولکوں پر سینہ بہ سینہ آئے ہوئے گیتوں کو مل کر گاتی ہیں انہیں لوک گیتوں میں ادب کی تاریخ بھی پوشیدہ ہے جس کے ابتدائی رشتوں کی تحقیق کے لیے زبردست پیمانے پر کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ایک دن وہ آئے گا جب دیہات اور قصبات میں یہ رسمیں اور مہذب ہونے پر مفقود ہو جائیں گی۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور محسن ادب امیر خسرو کے بارے میں سبھی جانتے ہیں مگر یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے پیش نظر جو لوک گیت ترتیب دیے تھے ان میں "سہرا گیت" بھی ہیں۔ ماہرین موسیقی نے انہیں اس طرح ترتیب دیا ہے۔

(۱) نبڑا گیت راگ نگار (گوبڈ) تال جھپتالہ

آستائی۔ آج نول نبڑی کو مبارک نبڑا بیاہن آیا

اری ایری ماں نبڑا بیاہن آیا

انترا۔ اولیاء انبیاء آئے براتی، عثمان باندھتا ہے سہرا

اری ایری ماں نبڑا بیاہن آیا

انترا ۲ گنج شکر کے لاڈلے نبڑے نظام نام دھرایا

اری ایری ماں نبڑا بیاہن آیا

(۲) سہرا شہانہ بہار تال جھپتالہ

آستائی۔ گوندلا مالن سہرا اچھے پیتم جو گا

گوندلا مالن سہرا

انترا ۱ گھر گھر منگل پاؤں پیا ہے اس جوگا اس رے بنے روپ جیسا

کوئی ہوا ہے اور نہ ہوگا گوندلا مالن سہرا

انترا ۲ دھن دھن بی بی آمنہ یہ پیمبر جایا بھاگ بڑے امت کے

ایا انبیا پایا گوندلا مالن سہرا

(۳) سہرا شہانہ تال جھپتالہ

آستائی۔ گوندلا ری مالن پھولوں کا سہرا آج نبا نبڑی کو مبارک

انترا۔ آج نبی نے کنگنا بندھایا حور دلہن نے سب مل منگل گایا

آج بنا نبڑی کو مبارک

امیر خسرو کے بعد سولہویں صدی عیسوی کے شاعر ملک محمد جائسی کی شہرہ آفاق کتاب "پدماوت" ہے جس کے اصل نسخے میں اس صنف کا کہیں پتہ نہیں البتہ اس کا اردو ترجمہ جو سید غلام علی مشہدی عشرت بریلوی اور ضیاء الدین عبرت نے ۱۲۰۶ھ میں کیا میں ذیل کے اشعار بھی موجود ہیں ؎

کہوں کیا میں کہ جب وہ روز آیا — رتن کو سب نے پھر دولہا بنایا

پنھایا خلعت زیبا و رنگیں — کہ تھا لعل و جواہر سے وہ تزئیں

مرصع بس کہ تھا اک سر پہ وہ تاج — کہ جس میں ہفت اقلیم کا باج

بندھا سہرا جب اس کے موتیوں کا — نہیں تقریر میں آتا کہوں کیا

سلہ ۔۔۔۔۔۔۔ عالم گزارے      کہ بس منہ پہ فدا ہوتے ہیں تارے
سراسر وسیں وہ عقیش کے تار      کرن خورشید کی جیسے نمودار
گلے میں ہار موتی کا نمایاں      پڑا سینے میں عکس سلک دنداں

مولوی حسین بخش [جد ابجد محسن کاکوروی] کی تاریخ پیدائش ۱۲۰۳ھ ہے آپ نے اپنے دو صاحب زادوں کے شہانے[۲] تحریر کئے جنہیں یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

شہانہ برخوردار مولوی نور الحسن سلمہ

آج شہانہ شہانہ گاؤ      میرن سائیں گھر دھوم مچاؤ
نیکے نیکے بیلوں منڈھا چھاؤ      گھر باہر سب رنگ چھڑکاؤ
نور حسن کو دولہا بناؤ      ہیرے موتن کا سہرا پہناؤ
محسن تم نوشاہ بناؤ      احسن میاں تم گرد الگاؤ
میرن سائیں تم اپنی ہی رنگ مان      اپنی حسن کی پگڑ پار لگاؤ

شہانہ برخوردار مولوی انوار الحسن

نئے نئے رنگ کا شہانہ بناؤ      محسن میاں گھر منڈھا چھواؤ
سونے کا سہرا موتن سہرا      آئے حسن انوار پہناؤ
دھوم گجر سوں برات سجاؤ      سب مل نبی کے دروازے لے گو
چوکھے رنگ سوں میرن سائیں      محسن حسن کے بسن رنگواؤ

۱۱۲۵ھ میں مرزا محمد رفیع سودا پیدا ہوئے۔ ان کے کلیات میں ایک ہجویہ مخمس کے یہ اشعار ہجویہ سہرے کے سلسلے کی اہم کڑی میں شمار کیے جا سکتے ہیں ؎

شیخ تم گھر سے چلے خلعت شادی جو پہر      باندھ کر سہرے کو عقیش کے عمامے پر
یوں مریدوں نے کہا پیٹ کے تب اپنا سر      ہم نے کیا پیر بنایا تھا بجا چرخ کے زد
آکے تم جھول کے چھپر کے جیاں چور بنے

ان کے بعد میر تقی میر کا دور آتا ہے جن کے ایک مرثیہ[۴] میں اس لفظ کا استعمال اس طرح ملتا ہے ؎

دولہا اگر تھا ظاہر نو یلا      لیکن نہایت بے کس اکیلا
بابا کا مرنا اس طور جھیلا      طاقت سے آگے ایذا اٹھائی
دل کے الم سے رخ زرد جوں زر      آنسو کا سہرا چہرے کے اوپر

میر کے ہم عصر شاعر نظیر اکبر آبادی ہیں جن کے شعری تجربات میں زبردست تنوع پایا جاتا ہے ان کے کلام میں "بیاہ دولہا" کا سیاہ ایک طویل نظم ہے۔ بیاہ کی منظر کشی کرتے ہوئے نظیر نے "سیوتی" کے بارے میں رقم کیا ہے ؎

---

سلہ کتاب کرم خوردہ ہونے کی بنا پر مصرع بھی دیمک کی نذر ہو گیا۔
سلہ ص ۵۲ تا ۵۳۔
سلہ ٹھریاں مشمولہ کلیات نعت محسن شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی۔
سلہ میر کی مرثیہ نگاری از عبد الغفار شکیل مشمولہ ماہنامہ ادیب جولائی ۱۹۶۲ء۔

اس وقت خوشی سے مسند پر شیو بیٹھے بن کر یوں دولہا
مکھ پان کی لالی کر مہندی اور آنکھوں بیچ لگا گجرا

ہر تار چمکتا چہرے کا اور تاشش سنہری کا ماتھا
اس تازگی کے چہرے میں جوں مہر چمکتا مکٹ دھرا

ہر کان مرصّع کندن تھے اور مکھ پر سونے کا سہرا
وہ سہرا مکھ پر یوں چمکے جوں سورج ہووے کرن بھرا

وہ موتی مالے گلے جھلکیں اور ان لعلوں کی مالا
وہ مانگ جڑاؤ بازو پر اور کنگنا پیچھے لٹک رہا

جب بیٹھے شیو یوں دولہا بن تب پریوں کا واں ناچ ہوا
اور کرنا سرنا جھانجھ بجے نقارے گونجے شور مچا سہ[1]

محسن کاکوروی [متوفی ۱۲۳۲ھ] کے شہرۂ آفاق قصیدے "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" میں یہ لفظ اس طرح استعمال ہوا ہے سہ

مثردہ گل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل
برق کہتی ہے مبارک تجھے سہرا بادل

ہمیں قوی امید تھی کہ اس سلسلے میں اردو مثنویاں ہمارا ساتھ دیں لیکن افسوس کہ ان مربوط اور مسلسل کہانیوں میں سہرے کا استعمال نہیں مثنوی گلزار نسیم میں تاج الملوک کے بکاولی کے ہمراہ بیان کے تذکرے میں شاعر نے مختصراً ان مصرعوں پر اکتفا کی ہے سہ

واں زلف نے کھائے پیچ در پیچ
طرز کلغی پہ بھتایاں پہ پیچ

آنچل ہوئے واں حجاب عارض
سہرا ہوا یاں حجاب عارض

اور بہرام وزیر زادہ تاج الملوک کی روح افزا پری سے شادی کے بیان میں اس کی تیز روی ادھر آنکھ بھی نہیں اٹھانے دیتی جس کی بنا پر مثنوی میں یہ منظر نامکمل نظر آتا ہے۔

مثنوی سحر البیان کے مصنف نے بدر منیر اور بے نظیر کو خانگی زندگی سے قریب کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے کوئی قابلِ قدر نقش نہیں مل پاتا سہ

وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار
وہ موتی کا سہرا جواہر نگار

اور نجم النساء کی شادی کے سلسلے میں اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا گیا ہے۔

ادھر سے ادھر اپنے سہرے کو چیر
وہ اک چاند سا منہہ دکھا بے نظیر

مثنوی زہر عشق کا مصنف اپنی داستان کے پلاٹ سے مجبور ہے اس لیے اس کا ایک شعر بھی کافی اہم ہے سہ

سہرا اس پر بندھا ہے اک رنگا
جیسے گلشن کی آخری ہو بہار

سودا کی مثنوی میں اس صنف کا تو کیا اس لفظ کا بھی استعمال نہ مل سکا۔ بہر حال مثنوی جیسی مسلسل داستانوں میں اس صنف کا فقدان تلمت چیز ضرور ہے۔

مراثی پر نظر ڈالیے تو یہاں حضرت قاسمؓ کے سلسلے میں قابلِ سند نقش ضرور دستیاب ہو جاتے ہیں وہ بھی باقاعدہ صنفی حیثیت سے ہ، ملا اس رسم کے جواز کی صورت میں۔ چنانچہ انیس و دبیر کا ایک ایک بند نقل کر رہا ہوں سہ

پنجا ادھر چمکتا تھا اور آفتاب ادھر
اس کی ضیا غ تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر

زر ریزیِ علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دولہا کا رخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر

تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
الجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

[انیس]

---

سلہ کلیات نظیر مرتبہ اظہرای۔

ماں قاسم نوشہ کی کدھر ہیں ادھر آئیں ۔۔۔ دولہا کوئی دم کے لیے قاسم کو بنائیں

شادی میں کسی طرح کا وسواس نہ لائیں ۔۔۔ جو رسم کہ اس گھر کی ہے وہ آکے بتائیں

اس پھول کو پروان چڑھا دیکھ لیں بھابی

فرزند کا سہرا تو بھلا دیکھ لیں بھابی ۔۔۔ دبیر

نوٹ :۔ عشرت بریلوی، نظیر، انیس اور دبیر کے یہاں سہرے کے متعلق جو جو بھی بیانات ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں یہ رسم مذہبی صورت میں ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اس کی تردید میں صرف یہی لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ حضرات شاعر تھے اور مبالغہ نیز شاعرانہ تعلی کی بنا پر اس کی حقیقت کو نظرانداز کر گئے "

مذکورہ اوراق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سہرا خالص اردو کی دین ہے اس پر قصائد یا دیگر اصنافِ سخن کی طرح عرب و عجم کا احسان نہیں یہ بات الگ ہے کہ اس کی جانب سے تغافل برتنے کی بنا پر اس کی کوئی خاص ہیئت وجود میں نہیں آسکی سب سے پہلے غالب اور ذوق ہیں جنہوں نے اسے ایک صنف کی حیثیت بخشی۔

محمد حسین آزاد نے ان کی شانِ نزول کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے مگر بادشاہ انہی کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے مرزا (غالب) نے یہ سہرا کہہ کر حضور میں گذرانا

(صرف مقطع اور مطلع نقل کیا جا رہا ہے)

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۔۔۔ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں ۔۔۔ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع سن کر حضور کو خیال آیا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک شعراء بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے چنانچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے کہا کہ استاد تم بھی ایک سہرا کہدو عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی کہدو اور ذرا مقطع پر نظر رکھنا استاد وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا "

(اس کا بھی مطلع اور مقطع نقل کیا جا رہا ہے)

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا ۔۔۔ آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

در خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا ۔۔۔ واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

غالب کے مقطع کا جواب بھی اس طرح دیا گیا۔

جس کو دعوی ہے سخن کا یہ سنادے اس کو ۔۔۔ دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

ذوق نے شاعرانہ فوقیت کے لیے صرف آخری شعر کو بنا کر اور گوہر کے علاوہ بقیہ قوافی غالب سے ہٹ کر کہے ہیں پہلے سنے [illegible] استعمال ہوئے جب تو تیر کہا جاتا تھا خاص طور پر جہاں آپسی چشمک بھی ہو۔ بہرحال غالب کا سہرا ان کے دلی جذبات و خلوص [illegible] ایک بات کہ چشمک کی بنا پر ذوق کی انا میں ہیجان پیدا ہو گیا لیکن رد عمل سے پیدا شدہ طوفانی لہریں جب [illegible] سہرے جیسی صنف سے شروع ہوتی تو معاملہ ایلاں تک پہنچ سکتا تھا۔

داشناس غالب نے دوسرے ہی دن دربار میں اپنے دعوٰی کے دماغ میں ایک معذرت نامہ بصورتِ قطعہ پیش کردیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر غالب کی جگہ ذوق ہوتے تو شاید آزاد اس واقعے اور سہروں کو اپنی تصنیف میں کوئی مقام نہ دیتے لیکن سہروں کی خوش قسمتی کہیے کہ کچھ غالب کی کمزوری اور کچھ مصنف آبِ حیات کے ذوق سے مضبوط ذہنی رشتہ نے دونوں سہروں کو امر کردیا ورنہ یہ بھی ستم ظریفیٔ دوراں کا شکار ہوجاتے۔

"دلی کا دبستانِ شاعری" کے مصنف نور الحسن صاحب دیوانِ ظفر کے بارے میں کریم الدین کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں۔

حمد و نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، مستزاد، قطعات، رباعیات، پنکھا، سہرا، پنجابی، فارسی ہر چیز موجود ہے۔ ص ۲۳۹

شاہ ظفر کے بعد فانی کی کلیات کا مطالعہ کیجیے تو کافی حد تک طمانیت کا احساس ہوتا ہے فانی بدایونی نے یہ سہرا نواب خواجہ نصر اللہ کی شادی کے موقع پر کہا ہے مطلع اور مقطع دلچسپی کے لیے نقل کر رہا ہوں [1]

مقدر کی بدولت آج ہو نچا ہے کہاں سہرا | کہ ہے ردیحِ آشنائے فرق نصر اللہ خاں سہرا
نہ ذوقِ خوش نمائی ہے نہ دعوٰی خوش بیانی کا | ترا اقبال ہے ورنہ کہاں فانی کہاں سہرا

فانی کے ہم عصر علامہ ابر احسنی گنوری کے یہاں بھی ایک سہرا دستیاب ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے

فروغ زندگی کا ہے اثر سہرے کی کلیوں میں | الجھ کر رہ گئی ہے ہر نظر سہرے کی کلیوں میں

ہجویہ سہروں کے سلسلے میں حسرت احسنی گنوری مرحوم کے قلمی نسخے سے ایک سہرے کے یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

روسیاہی نہ کرے بہہ کے خضابی داڑھی | اس لیے دھوپ میں لایا ہے سکھا کر سہرا
خشخشی مونچھ عیاں نہ ہو فرنچی داڑھی | رخ سے ہٹتا نہیں بال برابر سہرا
بیوی کم سن ہے میاں بوڑھے محلہ ہے شریر | مجھ کو ڈر ہے نہ دکھا دے کہیں بھتانا سہرا

مختصر یہ کہ اردو نے جو کارآمد اور مفید صنف پیدا کی اس کی طرف سے شعرا اور ناقدین ادب چشم پوشی کرتے رہے۔ غالباً اس کی پہلی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس صنف کا فارسی اور عربی سے کوئی تعلق نہیں دوسرے یہ کہ یہ وقتی تہنیت و مبارکباد تک محدود ہوتے ہیں حالانکہ قصیدہ خود وقتی ہوتا ہے مگر سہرا، قصیدے سے بہتر صنف سخن ہے کیونکہ اس کی عمومیت، ہمہ گیری بلا مذہب یکساں ہے یہاں نہ طمع و لالچ کی گنجائش ہے اور نہ ممدوح کے جاہ و جلال کی بلکہ شاعر اور ممدوح کے درمیان خلوص و محبت کے رشتے ظاہر ہوتے ہیں۔ حالی نے قصیدوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے [2]

"قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لیے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر ایک نہایت ضروری صنف ہے"

یہی بات ہم سہروں پر ثبت کر سکتے ہیں چنانچہ اس کو مستقل صنف بنانے اور اس کو وسعت دینے کے لیے ذیل کی باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) سہروں میں روایتی انداز کی تعریف سے گریز
(۲) ناموں کی بھرمار شاعر کے تخیل، ابلاغ و اظہار میں مانع ہوتی ہے اس لیے ان کا استعمال غیر ضروری ہے۔
(۳) فنی اقدار اور افادیت عامہ کے تحت ان کی تخلیق

[1] شائع کردہ ترکمان گیٹ دہلی۔ شہزاد بک ڈپو۔
[2] ماخوذ از مقدمہ شعر و شاعری۔

[باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھیے]

تحقیق نظر

[illegible] - رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

# شعرِ میر - تفہیم کے مدرسے میں

بات بہت پرانی ہے - میں نے اپنے بمبئی کے دورانِ قیام میں انجمن ترقی اردو (ہند) (علی گڑھ) کے ہفت روزہ ترجمان "ہماری زبان" بابت ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کے توسط سے میر تقی میر کے اس شعر:

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب ‏ ‏ ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

کے مطلب کی وضاحت کے لیے باخبر حضرات کو زحمت دی تھی۔

میرے استفسار کے جواب میں جناب اطہر مسعود رضوی [لکھنؤ] - جناب حامد ندیم (الٰہ آباد) استادِ محترم پروفیسر سید نجم الدین نقوی (رامپور) اور جناب اقبال ردولوی کے مراسلات "ہماری زبان" کے ۱۵ نومبر، ۲۲ نومبر، ۸ دسمبر اور ۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کے شماروں میں بالترتیب شائع ہوئے۔

ان مراسلہ نگاروں میں سے جناب حامد ندیم نے مسئلے سے متعلق از خود کچھ کہنے کے بجائے ڈاکٹر مسیح الزماں کی کتاب [illegible] سے ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ اسی طرح اقبال ردولوی صاحب نے حضرت اثر لکھنوی کا ایک مکتوب پیش کر دیا ہے۔ متذکرۂ بالا شارحین نے ہاتھ پر داغ پڑنے کی دو مختلف توجیہات کی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہہ آنکھوں سے داغ کی مانند کے مفہوم میں قرار دینے کی ہے۔ (ڈاکٹر مسیح الزماں، اطہر مسعود رضوی، اثر لکھنوی) - اس سلسلے کا سب سے مفصل و مبسوط بیان ڈاکٹر مسیح الزماں کا ہے وہ لکھتے ہیں:

"میر نے اپنے عہد کے ایک رواج پر اس شعر کی بنیاد رکھ کر ایسے لوگوں کے لیے اسے مبہم بنا دیا ہے جنھیں اس کا علم نہ ہو۔ محبت کرنے والے اپنے محبوب کی نشانی کے طور پر اس کا چھلا اپنے پاس رکھتے یا اپنی انگلی میں پہنے رہتے تھے۔ جب ہجر کی کاہش بڑھتی اور یاد زیادہ ستاتی تو اسے گرم کر کے بدن پر رکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے اس کا داغ پڑ جاتا تھا۔ محاورے میں اسے داغ دینا، داغ کھینچنا اور گل کھانا کہتے ہیں۔ اظہارِ غم کا یہ طریقہ ایسا عام تھا کہ محرم کے مہینے میں لوگ امام حسین کا غم ظاہر کرنے کے لیے بھی سینے پر داغ کھایا کرتے تھے۔ خود میر نے اپنے مرثیوں میں اس رسم کا ذکر کیا ہے[1]۔ میر کے علاوہ اردو شاعری میں اس رواج کا ذکر بہت جگہ ملتا ہے، مثلاً

بدنِ صاف پہ رنگینی دکھاؤ صاحب
قول ہارے ہو تو گل چھلوں کے کھاؤ صاحب

(واجد علی شاہ [illegible])

کھاتے ہیں گل چھین کر چھلا کسی محبوب کا
ہر برس اک داغ تازہ دینے کے عادی [illegible]

[1] [illegible]

دستِ خوردہ دشاخِ گل وگلزار ہیم

ان دلوں سود... اگر نے میں ہیں ضرب مثل (سودا)

ان مثالوں کے بعد اس رواج کی موجودگی سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا۔ لیکن مزید ثبوت کے لیے ہم دلوانِ رندؔ سے ایک منظوم خط کے تین شعر پیش کرتے ہیں جن میں واضح طور اس رواج کا بیان ہے تاکہ کوئی خلش باقی نہ رہ جائے۔ پردیس سے عاشق اپنے محبوب کو خط لکھتا ہے اور اس میں یہ فرمائش کرتا ہے کہ:

کوئی ہاتھ کا اپنے، چھلّا ضرور
مجھے بھیجیو خط میں، اے رشکِ حور
رہے گا مرے پاس تیرا نشاں
کروں گا میں تعویذِ دل، حرزِ جاں
اور اکثر جو فرقت میں گھبراؤں گا
اسے لال کرکر کے گل کھاؤں گا

چھلّے کے معنی مانند۔ ہجر کی بےتابی اور یادِ محبوب کی شدت میں عاشق نے اپنے ہاتھوں پر جو داغ کھائے ہیں ان کی شکل آنکھوں سے ملتی جلتی ہے، اس لیے کہ گرم چھلّے کے داغ بھی چھلّے ہی کی طرح ہیں۔ یہی داغ، ہاتھ پر آنکھوں کی طرح زیب دے رہے ہیں جنھیں دیکھ کر عاشق اس لیے مسرور ہے کہ ان سے اس کی محبت کی گہرائی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے۔ چوں کہ نرگس کے پھول کو آنکھ سے مشابہ کیا جاتا ہے اس لیے دوسرے مصرع میں اسی کو یوں ادا کیا ہے کہ ان داغوں کی وجہ سے میرا ہاتھ ان دنوں نرگس کے پھولوں کا گچھا معلوم ہوتا ہے۔"

معلوم کرنا ہوں کہ مسیح الزماں نے کھُل [بہ ضمہ اوّل] پڑھا ہے یا کھِل (بہ کسرِ اول) اردو میں زیب دینا کے معنی میں کھِلنا مستعمل ہیں۔ لیکن آنکھوں کی رعایت سے کھُلنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

[illegible] داغ "مشبہ" اور "آنکھوں" مشبہ بہ ہے۔ اطہر مسعود رضوی لکھتے ہیں کہ:

ان داغوں کا تعلق محبوب سے ہے۔ اس لیے آنکھ کی شکل کے ہر دائرہ نما داغ کو دیکھ کر عاشق کا ذہن اس کی آنکھوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

[illegible] محبوب سے منسوب کرنے کی یہ دلیل قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن شعر کی جو تعبیر اثر صاحب نے کی ہے وہ محض باریکی ہے۔ [illegible] صاحب کے نزدیک شعر کا حاصل یہ ہوا کہ میری آنکھیں ہی معشوق کے دیدار کو نہیں ترستی ہیں بلکہ اس کے عشق میں ہاتھ پر جو داغ کھائے ہیں وہ بھی حسرتِ دیدار میں چشمِ نرگس کی طرح اس کا راستہ تک رہے ہیں۔"

[illegible] گرم چھلّے کے داغ، چھلّے ہی کی طرح گول ہیں۔ اس لیے آنکھوں سے مشابہ ہیں۔ بند آنکھوں سے نہیں، کھلی ہوئی آنکھوں سے۔ پھول کا تصور ہی کھلا ہونے ہونے کا ہے تا وقتیکہ دوسری صورت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ اظہار نہ کیا جائے۔

جنابِ شمس الرحمٰن فاروقی نے شرحِ میر کے تحت (دیکھیے [illegible] جولائی ۱۹۸۲) [illegible]

اس طرح [illegible] شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی نکالا جاتا ہے

[illegible] جب اس نے اسے پوچھا تو خون کے داغ اس کے ہاتھوں پر پڑ گئے۔

[illegible] ان معنوں میں دو قباحتوں کی نشاندہی کی ہے:

[illegible] انسانی جلد پر جب کوئی ایسی چیز لگ جائے جسے دھویا یا دور کیا جا سکے تو اس کے لیے اردو میں ہم

خوشبو کا پھیلنا" بھی ہیں۔ اس اعتبار سے "نرگس" اور "کھل رہے ہیں" میں مناسبت ہے۔ ان سب مناسبتوں کو غالب نے میر سے بڑھ کر استعمال کیا ہے مگر، ممکن ہے، میر کے شعر نے یہ بات سجھائی ہو۔

غالب کا شعر ہے :

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھلا

"داغ کو گل بھی کہتے ہیں اور زخم کھلنا یعنی زخم کا فراخ ہونا بھی محاورہ ہے۔

ہاتھ کے ساتھ "گلدستہ" کی رعایت میر نے دیوانِ اول ہی میں ایک جگہ اور رکھی ہے ؎

تری گل گشت کی خاطر بنا ہے داغ داغوں سے
پرِ طاؤس ہے سینہ تمامی، دست، گلدستہ

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں وہ لطف نہیں ہے جو "ہاتھ" اور "دستہ" میں ہے [ شعر میں دوسری خوبیاں ہیں جو اپنی جگہ پر بیان ہوں گی ]۔ دیوانِ دوم میں میر نے اسی مضمون کو بہت دلکش انداز میں لکھا ہے :

گل کھائے ہیں افراط سے میں عشق میں اس کے
اب ہاتھ مرا دیکھو تو پھولوں کی چھڑی ہے

فاروقی صاحب نے "کھل رہے ہیں" سے "کھلے ہوئے ہیں" مراد لی ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ خود میر کے اس شعر :

ذرہ ذرہ ہے عشق سے معمور    سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میں "بھر رہا ہے" بمعنی "بھرا ہوا ہے" استعمال ہوا ہے یعنی عمل کے بجائے حالت کی نشان دہی مقصود ہے۔ لیکن داغ اگر چھلے کے ہیں (جیسا کہ گمان غالب ہے) تو ان کی شکل یوں بھی آنکھوں جیسی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ کہنگی کے باعث شق ہو کر یہ شکل بنے۔

"کھلنا" بمعنی ظاہر ہونا، معلوم ہونا، عیاں ہونا قدیم سے اردو میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صادق نے اپنے مضمون "علمِ بیان" [ ملاحظہ ہو "درسِ بلاغت" ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی صفحہ ٣٧ ] میں کنایہ کی ایک قسم تلویح کی مثالوں کے تحت میر کا زیرِ بحث شعر نقل کر کے مندرجہ ذیل تشریح کی ہے :

"یہاں داغ کا آنکھوں کی طرح کھلنا اور نرگس کا دستہ بن جانا "ہاتھ" کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے، یہ محبوب کے ہجر کا نتیجہ ہے۔ محبوب ملاقات کے لیے نہیں آیا ہوگا۔ اِس لیے عاشق نے اس کے دیے ہوئے چھلے کو گرم کر کے بارہا اپنے ہاتھ پر داغ دیے ہوں گے۔ چھلوں کے داغوں نے اس کے ہاتھ پر آنکھوں کی سی شکل اختیار کر لی ہوگی۔ نرگس کے پھول بھی آنکھوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اس لیے شاعر نے ہاتھ کو نرگس کا دستہ کہا ہے۔"

فاروقی صاحب کے نزدیک "کھلنا" کے جو معنی میر کے یہاں داغ کی نسبت سے ہیں وہی معنی غالب کے شعر میں زخم کے تعلق سے ہیں۔ میں تفہیمِ غالب میں فاروقی کی ناقدانہ صلاحیت اور ان کی فہم و فراست کا قائل اور معترف ہونے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ زیرِ نظر مسئلے میں وہ مغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ کم از کم تین شارحین یعنی جوش ملسیانی، آغا محمد باقر اور گیان چند جین کے بیانات سے مرتب ہونا، مزین ہونا کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، شق ہو جانے کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا :

۱۔ "زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا" کے معنی زخم داغ سے زیادہ اچھا ظاہر ہوتا ہے کے ہیں۔ یعنی مجھے داغ کی نسبت زخم زیادہ پسند ہے۔ غالباً اس لیے کہ زخم میں زیادہ ایذا ہوتی ہے۔" (مکتوب گیان چند جین بنام راقم الحروف مورخہ ۱۴ر دسمبر ۹۴ء)

۲ - یعنی داغِ محبت، دل کی زینت تھا مگر زخم محبت نے اِسے اور بھی زینت دے دی۔ (دیوانِ غالب مع شرح از جوش ملسیانی)

۳ - واقعی ہمارے دل کا داغ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا، اور ہم خوش تھے۔ لیکن زخم لگنے پر معلوم ہوا کہ زخم، داغ سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس قصیدے میں کھُلنا، زیب دینے کے معنوں میں متعدد بار استعمال کیا ہے۔ لیکن زخم کے ساتھ کھُلنا استعمال کرنے سے کچھ اور ہی لطف پیدا ہو گیا ہے۔"

(بیانِ غالب از آغا محمد باقر، طبع لاہور، ۱۹۴۵ء، ص ۵۹۳)

جیسا کہ معلوم ہے، خود غالب کے محولۂ بالا شعر میں "کھلنا" کا اطلاق زخم کے ساتھ داغ پر بھی ہو رہا ہے۔ لہٰذا "کھُلنا" بمعنی زیب دینا کی بدولت میر کے یہاں بھی وہی حُسن پیدا ہوتا ہے جس کی نشان دہی آغا محمد باقر نے غالب کے شعر میں کی ہے۔

داغ (گل)، "نشانِ عشق" ہونے کے باعث عاشق کو حسین معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ فاروقی صاحب کے نقل کردہ میر کے دیوانِ اوّل اور دیوانِ دوم والے اشعار سے بھی ظاہر ہے۔ پہلے شعر میں "گل خوردہ" ہاتھ کو "گلدستہ" اور دوسرے میں پھولوں کی چھڑی کہا ہے شعرِ زیرِ بحث میں "نرگس" قافیہ ہونے کی وجہ سے "داغ" کے لیے آنکھ کی تشبیہ ناگزیر تھی ورنہ اصلاً یہ شعر محولۂ بالا دو شعروں کا ہم مضمون ہے۔

شعر میں ایک لفظ کی قرأت بحث طلب معلوم ہوتی ہے۔ نیر مسعود رضوی نے "کھُل" (بہ ضمۂ اوّل) کے بجائے، کھِل (بکسرِ اول) پڑھا ہے۔ اور کھِلنا کے معنی اچھا لگنا، بھلا لگنا قوسین میں درج کیے ہیں۔ "انتخابِ میر" کے مرتب پروفیسر محمد حسن بھی اِسی کے حق میں ہیں راقم الحروف کے استفسار کے جواب میں انھوں نے لکھا ہے:

"میرے خیال میں کھِلنا ہی ہے۔ پھول کھُلا نہیں کرتے، کھِلا کرتے ہیں اور کھِلنا کے معنی اچھا لگنا بھی ہے میر نے غالباً ایہام پیدا کیا ہے۔"

یہ درست ہے کہ پھول کھُلا نہیں کرتے۔ لیکن آنکھ کی مانند داغ کا کھِلنا بھی بعید از قیاس ہے۔

دراصل نرگس کے پھول بھی (گرم چھلّے کے داغوں کی طرح) گول ہوتے ہیں۔ لہٰذا "کھِلنا" کے بجائے اگر "کھُلنا" پڑھا جائے (دونوں بہ معنیٰ اچھا لگنا، زیب دینا) تو محمد حسن صاحب کا اعتراض بے محل ہے۔ پھر جیسا کہ فاروقی نے لکھا ہے "کھُلنا" کے معنی "خوشبو کا پھیلنا" بھی ہیں۔ اس اعتبار سے "نرگس اور کھُل رہے ہیں" میں جو مناسبت ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کا بیان (مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۸۵ء) اس لائق ہے کہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے:

"... کھُلنا اور کھِلنا دونوں اردو میں پھبنا (اچھا لگنا، زیب دینا) کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن میر کے (محولہ بالا) شعر میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "کھِل رہے" نہیں بلکہ "کھُل رہے" نظم ہوا ہے، اس لیے کہ میر نے داغوں کی کیفیت کو آنکھوں کی ایک کیفیت سے تشبیہ دی ہے۔ "کھِلنا" آنکھوں کی کسی کیفیت کے لیے محاورہ نہیں ہے۔ میر نے گویا یہ کہا ہے کہ سب داغ اس طرح کھُل رہے ہیں جس طرح آنکھیں کھُلتی ہیں نہ کہ کھِلتی ہیں۔ البتہ اگر آنکھوں کی تشبیہ نہ ہوتی تو محض داغوں کے لیے "کھِلنا" اور "کھُلنا" دونوں پڑھے جا سکتے تھے (دونوں بمعنیٰ پھٹ کر زخم بن جانا) ......"

"آنکھوں سے" کو "آنکھوں کے ذریعہ" یا "آنکھوں کی بدولت" کے مفہوم میں قرار دے کر شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی نکالا جاتا ہے یعنی یہ کہ شدتِ غم میں عاشق کی آنکھوں سے خون بہنے لگا ہے۔ جب اس نے اسے پونچھا تو خون کے داغ اس کے ہاتھوں پر پڑ گئے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں نے ان معنوں میں دو قباحتوں کی نشان دہی کی ہے:

"ایک تو یہ کہ انسانی جلد پر جب کوئی ایسی چیز لگ جائے جسے دھویا یا دور کیا جا سکے تو اس کے لیے اردو میں ہم

لفظ دھبّا ہے داغ نہیں۔ داغ صرف ایسے نشان کو کہا جائے گا جو دھویا پونچھ کر دور نہ کیا جاسکے۔ دوسری بات یہ کہ خون سُرخ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر شاعر کا یہی مفہوم ہے تو دوسرے مصرع میں اس کی تشبیہ ایسے پھولوں کے دستے سے دی جانی چاہیے جو سُرخ ہوتے ہوں، مثلاً گلاب یا لالہ۔ نرگس کا دستہ کہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میر کا یہ مفہوم نہیں ہے۔" (ایضاً)

اس استدلال کے جواب میں نجم الدین نقوی صاحب رقم طراز ہیں:

آپ ذرا غور کیجیے تو بات بڑی لطیف نکلے گی۔ محبوب کی جدائی کے غم نے دل میں داغ پیدا کر دیے ہیں۔ داغ سے پہلے زخم کا ہونا ضروری ہے، اور کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ داغ رِسنے لگتے ہیں۔ بظاہر داغ ہوتے ہیں مگر اندر ناسور۔ ناسور کا بند ہو جانا سنتے آئے ہیں۔

محبوب کی جدائی رونے پر مجبور کرتی ہے۔ آنسوؤں کے ساتھ داغِ دل کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ میر صاحب آنسوؤں کو ہاتھوں سے پاک کرتے ہیں۔ داغ آلود آنسو، ہاتھ پر نرگس کے پھول کھلاتے ہیں اور اس طرح ان کا ہاتھ دستۂ نرگس بن جاتا ہے۔ نرگس کے پھول سے آنکھ کی مناسبت واضح ہے۔ "آنکھوں سے" کا مطلب "آنکھوں کی طرح" بھی ہو سکتا ہے اور "آنکھوں کے ذریعہ" بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نرگس کا پھول اگر سرخ نہ بھی ہوتا تب بھی تشبیہ غلط نہ ہوگی اور خون کی رعایت باقی رہے گی۔ تشبیہ کے لیے محض ایک وجہ شبہ کافی ہوتی ہے۔ آنکھ کی رعایت سے نرگس کے پھول بن گئے، سرخ ہوں کہ سیاہ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نرگس سرخ بھی ہوتی ہے۔"

چھینٹوں والی تلمیح کا اس شعر میں کوئی قرینہ نہیں معلوم ہوتا۔ میر صاحب بغیر کسی قرینے کے شعر نہیں کہتے۔ کبھی کبھی خون بھی اس طرح جم جاتا ہے کہ دھوئے نہیں دھلتا۔ یہ خصوصیت محض داغ یا دھبّے کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ خود میر کا ایک شعر ہے:

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

خون کا داغ بھی پڑ سکتا ہے اور ایسا کہ چھڑانے سے نہ چھوٹے ——
غالباً سوداؔ[1] نے کہا ہے:

چھڑانے سے نہ چھوٹے گا، اے قاتل، نہ بن لڑکا
وفاداروں کے خوں کا داغ کیا، دھبّہ ہے کیچڑ کا

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام گفتگو اصل نکتے سے دور جا پڑی ہے۔ سوال یہ ہے کہ "داغ" سے مراد "داغِ دل" کیوں کر ہو سکتی ہے؟ میر کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ مصرع یوں کہہ دیتے:

داغِ دل کھل رہے ہیں آنکھوں سے

میں نے اس بارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ موصوف نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۶ء میں ارقام فرمایا:

اُن کا (سیح الزماں کا) استدلال کم زور ہے۔ لیکن اگر داغ کھانا، گل کھانا محاورے اور اس رواج سے

---

[1] یہ شعر آتش کا ہے۔ [رم ج]

باقی صفحہ ۱۱ پر دیکھیے



## محمود سعیدی

### جاگتی آنکھوں کا خواب

بستر میں لیٹے لیٹے کیا دیکھ رہا ہوں میں!
رینگ رہے ہیں صوفے کے نیچے زہریلے سانپ
کرسی کے اوپر اک کالی بلی بیٹھی ہے
بند دریچے سے یہ اندر کون چلا آیا —؟
دروازے پر دل دہلاتی دستک کس کی ہے؟!

کس صدمے سے بے حس و حرکت ہوا ہے میرا جسم
دبا رہے ہیں میرا گلا یہ کس کے خونی ہاتھ؟
مر جانے کا جذبہ غالب آتا جاتا ہے —
جینے کی خواہش میرا کیوں چھوڑ رہی ہے ساتھ؟

بستر میں لیٹے لیٹے کیا دیکھ رہا ہوں میں؟
کھلی فضا میں اک نازک سی تتلی اڑتی جائے
ایک پرانا گدھ کہ اچانک اس پر جھپٹا ہے
گدھ کے پروں کے نیچے آ کر بھی تتلی بے خوف
تتلی کو گدھ کی نیت پر کیوں یہ بھروسا ہے؟

اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں کمرے کی دیواریں
پل دو پل میں یہ چھت مجھ پر گرنے والی ہے
تاریکی میں ڈوبنے والی ہیں ساری چیزیں
آنکھوں کے پردے پہ سیاہی بھرنے والی ہے

محمود سعیدی

۲۳۰۶ - [illegible] دہلی ۱۱۰۰۰۶



## قتیل شفائی

### گیت

کیسا انوکھا انوکھا سایا —
جھانکے دل کا کھولا دریچہ، مجھ سے ملنے آیا
کیسا انوکھا انوکھا سایا —

یہ سایا میں چاہوں جس کو چھونا
دیکھ کے جس کو شوق بڑا ہے دونا
[illegible]
کیسا انوکھا انوکھا سایا —

کچھ بتاؤں یہ سایا کیسا ہے
روپ کا ہر اک رنگ دمکتا جیسے
[illegible]
کیسا انوکھا انوکھا سایا —

خوشبو میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
کیسا انوکھا انوکھا سایا —

قتیل شفائی

غالب کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵

## مظفر حنفی



اس نے ہم کو صحرا، ترائی اور پہاڑ دیے
ہم نے اس کے ٹکڑوں میں پنجے گاڑ دیے

رنگ سرور میں فکر کا اس نے زور جب مانا ہم
توڑ دیے فکروں کے دروازے، پردے پھاڑ دیے

ہم سمجھے تھے تم بھی شاید درد کا درماں ہو
تم نے بھی کر کے ساتھ نہ بچے، خط بھی پھاڑ دیے

شبنم شبنم سپنے ہو کر آنسو سبھی تھے
شہر نے ... جھنڈ اکھاڑ دیے

رستے سوکھے پھولوں کو دیکھیں، سب پھولوں نے
نفرت کا آرہ ہو نے کتنے شجر اجاڑ دیے

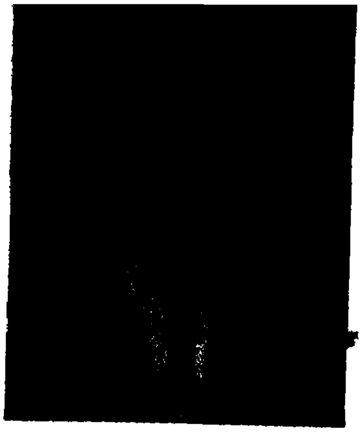
ہم تو گم ہو رہتے تھے جس کا رونا رونا تھا
تم نے ہم کو نقش بنائے اور بگاڑ دیے

موشی گروں ہیں، قسم ہے اور ماں ... ہیں
یاد مظفر ... میں ... دیے

مظفر حنفی

۳۵۸ - بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

## عالم تاب تشنہ



جو بن کے گرد راہ نکلے بس غبار ہو گئے
سر تمام رہ سے معتبر وہ شہسوار ہو گئے

ہمارے روز و شب کی ہے یہ مختصر سی داستاں
چراغ دار جل اٹھے ستارہ وار بجھ گئے

جو تھے مدعئ سحر سر دیار شب گئے
وہ سارے سب چراغ زیر طاق دار بجھ گئے

ہمیں تو وہ گلاب بھی تمازت بہار میں
جو شاخ شاخ گل پہ تھے جو چار چار بجھ گئے

ہمیں میں وہ چراغ آشنائے شب لحد
ہزار بار جل اٹھے ہزار بار بجھ گئے

چراغ حال میں جو دل کی لو بڑھا کے لائے تھے
وہ سارے لوگ لے کے ہوا کے سامنے یار بجھ گئے

نشاں رہے جو ہوا روشنی کا باد شب نژاد نے
چراغ بام سے قطار در قطار بجھ گئے

سحر فریب دے رہی تھی خواب سے کر
دیے تمام اے امید وصل یار بجھ گئے

جو تشنہ لب تھے ہر سبو کی آبرو تھی
تری ... بزم بھی نگاہ بادہ خوار بجھ گئے

عالم تاب تشنہ

۵۲/سی بلاک ۹، گلشن اقبال، کراچی - ۴۷ - (پاکستان)



نشتر خانقاہی



پرکاش فکری

زندہ رہنے کی بزرگوں سے دعا ہم کو ملی
خوب ورثہ تھا کہ صد رفتہ قبا ہم کو ملی

خود نمائی سے بچیں ساری شکستیں لیکن
ہم کہ خوددار رہے، پاداش میں جا ہم کو ملی

جانے کس شہر کی گلیوں سے گزر کر آئی
یادِ مسجود کے جھونکوں میں صبا ہم کو ملی

آئینہ دل کا ایسے دھند میں نکھرا کہ ادھر
آخری اگرد ملامت، اک دیا ہم کو ملی

زلف اقدار ہی کو الفت کا سمجھا معلوم
تنگ تھا جن پہ تعلق وہ نوا ہم کو ملی

خامشی، مدح نہ تنقیص کا پیرایہ ہیں
یہ بھی اک جرم تھا، اس کی بھی سزا ہم کو ملی

کون کرتا ہے، لیکن قطرہ سمندر کی تلاش
کچھ طبیعت ہی مقدر سے جدا ہم کو ملی

نشتر خانقاہی
محلہ پٹھانان، بجنور

شام آئی تو درد جاگا ہے
جاں آنکھ دل میں تنہا ہے

گھروں پہ چھایا ہے ساون کی
کھیتوں پہ دیوار سا پھیلا ہے

اب وہ کیا ہے ایسے پوچھوں تو
روبرو آئینہ جو رکھا ہے

کس کے دامن پہ صدقے ہونے کو
میری آنکھوں میں آنسو دریا ہے

اس کی یادوں کا حرم ہو کر میں
بستر موجوں کو چوکے کریا ہے

[illegible] ہیں وہ باب سارے
سر پہ بیٹھ کے جانے اترا ہے

کیا کہیں یہ مارتی فکری
بھولا اتنا کہاں سے لایا ہے

سرشار یوں تھے شوق کی وہ بات بھی گئی
شانہ ابھی یہ رکھ کے مرادات بھی گئی

مجھ کو شکوہ آئی تھی سیدوں کے دلیس
گھٹن ہوا اس مہرباں وہ رات بھی گئی

دیکھے ہی تھے وہ خواب ہم کو دے گئے
ہم گیا وہ خواب کی سوغات بھی گئی

دل پہ شکست کا عالم ہے اس دور
دوستیاں لیں و رکھی آیات بھی گئی

سچے دراس آہ بھی سچ تھی کا رگر
اے آنسوؤں تیرے سپیلکی اوقات بھی گئی

اس شہر ماہ دار میں فکری سوال ہے
کہ ٹپکی بوند تو برسات بھی گئی

پرکاش فکری
پراس ٹولی، دورنڈہ، رانچی (بہار)

# ممتاز راشد



دن ہو کہ شب ہے [illegible] تمہارا نام
جب سے [illegible] ہر [illegible] شام تمہارا نام

[illegible] ہر [illegible] تمہارا چہرہ
دل [illegible] ہر [illegible] پیام تمہارا نام

دنیا [illegible] اپنی [illegible]
جو [illegible] دل [illegible] دام تمہارا نام

ہم [illegible] لوگ [illegible]
[illegible] انجام تمہارا نام

شہر [illegible] تمہاری [illegible]
راشد [illegible] کلام تمہارا نام

دل میں [illegible] تنہا ہے
تم کیا [illegible] ساقی [illegible] بھرا ہے

[illegible] تھا [illegible] ہوا
تم چہرہ [illegible] تم [illegible] دیا ہے

[illegible]
[illegible] دیا ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] اچھا لگتا ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] راشد
[illegible]

ممتاز راشد

بلاک ۱، گراؤنڈ فلور، ۲۸-اے، مریم بائی ٹرسٹ بلڈنگ، درگاہ اسٹریٹ ماہم بمبئی ۴۰۰۰۱۶



حسن عباس رضا

سی کے ہجر میں آنکھوں کو لال کیا کرتا
ے عجز تھا اُس کا ملال کیا کرتا

ہی تو اُس کی جدائی سر پر رکھی ہے
جاہ و حشمت و مال و منال کیا کرتا

ں بہت ہے کہ وہ شہر حواس سے گزرے
ب اُس سے رہا دکسی سے سوال کیا کرتا

نہیں تو فقط اجنبائیں مانگتی ہیں
منوں میں بھلا اعتدال کیا کرتا

کارِ عشق تو اک جنونِ ناممکن ٹھہرا ہے
سو کارِ عشق میں کوئی کمال کیا کرتا

دراصل تو تیشے خود ہی کالعدم ہو رہے
یہ سر سے ہجر اُن کو ملال کیا کرتا

حسن عباس رضا

ڈی کے - ۹۱۵، پیا چاچا کالونی، سیٹیلائٹ ٹاؤن،
راولپنڈی (پاکستان)



## ذکاء الدین شایاں

دریا کا چڑھاؤ باندھ لیا
سیلاب میں ناؤ باندھ لینا

شہروں کے غبار اُڑ رہے ہیں
صحرا کی ہواؤ باندھ لیا

بارش میں بیر اچھوں سے ہوئی ہے
بادلوں کی گھٹاؤ باندھ لینا

رشتوں کی مالشیں ہیں خوب
یہ ریت کے گھاؤ باندھ لیا

آمادۂ سرکشی ہیں حدمات
میرے قریب آؤ باندھ لیا

عالم کی رگیں سی ٹوٹتی ہیں
حسنوں کے کھچاؤ باندھ لیا

کیوں زرد یہ ہوائیاں اُڑی ہیں
پیرہم سے لگاؤ باندھ لینا

ذکاء الدین شایاں

ر نزد اولڈ مسجد پوسٹ آفس بجریا، پیلی بھیت ۲۶۲۰۰۱ (یوپی)



اسلم عمادی

ہیں ماسروں کے بادل اُٹھے غبار میں اب
کھلے ہیں خاک سے گل موسم بہار میں اب

ہی ادائیں ہے زاویے نئے تیور ——
تمام قدرتیں قید سی ہیں اشتہار میں اب

وہ پہلی لذتیں اب کوفت بنتی جاتی ہیں
حول آگئے ہیں میرے انتظار میں اب

نہ سیر گل ہے مناسب نہ آشیاں سازی
بچھے ہوئے ہیں درندے بھی لالہ زار میں اب

ستاروں کے تماشے کو میں چلا تھا مگر
بھری ہے ریت مری چشم بے قرار میں اب

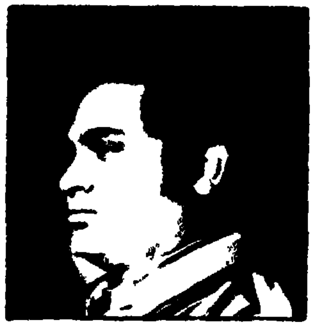
کسی جنون میں یہ دشت و ماہ کے شہزادے
پہنچ گئے ہیں نشیں ہو کے خارزار میں اب

کوئی غزل کوئی نوحہ کوئی صدا اسلم
سکوت مرگ لگے ہے جسے قرار میں اب

اسلم عمادی

۱۹۔۴۔۳۔۱۰، پوسٹ حمایت نگر۔ حیدرآباد ۲۸

## رشید افروز



اب عبث نو کا نصاب لکھوں
ورق ورق اضطراب لکھوں

دیا سلائی کی روشنی میں
تمام دن کا حساب لکھوں

سیہ دھوئیں کی دبیز چادر
پلکوں پہ میں آفتاب لکھوں

تم ایسی حالت میں کچھ بھی لکھو
میں زندگی کو سراب لکھوں

میں آس کی رحمت کا ذکر لکھ لوں
وار شعر کے حساب لکھوں

○

### سہیل کی سالگرہ پر

آس کی ادھی لڑتے ہے
جب آکاش کو چھو لوں
اور آکاش سے چاند ستارے
اپنی جیب میں بھر لوں
گھر لوٹوں
اور گڈو دیکھے
"ابا! تم کیا لائے؟"
جب اس کے ننھے ہاتھوں پر
چاند ستارے رکھ دوں

آج بھی لیکن گھر سے خالی ہاتھ ہی لوٹوں

○

### نجمہ کے لئے

ایک مدت سے یہ خواہش ہے
نئی نظم کہوں
وہ نئی نظم کہ جس کا
کوئی عنوان نہ ہو —
جس کے الفاظ پہ
خاموش صدا پھیلا دوں —
جس کی صدیوں کے دھندلکے پہ
ہوا کا سنگیت —
ایسی موسیقی ہو کہ پریشاں شعر
صدا اٹھے —
روشنی ایسی کہ تاریکی سے
بیٹھ جائے —
اور وہ نظم
تیرے نام سے منسوب کروں۔

○

سہیل منزل، ۸ - آشیانہ سوسائٹی، محمدی پارک، احمد آباد ۳۸۰۰۵۱ (گجرات)

## پرکاش تیواری



ایک دنیا اداس ہے مجھ میں
پھر بھی گلشن کی آس ہے مجھ میں

شب کے دھبے لہو سے دھوتا ہوں
اک سحر کا قیاس ہے مجھ میں

وہ سمندر ہے خود میں سمٹا ہوا
اور صحرا کی پیاس ہے مجھ میں

ایک سی ہیں عبارتیں لیکن
درد کا اقتباس ہے مجھ میں

میں جو ٹوٹا تو ٹیک نہ بہے گا
انقلابی احساس ہے مجھ میں

میرے زخموں کو یوں کریدو تو
زندگی بے لباس ہے مجھ میں

میں کہاں جاؤں کیا کروں پرکاش
آدمی بدحواس ہے مجھ میں

جانے کیا بات تھی ہواؤں میں
زہر سا گھل گیا فضاؤں میں

زندگی تھی کہ دھار خنجر کی
گر پڑا کٹ کے چہرہ پاؤں میں

کیا ڈرائیں گی ظلمتیں غم کی
ہم پلے ہیں انہی بلاؤں میں

ہو گیا ہے جو رنگ درد تو کیا
ہم بکھر کے گئے صداؤں میں

ہاتھ اٹھا کر ہرا دیا گھٹا نے
تھا اثر ہی کہاں دعاؤں میں

ریت تپتے سراب میں گم تھی
ایک پل کو تھے چھاؤں میں

جس طرف سے گئے رہے پرکاش
درد کی گرد تھا فضاؤں میں

تیری چاہت کی رہگذر ہی تو ہے
زندگی درد کا سفر ہی تو ہے

اس کے کوچے کا رخ کیا میں نے
آرزو شاخ بے ثمر ہی تو ہے

کس کو ہم سے کہیں حکایت بیاں
یہ زمانہ دکھوں کا گھر ہی تو ہے

میرے اوپر گرے جو پتھر
حادثہ بھی تو کیا کہ سر ہی تو ہے

وہ سمجھتا ہے میں رہا ہوں یہیں
حال سے میرے بے خبر ہی تو ہے

مسکراتے ہوئے چلو میرے ساتھ
ایک لمحے کا یہ سفر ہی تو ہے

اب تو جاگے ہے ریت سے پرکاش
دیکھو کہاں تک بچھے بستر ہی تو ہے

پرکاش تیواری

۲۱۵۹ لودھی روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

## مہدی جعفر

### کیمیائے سامری

شہر گریاں
جادوئے بارِ سیہ کا نعرہ
کیمیائے سامری کا اژدہا ڈس کر گیا

شہر گریاں
تو کہ آنکھوں میں غبارِ کیمیا بھر اجلا بچا پھر کر گیا

کل تلک تو شہرِ تاباں
تو کہ جلوہ جاں فزا
صبحِ تیرہ صبحِ بے پایاں سکوں
گھنٹیاں کلیسا کے اور طائروں کے چہچہے

دن کو کاریں شاہراہوں پر رواں
اجلی اجلی خواہشوں کے کارواں

دن کو بازاروں میں رونق خیمہ اور نازاں خریداروں کے جھنڈ
شام اور دیوار و در کی سایہ سایہ نغمگی
شام اور گلیاں سہانی لطف سے خواب آگیں کنارِ آب، وہ سعدہ ستار

جلوۂ جھیل میں عکساں مناظر دور تک

شب کو رنگِ ساز کی جھنکار پہ رقصیدہ فضا
چاندنی گلنار اور موجِ ہوا محوِ خرام

شہرِ خوباں
تو کہ فردوسِ بریں
تیرا اپنا آسماں تیری زمیں اپنی زمیں
خضر کی منزل
رہِ ظلمات کا حاصل
سنگلاخوں کے درمیاں آبِ بقا

کل تلک تو شہرِ تاباں

وائے کیا قہر تھا بچا پھر شہرِ جاں

کیوں کسی فردوس کے آرماں پھر کی بائے کی بیلک سانپ کی پھنکار سے
اُٹھے وہ کیمیا کی آسماں ویراں سازشیں

کیوں کسی جنت کو چھینیں اپنی آنکھوں کی تمنا کے عوض

اپنی حوروں میں بکھرے پھر بلا کیں
جو اگر چھپا تو لائے سارے منظر سارے خواب
جو اگر اُٹھا تو تن جانے جہنم کا عذاب
صورِ اسرافیل کی روح شمال

شہر والوں حلق آنکھوں پرتے تاریک پردوں میں نہاں

رات وحشی سلسلہ کا کوہِ ستم

محشرِ اندیشۂ پرہول، اندوہ و الم
سایۂ رگ آفت رحم طفلاں بچھڑ جانے کا غم

آگ کی لپٹیں رگیں اعصاب نشتر سنسنی
بھاگتی بھیڑیں کچلتی دوڑتی کاریں تڑپتی لاشیں گرتی انگلیاں

فرشتوں کا قتل اور بیاروں کا قتل
منظر سا کا کہساروں کا قتل
چشمۂ احساس کے دھاروں کا قتل
کہکشاں کا گہر باروں کا قتل

وحشت رقصاں انگلیاں

شہر گریاں
ایک مشعل کیمیا کو پار کرنا
اک فضائے زہر میں پرواز کرنا
رقصِ عقلِ آخری پر ناز کرنا

شہرِ امکاں

مہدی جعفر

زیڈ ۔ ۳۳، سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳



## اسلم بدر

خلاء سے نفس سارے پیکر خلاء
نگاہوں کا ہر اک منظر خلاء

زمان و مکاں گردشوں کے اسیر
مگر گردشوں کا ہے محور خلاء

حصارِ خرد میں بڑے پیچ و خم
حصارِ خرد سے ہے باہر خلاء

طلب گار تدبیر، دنیا، مگر
ہمارا، تمہارا مقدر خلاء

صداؤں کی اک وادیٔ بے کراں
صداؤں کا ہے اک سمندر خلاء

تماشوں میں ڈھونڈا کیے سب سکوں
سکوں پا گیا طفل پا کر خلاء

منانے لگے تھے کئی رب لگے
دعاؤں سے بولے ہمیں بستہ خلاء

---

میں سنگِ میل ہوں عقدہ کشائے منزل ہوں
ہوں سنگِ راہ نہیں رہنمائے منزل ہوں

مرے مزاج سے واقف ہیں گھنے پیپل
سفر میں ہے مرا مبتلائے منزل ہوں

بھٹک رہے ہو تو آؤ، مرے قریب آؤ
میں اپنے کاندھے پہ کب سے اٹھائے منزل ہوں

قدم قدم پہ بگولوں کا رقص جاری ہے
مجھے لپیٹ کے رکھو، ردائے منزل ہوں

مرے وجود کا احساس اپنی سانسوں میں
جو کر سکو تو کرو، میں ہوائے منزل ہوں

سفر کا مقصدِ اولیٰ ہوں میں، ارادہ میں
وہ انتہا ہے، میں ابتدائے منزل ہوں

---

لباسِ گل میں وہ، خوشبو کے دھیان سے نکلا
مرا یقین بھی وہم و گماں سے نکلا

ہمارے ساتھ ہی اب آندھیاں بھی چلتی ہیں
یہ طے رہا ہم سفرِ بادباں سے نکلا

کچھ اس طرح سے یہ جو ہیں زمیں کی ڈوریں ہم
کہ جو بھی گمراہ، اونچی اڑان سے نکلا

نقب میں ڈھونڈ رہا تھا فصیلِ شب میں، مگر
مرا مکین، مرے ہی مکاں سے نکلا

اب اس کے بعد کوئی راستہ نہ کوئی سفر
قدم حصارِ زمان و مکاں سے نکلا

عجیب کشمکشِ جبر و اختیار رہی
غمِ حیات اسی درمیاں سے نکلا

خدا سے پیاس ملی ہے اسی گھرانے کو
کہ جس کے واسطے پانی چٹان سے نکلا


۱۰۲، کے ایف ۴، دھتکیڈیہ، جمشید پور

اسلم بدر

## عشرت آفریں

فاصلوں اور جھیلوں کے درمیاں

آ گئے صحرا بیلوں کے درمیاں
دور تک پھیلی ہوئی ہے اک دیوار سی
کون حائل ہے دلوں کے درمیاں
گلشن آرائیوں میں سوئے تھے
ہم کہاں آ گئے جنگلوں کے درمیاں
کیاریوں میں ہم تو جاتے ہیں تو
دن کی لو میں جو ستاروں کے درمیاں

دور تم سے ہیں جی اپنے دل میں ہوں
تم ہی رہنا دوستوں کے درمیاں

## فرحت نواز

اس نے ڈالی جب آج نظر
دشنوں سی ہیں قسم اک حال پر

ایک ماہی بے قرار پانی سا
جب یاد ہیں ڈوبے لشکر

مجھ کو جنگل میں شام نے گھیرا
ہر گام آرام سے وہ اپنے گھر

آج سوچا تو یاس کی کرن ہے
صبر کتنا کیا تجھ کو گھر

زینت رفعت اداس تھا سورج
چاند قمر سے تھی لوٹ چہرے پر

اس کی جھلکی جانب بادلوں سے
دل کی لہر لے بس آئی سمندر

سن لے مجھ سے تم چلے جانا
نہیں کسی کا سکون کی تیرہ پہر

دل کو گھنٹے سی میں سرخ تھی
زندہ ہیں اپنا پیار گزر ان پہر کر

اے-11/15، زمیندارہ کالونی، رحیم یار خان (پاکستان)

## رعنا حیدری

### حاصل

کتنے بیتے ہوئے لمحے
جن میں ہیں بہت کا عنوان
مگر وہ محفل اب پھر حیراں
وہی لمحے
زمانے ملتی گزرے
ہو گئے بے نام ہمعنواں
کریں کیا تجزیہ ان کا
ملے جو کچھ بھی ہم کو
بس یہی اپنا مقدر تھا
یہی عمروں کا حاصل ہے

### دعا

اے خدا بس ایک بار
سن تو لے میری دعا
نہیں ہو قابل شنید
مگر کردگی التماس

ایک بار
زمانے میں پھر سے لٹ
عطا ہو مجھ کو وہ شہر
کہ دل کے سارے دکھوں کو بھلا کر
یہ جھوک میں جب پڑھوں
تو اے خدا اس گھڑی
تو ہو صلوں کو قبول سے دو پہر لیتیں
کہ پھر مجھے نہ ضرورت کسی سے کچھ بھی دعا کا ہے

اجنتا کلینک، بیگم پورہ اورنگ آباد - 431004 (مہاراشٹر)




رتن سنگھ

ایم - ۴۵ - پولی ٹیکنک کالونی، گواری گھاٹ روڈ، جبل پور - ۸


# زمانہ خراب ہے

آجی اگر آپ میری یہ چٹھی لے جائیں تو جبلپور اسٹیشن پر آکر میرا لڑکا آپ سے لے لے گا۔ بڑی کرپا ہوگی۔"

"لیکن آپ کا لڑکا مجھے پہچانے گا کیسے؟" میں نے ٹالنے کے لئے کہا۔

"جی وہ تو میں ابھی گھر جا کر انہیں فون کر دوں گا" آپ کے ڈبے اور سیٹ کا نمبر بھی انہیں دے دوں گا' تو وہ آپ کو ڈھونڈ لیں گے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

میرے اندر کا انسان ایک دوسرے انسان کی مدد کرنے کے لئے جاگ گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ لفافہ میرے ہاتھ میں تھا۔

"میں نے اس پر ان کا پورا پتہ لکھ دیا ہے۔ فون نمبر بھی لکھ دیا ہے اگر کسی وجہ سے وہ آ نہ پائیں تو آپ انہیں فون کر دیجئے گا۔ وہ خود آپ کے گھر آکر چٹھی لے جائیں گے۔ بڑی ضروری چٹھی ہے۔"

چٹھی لیتے ہی پتہ نہیں کیوں میرے من میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ اور میں نے پھر وہی سوال کر دیا۔ "مگر آپ کا لڑکا مجھے پہچانے گا کیسے۔؟"

"اچھا تو میں دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی واقف کار مل جائے تو میں چٹھی اسے دے دوں گا۔"

وہ شخص چلا گیا۔ اور چٹھی میرے ہی ہاتھوں میں پکڑی رہ گئی۔

اتنے میں گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی اور گاڑی چل دی۔ میں نے لاپرواہی سے چٹھی اپنے بستر کی چادر کے نیچے رکھ دی اور کوئی کتاب پڑھنے لگا۔

لیکن دوسرے ہی پل میرا من اچاٹ ہوگیا۔

پتہ نہیں اس خط میں کیا ہے؟ ——— ہو سکتا ہے اس میں کالا دھن ہو۔ نہیں پیسے تو کوئی اس طرح اجنبی کو نہیں دے گا لیکن کالے دھن سے متعلق کاغذات تو ہو ہی سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے کالے دھن کے بیوپار میں میں بھی اسی طرح کا مجرم ہوں، جس طرح اسمگلنگ والوں کا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والے۔

ایسا سوچتے سوچتے میرے پسینے چھوٹ گئے' اور دل پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

کسی کو منع کرنے کی ہمت نہیں ہے تو اب بھگتو۔ میں خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔

میں نے بڑی مشکل سے دھیان دوسری طرف لگایا تو سنا کہ ایک بیوپاری قسم کا مسافر دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "یار آج کل تو بڑی سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ کچھ مال وال تو نہیں تمہارے پاس۔ بس یہ سننا تھا کہ میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں نے گھبرا کر اور یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ میں نے وہ لفافہ چادر کے نیچے سے نکالا اور اسے برتھ پر ہی رکھے ہوئے ایک بوٹ کے اندر رکھ دیا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سپاہی دور کسی برتھ پر بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا ہے۔

اب تو میری گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کئی لوگوں کی نگاہیں مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ آخر میں ہی سب کی نظروں کا مرکز کیوں ہوں؟۔ میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اور اپنے بچاؤ کے لئے میں نے اپنے سارے پیر و مرشد یاد کر ڈالے ۔ "یا مولا اب کی بچا لے۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔"

کچھ دیر کے بعد مجھے سکون ملا ہی تھا کہ پھر دوسرے قسم کے خیالات دماغ میں آنے لگے۔ آج کل دہشت پسند ملک کے ہر کونے میں سرگرم ہیں۔ کہیں اس آدمی نے مجھے لیٹر بم ہی نہ تھما دیا ہو۔ کون جانے یہ خود بخود پھٹ جائے۔ میرے تو پرخچے اڑ جائیں گے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ میری تو حالت خراب ہونے لگی۔ میری ہمت

نہیں پڑتی تھی کہ اپنے اُس بوٹ کی طرف دیکھوں۔ جس میں وہ لفافہ رکھا تھا توجہ ہٹانے کے لئے میں نے ایک بار پھر کتاب کھولی لیکن تھوڑی دیر بعد ایسے لگا جیسے کسی چیز کے جلنے کی بو آ رہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بم پھٹنے کا وقت ہو گیا۔ ممکن ہے میرے بوٹ کا چمڑا جلنا شروع ہو گیا ہے۔

دل چاہا کہ میں اُٹھ کر اپنی برتھ سے دُور چلا جاؤں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر بم پھٹا تو پھر تو اِس ڈبے کا کوئی بھی مسافر نہیں بچے گا۔ اس لیے برتھ سے اُٹھ کر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب کی میرا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔

پھر میں نے ہمت کر کے بوٹ کی طرف دیکھا۔ ابھی وہاں سے دُھواں اُٹھنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اِس لئے میں نے اُس بوٹ کے اندر سے خط نکالا۔ ایک نظر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ معمولی سا لفافہ تھا پھر اُس کو انگلیوں سے اچھی طرح ٹٹولا۔ اُس کے اندر کاغذ ہی رکھے لگتے تھے۔ کسی دھات کا تار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے یہ تو اطمینان ہو گیا کہ یہ لیٹر بم نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاطاً اُس خط کو بوٹ سے نکال کر ایسے ہی برتھ پر رکھ کر اُس کے اوپر بوٹ رکھ دیا۔ جیسے میں نے اپنی مصیبت کو بوٹ کے نیچے دبا دیا ہو۔

لیکن مصیبت دبی نہیں تھی۔ وہ تو رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے کئی شکلوں میں نمودار ہوتی رہی۔ اِس لئے کبھی میں اُس خط کو چادر کے نیچے رکھتا کبھی بوٹ کے نیچے اور کبھی بوٹ کے اندر۔

کسی طرح بھی میری یہ ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اُسے اپنے سوٹ کیس یا کوٹ کی جیب میں رکھ لوں۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ اگر کہیں تلاشی ہو جائے تو کسی طرح بھی وہ لفافہ میرے سامان کے اندر سے برآمد نہ ہو۔

مطلب یہ کہ وہ لفافہ میرے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گیا کبھی سوچتا کہ وہ آدمی عین گاڑی کے چلنے کے وقت ہی کیوں آیا۔ پھر جب اُس نے کہا کہ میں کسی دوسرے واقف کار کو دیکھتا ہوں تو وہ لفافہ اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ اس طرح کی کئی باتیں میری پریشانی کو بڑھا رہی تھیں۔

یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ سبھی مسافر سو گئے۔ لیکن میری تو نیند ہی غائب تھی۔ دل میں عجیب طرح کا ڈر بیٹھا ہوا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور آخر جب تھوڑی بہت نیند آئی تو سپنے میں [illegible] پیڑ ہیں جن کی اونچی شاخوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میں اور میری بیوی دونوں مل کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن آگ ہے کہ پھیلتی جا رہی ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں ہمارے کپڑے جل گئے۔ ہم نیم برہنہ ہو گئے تھے۔ چہرے کالے پڑ گئے تھے۔

صبح جاگا تو سپنے کا اثر کافی دیر تک ذہن پر رہا۔ اونچی شاخوں کو آگ لگنے کا مطلب ہے۔ عزت گئی۔ اور چہرے کالے پڑ جانے کا بھی مطلب یہی ہے۔ کپڑے جھلس جانے کا مطلب ہے کہ گھر برباد۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے اسٹیشن پر پہنچتے ہی پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ ممکن ہے گرفتار کر لیا جاؤں۔ حوالات اور جیل کی کوٹھریاں بھی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

سارا سفر اِسی طرح کے اندیشوں میں کٹا۔

آخر خدا خدا کر کے اسٹیشن آیا تو میں ابھی اپنی سیٹ سے اٹھا ہی تھا کہ باہر کھڑکی پر کسی کی دو آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی دکھائی دیں۔

"جی ہماری چٹھی آپ کے پاس ہے۔" کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے ایک میگزین جس کے اندر وہ لفافہ رکھ دیا تھا اُس کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے میگزین کے اندر سے اپنا لفافہ لیتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔ شاید آپ کی مدد ہی سے میرے بچے کی جان بچ جائے۔ سارے معائنوں کی رپورٹیں مل جانے پر ممکن ہے صحیح علاج شروع ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک دفعہ پھر میرا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اچھا ہوا۔ یہ کسی کے کام آ سکا۔" میں نے سوچا۔

لیکن یہ احساس بہت ہی وقتی تھا۔ اگر دوبارہ کوئی مجھے اسی طرح چٹھی دے تو کیا میں لے لوں گا؟؟؟۔

نہیں۔ میری توبہ۔ ایک رات کے خوف ہی کیا کم ہیں۔ اُن کے تصور ہی سے میرا دل ایک مرتبہ پھر کانپ گیا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے میں اللہ کا شکر منا رہا تھا۔ اب کی تو جان بچ گئی ہے۔ لیکن آئندہ کبھی ایسے چکر میں نہیں آؤں گا۔

زمانہ بہت خراب ہے۔ ○




مانک ٹالا

ای۔۱۰ امین سیڈ اپارٹمینٹس، پالی ہل کھار، بمبئی ۵۲...۴۰۰


# چراغوں کا میلہ

بہار کے پہلے جھونکے پھولوں کی خوشبو اور کوئل کی کوک کے ساتھ یہ مژدۂ جانفزا بھی لاتے کہ چراغوں کے میلے کی آمد آمد ہے۔

مارچ کے مہینے کے آخری چار دنوں میں ہمارے قصبے میں اس میلے کی بڑی دھوم دھام رہتی ہے۔ ہمارے لئے اس میلے کی اس لیے بھی زیادہ اہمیت تھی کہ ان چار دنوں میں اسکول بند رہتے تھے۔ صبح اسکول جانے کی خاطر نیند سے جلد بیدار ہونے کی بندش نہیں رہتی تھی۔ مٹھائیوں اور پھلوں کی سوغات کے علاوہ جی بھر کر آوارہ گردی کرنے کی بھی کھلی چھوٹ مل جاتی تھی۔

ہمارا قصبہ باغبان پورہ شہر لاہور سے لگ بھگ پانچ میل کے فاصلے پر شیر شاہ سوری کی مشہور جرنیلی سڑک کے دونوں طرف بسا ہوا تھا۔ اور اس کے قریب ہی شاہ جہاں کا مشہورِ عالم شالیمار باغ تھا۔ یہ میلا اسی باغ کے اندر، باہر اور گرد و نواح میں منایا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس باغ کی تعمیر کے دوران اور بعد میں، باغ میں لگے ہوئے انواع و اقسام کے پھولوں اور پھلوں کے باغات کی دیکھ بھال، پرداخت اور آراستگی کے لئے سیکڑوں باغبان ملازم رکھے گئے تھے۔ جو اس باغ کے قرب و جوار میں اپنی جھونپڑیاں اور کچے پکے مکان بنا کر رہنے لگ گئے تھے اسلئے اس گاؤں کا نام باغبان پورہ پڑ گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں بڑھتے بڑھتے پچیس، تیس ہزار کی آبادی والا قصبہ بن گیا تھا۔ جہاں دو تین میونسپل پرائمری اسکول اور ایک گورنمنٹ ہائی اسکول بھی تھا۔

میلے سے کئی روز پہلے شالیمار باغ اور اس کے قرب و جوار میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ میلے سے ایک مہینہ پہلے باغ کے اندر اور باہر کے اہم ٹھکانوں پر دکانوں کے پلاٹوں کی حد بندی کر کے انہیں نیلام کر دیا جاتا۔ بڑھ چڑھ کر بولی لگانے والوں کو ان چار دنوں کے لئے دکانیں لگانے کے لئے میونسپلٹی کا پروانہ مل جاتا تھا۔ میلے کے کچھ روز پہلے ان پلاٹوں پر شامیانے لگنے شروع ہو جاتے۔ اور دکاندار اپنا سامان سجانا شروع کر دیتے۔ مشینوں سے چلنے والے بڑے بڑے جھولے لگ جاتے۔ جن میں سے کچھ تو آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے اور کچھ زمین کی وسعتوں کے متوازی گردش کر رہے ہوتے۔ قصبے میں بجلی آجانے کے بعد باغ کے اندر اور باہر بڑے بڑے قمقموں کی روشنی رات کی تاریکیوں کا سینہ چاک کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔

باغ کے بیچوں بیچ خراماں جوئے بار کی صفائی کرانے کے بعد اس میں صاف شفاف پانی چھوڑ دیا جاتا۔ اور اس کے عین درمیان ایستادہ بڑے بڑے فواروں سے پانی کی دھاریں اپنی نقرئی انگلیوں سے آسمان کی چھت کو چھونے کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتیں۔

ہمارے قصبے کے عین درمیان سے جرنیلی سڑک گزرتی تھی۔ آدھا قصبہ اس طرف اور آدھا قصبہ اس طرف۔ لیکن کسی پیر فقیر کی دعا یا کسی سنت مہاتما کا وردان کہیے کہ مذہب کی قینچی نے دلوں کو درمیان سے نہیں کاٹا تھا۔ دونوں ہی جانب ہندو مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ لوگوں میں ایسی بھائی چارے، پیار و محبت اور مذہبی رواداری کا رشتہ بڑی مضبوطی سے استوار تھا۔ شادی، بیاہ، ہولی، دیوالی، اور عیدوں کے تہواروں میں لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے۔ ایک دوسرے کے سکھ دکھ، خوشی اور ماتم میں برابر شریک ہوتے تھے۔ سیاست اور مذہب کی ریشہ دوانیاں ہولی کے گلال میں نفرت کا رنگ اور عید کی خوشیوں میں زہر کا جام نہ چھلکا سکیں۔ مسجدوں سے اذان اور مندروں سے ناقوس کی جانفزا صدائیں ہواؤں کے دوش پر لہراتی ہوئی فضاؤں

میں گھومتی چلی جاتیں۔

اس میلے میں بھی اسی طرح کے دل افروز نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ دُور نزدیک سے اپنی اپنی ٹولیاں اور منڈلیاں بناکر اس میلے میں شریک ہونے کے لئے آتے۔ جاٹ اور بھاٹ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ناچتے گاتے ہوئے آتے، ہاتھوں میں جھانجھ مجیرے، ڈھول اور تاشے ہوتے۔ بھنگڑے کے تیز اور تند نشے میں مخش گانے اور ٹپے گاتے ہوئے زندگی کی محرومیوں اور کلفتوں اور ناکامیوں کو دُور بھگا دیتے۔

اس زمانے میں جرنیلی سڑک کے علاوہ سارے قصبے کے سبھی راستے کچے اور اُوبڑ کھابڑ ہوا کرتے تھے۔ ٹرکوں، بسوں اور لاریوں کی آمد و رفت پر ہوائیں گرد و غبار کے مرغولے بن جاتے۔ سال بھر میں کبھی کبھار ہی ان راستوں پر چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ لیکن ان چار دنوں میں ہماری میونسپل کمیٹی گویا خوابِ خرگوش سے بیدار ہو جاتی، اور خاکروبوں، بہشتیوں وغیرہ کی فوج بھرتی کر کے گرد و غبار اور گندگی اور غلاظت کا قلع قمع کر دیتی۔

نیلام شدہ دُکانوں کے علاوہ بھی دُور نزدیک کے کچے پکے راستوں پر خوانچہ فروش اور دکاندار انواع و اقسام کے سامانوں سے اپنا کاروبار سجا لیتے۔ ان خردہ فروشوں سے میونسپلٹی کی جاگیر کے استعمال کا تاوان وصول کرنے کے لئے میونسپل اسکولوں کے استادوں کی فوج کو ملٹری کے گھوڑوں کی طرح بے لگام چھوڑ دیا جاتا۔ وہ ان ناجائز دُکانوں کے طول و عرض اور سامان کی اہمیت کو نظر میں رکھ کر چار آنے سے چار روپے تک کرایہ وصول لیتے اور رسید کاٹ کر دکاندار کے حوالے کرتے۔ رسید کے اس حصّے میں تو کرائے کی رقم ٹھیک بھری جاتی لیکن رسید کا وہ حصّہ جو رسید بک کا حصّہ بن جاتا تھا اور میونسپل کمیٹی کے حساب کتاب کے لئے پیش کرنا ہوتا تھا اُس میں بقدر ہمت او بے ایمانی کر کے رقم کم بھر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے کھلونے اور بیوی کیلئے تحفے تحائف الگ سے وصول کر لیتے تھے۔ اس طرح قلیل تنخواہ لیکن بڑی قبیل داری والے اسکول ماسٹروں کو بھی سال بھر کا غیر سرکاری الاؤنس وصول ہو جاتا۔

ہم لڑکے بالے بھی نئے نئے کپڑے پہن اپنی اپنی جیب خرچی کی دونی یا چونی دبائے ٹولیاں بناکر نکل پڑتے۔ خوانچوں سے خوان سامان کی بھانت بھانت کی چیزیں خرید کر کھاتے اور چٹخارے لیتے ہوئے میلے کی رونق اور دُکان داروں کی آمدنی میں اضافے کا پُن کماتے۔ مداریوں کے تماشے اور جادوگروں کے جادو دیکھتے، مجمع بازوں کی لچھے دار تقریریں سنتے اور اُن کی نقلیں اتارتے۔

شالیمار باغ کی ایک دیوار کے باہری طرف ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ جس میں ٹیوب ویل (Tube Well) بھی فٹ کیا ہوا تھا۔ باغ کے پھولوں کی کیاریوں اور آم جامن کے پیڑوں کی آبپاشی کیلئے اِس کنویں سے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔

اس کے بارے میں ایک افواہ مشہور تھی کہ اس کے اندر ایک اچھا دھاری سانپ رہتا ہے جو میلوں کے دنوں میں آدمی کا بھیس بدل کر میلے کی سیر تماشا دیکھتا ہے۔ اور پھر اپنا اصلی روپ دھارن کر کے کنویں کی گہرائیوں میں استراحت فرما ہو جاتا ہے۔ اُس کی پہچان یہ بتلائی جاتی تھی کہ انسان کے بھیس میں بھی اُس کی آنکھیں سانپ کی طرح گول ہی رہتی ہیں۔

ہم جب کبھی اُس کنویں کی طرف سے گزرتے تو بڑے بھائیوں یا اسکول کے بڑے لڑکوں کی انگلی پکڑ کر اُن کے ساتھ سٹک کر چلتے۔ وہ ہمیں پہلے ہی سے ڈرانا شروع کر دیتے اور ہم اپنی جان کی سلامتی کی خاطر گڑگڑا کر اپنی خرچی میں سے دو ایک پیسے دے دیتے یا خوانچہ فروشوں سے خورد و نوش کی کچھ چیزیں خرید کر اُن کی پیٹ پوجا کا سامان بھی مہیا کر دیتے۔ وہ مفت کا حلوہ مانڈا ڈکار کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہمارے تحفظ کا بیڑا اٹھا کر ہمیں انگلی سے لگا میلے کی رونق دکھانے چل پڑتے۔ اُن کی حرکات و سکنات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے یوں ظاہر ہوتا۔ جیسے سر پر کفن باندھ کر چل رہے ہیں اور ہماری حفاظت کی خاطر مرنے مارنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے، آج ایسے بہادر جودھا کہاں ملیں گے جو دو ایک پیسے کی تلافی یا چنے بھٹورے کے عوض جان کی بازی لگا دینے پر کمر بستہ ہو جائیں! پھر بھی ان لاتعلق تسلیوں کے باوجود سانس کی آمد و رفت قابو سے باہر رہتی۔ ہر مذہب و ملت کے مجازی خداؤں اور پیروں فقیروں کی منت مانتے ہوئے ہر آنے جانے والے شخص کی آنکھوں کا جائزہ لیتے جاتے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہر شخص کی آنکھیں گول ہی دکھائی دیتیں۔ اب پچاس سال بعد اگرچہ لوگوں کی آنکھیں گول دکھائی نہیں دیتیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر کوئی ڈسنے کو تیار کھڑا ہے!

اگرچہ یہ میلا چراغوں کا میلہ کہلاتا تھا۔ لیکن چراغوں کی بہار کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ ان چار دنوں میں لوگوں کی یلغار زیادہ تر شالیمار باغ یا اس کے گرد و نواح ہی میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس باغ کی فصیلوں، دروازوں، محرابوں، جو تے بار یا پھر فوارے ہو کہ کہیں ایک چراغ بھی ٹمٹماتا نظر

نا تھا۔ ہم اس مٹے کو حل کرنے کی بہت کوشش کرتے لیکن ہمارے ننھے ذہنوں کے دریچوں میں آگہی کا کوئی چراغ روشن نہ ہوتا۔

آخر جب شعور کی چند سیڑھیاں اور چڑھے تو اس چراغاں کی وجہ معلوم ہوئی۔ قصبے کے پرانے علاقے میں کچے پکے مکانوں کے قریب ایک معمولی سی نیم پختہ، نیم شکستہ پرانی سی ایک منزلہ عمارت تھی۔ جس کے اندر اور باہر ان چار دنوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ اس میلے کی سب سے اہم کڑی یہی چھوٹی سی عمارت تھی۔

ایک روز ہم بھی اس چراغاں کی بہار دیکھنے کے لئے پہنچ گئے جھٹپٹے کا وقت تھا سورج کی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اور تاریکیاں چاروں طرف سے جھپٹ رہی تھیں۔ لیکن سینکڑوں لوگ اس عمارت کے اندر اور باہر چبوتروں، منڈیروں اور طاقوں پر چراغاں کر کے ان امڈتی ہوئی سیاہیوں کا گلا گھونٹ رہے تھے۔

اس بظاہر بے بضاعت سی عمارت کے اندر ایک سمادھی تھی ــ مادھولال کی ــ اور ایک مزار تھا ــ حسین کا۔

مادھولال اور حسین دونوں پکے دوست ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے والے دوست۔ یار کی یاری سے مطلب تھا دُنیا کی عیاری کی پرواہ نہ تھی۔

جہاں حسین ہوتا ہے وہاں یزید بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس حسین کو تو کئی یزیدوں نے اپنے نرغے میں لے لیا تھا کہ اُس نے اپنے بے گناہ معصوم دوست مادھولال کو ان ظالموں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وہ دونوں ایک خون آشام شام کو مذہبی جنونیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر قربان ہو گئے تھے۔




گربچن سنگھ

۹۔ اے، پنجابی لین، رام داس بھاٹیہ، جمشید پور۔ ۱


# کالا پانی

چہرے پر افسردگی، تھکن اور آنکھوں میں مایوسی و شکست کے آثار تھے میں جانتا تھا بھیا آنسو بہانا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن سے رویا نہیں جائے گا۔ اُن کے پیوند لگے لباس نے اُنہیں اور بھی غریب اور مسکین آدمی کا روپ دے دیا تھا۔ کرتے اور نیکر میں جو کہ اکثر کوئلے کی کھدانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا ڈیوٹی کا لباس ہوتا ہے وہ بڑے خستہ حال نظر آتے تھے۔

وہ پچھلی رات دس بجے سے سیدھے اسپتال آئے تھے۔ تب سے یہیں تھے۔ پچھلی رات سے نہ اُنہوں نے کچھ کھایا تھا نہ کپڑے بدلے تھے۔ اس کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ رات قریب بارہ بجے اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا "چھُٹنے تو گھر چلا جا۔ ہوٹل سے کچھ لاکر بچوں کو کھلا پلا کر سُلا دے۔"

میں بھیا کو تنہا چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔ دل نہیں مانا۔ بھیا! مسرجی کے گھر والوں نے گڈو، شونو، اور پنّی کو ضرور کچھ کھلا پلا کر سُلا دیا ہوگا۔ چاچی شاید گھر پہنچ گئی ہو۔ میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔

"میرے پاس رہ کر کیا کروگے۔؟"

سوچنے لگا، واقعی میں ان کے پاس رہ کر کیا کر سکتا ہوں۔

ہاں! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، دُکھ درد و مایوسی کسی انسان کو تنہا پاکر اُس کے سب سے حوصلہ اور جرأت کو اُس سے چھین کر اُسے کھوکھلا کر دیا کرتا ہے۔ مگر اُس کے پاس ایک سہارا، ایک آواز قریب ہو تو اُسے اکھڑ اور گرنے سے بچا لیتا ہے۔

[illegible] چاچی ایک مرتبہ گھر کا چکر لگا آؤ۔ اب اُن کے اصرار پر [illegible]۔ شاید بھیا رونا چاہتے تھے اور اپنا [illegible]

[illegible]

گھٹنوں تک بیٹھ گیا تھا۔

بستی کی طرف جو سڑک جاتی تھی، اُس پر بالکل اندھیرا تھا سارے ماحول کو جیسے کوئلے کی راکھ اور سیاہی نے ڈھک لیا تھا۔ میں بستی کے لوگوں کی طرح اندھیرے میں چلنے کا عادی تھا۔ وہ لوگ تو راستے میں اُبھرے ہوئے پتھروں، یہاں تک کہ گڑھوں، نالوں کو بھی بغیر کسی جھجک کے پار کر جاتے ہیں۔ وہ جو تاریک کنوؤں میں اُتر کر کوئلے کی سیاہ دیواروں سے ٹکرانا جانتے ہوں۔ بھلا اندھیرے راستوں کا کیا خوف۔

بھیا کا کہنا تھا۔ ہم کوئلے کی دُنیا میں رہ کر، کوئلے کی دُھول پھانک کر کوئلے کا کاربن ملا پانی پی کر خود بھی کالے ہو گئے ہیں۔ من کالا ہو جائے تو اُس میں گیان کی روشنی اُجالا نہیں پھیلا سکتی......!

ساری بستی سو گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر دیکھا صرف اپنے گھر کے لوگ جاگ رہے تھے۔

چاچی بغل کی بستی ہی میں رہتی تھی۔ وہ ہمارے یہاں پہنچ چکی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پوچھنے لگی۔ کستی کا حال کیسا ہے چھُٹنے...؟

"کچھ پتہ نہیں چاچی۔ ڈاکٹر والوں نے اُسے ایک کمرے میں لٹا رکھا ہے وہاں کسی کو نہیں جانے دیتے۔"

"آگ لگی کیسے؟"

"کھانا بناتے بناتے...!"

"بہت زیادہ جل گئی ہے کیا...؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے..."

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں...؟"

"کچھ نہیں، ہمیں کچھ نہیں بتاتے..."

"کستی بچ تو جائے گی...؟" [illegible]

[illegible]

چاچی بتا کر رونے لگی۔

بچے جو شاید چاچی کے پیار سے بہلانے بجھانے پر چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے وہ بھی رونے لگے۔ میں انگیٹھی کی طرف دیکھنے لگا جو آنگن میں سرد پڑی تھی پچھلی شام کشتی وہیں بیٹھی رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ جانے کیسے اوڑھنی سے آگ پکڑ لی تھی۔ اس نے گھبرا کر وہ گھر سے باہر بھاگ گئی تھی۔ باہر ہوا کا سہارا پا کر پل بھر میں وہ آگ اُس کے جسم کے سارے کپڑوں سے لپٹ گئی تھی کشتی جل اُٹھی! پاپا.....!

میں گھر سے کچھ ہی پرے بن تلسی کے جنگل میں سوکھی جھاڑیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ پکار سن کر دوڑا آیا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگ بھی گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ کشتی کے کپڑے جل گئے تھے۔ بدن جھلس گیا تھا۔ سینہ، ہاتھ پاؤں سب کچھ.....!

میں نے فوراً ہی اپنی تہمد سے جو تیجی کے جلتے ہوئے عریاں جسم کو ڈھک دیا تھا۔ کراہتی ہوئی ”تڑپتی ہوئی کشتی کے لئے میں اور کچھ نہیں کر سکا تھا

.....کچھ نہیں.....!

چاچی.....! میں نے پوچھا۔ بچوں کو کھلا پلا دیا...؟

”ہاں بیٹا.....!“

”تب انہیں سُلا دو۔ میں بھیا کے پاس جاتا ہوں“

”تمہاری بھابھی کی طبیعت کیسی ہے بیٹے؟“ چاچی نے ادب بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اچھی ہی ہوگی.. کسی نے اُس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

”اُسے کچھ مت بتانا۔ دُکھ کرے گی تو نقصان ہو جائے گا۔

نہیں چاچی اُسے کوئی خبر نہیں۔‘

چاچی دبے لہجے میں ہنس پڑی۔‘ بھگوان نے پہلے سے ہی تو بہت کچھ دے رکھا تھا۔ اب اور کیا ضرورت تھی۔“

”بھیا کے پاس جا رہا ہوں چاچی۔“ کہتا ہوا میں گھر سے باہر نکلنے لگا تو چاچی نے پیچھے سے آواز دی۔ سنو! کچھ کھا پی لے۔ اپنے بھیا کے لئے بھی دو روٹیاں لیتے جاؤ۔

نہیں! بھیا خود ہی یہاں آ کر کھا جائیں گے۔ کہتا ہوا میں گھر سے باہر نکل گیا۔

شاید بھیا نے تنہائی میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ نظر آ رہی تھیں اور سوجی ہوئی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی بولے... آ گئے....؟

”ہاں.....!“

”چاچی اُٹھی ہے.....؟“

”بچے جاگ رہے تھے یا سو چکے تھے.....؟ انہوں نے کچھ کھایا پیا۔؟

”چاچی نے سب کو کھلا پلا دیا ہے“

تم نے کچھ کھایا...؟

میں خاموش رہا۔ بھیا کو میرے کھانے کی فکر تھی لیکن اپنے کھانے کی نہیں۔ میں جانتا ہوں دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ڈیوٹی جایا کرتے ہیں۔ شام کو کولری کی کینٹین میں چائے نمکی یا پکوڑیوں کا ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر رات کو گھر لوٹ کر کھانا کھاتے ہیں۔ لیکن دوپہر کا وقت بھابھی کو زچگی کے لئے اسپتال لاتے اور بھرتی کرانے میں لگ گیا تھا۔ وہ کھانا کھا ہی نہیں سکے تھے۔ اور رات ڈھلتے ڈھلتے کشتی حادثہ کا شکار ہو گئی تھی۔ رات کا کھانا بھی گیا یہاں نہ تو انہیں کھانے کے لئے کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ ہی دینے والا۔

میں نے کہا۔ بھیا! چاچی تمہارے لئے کچھ روٹیاں بھجوا رہی تھی میں نہیں لایا۔ جاؤ تم گھر جا کر کھانا کھا آؤ۔ میں یہیں بیٹھتا ہوں۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بولے، تم نے کھایا۔؟

میں پھر خاموش رہ گیا۔

وہ میری خاموشی کا مطلب سمجھ گئے اور بولے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا اب بھوکے رہنے سے کیا فائدہ۔؟

کشتی کو ہوش آیا...؟

اب کشتی کہاں رہے.....!“ بھیا کی آواز بھرّا گئی۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ قمیض کے دامن سے وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔

میں حیرت و استعجاب میں کھویا سا بھیا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا

کیا جو کچھ وہ بول رہے ہیں وہ سچ ہے؟

اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کشتی پوری طرح جل گئی تھی۔ ہم شاید گھر سے اُس کی لاش ڈھو کر لائے تھے۔ اسی لئے شاید اسپتال میں اُسے بیڈ نہیں دیا گیا تھا۔ میں بینچ پر سے اُٹھ کر ایمرجنسی روم کے دروازے کے شیشے سے اندر کی طرف جھانکنے لگا۔ اندر اسٹریچر خالی پڑا تھا۔ جس پر کشتی کو رکھا گیا تھا۔

کشتی کہاں ہے بھیا.....؟ بھیا کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”اُس کی لاش مُردہ گھر میں رکھ دی گئی ہے۔

ایمرجنسی روم کی بغل سے جو ڈھلوان راستہ نیچے کوٹھری نما بند کمرے

کی طرف جاتا تھا وہی مُردہ گھر تھا۔ اُس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں اُس طرف گیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس قفل لگے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ کیا کشتی کے علاوہ اور بھی کسی کی لاش اُس مُردہ گھر میں پڑی ہوگی؟ کہیں کشتی اس بند سونے کمرے میں اکیلی تو نہیں! اور کوئی موقع ہوتا شاید میں اُس طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر پاتا لیکن اس وقت جذبات کی رو میں قدم بڑھاتا ہوا۔

میں اُس مُردہ گھر تک پہنچ گیا۔ جی چاہا آہستہ سے پکاروں! کشتی .....!

اور میں نے لوہے کے جنگلے سے اپنا سر ٹیک دیا۔ کشتی کیسے جواب دیتی کشتی تو واقعی سو گئی تھی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ جیسے میرے پاؤں منجمد ہو گئے ہوں۔ پھر بھاری قدموں سے بھیّا کے پاس واپس لوٹ آیا۔ بھیّا منہ اوپر اٹھائے چھت کی طرف نظریں گاڑے شاید کشتی کے بارے سوچ رہے تھے۔ میں ان کی بغل میں بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ بھیّا کشتی کے گزر جانے کی خبر بھابھی کو نہ ہو وہ کچھ نہیں بولے۔ خاموش رہے۔ شاید اس معاملہ کو وہ مجھ سے کہیں اچھی طرح سمجھتے تھے۔

تب رات شاید آدھی کے قریب ہوگی۔ سارے اسپتال کے ماحول میں ایک دردناک سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اُس سنّاٹے کو زچہ خانے میں کسی رونے والے بچے کی آواز، کبھی سرجیکل وارڈ میں کبھی کسی زخمی کی کراہ یا پھر بستی میں بھونکنے اور رونے والے کتوں کی ملی جلی آواز جھنجھوڑ سی دیتی تھی۔

کشتی جب چھوٹی عمر کی تھی، رات کے وقت کسی کتے یا بلی کی آواز سُن کر بہت ڈرا کرتی تھی۔ بھابھی اس کے ڈرپوک پن پر بہت کڑھتی تھی۔ اکثر کہتی سُنی جاتی، ہمارے یہاں ایک بزدل لڑکی نے جنم لیا ہے۔ یہ زندگی میں اپنے پیروں پر مشکل سے کھڑی ہو پائے گی۔

جانے بھابھی نے کیا سوچ کر ایسا کہا تھا۔

کیا وہ کھدان میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کی طرح اپنی بیٹی کو نوکری کرانے یعنی کامن بنانے کے خواب دیکھتی تھی۔ یا کچھ اور .....!

چار چھ برس بعد کشتی بلّی اور کتوں کی آواز سے ڈرنے والی ــــ لڑکی نہیں بلکہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے اور لڑنے والی لڑکی تھی۔ مزدوروں کے بچے کولیری کمپنی کی طرف سے کھولے گئے ایک پرائمری اسکول میں پڑھنے جاتے تھے کشتی بھی اُن میں شامل رہتی تھی۔ بھیّا کی خواہش تھی کہ وہ کشتی کو میٹرک تک پڑھا دیں۔ بھلے ہی اُسے بستی سے جھریا یا دھنباد پڑھانے کیوں نہ بھیجنا پڑے۔ لیکن جب تک کشتی نے پرائمری پاس کیا۔ بھابھی دو اور بچوں کو جنم دے چکی تھی۔ بھیّا نے محسوس کیا کہ اب کشتی کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اگر وہ اسکول جائے گی تو ماں سے گھر کا کام نہیں سنبھلے گا۔ انہوں نے کشتی کا اسکول جانا بند کروا دیا تھا۔ لیکن اس کا انہیں افسوس بھی تھا۔ بھیّا اکثر کہتے رہتے۔ کشتی کو اسکول سے ہٹا کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن کیا کیا جائے جب قسمت میں پڑھنا لکھنا نہ ہو تو رکاوٹیں اپنے آپ راستے میں حائل ہو جاتی ہیں خیر کوئی بات نہیں۔ غریب گھروں میں لڑکیوں کو پڑھاتا کون ہے۔ پھر کوئلہ کھودنے اور کاٹنے والوں کو اس کا خیال کب رہتا ہے؟

بھیّا اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اپنی مجبوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے بہت کچھ کہتے رہے۔ ایک دن جوش میں آکر انہوں نے کہا تھا۔ ارے منّے! تجھے ضرور پڑھاؤں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے بھی کوئلہ کاٹنے کے کام میں لگا دوں گا۔ تو تو کچہری کا بابو بنے گا۔ کام کرے گا۔

تب میں سوچنے لگا تھا۔ ایسا کیا ہماری قسمت میں ہے ۔؟ یہ اونچی نیچی ناہموار دھرتی جس کے سینے کو گینتیوں، گھن اور کوئلہ کاٹنے والی مشینوں نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ کیا ہم اس پر رہ کر خوبصورت سپنے دیکھ سکتے ہیں۔ جوں جوں وقت بیتا جائے گا دھرتی کی چھاتی کھوکھلی ہوتی جائے گی۔ ویرانیاں پھیلتی جائیں گی۔

بھابھی کو شروع ہی سے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ چہرا سوکھا اور ویران پیلے پتّے جیسا۔ آنکھیں بھی اندر دھنسی ہوئی۔ وہ گھر کا کام نہیں کر پاتی تھیں گھر سنبھالنا کشتی کی ذمہ داری تھی۔ کشتی ہی گھر کے لوگوں کے لئے کھانا پکاتی۔ کشتی ہی اپنے چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کرے۔ کوئی ضرورت کا سامان لانا ہو تو کشتی ہی راشن کی دکان پر جائے۔ سبزی والے سے سبزی لے۔ کشتی مجھے کچھ نہیں کرنے دیتی تھی۔ کہتی تھی چاچا تم کچھ مت کرو۔ میں سب کام کر لوں گی۔ اپنا وقت پڑھائی میں لگاؤ۔

گھر بھر کے لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ میں کسی طرح میٹرک پاس کر لوں۔ جب بھیّا کام سے تھکے ہارے گھر لوٹتے تو اُن کے چہرے کو دیکھ کر یوں لگتا وہ اپنا سارا خون پسینہ کالے پتھروں پر بہا کر آئے ہیں۔ وہ جو کما کر مجھ پر خرچ کرتے ہیں اُس کی ایک ایک پائی میں اُن کے خون پسینے کی بو رچی ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ادا کرنا میرا فرض بن جاتا ہے۔ اسی لئے کشتی ٹھیک ہی کہا کرتی تھی پڑھائی میں من لگانا چاہئے۔

ایک دن اچانک ہی بھیّا کی نظروں نے بھانپ لیا تھا کشتی جوان ہو رہی ہے۔ کشتی کے لئے انہیں کوئی لڑکا دیکھنا چاہئے۔ لیکن کون لڑکا پسند کرے گا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے جسم پر صرف شرافت کا گہنا ہے۔ کپڑے اور میلے کچیلے پہنتی ہے۔ جیسے بھیک منگی ہو۔

پھر زور سے فضا میں کہنے لگے تھے۔ "اس میں اس بیچاری کا کیا قصور۔ میں نے کھانے کو دیا ہی کیا ہے۔ جو اس کے تن پر گوشت چڑھے۔ میں نے کون سی قیمتی نفیس کپڑے پہننے کو لا کر دیئے ہیں۔ جس کے پہننے سے اس کا روپ نکھر آئے۔"

تب میں نے سوچا تھا۔ اگر میری کوئی نوکری ہوتی۔ میں کچھ کما رہا ہوتا تو کشتی کو ضرور نفیس کپڑے پہننے کو لا کر دیتا۔ لیکن کشتی کو شاید کپڑوں کا لالچ نہیں ہوگا۔ اور اگر ہوگا بھی تو اس نے منہ نہیں کھولا تھا۔

بھیّا ایکدم بہت پریشان ہو گئے تھے۔ بھابھی سے کچھ اُلجھے تھے۔ دیر بولے تھے۔ کشتی کو دکان پر سودا سلف لانے کے لیے مت بھیجا کرو۔ چنا لے آیا کرے گا۔ نل پر پانی کے لئے بھی مت بھیجا کرو۔ میں لے آیا کروں گا۔

رات کے وقت مجھے گھر سے باہر ایک طرف لے جا کر بولے تھے۔ ذرا دھیان تو رکھا کر۔ بدلو کا لڑکا کشتی سے چھیڑ خانی تو نہیں کرتا۔ اُسے ادھر مت آنے دیا کرو۔ رام سنگھا کن نے ایک دن باتوں باتوں میں اشارہ کیا تھا۔ لڑکی کا دھیان رکھا کرو۔ وہ بھی بال بچے دار آدمی ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ سن کر میرا خون کھول گیا تھا۔ اس سالے بدلو کے لڑکے کی گردن مروڑ دیتا۔ لیکن بھیّا نے منع کر دیا تھا۔ جھگڑا نامت۔ اس سے بدنامی ہو جائے گی۔" اس لئے خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ تب سے ایسا مجھے لگا تھا۔ کشتی ایک انمول موتی ہے۔ پرائی امانت جیسے قبضے، لاڈ پیار سے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ خیال میرے دل کو کریدنے لگتا تھا۔ ایک دن کشتی یہاں نہیں رہے گی۔ کسی دوسرے خاندان کی فرد بن جائے گی۔ اس کی غیر حاضری میں یہ گھر بہت سُونا سُونا لگا کرے گا۔ چھوٹے بھائی بہن کشتی کے بغیر اُداس رہا کریں گے۔ کون چھوٹی کشتی کو گود میں لے کر کوئلے کے اس پہاڑ کو دکھایا کرے گا جن میں رات کے وقت جلتی ہوئی آگ کے شعلے لپکا کرتے ہیں۔ اور دن کے وقت سفید رنگ کا دھواں اُٹھا کرتا ہے۔ کون ریت اور کوئلہ ڈھونے والی ٹرالیوں کی طرف اشارہ کرکے کہے گا۔ منی چپ رہ نہیں تو اس ٹرالی میں بٹھا دوں گی۔ ٹرالی تجھے ندی کے کنارے لے جائے گی۔ وہاں بھوت رہتے ہیں۔

بھوت تو بستی میں بھی رہتے ہیں۔ جن کے چہرے اندھیرے میں بہت بھیانک لگتے۔

"اس اندھیرے کا رنگ کالا تھا۔ جس کی سطح پر کوئلے کی دھول تیرا کرتی تھی۔

ایک دن قریب کی کولیری میں کام کرنے والے ہمارے ایک پھوپھا گھر آئے۔ ان کے ساتھ پھوپھی بھی تھیں۔ بڑے پیار سے کشتی کو گلے لگایا۔ چائے ناشتہ کے بعد وہ بھابھی اور بھیّا کو پاس بیٹھا کر باتیں کرنے لگے۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں راشن کی دکان پر راشن لانے چلا گیا تھا۔ جب لوٹا تو شام اُترنے کو تھی۔ پھوپھا پھوپھی اپنی بستی میں لوٹنے کو تیار تھے۔ بھیّا اور بھابھی اُن سے کہہ رہے تھے۔ ٹھہر جائیے۔ رات کا کھانا کھا کر جائیے گا۔

"نہیں! اندھیرا اترنے پر گھر نہیں پہنچ جا سکے گا۔ پھوپھی بولی۔ اب تو تیرے پھوپھا کی نظریں پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئیں ہیں۔

ایسا تو ہوگا ہی۔ کھدانوں میں کام کرنے والوں کی آنکھیں کب ٹھیک رہتی ہیں۔ بھیّا بولے۔ نظروں میں کمزوری آ ہی جاتی ہے

پھوپھا نے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ تو پھر کسی دن دونوں گھر آ جانا۔ ہو سکے تو کشتی کو بھی ساتھ لیتے آنا۔

کوشش کروں گا۔!

پھوپھی بولی جلدی آنا۔

ہاں آؤں گا۔ کہتے ہوئے بھیّا نے انہیں رخصت کیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد بھیّا مجھے اپنے ساتھ لئے سڑک کی طرف نکل آئے تھے۔ مدھوا کی چائے کی دوکان کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تیرے پھوپھا نے کشتی کے لئے لڑکا دیکھا ہے۔"

"کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے ... ؟ کتنی عمر ہے؟"

"ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ بچوں کا باپ ہے۔ جو آٹھ دس سال کے ہیں۔"

"وہ اپنی کشتی سے ضرور پندرہ سولہ سال بڑا ہوگا۔ بے تو پھر"

"کولیری میں کام کرتا ہے۔ اور نوکری بھی پکی ہے۔"

"پہلی بیوی نہیں ہے کیا ... ؟"

"مر چکی ہے ...!"

میں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ بھیّا اور بھابھی کے منہ سے سنا تھا۔ "وہ کشتی کو چاہے جہاں بیاہ دیں۔ لیکن کولیری میں نہیں بیاہیں گے۔" لیکن اب ....!

اندھیرے میں جھاڑیوں کے اُس پار کچھ دھواں دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا۔ جیسے دھرتی کے نیچے کی آگ اوپر اُٹھنے کو ہے۔ کھدانوں میں لگی ہوئی آگ رفتہ رفتہ اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ برسوں سے یہ آگ دہک رہی ہے۔ اس آگ کو سرد کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر بھیّا بولے۔ "کیا خیال ہے تمہارا....؟"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کشتی تو ابھی.....!"

"اسے کام کاج کرنے والے جلدی ملتے کہاں ہیں...؟"

میرا جی چاہا تھا! چیخ کر کہوں۔ "بھیّا جسے آپ لڑکا کہتے ہیں، وہ لڑکا نہیں۔ آدمی ہے۔ مکمل آدمی۔ اور کشتی ایک نازک پھول ہے۔ چھوٹی عمر ہے اُسکی۔ دھرتی پر لڑکیوں کا اکال ہے کیا....؟ ذات برادری اور کوئی ہے ہی نہیں....!"

بھیّا گھر کی حالت اور دیگر مجبوریوں کا ذکر کرنے لگے تھے۔ میں چپ چاپ سن رہا تھا۔

اُس دن بھیّا بھابھی اور پھوپھا پھوپھی نے کچھ غلط سوچا تھا یا صحیح میں کچھ کہنے کی حالت میں نہیں۔ بھیّا ایک مرتبہ پھر پھوپھا کی وساطت سے اُس دولہا لڑکے کو دیکھ آئے تھے۔ بھابھی جانے کی حالت میں نہیں تھی اُن کے پاؤں بھاری تھے۔ میں اپنے آپ کو بھیّا کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں کر سکا تھا۔

جب کوئی گہری نیند سو جائے تو رات اُس کے لئے بہت چھوٹی ہو جاتی ہے اور جاگنے والے کے لئے بہت لمبی۔ کشتی سو رہی تھی۔ اور ہم جاگ رہے تھے۔ بھیّا، میں اور گھر کے دیگر افراد بھی۔ بھابھی بھی شاید وارڈ میں سو رہی تھی۔ اس کی بغل میں لیٹا ننھا بچہ بھی۔

کشتی کیا صبح تک جاگ جائے گی؟ اگر نہیں تو پھر انتظار کیسا۔ اسپتال والوں نے ہمیں اُسے گھر لے جانے کی اجازت کیوں نہیں دی۔

ایمرجنسی کے انچارج نے کہا تھا، "وہ لاش کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کام سی۔ ایم۔ او۔ رپورٹ پڑھنے کے بعد خود کرے گا۔"

سویرے کا انتظار تھا۔

جب نزدیک ہاسپٹل سے چار کی گھنٹی کی آواز آئی تو بھیّا جیسے اونگھتے اونگھتے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "کیا سویرا ہو گیا....؟"

"چار بج رہے ہیں بھیّا" میں نے کہا۔

"جاؤ ایک مرتبہ گھر سے ہو آؤ۔"

"جاتا ہوں۔" کہتا ہوا میں بینچ پر سے اُٹھا۔ "آس پڑوس میں بھی خبر کر دوں گا۔ کچھ لانا بھی پڑے گا....؟"

"کیا لاؤ گے؟ صرف ایک چادر لیتے آنا۔ اور چارپائی بھی۔" کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر بھیّا کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔

بھیّا کو تنہا چھوڑ کر جانے کی طبیعت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن کام تو کرنا ہی تھا۔ میں بستی کی طرف جا رہا تھا۔ بن تلسی کے پھولوں کی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اسی سڑک سے ہو کر ایک راستہ ندی کی طرف جاتا تھا۔ جس کے پانی کا رنگ کالا ہے۔ جس کی سطح پر کوئلے کی راکھ تیرا کرتی ہے۔ یہاں چہار سو راکھ ہی راکھ تو ہے۔ میرے پاؤں تلے جیسے راکھ تپ رہی تھی۔ میں انگاروں پر چل رہا تھا۔ میرے کندھے پر کشتی کی لاش تھی۔

تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا جب گلی میں داخل ہوا، گھر کے سامنے پاس پڑوس کے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ ان میں چاچی بھی تھیں۔ چاچی مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی:

اُس دن صبح کے نو بج گئے۔ پھر بھی کشتی کو لے جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اسپتال سے خبر تھانے چلی گئی تھی۔ داروغہ صاحب کا انتظار تھا۔

گلی محلے سے ساتھ دینے کے لئے جو لوگ وہاں آئے تھے۔ وہ بھی اُوب اور پریشانی محسوس کرنے لگے تھے۔ دو چار کی ٹولی میں اِدھر اُدھر بیٹھے شاید کشتی کا چرچا کر رہے تھے۔

"بھیّا" جو بے حد نڈھال، اُداس اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ مری ہوئی نحیف آواز میں بولے۔ "چھوٹے ذرا پوچھو تو تھانے دار صاحب کب آئیں گے....؟"

"پوچھتا ہوں...!" میں سی۔ ایم۔ او کے کمرے کی طرف گیا۔ اُس کے اسسٹنٹ سے پوچھا "کیا ہم اپنی بچی کی لاش نہیں لے سکتے۔"

"اُس نے سوال کیا۔ کس بچی کی لاش...؟"

"کشتی کی.....!"

"وہ جو جل کر مری ہے"

"ہاں...!"

"کیا لاش ابھی تک نہیں ملی ہے"

"جی ہاں"

اسسٹنٹ نے فون اُٹھا کر نمبر ملایا اور چند لمحوں بعد کسی سے باتیں کرنے لگا۔ چار یا پانچ منٹ کے بعد بولا۔ "آپ باہر جا کر بیٹھیں۔ تھانے انسپکٹر صاحب چل پڑے ہیں۔ پانچ دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اُن کی اجازت کے بعد لاش آپ کو مل جائے گی۔"

جانے داروغہ کب آتا۔ لیکن اسسٹنٹ کی کوشش اور مہربانی سے تو وہ جلدی ہی پہنچنے والا تھا۔ میں نے بھیّا کو سب کچھ بتا دیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد داروغہ دو سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ گاڑی میں آیا۔ وہ ایک غیر متوازن جسم کا موٹا تگڑا آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر

کی کے کالا نمایاں تھے۔ پان چبانے کی وجہ سے اُس کے ہونٹ سُرخ اور دانت
لے نظر آرہے تھے۔ وہ سیدھے ایمرجنسی روم میں چلا گیا۔ انچارج سے کچھ
تیں کیں۔ اور اس کے بعد بھیّا کو اندر بلایا۔ بھیّا اتنے کمزور محسوس کر رہے
تھے کہ مشکل سے اُٹھ کر اندر گئے۔ میں نے سہارا دیا۔

چند لمحے ہم دروغہ صاحب کے سامنے کھڑے رہے۔ وہ شاید جلد یکا
پورٹ پڑھ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اُنہوں نے نظریں اُٹھائیں اور پوچھا۔ "یہ ہیرو سنگھ
کا نام ہے؟"

بھیّا بولے۔ "جی حضور۔۔۔ میرا۔۔۔؟"

"اور یہ ساتھ کون ہے؟" دروغہ نے میری طرف اشارہ کیا۔

"جی میرا چھوٹا بھائی۔۔۔!"

"بیٹھو۔۔۔!"

میں نے بھیّا کو سامنے کی کُرسی پر بٹھایا۔

دروغہ نے پوچھا "لڑکی کو آگ کیسے لگی۔"

بھیّا نے سارا قصہ بیان کر دیا۔

سب کچھ سن کر دروغہ بولا۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے لڑکی نے خود آگ لگا کر خودکشی کر لی ہو۔ کیا تم اُسے مارتے پیٹتے تھے۔ کیا گھر کے لوگ اُس سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔؟ اُس کا چال چلن تو ٹھیک تھا"

دروغہ کے یہ الفاظ سنتے ہی میرے جسم میں غصے کی لہر سی دوڑ گئی جی چاہا کہ اس کمبخت کے منہ پر ایک تھپڑ سا جڑ دوں۔

بھیّا بولے۔ "نہیں حضور میری لڑکی تو دیوی تھی۔"

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُسے کچھ کھلا پلا کر مار دیا گیا ہو۔ اور آگ سے جلنے کا بہانہ بنا دیا گیا ہو۔"

"حضور کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" بھیّا گمبھیر آواز میں بولے کوئی اپنی بیٹی سے بھی ایسا برتاؤ کرتا ہے؟"

"دُنیا میں اُس سے بھی بڑھ کر بہت کچھ ہوتا ہے۔ جو صحیح بات ہو ہمیں بتا دو۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں جی"

"تب تو لڑکی کا پوسٹ مارٹم کروانا ہی پڑے گا۔۔"

"نہیں حضور ایسا مت کیجیے۔ اُس کا کیا پوسٹ مارٹم کروائیے گا وہ تو جل گئی ہے۔ ہم غریب سہی لیکن عزت دار آدمی ہیں۔ اس سے نہ صرف لاش خراب ہو گی بلکہ ہماری عزت بھی چلی جائے گی۔ ذات برادری میں ہم بدنام ہو جائیں گے۔ ہم اپنی بیٹی کا خون اپنے ہاتھوں سے کیسے کر سکتے ہیں۔؟"

"قانون جو کہتا ہے وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ چچا جو برآمدے کی بینچ پر سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنہیں سب کچھ بتا دیا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اُٹھے۔ برآمدے میں کھڑے کھڑے رشتے کے ایک بزرگ کو آواز دی۔ میں پھر واپس ایمرجنسی روم میں آگیا۔

"لڑکی کی شادی ہو گئی تھی کیا۔؟"

"بات چیت چل رہی تھی۔" بھیّا نے جواب دیا۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں لاش دیکھ کر آتا ہوں۔" کہتا ہوا دروغہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

چچا بزرگ کو ساتھ لیے ایمرجنسی روم میں داخل ہوئے۔ پوچھنے لگے کیا بات ہے؟

بھیّا نے سب کچھ بتا دیا۔

بزرگ کہنے لگے۔ "چاہے جیسے ہو لاش کی چیر پھاڑ نہیں ہونی چاہیے اس سے پریشانی اور بڑھ جائے گی۔ شہر جانا پڑے گا۔ خرچہ بڑھے گا اس سے تو اچھا ہے کہ یہیں کچھ خرچ کر دیا جائے۔ میں دروغہ سے بات کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

چچا نے بھیّا سے پوچھا۔ "تمہارے پاس روپے ہیں؟"

بھیّا بولے "نہیں۔"

پھر چچا اُس بزرگ کے پیچھے چلے گئے۔

بھیّا نے مجھ سے پریشان سے لہجے میں کہا۔ اب کیا ہوگا چھوٹے:
لاش کی قیمت چکائے بنا لاش نہیں ملے گی بھیّا۔"

پندرہ بیس منٹ بعد دروغہ پھر اُس کمرے میں آگیا۔ چچا اور بزرگ بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دروغہ نے انہیں دروازے پر ہی روک دیا۔ اور سوال کیا۔ "تمہیں پورا یقین ہے کہ لڑکی نے خود اپنے آپ کو آگ نہیں لگائی؟"

"میں ایشور کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔"

"ثبوت۔۔۔؟"

بھیّا کرتے کی آستین سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگے۔ منہ سے کچھ بولے نہیں۔ پھر دو منٹ بعد اپنے کالکھ لگے کرتے کی جیب سے

باقی صفحہ ۵۷ پر دیکھیے




بلراج ورما

۴۲۔ڈی پاکٹ III میور وہار۔ دہلی ۵۱۰۰۱۱


# بمبئی

## چند مناظر۔ چند منی کہانیاں

یہ بمبئی ہے پیارے
بمبئی!
مملکتِ ہند کا سب سے ممتاز شہر۔
یہاں آدمی کی تقدیر ایک پان کے پتے کے نیچے دبی رہتی ہے۔
پتہ اُڑا اور تقدیر جاگی۔
بڑا دلدار شہر ہے بمبئی
چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو قسمت ایک ایسی وزنی سِل کے
نیچے دبی رہتی ہے جسے مقدروں کے دیوتا خود ہی اٹھادیں تو بات
بنتی ہے۔

۱

یہ سب ٹھیک ہے بھائی مگر تم کیا ہو؟ اور کون ہو؟
بمبئی!
بمبئی؟ یہ تو کوئی نام نہ ہوا
ظاہر ہے کہ تم اِدھر نئے ہو۔ اور
پنجاب کا کوئی چھوٹا موٹا گاؤں یا قصبہ ہو
کبھی میں خود بھی تمہاری ہی طرح ایک معصوم گاؤں تھا۔
مگر اب نہیں
اب میں بمبئی ہوں
بمبئی ہوئے بغیر بمبئی میں جینا مشکل ہے
تم مسکرا رہے ہو، تم بمبئی کو نہیں جانتے، اسی لیے
جانتے ہوتے تو یوں اِس طرح خودکشی کا نہ سوچتے
اِدھر آئے تو تمہیں ابھی دو تین مہینے بھی نہیں ہوئے شاید؟
لوگ بمبئی میں بھی مرتے ہیں۔
مگر تمہاری طرح نہیں۔

وہ دوسروں کو مارتے ہیں۔ یا پھر
دوسروں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔
یہ مقدروں کے سوداگروں کی آماجگاہ ہے پیارے
اس شہر کے باسیوں نے
مقدروں کے دیوتاؤں سے
اپنی تقدیروں کی لگامیں چھین لی ہیں۔ اور
اب خودمختار ہو گئے ہیں۔
اب اُس سیٹھ گھنشام داس ہی کو لو۔
بیس برس پہلے ہاتھ میں ایک حقیر سا لوٹا تھامے
ایک فقیر کی طرح مختصر سے لنگوٹ میں مرد کی شرم چھپائے
اس شہر میں وارد ہوا تھا۔
آج دس بڑی بڑی ملوں، دو ہوٹلوں اور تین سینما گھروں
کا واحد مالک ہے
لوٹا لنگوٹ والی بات تم نے خوب کہی
اور وہ پان کے پتے والی بات بھی
پان کا پتہ، لوٹا اور لنگوٹ بھارت کی قدیم سبھیتا
کے سمبل ہیں پیارے
جانے آج کا بھارتیہ کیوں بھول گیا ہے۔
اپنی میراث،
اپنی شناخت

۲

نیتا نے کہا
تم عوام ہو
جنتا جناردن

ڈیموکریسی۔ جمہور پر معاشرے کے عوام
قوم کی سب سے بڑی طاقت۔
تم ہندوستان کا ضمیر ہو
دراصل تم ہی ہندوستان ہو
تم اس ملک۔
اِس برِ صغیر
کے معمار ہو
اُس کی آتما اس کا مقدر اور مستقبل ہو
پھر نیتا نے بلند آواز پوچھا۔

یہ محل، یہ فلک بوس عمارتیں، یہ کشادہ سڑکیں۔ یہ بجلی کے قمقمے۔ یہ وسیع و عریض باغات، پارک اور کھیلوں کے میدان کس نے بنائے ہیں؟

"ہم نے" جنتا کا نعرہ اتنا ہی بلند تھا۔
تو پھر یہ کس کے ہوئے؟
"ہمارے" دوسرا نعرہ بھی اتنا ہی پُر جوش تھا۔
"یہ شہر ہمارا ہے" تیسرا نعرہ سمندر کی لہروں کی طرح ہی جوشیلا تھا۔

تو آؤ سب مل کر کہیں
یہ ملک ہمارا ہے۔
یہ بھارت،
یہ ہندوستان۔

اور وہ جھومنے لگے اور ایک آواز ہو کر گانے لگے۔ اقبال کا وہ مرثیہ
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔
ہم بلبلیں ہیں اس کی ......"

بہت ہو گیا۔ آؤ چلیں۔
کہاں؟
اپنے اپنے گھر، تم نے پڑھا نہیں شیکسپیئر کا وہ قول۔

بھیڑ باہر نکل پڑے تو خدا اندر چھپ جاتا ہے۔ یہ بھیڑ چھٹنے ہی والی ہے۔

راجندر سنگھ نے کرشن، سعادت اور فکر کی جانب حقارت سے دیکھتے ہوئے تھوک دیا۔

پان کی پیک جو جلسے کے دوران جگالی کرتے ہوئے اس کے منہ میں جمع ہو گئی تھی۔

کچھ ایسی طرح اُچھلی سے چھینٹی سردار تنجادر نے گھنشیام داس سرکی کی پیلی نیم پلیٹ ایکدم سُرخ ہو گئی۔

"سالا حرامی"

کرشن مُسکرایا۔ گھنشام سیٹھ کی دھمکی میں سرشار سالا ہمیں ورغلانے آیا تھا۔

"سالا حرامی"

سعادت بولا۔ ورغلانے نہیں۔ ہمیں بتانے آیا تھا۔ پیارو کہ یہ زمین و آسمان، یہ سڑکیں اور گلیاں اور یہ بے محابا ادھر سے اُدھر بھاگتی ہوئی بسیں اور ریل گاڑیاں سب کی سب ہماری ہیں۔

فکر نے جملہ پورا کیا۔ "ماسوائے ان معزور عمارتوں اور ان کے سامنے بھی کھڑی ان رنگ برنگی کاروں کے"

نیتا حرامی نہیں تھا۔ وفادار تھا اپنے مالکوں کا۔
اُس کی تقریر میں نمک حرامی کی نہیں
وفاداری کی باس تھی۔

سالے حرامی تو ہم سب ہیں جو اس چھٹی کے دن بھی
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے
اس مداری کا تماشہ دیکھنے چلے آئے ہیں

مگر یار فکر کمبخت کو خواب بانٹنے بیچنے کا سلیقہ آتا تھا۔ تم ہوتے تو کیا کرتے؟

"اپنی بنائی ہوئی اُن بلند و بالا اور مغرور عمارتوں سے ہٹ کر
چپ چاپ پڑے لیٹے رہو
تقدیروں کے جال بنو۔ تاکہ جب تقدیریں جاگیں تو تدبیروں پر عمل ہو سکے۔

اپنے اندر خود اپنے دم سے خواب دیکھنے کا سلیقہ پیدا کرو"

فٹ پاتھوں پر بکھری پڑی مردہ لاشیں کیا خواب دیکھیں گی۔ راجندر نے باقی ماندہ پیک بھی تھوک دی۔

خواب ان عمارتوں کے مکینوں کا نہیں۔
ہمارا بھی حق ہے۔

باقی صفحہ ۵ پر دیکھئے



مسیح انجم
سی-۲-۵، این، جی، او، ایس، کالونی، وناس تھالی پورم حیدرآباد

# مردوں کی شمشیریں

یہ راکٹ کا دور ہے۔ راکٹوں کے اس دور میں شمشیروں کا کیا کام؟

چنانچہ تاریخی شمشیروں کو میوزیموں میں سجا دیا گیا ہے۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت مورخ کے کام آئے۔ اب یہ شمشیریں مورخ کے انتظار میں لیٹی لیٹی زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک کوئی چیز زنگ آلود یا پرزے پرزے نہیں ہو جاتی اس کا آثار قدیمہ ہونا مورخ کی نظر میں مستند قرار نہیں پاتا۔ ہاں تو ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ آج کل شمشیر کا جلوہ عام نہیں ہے۔ البتہ کبھی کبھار کسی تھیٹر کے اسٹیج پر اس کا دیدار عام ہو جاتا ہے جب کہ کوئی تاریخی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو۔ لیکن وہ شمشیر اصلی نہیں بلکہ کاغذی یا ٹین کی بنی ہوتی ہے تاکہ اس کو گھماتے وقت مہاراجہ کے ہاتھ میں موچ نہ آنے پائے۔ اور ویلن پر وار کرنے میں بڑی سہولت بھی ہو۔ اور وہ اس وار کی تاب بھی لا سکے، بلکہ مقدور ہو تو ایک اور عنایت ہو!" عرض کر کے اگلے وقتوں کے ناظرین تو اس قسم کے سین پر "ونس مور" کہا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں ویلن کو پھر ایک بار اٹھ کر یعنی زندہ ہو کر زخم سہنا پڑتا تھا۔ اور پھر مہاراج کے تلوار گھمانے پر اسٹیج پر شہید ہو کر بتانا پڑتا تھا۔

ڈرامہ کے ذکر پر ہمیں کالج کے زمانے کے مرزا صاحب یاد آ گئے جو کالج کے ایک ڈرامہ میں شیطان کا پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اور نماز کے پابند بھی تھے۔ ایک بار موصوف عین ڈرامہ کے آغاز پر کہیں غائب ہو گئے۔ چنانچہ ان کی تلاش بڑی تیزی سے شروع کر دی گئی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک شخص دوڑا دوڑا ڈائرکٹر کے پاس آیا اور ہانپتا ہوا بولا "فکر کی چنداں ضرورت نہیں۔ شیطان مل گیا ہے۔ اور وہ اس وقت کالج کے ورانڈے میں مغرب کی نماز پڑھ رہا ہے!"

بات شمشیر کی ہو رہی تھی۔ لیکن درمیان میں اسٹیج اور ڈرامہ کی [illegible]

جب مرد دنیا کے اسٹیج پر سن شعور کو پہنچ کر عملی زندگی میں قد رکھتا ہے تو اسے سخت جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اور اس جد و جہد کے دوران اس سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ جب کہ و ایک عورت کو بیاہ کر لے آتا ہے۔ ویسے قدرت کا قانون بھی یہی ہے کہ مرد غلطی کرے!—

ع۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اگر مرد غلطی نہ کرتے (یعنی شادیاں نہ کرتے) تو ہر طرف بیچلرس ہی بیچلرس نظر آتے۔ نتیجتاً ساری دنیا "بیچلرس کوارٹرس" کا نمو بن جاتی۔ اور تجرد گاہ کے نام سے موسوم ہوتی!

مرد کی عملی زندگی کے مطلع پر عورت بیوی کے روپ میں گھونگھٹ ڈالے نمودار ہوتی ہے۔ دراصل گھونگھٹ کے اندر بیوی نہیں بلکہ نیا میں رکھی ہوئی شمشیر ہوتی ہے۔ زندگی کا یہی وہ موڑ ہوتا ہے جہاں سے مرد کو شمشیر سے پالا پڑتا ہے۔ یہ شمشیر دو دھار والی بھی ہو سکتی ہے اور ایک دھ والی بھی چھپے والی بھی ہو سکتی ہے۔ اور نیام میں بند رہنے والی بھی۔ غرض ان تمام باتوں کا انحصار مرد کے برتنے اور مزہ چکھنے پر ہے۔ اور جو مرد شمشیر کو برتنے کا ہنر جانتا ہے وہی مرد شمشیر جنگ کہلانے کا مستحق بھی ہو ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف تلوا کا نام، اس کی کاٹ، بناوٹ، صلاحیت اور کارکردگی کی مناسبت رکھا کرتے تھے۔ اس طرح انواع و اقسام کی تلواریں وجود میں آتی گئیں۔ یہاں ہم تلواروں کے ناموں کی مناسبت سے مردوں کی شمشیروں عرف بیویوں کے پیکر تراشتے ہیں۔

شمشیر پیکر —— شمشیر پیکر بیوی سیدھی بھی ہو سکتی ہے اور ٹیڑ [illegible]

کی غلطی نہ کرے۔ بلکہ وہ خود بھی شمشیر زن جاگ جائے۔ شمشیر پیکر بیوی چاہے سیدھی ہو یا ٹیڑھی لگ رہی ہو بڑی تیز دھار قسم کی وہ جب تن کر کھڑی ہو جاتی ہے تو مرد کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ شمشیر پیکر بیوی کی موجودگی میں شوہر نامدار ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ جو مرد کسی خاص ماہ کی پہلی تاریخ کو چاند دیکھ کر شمشیر کو دیکھنا پسند کرتے ہیں ایسے مردوں کیلئے شمشیر پیکر بیویاں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شمشیر پیکر بیوی کی موجودگی میں چاند کو دیکھنے کے بعد شمشیر کو دیکھنے کے لئے شوہر کو کسی میوزیم تک جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ بس ادھر مطلع پر چاند کو دیکھ لیا اور پھر پلٹ کر بیوی کی ایک جھلک دیکھ لی۔ بیوی کی بیوی! شمشیر کی شمشیر! لیکن اس میں ایک مجبوری بھی حائل ہے۔ فرض کیجئے کہ ادھر آپ مطلع پر چاند کو دیکھ رہے ہوں اور ادھر آپ کی شمشیر پیکر اہلیہ رسوئی گھر میں آٹا گوندھ رہی ہو۔ تو اس کے میک اپ کر کے آنے تک نہ صرف چاند بلکہ چاند رات کے گزر جانے اور تاریخ کے بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

## فیل پیکر

بھاری بھرکم تن و توش رکھنے والی بیوی فیل پیکر کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کا ڈیل ڈول ملاحظہ فرمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی بیوی کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا — حتیٰ کہ شوہر نامدار بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ چوں کہ وہ اپنے ساتھ بھاری بھرکم جہیز لاتی ہے اس لئے شوہر اسے برداشت کر لیتا ہے۔ (کر لیتا ہے کیا، کر لینا پڑتا ہے) اس سلسلے میں ایک نوجوان کا قصہ بڑا تعجب انگیز ہے۔ جس نے بھاری بھرکم جہیز کے لالچ میں پڑ کر ایک فیل پیکر سے شادی کی تھی۔ شادی کی رات کو جب اس نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو فیل پیکر کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ صبح ہوئی تو دلہن نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"اجی! میں کس کس کے سامنے نکلوں اور کس سے پردہ کروں؟"

شوہر جل کر بولا۔ "سب کے سامنے نکلو! صرف مجھ سے پردہ کرو!"

پچھلے چند برسوں سے اونچے گھرانوں میں فیل پیکر بیویوں کا تناسب کچھ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کا تناسب بڑھے یا گھٹے۔ لیکن یہ ہوتی ہیں بڑی خوش مزاج۔ یہ خوش مزاجی دراصل ان کی اپنی مجبوری بھی ہوتی ہے ان کا بھاری بھرکم وجود ان کو خوش مزاجی کا سبق سکھلاتا ہے۔ اسے بیٹھنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں تو اٹھنے میں آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی خوش مزاجی کے بل بوتے پر اپنے شوہروں سے گھر کا سارا "ہینڈلنگ ورک" کرواتی ہیں۔

## پری پیکر اور حور پیکر

پری اور حور — چوں کہ ایک ہی شعر کے دو مصرعے کی مانند ہیں اس لئے ہم ان کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہیں۔ پری اور حور کا وجود تو دنیا میں ہے ہی نہیں۔ دراصل یہ ساری آگ شاعروں اور رومانی ناول نگاروں کی لگائی ہوئی ہے۔ ایک شاعر نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ حور پیکر دوشیزہ کو دیکھ کر چاند شرماتا ہے اور پری پیکر دوشیزہ کو دیکھ کر کلی کھلنا سیکھتی ہے۔

ہمارے بعض رومانی ناول نگار تو پری پیکر اور حور پیکر دوشیزاؤں کے حلق کی پان کی لالی تک دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ گویا گوشت کا بنا ہوا حلق نہ ہوا بلکہ ٹرانسپرنٹ شیشہ ہوا! اس قسم کے کرداروں کے ناول پڑھ کر بھولی بیوی اپنے آپ کو پری پیکر اور حور پیکر تصور کرنے لگتی ہے۔ لہٰذا وہ سسرال میں فساد کی جڑ قرار پاتی ہے۔ پری پیکر اور حور پیکر بیوی پر ہمہ شہ نرگسیت طاری رہتی ہے۔ اس کو آئینہ اور بناؤ سنگار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔

## اژدھا پیکر

جس عورت کی زبان گز بھر کی ہوتی ہے۔ وہ اژدھا پیکر بیوی کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کے آگے کسی ایک کی نہیں چلتی۔ اس کو بول کر مکر جانا بھی خوب آتا ہے۔ یہ اپنے شوہر کو دب کر رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شوہر پر برا وقت آن پڑنے پر اس کو پس پشت ڈال کر خود آگے بڑھ جاتی ہے۔ ایسی بیوی کو الیکشن کے موقع پر کسی سیاسی پارٹی کا ٹکٹ دے کر سیاست کے میدان میں اتارا جا سکتا ہے۔ چوں کہ اژدھا پیکر بیوی کی زبان ہمیشہ چلتی رہتی ہے اس لئے شوہر کو محض مفاہمت کے طور ہمیشہ مسکراتے رہنا پڑتا ہے۔ اور یہ عادت اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے کہ وہ سوتے میں بھی مسکراتا رہتا ہے۔

## سیماب پیکر

جس عورت کے جسم میں بے پناہ لوچ ہو ایسی بیوی سیماب پیکر کہلاتی ہے۔ سیماب پیکر بیوی کا قدم سسرال میں ٹکتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی سسرال میں ہمیشہ ایک ٹانگ پر کھڑی رہتی ہے۔ اور وہ اس وقت تک اسی پوزیشن میں کھڑی رہتی ہے جب تک کہ میکے سے بلاوا نہیں آتا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ سفر اور سیاحی میں گزرتا ہے۔

سیماب پیکر بیوی کا شوہر ہمیشہ قلاش رہتا ہے۔

بیوی چاہے پری پیکر ہو یا فیل پیکر — بہرحال بیوی ہوتی ہے۔ اور گھروں میں بیویوں ہی کا سکہ چلتا ہے۔ چاہے کھرا ہو یا کھوٹا!

ع۔ جہاد زندگی میں، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں ✿



امراؤ طارق

اے-۱۴۱، بلاک ۱۳-ڈی، گلشن اقبال، کراچی-۴۷ (پاکستان)

# قیدِ مسلسل صیدِ مسلسل

چھ ستمبر کی تعطیل تھی سید امراؤ علی ابھی دفتر پہونچے تھے طبیعت مکدر تھی اور ہمیشہ کی طرح چھٹی کے دن دفتر آنے کی کوفت نے اُن کا بلڈ پریشر بڑھا دیا تھا اور وہ مسلسل سرکاری ملازمت کو کوس رہے تھے۔ رات مجلس بھی دیر سے ختم ہوئی تھی۔ شہدائے کربلا کے ذکر، بے گور و کفن لاشوں پر بیدائیوں کے بین، پیاس سے نڈھال بچوں کی بے بسی سنتے ہوئے تیروں کے سائے میں پانی سے بھرے مشکیزے کو پیٹھ کی ڈھال بنا کر خیموں میں منتظر پیاسوں تک پہونچانے کی سعی، تپتی ہوئی ریت پر اہل بیت کے خون کی لکیریں اور افواج شمر کی بے حسی نے سید امراؤ علی کو گزشتہ رات رلا رلا کر نڈھال کر دیا تھا اور آنکھوں میں اس وقت بھی تنکے سے چبھ رہے تھے لیکن اوپر سے آئی ہوئی فہرست کے مطابق قیدیوں کو آج ہی چھ ستمبر کی خوشی میں رہا کرنا تھا

"طاقت کا توازن ہمیشہ ظلم کے حق میں رہا ہے۔" سید امراؤ علی نے سوچا۔ اور ہم جب بے رحمی سے کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں اُسی فیاضی سے شہید کا لقب بھی عطا کر دیتے ہیں۔ اور عیب کو ہنر کی طرح قبول کر لیتے ہیں۔ آج بھی ظالم انصاف کے نام پر منھ سے نوالے چھین لیتے ہیں۔ اور بس کنڈکٹر گیٹ پر لٹکی ہوئی کالج جانے والی لڑکیوں کے لمس سے استفادہ کرتے ہیں اور ہم اپنی بزدلی کو جاہلوں کے منھ نہ لگنے کا نام دے کر کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ ہم تو مرچکے ہیں۔ کیا قید۔ کیا آزاد۔ سب مصلحتوں کی حراست میں ہیں اور گول کی روٹی کے تحفظ کے لئے سرگرداں ہیں۔ ہم حسین کا ماتم صرف اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ ہماری سینہ کوبی کا سبب یہ بھی ہے کہ کربلا ہمیشہ جاری ہے اور بس کے گیٹ پر بے بسی سے لٹکی ہوئی سکینہ کنڈکٹر کے نیزوں کی زد میں ہے۔ اور حق کی آواز کے لئے سارے کان بند ہیں۔"

سید امراؤ علی نے سوچتے سوچتے اوپر سے آئی ہوئی فہرست اپنے اسسٹنٹ کے ہاتھ سے لے لی اور اُن کے جسم میں ایک خوشگوار سی لہر دوڑ گئی۔ قیدیوں کو قید کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی رہا کر دینا بالکل اس طرح کا عمل ہے جیسے بچہ پنجرے میں بند پرندے سے کھیلتے کھیلتے خوش ہو کر پنجرے کی کھڑکی کھول کر پرندے کو اڑا دے اور دیر تک اُسے فضا میں اُڑتا ہوا دیکھتا رہے۔

"آزادی بڑی نعمت ہے" سید امراؤ علی نے اپنے نائب سے کہا اور اوپر سے آئی ہوئی فہرست اُس کے بے تاثیر چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے بڑے جوش سے بولے۔

"اور یہ روزمرہ دہرائی جانے والی محاورہ نصیحت نہیں ہے۔ بڑی بہت بڑی آفاقی حقیقت ہے۔"

پھر دونوں قیدیوں کی طرف چل دیئے۔

"جرم و سزا کی کہانی بڑی پرانی اور بہت پیچیدہ ہے۔ آدمی کبھی مظلوم اور کبھی ظالم نظر آتا ہے۔ اس کے دو بہت واضح چہرے ہیں ایک ظالم کا چہرہ دوسرا مظلوم کا۔ اور ساری انسانیت یہی دو چہرے پہچانتی ہے۔ آدمی جب موسموں کی شدت سے محفوظ رہنے کے لئے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپتا تھا تب بھی ظالم تھا۔ اور جب اُس نے زرہ بکتر پہنی تب بھی مظلوم تھا۔ جب اُس نے درندوں سے دفاع کے لئے پتھر کے ہتھیار بنائے تب بھی ظالم تھا جب ملوکیت کے لئے میزائیل استعمال کئے تب بھی مظلوم تھا۔ انسان ہمیشہ آنے والے کل سے خائف رہتا ہے۔ اُس نے معاشرہ بنایا۔ قوانین بنائے۔ ظالم بنائے مظلوم بنائے۔ جرم بنائے اور سزائیں بنائیں۔ جیلیں بنائیں اور انہیں توڑنے والے بنائے۔ کمیٹیاں سوچیں اور کتابیں لکھیں۔ اخلاق وضع کئے اور عصمتیں لوٹیں۔ اور سولیاں کھڑی کیں اور اُن پر انسانوں کو چڑھا دیا اور دیواریں اونچی اور آزادیاں سلب کر لیں اور بلال تعمیر بنائی اور شفاخانوں پر بم گرائے اور سجدے کئے اور جنت کے خواب دیکھے اور مذہبی کتابوں میں لکھی ایک ایک سطر کو

اور راستہ بھول گیا۔

سید امراؤ علی سوچ رہے تھے اور رہائی پانے والے قیدیوں کی فہرست اُن کے ہاتھوں میں پھڑپھڑانے لگی۔ اُن کے اسسٹنٹ نے بالآخر پہلا قیدی اُن کے سامنے پیش کیا۔

"سر یہ پہلا قیدی"

"نام" سید امراؤ نے فہرست میں نام دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بانے نام ہی جی میرا"

"سر یہ دفعہ ۳۲۵ کا سزا یاب ہے اس نے ڈنڈا مار کر مدعی کی ہڈی توڑ دی تھی۔"

"آئندہ اپنے غصے پر قابو رکھنا" سید امراؤ نے آزاد ہونے والے قیدی کو تنبیہ کی۔

"جناب اُس نے میری بیٹی کا کالج جانا دوبھر کر رکھا تھا۔ پھر مجھے سزا ہو گئی اور وہ میری بیٹی کو اغوا کر کے لے گیا۔" میرا کوئی نہیں تھا جو میری بیٹی کی آبرو کا محافظ بن کر کھڑا ہو جاتا۔"

"ظالم کالج جانے والی لڑکی کو اغوا کر لیتے ہیں۔ اور اُن کو، روکنے والے قید کی صعوبتیں برداشت کر لیتے ہیں۔" میزان کوئی نہیں" سید امراؤ چپ چاپ سوچتے رہے پھر بولے۔

"تم نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر غلطی کی تھی۔"

"اور جو وہ میرے منہ پر تھوک گیا۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں صبر کرو۔ جاؤ تم آزاد ہو"

"دوسرا قیدی سر" اسسٹنٹ نے ایک اور قیدی پیش کیا۔

"نام"

"سرفراز" سید امراؤ علی نے فہرست دیکھی اُس کا نام بھی موجود تھا۔

"سر اس نے نلکے پر پانی کے لئے قطار میں لگے ہوئے برتنوں کو ہٹا کر زبردستی اپنا برتن سب سے آگے لگایا اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بلوا کیا اور زبردستی پانی حاصل کیا۔"

"بھائی پانی کے لئے لڑتے ہو" سید امراؤ نے بڑے رسان سے کہا۔

"انہوں نے تین دنوں سے میرا پانی بند کر رکھا تھا۔ میرے بچے پیاسے تھے پھر میں کیا کرتا۔"

"تم اب آزاد ہو جا سکتے ہو۔"

"یہ تیسرا قیدی سر"

"تم کو رہا کیا جاتا ہے۔"

"چوتھا قیدی سر"

"تم کو بھی رہا کیا جاتا ہے"

"پانچواں قیدی"

"تم بھی آزاد ہو"

"چھٹا قیدی"

"تم بھی آزاد"

"ساتواں"

"تم بھی"

"آٹھ"

"نو"

فہرست کے سارے نام ختم ہوئے۔ سب رہا ہو گئے تو سید امراؤ علی کے سامنے ایک نحیف بوڑھا چہرے پر صدیوں کی گرد کا ملال لئے ہوئے کھڑا تھا۔ فہرست ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے دئے گئے سارے نام پکارے جا چکے تھے۔

"اب کوئی قیدی رہائی کے لئے باقی نہیں سر۔ اوپر سے آئی ہوئی فہرست کے تمام قیدی رہائی پا چکے۔ یہ تو سیاسی قیدی لگتا ہے۔" سید امراؤ کے اسسٹنٹ نے وضاحت کی۔

سید امراؤ نے اپنے اسسٹنٹ کی وضاحت سنی پھر بھی صدیوں کی گرد کے ملال لئے ہوئے خاموش کھڑے قیدی کے سامنے آ گئے۔

"تمہارا نام کیا ہے" سید امراؤ نے پوچھا۔ بوڑھے نے سید امراؤ کو اس طرح دیکھا جیسے نام پوچھنے پر حیران ہو۔

"نام بتاؤ" سید امراؤ نے پھر سوال کیا۔

"سجاد — سجاد ہے میرا نام"

نام سنتے ہی سید امراؤ کے کانوں میں کربلا کے ریگزاروں کی جھلس دینے والی ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگیں، انہیں ایسا لگا جیسے کمانوں سے نکلے ہوئے تیر اب بھی فضا میں تیر رہے ہیں۔ نیزوں پر سر بلند ہیں اور پانی پر پہرے ہیں۔

تم اب تک تاریخ کے زنداں میں قید ہو سجاد۔ آج تک۔ اور آج بھی جو فہرست اوپر سے آئی اُس میں تمہارا نام نہیں ہے سجاد۔ تمہارے لئے کبھی کوئی فہرست نہ آئے گی!" سید امراؤ کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ۞



قمر جہاں
لکچرار شعبۂ اردو، سندرتی مہیلا کالج، بھاگلپور (بہار)

# چاند نگر کے نواسی کے نام

انہوں نے اپنی شناخت کے تمام نقوش مٹانے شروع کردئے تھے۔ نہ معلوم یہ ان کی دانشوری تھی یا دماغی خلل؟

کوئی اہم واقعہ تو ہوا نہیں تھا بات بڑی معمولی سی تھی لیکن یہاں تو رائی کو پہاڑ بنا دینے کی عادت پرانی ہے۔

اس دن بھی تو معمول کی طرح معصوم بچے ہنستے مسکراتے ہوئے اسکول کی بسوں پر سوار ہو کر اسکول گئے۔ مرد اور کام کرنے والی عورتیں اپنے اپنے دفتروں کو گئیں۔ بازار میں ہر دن کی طرح چہل پہل تھی کہ بیچ چوک بازار سے چیخ وپکار کی دہشتناک آوازیں بلند ہونے لگیں۔ دوکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گرنے لگے۔ دفتر اور کارخانے چھوڑ کر لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف سرپٹ بھاگنے لگے ——— بارود کی بو سے چاند نگر کی خوبصورت فضا دیکھتے دیکھتے مکدر ہوگئی . . . . . پھر یہ سلسلہ معمول بن گیا۔ آدم ہی آدم کے خون کا پیاسا بن چکا تھا۔ انسانیت کا یہ ننگا ناچ پہلے بھی اس نگر میں اکثر ہوا تھا۔ لیکن اس قدر بھیانک انداز میں نہیں ——— سڑکیں ویران ہوتی چلی گئیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کئے ہوئے چوہوں کی طرح بل کی تلاش میں تھے۔ بچوں اور عورتوں کی ہنسی کی جگہ اب ہر وقت بندوق اور مشین گن کی ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ ہر شخص دن کے اجالے میں بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ شروع میں تو صرف رات کے سناٹے میں بھیانک چڑیلیں ان کے ناموں کا ورد کرتی اور جب وہ دروازہ کھولتے تو آدم خور انہیں نگل جاتے لیکن آہستہ آہستہ دن کے اجالے میں بھی جب یہی عمل ان پر دہرایا جانے لگا تو وہ لوگ سخت ہراساں ہوگئے۔ زندگی تو ہر حال میں ہر ذی روح کو عزیز ہے۔ خواہ وہ چوہے کی طرح بل میں سر چھپا کر ہو یا شیر کی طرح سینہ تان کر۔

ناساعد حالات سے تنگ آکر ایک روز ان لوگوں نے رات کی خاموشی میں خفیہ میٹنگ کی۔ ان کے ایک دانشور نے نہایت فکرمند لہجہ میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

اس نگر کے تمام مکانات تو ایک جیسے ہیں، ہم نے ہنگامے کے پہلے ہی دن اپنے اپنے گھروں کی نیم پلیٹ بھی اکھاڑ پھینکی، پھر وہ کون سی ایسی پہچان کی صلیب ہے جسے وہ دن کے اجالے میں آویزاں کر دیتے ہیں۔ اور رات کی تاریکی میں شناخت کے انہیں نشانات کے سہارے ہمارے گھروں کا پتہ لگاتے ہیں اور ایک دم صحیح مقام پر پہنچ کر درندگی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں۔

دوسرے نے جواب دیا ———

"واہ بھئی! مکانوں کی یکسانیت سے شخصیت کی انفرادیت ختم نہیں ہوسکتی۔ شخصیت کے مادی عناصر کو مکان کے در و دیوار اور رنگ و روغن میں چھپایا نہیں جا سکتا۔ ہماری اپنی منفرد پہچان ہے جو ہماری اپنی شخصیت کا خاصہ ہے ———"

"تو کیا ہیں ——— ؟"

"تو اور کیا . . . . ؟" کسی نے تائید کی ——

اکثریت اس فیصلے کے حق میں نہ ہوتے ہوئے بھی مجبور تھی۔ کیونکہ ان کے دانشوروں اور رہنماؤں کا خیال تھا کہ یہاں رہنا ہے تو پھر ایک ہی پلیٹ فارم پر آکر جینا ہوگا۔

روز روز کے خون خرابے سے وہ بالکل معطل ہو چکے تھے ان کے سامنے زندہ رہنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ کیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس پر فریب راہ کو اپنالیں؟ کیا ان کے جینے میں حقیقتوں اور سچائیوں کی جگہ صرف فریب اور جھوٹ کے سہارے ہی رہ گیا؟ زندگی ہی

سفاکی سے ان کے سامنے تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر تھک گئے، موت سے بزدآزما ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ سو انہوں نے کرب کا پیمانہ ہونٹوں سے لگا لیا اور زندگی کے زہر کو لمحہ لمحہ بوند بوند حلق میں اتارنے لگے۔ اس طرح نادیدہ نظریے کے ساتھ ان کا لباس بھی بدل گیا۔ منفرد نشانیاں اتاری جانے لگیں اپنے بزرگوں کی روایات کو مصلحت آمیز پردوں میں چھپا دیا۔ اور مذہب کا احترام دل کے ایک تاریک اور اکھڑے گوشے میں سلانے کی کوششیں کرنے لگے ____

لیکن مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ اپنے حال سے سمجھوتہ کرنے لگے تھے کہ اچانک ان میں سے کسی نے مستقبل کا خوفناک سوال اٹھا دیا۔ فریب اور فریب مسلسل اور جھوٹ کا لامتناہی سلسلہ ان سے گذر کر ان کے آنے والی نسلوں تک جائے یہ ان میں سے بیشتر کو گوارہ نہ تھا۔ چنانچہ اختلافات سر اٹھانے لگے اور افراد دو جماعتوں میں بٹنے لگے۔ ایک جماعت اپنے مذہب اور روایات کو کسی مصلحت پر قربان کرنے کو تیار نہ تھی۔ اور دوسری جماعت زندگی اور اس کی آسائشوں کو ترجیح دے رہی تھی۔ اس صورت حال سے چاند نگر کے راجہ کو بڑی تقویت ملی۔ وہ خود ان ہنگاموں اور شورشوں سے نالاں تھا۔ اس نے اپنے نگر کے چین و سکون کے لئے انہیں خوب خوب اعزازات و انعامات عطا کئے۔ جو زندگی کی آسائش چاہتے تھے ان کی آنکھوں پر دولت کی پٹی باندھ دی گئی۔ اور وہ اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات تک محدود ہو گئے۔ مخالف گروہ انجمن ہی کا اس لاپرواہی اور بڑھتی غلامی سے بڑا نادِم ہوا۔ لیکن روایات کا احترام اور رہنما کی قسم نے ہمت و حوصلہ کی شمع روشن رکھی۔ اور وہ مصلحت آمیز خاموشی کے ساتھ وقت کا انتظار کرنے لگے۔

اور پھر . . . . . وہ وقت آ گیا۔ خود کو مصلحت پر قربان کرنے والے شرمندہ تھے۔ اپنی شخصیت کے تمام بنیادی عناصر کو مٹا دینے کے باوجود وہ خود کو ایک نئی شخصیت میں نہیں ڈھال سکے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ عجب مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ بے چہرگی کا کرب انہیں پریشان کر رہا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا چین اور سکون کے گہوارے میں وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اور حقیقت کی ضرب سے پاش پاش ہونے لگے۔

جو اقدار و روایات اب تک ثابت قدمی سے جمے ہوئے تھے ان کے لبوں پر بھی پرانی مانگ آنے لگی۔ آزادی بے لگام انفرادیت۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دانشوروں کی میٹنگ پھر سے ہوئی۔ مسئلہ کا حل تلاش کیا گیا مگر الجھتا چلا گیا۔ وحشت اور درندگی حیات کی بنیادی قدریں بن گئیں۔ تعمیر کی بجائے تخریب کا پرچم ہر طرف لہرانے لگا۔

اس دو سمجھوتہ ہوا کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اب اس نگر کو ہی خیرباد کہہ دیں جہاں نہ دن کا آرام نصیب ہے اور نہ رات کی نیند ـ

لیکن ہم ہجرت کریں تو کہاں ـ ؟ ہم تو بے زمینی کے کرب میں مبتلا ہیں یارو ! کسی عاقل نے سوال کیا۔

اس سوال نے مسئلہ کو اور گمبھیر بنا دیا۔ بالآخر عجلت میں یہ طے پایا کہ اب ہمیں چاند نگر کو ہی منقسم کر دینا ہوگا، اس طرح ہم بھی اپنا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس فیصلہ پر بہت سارے دل مجروح بھی ہوئے کیونکہ انہیں یہ احساس تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کا خون چاند نگر کی ایک ایک اینٹ میں جذب ہے۔ وہ نگر جو کبھی ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اسے انہوں نے قربانیاں دے کر متحد کیا تھا مگر آج ایک بار پھر . . . . . . !

ان دونوں شہر کی حالت دگرگوں تھی۔ بڑے بڑے جلوس نکلتے صبح و شام میٹنگ ہوتی۔ نعرے لگائے جاتے ـ

آزادی نعمت ہے، آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ہم کو بھی آزاد کرو۔ جیو اور جینے دو . . . . . آواز کا یہ مختصر ازدحام ایک چھوٹے سے گوشے سے اٹھا اور پھیلتے پھیلتے پورے نگر کو اپنے حصار میں لے لیا۔ خطرات کی گھنٹی ہر طرف بجنے لگی

آخرکار ایک دن کافی خون خرابہ کے بعد انہیں وہ آزادی نصیب ہوئی جس کے خواب وہ ایک عرصے سے دیکھتے آ رہے تھے۔ وہ دن ان سب کے لئے انتہائی مسرت کا دن تھا جب حاکم وقت کی طرف سے انہیں علاحدہ مملکت ملنے کی بشارت دی گئی۔ اس روز بہت بڑا جشن ہوا گھر گھر خوشیاں منائی گئیں۔ مٹھائی اور بتاشے تقسیم ہوئے۔ آزادی کی جنگ میں مرنے والوں کی تصاویر پر پھول کی مالائیں چڑھائی گئیں۔ اگربتی اور لوبان کی خوشبو سے سارا شہر مہک اٹھا تھا۔ دانشوروں نے ہر طرف چین کی بنسی بجتے دیکھ کر اطمینان اور سکون کا گہرا سانس لیا۔

وقت تیز رفتار پرندے کی مانند اڑتا جا رہا تھا۔ اپنی اپنی حویلی کے حصار کو اونچا کرنے کی فکر میں ہر فرد و بشر لگا ہوا تھا۔ یہاں تک مضبوط کرے

گئے۔ ان پر بڑے بڑے آہنی قفل لگا دیئے گئے اور ہر وقت وہاں پر اونچی پگڑی والے اپنے کاندھے سے بندوق لٹکائے تعینات رہتے تاکہ باہر سے کوئی بھی ان پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اپنے تحفظ کے لئے انہوں نے ہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اور اب وہ بیچ میں بے حد خوش اور محفوظ تھے۔ حفظ و امان کے اس احساس نے ان کے اندر جینے کی نئی امنگ پیدا کی اور حویلی کی دیواریں اونچی کرنے کے بعد وہ لوگ اپنے لئے خوبصورت گھروندوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

ابھی ان کے گھروندے تکمیل کے ابتدائی مراحل ہی میں تھے کہ فضا میں تناؤ کی کیفیت پھر پیدا ہو گئی۔ اپنے گھروندوں کے تحفظ کی خاطر لوگ آپس میں جھگڑنے لگے۔ شک و بے اطمینانی کا جو بیج ذہن میں پیوست تھا وہ پھر ابھرنے لگا۔ وہ ایک دوسرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور اپنے گھروندے کے گرد حصار کھینچ دیتے عدم تحفظ کا احساس روز بروز بڑھنے لگا اور چھوٹی چھوٹی باتیں اختلافات کا سبب بننے لگیں۔ سکون اور اطمینان کی وہ فضا جو ابھی تھوڑے دنوں سے اس مملکت کے نو اسیوں کا شیوہ بنی ہوئی تھی پھر رخصت ہونے لگی۔

موجودہ ابتری کی خبر یہاں کے دانشوروں تک پہنچیں۔ وہ جنوں کی پریشانی کے بعد آرام سے تفریح میں مگن تھے۔ اس جھگڑے اور تناؤ نے ان کے خوابیدہ اعصاب پر گہرا اثر ڈالا وہ طیش میں آکر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے۔

"آدم کی نسل کو بھلا سکون سے کیا مطلب۔ جب جنت میں اسے سکون نہیں ملا تو اس خاکستان میں کیا ملے گا۔"

دانشوران تفریح چھوڑ کر لوٹ آئے نہ پر مجبور کئے جا رہے تھے کیونکہ ان کی مملکت کے نو اسیوں نے پھر سے پرانی ڈگر اپنا لی تھی اور وہ درندگی و بربریت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ لڑائی اب رنگ، نسل، مسجد و مندر اور گردوارے کے لئے نہیں ہو رہی تھی بلکہ آپسی خانہ جنگی تھی اور ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلا دبا رہا تھا۔ چچا بھتیجے کا قاتل بن چکا تھا۔ بیوی، ماں، بہن، بیٹی کی عزت بے معنی الفاظ بنتے جا رہے تھے۔

"اب اس درندگی کا کیا علاج ہے؟" سب کے سامنے یہی ایک سوال تھا۔

اس دفعہ ان کے دانشوروں نے فساد کی علت دریافت کرنے کے بجائے تاریخ انسانیت کا مطالعہ و مشاہدہ شروع کیا اور ابتدا سے لے کر اب تک کے واقعات و واردات کا سروے کیا۔ رپورٹیں تیار کیں۔ رپورٹ دیکھتے ہی ان کی عقل کی تیسری آنکھ کھل چکی تھی۔ انہوں نے نہایت دکھ کے ساتھ اس تلخ صداقت کا انکشاف کیا۔

"خامی چاند نگر میں نہیں، کسی بھی خطۂ زمین میں نہیں بلکہ اس فتنہ و جدال کی جڑ خود ابن آدم کے باطن میں پوشیدہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں امن اور سکون کے قاتل بن جاتے ہیں۔"

اس انکشاف کے بعد اپنی شخصیت انہیں باہر سے اس دیو کی شکل میں نظر آئی جس کے دونوں ہاتھ آسمان کی وسعتوں کو چھو رہے ہیں۔ اور اندر سے اس بونے کی طرح جس کا قدم بہ قدم زمین ہی میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی اس عجیب و غریب شبیہ پر نہ تو ہنس سکتے تھے نہ رو سکتے تھے۔ ۞

## بقیہ صفحہ ۱۹ کچھ سہرا کے بارے میں

(۴) ان کے وسیلے سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تخلیقی اظہار

(۵) ایسے پراگندہ مضامین جو وقتی تفنن طبع کے سامان فراہم کریں ان کو یکسر نظر انداز کرنا

(۶) لفظ "سہرا" کو خالص علامتی صورت میں پیش کیا جانا۔ ضروری نہیں کہ اس کو ردیف کی صورت میں استعمال کیا جائے ہاں ضمناً اس کا ذکر برا نہیں۔

(۷) سہروں کو رسمی طور پر نہیں ادبی حیثیت سے تخلیق کیا جانا

سہروں کی طرح "رخصتی" لکھنے اور پڑھنے کا رواج بھی عام ہے۔ سہرا اور رخصتی جیسی خالص اردو اصناف پر توجہ ضروری ہے۔ قصیدہ، مثنوی اور تخلیقی اشکالات کا جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ ۞

رحمٰن نشاط
فلیٹ ۹۔ ڈی، گلبرگ اسکوائر، فیڈرل بی ایریا، بلاک ۷، کراچی

# گئودان

نصرو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ اماں پھر دکھڑا لے بیٹھیں۔

"ارے اماں! کیا تم بھی ہر وقت بھائی کی جان کھاتی رہتی ہو۔ کھانا تو کھا لینے دو۔ بیچارہ ابھی آیا ہے تھکا ہارا۔" زرینہ نے پانی کا گلاس نصرو کے سامنے چارپائی کی پٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر کیا میں محلے والوں سے کہوں۔ اونٹ کی اوٹ گھر میں بٹھا رکھی ہے۔ نہ بھائی کو فکر نہ باپ کو۔" غصے میں اماں کا پنکھا ذرا تیز تیز چلنے لگا۔

"مگر اماں یہ وقت تو نہیں ہے ان باتوں کا۔ اسے سکون سے کھانا تو کھا لینے دو۔" زرینہ نے چھوٹے بھائی کی حمایت کی۔

"پھر ہاتھ آئے گا یہ میرے۔؟ کھانا کھاتے ہی نکل جائے گا۔ وہ الٹا موٹر وائنڈنگ سیکھنے۔!" اماں کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"دیکھو اماں! میں جو کماتا ہوں لا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ اور شام تک کے پیسے اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اور مجھ سے تم کیا چاہتی ہو؟" نصرو نے پانی کا گلاس خالی کر کے کہا۔

"تو جو کچھ لا کر مجھے دیتا ہے اس کا بھی حساب سن لے۔ دو سو روپے تو تو ہی رکھ لیتا ہے۔ دو سو روپے بس کے چلے جاتے ہیں۔ سو روپے مکان کا کرایہ چلا جاتا ہے۔ باقی بچے دو سو۔ اس میں کچھ تیرے ابا لا دیتے ہیں۔ اس طرح بڑی مشکل سے تین ساڑھے تین سو میں گھر کا خرچ چلتا ہے۔ اب یہ تو کہو یا بہن کو رخصت کر دو۔" اماں نے سارا بجٹ سنا دیا۔

"میں کیا کروں اماں۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتا!"

"بس تو پھر بٹھائے رکھو بہن کو ساری عمر اور سنتے رہو لوگوں کے طعنے۔"

"لوگوں کی بات مت کرو اماں۔ لوگ ہمیں کھانے کو نہیں دیتے۔ کیا کسی رشتہ دار نے آج تک آ کر یہ دیکھا کہ ہم کس طرح رہتے ہیں۔ کیا کسی محلے والے نے یہ پوچھا کہ ہم مہینے میں کتنے دن فاقے کرتے ہیں۔؟"
زرینہ برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

"بس تم دونوں تقریر کرنے بیٹھ جایا کرو۔!" اماں نے غصے سے پنکھا ایک طرف پھینک دیا۔

نصرو دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

نام تو اس کا نصیر الدین تھا۔ لیکن اس کا تعلق اس طبقہ سے تھا جہاں نصیر الدین، نصرو اور قمر الحسن کمو کہلاتے ہیں۔ ماں باپ اور دو بہن بھائی پر مشتمل اس مختصر سے خاندان کا واحد کفیل نصرو تھا۔ کبھی زمانے میں اسکول بھی جاتا تھا لیکن امیروں کے اس چونچلے کو زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رکھ سکا۔ باپ بوڑھا ہو چلا تھا۔ اب اس سے ٹھیلوں کا بھاری بھرکم ٹھیلا نہیں کھینچا جاتا تھا لہٰذا اس نے ایک چھوٹے سے خوانچے پر بسکٹ، ٹافیاں، میٹھی چھالیا اور اسی قسم کی دوسری اشیاء سجا کر اسکول کے سامنے بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور گھر کے چلانے میں تھوڑی بہت مدد کرنے لگا تھا۔

ایک ٹوٹے پھوٹے سے کوارٹر کے آدھے حصے میں یہ خاندان سو روپے مہینہ پر آباد تھا۔ عزیز رشتہ دار تھے تو لیکن دروازے پر پڑے ٹاٹ کے پردے میں سے گرد اڑتی تھی اور وہ اپنے کپڑے گرد آلود نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نصرو اسکول چھوڑنے کے بعد جگہ جگہ دھکے کھاتا رہا اور پھر کسی نے کہہ سن کر اسے ایک فیکٹری میں ہیلپر رکھوا دیا تھا۔ جہاں وہ دن بھر مشینوں کے شور میں ہاتھ پاؤں کالے کرتا رہتا۔ شام کو تھکا ہارا گھر پہنچتا اور مارا مارا۔ الٹا سیدھا کھانا کھا کر اپنے ایک دوست کی دکان پر موٹر وائنڈنگ کا کام سیکھنے چلا جاتا۔ اس امید پر کہ ایک ہنر ہاتھ آ جائے گا تو شاید باہر جانے کا چانس مل جائے۔ دکان سے دس گیارہ بجے تک لوٹتا اور پڑ کر ایسا سوتا کہ صبح چھ بجے

جب روبینہ تنگ آکر پانی کا گلاس بھر کر منہ پر ڈال دیتی تب جھنجھلاتا ہوا اُٹھتا۔

جس روز فیکٹری میں اوور ٹائم ہوتا اس روز دکان کا ناغہ ہو جاتا۔ ہاں جمعہ کے دن کا وہ بے چینی سے انتظار کرتا تھا۔ اُس روز اسے ذرا سا آرام مل جاتا تھا۔ اور صبح کو دیر تک سونے کی آزادی بھی ہوتی تھی۔ اور پھر اس روز وہ اپنے ہفتہ بھر کے میلے کچیلے کپڑے بھی دھوتا اور گیلے کپڑوں کو کریز بنا کر اور ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر صحن میں بندھی ہوئی ڈوری پر ڈالتا جاتا۔ گریس اور تیل میں ڈوبے کپڑے ڈیڑھ روپے کی ایک صابن سے صاف تو کیا ہوتے بس ذرا نصرو خوش ہو جاتا تھا۔ اُنہیں پانی میں بھیگا دیکھ کر۔

تو یہ تھے اُس کے شب و روز۔ نہ کہیں جانا۔ نہ آنا۔ نہ تفریح نہ کھیل کود۔

لیکن وہ اپنے ان معمولات سے بہت خوش تھا۔ بڑا مطمئن اور مسرور و شادماں اور خوش اگر نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ کیوں کہ اس کا تعلق جس طبقے سے تھا اُس کی کُل دنیا اور زندگی کے کُل معمولات یہی تھے۔ محنت مزدوری کرنا اور اپنے خاندان کو زندہ رکھنا۔ یہ طبقہ اسی میں خوش رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا ——— بلکہ اپنا فرض پورا کر دیا۔ یہ طبقہ اپنے گھر اور فیکٹری سے آگے نہ دیکھ سکتا ہے نہ سوچ سکتا ہے۔ بلکہ کچھ اور دیکھنے اور سوچنے کی اُس میں خواہش ہی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اُسے وہی کرنا چاہیئے۔ وہ جس طرح زندہ ہے اسی طرح زندہ رہنا چاہیئے۔ دنیا اس کے لئے جیسی ہے یہ ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ سو نصرو بھی بہت مطمئن اور خوش تھا کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہن کی سانسوں کی آمد و رفت کو جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کائنات کے کاروبار میں اپنا کردار خوب ادا کر رہا ہے۔

البتہ اس کی ماں نے ایک فکر اسے ضرور لگا دی تھی۔ اور وہ تھی بہن کی شادی۔ وہ سوچتا تھا کہ سانس کا سلسلہ تو کسی نہ کسی طرح چلتا رہے گا۔ لیکن یہ اتنا بڑا بوجھ کیسے اُترے گا۔ اور جب سر پر بوجھ ہو تو سانس بھی اُکھڑی اُکھڑی سی ہوتی ہے۔ لڑکی کب تک رکی۔ لہٰذا اس بوجھ کو اتارنے کیلئے اس نے موٹر وائنڈنگ سیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اور اس سارے عمل کو وہ اپنے جینے کا فرض سمجھ کر ادا کرتا تھا۔ اسے کوئی جبر یا مصیبت نہیں سمجھتا تھا۔ ہاں ایک تفریح وہ ضرور کرتا تھا۔ اور وہ تھی ہر مہینہ کے پہلے جمعہ کو ایک عدد فلم دیکھنے کی تفریح۔ یہ اس کی واحد تفریح تھی۔ جس کے نشے میں وہ پورے مہینہ سرشار رہتا تھا اور آنے والے مہینہ کا انتظار کرتا تھا۔

فلمیں اسے بہت پسند تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے گھر کی دیواروں پر اداکاراؤں اور اداکاروں کی رنگین تصویریں بھی اس نے اخبارات سے کاٹ کاٹ کر چپکا رکھی تھیں۔

جس مہینہ وہ فلم نہ دیکھ سکتا وہ مہینہ اسے بہت خالی خالی اور ادھورا سا لگتا۔ بالکل ایسا جیسے بغیر نوکری کے اُس کا بوڑھا باپ، جیسے ان سلے کپڑوں کے بغیر اُس کی ماں، جیسے بغیر آگ کے گھر کا چولہا، جیسے بغیر چوڑیوں کے اُس کی بہن کی کلائی۔

آج مہینہ کا پہلا جمعہ تھا۔ اُس کی ماں اور بہن جانتی تھیں کہ آج وہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر اور سر پر ڈھیروں تیل چپڑ کر بالوں کی پٹیاں جما کر فلم دیکھنے جائے گا۔ لیکن وہ خلاف معمول سویرے ہی اٹھ گیا اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اماں نے اسے خلاف توقع کہیں جانے کی تیاری کرتے دیکھا تو چونکی

"کہاں جا رہا ہے رے صبح ہی صبح۔؟

"وہ ـــ اماں ـ میرا ایک دوست ہے۔ نئی کراچی میں رہتا ہے اُس سے ملنے جانا ہے۔

"بس۔ دوستوں میں اڑا پھر۔ تفریحیں کرتا رہ ـ اور یہ جو سانڈ سر پر بیٹھا ہے۔ اس کو ساری عمر بٹھائے رکھ۔" اماں شروع ہو گئیں۔

"ارے نیک بخت۔ آج چھٹی کے دن تو اُس کی جان بخش دے۔ جانے دے کہیں جا رہا ہے تو ۔ ۔!" صحن میں پڑی کھٹیا پر سے ابا کھانستے ہوئے گویا ہوئے۔

"ارے اماں، جانے دے۔ کون سا یہ کہیں روز روز جاتا ہے" روبینہ نے چائے کا پیالہ اور پاپوں کی پلیٹ نصرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بھائی کی وکالت کی۔

"بس تو ـ بولا کر ـ یہ تیرے بولنے کی بات نہیں ہے۔" اماں نے اسے جھڑک دیا۔

"اماں میں اسی کے لئے تو جا رہا ہوں۔" نصرو بولا۔

"اس کے لئے ـ ؟" اماں نے پوچھا۔

"ہاں اماں میرے دوست کے چچا کی وائنڈنگ کی دکان ہے اُس نے اپنے چچا سے میرے لئے بات کی ہے۔ آج اُن سے ملنا ہے۔ اگر اُنہیں میرا کام پسند آیا تو کام ہو جائے گا۔ بس تو دعا کر۔ وائنڈنگ کے کام میں اچھے پیسے ملتے ہیں" نصرو نے بتایا۔

"مگر بھیا کیا تم فیکٹری چھوڑ دو گے پھر؟" روبینہ بولی۔

"ہٹ۔ پاگل۔ فیکٹری کیوں چھوڑوں گا۔ فیکٹری کے بعد شام کو اُدھر جایا کروں گا۔

"سمجھا ہم سمجھا رہے ہیں، کچھ آرام کیا کر۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گے" "چل بھاگ۔ یہ تیرے نہیں میرے سوچنے کی بات ہے۔" نصرو نے بڑے پیار سے ڈانٹا۔

"اچھا اماں خدا حافظ۔" نصرو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ہاں! جاؤ اس طرح رہا ہے جیسے آج ہی پندرہ ہزار روپے لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دے گا"

اماں بدستور غصہ میں تھیں۔

"ارے اماں کہا نہیں تو کبھی نہ کبھی ضرور، پندرہ ہزار روپے تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"ارے بس رہنے دے۔ پندرہ ہزار کماتے کماتے تو تو مر جائے گا"۔

اماں کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"چل مر کر بھی لا کر ضرور دوں گا۔ اپنی بہن کی شادی کے لئے رقم" نصرو ہنستا ہوا بولا۔ "اچھا آپا خدا حافظ۔" نصرو باہر نکل گیا۔ اور زرینہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دعائیں پڑھ پڑھ کر کافی دیر تک دروازے کی طرف پھونکتی رہی۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ گلی میں بچے شور مچا مچا کر کھیل رہے تھے۔ زرینہ چولہے کے سامنے بیٹھی گیلی لکڑیوں کو پھونک مار مار کر بے حال ہوئی جا رہی تھی"

"نصرو نہیں آیا ابھی تک۔ !" ابا نے کھانسی کے شدید ریلے سے بمشکل سانسیں قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"آتا ہوگا۔ شام کا کہہ کر گیا تھا۔!" اماں نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔

اچانک گلی میں کھیلتے بچوں کا شور ایمبولنس کی کرخت آواز میں دب گیا

ہائے خدا خیر۔ گھبرا کر جوئی زرینہ دروازے کی طرف دوڑی۔

اور پردہ اٹھا کر باہر جھانکنے لگی۔

"اری کیا بات ہے۔ کیا وہیں کھڑی رہے گی۔؟" اماں نے چند منٹ بعد زرینہ کو پکارا۔

"ارے اماں۔ یہ تو۔ یہ تو۔ بھیا۔" زرینہ اپنی بے ساختہ چیخ کو نہ روک سکی۔

سارے محلے میں کہرام مچ گیا۔ نصرو۔ محلے کا گبرو جوان۔ زرینہ کا اکلوتا بھائی۔ بوڑھے باپ کا واحد سہارا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان کے کچے صحن میں چارپائی پر پڑا تھا۔ لوگ اس کا آخری دیدار کر رہے تھے۔

کسی نے بتایا کہ نصرو جس بس میں سفر کر رہا تھا وہ ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا کر پل توڑتی ہوئی پچاس فٹ نیچے خشک ندی میں گر پڑی بیسوں مسافر ہلاک اور زخمی ہو گئے۔

زرینہ کو سکتہ ہو گیا۔ اماں بار بار نصرو کی خون آلود قمیض چومنے لگتیں۔

ابا نہ معلوم کس سوچ میں مستغرق ایک ٹک دروازے کو تکے جا رہے تھے انہوں نے تو یہ بھی نہیں سنا کہ حکومت نے حادثہ میں ہلاک ہونے والوں کے ورثا کو دس دس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ ✿

## بقیہ صفحہ ۴۵ کالا پانی

نوٹوں کی چھوٹی سی گڈی نکال کر داروغہ کے سامنے رکھ دی۔

"حضور میں غریب آدمی ہوں۔ میری بیٹی کے بارے میں مجھ سے اور سوال مت کیجئے۔ وہ تو ڈوب گئی۔" اور پہلے کی طرح آنکھیں پونچھنے لگے۔ داروغہ نے نوٹ اٹھالئے اور بغیر گنے جیب میں ڈال لئے۔

مجھے لگا پیروں تلے کی دھرتی پھر انگاروں کی طرح دہکنے لگی ہے ابھی پھر کوئی دھماکا ہوگا۔ زمین پھٹ جائے گی۔ اور شعلے اگلنا شروع کر دے گی۔

داروغہ رپورٹ تیار کر رہا تھا اور بھیا آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ میں کمرے سے نکل کر مردہ گھر کی طرف چلا گیا۔ اور جالی دار دروازہ سے سر ٹیک کر پھپک پڑا۔ ✿

## بقیہ صفحہ ۴۷ بمبئی چند مناظر

یہ حق صرف تمہارا ہی ہے پیارے، سعادت نے سمجھایا۔

ان بے چاروں کے پاس خوابوں کے لئے وقت ہی کہاں ہے۔

نت نئی اسکیموں میں الجھے یہ بے چارے،

اماں چھوڑو ان کی باتیں۔

آؤ خواب دیکھیں،

نہ دکھائی دیں تو خود بنیں۔

ست رنگے خوابوں کا سب سے بانکا بنکر غریب ہی ہو تو ملے

تو پھر آؤ خواب بنیں۔

کون جانے کب کوئی خواب وہ خبر دے جائے۔

جس کا ہمیں یگوں سے انتظار ہے۔ ✿

# نقد و نظر

## بات سے بات چلے

[رپورتاژ]

یعقوب راہی

شہر بمبئی ادبی محفلوں، نشستوں اور جلسوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں لوگ
سنجیدہ، نرم سب ہی ہیں اور دم گفتگو گرم۔ مباحث جب بھی ہوتے
باعث RIOT کی طرح ہوتے ہیں۔ مختلف اور متضاد
ریوں کے نقیب، علاحدہ علاحدہ مکتب خیال کے (طالب
ہیں) اساتذہ اور کچھ آزاد اسپ سوار، ان سب کا جنگ کبھی (ختم)
ہے۔ لوگوں کو پانی پت اور واٹرلو کی یاد آتی ہے۔ (پانی پت
ں میں واٹرلو کا ترجمہ ہے) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خیال
کی محفل سونی سونی رہتی ہے۔ نہیں اس محفل میں بھی وہ
حال ہوتے ہیں جو مخالفانہ، معاندانہ اور مردانہ قسم کے
یقوں کے علم بردار دوستوں کی صحبت میں استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔
لفظوں کی روشنائی کو سینٹ اور کمان سے نکلے ہوئے تیروں کو واپس
کرنا ایک علاحدہ فن ہے جسے ادبی زبان میں رپورتاژ قلم بند
کیا جاتا ہے۔ اردو میں کتنے رپورتاژ ہیں۔ بس یہی کوئی پانچ سات۔
جائے دیکھیے پانچ سات نہ سہی دس بارہ ہوں گے۔ اس سے
ہم بھی نہیں سکتے۔

قاضی عبدالستار کے دو رپورتاژ مجھے یاد ہیں۔ ایک اور
رپورتاژ بھوپال سے متعلق تھا اور "۔۔۔" کے مصنف کا نام مجھے
ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ غلط نام لکھوں گا تو اور بری بات ہوگی
FILL IN THE BLANK خیال ہے قارئین ان دونوں کو
لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ محمد شمیم حیدر رہا کی ادبی محفلوں سے
متعلق ایک رپورتاژ، مرحوم تصدق سہارنپوری کا لکھا ہوا تھا اور بھی
رپورتاژ ہوں گے جو میں نے پڑھے بھی ہوں گے لیکن مجھے کون سا تحقیق
کا سرانجام دینا ہے کہ ان سب کے نام لکھوں۔ اب ایک زمانے
بعد رپورتاژ کی ایک کتاب سامنے آئی ہے۔ "بات سے بات چلے"
عنوان شاید فیض احمد فیض کے ایک مصرعے سے لیا گیا ہے اور اگر
ہے تو خوشی اس لیے ہوئی کہ یعقوب راہی اور ایک ترقی
پسند شاعر۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کا ملاپ کیا
ممکن ہے؟ یعقوب راہی اپنے ادبی عقیدوں کی حد تک
FUNDAMENTALIST ہیں۔ اس معاملے میں کم
بلکہ ایک معاملے میں زیادہ ہی ہوں گے۔ جدیدیت کے بارے میں
کوئی ہچکچاہٹ نہیں لیکن وہ ترقی پسندی کی مخالفت میں
بعض معاصرین کی طرح کوئی چیز دل میں لیے اور زبان پر
میرا کیا لیتے ہیں؟! بہرحال یہ کنونشن CONVI-
CTION کے آدمی ہیں اور اپنے کنونشن کی درستی کو مضبوطی سے
تھامے ہوئے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اصلی ایمان وہ وفاداری ہے
جو استواری کی شرط کو بھی پورا کرے۔ یہ کتاب انھی یعقوب
راہی کی مرتبہ ہے۔ اسے تصنیف اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ یعقوب
راہی نے محفل کے مباحث کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا بھی
اظہار کیا ہے۔

یعقوب راہی اچھے معلم ہیں۔ جدید شاعر ہیں۔ ان کے
تین مجموعے "امکانات" (۱۹۷۵ء) "حرف مکرر" (۱۹۸۰ء) اور
"لو لو جاگی رات" (۱۹۸۵ء) میں شائع ہو چکے ہیں جس شاعر
کے تین مجموعے چھپیں۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے کے دو مجموعے
فروخت ہو چکے تبھی تو شاعر نے تیسرا مجموعہ پیش کیا۔ اب ان کی
چوتھی ادبی کاوش ۱۹۸۸ء کے تحفے کی صورت میں دستیاب ہوئی
ہے۔ یہ تذکرہ تو نہیں، یادوں کی بارات بھی نہیں لیکن تاریخ ضرور
ہے۔ اس قسم کی کتابیں دلچسپ تو ہوتی ہی ہیں لیکن ان کا افادی
پہلو یہ ہے کہ بعد کے آنے والے لوگوں کے لیے یہ یادگار بن جاتی ہیں
ادبی معرکوں یا ادبی مناقشات سے متعلق ہم جب بھی کوئی کتاب پڑھتے
ہیں ہمارے اساتذہ اور بزرگ ادیب، اپنے شاعرانہ ہیں، شاعرانہ
نہیں بلکہ اپنے اصل صورت حال میں ہمارے دائرۂ بصارت میں
آجاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی اور انشا، اپنے ثقہ اور
بزرگ صورت ہونے کے باوجود کتنے کھلنڈرے اور ہماری آپ
کی طرح کے آدمی تھے۔ رپورتاژ بھی ایک اچھا رپورتاژ اصل میں
ڈاکیومنٹری فلم ہوتا ہے۔ اور اگر میں یہ عرض کروں کہ اس کتاب
میں یعقوب راہی نے اچھے رپورتاژ بھی ڈالے ہیں تو اسے آپ اخبار کی
خبریں نہیں واقعہ کہیں۔ تحریر ان کی رواں ہے۔ اپنی فکر وہ جھجک نہیں
جانتے اور دو ٹوک بات کہنے میں لطف حاصل کرتے ہیں تو دوسروں
کو ٹوکنے کے لیے دو ٹوک بات طبیب حاذق کا نسخہ ہے۔

یعقوب راہی نے "عرض حال" (جو جملہ ۱۲ سطروں پر مشتمل ہے)
میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "ان دنوں شاعروں ادیبوں اور ادب
نوازوں کے دلوں میں بول بیٹھنے کی خواہش تھی، خود پسندی و خودنمائی کے
جذبات کا اظہار کم ہی ہوا کرتا تھا لیکن آج کل ایک دوسرے کے ذکر
ہی سے محفلیں اجڑ جاتی ہیں" بہت غنیمت کہ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ
اس صورت حال پر کچھ لوگ خوش بھی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا
ہے کہ "ادبی نشستیں میرے اور میرے معاصرین کے لیے تربیت
گاہ بھی رہی ہیں اور عبرت گاہ بھی۔" اس جملے سے مصنف کے
حقیقی جذبات اور دلی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔

کتاب میں محفلوں کی روئیداد ہی ہیں اور ان کے علاوہ خود
مصنف کے دو مختصر مضامین "شہر نامہ" اور "شہر جمعہ" شامل
ہیں جو اردو سروس دہلی کے نشر ہوئے ہیں۔

محفلوں کی روداد سے ادیبوں اور شاعروں کے خاص خاص
جملوں کا اگر ایک گلدستہ (انتخاب) شائع کیا جائے تو یہ گلدستہ
ایک بچھو کے ہونے زلزلے کا باعث بن سکتا ہے۔ تمہیں کم میں ان جملوں کو
یہاں دہرا کر اس زلزلے کا ذمہ دار بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کتاب
بے حد دلچسپ ہے۔ اس میں ذاتی، صفاتی باتیں بھی ہیں اور واقعاتی
تو ہیں ہی۔ اپنے اپنے مطلب اور اپنی اپنی پسند کے جملے، ادائیں،
اس بات کی تصدیق کرنی چاہیے کہ یہ
مرض کیا وہ صحیح ہے یا صرف مزاح ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ روشنائی کے استعمال میں ناشر
نے کنجوسی نہیں برتی۔ الفاظ صرف صاف ہی نہیں چمک دار ہیں اور
بلکہ خود بخود آگے بڑھتے ہیں حتیٰ کہ سرورق بھی عمدہ ہے۔ رنگ
کے گلیز پیپر پر سیاہ حروف ابھر کر آئے ہیں۔

اب کتاب میں گو "طرف داری" کا پہلو نمایاں ہے لیکن صرف سخن ہی
کو ایک عیب بن گئی ہے اور ان دونوں کا آمیزہ تیار کرنا ایسا ہی ہے
جیسے بکا پہ پتلون پہننا۔

● ۲۲۴ صفحات ● قیمت ۵۰ روپے ● مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۸ء
● پتہ: ۱۰۱-۲-۱۲، بھوانی نگر، مرول مروشی روڈ،
مرول، اندھیری (مشرق) بمبئی ۴۰۰۰۵۹

○ (یوسف ناظم)

## بازگشت و بازیافت

[تنقید]

ساقی فاروقی

"بازگشت و بازیافت" ساقی فاروقی کے مضامین کا مجموعہ ہے
جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقیدوں کے لیے اپنے پیش رو
اور معاصرین شعرا کا معروضی مطالعہ بھی ہے اور تخلیقی تیاری بھی۔
ساقی تصنیف و تخلیق سے فنی توقعات کے ساتھ ملتے ہیں۔ لکھتے
ہیں "میں شاعری میں COMMITMENT کا شدید قائل ہوں
مگر شاعری کی پہلی COMMITMENT شاعری سے ہے نہ کہ
JOURNALISM سے" (صفحہ ۲۱) روایت کی رد و قبول
کے لیے وہ روایت کے ادراک کو ضروری جانتے ہیں۔ ان کے اسلوب
کی تازگی میں اظہار آمیز ہے تعلق ہونے میں گفتگو کے مصداق ہے
فن کار کے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ بھی ہے اور خفا بھی، بقول
اُن کے۔ ان کا تناسب غیر جذباتی الفاظ کے
(صفحہ ۱۲۵)

تقدیر ہے، تبصرے اور شخصی خاکوں پر مشتمل اس
مجموعہ کا پہلا مضمون، جسے تمہید بھی کہا جا سکتا ہے، میں وہ اردو کی
تہذیبی روایت کا ذکر کرتے ہیں۔ برصغیر کا ہندستانی
ذہن اس میں آنے والے تبدیل و تغیر اور شہری تہذیب کی تاریخ
کے بیچ میں ساقی شعر کی بنیادی کے بارے میں اپنے تجزیے

یں الثبات کرسکے ہوئے گھلتے ہیں لفظ اس وقت ...
ے ہیں جب آدمی خدا (۹۹) کے علاوہ اپنی ذات کو بھی ...
ہے " (صفحہ ۵۸)
نظم کا سفر " میں فیض، میراجی اور راشد پر بہت اچھی بحث
ہے اور ایسے نتائج برآمد کیے گئے ہیں جو قاری کو ان تینوں کی
ری پر از سر نو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً فیض کی نظم "رقیب سے"
متعلق لکھا ہے "میرے خیال میں اگر نظم اس مصرعے (۲) ترے
ر گماں تو گنہگار سکوں کا پہ ختم ہو جاتی تو ایک بھرا تاثر چھوڑتی۔
بارہ مصرعے جو زائد ہیں۔ نام نہاد غم دوراں کو غم جاناں کے ساتھ
ڑنے کا پیوند۔ ایک سچ کو دوسرے جھوٹ کے ساتھ جوڑنے کا
بد اور اس اٹل سے جوڑ پیوند کا سلسلہ فیض کی اکثر نظموں میں
پھیلا ہوا ہے " یا "فیض میں بڑے امکان تھے اور وہ چلے بھی
یکہ ہی تھے لیکن ادب کا معاملہ تو بھول بھلیوں کا سا ہے۔
ہاتھ میں چراغ نہیں ہے یا اس چراغ پر کوئی ... ہے تو نکلے
کوئی صورت نہیں۔ فیض نے بے شک ہماری نظم کو بڑا نقصان
پہنچایا ہے " (صفحہ ۳۰)۔ میراجی کے بارے میں لکھا ہے "وہ اچھے
شاعر نہیں تھے مگر ایک اہم شاعر ہیں ... وہ اردو شاعری کی
معنوی زمین کو توڑنے کی دھن میں کچھ سانچے بھول گئے " (صفحہ ۳۳)
یک اس بات سے اتفاق کر بھی لیا جائے تو اس کی وجہ تو ان
کی حد سے بڑھی ہوئی ہندیت ہے یا ایک چیز اردو ... بھی
رہی ہے۔ میراجی اس سے کم کم آگاہ تھے " (صفحہ ۳۴) انھوں نے
کہی ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ راشد کے متعلق لکھا
ہے ان پر بھی اپنے ہم عصر ہندگی اختر شیرانی کا گہرا اثر ہے " "لیکن
میراجی نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیریں راشد کے یہاں
ملتی ہیں، انھوں نے جن امکانات کی طرف مبہم اشارے کیے تھے
راشد نے ان میں بیشتر کو پورا کیا " (صفحہ ۳۲) یا "ان کے یہاں
تجربات، مشاہدات، موضوعات کا ایک ایسا رنگا رنگ ذخیرہ
ہے جو شاید کسی نظم نگار کے یہاں نہیں ملے گا " (صفحہ ۳۹)
آخر میں ساقی نے لکھا ہے "راشد کی ایرانی اردو بھی کھٹ پٹ پیدا
کرتی ہے ... کسی اردو والے کے ذہن میں "زنبور" ناخورده
بیدار نہیں کر سکتا جو "بھڑ" سے بیدار ہو جاتا ہے۔
ہماری صحافت اور خیالی دونوں سالہا سال سے بھڑ کو ...
بیان کی چلی آرہی ہے "زنبور" ان کے لیے کسی بھڑ سے کم نہیں "
(صفحہ ۳) انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے لیکن یہ نقد تفصیل
طلب تھا اس لیے بھی کہ شاعری میں بحث ثقیل و سہل الفاظ
پر نہیں بلکہ مناسب و نامناسب یا غلط اور صحیح الفاظ کے متعلق
ہوتی ہے۔

ایک ہم عصر " شمس الرحمن فاروقی کے نام لکھا خط ہے۔
اس میں ساقی نے بہت کام کی باتیں کہی ہیں مثلاً (۱) جن کتابوں کو
... انگریزی یا فرانسیسی ... شاعر اپنی یادی کرتا ہے ان کا نام
... بغیر بھی اردو شاعر بڑی شاعری کر سکتا ہے۔ اسے اپنی تاریخ
ہندوستان اور پاکستان میں ... کرنی چاہیے۔ انتخاب، اپنی ہی
زبان اور اپنے مسائل میں اور سب سے زیادہ اپنی ذات میں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دنیا کے ادب میں جو کچھ ہوا ہے !
ہو رہا ہے اس سے آنکھیں بند کر لے (ب) یورپ ...
غریب ملک کے رہنے والے ہیں لفظوں کے استعمال میں سخت بخیلی
دکھاتا ہے۔ (ج) ردیفوں میں NOUNS کو گھلانے
کی سخت ضرورت ہے PRONOUNS, VERBS اور
ADJECTIVES کے علاوہ کوئی سیدھا مستقیم ہیں اور انھیں سے
ردیف منتخب کرنی چاہیے۔ (د) ایسی جدید شاعری کا المیہ یہ بھی ہے
کہ لوگ زبان کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ مسائل کی COMPLEXITY
کا تقاضا ہے کہ اس پر دسترس مکمل ہونا چاہیے وغیرہ۔
آخر میں لکھتے ہیں "زاہدی، لکھو۔ یہ تمہارا مزاج ہے اور یہ تمہارے
بس کی بات ہے " معلوم نہیں شمس الرحمن فاروقی کی رباعیات کے تجربے

تجارت کا اور یا "پڑھنے کے بعد ان کی کیا رائے ہے !
تشنہ کا پہلا خط " ہے... زہرا نگاہ کے نام ساقی کا خط ہے۔ جس
میں انہوں نے زہرا نگاہ کے انتخاب کے پہلے مصرعے میں آئی ترکیب
"غضب ہو" پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے اگر آپ نے واقعہ طور
پر لکھا ہے تو خیر ورنہ "ہو" ہندی کا لفظ ہے اور اضافت کا بوجھ
نہیں اٹھا سکتا۔ ویسے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تراکیب
اردو میں جاری ہونی چاہئیں اگر زبان آگے جانا چاہتی ہے مگر یہ
فعل شعوری ہو لاعلمی میں نہ ہو۔ ان کے ایک اور مصرعے
ان کے دیوار و در فرش و آنگن کے بارے میں لکھا ہے "آنگن ہندی
ہے اور "واو" فارسی کا حرف عطف ہے۔ فرش عربی ہے۔ ...

[باقی صفحہ ۳۳ پر دیکھیے]

# مکتوب

## ظہیر احمد صدیقی — شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

### شعرِ منثور یا نثرِ شاعرانہ

پروفیسر اختر انصاری کمال اردو میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے جن شاگردوں پر فخر کر سکتی ہے ان میں کمال صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کی ذہانت اور تبحرِ علمی کا اعتراف ان کے استادوں پروفیسر لیلی اور پروفیسر خواجہ منظور نے کیا ہے۔ اس وقت ان کے ایک خط کے کچھ حصے کو احباب کی فہم کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ خط کے ابتدائی حصے کو دانستہ حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس میں یا تو نجی واقعات ہیں یا بعض شخصیات پر تبصرے ہیں جن کا بقول کمال صاحب "خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہنا ہی بہتر ہے"۔

میں نے کمال صاحب سے اس بدعت کا ذکر کیا تھا جو نثری شاعری کی صورت میں ہندوستان میں رواج پا رہی ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ نثری شاعری نثر کی دوسری شکل ہے۔ نیز یہ کہ جو بات وزن اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ ادا کی جا سکتی ہے اس میں زیادہ حسن اور دل کشی ہوتی ہے۔ صرف حسن ہی نہیں بلکہ بات کا جو اثر منظوم شعر سے ہوگا وہ منثور شعر سے (اگر اس کو شعر کہا جا سکتا ہے) نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ اس احساس کا بھی ذکر کیا تھا کہ نثری شاعری کے دعوے دار اپنے نثر پارے کے RECOGNITION کے لیے "شاعری" کے لفظ کی شمولیت ضروری خیال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نثر کا لفظ شعر کے مقابلہ میں (؟) ہے (سرِ دست مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان دونوں میں کس کو فضیلت حاصل ہے)۔ میں نے کمال صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ نثری شاعری کے مدعی یہ کہتے ہیں کہ وزن، قافیہ، بحر وغیرہ کی قید میں رہ کر خیالات کا اظہار بھرپور طریقے سے نہیں ہو سکتا (یہ اعتراض اس سے قبل بھی مختلف صورتوں میں اٹھ چکا ہے) مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعری کا اتنا بڑا سرمایہ ہمارے سامنے ہے ان شعرا کو کب اپنے اظہارِ خیال میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ غالب کے "ظرفِ تنگنائے غزل" کو "بقدرِ شوق" نہ ہونے سے بہت سے لوگ دھوکہ کھا گئے۔ میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں دو نمونے تحریر کیے تھے۔

#### نثری نظم

1 پوری زندگی
کا حساب
کون دے سکتا ہے
حساب دینے کے لیے
پوری زندگی چاہیے

#### نثرِ منظوم

حساب مانگنے والے حیاتِ رفتہ کا
حساب دینے کے لیے ایک زندگی دیتا

2 جب پیار روشن ہوتا ہے
تو اندھیرے کے دانے
بمثل صاف نظر آنے
لگتے ہیں

بس ایک گھونٹ میں کھل جاتے ہیں رموزِ حیات
شراب کتنی بصیرت نواز ہوتی ہے۔

یہ وہ سوال تھے جو میں نے پروفیسر اختر کمال صاحب کے سامنے پیش کیے تھے۔ ان سوالوں کی روشنی میں ان کا یہ خط اہلِ ادب کے لیے دلچسپی کا سبب ہوگا۔ شاعر نے نثری نظم اور آزاد غزل کے شائع کیا تھا اور ان دونوں شعری تجربوں کو بحث کی نئی سمتیں دی تھیں اس لیے یہ خط شاعر کے حوالے سے شعر و ادب کے قارئین کی نذر ہے۔

اب تیسرا مسئلہ (یعنی شعرِ منثور یا نثرِ شاعرانہ) کا تو مرزا صاحب اس بارے میں قریب قریب سب کچھ کہہ چکے "کھتی والا" لیکن یہ خیال کرنا چاہیے اس تجربہ کو ان کے لیے — اور خدا کا شکر ... میری تحریر کی لمبائی کے باوجود اس کی تحمل نہ ہو سکے گی۔ تفصیلی اظہارِ رائے کی راہ میں حائل ہے۔ شعرِ منثور کے سلسلے میں جس مرض کا تم نے ذکر کیا ہے وہ یہاں کچھ عرصہ قبل وبائے عام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اب شاید جدید شعرا کی طبیعت نظمِ منثور کی بھی کم متحمل ہوتی ہے اس لیے عام طور پر غزل کو کچھ زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ... تجربہ اور مثالی کلچر اور طرزِ احساس کو روایتی سانچوں میں سمونے کے نتائج نوعیت کے اعتبار سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ یہاں کچھ عرصہ قبل شعرا کی ایک نئی نسل سطحِ عام پر آئی تھی (اور آج بھی اس کے باقیات ملتے ہیں اگرچہ وہ فراوانی اب نظر نہیں آتی) جو شاعروں کے مقابلے میں نئے شاعر تو تم نے بہت دیکھے ہوں گے۔ یہاں ایک عرصہ تک شعری محاذ پر NEW POETS کے مقابلہ پر NEW NEW POETS کا دور دورہ رہا ہے۔ شاعری کے اس دبستان سے بھی جیسے روایت سے وابستہ اور سرگشتۂ رسوم و قیود لوگوں کو مادر پدر آزاد شاعری سے زیادہ موزوں اور کوئی لقب دستیاب نہیں ہو سکا۔ ہیئت کے تجربوں کی داستان بھی اس سے کم عبرت آموز نہیں۔ ابہام اور اہمال کے عنوان سے میں نے ایک مقالہ میں ایک عرصہ قبل شعر کا SEMANTICS کے نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی تھی اور بعض ادبی حلقوں میں اس پر خاصی لے دے بھی ہوئی۔ کیونکہ زبان و ادب کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں کسی مداہنت کا قائل نہیں۔ یہاں معنویت اور ابہام کے شوق میں بعض سکہ بند ناقدین کی عجیب و غریب بحثیں بھی سننے میں آئیں۔ ایک معروف ادبی مجلس میں ایک بار (کئی سال پہلے کی بات ہے) کسی بزرگ شاعر نے ایک روایتی انداز کی سیدھی سادی غزل پیش کی۔ دو ایک شعر غنیمت تھے باقی صاف تھے مگر کوئی خاص بات نہ تھی۔ ایک سکہ بند ناقد نے بحث کا آغاز اس نقطہ سے کیا کہ غزل میں MODERN SENSIBILITY نہیں ملتی کیونکہ اس کا اندازِ بیان سپاٹ ہے اور اس میں ابہام نہیں پایا جاتا ہے۔ میں نے برسبیلِ تفنن عرض کیا کہ اگر اس قسم کی منفی تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بات کبھی ختم نہ ہو سکے گی۔

کمال صاحب یہ فرمائیں گے کہ اس میں کوئی مطلب تو ہے ہی نہیں۔ کسی کو یہ اعتراض ہوگا کہ اس میں آرٹ شاعری کے نظریۂ انفرادیت کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ کسی کو اس میں جدلیاتی مادیت کے اثبات میں کسی دلیل کے فقدان کی شکایت ہوگی۔ کوئی یہ کہے گا کہ اس میں عصرِ حاضر کی نظریاتی کشمکش کے بارے میں کسی COMMITMENT کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے مناسب اور RELEVANT تنقید بھی یہ ہو سکتی ہے کہ آپ یہ غور فرمائیں کہ اگر یہ غزل ہے تو صنفِ غزل کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتی ہے اور شاعر کا وہ ذاتی تجربہ جو غزل کے سانچے میں ڈھالا گیا کس حد تک منفرد ہے اور کس حد تک روایتِ غزل سے ہم آہنگ ہے۔ میرے اس خیال کی کھل کر کسی نے مخالفت نہیں کی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ... بحث جس انداز میں جاری رہی اس کو دیکھ کر وہاں بیٹھا رہنا ضروری نظر آیا۔

نظم کے سلسلے میں یہاں صنعتِ بے بحری خاصی مقبول رہی ہے۔ تم نے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ دانستہ نثر کی صورت میں کسی شعری خیال کو پیش کرنے کے ضمن میں آتے ہیں اور اگر ان کے نظم ہونے پر اصرار کیا جائے تو قابلِ مواخذہ بھی ہو سکتے ہیں ان کا مقابلہ ان منثور شعرا سے کیا جا سکتا ہے جو تقریباً نصف صدی قبل ٹیگور کی شاعری کے اتباع میں رائج ہوئے تھے۔ اور کچھ عرصہ تک اپنی جدت سے لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کے بعد فرسودہ ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کو اگر شاعرانہ خیال اور اندازِ بیان کی بنا پر شعر کہا جائے تو بھی قابلِ درگزر ہے لیکن ایسے نثر پاروں کو نظم کہنے میں مجھے تامل ہوگا۔ اس لیے کہ لفظ نظم کے ساتھ دو مختلف مفہوم وابستہ ہیں۔ ایک تو منظوم VERSE OR METRICAL COMPOSITION اور دوسرا وہ مفہوم جو انگریزی کے لفظ POEM یا POETIC COMPOSITION میں پایا جاتا ہے۔ ایسے نمونوں کو دوسرے مفہوم میں نظم یا POEM کہہ دیا جائے تو یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ غیر موزوں نظم ہے۔ اس ضمن میں مشرق و مغرب کی تنقید کی کشمکش نے بھی بڑی الجھن پیدا کی ہے۔ ہماری مشرقی تنقید میں شعر کی تعریف کلامِ موزوں بالقصد کی گئی ہے کبھی مقفیٰ کی قید کا بھی اضافہ کیا گیا ہے (جو سراسر زائد ہے) مغربی تنقید میں (خصوصاً رومانی ناقدین خصوصاً COLERIDGE کے یہاں) جذباتی یا وجدانی تجربہ کو اساسی اہمیت دی گئی ہے اور ہیئت کو اس کا تابع سمجھا گیا ہے۔ میرا ذاتی نقطۂ نظر جزوی طور پر دونوں تصورات میں توافق یا مطابقت پر مبنی ہے۔ شعر یا لا شعر، کلامِ منظوم و منثور کی DICHOTOMY کو مدِ نظر رکھا جائے تو ایک چہار گانہ تقسیم سامنے آتی ہے۔ ایک طرف شعر کا تقابل لا شعر یا MATTER OF FACT کے ساتھ اور دوسری طرف کلامِ موزوں اور غیر موزوں کا تقابل۔ یہ تقسیمیں اپنی جگہ مانع بھی MUTUALLY EXCLUSIVE ہیں۔ لیکن ان کو بیک وقت پیشِ نظر رکھا جائے تو وہ چہار گانہ تقسیم سامنے آتی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا

ہے۔ یعنی شعر کلام حقیقت میں نا گہاں پیدا ہوتا ہے اور غیر منظم میں ہی ادا ہوتا ہے وہ شعر ہے جسے کولرج نے سائنس یا MATTER OF FACT کہا ہے کا متضاد ہے۔ نثر کی صورت میں اعلیٰ ترین شاعری کے بے شمار نمونے مل جائیں گے اور اقبال کا "منظوم فکر" کی بے شمار مثالیں بھی۔ جب پابند شاعری کے ہاتھوں کا سلسلہ تو اس میں کبھی رد آئے گا، سلسلہ کا منظر عام ہوتا ہے اور کبھی مسلسل روایتوں کا اتباع نظر آتا ہے۔ اگر وہ فضا میں بہرا ہوئی پیدا ہو جائے تو کیا کہنے۔ دراصل مشق رکھنے والے مصرعہ کہنے کو شعر ہو اور روایت پسند ناقد کہتا ہے لا اعرفہ یعنی اسے نہیں پہچانتا۔ اور حالانکہ اس بارے میں حرف آخر کہنا ممکن بھی نہیں۔ شاعری میں ہیئت کی نت نئے تجربے جن کی ابتدا تحریم ہیئت سے ہوتی ہوئی نثری شاعری میں پہنچتی ہے۔ عموماً ایسے شاعروں کے یہاں ملتے ہیں جن کے پاس کہنے کے قابل کوئی بات نہیں ہوتی یا انہیں اس کے بارے میں وہ تیقن حاصل نہیں ہوتا جو اثر کلام کی اساس ہو۔ بڑے شعراء میر، غالب، اقبال، شیکسپیئر، ملٹن، ورڈزورتھ وغیرہ کبھی ہیئت کے تجربوں کے چکر میں نہیں پڑے۔ ان کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے مروجہ رسمی سانچوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ان کے منفرد فکری و وجدانی تجربات کا مکمل اظہار و ابلاغ کر سکیں۔ اور یہ کلیہ بلا استثنا ہر زبان کے ادب پر صادق آتا ہے تم نے اس ضمن میں تجربات مرا۔ کی بات چھیڑی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ راشد، میراجی، اختر الایمان وغیرہ اپنے ادوار کے نامور شاعر تھے۔ ان کی قدر و قیمت سے قطع نظر مجھے اس ساری جماعت میں قدر مشترک نظر آتی ہے۔ یہ نسل وہی تمدنی اور روحانی حادثات کا زخم خوردہ ہے۔ انہیں اپنی روحانی واردات پر وہ مستحکم گرفت میسر نہیں جو عظیم شاعری کی اولین شرط ہے اور اپنے تجربے کو خواہ وہ منفی ہی کیوں نہ ہو [؟] معروف شعری سانچوں میں ڈھالنے کے لیے جس قدرت کلام کی ضرورت ہے وہ لوگ اس سے بھی تہی دامن تھے۔ اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جن کے نزدیک شعری تجربے یا وجدان کی حیثیت بھی ثانوی تھی۔ دوران کی شاعری کی جاذبیت اور اپیل کی بنیادیں ان کی تکنیک کی "ندرت" ہی کی مرہون منت تھی۔ ان تجربوں کے پس پردہ اکثر صورتوں میں یہ احساس کارفرما نظر آتا ہے کہ مروجہ رسمی ہیئتوں میں شعر اپنا اظہار ممکن نہیں۔ اس لیے بیان کی پابندیوں میں بے ضرورت نرمی اور لچک پیدا کرتی ہے۔ قافیہ کا التزام مشکل ہو تو نظم معرّیٰ سہی۔ وزن کی پابندی گراں گذرتی ہو تو اس میں سہولت کی راہیں تلاش کی جائیں۔ ہم وزن مصرعے نہ ہو سکیں تو ارکان کی تعداد میں کمی بیشی کر کے غیر متوازن مصرعے رکھے جائیں اور یوں قدم قدم پر سہولتوں کی تلاش میں شاعر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں قافیہ ہی نہیں وزن و آہنگ بھی غیر اہم اور اضافی عناصر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ... کا ایک قابل ذکر یا محمود ... دوسری انتہا کو پہنچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ایک شام عالم سرگوشی میں

... سے کا اتفاق ہوا۔ شعر کی آزادی اور پابندی کا ذکر چھڑا ... اور وہ کچھ سہمے کہ میں اپنی ساری زندگی میں غیر مقفیٰ شاعری ... پیش نہیں آئی۔ اردو کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ اتنا وسیع اور متنوع ہے کہ اس میں ہم قافیہ الفاظ کی کوئی کمی نہیں ہے اور ذرا سی کاوش سے ہر طرح کا خیال قافیہ کے التزام کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ غیر مقفیٰ شاعری کا سہارا لیتے ہیں دراصل اپنے عجز کلام کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس انتہا پسندانہ نقطۂ نظر سے کلام غیر موزوں تو مطلقاً ہے جواز قرار پائے گا۔ لیکن میرے نقطۂ نظر سے یہ سخت گیری درست نہیں۔ اس سلسلے میں اپنا تجربہ بھی بتا دوں۔ میں نے دس بارہ لمبی نظمیں بلینک ورس میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی میں بلینک ورس کا ایک خاص مقام ہے۔ ملٹن اور بہت سے نقاد اس کو مقفیٰ شاعری کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور "مہذب" صنف قرار دیتے ہیں۔ اس کی خاص تکنیک اور خصوصیات میں اس کا مخصوص RHYTHM ہے جو شاعر سے پوری توجہ اور ریاضت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اردو اور انگریزی کے مخصوص مزاج اور مختلف طرز صوت و آہنگ کی بدولت اردو کی غیر مقفیٰ شاعری میں وہ اثر آفرینی نہیں ملتی جو انگریزی بلینک ورس کے اعلیٰ ترین نمونوں مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں یا ملٹن کی رزمیہ کی بلینک ورس میں ملتی ہے۔ میں نے اس ضمن میں کچھ تجربے کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر جگہ یکساں کامیابی نہ ہو سکی۔ بلینک ورس کے بعد نظم آزاد کی منزل آتی ہے جس میں طرز آہنگ RHYTHMIC PATTERN تو قائم رہتا ہے لیکن مصرعے غیر متوازن ہو جاتے ہیں اور اس کی انتہائی صورت وہ ہے جس کی جانب فرقت کاکوروی نے مداوا میں پیش کردہ پیروڈی میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی [؟] ایک مصرعہ میل سے زنجیر کی صورت طویل۔ دوسرا اشتر کی دم [؟] اس سے آگے بڑھو تو وہ صورت سامنے آتی ہے کہ بحر بحر میں ڈال کے بحر ڈال چلے گئے اور مختلف بحریں خلط ملط ہوتی گئی ہیں اور پھر سب سے آخر میں صنعت بے بحری کے وہ کارہائے نمایاں شاعر ملکا کرے کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ "در ہر شعر چہ کشتی ست کہ پیش مرداں بیاید" ہر حال اس قسم کے تجربوں کے بارے میں آخری فیصلہ وقت کی عدالت ہی کر سکے گی۔ اور اکثر صورتوں میں اس فیصلے کا انحصار قبول عام کی شہادت اور بیشتر یادوں کی زندہ رہنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست نے ایک بار اس ضمن میں ایک دلچسپ معیار پیش کیا تھا۔ بحث کے دوران انھوں نے جدید شاعری کے ایک حامی کو چیلنج دیا تھا کہ وہ حافظہ کی مدد سے کسی آزاد نظم کی دس لائنیں دہرا دیں۔ ان کے نزدیک شاعری کرنے والے اور سننے والے کے درمیان ایک رابطہ ہے اور اس کی زندگی کا ثبوت صفحۂ قرطاس پر رقم ہونے سے نہیں بلکہ ذہن سامع پر ایک پائدار نقش ثبت کر دینے سے ملتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جدید شاعری کے اکثر و بیشتر نمونے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

[ احسن اقبال۔ لاہور ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ء ]

**مظہر امام۔** ۷۔ پرتاپ پارک فلیٹس، ریسیڈنسی روڈ، سری نگر۔

شاعر شمارہ ۱۹۸۸ء میں جو تین مضامین شامل اشاعت ہیں۔ ان میں مجھے ایک معنوی ربط نظر آیا۔ ڈاکٹر خورشید سمیع کے مقالے کا عنوان ہے۔ "نئی کہانیاں، ایک بازدید" اور ثانی انصاری اور ناصر بغدادی کے مقالات کے عنوانات بالترتیب "ادب کی مدتی قدریں" اور "ادبی تعصبات کا مسئلہ" ہیں۔ عنوانات سے ہی ظاہر ہے کہ اوّل الذکر مضمون نئے افسانوی ادب کی صورت حال کا جائزہ کرتا ہے اور باقی دو مضامین ادب کے بعض مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ ایک ساتھ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان مضمون نگاروں کے یہاں ادبی اقدار کے تصور میں شاید ہم آہنگی اور مماثلت ہے۔

خورشید سمیع کا مضمون ان کے وسیع مطالعہ کا غماز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس مضمون کی اہمیت اور شناسائی حاصل کرنے کے لیے مضمون نگار کے موقف کا ابہام ضروری ہے اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں ان کا موقف یہ ہے کہ :

(۱) افسانہ، افسانویت یا کہانی پن کے بغیر افسانہ نہیں رہ جاتا۔

(۲) اپنی ہی ذات کے ریشوں سے مسخ شدہ حسیت پر مبنی تجریدی اور علامتی افسانے لا یعنی اظہار ہو گا۔

(۳) اگر کہانی نظم سے قریب ہو جائے تو اپنی صنفی حیثیت اور شناخت کھو دیتی ہے۔

(۴) افسانہ وہی اچھا ہے جو کسی نہ کسی عنوان سے سماج کی ان بنیادی حقیقتوں کو ابھارتا ہے جن میں طبقاتی شعور اور اور رنگ شامل ہے۔

مضمون نگار کے اس نقطۂ نظر یا ان کے بعض حصوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، خورشید سمیع نے اپنے جائزے کے لیے افسانہ نگاروں کے انتخاب میں جو موقف اختیار کیا ہے، اور ان کا جائزہ لینے کے لیے جو تنقیدی رویّہ اپنایا ہے، ان کی آگاہی کے بغیر مضمون نگار کی بات غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس مضمون کو خورشید سمیع ہی کے ایک اور مضمون "نئی افسانوی روایت" کو سامنے رکھ کر پڑھنا مناسب ہے، جناب سے تقریباً ایک سال پہلے شاعر میں ہی شائع ہوا تھا۔ زیر تبصرہ مضمون میں ان کے پہلے مضمون کی کچھ باتوں کا اعادہ بھی ہے اور کچھ باتوں کی وضاحت بھی۔ ان کا خیال ہے کہ،

"نئی افسانوی روایت ترقی پسند افسانوی روایت سے کچھ الگ نہیں"

شاید اسی لیے انہوں نے اپنے جائزے کے لیے ان بیس افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، انور سجاد، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، جوگندر پال، رام لعل، انور عظیم، بلراج مین را، قاضی عبد الستار، عابد سہیل، اقبال مجید، اقبال متین، رتن سنگھ، انور قمر، سلام بن رزاق، انور خان، شفق، عبد الصمد، عبید قمر۔ ان میں سے انور خان اور شفق کا اضافہ حالیہ مضمون میں ہوا ہے "نئی افسانوی روایت" میں یہ دونوں نام نہیں تھے]

ان مضامین میں احمد یوسف، انیس رفیع، شوکت حیات، حسین الحق وغیرہ کے افسانوں سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ میں نے یہ نام اس وجہ سے لیے ہیں کیوں کہ مجھے ان کے یہاں "سماجی حقیقتوں کا احساس اور طبقاتی شعور" ملتا ہے۔ احمد یوسف پوری بھی اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں، اور غالباً آج بھی وہ مارکسزم کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اگر پریم چند کے گروہ ان کے گرد ہوئی کے دعوے کی بنا پر بھی کو "ترقی پسند افسانوں" میں شامل کیا جا سکتا

## اپنی کتب کی نکاسی کے لئے شاعر میں

# اشتہار

دیجئے ـــــ کیوں کہ

- ○ شاعر - ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی لائبریریوں میں جاتا ہے
- ○ شاعر - ہندوستان کے بیشتر اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں منگوایا جاتا ہے
- ○ شاعر - ملک اور بیرون ملک کے تمام علمی و ادبی حلقوں میں بڑی تعداد میں پڑھا جاتا ہے
- ○ شاعر - ہر مکتبہ فکر کے قارئین میں یکساں مقبول ہے

اس لئے آپ کی



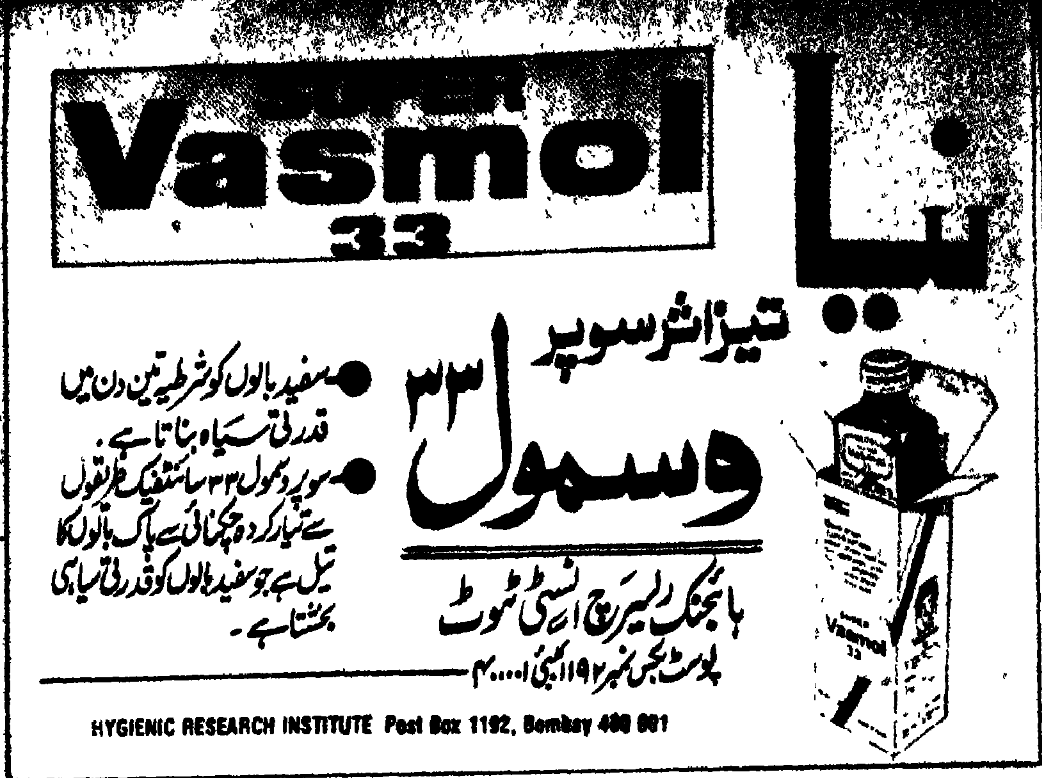
# کتاب

کا اشتہار کتاب کی نکاسی میں معاون ثابت ہوگا

کم شرح ❀ بہترین خدمات

تفصیلات کے لئے لکھئے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸


SUPER
Vasmol
33
نیا
تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳
سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔
ہائجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001


IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
NO 253
EXCELLENT
PLAYING CARDS
T.M.R.No.176412
METRO PLAYING CARD CO.
Metro Estate, Bombay-400 029. • TEL :

Regd. No. MH-BY.W. 28 [redacted] Price : Rs. 5

The "SHAIR" (Monthly) Bombay 400 008.

Years of Publication ISSUE No: 9 to 12 1987 Telephone No. 35 99 04

(Publishing Date 27-28)

Registered with the Registrar of Newspapers at R N. No 14482/57